
ادبیات اردو
اردو حیدرآباد اے پی-۴

یادگار ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور مرحوم

ادارۂ ادبیات اردو کا ترجمان

سنہ اجراء ۱۹۳۸ء فون نمبر (۳۵۲۰۹)

جلد (۲۶) ۔ شمارہ (۶) جون ۱۹۶۳ء

ماہنامہ

سب رس

حیدرآباد دکن

نگران :- (پروفیسر) عبدالمجید صدیقی

مجلس مشاورت :-

ڈاکٹر گوپی چند نارنگ ، نصیر الدین ہاشمی

رتن راج سکسینہ ، منظور احمد ، وقار خلیل

معتمد :-

محمد اکبر الدین صدیقی

زر سالانہ ہندوپاک سے ۶ روپے

ششماہی ۳ "

غیر ممالک سے ۱۰ "

فی پرچہ ۵۰ نئے پیسے

مہتمم ادارہ ادبیات اردو کے اہتمام سے

نیشنل فائن پرنٹنگ پریس میں چھپ کر

دفتر ایوان اردو خیریت آباد حیدرآباد دکن ۴ سے شائع ہوا

ترتیب

اپنی بات ۲

شبلی — ڈاکٹر سید ابوالفضل مرحوم ۳

رشید الدین عالی — سعید الدین ۹

قند بوسہ شیریں لباں مکرر ہو — قادر جاوید ۱۵

نصرتی اور حسن و عشق — طیب انصاری ۱۰

حصۂ نظم

تضمین — راگھویندر راؤ جذب عالمپوری ۲۷

رزمیہ دفاعی رباعیات — اختر رضوانی ۲۸

رباعیات انور — لطیف انور ۰

غزلیات

محسن بھوپالی — صابر شاہ آبادی ۲۹

حامد بکاوی — تمنا یوسفی ۳۰

اختر فدائی — بشیر بدر ۳۱

آرزو (نظم) — رؤف خلش ۳۲

اپنے آوارہ گرد اشعار — انوار ظہوری ۳۳

افسانہ

ادھوری تصویر — ولایت جعفری ۳۴

نقد و نظر

محمد اکبر الدین صدیقی — محمد منظور احمد ۳۷

رشید الدین — وقار خلیل

اپنی بات

حیدرآباد میں مئی کا مہینہ گرمیوں کا ہونے کے باوجود ادبی سرگرمیوں کا تھا۔ انجمن تحفظ اردو نے اردو کی ایک کانفرنس اندرون شہر (قدیم آبادی) منعقد کی مختلف مسائل کا جائزہ لیا اور اپنے مطالبات حکومت کے سامنے رکھے، جو مقامی اخبارات میں آ چکے ہیں۔

عثمانیہ یونیورسٹی نے یونیورسٹی گرانٹ کمیشن کے تعاون سے لسانیات کا گرمائی اسکول کھولا۔ یہ اسکول ۲۹ / اپریل سے ۷ / جون تک کام کرتا رہا۔ ہندوستان کی مختلف جامعات کے اساتذہ اس میں شرکت کے لیے آئے۔ چنانچہ شعبۂ اردو سے متعلق اساتذہ جناب ڈاکٹر خواجہ احمد فاروقی اور جناب عتیق احمد صدیقی دہلی سے اور جناب حکم چند نیّر نے بنارس یونیورسٹی سے شرکت کی۔ اساتذہ میں پروفیسر سنیتی کمار چٹرجی تشریف لائے اور ان سب حضرات نے ادارۂ ادبیات اردو کا معائنہ کیا۔ ڈاکٹر زور صاحب کی بے وقت موت پر دیر تک افسوس کرتے رہے اور دعا کی کہ ادارہ ڈاکٹر زور صاحب مرحوم کی خواہش کے مطابق کام کرتا رہے۔ مئی میں ادارہ ادبیات اردو کی دو نئی کتابیں تیار ہو گئیں ایک فہرست مطبوعات جلد سوم شائع ہو چکی ہے اس میں تقریباً تین ہزار کتابوں کا ذکر ہے۔ اس فہرست میں کئی ایسی مطبوعات شامل ہیں جو نایاب ہو چکی ہیں۔ آج بہت کم لوگوں کو اس کا علم ہے کہ انجینئرنگ کالج رڑکی کا اپنا ایک پریس تھا۔ جہاں فن انجینئری پر انگریزی سے اردو میں کتابیں ترجمہ کی جاتیں اور اپنے طلبا کے استفادوں کی خاطر انھیں شائع کیا جاتا۔ ترجمہ کرنے والے کالج کے اساتذہ تھے جن میں چند کے اسمائے گرامی حسب ذیل ہیں۔ شنبھو داس منولال، کنھیالال اور شیخ مینجا۔ ان حضرات نے لوگارتھم، حساب، الجبرا، ہندسہ، مساحت وغیرہ پر کتابیں لکھیں اور ان میں سے اکثر و بیشتر کتابیں ادارے کے کتب خانے میں محفوظ ہیں اور اس فہرست میں شامل ہیں۔ ان کے علاوہ اور بھی کئی ایسی مطبوعات ہیں جو آج نایاب ہو چکی ہیں۔

ادارہ نے اب تک مختلف موضوعات پر مختلف مصنفوں کی کئی کتابیں شائع کی ہیں۔ طنز و مزاح پر ادارہ نے بھارت چند کھنہ کی کتاب ٹھنڈی بجلیاں اور پروفیسر قاضی غلام محمد (کشمیر) کی طنزیہ و مزاحیہ نظموں کا مجموعہ پیش کیا ہے۔ اب ملک کے مشہور طنز نگار یوسف ناظم کا مجموعہ پیش کر رہا ہے جس کا مقدمہ اردو کے مشہور افسانہ نگار کرشن چندر نے لکھا ہے۔ توقع ہے کہ علم دوست اصحاب ادارہ کی ان خدمات کی قدر کریں گے، اور بہتر خدمت کا موقع عنایت فرمائیں گے۔

امیدواران امتحانات ادارہ نے سال میں دو بار امتحان لینے کی درخواست دی جس کو مجلس انتظامی نے منظور کیا چنانچہ ان امتحانات میں جون کی میقات میں چالیس امیدواروں نے شرکت کی۔ اس سے ادارہ کے امتحانات کی مقبولیت کا اندازہ ہو سکتا ہے۔ اگر اس کی معقول پبلسٹی ہوتی تو شرکا کی تعداد میں اضافہ ہو سکتا۔

پیش نظر رسالے میں ایک مضمون شبلی پر ڈاکٹر سید ابو الفضل مرحوم کا ہے یہ ادارہ کے کارکنوں میں تھے ادارہ نے ان کی گرانقدر کتاب تاریخ ادب عربی شائع کی جو کافی مقبول ہوئی اور اکثر جامعات کے نصابوں میں شریک ہے۔ ڈاکٹر ابو الفضل نے حال ہی میں انتقال کیا۔ تاریخ ادب عربی پر دوسرے ایڈیشن کے لیے نظر ثانی کر رہے تھے لیکن موت نے مہلت نہ دی۔ ایک اور مضمون طیب انصاری صاحب کا فغرتی کی شاعری پر ہے۔ فاضل مقالہ نگار نے اس کی پیش کشی میں کافی عرق ریزی کی ہے۔ توقع ہے کہ ۔۔۔۔ شوق سے پڑھا جائے گا۔ دیگر مضامین اور نظمیں بھی قارئین کے لیے دلچسپی کا باعث ہوں گی۔

ڈاکٹر سید ابو الفضل مرحوم

شبلی

شخصیت کا تعین خطوط کی روشنی میں

اوروں کے خانگی اور نجی خطوط کا پڑھنا ہر قوم، ہر ملک اور معاشرت میں ایک اخلاقی جرم سمجھا جاتا ہے مگر ہر دستور اور رواج کی استثنا سا ایک ایسا پہلو نکل آتا ہے جہاں عیب ایک ہنر اور جرم ایک خوبی بن جاتا ہے۔ اسی استثنائی شکل میں بڑی شخصیتوں کے نجی خطوط کا مطالعہ بھی آ جاتا ہے کہ طرز جدید کی سوانح عمری مرتب کرنے میں — آجکل — ان کے ایسے خطوط اور تحریروں سے زیادہ اہم دستاویز کوئی اور نہیں سمجھی جاتیں۔ ان کی زندگی کے واقعات کی جمع و ترتیب ان کی ذہنی ساخت اور سماجی شعور کے تعین اور ان کے اعمال و افعال کے اثرات مرتب کرنے میں ان سے بے حد مدد ملتی ہے۔

نجی خطوط خود کلامی کا بہترین مظہر ہیں۔ تنہائی میں اپنے رازدار اور مخلص دوستوں یا اپنے نور نظر عزیزوں کو خط لکھتے ہوئے انسان کسی دار و گیر یا باز پرس و تنقید کی گرفت سے آزاد ہو کر نہایت بے تکلفی اور سادگی سے اپنا دل کھول کر رکھتا ہے۔ اس کی مثال اسی شخص کی کسی اور علمی یا ادبی تحریروں میں ہرگز نہ مل سکے گی۔ ایسے خطوط میں سادگی، صداقت اور خلوص ہوتا ہے۔ تصنع نام کو نہیں ہوتا۔ وہ نہایت بے تکلفی سے اپنے مخاطب سے باتیں کرتا ہے۔ اسے اپنا شریک راز بناتا ہے۔ اپنے دل کی گہرائیاں اس کے سامنے کھول کر رکھ دیتا ہے۔ اس سے مشورے لیتا ہے اس کی باتوں پر ہنستا ہے اور انہیں بھی کرتا ہے، اسے اپنی مسرت اور غم کا شریک و رازدان جان کر اپنی کامیابیاں اور ناکامیاں اس سے بیان کرتا ہے بلکہ بعض اوقات اپنی ناکامیوں کی داد کا طالب ہوتا ہے اور اپنی حسرتوں کی بیداد پر اس سے مرہم کا جویا — یہاں اس کی زندگی کے تمام پہلو — اس کی تمنائیں اس کے ولولے اور اس کے اعمال و افعال کے تمام کے تمام جیتی جاگتی تصویروں میں بدل جاتے ہیں۔ اس کی حیات کے سارے اسرار اور خوابیدہ پہلو جاگ پڑتے ہیں۔ گویا اس کے یہ خطوط شفاف آئینے ہیں کہ جن میں اس کے تحت الشعور کی جھلکیاں تک نمودار ہو جاتی ہیں۔

کسی بڑی شخصیت کی سوانح عمری کا مطالعہ کیجیے تو معلوم ہوگا کہ اس کے سوانح نگار نے کد و کاوش سے اس کی زندگی کے ایک ایک واقعہ کو خواہ وہ کتنا ہی معمولی کیوں نہ ہو جمع کیا ہے۔ اس کے ایک ایک جملے بلکہ ایک ایک لفظ سے واقعات میں جان بھرنے کی کوشش کی ہے۔ لیکن اس کے برخلاف اگر اس کے خانگی خطوط مل جائیں جو اس نے اپنے عزیزوں، دوستوں اور ساتھیوں کو موقع بموقع لکھے جن میں مختلف واقعات، جذبات یا ان کے آپسی معاملات کی گہرائی کو واضح کرنے والی عبارتوں اور تحریروں سے انہیں زینت بخشی ہے تو اس شخصیت کی مکمل تصویر ہمارے سامنے ابھر آئے گی۔ یہ بات شبلی کے خطوط پر بڑی حد تک صحیح ثابت ہوتی ہے۔

خطوط میں شبلی کے مخاطب ہر قسم کے لوگ ہیں۔ بزرگ، خاندان، دوست — جن میں دونوں اصناف شامل ہیں — شاگرد اور ہم پیشہ و ہم مشرب۔ اس لحاظ سے مختلف امور و معاملات کے علاوہ جا بجا ان کو ایسے حالات و واقعات سے دوچار

ہوتا تاہم ان مضامین میں وہ خود اپنے متعلق بھی کچھ لکھتے اور یہی باتیں ہمارے سامنے کی ہیں۔ انہیں باتوں سے ان کے دلی انداز کی امیدیں، ان کے ارادے، ان کی دلچسپیاں — غرض ان کے حقیقی خیالات و جذبات کو ظاہر کرنے والی ایسی بہت سی چیزیں نکل آتی ہیں جن سے ان کی شخصیت کے متعین کرنے میں ہمیں بڑی مدد ملتی ہے ۔

جہاں شبلی کی شخصیت کے بہت سے پہلو ان کے اس سرمایہ کے مطالعہ سے ہمارے سامنے ابھر آتے ہیں ان میں کم از کم دو نہایت شاندار اور جاندار ہیں۔ انہیں ہم کمال اور جمال سے منسوب کر سکتے ہیں۔ جہاں تک ان کی کمالی حیثیت کا تعلق ہے اس کے یوں تو کئی روپ ہیں مگر سب کا مجموعہ "تعلیم" اور اس کے متعلقات کے علاوہ کچھ نہیں۔ جیسے مسلمانوں کی علمی ترقی، مذہبی علوم کی اصلاح، مستشرقین کی غلطیوں کا ازالہ، درسگاہوں کی بہتری، تصانیف کی تیاری، طلبہ کو ہر قسم کی امداد کا خیال، کتابوں کی خریدی، کتب خانوں سے استفادہ کی کوششیں، علوم و فنون کی ترقی کے سلسلہ میں جلسوں، کمیٹیوں اور کانفرنسوں کا انعقاد اور عام طور پر مسلمانوں کی ہمہ جہتی ترقی کے پروگرام بنانا۔ غرض ایک طومار ہے جو ان کی زندگی کے ہر لمحہ پر چھایا ہوا ہے۔ اپنے ان مقاصد کی تکمیل کے لئے کبھی وہ گورنمنٹ کو نصابِ تعلیم، اساتذہ، زبان اور اخلاق و مذہب کے مسائل کے بارے میں توجہ دلاتے نظر آتے ہیں۔ کبھی ملک کے لیڈروں سے تعلیم و تدریس کے معاملہ میں گرماگرم بحث کرتے ہیں کبھی پریس والوں سے تصانیف طباعت اور اشاعت و فروخت کی باتیں طے ہو رہی ہیں تو کبھی دور دراز کے کتب خانوں اور مصنفوں سے کتابیں حاصل کرنے کی کوشش میں لگے ہیں۔ قلمی نسخے خریدتے ہیں اور اس قیمتی سرمایہ کے جمع ہونے پر خوشی کا اظہار کرتے ہیں اور ساتھ ہی اہل علم یا اہل ثروت کو ان کتب کے تحفے تحائف بھی دے رہے ہیں۔ بیماریوں نے عاجز کیا اور صحت حاصل کرنے کا خیال آیا تو کسی ایک صحت بخش مقام پر جم کر رہنے اور فارغ البالی و سکون سے زندگی گزارنے کے پروگرام بناتے ہیں۔ مگر جونہی تصانیف کی تیاری یا تلاش روزگار کی ضرورت آ پڑے تو طویل سفروں کے انتظامات میں لگ جاتے ہیں۔

ایک طرف طالب علموں کی ذہنی تربیت اور تدریس میں مصروف ہیں تو دوسری طرف کسبِ معیشت اور روزگار کی فراہمی کی ان کی سفارشیں کر رہے ہیں اور زندگی کی دوڑ میں بھرپور حصہ لینے کے لئے نہ صرف انہیں مختلف طریقوں سے تیار کر رہے ہیں بلکہ ہر طرح ان کی مدد بھی کر لیتے ہیں۔ کبھی اہل مشرق کو ان کے جمود، تساہل اور جہالت پسندی پر برا بھلا کہا جا رہا ہے تو کبھی اہل مغرب کی خباثت اور مکر کا دامن چاک کیا جا رہا ہے۔ کبھی اپنی شخصیت کے اسرار کھولے جا رہے ہیں تو کبھی اپنے مخالفین کی تعصب پرستی اور کمینگی کی طرف لطیف اشارے کر رہے ہیں۔ اس تمام ہنگامے اور زندگی کی ان جیتی جاگتی متنوع الجھنوں میں بھی ان خطوط کے ہر پڑھنے والے کو یہ صاف نظر آتا ہے کہ ناسازگار ماحول، حوادث پیہم اور نارسائی بخت کے باوجود ایک عظیم شخصیت کس طرح اپنی ہستی کو ہر الجھاؤ اور ہر پیچ و خم سے باہر نکالتی ہے اور کس طرح اپنی رفعت کا لوہا اہل عالم سے منواتی ہے۔ کارناموں کو سرانجام دینے کی دھن کس طرح اسے اپنے اطراف ایسے شاگردوں اور رفیقوں کے جمع کرنے میں مدد دیتی ہے۔ تا آنکہ وہی لگن وہ اوروں کے دل میں بھی پیدا کر دیتی ہے۔ یہاں پہنچ کر ہمیں محسوس ہوتا ہے کہ علم و فن کی عظمت اور اس سے حقیقی افادہ ایسا ہی ہے جیسا کہ سورج اپنے نور سے ایسے کئی کروڑوں کو ضیا پاش کر دے کہ ذرّہ سے مل کر ماہتاب کہلائیں پھر اس حاصل شدہ نور کے فیضان سے وہ اوروں کو استفادہ کرنے کا موقع دیں۔ چراغ سے چراغ جلنے کا یہی طریقہ تعلیم کا حقیقی طرز اور مقصد ہے !!

علمی مظاہر پر روشنی ڈالنے والے مکاتیب بظاہر خشک اور خالص کاروباری انداز کے معلوم ہوتے ہیں۔ لیکن ان کی شخصیت کے
یت جاندار پہلو انہیں سے واضح ہوتے ہیں۔ ان سے پتہ چلتا ہے کہ اپنی زندگی کے ایک ایک لمحے سے وہ کس طرح
متفادہ کرنا چاہتے ہیں۔ ان لمحات کی قدر و قیمت اور انہیں صلاحیتوں کو بروئے کار لانے سے وہ بخوبی واقف ہیں۔
ینے مخاطب کی ذہنی افتاد اور اس کے جوہر کا بھی علم رکھتے ہیں جس سے فائدہ اٹھانا چاہتے ہیں۔ اسی لئے شاگردوں کو
ینے کے عجیب انداز ہیں ایک جگہ ان کی سستی پر طعن دیتے ہیں تو دوسری جگہ ان کے مضامین و کتب کی تعریف و توصیف کرتے
ں۔ کبھی یورپ والوں کے مقابلہ کے لئے مختلف طریقوں سے انہیں اکساتے ہیں تو کبھی اپنے علوم و آداب کی بلندی
فادیت کا یقین ان کے دلوں میں پیدا کرتے ہیں۔ کبھی علمائے سلف کی بے مزا طرز تحریر اور لاپرواہانہ اسلوب نگارش
یز بر ہو رہے ہیں تو کبھی ان کی انہیں غلطیوں سے مستشرقین کے فائدہ اٹھانے اور مغالطے دینے کو برا بھلا
ہہ رہے ہیں۔

ان کے مکاتیب کے اس ضخیم حصہ سے یہ پوری طرح واضح ہوتا ہے کہ مسلمانوں کا عروج ان کی تعلیمی و سماجی اصلاح
ر ان کو ایک بلند کردار اور اعلیٰ نصب العین رکھنے والی ایک عظیم قوم بنانا ان کی زندگی کا پہلا مقصد تھا۔ اس سلسلہ میں دو پہلو
ص طور پر ان کے پیش نظر تھے۔ ایک مسلمانوں کے نظام تعلیم اور ان کے مدارس کی اصلاح اور دوسرے مضامین اور
تب و رسائل کے ذریعہ اسلام کے محاسن اور اکابر اسلام کے محامد نئے طریق سے دنیا کے آگے پیش کرنا اس غرض میں جن
یقوں سے انہوں نے اپنے ماحول میں جان بھری وہ ان کی عظمت کی دلیل ہے۔ ان کی کوششوں کے جو نتائج ہمارے
منے ہیں۔ یہی وہ اس عظمت پر مہر تصدیق ثبت کرتے ہیں۔ ان خطوں کے ایک ایک جملے میں ان کی روح سمائی
ئی ہے۔ ان کی دھن اور ان کی لگن ہر لفظ سے ٹپکی پڑتی ہے۔ ان کے عکس میں وہ محض ایک شخصیت ہی نہیں بلکہ
ب مکمل ادارہ معلوم ہوتے ہیں۔ ایک مشین ہی نہیں بلکہ پورا ایک کارخانہ جس میں معمولی پرزوں سے لے کر بڑی بڑی
م کی چیزیں ڈھل رہی ہیں۔ ان کی صیقل گری ہو رہی ہے۔ ان کی ترتیب اور پیچ و خم دیکھے جا رہے ہیں تاکہ ایک مکمل
رکارآمد چیز دنیا کے سامنے پیش کی جا سکے۔ اور اس بناوٹ کے پورے دوران میں ان کی شخصیت ایک ماہر کاریگر ایک
بک دست صناع اور ایک حاضر دماغ، نگراں شناس و تجربہ کار منتظم کی طرح ہر وقت اس کی نگرانی کر رہی ہے۔
طرح شبلی نے اپنی عظمت کے زور سے دو چیزیں تخلیق کیں۔ ایک شاگرد اور دوسری کتابیں اور دونوں جاندار۔

شاعروں کو چھوڑ بھی دیں تو دنیا میں ایسے کتنے ہیں جو اپنی زندگی کے حالات کے اظہار میں نصیب پر راضی اور حال
ہوں دکھائی دیں۔ شبلی تو فطرتاً شاعر تھے۔ ان کی شاعرانہ جولانیوں کو نظر انداز بھی کر دیں تو انہیں اپنی بدنصیبی
ادی اور مقاصد حیات میں ناکامی کا شدید سے احساس تھا اور شدید تھا۔ اس کی وجوہات بھی تھیں۔ ماں کی موت
سے ان پیچیدگیوں کا آغاز ہوا۔ معمولی گھرانے کا فرد کچھ تو نئی ماں کی نئی سیاست کے باعث اور زیادہ تر خود دارو
ال بلکہ ضدی طبیعت کی وجہ سے اپنے آلام میں خود ہی اضافہ کا موجب ہوا۔ ان کی طبیعت کی یہ افتاد زندگی
اور میدانوں میں بھی ان کے لئے مشکلات کا باعث بنتی رہی۔ مگر جیسا کہ خود انہیں اعتراف تھا کہ وہ اپنی طبیعت
سے مجبور تھے۔ بے وجہ خدا کی نعمتوں سے شاد کام ہونے والوں اور بے سبب سماج میں مال اور منزلت کے
وہ عزت و شہرت و اقتدار کے بلند ترین زینوں پر پہونچنے والوں پر انہوں نے کبھی رشک نہیں کیا بلکہ

ال اثر بھی معلوم ہوتا ہے ـــ جیسا کہ ان کی تحریریں گواہ ہیں ـــ کہ ان کی ضد میں پختگی، احساس خودداری میں اضافہ اور
سخ الاعتقادگی میں کمی ان حاصل ہونے لگا۔ اس سے جہاں ان کو بعض تکلیفیں پہونچیں اور زندگی میں بہت سے نشیب و فراز
ے خصوصاً کسب معیشت اور خانگی معاملات میں ـــ وہیں انکی علمی جد و جہد اور تحقیق پسندی کو بڑا فائدہ پہونچا۔ عامیانہ معتقدات
ں سے تنفر بڑھ گیا۔ معمولی دلائل و نکات پر رضامندی سے گریز کرنے لگے اور مخالفین کے دلائل و براہین سے کسی قسم کا سمجھوتہ
ملن ہو گیا۔ ظاہر ہے کہ محققانہ و عالمانہ شان کا بڑا حصہ اپنے نقطۂ نظر کی اہمیت کے احساس اور ان کے اصرار ہی سے مکمل ہوتا ہے
بلی کی ذات سے ثابت ہوتا ہے کہ زمانہ اور زندگی کی کوتہ دستیاں بعض اوقات عظمت کے ان محلوں میں کیسے نقش و نگار
ٹے اور کبھی ساری کے حسین نمونے بنا دیتی ہیں۔ یہی بات تھی کہ شبلی کے معاملے میں بھی ان کے حوادث، انکی ناکامیاں اور ایک
ب العینی زندگی سے ان کی دوری نے ان کے لوہے کو فولاد میں تبدیل کیا۔ ان کے آب نوشیوں کو تندیٔ صہبا عطا کی اور
ن کی بے تابیوں کو بجلی کا لباس پہنایا۔

مولانا کی زندگی کی نوعیت بھی قابل مطالعہ ہے۔ مگر عجیب بات یہ ہے کہ وہ اپنے ہر جذبے اور ہر خیال کو گھٹے بندھے طریقے
ے نہیں بلکہ بالکل واضح اور بے ریا طریقہ سے لکھ جاتے ہیں۔ اگر یہ خطوط نہ چھپ سکتے تو اردو زبان طرز ادا، جذبات نگاری
ر صداقت و خلوص کے ایک اہم دستاویز سے محروم رہ جاتی اور ساتھ ہی شبلی جیسے عالم کی زندگی واضح طور پر ہمارے سامنے نہ
سکتی۔ جہاں مولویوں کو ان کی بے عقلی اور تعصب و ضد پر لعن طعن کیا ہے۔ وہیں بعض اوقات کسی کو اس لئے مولوی کی شکل
ے رہنے کی ترغیب دی ہے کہ اس سے بڑے فائدے حاصل ہوتے ہیں اسی طرح ابتداءً پردے کے سخت [illegible] میں رہے
ایک خاص ماحول کے اثرات کے تحت وہ روایاتی پردے کے مخالفین میں شامل ہو گئے۔ جب آزاد خیالی آئی اور عورتوں کی سماجی
ثیت بدل دینے کے خیالات پیدا ہوئے تو اس وقت بھی ندوہ کے بعض معاملات میں عورتوں کی شرکت پر اس لئے راضی
سکے کہ مولویوں اور کم خیال لوگوں کی وجہ سے ایسے جری اقدامات بعض مفید تحریکوں کو فوراً برباد کر دیں گے۔ غرض موقعہ
سی اور مصلحت بینی نے بعض اوقات شبلی جیسے اکمل کمرے انسان کو بھی پابہ زنجیر کیا مگر ایسے امور ان کی زندگی میں
آئے اور وہ بھی خاص حالات اور خاص اشخاص کی وجہ سے آئے۔

انکی زندگی کا ایک نسبتاً دلچسپ پہلو ان کے ان خطوط سے ظاہر ہوتا ہے جو انہوں نے بمبئی کی دو دوست خواتین عطیہ
اور زہرا بیگم کے نام لکھے۔ ان خطوط کے باعث بعض ادبی رومان پسندوں کو مسالہ ہاتھ آ گیا۔ اس سلسلہ میں بعض
تابیں لکھی گئیں اور رسائل میں کئی مضامین لکھے گئے جن میں شبلی کی حیات معاشقہ ترتیب دی گئی۔ مختلف طبیعتوں
نے ان کی زندگی کے اس دور سے مختلف نتیجے نکالے۔ داستانیں بنیں ان میں گل کاریاں کی گئیں۔ رنگ و بو
سے انہیں مالا مال کیا گیا۔ اس باب میں اس کے سوا اور کیا کہا جا سکتا ہے کہ شبلی کی یہ آخری بدنصیبی تھی جس کے
ترسے وہ مرنے کے بعد بھی نہ بچ سکے۔

جیسا کہ ابھی کہا گیا ہے شبلی فطری شاعر تھے۔ لکھنؤ کی زوال پذیر معاشرت میں ان کا بچپن اور ابتدائی شباب گزرا
ں دور سے کئی رنگینی کی بہت سی خصوصیات اور روایتیں انہوں نے حاصل کر لیں جو عمر کے آخری حصے تک
ن سے جدا نہ ہو سکیں۔ جب کبھی علمی کاموں اور مذہبی امور میں منہمک رہتے یہ جذبہ دب جاتا لیکن پھر بیچ بیچ
ں ایسے ماحول نصیب ہوتے کہ جن میں یہ دبی چنگاریاں پھر سلگ اٹھتیں۔ حیدرآباد کا ماحول ملا ـــ واقع

اور امیر کی صحبتیں ملیں۔ پرانا ذوق نئے جوش سے نمودار ہوا۔ علی گڑھ میں یہ جذبہ بے چین رہا۔ ندوہ ملا پھر زاہد اور مولوی بن گئے اور اصل یہ ہے کہ ندوہ کے کاموں کی سنجیدگی اور وہاں کا ماحول کسی بڑے سے بڑے شاعر کو بھی توبہ کرنے پر مجبور کرتا جس پر شبلی مجبور تھے مگر اس سے ان کی فطری صلاحیتیں مٹ تو نہیں سکتی تھیں اور شبلی جب سازگار ماحول پاتے۔ ان صلاحیتوں کو زندہ کر لیتے تھے اس سے ان کی اس قدرت کا بھی پتہ چلتا ہے جو ان کو بیک وقت کئی معبودوں کی پرستش کرنے پر حاصل تھی۔ ان کے اس ملکہ کا اعلیٰ ترین ظہور اس وقت ہوا جبکہ انہیں بمبئی کا ماحول ملا۔ یہ مختصر دور ان کی شاعری اور ادبی نگارشات ——— دونوں اعتبار سے اتنا زریں ہے کہ اردو ادب کو اس دور کے مکاتیب نے ایک بیش قیمت عطیہ ورثہ میں دیا ہے!

وادیٔ گل کے مکاتیب سے حسن ظنی کے ماہروں کو بڑا مواد ہاتھ آیا۔ ہر ادب و سماج میں بڑی شخصیتوں کے بارے میں ایسا ہی کچھ ہوتا آیا ہے۔ سوانح نگاروں اور تنقید پسندوں کو بڑے آدمیوں کے دلچسپ واقعات محبوب مشاغل اور ننگ سے بچائے ہوئے شوخیٔ دل کے ان بیتے ہوئے لمحات کی تلاش ہوتی ہے جس میں پابندیٔ عقل کی گرفت ڈھیلی ہو۔ کہ وہ دنیا کو وہ دونوں تخیل کی زد میں آجاتے ہیں۔ یہی حال وادیٔ گل میں شبلی کا ہوا۔ اس شاعر نے ایسے خیال کاروں کی اڑان کے لئے اتفاق سے دو پر بھی مہیا کر دیے یعنی "بوئے گل" اور "دستۂ گل"!!

حالات خواہ کچھ ہوں ہمیں ان تحریروں میں شبلی کی اعلیٰ پایہ شاعرانہ صلاحیتوں کے علاوہ ان کے خلوص انتہا سادہ زیستی، خودداری، اپنی اہمیت کے احساس اور جذبۂ شوق عمل کی سچی تصویریں ملتی ہیں۔ وہ دوسروں کی خوبیوں کا اعتراف کرتے اور کھلے دل سے کرتے۔ اس کے کسی خیال، عیب یا نقص کی طرف اشارہ کرتے تو کوئی جھجک لگی لپٹی نہ رکھتے۔ مثلاً جہاں عطیہ بیگم کی بہت سی خوبیوں کا ذکر بار بار کیا ہے کہ انہیں مردانہ صلاحیتیں ہیں، بیدار کی ماہر ہیں، بہترین مقرر ہیں، عمدہ انشاء پرداز ہیں۔ عورتوں کی ترقی و فلاح کی علمبردار ہیں وغیرہ وغیرہ۔ وہیں موسیقی سے ناواقفیت پر ان کا مذاق اڑایا ہے۔ وہ تو سارے اہل بمبئی کو علم موسیقی سے ناواقف اور "محض جاہل" ہونے کا الزام دیتے ہے۔ ایک اور جگہ لکھا "تم شائد اس کو حسن طلب سمجھتی ہو اور میں شہنشاہ سے بھی اس قسم کا خیال ننگ سمجھتا ہوں" محاورہ اور روزمرہ کے غلط استعمال پر بار بار ٹوکا ہے بلکہ بے محل استعمال کو "خلاف تہذیب"، "رکیک" اور "بازاری" کے الفاظ سے یاد کیا ہے۔

فصل گل کے نتائج پہ ہمیں ان کی متنوع صلاحیتوں کو پیش نظر رکھکر غور کرنا ہے۔ یہ اتفاق ہے کہ ایک عمدہ شاعر، اکیڈ بڑا محقق، ماہر اسلامیات اور رہنمائے تعلیم بھی تھا۔ موخرالذکر صلاحیتوں کے حامل کو لوگ سمجھتے ہیں کہ وہ تقریباً فرشتہ؛ کم از کم عام انسانی جذبات اور تقاضوں سے خالی ہو، خشونت اور اکھڑ پن سے مملو ہو۔ لہذا شاعری کا میل اس کے ساتھ ان کی سمجھ میں نہیں آتا۔ اس میں نہ شبلی کا قصور ہے اور نہ لوگوں کا۔

شبلی نے وادیٔ گل کی رنگینی سے بساط بھر فائدہ اٹھایا۔ گلزار تخیل سے جی بھر کر گل چینی کی اور ادب کے دامن کو دامان باغبان و کف گلفروش بنا دیا۔ خلوص و بے ریائی کی حقیقی تصویریں پیش کیں۔ ہمت افزائی اور ترغیب کے اقوال کے انداز تماشے پر دو ٹکے مٹانے کے خاطر پیش کئے۔ نوشابہ دل [illegible] مرتب [illegible] گرد کتاب کو پاؤں سے

بلکہ ہاتھوں سے چھوٹنے نہ دیا۔ لکھا بھی کھایا بھی۔ پڑھا بھی ـــــ حسن کو دیکھ کر حسن معانی کی تفسیر کی! صورت کی آرائش و زیبائش کے لئے لازم کردار و سیرت کی تعمیر دی! دلوں کو صدق و صفائی اور نظروں کو ادب کی تنویر دی! غرض اس پورے سرمایہ کے مطالعے سے ہمیں شبلی کی عظمت میں کسی کمی کا پتہ نہیں چلتا۔ وہ اس چٹان کی طرح بلند تھے جس کے چھوٹے چھوٹے قدرتی گڑھے بھی اس لئے ہوئے ہیں کہ انہیں جمع شدہ پانی سے حسین پرندے اپنی پیاس بجھا سکیں! ـــــ وہ اس بلند و بالا درخت کی طرح تھے کہ جس پر اگنے والی پھپھوندی کی رنگا رنگی سے درخت کی اصلیت اور اہمیت میں فرق نہیں آتا بلکہ الٹا اس درخت کی عظمت سے عارضی طور پر ہی وہی پھپھوندی اپنے لئے ایک بلند مقام پیدا کر لیتی ہے اور اس درخت کے شیدا کبھی کبھی اس پر بھی نظر ڈال لیتے ہیں جس سے محض عظمت سے وابستگی کے باعث اسے بھی زندگی ملتی ہے لیکن حاصل شدہ مواد کی بنا پر حقیقت پسند جان لیتے ہیں کہ وہ جوہر جوان خطوں کے مخاطب نے شبلی سے حاصل کیا۔ اس غرض کے مقابل نہایت گراں قدر ہے جو اس نے شبلی کو دیا۔

پروفیسر رشید احمد صدیقی کا مراسلہ

بعض کرم فرما میری بعض تحریریں یا خطوط کو جو وقتاً فوقتاً ان کو یا کسی اور کو لکھے گئے، علیحدہ علیحدہ یا مجموعے کی شکل میں نیز میری سیرت و شخصیت و خدمات کو منظر عام پر لانے کی غرض سے اپنے گراں قدر اخبار یا رسالہ کے خاص نمبر شائع کرنا چاہتے۔ میں جہاں تک پتہ چل سکا ان عزیزوں کو نہایت ادب و اخلاص سے ممانعت و معذرت کے عریضے لکھ دیے کہ اس طرح کا اہتمام میری حیات ہی میں نہیں بلکہ اس کے بعد بھی نہ فرمائیں! انھوں نے میری درخواست قبول فرمائی اپنا ارادہ ملتوی کر دیا اور مجھے اپنا گرویدۂ احسان بنایا۔

علاوہ بریں کبھی میری یادگار منانے یا قائم کرنے کیلئے نہ کوئی عام چندہ کیا جائے نہ کوئی خاص عطیہ یک مشت کسی سے وصول کیا جائے۔ لیکن اس کا اندیشہ ہے کہ عام طور پر میری اس خواہش و گزارش کا علم دوسرے عزیزوں اور بزرگوں کو شاید نہ ہو اس لئے آپ کے مقبول عام اور کثیر الاشاعت اخبار یا رسالہ سے اعانت کا خواستگار ہوں اور درخواست کرتا ہوں کہ متذکرہ صدر خطوط یا تحریریں کسی شکل میں نہ شائع فرمائی جائیں نہ کسی اور طرح محفوظ رکھی جائیں بلکہ بہ نظر احتیاط ان کو تلف فرما دیا جائے تاکہ آئندہ کبھی ان کی اشاعت کا امکان باقی نہ رہ جائے۔ اس کے ساتھ یہ بھی گزارش کروں گا۔ میری اس درخواست کو معرض بحث میں نہ لایا جائے۔

معمولی تبدیلی کے ساتھ جو ناگزیر یا نادانستہ تھی اس مضمون کا عریضہ میں نے دوسرے اخبارات و رسائل کو بھی بھیجا ہے۔ اصل مقصد صرف اتنا ہے کہ بیچ کے خطوط یا تحریریں جو میں نے دوسروں کو کسی موقع پر لکھی ہوں وہ کسی حال میں شائع نہ فرمائی جائیں۔ نہ میری زندگی نہ میرے مرنے کے بعد نہ کبھی خاص نمبر شائع کئے جائیں۔

امیدوار ہوں کہ ہندوستان اور پاکستان کے متعدد اخبارات و رسائل اس عریضے کو بجنسہ ورنہ اس کا خلاصہ شائع فرما کر ممنون فرمائیں گے۔

رشید الدین عالیؔ

سعید الدین

رشید الدین خاں نام اور عالیؔ تخلص ہے۔ آپ کے جد اعلیٰ بعہد اورنگ زیب عالمگیر کابل سے دہلی تشریف لائے۔ سلسلۂ نسب نواب محمد خاں بنگش غضنفر جنگ بانی ریاست فرخ آباد سے ملتا ہے۔ بتاریخ ۲۷ جمادی الثانی ۱۲۹۰ھ بروز پنجشنبہ بعد نماز مغرب حیدرآباد میں پیدا ہوئے۔ خوش رو، میانہ قد ہے اور جسم سڈول اور ورزشی تھا۔ حضرت مرزا سردار بیگ صاحب قبلہ قدس سرہ جب کبھی آپ کے والد مولوی غلام محی الدین خاں سرہدی سے جو آپ کے مرید تھے، ملنے کے لئے تشریف لاتے تو پیار سے آپ کو "گودڑ" پکارا کرتے تھے۔ ابتدائی تعلیم گھر ہی پر اپنے والد سے حاصل کی بعد ازاں اپنے بہنوئی مولوی محمد عباس علی خاں بحرالعلوم کے سامنے زانوئے تلمذ تہ کیا اور فارسی و عربی کی اچھی استعداد بہم پہنچائی۔ خطاطی میں محمد قدرت اللہ دہلوی انتخاب رقم کی شاگردی اختیار کی۔ منشی میر امداد علی علویؔ، خلیفہ حضرت مرزا سردار بیگ صاحب قبلہ رحمۃ اللہ علیہ کے ہاتھ پر بیعت کی اور پنڈت سورج بھان ہیکشؔ متوطن تھانہ بھون سے اصلاح سخن کے لئے رجوع کیا۔ منشی محمد مومن علی صاحب امینؔ، ابوالمعانی سید منتجب الدین خمارؔ، عبد الرحمن میخوارؔ، منشی غوث خاں بیدارؔ، منشی غلام حسین خاں دردؔ، رضی الدین حسن کیفیؔ، حبیب الدین صفیرؔ، نواب وحید الدین خاں عادلؔ، ارشد تلامذۂ ہیکشؔ کا بہت ساتھ رہا۔ "بزم رندان" "شور عاشقان" "میکدۂ ہیکشؔ" کے ان ہی نے گلدستوں کی مسلک نئے ناب کا نام تھا۔

آپ کی شخصیت کا اندازہ آپ کی نجی زندگی کے حالات سے ہو سکتا ہے۔ آپ نہایت ہی مخیر، بہت ہی منکسر المزاج، حلیم و بردبار، خلیق و ملنسار تھے اور ہر اس شخص کی جو آپ کے پاس خود یا کسی کے توسط سے پہنچ جاتا، دامے، درمے، قدمے، سخنے مدد کرنے کے لئے آمادہ ہو جاتے۔ آپ بہت ہی سیر چشم واقع ہوئے تھے۔ کاچی گوڑہ اسٹیشن کی نواح میں سو ایکڑ اراضی نہایت ہی کم شرح پر پٹہ پر دی جا رہی تھی لیکن آپ نے اس جھنجھٹ میں پڑنے سے انکار کر دیا۔ نماز و روزہ کے سخت پابند تھے علی الصبح بیدار ہوتے، اور وظائف سے فارغ ہونے کے بعد اپنا کام خود اپنے ہاتھ سے کر لیتے۔ بہت ہی رقیق القلب تھے۔ بچے ہوں یا جوان کسی کی تکلیف ذرا بھی ان سے سہی نہیں جاتی تھی۔ دکھ درد میں ان سے زیادہ بے چین کوئی اور نہیں ہوتا تھا۔ فوراً ڈاکٹر کے پاس پہنچ جاتے، دوا لاتے، دیتا وقتیکہ خود اپنے ہاتھ سے انھیں پلا نہ لیتے انھیں اطمینان خاطر حاصل نہ ہوتا تھا۔ وضع کے بڑے پابند تھے۔ سلام میں پیشقدمی کرتے، اور جن اعزا و کرم فرماؤں سے ملنے کے دن مقرر کر رکھے تھے۔ ان میں کوئی فرق نہ آتا۔ عید کی ملاقات بازدید تو آپ نے خود پر لازم کر رکھی تھی۔ کسی چیز کے عادی نہ تھے۔ حقہ، سگریٹ کو انہوں نے عمر بھر ہاتھ نہ لگایا۔ البتہ کھانا کھانے کے بعد پان ضرور کھا لیتے تھے۔ موسیقی سے لگاؤ تھا لیکن نہ اتنا کہ اسی کے لئے وقف ہو جاتے۔ وہ ستار بجانا جانتے تھے، لیکن اب اس کی مشق باقی نہیں رہی تھی۔

مرزا عزیز احمد بیگ صاحب مرحوم تعلقدار اطراف بلدہ ان کے خسر اور حکیم مرزا بشیر احمد بیگ صاحب عابدی منصف داماد نواب شہید ملک ماموں خسر تھے، ان ہی حضرات کے ایماء پر آپ نے بتاریخ ۲۰ فبروری ۱۳۰۹ف بدفتر مجلس وضع قوانین و مشیر قانونی سرکار عالی آتا ملازمت اختیار کی

موسوم بہ جائیداد خوشنویسی چشتی حضرت آصف جاہ سابع زریعہ فرمان مبارک م ۲۳ ربیع الثانی ۱۳۳۱ھ آپ کا تبدل عمل میں آیا اور ۲۵ محرم ۱۳۳۳ھ مدد معاش سے شہزادہ نواب اعظم جاہ بہادر اور شاہزادہ نواب معظم جاہ بہادر کو فن خطاطی کی تعلیم دینے کے لئے مامور کئے گئے۔ حسب الحکم شاہ زکا علیہ صدقہ۔ اور رجب ۱۳۳۵ھ م ۱۹ رہ شتہ میز خانہ مبارک سے دوپہر کا خاصہ اور شام کی چائے جاری کی گئی اور بگھی خانہ سے تانگہ مقرر کیا گیا۔ انتقال سے ایک مہینہ پہلے موقوف فرمائی گئی تھی۔

چشتی مبارک میں دستار اور انگرکھا میں ملبوس گھنٹوں ایک زانو بیٹھے کلام شاہانہ ایام کو خوش خط لکھا کرتے تھے۔ بعض اوقات میں بھی یاد ہو جاتی تھی۔ آپ نے کبھی کوئی رخصت نہیں لی۔ پہلے میں تو جمعہ کو بھی چھٹی نہیں ملتی تھی اور عیدین پر حاضری ضروری تھی۔ آپ نے عمر و کیواں حشم کے کئی دیوان خوش خط لکھے اور جب دیوان ختم ہوتے پر آپ کو نوازا گیا۔ یا تو آپ کی تنخواہ میں اضافہ فرمایا گیا، یا کمخواب اور جامہ وار کے قیمتی تھان سرفراز کئے گئے یا طلائی گھڑی، نیکلس سگریٹ کیس اور اسی قبیل کی دیگر اشیاء مرحمت ہوئیں یا نقد روپیوں کی تھیلیاں عطا فرمائی گئیں۔ شاہ جم جاہ کی نوازشات آپ کے حال پر اس قدر تھیں کہ ۱۹۱۸ء میں جب یہ مرض نمونیا میں مبتلا ہوئے تو ڈاکٹر مظفر حسین صاحب اسٹاف سرجن کو علاج کے لئے مقرر فرمایا گیا۔ جب ہائیڈروسیل (Hydrocele) کی تکلیف بڑھ گئی تو ڈاکٹر عبدالحسین صاحب المخاطب بہ نواب اسلم یار جنگ کو حکم دیا گیا، اور آپ نے مکان پر آپریشن فرمایا اور بہ زمانہ الملہاق مولوی عبدالعزیز صاحب آپ کی آنکھ کے آپریشن کے لئے ڈاکٹر متھرا داس کا انتخاب فرمایا گیا۔ آپ نے اپنے کمالات کا ایک مرقع جو نستعلیق، خط ثلث، خط یاقوت اور خط نسخ پر مشتمل ہے اور جو طلائی نقش و نگار سے آراستہ ہے۔ حضور پرنور کی بارگاہ عالی میں نذر گذرانا، اور تسبیح و وصلیاں جو سرکار کے کلام سے مزین ہیں نفاست پسند شائقین اور بیگموں میں بہ خط جلی اور خفی سرکار کے اس ارشاد پر کہ ان کو انگلستان بھجوا کر مطلا و مذہب منقش مجلد کیا جائیگا تیار فرمائیں لیکن یہ ابھی تک آپ ہی کی نشست میں مقفل ہیں اور اندیشہ ہے کہ خطاطی کے یہ گراں بہا نمونے نذر دیمک نہ ہو جائیں۔ آپ نے چالیس سال سے زیادہ نذری باغ میں حضرت آصف جاہ سابع اور خانوادۂ آصفی کی بے لوث خدمت انجام دی اور بعمر ۷۷ سال بتاریخ ۱۳ جمادی الثانی ۱۳۷۵ھ بروز دوشنبہ بوقت گیارہ ساعت شب حرکت قلب یکدم بند ہو جانے سے اس دار فانی سے کوچ فرمایا۔ اور صحن مسجد ٹھکی جیل سے ملحقہ قبرستان میں اپنے خسر کے پائیں سپرد خاک کئے گئے۔

اردو ہفتہ وار شیراز جلد ۱۰، شمارہ ۴۴ مورخہ ۲۱ فروری ۱۹۵۶ء میں نثر دکن نے آپ کی خدمات کو سراہتے ہوئے رنج و غم کا اظہار فرمایا

"افسوس ہے کہ دفعتاً بلاکسی بیماری کے یہ ۱۳ فروری ۱۹۵۶ء کی شب میں ہارٹ فیول سے گذر گئے۔ یہ ربع صدی سے زائد یہی خدمت کیا کرتے تھے یعنی مختلف النوع کلام کو لکھا کرتے تھے یا صاف کرتے تھے۔ خط نستعلیق بھی ان کا اچھا تھا۔ اور وفاداروں میں شامل تھے طبیعت خاموش تھی، یعنی بجز اپنے کام کے دوسروں کے معاملات سے خود کو علحدہ رکھا تھا ——"

دامودر پرشاد ذکی ٹھاکور نے تاریخ وفات کہی :——

رشید الدین خاں خطاط شاہی ✿ بسوئے خلد شد امروز راہی
ذکی سالش بہ ہجری گفت آنگہ ✿ بہ ششم، سیم روز دوشنبہ
۱۳۷۵ھ

—— دیگر ——

چہ ایک جور چرخ کہن رونما ہوا ✿ ملک دکن کا ماہر فن ایک چل بسا
سن کر کہا ذکی نے یہ جانکاہ واقعہ ✿ کیا سال تھا کہ آہ گیا خوش نویس شاہ
۱۳۷۵ھ

مولانا خواجہ محمد اسمٰعیل صاحب فرزند تیغ گڈھ بی نے آپ کو یوں خراج عقیدت پیش کیا ہے۔

وہ رشید الدین خان عالیؔ طریقت انتساب — مومن پاکیزہ سیرت رہبر و راہِ صواب
خامۂ قدرت رقم تھا جن کا آپ اپنی نظیر — آسمانِ فن خطاطی کے تھے جو آفتاب
نقطہ نقطہ تھا سوادِ دیدۂ بینش کا نور — ہر کشش جن کے قلم کی کہکشاں خط الاجواب
دارِ فانی سے ترقی دے کے قدرت لے گئی — کر لیا فردوس کی طغرہ کشی پر انتخاب
روحِ عالیؔ نے ادھر پرواز کی سوئے وطن — کھل گئے ابواب جنت اس طرف بے احتساب
بخششِ الطافِ حق نے دی نوید مغفرت — یوں ہوئے وہ داخلِ جنت با عز و از رخصت
خیر مقدم کو بڑھی رحمت لئے حوروں کو ساتھ — غلغلہ تھا آ گئے واپس وطن "غفران مآب"

مرحوم نے طبع موزوں اور ذہن رسا پایا تھا۔ چنانچہ آپ نے ہر صنف سخن میں طبع آزمائی کی ہے۔ کلام کا بیشتر حصہ ضائع ہو گیا ہے لیکن پھر بھی جو موجود ہے وہ چار قصائد پچاس غزلیات اردو، سولہ غزلیات فارسی، تریسٹھ رباعیات اردو، دس رباعیات فارسی، بیس قطعات تاریخی، دو نعتیں بزبان فارسی دو بزبان اردو، بہت نظمیں، سات تہنیت نامے، پندرہ مرثیے نظمیں، دو تسبیح سے درود و سلام پر مشتمل ہے۔ اس کے علاوہ رابرٹ براؤننگ کی مشہور نظم "ربیع بن عذرا" کا جو ترجمہ مولوی ... احمد صاحب نے فرمایا تھا اس کے سترہ بند کو منظوم بھی کیا تھا۔ یہ کام ابھی جاری تھا لیکن حیات نے وفا نہ کی اور یہ ناتمام رہ گیا۔ برجستگی، معاملہ بندی، دلکشی و رنگینی، جوشِ بیان، لطافتِ معانی، زبان کی سادگی اور پرکاری کی کلام میں بیشتر مثالیں ملتی ہیں۔ مادۂ تاریخ کے نکالنے میں خاص ملکہ حاصل تھا۔ خسروِ دکن کے الطافِ شاہانہ ہمیشہ مرحوم کے شریکِ حال رہے پیہم نمک اور جذبۂ وفاداری اس امر کا متقاضی تھا کہ جو بات دل میں ہو احساس کا اظہار زبان سے بھی ہو جائے۔

تھا خسرو کے لئے کچھ کم نہیں یہ نسبتِ عالیؔ — رشید الدین بھی اک تھا نہ زادِ ظلِ سبحانی
شہنشاہی مبارک ہو عثمان علی خاں کو — تجھے عالیؔ گدائی آستانِ عثماں مبارک ہو
نقدِ جانِ خویش کن عالیؔ بہ ستی نذرِ شہ — چوں شرابِ زندگی در ساغرِ تیزی رواست
دلم را بس بود شغلِ ایاز این نسبت عالیؔ — کہ بابِ او بہ غلامی یارگاہ تا ابد چشمی است

سرکار کی ذات پر بڑا ہی ناز تھا کس فخر و شان اور انداز سے کہتے ہیں ___

... ہم در آصف ... بیٹھے ہیں ... آج ... ہمیں کیا ... بیٹھے ہیں

عقیدت کیشی کا یہ عالم تھا کہ ہر سال گرہ پر ایک ... تہنیت نامہ پیش کرتے ... نذر ... اس میں فصاحت بھی ہوتی اور نظمیں بھی۔ چند شعر ملاحظہ ہوں۔

یہ دربارِ شہنشاہی یہ جشنِ آصفی عالی — ... بارگاہِ ... عالم مبارک ہو
... شمشیرِ تیغ و نصرتِ باری — ... تاج ... مبارک ہو
تجلی ... عالیؔ — جہاں میں ... ہو
کچھ ایسا ورد ہے نامِ عثمان — زبان خالی نہیں رہتی دعا سے
نہ رکھو حاجت کسی اور سے عالیؔ — خدا سے مانگ یا آقا خدا سے

نثر حساد قرباں چوں جواہر پارہا ہر دم
بہ تیغ آصفی سرمایۂ جوہر چنیں باشد

رحیق سلطنت در جام عثماں انا زل پر شد
نہ ہے بخشتے کہ لطف ساقی کوثر چنیں باشد

بہ جلالش چہ سلاطین سلف را نسبت
سطوت شاہ ما از قیصر و کسریٰ بیش است

چوں دکن بذل و عطا ہست کجا اے عالی
آنچہ ہست از کرم و جود ہمیں جا بیش است

فیروز بخت چوں شہ عثماں دریں جہاں
عالی بگو بروئے زمیں بادشاہ کیست

گرچہ شد شاہان عالی بیشتر اینجا دلے
شاہ چوں عثمان علی خاں کے دکن پیدا کند

ایک قصیدہ جس کی تشبیب اس شعر سے شروع ہوتی ہے ـــ

شاہ خاور آج کس جاہ و حشم سے ہے عیاں
سر پہ ہے اکلیل زر بر میں قبائے زعفراں

ایک سو بیس اشعار پر مشتمل ہے۔

نیر برج جلالت آفتاب عز و جاہ
والیٔ ملک دکن شاہنشہ کشورستاں

میر عثمان علی خاں ظل رب العالمین
آصف سابع نظام الملک سلطان جہاں

خسرو کیواں حشم جم جاہ اسکندر شکوہ
گوہر تاج فریدوں شاہ شاہان جہاں

گوہر کان عدالت لولوئے بحر کرم
تاج دار و صاحب چتر و مہر و مہر جہاں

دستگیر بے کساں و دردمنداں را دوا
حامیٔ زین متین و چارۂ بے چارگاں

کانپتے ہیں تیری صورت سے ہزبران نبرد
تو وہ ہے ضرغام دشت صف غزاں مکاں

تیری صورت کے مقابل میں ہے خورشید ہیچ
تیرے آگے ہے خموشاں ساز جا نرم مبہوتاں

مثل عثمان غنی تو بھی غنی الطبع ہے
ہے تری ذات مقدس شمع بزم قدسیاں

فارسی قصیدہ میں بالکل عراقی کا رنگ جھلکتا ہے ـــ

تو آں فلک حشم و مطلع شرف آئیں
کہ مہر اوج بساید بدرگہ تو جبیں

رسالت پائے تفاخر اگر نہی بہ فلک
سزد کہ جلوہ نمائی بہ مسند تمکیں

پرانہ بخت نکوئی تو بر سریر ناز دہ
پناہ عالمیاں آمری و حامی دیں

چکاں ز ابر فیوض تو رشحۂ الطاف
رواں ز قلزم بذل تو چشمۂ شیریں

صلاح کار تو ہم دوش شاہ خوبی
در نظام تو ہم سلک رشتۂ تحسین

عید کے موقع پر کہتے ہیں :ـــ

کیوں نہ عشرت خیز عالم ہو رخ تطہیر عید
ہے ترے دم سے تجلی جبۂ تقدیر عید

جلوہ آرا چشم عالم میں تیری صورت ہے یا
ہے ہم آغوش نظر پیکر تصویر عید

اسی مبارک و مسعود موقع پر پھر ایک دفعہ یوں نغمہ ریز ہیں ـــ

سایہ افگن ہے سر شاہ پہ چتر اقبال
گوہر تاج ہے زیب کلہ گردوں فر

زینت نور کو حاصل ہے بصد فرط خوشی
کشتیٔ بہمن میں زر ہے مسرت لے کر

شاہزادہ اعظم جاہ کے جشن عقد کے موقع پر مبارک باد پیش کی ہے:

بہار عطر بیز سرزمین ہیں ہو دلکش   گل نورستہ گل زار ترکستان مبارک ہو
رہیں شاداں قرین شہوار اعظم جاہ اے عالی   یہ بزم شادمانی یہ سروسامان مبارک ہو

شاہزادہ معظم جاہ بہادر کی خدمت میں یوں عرض کیا ہے۔

نصیب چشم ہو نظارۂ رخ تاباں   لقائے چہرۂ بدرالدجیٰ مبارک ہو
کہا یہ مصرع تاریخ عقد عالی نے   عروس نیلوفر دل کشا مبارک ہو

نواب مکرم جاہ بہادر کی ولادت باسعادت کے موقع پر آپ یوں گل افشاں ہیں:۔

چراغ دودماں ہے یہ فروغ خانداں ہے یہ   برنگ لولو لالا بشکل گوہر یکتا
ہو اس کے زیر فرماں شرق سے تا غرب کل عالم   سکندر بخت ہو اس طرح ذی اقبال ہو ایسا
حیات خضر رب العالمین اس کو عطا فرما   رہے اپنے پدر کا اس کے سر پر تا ابد سایا
ہمیشہ اس کو شادی و طرب حاصل رہے یارب   بہ تحسین یوم میلاد النبی و لیلۃ الاسریٰ
کہا عالی نے برجستہ ہمایوں سال پیدائش   مبارک ہو سلیمان جاہ اعظم جاہ کو بیٹا
۱۹۳۳

حضور سرور کائنات سیدنا حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات اقدس سے نسبت یوں رطب اللسان ہیں

(۱) ——— ہمہ دیوانۂ حسنت چہ مہر و چہ جن و انس   تو آن نامی لقب شمس الضحیٰ بدرالدجیٰ داری
چہ نسبت با تو اے نور مجسم ماہ کنعاں را   جمال حسنے کہ یوسف داشت تو سر تا پا داری
فضائے حشر و برسر آفتاب و من جگر تشنہ   بدہ اے ساقی کوثر نبئ اطہر کجا داری
چہ ترسی و چہ نالی از ہجوم معصیت عالی   چو نسبت با غلامان محمد مصطفیٰ داری

(۲) ——— سر متشائے خدا ہیں مصطفیٰ   مظہر ارض و سما ہیں مصطفیٰ
تاج فرق اولیاء ہیں مصطفیٰ   شمع بزم انبیاء ہیں مصطفیٰ
کیوں گناہوں سے ہے عالی منفعل   شافع روز جزا ہیں مصطفیٰ

(۳) ——— آمد بنظر چوں رخ زیبائے محمد   خود گشت خدا والہ و شیدائے محمد
چوں خواہست کہ از کتم عدم خود بدر آید   حق بشد متجلی بہ سراپائے محمد
باشد بہ سرش در دو جہاں تاج فضیلت   آں کس کہ نہد سر بہ سر پائے محمد

(۴) ——— ظہور حق تعالیٰ ہے سراپائے محمد میں   نہ کیوں ہو سجدہ گاہ خلق نقش پا محمد کا
سمجھ میں کچھ نہیں آتا کوئی سمجھے تو کیا سمجھے   خدا کا ہے سراپا یا ہے سر تا پا محمد کا
نظر میں کچھ نہیں سکتا کوئی اب اور اے عالی   مری آنکھوں میں ہے پنہاں رخ زیبا محمد کا

امام ہمام عالی مقام سیدنا حضرت امام حسین علیہ السلام کی بارگاہ میں سلام عرض کیا ہے ———

ہزاروں زخم کھا کر کی نہ اُف تک سر دیا جس نے   شہید خنجر تسلیم کتنے ایسے ہوتے ہیں
ہے ثابت قدم جو امتحان حق میں خوش ہو کر   حسین ابن علی سبط پیمبر ایسے ہوتے ہیں

کربلا کی دشت میں سرسبز بخشا نقش — سپاہ ابن عاصی کے سر والیسے ہوتے ہیں

ترجیع بند میں آپ کی حیات جاوید کا ثبوت پیش کیا ہے

مانا کہ نہیں نے کبھی شبیر کو دیکھا — پھر بھی مری نظروں میں ہے حضرت کا سراپا
آنکھیں ہیں جنہیں دیکھتے ہیں شاہ کا جلوا — مردہ انھیں کیونکر کہوں زندہ ہیں وہ زیبا
کافر ہے جو منکر ہے حیات شہدا کا — ہم زندۂ جاوید کا ماتم نہیں کرتے
ہے آئینہ دہر میں شبیر کا نقشا — کیا دیکھیں گے وہ جن کی نگاہوں پہ ہے پردا
آئے تو کوئی دید کی ہو جس کو تمنا — ہم اس طرح دکھا دیں گے ابھی صورت زیبا
کافر ہے - - - - - - - - - - - - ماتم نہیں کرتے

حضرت مرزا سردار بیگ صاحب قبلہ جن کے عتبۂ عالیہ سے آپ کے والد اور آپ نے فیضان حاصل کیا تھا، ان کی خدمت میں آپ نے یوں نذر عقیدت پیش کی ہے ——

دیکھے گر نگہ چشم زلیخا سے اسے — پارۂ دامن یوسف ہے نقاب مرزا
مرجع جن و ملک عتبۂ تقدیس نژاد — غازۂ عالیان گرد تراب مرزا
راز مل بستہ ہے زخم جگر صد پارہ — داغ دل ہے مرا سرلوح کتاب مرزا
منفعل ہو نہ مرا نزع میں حضرت سے خیال — مت ڈالے ہوئے آئی ہے نقاب مرزا
سرخ رو ہی سے ملا درجۂ سرافرازی — میں وہ عاصی ہوں کہ ہوں خادم باب مرزا

اپنے پیر و مرشد حضرت منشی میر امداد علی صاحب علوی کی آستان بوسی آپ کا سرمایۂ حیات تھا۔ عرس فاتحہ خوانی کے لیے شعر فرمائے مبارک ہے جو امداد جاری ہوئی وہ آپ ہی کی کوششوں کی رہین منت ہے آپ کی بے پایاں گرویدگی اور عقیدت کیشی ملاحظہ ہو۔

ہے ان کی خاک قدم کحل دیدۂ عالم — نہ کیوں ہوں صدر نشین جہانیان علوی
بگڑی بن جاتی ہے ہر بات اپنی — ہے وہ عالم میں نظام علوی
میں سفلی تھا عالی بنایا ہے مجھ کو — زہے عظمت ذکر تطہیر علوی
پاس انفاس کا دل میں ہے جو ہر وقت خیال — ہر نفس سے مرے پیدا ہے سراسر علوی
کیا تعجب ہے جو ہو جاؤں میں عالی درجات — یاد علوی کی ہے مرے دل میں زبان پر علوی
نہ نکلے نزع میں حرف غلط منہ سے یہ حسرت ہے — زبان پر نقش عین و واؤ یا بیاد لام علوی ہو
کیوں نہ ہوں مرکز تصویر خیالی آنکھیں — نقطۂ مردم دیدہ ہے مدار علوی

تاج جاوید

قندِ بوسۂ شیریں لباں مکرّر ہو!

غالبؔ نے ایک جگہ کہا ہے ؎

گنجینۂ معنی کا طلسم اس کو سمجھیے جو لفظ کہ غالبؔ مرے اشعار میں آوے

جب کوئی لفظ غالبؔ کے اشعار میں آ کر گنجینۂ معنی کا طلسم بن جاتا ہے تو پھر اس پورے ایک مصرعہ کی عظمت کا اندازہ کیجیے جس
کی تکرار دیوانِ غالب میں ہو چکی ہے۔ میرا مراد اس مصرعہ سے ہے ؏

بلبل کے کاروبار پہ ہیں خندہ ہائے گل

یہ مصرعہ غالبؔ کی ایک غزل کے ایک شعر کا مصرعۂ اولیٰ ہے ؎

بلبل کے کاروبار پہ ہیں خندہ ہائے گل کہتے ہیں جس کو عشق خلل ہے دماغ کا

اور یہی مصرعہ ایک دوسری غزل کے مطلع کا مصرعۂ ثانی بن گیا ہے ؎

ہے کس قدر ہلاکِ فریبِ وفائے گل بلبل کے کاروبار پہ ہیں خندہ ہائے گل

میں سمجھتا ہوں کہ غالباً غالب کا یہی ایک مصرعہ ہے جسے غالبؔ نے تکرار کی عظمت بخشی ہے۔ آئیے دیکھیں کہ یہ مصرعہ کس شعر
میں اپنی پوری بہار دکھا رہا ہے؟

غالبؔ ہرگز ایسا شاعر نہیں ہے کہ چلتے چلتے "سر راہ سے" اس کے اشعار کے مطالب دریافت و بیان کئے جائیں۔ وہ
بہت مشکل پسند شاعر ہے۔ آلِ احمد سرور غالبؔ کی عظمت کا تعین کرتے ہوئے اسے اردو میں پہلی بھرپور اور رنگارنگ شخصیت قرار
دیتے ہیں۔ اور اسلوب احمد انصاری کا خیال تو یہ ہے کہ غالبؔ اردو شاعری میں ایک نادر منظر ہیں۔ اور خود غالبؔ کی زبان
سے یہ تعلّی بڑی پیاری لگتی ہے کہ ؎

کہتا ہوں اسدؔ سوزشِ دل سے سخن گرم تا رکھ نہ سکے کوئی مرے حرف پہ انگشت

میں نے جس مصرعہ کی تکرار کا ذکر کیا ہے وہ کوئی اعتراض کی بات نہیں اس لئے کہ اعتراض تو منفی رجحان اختیار کر جاتا ہے
میں تو اس تکرار کو قندِ بوسۂ شیریں لباں کی تکرار سمجھتا ہوں۔

غالبؔ کے دیوان پر جب نظر ڈالی جاتی ہے تو حسن و عشق کے مضمون کے تعلق سے سرسری طور پر جو داخلی تقسیم محسوس ہوتی ہے
حسن و عشق کی مشترکہ باتیں نہیں بلکہ ان کا علیحدہ علیحدہ وجود ہے۔ مثلاً یوں محسوس ہوتا ہے کہ غالبؔ کے نزدیک خوب صورتی و حسن کا
مفہوم "زلف تا بہ قدم" والی نہیں بلکہ صرف "چشم و نظر" کی بات ہے۔ اور جب اشعارِ غالبؔ میں مقامِ عشق تلاش کیا جائے
تو پتہ چلتا ہے کہ نوجوانی کے دور میں غالبؔ نے جو اشعار کہے ہیں ان میں عشق کا طلبی اور بدنی پہلو خاص نمایاں ہے۔ جوانی
کے جوشِ عشق نے غالبؔ کی شاعری کے دورِ اول میں بوس و کنار کے کیسے دلچسپ منظر پیدا کئے ہیں۔

اس لب سے مل ہی جائے گا بوسہ کبھی تو ہاں شوقِ فضول و جرأتِ رندانہ چاہیے

ساقیا دے ایک ہی ساغر میں سب کو کہ آج　　آرزوئے بوسۂ لب ہائے میگوں ہے مجھے

لیکن عشق کے اس خمار کو اضمحلال کی ترشی نے بہت کچھ اتار دیا اور جب رخشِ عمر نے ہاتھ سے باگ اور پا سے رکاب چھین لی تب غالب کے نزدیک عشق دماغ کا خلل اور بلبل کے کاروبار پہ خندہ ہائے گل بن گیا!

غزل کو لاکھ نیم وحشی صنفِ سخن کہہ لیا جائے لیکن بقول ممتاز حسن ایک غزل تاج محل نہ سہی قیمتی موتیوں کا ہار تو ہوتی ہے اور پھر غزل اچھی ہو اور غالب جیسے باکمال کی ہو تب تو گنجینۂ معنی کے جو طلسم کھلتے ہیں انھیں صرف محسوس کیا جا سکتا ہے۔

ڈاکٹر بجنوری کا خیال ہے کہ جس طرح ہر جان اپنا جسم خود ہمراہ لاتی ہے اسی طرح جہاں نیا خیال پیدا ہوتا ہے وہاں نیا لفظ خود بخود پیدا ہو جاتا ہے۔ لیکن میں سمجھتا ہوں کہ اساتذۂ سخن کے یہاں جہاں نئے خیالات کے دریچوں کو نئے الفاظ کی شیشہ گری نے سجایا اور سنوارا ہے۔ وہیں اپنے فن کے کمال کے اظہار کے لئے انہوں نے پرانے خیالات کو کچھ اس نئی اپج کے ساتھ پیش کیا کہ زبان سے صلِّ علیٰ نکلتے ہی بنی!

اور یہاں غالب نے تکرار کی لذت سے ایک ہی خیال کو ایک ہی انداز میں ایک ہی معنی و مفہوم کے ساتھ ایک ہی مصرعہ کے آغوش سے ہمکنار کر دیا ہے۔ فن ایک وہبی عطیہ ہو یا نہ ہو لیکن یہ ہنرمندی یقیناً کسبی ہنرمندی ہے

سب سے پہلے اس شعر کو سن لیجئے ؎

بلبل کے کاروبار پہ ہیں خندہ ہائے گل　　کہتے ہیں جس کو عشق خلل ہے دماغ کا

مراۃ الغالب میں بیخود دہلوی اس شعر کی شرح یوں قلمبند کرتے ہیں کہ دیوانے آدمی کی حرکات پر جس طرح عام آدمی ہنستے ہیں اسی طرح بلبل کے شوق و ذوق و شیفتگی پر پھول خندہ زن ہیں۔ اس سے ثابت ہوا کہ جس کو عشق کہتے ہیں وہ درحقیقت ایک قسم کا خلل دماغ ہے انسان نے غلطی سے خلل دماغ کا نام عشق رکھا ہے۔

نظم طباطبائی کی تشریح یوں ہے کہ بلبل کو خللِ دماغ سمجھ کر گل اس پر ہنستے ہیں۔ کار و بار سے مراد اس کے حرکات ہیں۔ لفظ "حالِ زار" کو چھوڑ کر "کاروبار" اس وجہ سے کہا کہ "کار" بہ معنی زراعت و "بار" بہ معنی ثمر بھی ہے اور یہ گل کے ساتھ مناسبت رکھتے ہیں۔ پھر یہ مطلع ہے ؎

ہے کس قدر ہلاکِ فریبِ ہوائے گل　　بلبل کے کاروبار پہ ہیں خندہ ہائے گل

نظم طباطبائی "شرح دیوان اردوئے غالب" میں لکھتے ہیں کہ بلبل اس دھوکے میں مری جاتی ہے کہ رنگِ گل میں وفا و ثبات ہے۔ اس کی اس ناسمجھی پر پھول ہنس رہے ہیں اور علامہ بیخود فرماتے ہیں کہ بلبل اس فریب و دھوکے میں اپنی جان دے دیتی ہے کہ گل میں وفاداری کی صفت کو ثبات و قیام ہے۔ پھولوں کو دیکھو کہ وہ بلبل کی اس غلط فہمی پر خندہ زن ہیں۔ مطلب یہ کہ ہر عاشق کی نگاہ میں ہر معشوق ایک غیر فانی ہستی ہے۔

علامہ بیخود نے پہلے شعر کے دوسرے مصرعہ یعنی "کہتے ہیں جس کو عشق خلل ہے دماغ کا" کی بڑی داد دی ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ مصرعۂ ثانی کی بے ساختگی قابلِ مدح و ستائش ہے۔

لیکن میں سمجھتا ہوں کہ اس بے ساختگی نے ہی شعر کے معیار کو مجروح بھی کیا ہے۔ پہلا مصرعہ جس طمطراق کا متقاضی ہو سکتا ہے دوسرے مصرعہ سے اتنے ہی عامیانہ پن کا اظہار ہوتا ہے جسے بیخود دہلوی بے ساختگی پر محمول کرتے ہیں۔ ان دونوں اشعار کو بار بار پڑھنے سے مجھے تو یوں لگتا ہے کہ بہر نوع صورت یہی کہ بہ اعتبار صوری و معنوی فوقیت

دوسرے شعر کو ہی لینا چاہیئے جو غزل کا مطلع بن کر آیا ہے۔ یعنی ؎

ہے کس قدر ہلاکِ فریبِ وفائے گل
بلبل کے کاروبار پہ ہیں خندہ ہائے گل

پہلی وجہ تو یہ ہے کہ مطلع ہونے کی وجہ سے دونوں مصرعوں کے قوافی نے صوتی ہم آہنگی پیدا کر دی ہے جو کانوں کو بہت بھلی لگتی ہے۔ دوسرے یہ کہ بلبل کے کاروبار پر پھولوں کو جو ہنسی آجاتی ہے اس سے عشق کو دماغ کا خلل ثابت کیا جائے یا نہ کیا جائے لیکن بلبل کی غلط فہمی کتنی خوب صورت ہو جاتی ہے کہ وہ معشوق کو ایک غیر فانی ہستی سمجھنے لگتی ہے اور اسی خوش فہمی میں جان دیتی ہے کہ اس کے معشوق میں وفاداری کی صفت ثابت و قائم رہے گی۔ اور پھر یہ ہلاکت کتنی اندوہناک ہے کہ جس صفت کو عاشق نے قائم و دائم سمجھا، اس صفت سے متصف معشوق اپنے عاشق کی موت پر خندہ زن ہو جاتا ہے کہ ہائے بے چارے نے جان بھی دی تو کس غلط فہمی پر!

طیب انصاری

نصرتی اور حسن و عشق

نصرتی کی شاعری حسن و عشق کا دریائے تلاطم ہے۔ نصرتی کی شاعری گلوں کی مہک ہے بلبل کی چہک ہے حسن ہے حسن کی رنگینی گل صد رنگ اور عشق کی بے تابیاں ہیں۔ نصرتی کی شاعری ایک شعلہ ہے جو خرمن دل کو جلا کر خاکستر کر دیتا ہے نصرتی حسن کا پرور دگار اور عشق کا آشفتہ ہے۔ وہ جو بھی بات کہتا ہے۔ لذت دو آتشہ اگر کوئی چاہے تو وہ نصرتی کا کلام پڑھے اور سر دھنے۔ اس کیلئے بہت مشکل ہے کہ وہ داد نہ دے۔ نصرتی نے جس مقام پر جو بھی واقعہ لکھا ہے اس کی پوری تصویر آنکھوں کے سامنے اپنی تمام تر رعنائیوں کے ساتھ آجاتی ہے۔ یہی آرٹ کی خوبی اور فن کار کا کمال ہے۔ نصرتی اپنی فہم و فراست سے ہر رزم و بزم کو اس شان سے سنوارتا ہے کہ سننے والے پر کیف و سرور کی حالت طاری ہو جاتی ہے اور یہی اس کے فن کا اعجاز بھی ہے جب تک کلام میں یہ کرامت نہ ہو۔ سخنور کہلانا سزاوار نہیں۔ چنانچہ نصرتی خود کہتا ہے سے

کیا میں بچن بیل کوں یوں بڑی بدلی سو ملک کا چ منڈوا چڑی
چندر سور ستارے رہے دیکھ بھول مضامین و معناں کے مجھ پھل و پھول
یک یک قصہ بولیا ہوں جس ٹھار کا دکھایا ہوں مجلس وہ نظراں میں لا
سنوار یا ہوں کر فہم کی حاتمی ہر یک رزمیہ بزمیہ رستی
سنے پر یو خوش طرز مردانہ قال اہل شوق ہوئے شیر مرداں حال
سخن میں نہ ہوئے کرامت جلک کوانا نہ ہرگز سخنور ز ملک
کر یو شعر میں آج اس دھات سات کہیا سو بڑے وید کے نکات
کسی کا بی نا پلتے انپڑ نا گگر رکھیا ہوں یو طاق گردوں اوپر

اور واقعہ تو یہ ہے کہ اس نے اپنے اشعار کو طاق گردوں پر لیجا کر رکھا ہے جہاں کسی کی بھی رسائی ممکن نہیں ہے۔

نصرتی بیجاپور کی سلطنت سے وابستہ رہا۔ اور اس کا یہ تعلق کوئی نیا نہیں تھا۔ اس کے باپ دادا عرصہ دراز سے خاندان عادل شاہیہ سے وابستہ تھے اور اسی خاندان کے نمک خوار و وفادار رہے ہیں جس کا خود نصرتی کو بھی اعتراف تھا

کہ میں اصل میں ایک سپاہی اتھا فدا درگہ بادشاہی اتھا
مجھے تربیت کر توں ظاہر کیا حضور اس ہنر کا دے شاعر کیا
وگر نہ نہ تھا مجھ یہ کسب مال کتا ہوں اتا یو سخن حسب حال

علی نامہ جو اس کا سرکتہ الآرا منظوم تاریخی کارنامہ ہے۔ اس میں بالکل واضح طور پر کہہ دیا ہے۔ سے

اے شاہ رتن کا کمن ہرا مجھ من سو تیرا فیض ہے کچھ موروثی دھونی خفا کر مجھ یہ شاعری

نصرتی کا اصلی نام مولوی عبدالجبار نے اپنی کتاب تذکرہ شعرائے دکن میں محمد نصرت بتایا ہے: تاریخ پیدائش کا

سلسلے تو کوئی پتہ نہیں اور نہ ہی نصرتی نے خود لکھا ہے۔ البتہ اسی تذکرہ میں اس کی موت کی تاریخ ۱۰۹۵ھ لکھی ہے۔ حالانکہ نصرتی کا اورنگ زیب عالمگیر کے زمانہ میں بقید حیات رہنا اور ملک الشعراء ہند کا خطاب پانا تاریخی حقیقت ہے۔[1] اور اورنگ زیب نے ۱۰۹۷ھ میں بیجاپور فتح کیا تھا۔ اس طرح اس کی موت کی تاریخ کا بھی صحیح طور پر تعین نہیں کیا جا سکتا۔ چنانچہ مولوی عبدالحق مرحوم نے بھی اپنی تصنیف نصرتی میں اس کا کوئی ذکر نہیں کیا ہے۔

نصرتی سپاہی زادہ تھا اور شاعری کا خون ریزی سے کیا تعلق ہو سکتا تھا؟ لیکن اسے خدا کی شان کہیئے یا نصرتی کا کمال کہ جو آنکھیں خون کی بہتی ندیاں دیکھ کر بھی سیر نہ ہوتی تھیں چاند اور چاندنی کی راتوں سے لطف اندوز ہونے لگیں۔ حسن و جمال کی پگڈنڈیوں میں تلاش سکون جاری رہی تشنہ لبی کو جام و سبو نے سہارا دیا اور وہ مضبوط ہاتھ جو تلوار کو اٹھانے کے لئے بنائے گئے تھے قلم تھام لیے۔ لیکن یہ عجیب بات ہے کہ نصرتی کی فطرت بحیثیت سپاہی زادہ نہ بدلی۔ اس نے تلوار کے بجائے قلم کے ذریعے قتل عام کیا۔ تمام جواں سال جو مر تو نہیں سکے تڑپتے رہے کہ ان کا دل نشتر قلم سے چھد گیا تھا۔

بات رات کی ہو کہ دن کی حکایت، چاندنی کا سماں ہو کہ میدان جنگ کا لرزہ خیز واقعہ، وصل کی باتیں ہوں کہ فراق کی شکایتیں بہرحال کوئی بات ہو شعری لذتوں میں ڈوبی ہوئی کیف و سرور سے آراستہ اور حسن سے مرصع پائیں گے۔ اس کے خیالات میں ہوا کی سی تیزی، خلا کی سی وسعت اور طوفان خیز دریا کا تلاطم چھپا ہوا تھا۔ زبان شمشیر آبدار کی طرح چمکدار اور جدھر نکل گئی موشگافی کرتی نکل گئی۔ گو شاعری اس کو ورثہ میں تو نہ ملی تھی لیکن اسے اس نے اپنی میراث بنا لیا اور پھر یہ میراث اس کی زندگی کے ساتھ دفن ہو گئی یعنی جس طرح نصرتی کے آباء و اجداد میں کوئی شاعر نہ تھا۔ اسی طرح اس کے بعد کوئی شاعر نہ ہوا۔

میرے فن کے بن کوں عطا کر او آب — کہ ہر پھول ہوئے چشمۂ پر گلاب
ہر ایک پھول کوں دے تو اس دھات رنگ — کہ ہوئے ہر صبح دیکھ خورشید دنگ
خیالاں کوں مجھ بار کی اوج دے — طبیعت کوں دریا کی نت موج دے
میری جیب کوں سیف کر آبدار — عنایت کی رکھ دم سوں نت تیز دھار
کہ تک جس طرف آ بہے دو زباں — گذر جائے کر موشگافی وہاں

نصرتی کی شاعری اس کی دعاؤں کا نتیجہ تھی۔ اس کی شاعری میں وہ رنگ پیدا ہوا جسے دیکھ کر گلاب [illegible] ہو گیا۔ چمک دمک ایسی جس کی تاب ماہ و انجم بھی نہ لا سکے۔ اور واقعی اس کی شاعری شمشیر آبدار کی طرح چمکدار اور تیز تھی۔ شعر فصیح ہونے کے ساتھ اگر بلیغ ہو تو اس کے کیا کہنے لیکن نصرتی صرف بلاغت ہی کا قائل نہ تھا بلکہ کمال ندرت سے شعر کو زندہ جاوید بنانا چاہتا اور یہی تصور اس کی شعری کیفیات کا سرچشمہ ہے ؎

فصاحت ہے گو شعر کے بن کا روپ — ولے شعر کا جیو ہے مضمون انوپ
مزہ ہے تنا جیو دھوتا ہے جو — نہ بیجاں کی صورت کوں بتا ہے وہو
اچھے کاٹھ کا گر چہ پتلا سرنگ — نہ کام آدمی کے سکے کر اپنگ

یعنی اگرچہ فصاحت شعر کے چمن کا روپ ہے لیکن مضمون کی ندرت اس کی جان ہے جسم وہی مزہ ہے جس میں جان بھی ہے ورنہ بے جان کاٹھ کا پتلا چاہے کتنا ہی حسین و خوب صورت ہو کسی کام نہیں آ سکتا۔ چنانچہ یہی وجہ ہے مصرعہ "نصرتی شہید ہے" ۱۰۰۵ اس تاریخ شہادت ہے۔ ۱ھ

جب بھی وہ کسی مضمون کو شعر کے قالب میں ڈھالنا چاہتا ہے پہلے کافی جانچ پڑتال کر لیتا ہے۔

نظر میں میری جان دسیا کچھ بھی کام — سخن کی کیا دیکھ جھڑتی تمام

نصرتی کی شاعری میں جہاں حسن ہے وہیں حسن کی جلوہ گری بھی ہے۔ جہاں عشق ہے وہیں جنوں خیزیاں بھی ہیں اور جہاں بلاغت کا دامن تھام لیتا ہے وہیں ندرت فکر کے ذریعہ شعر میں جلا پیدا کر دیتا ہے۔ چنانچہ اس کی بہترین مثال مثنوی "گلشن عشق" ہے جس کی تعریف وہ خود یوں کرتا ہے ؎

یک رنگ پیالا ہے اس بن میں — جیسے گل ہے نزاکت کا نول اس فن میں

جن سیر کرے عشق کی گلشن میں — ہے طبع معطر نسے رنگین نظم

یوں تو نصرتی کی چار مشہور تصانیف ہیں (۱) "گلشن عشق" (۲) علی نامہ، (۳) تاریخ اسکندری (۴) متفرقات و قصائد لیکن جیسا کہ خود نصرتی نے لکھا ہے ؎

محبت کی پاپاس جب ٹھاؤں میں — رکھیا گلشن عشق کرناؤں میں

دھریا اس کی تاریخ یوں ہجرتی — مبارک ہو ہے معدیہ نصرتی ۱۰۶۸ھ

مثنوی کیا ہے ؟؟ شراب کا ابلتا دریا ہے شباب کی مستیاں ہیں۔ کیف و سرور کی انجمن آرائی ہے حسن کی بے تابیاں ہیں عشق کی جنوں خیزیاں ہیں۔ فراق کی ستم آرائی ہے وصل کی بے تابی ہے۔ چاند ہے چاند کی چاندنی ہے باغ و بہار ہے دریاؤں کا تلاطم ہے اضطراب و بے چینی ہے۔ کنور کی بے تابی و ذوق دید ہے۔ مدمالتی کی جلوہ آرائی ہے۔ خواب شیریں کی باتیں حقیقت کا پردہ مجاز میں نظر آتا وہ سب کچھ ہے جو دیدۂ بے تاب دیکھنے کو چاہتا ہے اور دل مضطر جاننے کے لئے تڑپتا ہے۔ ایسا لگتا ہے نصرتی کا تخیل حسن کا پروردہ ہے اور اس کا قلم امرت برساتا ہے۔ اور واقعہ تو یہ ہے کہ جب خضر ظلمات (دوات کی روشنائی) میں جائے تو امرت برسانے کیلئے ابر ہو کر آئے

کہ ظلمات میں اس جو یو خضر جائے — برسنے کوں امرت اچھال ہو کے آئے

عشق کیا ہے ؟؟ اگر واقعی یہ جاننے کے لئے بے تاب ہیں تو آئیے گلشن عشق کی میں سیر کراؤں جہاں عشق آہ ہے بے تابی ہے۔ یکتا شعلہ ہے جو خرمن دل کو جلا کر خاکستر کر دیتا ہے وہ ایک موج بلا ہے جو خس و خاشاک کو اپنے بہاؤ میں بہائے لے جاتا ہے۔ وہ ایک تڑپ ہے ہنگامہ ہے اور شمع حسن کا پروانہ ہے جو بار بار جلتا ہے اور تڑپ کر جان دیتا ہے کہ تڑپنا اور پھر مٹ جانا ہی اس کی زندگی اور یہی اس کا مقصود حیات بھی ہے اور شاید اسی وجہ سے وہ اعلیٰ وارفع بھی ہے کہ وہ دوسروں کو جلاتا نہیں خود جلتا ہے۔ دوسروں کو مارتا نہیں خود ہی مرتا ہے اور اس طرح مر کر بھی زندۂ جاوید ہو جاتا ہے۔ مگر شمع اس کے سوگ میں آنسو بہاتی ہے کہ وہ مر گیا۔ آہ ! بیچاری شمع ! ! اس راز حیات کو کیا سمجھے اور اگر وہ سمجھ بھی جاتی ہے تب پھڑ پھڑا کر جان دیتی ہے۔ اس کی صورت خاموشی سے اداسی اور حسرت ٹپکتی ہے۔ یوں پروانے مر کر بھی جان لیوا ہوتے ہیں۔

کہ نہار امرت کو شتر مست وہ عشق — دھر کاؤں سو مگ میں نت زندہ عشق

بقا کی جسے جگ میں ثابت ہی اچھے — اجل جس کے گھر کا سپاہی اچھے

اٹھے داغ میں جس کے مرہم سوں درد — اگن جوش انگے جس کے لگتی ہے سرد

سدا فکر نو سکھ ہو جس پاس اچھے — رکھتا نیر ہور آں جسے پاس اچھے
ولاں کا ہے اے عشق توں بادشاہ — جہاں ڈر ہے سو واچہ تجھ تخت گاہ
دیوا را بسکا تجھ سو سکا لا د سے — اندھارا ج تیرا اوجالا د سے
کیا سر خوشی جگ میں مشہور تو تجھ — نزا بات عالم کیا پور تو سچھ
ترا خار بہتر ہے گلزار ستے — ترا دو سے دیوانہ ہشیار تے
ولاں کو اگن کھیل تجھ تے ہوا — انجو نیں آبرتیل تجھ ستے ہوا
جلانا ہوس سوں مرادیاں ہے — سورج تجھ ہوا کا سوریا پان ہے
نمت کو تجھ شہر میں مقرر ہے — تیرے ملک میں صبر بے قدر ہے

عشق امت کیلئے سامان شرم و ندامت ہے کہ وہ انسان کو ام بنا دیتا ہے۔ عشق کی سلطنت میں بقا کی شہنشاہی ہے اور اجل اس کا پہریدار۔ دلوں کا یہی بادشاہ اندیشہ و خوف اس کا پایہ تخت ہے۔ دل کا اجالا کرب و گداز کا باعث اور شام رنگین کی حسین و خوب صورت تصورات میں رہتا بستا ہے۔ شب کی سیاہی میں امید و بیم کے چراغ جلا کر زندگی کو تابناک بنا دیتا ہے۔ عشق ایک نعمت ہے اور اس کی مثال اس سلطنت کی سی ہے جس میں انقلاب ہی انقلاب پلتے ہیں۔ صبر و قرار کی جگہ بے چینی اور بیقراری ہے۔ اور نصرتی اس سلطنت کا شہزادہ جو چاندنی سے حسن جہان کر اپنی شاعری کو روشن و تابناک بناتا ہے۔ وہ فراق کے اضطرار کو لے کر شعر کو مجسم حرکت بنا دیتا ہے۔ دریا کی روانی اس کے شعری بہاؤ میں بدرجۂ اتم موجود ہے۔ وصل کی سرمستیاں اور جوش محبت شعر کو اور بھی رنگین و جاودان بنا دیتے ہیں۔ رات اس کے یہاں بھیانک نہیں بلکہ روز روشن کی طرح منور اور حیات افروز ہے۔ چنانچہ وہ ایک چاندنی رات کی منظر نگاری یوں کرتا ہے ؎

ڈوباتی اودیلاب مغرب میں رخش — نکل آئی نس ہو مشرق فیض بخش
چندر پاک چھاتی تے دھو یا غبار — سورج کا ہوا آئینہ تابدار
دیے جلوہ خوش نس پتی کے حضور — کیا پردہ پردہ نشیاں تے دور
دیئے جوش پر نور سیلاب کا — ہوا تھا کوا چاند سیماب کا
گگن پر نہ ہر تھار تارا د سے — کٹورے سے بھر یا سپ اوپارا دسے
صفائی سوں چندنے کے چادر رخن — جھلکتی تھی ہوئی میں صاف ابرک متن
فلک اور زمین پورا تھے نور میں — چھپا تھا جتا جگ کا نور میں
نگر گم پہ چاند رمع کی سٹ — زمیں پر بچھائے تھے اجلا ٹکٹ

رات اپنا مشکی گھوڑا مغرب کے دریا میں ڈال فیض بخش بن کر نمودار ہوئی۔ پاک چاند نے اپنی چھاتی سے غبار دھویا اور چاند کا آئینہ (بدر) روشن ہوا۔ تاجدار شب کے حضور میں جلوہ دکھانے کے لئے سب پردہ نشینوں نے پردے اٹھا دیے۔ چاند گویا سیماب کا کنواں اور تارے پارہ بھرے کٹورے معلوم ہونے لگے۔ چاندنی ابرک کی طرح چمکدار، زمین و آسمان پر نور ایسا لگتا ہے گویا آسمان پر مرصع چادر تان دی گئی ہو اور زمین پر شفاف

چادر بچھی ہو۔
تاریخ اسکندری جو نصرتی کا آخری کلام ہے جسے اس نے ۱۰۸۳ھ میں قلم بند کیا تھا چاندنی کا سماں پیش کرتا ہے۔

چندر جب گگن کے کہتان تے ۔۔۔ حشم لے کے نکلیا بڑی شان تے

یعنی جب چاند آسمان کے کوہستان سے بڑی آب و تاب کے ساتھ نکلا تب ——

گیا کر سورج کو مغرب میں جان ۔۔۔ لگی مارنے تس شہاباں کے بان
دھواں جوت اگے دب نرالا ہوا ۔۔۔ اندھارے پو غالب اجالا ہوا
پڑیا چاند کے کاہ تے پرتو جمان ۔۔۔ ہوئی آرسی سب زمیں بے خلاف
گیا کلکلا نے زمین کا طبق ۔۔۔ ہوئے ہیں اکھنڈ جیوں رو پہرے ورق
سورج دیکھ مغرب میں چندنی کی چھاؤں ۔۔۔ گیا دیکھنے پھر لچھن تے پاؤں

سورج جب کوہ مغرب کی طرف جانے لگا تو رات شہابوں کے تیر مارنے لگی۔ دھواں چاند کی روشنی سے مغلوب ہو گیا۔ اس طرح اندھیرے پہ اجالا چھا گیا۔ ساری زمین آئینہ بن گئی۔ سورج چاندنی کا یہ سماں دیکھ کر دنگ رہ گیا اور اپنے قدم پیچھے ہٹا کر چاہا کہ چاند کے حسن و جمال سے لطف اندوز ہو۔ چاند سورج کی آنکھوں سے نکلتے ہوئے شراروں کی تاب نہ لا سکا۔ وہ شرما گیا اور اپنا منہ بادلوں کے اوٹ میں چھپا لیا۔ گویا اس طرح نصرتی نے صبح درخشاں کی آمد آمد کی خبر دی۔ چاند کے حسن کا سورج پر کیا اثر ہوا ہے۔

صفائی اگے مہ کے شرمندہ سور ۔۔۔ دسے روئے خوباں تے تس نرم نور

چاند کی رعنائی و حسن سے سورج بے حد متاثر ہوا کہ چاند کی پاکی روئے خوباں سے بھی زیادہ بھلی لگتی ہے

"ذکر معراج" میں نصرتی رات کے حسن کو کس انداز میں ظاہر کرتا ہے ملاحظہ فرمائیے۔

سمع کے کسوت سوں یک نس سنوار ۔۔۔ رکھے آرسی چاند کے بر مجھار
جگا جوت نا دیکھ تس ابر صن ۔۔۔ اندھیارے لیا موج سورج نین
جو خوش مکھ پہ زلفاں پریشاں کرے ۔۔۔ ہر یک سیام بادل کو گریاں کرے

رات نے زرق برق کا مرصع لباس پہنا اور چاند کا آئینہ لئے ہوئے جلوہ گر ہوئی۔ اس کروفر کو دیکھ کر اندھیرا گھبرا گیا اور اپنی آنکھیں بند کر لیں۔ رات اگر اپنے رخ جمال پر زلفوں کو پریشان کر دے تو یہ سماں دیکھ کر سیاہ بادل بھی شرما جائیں۔
نصرتی اللہ جل جلالہٗ کو ہی جمال کا پرتو سمجھتا ہے وہی حسن کا مخزن اور وہی جنون و عشق کا سرچشمہ بھی ہے۔ چنانچہ مثنوی "گلشن عشق" میں خدا کی حمد و ثنا ان الفاظ میں کرتا ہے ؎

صنعت اس کی قدرت کی اول سراؤں ۔۔۔ دھریا جس نے یو گلشن عشق ناؤں
کیا کر گرم عشق کا تس ابھال ۔۔۔ یو باغ آزینش کا پکڑیا جمال
عجب کوئی تون اے باغباں جہاں ۔۔۔ کہ صنعت میں تجھ چل سکے نا زباں
رنگا رنگ جیسے گل یو بن باس ہے ۔۔۔ ہو ہر گل میں تجھ عشق کی باس ہے

اپس حسن دکھلا ہر یک مظہر صور — ہر یک نیں پاڑیا ہے کئی نمط شور
کدھیں پاڑ خیریں سوں خسرو کو کام — کیا کوہ کن کوں وفا میں تمام
کدھیں نین لیلی کے لئی دل میں ہیں — پھریا ہو کے مجنوں گنوا بد کو نین
کنے پھول ایسے کھلایا ہے حور — ابھوں بن تس بلبلاں کا ہے شور
دیا عشق کو تو سچہ عزت کمال — تحیں ہے جمیل یحب الجمال
نظارے میں عارف نظر باز کوں — دسے ہر طرف تیری قدرت کا موں
زمیں کا توں قطعہ مصور کیا — فلک کا مقم توں انور کیا

اللہ ہی درحقیقت حسن کا دینے والا ہے اور وہی عشق کے چراغ دلوں میں روشن کرتا ہے۔ شیریں و فرہاد کی حیا یا لیلیٰ مجنوں کی داستان غم، یوسف و زلیخا کا فسانۂ رنگین اور پھر کنور و مدمالتی کی رومان انگیز کہانی ان سبھوں میں خدا ہی کی دی ہوئی چنگاری ہے جو کبھی آگ بن گئی اور پھر کہیں لپکتا ہوا شعلہ اس طرح دل جلتے رہے اور دھواں نکلتا رہا۔ اور اسی دھوئیں کے دھند لکے میں عقل چھپ گئی اور جنون دیوانہ وار کبھی کوہ کن بن کر پہاڑوں کے جگر کاٹنے لگا اور کبھی یہی جنوں دیک کی نذر ہونے لگا۔ کبھی وہ دامنِ پاک چھڑا کر بھاگنے لگا اور پھر کہیں نقشِ قدم کی تلاش شروع ہوئی۔ عشق و جنوں کیا ہیں خدا کی لگائی ہوئی آگ ہے جس طرح اللہ نے انسان کی نظر میں حسن دیا ہے اسی طرح کائنات کو بھی حسین بنا دیا ہے۔ وہی خالق کائنات جہاں رنگ و بو کا معمار ہے اور وہی مصور بھی ہے۔ ایقان نصرتی کو اس بات پر مجبور کر دیتا ہے کہ وہ حسنِ شعر اور شعری کیفیت کیلئے بارگاہ جمال و کمال میں ہاتھ پھیلا کر دعا مانگے۔

الٰہی تہیں جگ کوں داتار ہے — کرم مفض تجھ پہ سزاوار ہے
الٰہی میں اس جگ میں گمنام اتھا — اد ک سخنہ کاراں میں ات خام اتھا
عنایت کیا آسمانی سنے مجھے — بچن کی دیا زر فشانی سنے مجھے
ہر یک ذرہ بھی شاہاں کے لایق دیا — بہا نور تن تے بھی فایق دیا
میرا سینہ خالیچ یک گھن ہے ین — بھرے فیض تجھ یل میں کئی لک رتن
میرے من کا طوطی تو بے کام ہے — کرانا تو بات اس کرا الہام ہے
نہالاں خیالاں کے بن کے تمام — د کھو لہار رکھ تجھ ہوا میں مدام
رنگیلا یو ہر یک نزاکت کا پات — پیاریا جو ہے تیری رحمت کوں سات
ادھر آ ستے رحمت سوں کر پور توں — عطا کر سو نور علیٰ نور توں
دے ایسا سخن کے جہاں میں قلم — جو الہام کی فوج کا ہو شہ علم
دکھیا دو جو تجھ فیض تے جس خیال — کر اس شعر کو میں تحسہ حلال
ہر یک حرف میں کر دکھیا جام جم — معانی میں تس بھر مسیحا کا دم

نصرتی کے دل سے نکلی ہوئی دعا مستجاب ہوئی حسن و عشق کی باتیں الہام کے ذریعہ ان کے قلب پر مرتسم ہونے لگیں اور پھر وہی نقوش نوکِ قلم کے ذریعہ صفحۂ قرطاس پر بکھر گئے۔ قلم کی روانی جیسے گرتا ہوا آبشار ہے جس میں تیزی

بھی ہے تندی بھی ہے۔ بجلی کی چمک کے ساتھ حرارت بھی ہے جس کے ذریعہ ہزار ہا دل قمقموں کی طرح روشن ہو گئے۔ نصرتی کا شعر جام جم سے زیادہ شفاف ہے جس میں جہان حسن کی تمام رنگینیوں کو دیکھ سکتے ہیں اور یقیناً اس کے کلام میں مسیحائی کی قوت بھی پوشیدہ ہے جو اہل جنوں کو مریض نہیں بلکہ صحت مند بنا دیتا ہے۔ مایوس نہیں بلکہ ان کے آگے امید کے چراغ جلتے ہیں اس کے یہاں یاس کا کوئی پاس نہیں۔ وہ جہاں ہمت اور عزم کا قائل ہے وہیں اپنی کوہ کنی سے پر امید بھی ہے۔ واقعی اسکی شاعری سحر کی شاعری ہے جو دلوں کو مسخر کر لیتی ہے اور اس کا اثر دائمی ہوتا ہے۔ آپ نصرتی کے تخیل حسن و جمال کو دیکھئے اور پھر عشق کی جنوں خیزیوں کو محسوس کیجئے۔ میرا دعویٰ ہے کہ آپ حسن کے تصور ہی کو بھول سکتے ہیں اور نہ ہی عشق کی جلن سے چھٹکارا ممکن ہے۔ یہ بات اس وجہ سے بھی زیادہ اثر انگیز ہو جاتی ہے کہ نصرتی کا تصور حسن مانگے تانگے کا نہیں بلکہ وہ اپنے ماحول ہی میں تلاش حسن کرتا ہے وہ دکن کی راتوں کا کبھی تصور باندھتا ہے جہاں چاند اپنی تمام تر رعنائیوں کے ساتھ جلوہ گر ہوتا ہے اور کبھی موسم بہار سے لطف اندوز ہوتا ہے۔ چنانچہ اس تعلق سے چند اشعار درج ذیل ہیں۔

سورج آ جو بیت الشرف کے منجھار   دیا بھوئیں کوں جب خلعت نوبہار
کیا حسن پیدا زمانہ نوا   زمیں نوجواں ہو کے خوبی ہوا
دیا آبرو پھولبن کوں اچھال   گلاں سرخ رو ہو رہے بالے بال
لئے چھین گل گلعذاراں تے رنگ   لے آیا کلیاں دکھوں خوباں کے تنگ
ہنسے پھول ہو شوق کی گد گلی   رہی نازیں سکٹ تی کلی
جوانی میں سبزے نے آتا چلیا   مدن بان ریحان پاتا چلیا
ہر اک گل کے دیدے میں داٹیاں دن   ہر یک شاخ کوں پھل کے نکلے جوبن
ہوا زلف سنبل تے جل بے شکیب   لٹک سرو بار سے کون دیتا زیب
بھولا نے انکھیاں ماریاں کامن   دیا چک میں لالے نے سالا انجن
پکی ہر ہر یک گل پہ تیراندیسیا   ہر اک دل میں یک حال پیدا رسیا

نصرتی بہتی ہوئی نہروں کو مست خرام حسینوں سے تشبیہ دیتا ہے اور سیاہ پانی کے گول چشموں اور کنوؤں کو سرمگیں آنکھوں سے۔ واقعہ تو یہ ہے کہ منظر نگار سچائی کے قلم سے تصویر میں حقیقت کا رنگ بھرتا ہو تو کائنات اپنے حسن و جمال کے ساتھ اشعار کی شکل میں جلوہ گر ہو جاتی ہے اور انسان اس کے کلام کو پڑھتے ہوئے حسن زاروں کی سیر بھی کر لیتا ہے۔

آپ نے حسن کی رعنائی اور جلوہ گری تو دیکھی ہے۔ آئیے اب ذرا عشق کا تڑپنا اور بھڑکنا دیکھیں۔ نصرتی کی شاعری سراسر حسن و عشق کی شاعری ہے۔ اس کے یہاں حسن ہر دم جواں ہے اور وہیں عشق بھی رواں دواں ہے جلن عارضی نہیں دائمی ہے۔ سطحی نہیں عمیق و گہری ہے اور اس کی شاعری میں ہوس کا عمل دخل بھی نہیں بلکہ ذوق یقین کی نمود ہے۔ صداقت اور سچائی ہے۔ یہی عناصر اس کے سخن کی جان ہیں۔ وہ شاعر حقیقی انسانی جذبات و خواہشات کا صحیح عکاس ہے مجاز آپ کو اس بات کا اندازہ نہیں ہے کہ ایک گل اندام ہوش ربا حسین نازنین کو دیکھنے کے بعد نوجوان دل کی کیا حالت ہوتی ہے

جگا کر اپس کہ کی شمع کی تاب   ستم چھین لینا مرتی مجھتے خواب

اس حسینہ نے اپنا رخ فروزاں دکھلا کر اپنا زلفیہ بنا لیا اور پھر میری میٹھی نیند مجھ سے چھین کر تڑپنے کیلئے چھوڑ دیا۔ فراق کے غم

اور فراق کی راتیں کسی طرح کٹتی ہیں کوئی ستم گر کیا جانے ؟

نہ کس سات کہنا مجھے بات بھائے — نہ کوئی بات بولے تو بھا ہوش گنائے
دسے دیس تو تس اندھیاری مجھے — رین کالے دوزخ تھے کاری مجھے
انکھیاں کھولتا ہوں تو ایک پل نہ بھائے — اگر موں مجھتا ہوں تو یوں خوف آئے
کرمت پھر پڑے خواب نِندی سونگ — ملے پھر کے خون میں تن کے انگ
پڑیا آہ ماہی منن مجھ رھنا — گنوا تا زباں ہور نہ چک موں تپنا
نکل بھار جلنے ادساساں کی بھاپ — چلیا جل ادبل چک سوں اپس نے آپ
چندر مجھ اوپر زہر کا ہو ابیا نغ — دیوے ہر تارا مرے دل یہ داغ
دھن عشق کا سوز لا بار بار — میرے دل کوں کیتا ادک بے قرار

دن رات سے زیادہ بھیانک اور رات دوزخ کی طرح خوفناک بن جاتی ہے آنکھیں ایک لحظہ کیلئے بھی کھولنا گوارا نہیں اور اگر آنکھ بند کرلوں تو ڈر ہے وہی ظالم اپنے تمام حسن وجمال کے ساتھ کہیں نمودار نہ ہوجائے ۔ نیند کی تاب کہاں ؟ ہمیشہ میری آنکھ سے آنسو اور منھ سے آہیں نکلتی رہتی ہیں ۔ اس بیقراری و بے چینی میں دن گزرتے ہیں لیکن یہ کتنا سراسر زیادتی ہے کہ آگ اپنا ناچ صرف ایک ہی طرف دکھلاتی ہے ۔ دوسری طرف تو چنگاری بھی نہیں ہوتی کہ جلن محسوس ہو ۔ ایسا نہیں ہے ۔ خود محبوبہ ناز کے دل میں آگ کا کھیل دیکھنا ہو تو نصرتی کے ذیل کے اشعار پڑھیے ۔

ادک سوز لگ مجھ تڑپنا پڑے — اسی گھاٹ کے باج تپنا پڑے
تنگ زور سوں جھٹ اساساں کا تاؤ — دیوے جوش سوں دل کے دریا کو تاؤ
وجی تے ہو جب کھول دیکھی نین — ہوا تس اجالے سوں بے تاب من

منہ سے آہ نکال سکتی ہوں اور نہ ہی آنکھوں سے آنسو ۔ ہمیشہ تنہا اور غمزدہ رہتی ہوں ۔ کوئی ایسا نہیں جو میرے دل کے بوجھ کو بانٹ لے ۔ دن تو جوں توں سہیلیوں کے ساتھ گزر ہی جاتا ہے لیکن رات چھاتی پہ پہاڑ بن جاتی ہے ۔ کیسی جسم پر آگ معلوم ہوتا ہے اور پھول انگارے ۔ چاندنی گویا زہر کا پیالا ہے اور ہر ایک تارہ میرے دل پہ داغ ۔ نیا عالم ہوتا ہے سوزش دردوں سے تڑپتی ہوں اور عجب بات ہے کہ مجھے اس تڑپ و اضطرار کے بغیر چین بھی نہیں آتا ۔ محبوبہ کی وفاداری ملاحظہ فرمائیے ۔

پیا باج سنگار سام آسے نا — نہ کچھ جسم کا پیرا ین بھائے نا
زباں سے ہوے اس کو لا ہم سلام — نکالے نہ چک غیر کا کہہ تے نام
لگیا تھا کر اپنا سو تس تن کو تن — اپس جیا کوں کرتا تھی وسے چین
چوم لب کا امیخیہ اپن رنگ رس — تھکر ہوئے تھے امرت تے خوش ہوس
دھرے ہاتھ اپس اپنے سینے سوں لگ — کہ گلہار تھے وصل کے یار سنگ
بعد یک دوجی یاد کرتی تھی جین — نہ دیکھے بول رکتی ایک سے تے سو جاکر دن
دو جا دھیان تس دن اچھے لیت اچھے — نہ ایسے پی دیکھنا مال آپ سیتہ نہ پیچھے

نیا اور محبت کا یہ عالم ہے کہ کسی مرد سے بات کرنا تو کجا اس کی آواز بھی ناگوار ہے محبت کی فیر موجودگی میں دشگار ہو تو کس کیلئے ہو۔ میں ہمیشہ اسی کے تصور میں رہتی ہوں اور اس جگہ اپنا پاؤں رکھنا گوارا نہیں کرتی جہاں میرے محبوب کا سایہ پڑا تھا۔ میری دیوانگی کا یہ عالم ہے کہ میں خود اپنے ہی لبوں کو چوس لیتی ہوں کہ شب وصل کو ان ہی لبوں سے میرے محبوب کے لب مس ہوئے تھے۔ اپنے ان ہاتھوں کو سینہ سے لپٹا رکھتی ہوں کہ اسی دن یہی ہاتھ میرے محبوب کے گلے کا ہار تھے۔ مجھے اب دنیا کی چیز بھاتی نہیں سوائے خیال یار کے اور اسی خیال میں مست رہتی ہوں اور یوں فراق کے دن کٹتے ہیں

میں نہیں سمجھتا عشق کا یہ طوفان کسی اور کے دل میں اٹھا ہو۔ اور اگر کہیں اس کی بے تابیاں اور والہانہ پن ہو بھی یہ انداز بیان کہاں۔ نصرتی کی ان بے تابیوں سے ایسا لگتا ہے وہ بھی کسی نگاہ نیم باز کا گھائل تھا۔ ورنہ حقیقت نگاری کا یہ عالم اور قلم کی یہ جاں فشانی کہاں سے آتی۔ بلاشبہ اس نے اپنے کلام میں کہیں بھی اپنی محبوبہ کا ذکر نہیں کیا۔ لیکن عقل ماننے کیلئے تیار نہیں ہے کہ حسن و عشق کی تڑپ اس میں یونہی آ گئی۔ اگر اجازت دیں تو کہوں۔ اردو کے قدیم و جدید شعراء میں نصرتی اول و آخر ہے۔ یہ وقت کوئی تقابلی جائزہ کا نہیں لیکن یہ ضرور ہے کہ نصرتی اپنے زمانے کے مشہور دکنی شاعر قلی سے کہیں زیادہ رنگین بیان اور جذبات کا قتنا والہانہ پن اس کے یہاں موجود ہے وہ قلی کے کلام میں نہیں۔

حسن ہوا حسن کی رعنائی آپ نے دیکھی۔ عشق کی وارفتگی اور فراق کی کیفیت کا اندازہ بھی ہو گیا۔ اب وصل کی شب رنگین اور پر بہار لمحات کا بھی حال دیکھئے۔

طرب بخش مطرب میٹھے تان اچائیں
سو گیانی سجا گیان ہور گن سے گائیں

بتا کچھ بلندی : عمری خوش سید
دیکھیں جھاڑ پڑنے کو زہرہ لبید

لبید سحر کا حقہ بعد انبار
سید بہ کوں انسوں ہور لیجا نہار

ہر یک تھب میں دھرتیاں ہزاراں سوز سب
ہر یک فن میں کرتیاں ہزاراں فریب

تنک چینغ کھانے کی گت بھول گیا
سورج کے چھریاں کا بجتا مل رہیا

یوں تاز رنگ ہور رہیا کہنہ رنگ
ہوا کند تر تیرا گگن کا فرنگ

جب اس نے ساز چھیڑ دیا اور نغمہ جانفزا کی تانوں سے ساری فضا گونج اٹھی۔ نغمہ کے سرور و کیف کا یہ عالم تھا کہ زہرہ جبیں جھاڑ دیکھنے گئیں۔ اس کے لب نیلے اور آواز میں افسوں بھرا تھا عقل کام نہ کرتی تھی۔ ایک ایک ادائیں ہزاروں زیبائش اور ایک من میں خواہش۔ جب وہ ناچنے لگی تب ایسا لگتا ہی فضا میں رقص کر رہی ہے۔ اس پر روح پرور رقص کو دیکھ کر آفتاب گھومنا بھول گیا۔ ساکت اور مورشتہ رہ گیا۔ چاند کا منہ کھلا کا کھلا رہ گیا۔ اور اس کی چمکتی ہوئی روشنی ماند پڑ گئی۔ ایسے وقت دو دھڑکتے دل پر تڑپ و بے چینی کا زمانہ جاتا رہا۔ جہاں کبھی آنسو بہا کرتے وہاں مسرت کے موتی چمک رہے تھے جو نظریں سرنگوں رہا کرتی تھیں انہی نگاہوں میں مقناطیسی قوت پیدا ہو گئی۔ اور ہر لب مضطرب و بے چین خشک ہو چکے تھے وہاں تبسم رقصاں و شاداں تھا۔ درحقیقت عشق حسن سے جا ملا۔ حسن عشق کو اپنی روح میں بھر لیا۔ اس طرح حسن و عشق ایک ہو کر جاوداں ہو گئے۔ کنور اور مالتی مل گیا۔ اس طرح نصرتی کا کلام صدر رنگ اختتام کو پہنچا۔ کہانی کو ختم ہوئے عرصہ دراز گزرا لیکن نصرتی کی مثنوی پڑھنے سے بھی حسن و عشق کی داستان تازہ ہو جاتی ہے۔ مالتی اور کنور مر گئے لیکن حسن و عشق آج بھی باقی ہیں اور جب تک حسن و عشق باقی نصرتی کا کلام زندہ و پائندہ ہے کہ وہی حسن و عشق کا رازداں تھا۔

جذب عالمپوری

تضمین بر غزل پنڈت گوپی ناتھ امن دہلوی

ارادوں میں ہے لازم استقامت پہلے پیدا کر　　ضرورت ہے، عمل بن کر ضرورت پہلے پیدا کر
فلک جھکتا ہے فیضِ دستِ قدرت پہلے پیدا کر　　اگر عزت کی خواہش ہے تو دولت پہلے پیدا کر
یہ ظاہر ہے نہ دولت ہو تو پھر عزت نہیں ہوتی

بہر پہلو وہ عیاری کے تانے خوب تنتے ہیں　　غرض لے کر وفاداری کا دم ہر وقت بھرتے ہیں
خوشامد کرنے والے زندگی میں موج کرتے ہیں　　خوشامد کی بدولت بے ہنر ذی رتبہ بنتے ہیں
ہنرور کس مپرسی میں ہیں کچھ شہرت نہیں ہوتی

یہ دورِ زرگری ہے دور کے لاکھوں نمائندے　　درِ زردار پہ جا کر لگاتے ہیں فقط پھیرے
وہ اہلِ علم و فن ہوں یا وہ کوئی سوک کے بندے　　اگر زردار بد طینت بھی ہو جھکتے ہیں سر سب کے
مجسم خلق اگر نادار ہو، وقعت نہیں ہوتی

مساواتی سبق لوگوں کو از بر ہوتے رہتے ہیں　　دیا اور دھرم کے پرچار گھر گھر ہوتے رہتے ہیں
کرم فرما ہر اک جلتے پہ رہبر ہوتے رہتے ہیں　　زبانی وعظ اور اپدیش اکثر ہوتے رہتے ہیں
مگر اس دور میں کچھ پرسشِ سیرت نہیں ہوتی

یہاں پر قدر ہوتی ہے جناب جذب پونجی کی　　یہ دنیا زر پرستوں کی ہے دنیا زر پرستی کی
یہاں دھنواں کو حاجت ہے جب تک جی حضوری کی　　کوئی نادار کتنی ہی کہے باتیں بلندی کی
مگر اے امن حاصل کوئی اہمیت نہیں ہوتی

اختر رضوانی

رزمیہ دفاعی رباعیات

ہنگامۂ پیکار کی باتیں ہوں گی
تاریخ کے ادوار کی باتیں ہوں گی
اے چین تجھے صاف کہے دیتے ہیں
تلوار سے تلوار کی باتیں ہوں گی

عادت تری کینہ ہے ہوس کاری ہے
کردار ترا گفظ ہے عیّاری ہے
اے چین شرارت ہے تری گھٹی میں
تو ایشیا کے امن پہ چنگاری ہے

باندھے ہوئے وہ سر پہ کفن بیٹھے ہیں
آتی نہیں بات تو پہ شکن بیٹھے ہیں
نامردوں کی زباں پہ آئیں کہتے ہیں ولی
جو لوگ سر دار و رسن بیٹھے ہیں

منزل ہے اگر سخت نہیں رک سکتے
پیدار ہو یا تخت نہیں رک سکتے
کہسار کے سینے پہ قدم رکھتے ہیں
مردانِ جواں بخت نہیں رک سکتے

سو دم دم مچاتے ہوئے بڑھتے نکلے
مردانِ جواں فکر جدھر سے نکلے
جب آئے تو دنیا نے بچھا دیں آنکھیں
نکلے تو کفن باندھ کے گھر سے نکلے

لطیف انور

رباعیات انور

مضطر ہے حیات کس قرینے کے لیے
ہر سانس ہے مثلِ تیر سینے کے لیے
حیران ہوں کس سے جاکے پوچھوں انور!
کیا مرنا پڑے گا روز جینے کے لیے

خود بول اٹھے جو منہ سے محبت کا مز
ممکن نہیں کچھ اس کے سوا دکھ کا ع
آباد نہ ہو گی کبھی دل کی دُنیـ
جب تک نہ ادا ہو غم انساں کو خ

اک دکھ ہو تو سو طرح سہا جاتا ہے
آنسو ہے کہ آنکھوں میں رہا جاتا ہے
اس ظلم کی داد کون دے گا انور!
چپ رہنے کو فریاد کہا جاتا ہے

محسن بھوپالی

جب ان کو بہکتا ہوا محسوس کیا ہے
ساغر سا چھلکتا ہوا محسوس کیا ہے

اعجازِ تکلم ہے کہ ہر جنبشِ لب پر
غنچہ سا چٹکتا ہوا محسوس کیا ہے

جب یاد تری آئی ہے ہم نے رگ و پے میں
نشتر سا کھٹکتا ہوا محسوس کیا ہے

چاہا جو کبھی ان سے کہیں حرفِ تمنا
ہر سانس اٹکتا ہوا محسوس کیا ہے

اس شان سے گزرے ترے دیوانے چمن سے
ہر خار مہکتا ہوا محسوس کیا ہے

کس دشت سے آئی ہے صبا اب کے برس بھی
ہر پھول سسکتا ہوا محسوس کیا ہے

صابر شاہ آبادی

کہتے ہوئے اک بات وہ شرمائے ہوئے ہیں
ہم قلب کی رفتار کو ٹھہرائے ہوئے ہیں
شاید انھیں یاد آ گئی میری نگہِ شوق!
آئینے سے منہ پھیر کے شرمائے ہوئے ہیں
اے رات بتا! چاند ہے یا عارضِ جاناں؟
گیسوئے پریشاں جسے گہنائے ہوئے ہیں
دنیائے محبت میں بھلا کیا نہیں ہوتا
اک آپ ہیں صورت کو بھی ترسائے ہوئے ہیں
اعضائے بدن ہیں کہ چھلکتے ہوئے اشعار
وہ قامتِ رعنا میں غزل لائے ہوئے ہیں
اے دوست تری راہ میں ہم دل کو مٹا کر
اک قافلۂ آرزو دفنائے ہوئے ہیں!
دل پر غمِ دوراں کا ذرا جبر تو دیکھو
ہم سایۂ گیسو میں بھی مرجھائے ہوئے ہیں
وہ ترکِ تعلق کا اثر لاکھ چھپائیں
حالت یہ بتاتی ہے کہ پچھتائے ہوئے ہیں
وہ آج تو بے ساختہ یاد آ گئے صابر
کیوں لوٹ کے ایام بہار آئے ہوئے ہیں

حامد بہکاوی

شام فراق یار غموں کی سحر لیے
یارو یہ زندگی ہے کئی نیشتر لیے

بیٹھا ہوں کاروانِ خرد انتظار میں
اک مشعلِ خیال سر رہ گزر لیے

منزل کی جستجو میں سر دار آ گئے
ہم اپنے ساتھ اپنا مذاق سحر لیے

ہر انجمن سے ایک نئی داستاں ملی
ہر گام پر عجیب سے دل نے اثر لیے

آواز دے رہی ہے تجھے غیرت جنوں
ہر جلوہ گاہ ناز تقاضائے سر لیے

برق جمال دوست چمکتی ہے آج بھی
ہاں گردشِ زمانہ ذرا تیز تر لیے

حامد چلے ہیں کوئے نگاراں کی سمت ہم
یہ نقدِ جان و دل یہ متاع نظر لیے

تمنا یوسفی

رہبر بھی نہیں راہ بھی کانٹوں سے بھری ہے
آجائے اب جسے حوصلۂ ہم سفری ہے

کیا جانے کہاں ڈھونڈتا پھرتا ہے تمھیں دل
تم سامنے ہو اور پریشاں نظری ہے

برباد تو ہو ہی گیا سرمایۂ گلشن
اے زورِ خزاں کیوں مری آنکھوں میں تری ہے

چھیڑا ابھی تو کس ساز کو ان اہلِ ہوس نے
جس ساز کے ہر تار میں فریاد بھری ہے

تقدیر سے ملتی ہے تو پی لیتے ہیں ساقی!
تدبیر جسے کہتے ہیں دریوزہ گری ہے

سونا تری پازیب کا سچا ہو کہ جھوٹا
ساقی تری پازیب کی جھنکار کھری ہے

دلداریٔ صیاد کے پیکر ہیں تمنا
آزاد کہاں دلکشیٔ بال و پری ہے

اختر فدائی

ہر چیز پر ملا ہے ہمیں اختیارِ دوست
ہم لوگ ہی منائیں گے جشنِ بہارِ دوست

تاروں کی روشنی بھی نظر سے پرے ہوئی
کیسے کٹے گی ہم سے شبِ انتظارِ دوست

آؤ گلے ملیں کہ فضائیں چہک اٹھیں
مدت کے بعد آئی ہے فصلِ بہارِ دوست

تیری جدائیوں کا مداوا کروں تو کیا
دل کو ستا رہا ہے غمِ روزگارِ دوست

یہ اور بات ہم شبِ زنداں سے آ گئے
یاد آ رہی ہے تیری ہمیں بار بار دوست

تکمیل پا گئی ہے محبت کی داستاں
دیوانے آج چوم کر آئے ہیں دارِ دوست

اختر ہر اک قدم پہ جو کھائیں گے ٹھوکریں
راہِ وفا کریں گے وہی استوار دوست

بشیر بدر

وہ تبسم رکا رکا سا ہے
چاند جیسے چھپا چھپا سا ہے

آج دریا چڑھا چڑھا سا ہے
کوئی ہم سے خفا خفا سا ہے

ناک نقشہ بس آپ ہی جیسا
نام بھی کچھ بھلا بھلا سا ہے

شہر یاروں کا اک بسایا تھا
اب نشاں تک مٹا مٹا سا ہے

یہ شبِ غم کٹے تو کیسے کٹے
وقت جیسے رکا رکا سا ہے

اس تبسم کے باوجود اے دوست
رنگِ رخ کچھ اڑا اڑا سا ہے

دل سے کچھ روشنی جہاں میں تھی
یہ دیا بھی بجھا بجھا سا ہے

شبنمی آگ بھی جلاتی ہے
پھول کا دل جلا جلا سا ہے

کس کو فرصت کہ اک نظر دیکھے
بدر تنہا بجھا بجھا سا ہے

رؤف خلش

آرزو

سلونی سانولی رُت ہو کہ شاموں کی اداسی ہو
تری چاہت کا جذبہ منجمد ہونے نہیں پاتا
لہو کے اشک بہتے ہیں مری آنکھوں کی جھیلوں سے
تصور کھینچ لیتا ہے لکیریں زلف و قامت کی
شبِ تنہائی جب بھی چھیڑتا ہوں دکھ بھرے نغمے
فضا کی چادریں تک آنسوؤں میں ڈوب جاتی ہیں

روایت تھی جو اس کے وعدہ و پیماں کی قائم ہے
نہ خلوت کی روپہلی چاندنی میں جلوہ سامانی
نہ میٹھی گفتگو کی چاشنی میں ترشی سا انداز
بہت دن سے جوانی "زاہدانہ" ہوتی جاتی ہے!

حیاتِ عاشقاں ہے نام دل پر چوٹ کھانے کا
ہر اک کو حوصلہ کب ہے شبِ غم مسکرانے کا

مرا یہ حوصلہ دیکھو شبِ غم مسکراتا ہوں
طبیعت گا نہیں سکتی مگر میں گیت گاتا ہوں
مزہ جب ہے کہ یہ محرومیاں مجھ سے نہ چھن جائیں
سدا دریوزہ گر کہلاؤں اہلِ دل کی بستی میں

اسی شعلہ صفت انداز سے آنکھیں ملائے وہ
تپش سے میرے دل کا آبگینہ تک پگھل جائے
سرِ گلشن کھڑا ہو مئے کے پیمانے لیے ساقی
مگر بادہ گساروں پر وہی ہو پیاس کا عالم
یونہی جلتا رہوں لاوے کی بھٹی کی طرح غم میں
بکھر جائیں سیہ زلفیں، نکھر جائیں سیہ راتیں
حدیثِ دیگراں میں کچھ غمِ جاں کی حکایت ہو
مری محبوب کو میری محبت سے شکایت ہو!!

انوار ظہوری

اپنے آوارہ گرد اشعار

جس نے بخشا ہے جمالِ یار کو آب و نمک   آفتابِ غم کی ہے دل میں وہی تابندگی
ان سے حوروں کا رویّہ ٹھیک رہ سکتا نہیں   شیخ صاحب کو رہے گی مستقل شرمندگی

حسن خود شہکارِ یزداں ہے کسے انکار ہے
ان بتوں کا چاہنا بھی ہے خدا کی بندگی

. . . ❁ . . .

ناسازگاریِ صورتِ حالات خود شرما گئی   جب شکن کوئی ارادوں کی جبیں پر آگئی

. . . ❁ . . .

ترے قرب کا تصور مرا دل نہ چاٹ جائے   نہ وہ عارضوں کی جنت نہ وہ گیسوؤں کے سائے

. . . ❁ . . .

مدتوں خونِ جگر سے آبیاری کی گئی   تب کہیں تسخیر کے قابل ہوا ملکِ ادب
فطرتِ معصوم کی اللہ رے سادہ دلی   جاتے جاتے خود وہ پوچھیں مجھ سے رکنے کا سبب

زندگی کے سینکڑوں پہلو نمایاں کر گئے
آرزوؤں کے تعاقب میں گزارے روز و شب

. . . ❁ . . .

رات کے تاریک پردے ڈھانک لیتے ہیں اسے   آگ برساتا ہوا سورج بجھا سکتے نہیں

. . . ❁ . . .

میاں عشق طالب ہے ایثار کا   غرض اس کو سوداگری سے نہیں

. . . ❁ . . .

تیری آنکھوں میں سموئی ہوئی گویائی نے   تازگی فکر کو دی ہے، لب و لہجہ فن کو

نظرجالِ طلب اور جالِ زیست طلب
فریبِ شہر کی ایذا پسند فطرت ہے

* * *

چند باتیں جو یاد آئی ہیں
ذہن پر بدلیاں سی چھائی ہیں

* * *

یہ کہیں تم تو نہیں سوچ رہا ہوں کب سے
ایک سایہ سا نمودار ہوا ہے دل میں

* * *

آدمی کو آدمی ایذا نہ پہنچائے اگر
کون پھر ایمان لائے گا خدا کی ذات پر
لی نہ جب تک عشق کی بے چین فطرت سے مدد
لطف سے خالی نظر آئے اسالیبِ ہنر

* * *

سبھی کو دیکھتا ہوں کاروبارِ حال سے غافل
کسی کو فکرِ ماضی ہے کسی کو فکرِ مستقبل

* * *

بیدار ہو گئی ہوں اگر سب جبلّتیں
سامانِ زندگی ہیں جوانی کی جراتیں

* * *

مری موجِ تنفّس نے کئی سرگوشیاں کی ہیں
تیری نظروں نے شاید میرے دل کو چن لیا ہوگا
مجھے وہ مسکرا کر دیکھتے ہیں جھینپ جاتے ہیں
خدا نے میرے دل کا فیصلہ کیا سن لیا ہوگا

* * *

یہ سمجھوتہ ہی عرفِ عام میں شاید محبت ہے
انھیں میری ضرورت ہے مجھے ان کی ضرورت ہے

* * *

وہ کب حالات کے پیشِ نظر سمجھوتہ کرتا ہے
ظہوری تدمی ہے وقت کو تسخیر کرنے کا

* * *

جہاں ماحول کی ناپختہ حیثیت اضافی ہے
طفیلی بن کے جینا میری فطرت کے منافی ہے

* * *

اک مشغلہ نظامِ تنفّس کو چاہیئے
اب زندگی نہیں تو غمِ زندگی سہی

* * *

دریچے ذہن و دل کے بے تکلف کھول دیتی ہیں
بہت گستاخ ہیں بے باک یادیں شہرِ ماضی کی۔!

ولایت جعفری

ادھوری تصویر

وہ مجھے سری نگر میں ڈل جھیل پر ملا تھا۔

چار چنار کے سامنے بیٹھا ہوا جھیل کی تصویر بنا رہا تھا۔ میں اس کی پشت پر کھڑا ہو کر اس کی بنی ہوئی تصویر دیکھنے لگا۔ اس کو احساس بھی نہیں ہوا اور میں دیکھتا رہا۔ وہ اپنی تصویر صرف ایک رنگ سے بنانا چاہتا تھا ــــــ خون کی طرح سرخ رنگ سے ــــــ یہ دیکھ کے میری دلچسپی اور بڑھی اور میں نے سوچا اب اس نوجوان سے بات کر کے ہی جاؤں گا۔ وہ تصویر بناتا رہا تصویر کی ہر لکیر اپنے اندر بہت سی حیرت کی لکیریں لیے ہوئے تھی ــــــ اس نے چنار کے درخت الٹے بنائے تھے۔ جھیل میں ذرا سا بھی پانی نہیں تھا اور جھیل کی چھاتی کئی جگہ سے پھٹ گئی تھی۔ اور اس کی دراڑوں میں سوکھی، مردہ مچھلیاں دبی ہوئی تھیں۔ بہت سے سانپ البتہ رینگ رہے تھے، اور ان سانپوں کے منہ انسان جیسے تھے۔ لمبے لمبے سفیدے کے پیڑ الٹے کھڑے تھے اور ان میں عورتیں الٹی لٹکی ہوئی تھیں۔ بچے تھے لیکن ان کی آنکھیں نہیں تھیں، پیٹ نہیں تھے، صرف زبانیں تھیں جو باہر نکلی ہوئی تھیں۔ مردہ دودھ جیسے کبوتر پڑے ہوئے تھے جن کا کلیجہ نکال لیا گیا تھا ــــــ سوکھی ہوئی جھیل کے بالکل درمیان میں اس نے ایک عورت اور بنائی، جس کی باہیں اس نے پھیلا دیں، ناک کاٹ دی ــــــ میں کب تک کھڑا رہتا۔ مجھ سے نہ رہا گیا۔ میں نے کہا۔

"ارے ظالم۔ اس بیچاری کی ناک کیوں کاٹے دے رہے ہو۔ ابھی تک الٹی سیدھی جو بھی تصویر تم نے بنائی میں نہیں بولا لیکن مجھ سے یہ نہیں دیکھا جاتا۔"

اس نے بہت دھیرے دھیرے بڑے اطمینان سے اپنا سر گھمایا۔ اور میری طرف منہ کر کے اپنی لال لال آنکھوں سے گھورنے لگا۔ پھر بہت دھیرے سے بولا۔

"تمھارے دل کے کسی کونے میں انسانیت ضرور چھپی ہوئی ہے۔ نہیں تو تمھیں دکھ نہ ہوتا۔"

یہ جواب سن کے میں سوچنے لگا۔ یہ میرے سوال کا جواب تو نہیں، سوال کچھ کیا جواب کچھ ملا۔ اس سے پہلے کہ میں کچھ بولوں وہ خود بول اٹھا۔

"میری یہ مجال کہاں تھی کہ میں اس عورت کی ناک کاٹتا۔ اس دنیا کے رہنے والے بڑے بڑے آدمیوں نے اس عورت کی ناک کاٹ لی ہے۔ اب یہ بیچاری باہیں اٹھا اٹھا کر فریاد کر رہی ہے ــــــ کون اس کی فریاد سنے"۔؟؟ پھر وہ کھانسنے لگا۔ اور تھوڑا سا خون اس نے ڈل میں تھوک دیا۔ شاید اسے دق تھی ــــــ پھر وہ کہنے لگا۔

"جب تم اس عورت کی ناک کٹنے [illegible]

کے ہر انسان کے دماغ میں (اگر وہ انسان ہے) جنگ کے خطرے سے دنیا کی ایک الٹی تصویر ہے۔ جنگ کے بعد اس ارضی جنت کا یہ حال ہوگا تو دنیا کا کون جانے!! اس تصویر کا عنوان بھی "تیسری جنگ" ہے۔ اور یہ عورت جس کی ناک کٹ گئی ہے .... حوا ہے"

یہ کہہ کے وہ پھر کھانسنے لگا اور اکی بار اس نے بہت سا خون ڈل میں تھوک دیا، اور پھر ہانپتے ہوئے بولا۔

"وہ دیکھو سامنے چار چنار کے درخت ہیں، ان کو کسی طرف سے دیکھو ایک نہ دکھائی دیں گے۔ دو دکھائی دیں گے، تین اور چار دکھائی دیں گے . . . . مگر ایک نہیں دکھائی دے سکتے —— بالکل دنیا کے انسانوں کی طرح . . !! اب وہ خاموش تھا۔ میں بھی خاموشی اور حیرت میں ڈوبا ہوا کھڑا رہا۔

ان باتوں کی بنیاد پر میری اس کی دوستی کا محل کھڑا ہوگیا کیوں کہ میرا اس کا درد ایک ہی تھا۔ میں اس سے اکثر ملنے لگا۔ کبھی ڈل جھیل پہ کبھی نشاط باغ میں —— ایک دن مجھے وہ وہاں لے گیا جہاں وہ ٹھہرا تھا —— ایک معمولی سا کمرہ —— ایک بوسیدہ سی کرسی پر۔ مجھے بٹھا کر اور ایک پردہ پڑی ہوئی تصویر کی طرف اشارہ کر کے مجھ سے کہنے لگا "ایک تصویر اور بنا رہا ہوں جو کہ میری زندگی کا شاہکار ہوگی اور شاید آخری بھی —— آخر کب تک زندہ رہوں گا۔ ایک پہیے کی گاڑی کب تک چل سکتی ہے"

میں جب تصویر دیکھنے کے لیے اٹھا تو اس نے مجھے روک دیا

"ابھی کیا کروگے دیکھ کے۔ ابھی تو تصویر ادھوری ہے۔ جب مکمل ہو جائے گی تب دکھاؤں گا"

اور میں بیٹھ گیا۔ پھر ادھر ادھر کی باتیں ہونے لگیں۔ اس نے باتوں ہی باتوں میں مجھے بتایا کہ اسے کھانے میں مچھلیاں سب سے زیادہ پسند ہیں۔ یہ کہہ کے وہ اداس ہوگیا اور میں نے اس سے کہا تھا "میری بیوی بہت جلد یہاں آنے والی ہے۔ میں تمہیں اس کے ہاتھ کی مچھلیاں کھلاؤں گا وہ مچھلیاں بہت اچھی بناتی ہے" یہ بات سن کے وہ خوش نہیں ہوا بس مجھے گھور کے رہ گیا۔

پھر اس سے کئی روز تک ملاقات نہیں ہوئی۔ میں اس کے کمرے تک جاتا مگر اس سے ملاقات نہیں ہوتی تھی۔ وہ باہر بھی نہیں نکلتا تھا بس اندر ہی سے کہہ دیتا "بھائی معاف کرنا۔ میں ذرا تصویر مکمل کر رہا ہوں"

شاید وہ اپنی زندگی سے بالکل ناامید ہوگیا تھا۔ تب ہی تو اسے تصویر مکمل کرنے کی اتنی جلدی تھی۔

پھر سری نگر پر سیلاب ایک دیو کی طرح چڑھ بیٹھا اور میرے سالے کا تار آیا کہ میری بیوی سیلاب کی وجہ سے آنے سے انکار کر رہی ہے۔ مجھے اپنی نئی نویلی بیوی پر بہت غصہ آیا۔ کیا وہ سیلاب سے پہلے نہیں آسکتی تھی، کیا وہ میرے ساتھ نہیں آسکتی تھی؟ مرتے تو دونوں ساتھ مرتے یہ تو زندگی بھر کا ساتھ ہوتا ہے۔ پھر اس نے جب سے شادی ہوئی مجھے ایک خط بھی نہیں لکھا۔ تار بھی دیا تو اپنے بھائی کے ذریعہ۔ اسی طرح کے بہت سے سوالات میرے ذہن کے کونے کونے میں ناگ کی طرح پھن پھیلا کر بیٹھ گئے، اور میں غصہ میں بھرا بھرا اپنے آرٹسٹ دوست سے ملنے چلا گیا۔ سوچا کہ آؤں کہ میں اپنا مچھلی کھلانے والا وعدہ پورا نہ کرسکوں گا۔ میری بیوی سیلاب کی وجہ سے نہ آسکے گی۔

میں اس کے کمرے کے دروازے کے پاس پہنچ کے اسے پکارنے لگا۔ کوئی آواز نہ آئی تو میں دروازہ کھول کے اندر داخل ہوگیا۔ میرا دوست اوندھے منہ زمین پر پڑا تھا اور اس کے منہ کے پاس بہت سا خون بکھر گیا تھا۔ پھیپھڑوں کے درمیان ایک بھی سانس نہیں تھی۔ تصویر پر اسی طرح پردہ پڑا ہوا تھا۔ میں نے پردہ الٹ دیا —— وہ میری بیوی کی تصویر تھی۔

اور میں کھڑا کھڑا سوچ رہا تھا۔

کاش میں آرٹسٹ ہوتا۔

اور یہ نہ مرتا ——— !!

نقد و نظر

تبصرے کے لئے دو جلدوں کا آنا ضروری ہے

شکستِ شب

محسن بھوپالی ۔ ناشر فنکدہ حیدرآباد ۔ پاکستان
صفحات ۱۱۲ ۔ مجلد خوبصورت مع گرد پوش ۔ قیمت دو روپے

محسن بھوپالی نے اردو کے نوجوان شعرا میں کافی شہرت حاصل کی ہے ۔ سندھ کی سرزمین اردو کے لئے کچھ موافق نہیں لیکن اس کے باوجود اردو سے دلچسپی رکھنے والے حضرات کام کئے جا رہے ہیں ۔ شکستِ شب جیسی دیدہ زیب اور خوبصورت کتاب کی اشاعت اسی کا ثبوت ہے ۔ محسن بھوپالی کے کلام کا مطالعہ کرنے کے بعد یہ اندازہ ہوتا ہے کہ وہ خارجی حالات سے بہت زیادہ متاثر ہیں ۔ خارجی حالات موضوع ہوتے ہیں اور جو تاثر ان سے پیدا ہوتا ہے وہ نظم میں ادا ہو جاتا ہے ۔ لیکن قاری کے ذہن پر دیرپا اثر نہیں چھوڑتا ۔ تاہم محسن کی شاعری میں بعض ایسے علایم و اشارات ہیں جن کی قدریں بلند ہیں بعض تشبیہوں میں نیا پن ہے ۔ اور یہ شاعر کی شعری صلاحیتوں کی غماز ہیں ۔

ایک نظم کا عنوان ہے ۔ "کس قدر سادہ لوح ہیں ہم لوگ" اس کے آخری بند میں جو طنز ہے ملاحظہ ہو ۔

جو ہمارے کسی طرح نہ ہوئے — ان کو پائندہ باد کہتے ہیں
موت ارزاں ہوئی ہے جن کے طفیل — ہم انہیں زندہ باد کہتے ہیں
کس قدر سادہ لوح ہیں ہم لوگ

ایک نظم "معذرت" کے عنوان سے ہے اس کا آخری بند غالب کے مصرعہ "تیغ بر آں ہاتھ میں ہے یا کوئی خنجر کھلا" کا مصداق ہے ۔ کہتے ہیں ۔

زندگی خواب پریشاں ہے کہوں یا نہ کہوں — مور بے جان سلیمان ہے کہوں یا نہ کہوں
باغباں تنگ گلستاں ہے کہوں یا نہ کہوں — اہرمن حاکم زنداں ہے کہوں یا نہ کہوں
دادِ ایثار جو چاہو تو زباں جلتی ہے
ہونٹ سلتے ہیں اصولوں پہ چھری چلتی ہے

"پیکرِ عمل" کے عنوان سے بابائے اردو کی جد و جہد کے نام ایک نظم ہے ۔ جس کا ایک بند ہے ۔

شمعِ حق کو کفِ ظلمت سے بچائے رکھنا — اپنی رگ رگ سے لہو دے کے جلائے رکھنا
کانپتے ہاتھوں کو نازش بنائے رکھنا

مجموعی شکستِ شب اور جاتے جاتے قابلِ مطالعہ نظمیں ہیں ۔ ارباب فنکدہ نے شکستِ شب کی اشاعت سے ایک نوجوان شاعر کی مناسب حوصلہ افزائی کی ہے ۔

ماسٹر آف ٹیکسیز

• مرتبہ دھرم پال کھنہ، بی اے - ایل ایل بی - ایڈوکیٹ
• صفحات ۴۰۸ مع نمونہ برائے فارم مجلد وگرد پوش - قیمت پانچ روپیہ
• ناشر کھنہ اینڈ کمپنی چوڑا بازار لدھیانہ مشرقی پنجاب

حکومت ہر سال نئے نئے ٹیکس نافذ کرتی ہے۔ اور سرکاری جریدوں اور اخباروں کے ذریعہ اس کا اشتہار ہوجاتا ہے جب ادائی کی نوبت آتی ہے تو عوام کجا کئی لکھے پڑھے لوگ بھی ان سے ناواقف ہی رہتے ہیں ٹیکسوں کی شرحوں سے صحیح طور پر واقفیت نہیں ہوتی جس کی وجہ سے گرفت سرکار یا داؤں میں آجاتی ہے۔ ایسے ہی لکھے پڑھے لوگوں کے لئے کھنہ صاحب نے "ماسٹر آف ٹیکسیز" مرتب کرکے شائع کی ہے۔ اس میں انکم ٹیکس ایکٹ ۱۹۶۱ء انکم ٹیکس رولز ۱۹۶۲ء گفٹ (تحفہ) ٹیکس ایکٹ ۱۹۵۸ء ویلتھ ٹیکس ایکٹ ۱۹۵۷ء۔ اسٹیٹ ڈیوٹی ٹیکس ایکٹ ۱۹۵۳ء کی تفصیلات کے علاوہ ان سب کے حاضر حساب جدول موجود ہیں جس سے حوالہ جاننے والوں اور حساب کرنے والوں کو بہت آسانی ہوگئی ہے بجٹ کی شرح اور ان کے جدول بھی دیئے گئے ہیں اور اس طرح یہ بے حد کارآمد ہے۔ فاضل مرتب نے ان تمام قوانین کو سوال وجواب کی صورت میں پیش کیا ہے جس سے ایک معمولی خواندہ آدمی بھی استفادہ کرسکتا ہے۔ یہ اور بات ہے کہ حکومت کے قوانین ۱۹۶۱ء میں کچھ تھے ۱۹۶۲ء میں کچھ ہوئے اور ۱۹۶۳ء میں کچھ ہورہے ہیں۔ ان بدل قوانین کی حد تک ممکن ہے کہ قارئین دشواری محسوس کریں۔ لیکن قانونی اور عملی پہلوؤں کا لحاظ کرتے کتاب بیحد مفید اور کارآمد ہے۔ اور روزانہ ٹیکس ادا کرنے والے کیلئے یہ کتاب نہایت اہم خدمت انجام دے گی۔

دو شہروں کی کہانی

• مترجم فیض الرحمٰن - ناشر نیشنل بک ٹرسٹ۔ پبلیکیشنز ڈیویژن منسٹری آف انفارمیشن اینڈ براڈکاسٹنگ گورنمنٹ آف انڈیا نئی دہلی۔
• سائز ۱/۱۶ کراؤن صفحات ۴۷۶ - قیمت پانچ روپے

یہ چارلس ڈکنز کے شہرہ آفاق ناول "اے ٹیل آف ٹو سٹیز" کا ترجمہ ہے۔ اس ناول نے غیر معمولی مقبولیت حاصل کی اور ڈکنس کا شاہکار سمجھا گیا۔ امتحانی جماعتوں کے نصابوں میں اس کے کبھی تفصیلی اور کبھی اجمالی ایڈیشن شریک رہے۔

اس ناول میں ڈکنس نے انقلاب فرانس سے قبل اور بعد کی عوامی زندگی کی عکاسی کی ہے اور واقعات کو اس نے اتنا زیادہ ڈوب کر لکھا ہے گویا یہ خود اس پر بیتے ہیں

فاضل مترجم ہمارے ادب کے لئے نئے نہیں وہ شاعر، ڈرامہ نگار اور ایک اعلیٰ عہدہ دار کی حیثیت سے بہت زیادہ مقبول رہے ہیں اور ہیں۔ وہ نہ صرف اردو ہی کے اچھے ادیب ہیں بلکہ انگریزی پر بھی قدرت رکھتے ہیں۔ ترجمہ میں فاضل مترجم نے اپنی اعلیٰ صلاحیتوں کو بروئے کار لاکر اردو ادب کو ایک عظیم انگریزی ناول نگار سے واقف کرایا۔ انگریزی پڑھنے والے تو سب ہی ڈکنس سے واقف ہیں لیکن صرف اردو داں طبقہ کو ابھی اس سے متعارف ہونے کا موقع ملا ہے یہ ابھی تک مکمل طور پر اردو میں منتقل نہیں ہوا تھا نیشنل بک ٹرسٹ قابل مبارکباد ہے کہ اس نے انگریزی کا یہ شاہکار اردو کو دیا اور فیض الرحمٰن جیسے ادیب کی خدمات ترجمہ کے لئے اس کو حاصل ہوسکیں۔

(ا۔ ص)

نیا کاروان

● مرتب وقار اعظمی

"ادارۂ مصنفین نو" نے "نیا کاروان" کے زیر عنوان اردو دنیا، حیدرآباد کے جواں سال اور ابھرتے
ہوئے نئے افسانہ نگاروں کے دس منتخب افسانے شائع کئے ہیں۔ وقار اعظمی نے انھیں نہایت سلیقے سے مرتب کیا ہے
تاب کی ترتیب مرتب کے حسن ذوق اور شائستہ مزاجی کی مظہر ہے۔ ادب کی دنیا میں نئے لکھنے والوں کی حوصلہ افزائی
ے ضروری ہے اور ان کے افسانوں کے مجموعوں کو خرید کر پڑھا جانا چاہیئے۔ اس سے ہماری زبان کی پرخلوص خدمتگزار
ا یوں میں کام کرنے کا ولولہ پیدا ہوگا۔

زیر نظر مجموعہ میں بعض افسانوں کے عنوانات بھی دلفریب اور رومان انگیز ہیں۔ فکر و فن کا لحاظ کرتے، کم و بیش تمام افسانے
ے لکھنے والوں کے خلوص اور موضوع سے ان کی اثر پذیری کے آئینہ دار ہیں۔ اردو کے کلاسیکی ادب اور عہد حاضر
ے پختہ کار و پختہ خیال ادیبوں کی تخلیقات کے علاوہ، اگر ہمارے ان نئے لکھنے والوں کے پیش نظر دیگر ترقی یافتہ زبانوں
ہ معیاری تخلیقات بھی رہیں تو یقیناً زبان و بیان کی شگفتگی، فکر و خیال کی ندرت اور حیات کے تنوع اور جان دار پہلوؤں
دکاسی کے اعلیٰ نمونے ان کی صلاحیتوں کے نکھرنے اور سنورنے میں ممد و معاون ہوں گے۔

بقول مرتب اس مجموعہ کی سب سے اہم خصوصیت یہ ہے کہ اسے کوآپریٹیو اساس پر شائع کیا گیا ہے۔ کتاب کی
عت کے سارے اخراجات فن کاروں نے مساوی طور پر برداشت کئے ہیں اور اشاعت کے بعد تمام کاپیاں بھی مساوی
دی تقسیم کر دی جائیں گی"۔ خدا کرے کہ یہ تجربہ کامیاب ہو تاکہ کتابوں کی اشاعت کے اس سلسلہ کو آئندہ بھی جاری رکھا جا سکے
بہرحال ادارہ مصنفین نو اور اس کے نوجوان کارکن اپنی اس پہلی اور خوبصورت پیش کش پر دلی مبارکباد کے مستحق ہیں۔
"نیا کاروان" کی قیمت ایک روپیہ ہے۔ اور یہ ادارۂ مصنفین نو ۲۸۶ - سی کلاس، اعظم پورہ، حیدرآباد ۲۴ کے
ے پر حاصل کی جا سکتی ہے۔ (محمد منظور احمد)

نئے رسائل

انتخاب نو

عالمی ادب کا معیاری انتخاب پیش کرنے والا کراچی کا ماہنامہ "انتخاب نو" عام انتخابی
ادب پیش کرنے والے ماہناموں سے بڑی حد تک مختلف ہے۔ یہ ماہنامہ صرف معروف فنکاروں
ز لوں، نظموں، اور کہانیوں کے انتخاب پر ہی اکتفا نہیں کرتا بلکہ اس میں ٹھوس مضامین، منفرد تراجم، اچھی نظمیں اور مقصدی
ہ مضامین اور نظمیں وغیرہ بھی ہوتی ہیں۔ "انتخاب نو" کا زیر تبصرہ شمارہ سالنامہ ہے جو ۱۹۶۳ء کا بہترین ادب اپنے
ا میں لئے ہوئے ہے۔ ۲۱۶ صفحات کا یہ ضخیم ماہنامہ بڑا خوبصورت گیٹ اپ اور اچھی کتابت و طباعت سے مزین
، حصہ دوم جو ۱۲۸ صفحات پر الگ مشتمل ہے وحیدہ نسیم کا طویل مقالہ "اردو زبان اور عورت" شامل ہے جس کا مقدمہ
ا ملیح آبادی نے لکھا ہے۔ وحیدہ نسیم نے اپنے اس مضمون میں جو ایک پوری کتاب کا مواد لئے ہوئے ہے۔ یہ بتایا
کہ اردو زبان سے عورتوں کا کیا تعلق رہا ہے۔ عورتوں نے اس کے لئے کیا کیا کیا؟ ادارہ "انتخاب نو" کو وحیدہ نسیم کی
کتاب کو الگ شائع کرنا چاہیئے۔ "انتخاب نو" کا زیر تبصرہ خاص نمبر تین روپے میں ۱۲ وزیر منشن۔ نکل روڈ
چی ۲ سے مل سکتا ہے۔

ماہنامہ "رکت وان" دہلی

زیر تبصرہ شمارہ ماہنامہ "رکت وان" دہلی کا چھٹا شمارہ ہے جو ...... ویسٹرن ایجنسی شن ایریا نئی دہلی ۔ ۵ سے شائع ہو رہا ہے۔ یہ پرچہ بڑے سائز کے چالیس صفحات پر مشتمل ہے جس کا گیٹ اپ بہت ہی خوب صورت ہے اور ترتیب، کتابت، طباعت بے حد معیاری ہے سارا مواد خون سے متعلق ہے جو بے حد انفرادیت لیے ہوئے ہے۔ اردو ادب میں یہ ایک نئی چیز ہے ہمیں اس تحریک میں اس ادارہ کا ہاتھ بٹانا چاہیئے۔

آج جبکہ چین نے ہمارے علاقوں پر حملہ کر دیا ہے اور ہمارے سپاہی میدان جنگ میں مادر وطن کی حفاظت میں مصروف ہیں۔ اس بات کی شدید ضرورت ہے کہ زخمی ہونے کی صورت میں ان کو تازہ خون دیا جائے ۔ یہ ماہنامہ اس مقصد کے لئے جاری کیا گیا ہے کہ لوگوں کو خون دینے کیلئے تیار کیا جائے اور انھیں اس کی اہمیت سے واقف کرایا جائے۔ پرچے میں کہانیاں، مضامین، نظمیں سب ہی ہوتی ہیں ...... مگر سب راست خون سے متعلق ہوتی ہیں۔ زیر نظر شمارہ پچاس نئے پیسے میں متذکرہ بالا پتے سے حاصل کیا جا سکتا ہے ۔ (رشید الدین)

ماہنامہ "المہدی"

ادارہ :۔ محمد علی، جہاں بانو نقوی صفحات ۴۰ فی پرچہ ۵۰ نئے پیسے
پتہ ۔ ۴۴ ۔ ۳ ۔ ۲۲ جلال کوچہ، حیدرآباد ۔ ۲ (اے، پی)

ماہنامہ المہدی بابتہ اپریل ۶۳ء "بندہ نواز نمبر کے ضمیمہ" کی صورت میں شائع ہوا ہے جو چھتیس صفحات پر محیط ہے اور اکثر مضامین نظم و نثر مطبوعہ یکجا کئے گئے ہیں جن کے مطالعہ سے اردو کے پہلے نثر نگار صوفی حضرت خواجہ بندہ نواز گیسو دراز کے فیوضات روحانی اور کمالات عرفانی سے عام پڑھے لکھوں کو تھوڑی بہت واقفیت ہو جاتی ہے۔ بہرحال اس کفر و الحاد کے زمانہ میں ایسی کوششیں مشکور ہی ہوں گی۔ "المہدی" کو محترمہ جہاں بانو نقوی کا تعاون حاصل ہے۔ ایسی صورت میں اس رسالہ کے مستقبل سے اچھی توقعات وابستہ کی جا سکتی ہیں۔ (و، خ)

ماہنامہ "قومی زبان"

ادارہ تحریر :۔ چندر سری واستو، ایم انگا ریڈی ۔ کمال احمد۔ صفحات :۔ ۴۰
زر سالانہ ۔ ۶ روپے فی پرچہ ۵۰ نئے پیسے۔ پتہ :۔ انجمن تحفظ اردو ۔ سلطان کوٹلہ حیدرآباد

انجمن تحفظ اردو آندھرا پردیش نے ریاست میں اردو تعلیم اور دیگر مسائل کے بارے میں مختصر ترین مدت میں ٹھوس کام انجام دیئے ہیں۔ اب اس انجمن نے گزشتہ تین مہینوں سے اپنا ماہانہ ترجمان "قومی زبان" شروع کیا ہے جس کا ہم تہہ دل سے خیر مقدم کرتے ہیں۔ قومی زبان اردو کے مسائل کے بارے میں فکر انگیز اور گراں قدر مواد پیش کرتا رہتا ہے جس کے سبب اس کی افادیت بڑھ جاتی ہے۔ اس کے لکھنے والوں میں مشہور اہل قلم حضرات کے علاوہ نئے نوجوان بھی شریک ہیں۔ قومی زبان تلگو کے ایک افسانے کا ترجمہ بھی پیش کرتا ہے۔ جس کے سبب اس رسالہ کی اہمیت بڑھ جاتی ہے۔ تلگو اور اردو میں ترجموں کے ذریعہ "قربت" کی کوشش قابل قدر ہے۔

(ز، ر۔ ش)

بیادگار ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور مرحوم

ادارۂ ادبیات اردو کا ترجمان

سنہ اجراء ۱۹۳۸ء فون نمبر (۳۵۲۰۹)

جلد (۲۶) شمارہ (۷) جولائی ۱۹۶۳ء

ماہنامہ

سب رس

حیدرآباد دکن

نگران :- (پروفیسر) عبدالمجید صدیقی

مجلس مشاورت :-

ڈاکٹر گوپی چند نارنگ، نصیر الدین ہاشمی
رین راج سکسینہ، منظور احمد، وقار خلیل

معتمد

محمد اکبر الدین صدیقی

زر سالانہ ہند و پاک سے ۶ روپے
ششماہی ۳ ،،
غیر ممالک ۱۰ ،،
فی پرچہ ۵۰ نئے پیسے

مہتمم ادارہ ادبیات اردو کے اہتمام سے
نیشنل فائن آرٹ پرنٹنگ پریس میں چھپ کر
دفتر ایوان اردو خیریت آباد حیدرآباد دکن ۴ سے شائع ہوا۔

ترتیب

اپنی بات		۲
لیف ٹولسٹائی اور اس کے مصنف یوسف ناظم	کرشن چندر	۳
نیاز فتحپوری	یوسف ناظم	۷
ہندوستان کے افادی فلسفے کی شاخیں	جلال شاہجہاں پوری	۱۰
ایک کہانی	قاضی محمد عبدالغفار	۱۳
شاعر انسانیت	سیفی پریمی	۱۷
حصۂ نظم		
اشعار	جگن ناتھ آزاد	۲۷
خواب بیداری	مخدوم محی الدین	۲۸
غزلیں	محمد منظور احمد	
	خورشید احمد جامی	۲۹
طوفان محل (سانیٹ)	شکیب (علیگ)	
اپریل دھلی	احمد حسین خاں	۳۰
قطعات	روشن پٹیالوی	۳۱
مرجھائے ہوئے پتے	حکیم یوسف حسین خاں	۳۲
غزلیں	سید حرمت الاکرام	
	ریورنڈ ڈبلیو محسن ریحانی	۳۳
	عطا الرحمٰن ارشاد	
	اختر نظمی	۳۴
	مظفر حنفی ہسوی	۳۵
ممتا اور مسکان	محترمہ کلا پرکاش	
	ترجمہ۔ ممتاز ارشد اجمیری	۳۶
زمین کیسے ٹھنڈی ہوئی	ڈی۔ ایس۔ کھاٹکر	
	ترجمہ۔ ممتاز ارشد اجمیری	۳۸

اپنی بات

جون کے مہینہ میں وزارت امور ثقافت و سائنسی تحقیقات کے زیر سرپرستی ادیبوں کا ایک اجتماع ہوا۔ ہندوستان کے صوبوں اور مختلف ریاستوں کے نمائندہ ادیب جمع ہوئے اور ایک کو دوسرے کے خیالات سے استفادہ کرنے کا موقع ملا۔

اردو کے بارے میں بھی ایک ادیب نے اپنا خیال ظاہر کیا کہ ناگری رسم خط اختیار کیا جائے۔ اردو کی جان داری اور جی داری اس کے رسم خط کی دلآویزی نے اس کو آج نہیں بلکہ دو تین صدی پہلے بھی مقبول عام بنایا تھا۔ ہندی کی کتابیں اردو رسم خط میں لکھی گئیں جس میں بعض مذہبی کتب کے مخطوطات ادارۂ ادبیات اردو کے کتب خانہ میں محفوظ ہیں۔ اسی طرح کئی اردو کتابیں رومن رسم خط میں طبع ہوئیں اور میر امن کی باغ و بہار کا ایک نسخہ بھی یہاں محفوظ ہے۔ انگریزوں نے اردو زبان کے حصول کی خاطر کچھ محض تفنن طبع کیلئے اردو کی کتابیں اپنے رسم خط میں چھاپ لیں اور اردو داں طبقے نے جس میں ہندو اور مسلم بلا تفریق مذہب و ملت شامل ہیں ہند کی مختلف زبانوں کی کتابیں اپنے رسم خط (فارسی) میں لکھ لیں۔ ادارے کے کتب خانے میں گورمکھی زبان میں گرنتھ صاحب کا ایک مخطوطہ اردو رسم خط میں موجود ہے۔

اسی طرح اب اردو کے سینکڑوں شاہکار ناگری رسم خط میں منتقل ہو چکے ہیں اور ہو رہے ہیں لیکن اس کا یہ مطلب تو نہیں کہ ایک زبان والا اپنا رسم خط چھوڑ کر دوسری زبان کا رسم خط محض اس لیے اختیار کرے کہ اس سے قومی یک جہتی کو فائدہ پہنچے گا۔ محبت، ایثار اور خلوص کے جذبات عوام میں پیدا ہوں تو قومی یکجہتی کو فائدہ پہنچ سکتا ہے۔ رسم خط کو بدلنے کی بات دلوں کو جوڑ سکے گی بلکہ توڑنے والی ہوگی۔ جن باتوں کا مشاہدہ اور تجربہ ہو رہا ہے ان پر مزید تجربے من جرب المجرب حلت بہ الندامہ کے مصداق ہوں گے۔

"ستمبر" قریب آرہا ہے۔ ہماری خواہش ہے کہ ادارہ "سب رس" ڈاکٹر زور مرحوم کی بارگاہ میں خاص نمبر بطور عقیدت پیش کرے۔ اس سلسلے میں ہمیں جن اصحاب نے اپنے مضامین و مقالات عنایت فرمائے ہیں۔ ان کی ایک مختصر فہرست پیش ہے۔

پروفیسر رشید احمد صدیقی، سید حرمت الاکرام، ڈاکٹر گوپی چند نارنگ، پروفیسر عبدالمجید صدیقی، احمد جلال پاشا، محمود حسین محمود، مولوی غلام رسول، نصیر الدین ہاشمی، سید محمد مورخ، محمد اکبرالدین صدیقی۔

ڈاکٹر سنیتی کمار چٹرجی، جوش ملیح آبادی، ڈاکٹر خواجہ احمد فاروقی، ڈاکٹر گیان چند، پروفیسر عبدالقادر سروری، ماہر القادری، ایم اسلم، جہاں بانو بیگم، پروفیسر سید محمد، پروفیسر مسعود حسین خاں، ڈاکٹر رفیعہ سلطانہ، زینت ساجدہ، محمد عتیق صدیقی، ڈاکٹر سیدہ شان الحق حقی، خواجہ حمید الدین شاہد، ابن فرید، شریف احمد، نثار احمد فاروقی، حکم چند نیر، اور دیگر حضرات نے وعدے فرمائے اور ہمیں یقین ہے کہ وہ بہت جلد اپنے مقالات روانہ فرما دیں گے۔

خطوط اور خطبات کی نقلیں جن حضرات کے پاس ہوں اگر روانہ فرمائیں تو یہ ایک ادبی خدمت ہوگی۔

کرشن چندر

کیف و کم اور اس کے مصنّف

یوسف ناظم

یوسف ناظم کا پہلا مضمون جو میری نظر سے گزرا وہ غالب کی جسمانی صحت بلکہ عدم صحت کے بارے میں تھا۔ اس وقت تک میری ملاقات یوسف ناظم سے نہ ہوئی تھی۔ گزشتہ دنوں اچانک ایک تقریب میں ان سے ملاقات ہوگئی تو معلوم ہوا کہ صحت کے معاملہ میں یوسف ناظم بھی غالب کے طرفدار ہیں۔ بعد میں معلوم ہوا کہ شاعر بھی ہیں اور شاعروں کی نازک بدنی تو مشہور ہے۔ (پنجابی اور پٹھان شاعروں کو چھوڑ کر) اس لئے یہ سن کر اطمینان ہوا کہ یوسف ناظم کی نازک بدنی کسی عارضے کا نتیجہ نہیں بلکہ موزونی طبع کا۔ ممکن ہے یہ دھان پان کیفیت ان کے کام کی نوعیت کی وجہ سے ہو۔ موصوف اسسٹنٹ لیبر کمشنر ہیں۔ اس لئے ممکن ہے قوم کے غم میں گھلے جاتے ہوں۔ اور لیڈر کی طرح ڈنر بھی نہ کھاتے ہوں۔ اور توازن برقرار رکھنے کے لئے مزاح نگاری کو اختیار کیا ہو گو وہ یہی کہتے ہیں کہ مزاح نگاری کو انھوں نے پہلے اختیار کیا اور صاحب اختیار بعد میں بنے۔ کچھ بھی ہو ان کی مزاح نگاری میں جو اختصار جامعیت اور احتیاط پائی جاتی ہے وہ ان کی نازک بدنی کا ایک حصہ یا نتیجہ معلوم ہوتی ہے ظرافت میں اختصار بہت مشکل کام ہے۔ لکھنے والے بالعموم لکھے چلے جاتے ہیں۔ اللہ توکل۔ اس سہارے پر کہ کہیں نہ کہیں ان کے قلم سے ایک آدھ جملہ تو ایسا نکل ہی آئے گا جو لوگوں کو ہنسا دے گا۔ نتیجہ میں مضمون بے حد طویل ہوتا ہے اور قاری محظوظ ہونے کی بجائے بور ہونے لگتا ہے۔ اکثر مزاحیہ مضامین پڑھتے ہوئے گمان ہوتا ہے کہ الفاظ کا صحرائے ریت ہے جو ریت بکھیرتا ہوا چلا جا رہا ہے جس میں کہیں کہیں مزاح کے نخلستان آباد ہیں۔ یوسف ناظم کی تحریر میں آپ کو کالاکاری کم ملے گی نخلستان زیادہ ملیں گے۔ غالباً اس باب میں ان کی شاعری کا تجربہ ان کے کام آیا ہے۔ کیونکہ شاعری میں نثر نگاری سے کہیں زیادہ اختصار سے کام لینا پڑتا ہے۔ یوسف ناظم کے ہاں بہت کم ایسے جملے ملیں گے جو بلا ضرورت لکھے گئے ہوں۔

یوسف ناظم شستہ و رفتہ ظرافت کے قائل معلوم ہوتے ہیں کہیں کہیں وہ ہنسی کی پھلجھڑیاں ضرور چھوڑتے ہیں۔ مگر ان کا مزاج گراں بار قہقہوں کا قائل نہیں ہو سکتا۔ ان کی ظرافت کا معیار متین، شائستہ اور مہذب ہے جو بلند بانگ دیہاتی قہقہوں کے بجائے ہونٹوں پر مسکراہٹ لاتا ہے اور محظوظ ہونے کے بجائے خوش خندان ہونے پر زیادہ زور دیتا ہے دراصل طرح قاری کے ذہن کو غور و فکر کی طرف مائل کرتے ہوئے اس مرکزی بات کی طرف متوجہ کرتا ہے جو ہنسی کے پردے میں کہی گئی ہے۔ اختصار کے فن میں وہ پطرس کے قریب اور اپنے اسلوب کے مزاج کے اعتبار سے رشید احمد صدیقی کے طرفدار نظر آتے ہیں۔ اور یہ دونوں مدرسہ فکر و مزاح کے باب میں ایک دوسرے سے اس قدر الگ الگ اور دور دور ہیں کہ حیرت ہوتی ہے کہ یوسف ناظم نے کیسے ان دونوں کی خوبیوں کو اپنی تحریر میں یکجا کر دیا ہے کہ ذہنی

بالکل ایک نئی چیز معلوم ہوتی ہے۔

مزاح نگاری کے فن میں کیلے کے چھلکے کو ایک خاص اہمیت حاصل ہے۔ غیر متوقع طور پر جب قدموں کے نیچے کیلے کا چھلکا آجاتا ہے تو اس وقت آدمی کس کس طرح پٹخنی کھا کر گرتا ہے اور تماشائی اس سے کس درجہ محظوظ ہوتے ہیں۔ ظرافت کے فن میں ایک مسلمہ تجربہ ہے جو کبھی ناکام نہیں ہوتا۔ مزاح نگار یہ تو نہیں کر سکتا کہ خود جسمانی طور پر قاری کے قدموں میں کیلے کے چھلکے رکھتا چلا جائے۔ لیکن وہ فنی طور پر ایسا کرنے کی کوشش ضرور کرتا ہے کہ پڑھنے والے کو چند لمحوں سیدھی سپاٹ نثر سے گزار دے اور اسے اطمینان دلا دے کہ راستہ صاف ہے۔ پھر بے خوف و خطر آگے بڑھتے ہوئے ٹھیک پڑھتے ہوئے ایکا ایک قاری کے ذہن کے قدموں کے نیچے وہ کیلے کا چھلکا آجاتا ہے اور اچانک قاری کا ذہن وہ پٹخنی کھاتا ہے جس سے ظرافت پیدا ہوتی ہے اور کبھی کبھی زخم بھی پیدا ہوتا ہے۔ مگر یہاں چونکہ چوٹ ذہنی ہوتی ہے اس لئے برلب سڑک تماشائیوں کے تفنن کا کوئی انتظام یہاں نہیں ہوتا۔ یہاں قاری خود ہی چوٹ کھاتا ہے خود ہی اس پر ہنستا۔ اگر صاحب ذوق ہے تو مزاح نگار کی سادگی و پرکاری کی داد بھی دیتا ہے۔ یوسف ناظم کے ہاں آپ کو ان کی تحریر میں بہت سے ایسے مقام ملیں گے جن کی نشاندہی میں اس تعارف میں جان بوجھ کے نہیں کر رہا ہوں۔ ورنہ آپ ہوشیار ہو جائیں گے اور ہوشیار آدمی بالعموم بڑے تنگ دل ہوتے ہیں جو پہلے ہی سے طے کر لیتے ہیں کہ ہم تو ہنسیں گے ہی نہیں۔ ہر طرف دیکھ کر چوکنے ہو کر چلیں گے اور ہر قدم پھونک پھونک کر رکھیں گے۔ ایسے آدمی تجارت کے میدان میں بہت کامیاب رہتے ہیں۔ لیکن ظرافت کے دائرے میں غبی ثابت ہوتے ہیں۔ مزاحیہ تحریر کو پڑھنے کا بہترین طریقہ یہ ہے کہ اسے آپ خالی الذہن ہو کر شروع کیجئے اور بے جھجک تحریر کی پٹری پر رواں ہو جائیے۔ پھر پٹخنی کھانے کا مزا آئے گا۔

کنھیا لال کپور کی طرح یوسف ناظم بھی کسی خاص ازم کے قائل معلوم نہیں ہوتے۔ وہ اپنے مزاح کا خمیر تو زندگی سے اٹھاتے ہیں لیکن اسے کسی بین رجحان کی طرف موڑنے سے احتراز کرتے ہیں۔ ان کے لئے خیال یا زندگی کا ہر وہ پہلو اہم ہے جس سے مزاح پیدا ہو سکے۔ چاہے وہ سگریٹ کی خلا میں پرواز ہو یا حاکم کی رشوت خوری۔ وہ زندگی کی گوناگوں اور بوقلموں کیفیتوں سے مضحک پہلو تلاش کر لیتے ہیں اور ان کے عجب کو قاری کے سامنے لے آتے ہیں۔ ان کے لئے کوئی ازم اس حد تک مقدس نہیں ہے کہ اس سے مزاح نہ پیدا کیا جا سکے۔ مولوی کے وعظ سے لے کر موت تک پر مسکرا سکتے ہیں۔ مگر یہ مسکراہٹ کسی دل آزار طنز میں تبدیل نہیں ہوتی۔ کیونکہ یوسف ناظم کے مزاج کی شائستگی فطری طور پر دل آزاری کے خلاف معلوم ہوتی ہے وہ محض ہنسنے کی خاطر ہنسنا جانتے ہیں۔ شاید اس خیال کے زیر نظر کہ اس انسان دکھ میں ہیں اتنے مصائب ہیں اتنی مصیبتیں اور مجبوریاں ہیں کہ ان سے عہدہ برآ ہونے کا ایک طریقہ یہ بھی ہے کہ ان پر دو گھڑی کے لئے ہنس لیا جائے کبھی کبھی ایسی ہنسی آنسوؤں کے بہت قریب ہوتی ہے اور بہت جیتی کا باعث ہے۔ لیکن یوسف ناظم کی ظرافت پست ہمت نہیں ہے۔ وہ جوان، زندہ دل کی ظرافت معلوم ہوتی ہے جو کسی ازم کی قائل نہ ہو کر بھی انسانیت کا مذاق نہیں اڑاتی ہے۔ بلکہ ہلکے ہلکے طنزیہ چٹکیوں سے، شگفتہ جملوں اور باریک نشتر زنی سے کہیں کہیں ہماری سماجی زندگی پر تنقید بھی کرتی جاتی ہے۔ لیکن یہ تنقید کبھی اوچھی یعنی دل آزار نہیں ہوتی۔ ایسی گہری بھی نہیں ہوتی کہ زخموں کے ٹانکے ادھیڑ دے۔ بہ حال نظم اور احتیاط سے یہ زندگی کی تلخ حکایتوں اور حقیقتوں کی طرف ہلکے ہلکے خیال انگیز اشارے کر کے قاری کو اس کے حال پر چھوڑ

یوسف ناظم شریفانہ مزاح کے قائل ہیں نہ جارحانہ کا۔ لیکن یوسف ناظم کبھی صبر اور احتیاط کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑتے اور ظرافت میں لطافت کے قائل نظر آتے ہیں۔ اس سے ایک فائدہ تو ہوا ہے انہیں۔ اور وہ یہ کہ اپنے مزاح کو وہ بوجوہ ایک بلند سطح پر رکھنے میں کامیاب ہوئے ہیں مگر یہ جی چاہتا ہے کہ کبھی کبھی تو وہ اپنے صبر و شکیب کے حصار کو توڑ کر ہم لوگوں کی سطح پر اتر آیا کریں۔ اور اپنی ظرافت میں قطرہ بھر کر اس قسم کا "زہر خند" تخلیق کریں جس کی ایک اچھی مثال ان کے اس مجموعہ میں شامل ہے جس کا عنوان انہوں نے رکھا ہے "نثر میں ایک نوحہ"۔ بظاہر یہ نوحہ میجر گگارین کی خلائی پرواز سے متاثر معلوم ہوتا ہے۔ لیکن دراصل یہ نوحہ تھرڈ کلاس کے سفر کی صعوبتوں کے بارے میں ہے۔ یہاں یوسف ناظم کے دامن صبر و شکیب کے پرخچے اڑ گئے ہیں۔ زہرناکی کی شدت ملاحظہ فرمائیے :-

"میجر گگارین کی شہرت ہمارے نزدیک لایعنی ہے۔ ذرا ان سے تھرڈ کلاس میں (ہندوستان کے تھرڈ کلاس) سفر کرنے کیلئے کہیئے تو پتہ چلے گا کہ موصوف کتنے پانی میں ہیں۔ جنہوں اعلیٰ قسم کی تربیت پانے اور ایک سے ایک قیمتی غذا کھانے کے بعد نہایت آرام اور تزک و احتشام کے ساتھ خلا کے سفر پر روانہ ہونا اور وہاں سے بار بار واپس ہونا کونسا ایسا معرکہ سر کرنا ہے جس کی اتنی دھوم دھام ہے۔ کیا میجر موصوف کبھی کھڑکی میں الٹے لٹک کر ٹرین کے ڈبے میں سوار ہوئے ہیں۔ ایک مرتبہ ایسا کرنے جائیں تو سارا کھایا پیا ناک کے راستہ نکل آئے اور میجری دھری کی دھری رہ جائے اور صرف ٹرین کے ڈبے میں داخل ہو جانا کافی نہیں۔ انہیں یا تو اپنا بستر اپنے سر پر رکھ کر ایک ٹانگ پر لیٹرن کے نزدیک کھڑا رہنا ہوگا۔ اگر کہیں پھنس پھنسا کر بیٹھ بھی گئے تو ان پر مزید دو مسافر اور سوار ہوں گے اور پھر سانس کی آمد و شد کے لئے آکسیجن مہیا نہ ہوگی۔ اس حالت میں انہیں کم سے کم اٹھارہ گھنٹے سفر کرنا ہوگا۔ یہ نہیں کہ چند منٹ خلا میں رہ کر واپس ہو گئے۔ ٹکٹ کے دام اپنی گرہ سے ادا کرنے ہوں گے۔ اگر وہ منزل مقصود پر بخیر و عافیت پہنچ گئے تو انہیں میجر سے بریگیڈیر بنا دینے کا ہمارا ذمہ۔" پورا مضمون اس غضبناک شدت سے لکھا گیا ہے کہ معلوم ہوتا ہے کہ ہندوستانی ریلوے کی کسی تھرڈ کلاس سیٹ پر بیٹھ کر لکھا گیا ہے۔ پڑھ کر ہنسی بھی آتی ہے رونا بھی آتا ہے۔ اور تھرڈ کلاس کے سفر کی ایک مکمل اور مضحک تصویر میجر گگارین کی خلائی پرواز کے پس منظر میں بڑی شدت سے ابھرتی ہے۔

یوسف ناظم فن کے معاملے میں مبتدی نہیں ہیں۔ گو زیر نظر مجموعہ ان کی فنی کاوشوں کا پہلا مجموعہ ہے لیکن فنی اعتبار سے وقیع اور پختہ ہے۔ یوسف ناظم ظرافت نگاری کے داؤ پیچ اور اس فن کی تکنیک سے بخوبی واقف معلوم ہوتے ہیں۔ ان کے مضامین پڑھ کر یہ احساس نہیں ہوتا کہ مصنف اپنا راستہ ٹٹول ٹٹول کر آگے بڑھنے کی کوشش کر رہا ہے۔ بلکہ یہ احساس ہوتا ہے کہ مزاح نگار کو اپنے فن پر مکمل بھروسہ ہے۔ یوسف ناظم کو متوقع امور کو غیر متوقع اور غیر متوقع امور کو متوقع بنا دینے کا فن بھی خوب آتا ہے۔ کہ ظرافت کے اکثر نکتے اسی عمل سے پیدا ہوتے ہیں۔ اس کی ایک عمدہ مثال ان کا مضمون "گنگو" ہے جس میں انہوں نے زبان اور ادب کے روایتی محاوروں کو نئے معنے پہنائے ہیں یا ان کے نئے ماخذ بتائے ہیں یا ان پر نئے انداز سے تنقید کی ہے۔ پورا مضمون بے حد دلچسپ ہے۔ یہاں پر صرف ایک ٹکڑا پیش کرتا ہوں۔

"نو سو چوہے اور بلی کا حج" ـــ تعجب ہے کہ اس محاورہ پر مسلمانوں نے اب تک کوئی اعتراض نہیں کیا۔ بلی اور حج بیت اللہ حد سے زیادہ قابل اعتراض بات ہے۔ یہ محاورہ تو قانوناً یا کم سے کم اخلاقاً خارج از ادب کیا جانا چاہیئے۔ قیاس کہتا ہے کہ یہ محاورہ کسی خبیث النفس شخص نے گھڑا ہوگا۔ لیکن اس کی قبولیت دیکھئے کہ زبان زدِ خاص و عام ہے۔ ہم اس

ں سے مخالف ہیں اور چاہتے ہیں کہ مذہب کی خاطر اس کے خلاف مہم کا آغاز کریں۔ اور ہوٹل اور پبلیشروں کے مکانوں کے
سامنے پکٹنگ کریں بحث اجازت دے تو برت بھی رکھیں اور کالج کے طالب علموں کو ورغلا کر یا بے روزگاروں کو کچھ پیسے
دے کر جلوس نکالیں لیکن ڈرتے ہیں کہ لوگ ہمیں کو نہ کہنے لگیں کہ نوسو چوہے کھا کے بلی حج کو چلی"۔

"قواعد اردو کی تشریحات میں بھی انہوں نے اسی قبیل کی فن کارانہ چابک دستی کا ثبوت دیا ہے۔ اور صرف و نحو کی
خشک اور سنگلاخ سرزمین سے ایسی شگفتہ اور نادر پھلجھڑیاں برآمد کی ہیں کہ پڑھ کر طبیعت بے اختیار داد دینے پر مجبور ہو جاتی ہے
"غالب کی صحت جسمانی" بھی اسی فن کاری کا ایک نادر نمونہ ہے جس کا میں اس تعارف کے شروع میں ذکر کر چکا ہوں۔
غالب کی صحت جسمانی کی رپورٹ مصنف نے خود غالب کے کلام سے مرتب کی ہے۔ اس کی مضحک جزئیات مصنف کی ندرت طبع کا
ایک اعلیٰ نمونہ پیش کرتی ہیں۔ غالبیات کے خالص علمی موضوع کو لے کر جن لوگوں نے مزاحیہ مضامین لکھے ہیں ان میں خاص طور پر
دو مضامین ہمیشہ یاد رکھے جائیں گے۔ ایک تو ہے "غالب ترقی پسند شعراء کی محفل میں" جس کے مصنف کنھیا لال کپور ہیں۔
دوسرا "غالب کی صحت جسمانی" جس کے مصنف یوسف ناظم ہیں۔ ان دونوں مضامین کا شمار ہمارے اعلیٰ اور برتر ادبی مزاح
میں ہمیشہ کیا جائے گا۔

"کیف و کم" کی اشاعت سے اردو ادب کے طنز و مزاح میں ایک اعلیٰ درجہ کے جوہر کا اضافہ ہوا ہے۔ خدا کرے یہ جوہر
پنپے، پروان چڑھے اور ترقی کی بلند تر منزلوں کی طرف گامزن ہو۔

یوسف ناظم

نیاز فتحپوری

بمبئی میں ایک مقام ہے، جیکب سرکل، جسے سات رستہ بھی کہا جاتا ہے۔ میں نیاز صاحب کے بارے میں جب بھی سوچتا ہوں مجھے وہ کچھ اس قسم کی چیز نظر آتے ہیں یا اگر آپ بہت ہی شاعرانہ قسم کا بیان چاہتے ہوں تو قوس و قزح کہہ لیجئے یعنی پن کمان، بارش کے پانی سے دھلی ہوئی آب مقطر میں نہائی ہوئی اور حسین رنگوں میں ڈوبی ہوئی۔ دیکھنے میں کمانی لیکن اصل میں سات رنگوں کی شستر گربہار۔ ہر رنگ اپنی جگہ اپنا جواب آپ۔ نیاز صاحب کا بھی بس کچھ ایسا ہی حال ہے دیکھنے میں وہ ایک ہیں لیکن بند لفافہ ایسا ہی ہوتا ہے کھول لیجئے تو کئی ورق نظر کے سامنے آ جائیں۔ کبھی کبھی تو یہ شبہ ہوتا ہے کہ نیاز فتحپوری اللہ میاں کی کسی غفلت سے پیدا ہو گئے ہیں ورنہ رنگا رنگ شخصیتوں کا ایک فرد مشکل ہی سے پیدا ہوتا ہے۔ وہ باغ و بہار بھی ہیں اور فسانۂ عجائب بھی نیاز یوں تو ہیں ہی خاص خاص باتوں کا مجموعہ لیکن ان میں ایک خاص بات یہ ہے کہ وہ مرعوب بہت کرتے ہیں۔ ان کو دیکھئے، سنئے، یا پڑھیئے تو ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے ہم لغت کشوری میں دبدبہ اور طمطراق کے معنی دیکھ رہے ہوں۔ نیاز صاحب سے کوئی بیس بائیس سال پہلے حیدرآباد میں ملاقات ہوئی تھی۔ میں اس وقت یونیورسٹی میں پڑھتا تھا اور غالباً کسی تقریب میں نیاز صاحب کو مدعو کرنے گیا تھا وہ ہوش یار جنگ کے ہاں مقیم تھے۔ میں جب ملاقات کے لئے پہنچا تو اطلاع ملنے پر وہ جس قدر جلد باہر آئے اسی قدر جلد اندر واپس بھی ہو گئے اس قدر مصروف شخص کو جلوس اور جلسوں میں شرکت کا موقعہ کہاں ملتا۔ وہ ملاقات اب بھی ذہن کے ایک گوشہ میں یوں محفوظ ہے جیسے گورنمنٹ کا کوئی انعامی بانڈ ہو۔ لیکن نیاز صاحب سے سچی ملاقات تو ان کی تحریروں ہی میں ہوتی ہے یہاں ان کی کم آمیزی، تکلف اور نیچے نیچے رہنے کی عادت، کپڑے اتار دیتی ہے۔ وہ تو پڑھنے والے کو کچھ اس طرح گرفت میں لے لیتے ہیں۔ جیسے ماں بچے کو دودھ پلاتی ہے۔ نیاز نے جب رومانی افسانہ نگاری شروع کی تو ایسا معلوم ہوا جیسے کوئی بھولا خیال آ گیا ہو۔ عورت ایک نور کا مجسمہ بن کر سامنے آ گئی اور محبت چاندنی بن کر چٹک گئی۔ عشق اور عورت کے عنوان کے باب میں حرف آخر معلوم ہوتے ہیں۔ عورت کو انہوں نے بہت زیادہ پڑھا ہے اور جتنا پڑھا ہے اتنا ہی اس پر لکھا ہے۔ عورتیں انھیں بڑے پیار سے پڑھتی اور بہت دکھ سے یاد کرتی ہیں۔ "شہاب کی سرگزشت"، شاعر کا انجام، تاجدار رقاصہ، کیوپڈ اور سائیکی، رومانی افسانے ہیں، دودھ اور شہد کی نہریں ہیں اور "عمر خیام" کا دیوان ہیں۔ یہ تو نیاز کی ایک جھلک ہوئی۔ صنوبر کے اس سایہ سے اگر آپ باہر آ سکیں تو باغ کی ہر روش آپ کو دعوت نظارہ دے گی۔ یہ دیکھئے خطوں کا ڈھیر لگا ہوا ہے۔ ہر خط موگرے کے پھولوں کا ہار اور جوہی کی کلیوں کا گجرا نظر آتا ہے۔ کبھی کبھی تو کچھ دھوکہ ہوتا ہے کہ یہ خط ہیں یا دلہن کا جہیز۔ لوگوں کو چاہیئے کہ اپنے محبوب کو نیاز صاحب سے خط لکھوائیں ــــ ہر محبت کا انجام شادی نہ ہو تو ہمارا ذمہ۔
نیاز ہلکی پھلکی موسیقی کے ماہر ہیں۔ کلاسیکل زیادہ بہتر جانتے ہیں۔ اگر رومانی افسانہ نگاری اور مکتوب نویسی

طبلکی موسیقی کا درجہ رکھتی ہیں تو ان کی تنقید اور بحث ان کی عظمت اور برتری کا وہ تابناک پہلو ہے جس سے آنکھیں چندھیا جائیں اور دیکھنے والے کو دھوپ کی عینک لگانا پڑے۔

دنیا میں مختلف قسم کے آدمی پیدا ہوتے ہیں۔ وہ ایک جو زندہ رہتے ہیں اور زندوں میں شمار نہیں ہوتے۔ دوسرے وہ جو مر جاتے ہیں تو واقعی مر جاتے ہیں اور تیسرے وہ جو مر کر بھی زندہ رہتے ہیں۔ لیکن۔ نیاز فتحپوری تو چوتھی قسم کے آدمی ہیں جو اپنی زندگی ہی میں امر ہو گئے ہیں۔ ان کا روپ ان کی موجودگی ہی میں کلاسیکی ادب کے قریب تر پہنچ گیا۔ نیاز فتحپوری ایک لحاظ سے مورخ بھی ہیں اور تاریخ بھی۔ غالب کا وہ ایک مصرعہ ہے۔ جو پڑھا زیادہ جاتا ہے لیکن سمجھ میں نہیں آتا۔ شاید مشہور والا۔ نیاز فتحپوری اسی قبیل کے آدمی ہیں۔ اگر قصیدہ سے کلیجے کا دماغ پرزے کی طرح اڑ نہ جاتا تو میں واقعی ان کی شان میں ایک قصیدہ کہتا۔ ان کو ایک مرتبہ پڑھ لیجئے تو دماغ میں گرہیں پڑ کر رہ جائیں۔ ان کی تحریر کے حسن اور قلوپطرہ کے حسن میں فرق کیا ہے؟ دونوں شعلہ و شمشیر۔ دشنہ و خنجر۔ قلوپطرہ کے عاشق اس کے اپنے دور کے ساتھ ختم ہو گئے۔ لیکن نیاز کے پرستار تو پیدا ہوتے رہیں گے۔ ڈرتا ہوں قصیدہ نہ ہو جائے۔ سوچا تھا کوئی طنزیہ و مزاحیہ مضمون لکھوں گا تاکہ نیاز صاحب اتفاق سے پڑھ لیں تو چھپ کر مسکرا لیں۔

نیاز صاحب کی زندگی کے بعض پہلو بڑے دلچسپ ہیں۔ ان کے والد نے تین شادیاں کیں تو انہوں نے بھی تین شادیاں کیں اور یہی وجہ ہے کہ زندگی میں وہ کسی سے دبے نہیں۔ طرفہ یہ کہ عملی زندگی کا آغاز پولیس انسپکٹری سے ہوا پھر بھلا وہ کسی سے کیوں ڈرتے اور آپ غور تو کیجئے ۱۹۰۱ء کی پولیس انسپکٹری بادشاہت کی شکل کی کوئی چیز ہوگی۔ اسی کا طفیل تھا کہ نیاز کسی مولوی یا ملا سے نہیں ڈرے۔ شاعروں کو تو ہم نے بہت دیکھا ہے جو مولوی اور ملا واعظ اور ناصح کی لے دے میں ایک دوسرے سے آگے بڑھنے کے لئے مرے جاتے ہیں لیکن نثر کے مولویوں اور ملاؤں کا جو حال نیاز نے کیا وہ شاعروں کی گوریلا لڑائی نہیں۔ دو بدو جنگ ہے۔ اور پھر ایک شاعر اور ایک ملا کی دشمنی روایتی ہے جھگڑا صرف اس بات پر ہے کہ ملا یا واعظ یا تو شاعر کو شراب نوشی کی اجازت نہیں دیتا یا اس کے عشق سے نالاں ہے۔ اس کے علاوہ شاعر کو ملا کی اور کوئی بات ناپسند نہیں لیکن نیاز تو ملاؤں سے واقعی لڑ بیٹھے اور مذہب کا جھگڑا، جائداد کا جھگڑا نظر آنے لگا۔

نیاز نے شعر بھی کہے ہیں اور اگر وہ شعر کہتے رہتے تو ان کا کیا حال تھا۔ نثر میں جو شخص شاعری کر سکتا ہو اسے شعر نہیں کہنا چاہیئے۔ شعر کہنا غالباً انہوں نے ۱۹۱۱ء میں شروع کیا ہوگا۔ جب کہ وہ کسی جگہ میونسپل سکریٹری ہو گئے تھے۔ میونسپل سکریٹری کو تو ہر طرح کے کام کرنے پڑتے ہیں۔

پتہ نہیں ترکی کی شاعرہ نگار بنت عثمان پر وہ کب فریفتہ ہو گئے۔ لیکن ان کی گرویدگی، شگفتگی اور فریفتگی کا ثبوت نگار اب بھی زندہ و تازہ ہے۔ نگار کو ہر جگہ ساتھ لئے لئے پھرے۔ جیسے وہ کوئی رکن خاندان ہو۔ آگرہ، بھوپال، لکھنؤ اور کراچی۔ نگار ہر جگہ سے نکلتا رہا۔ نیاز اور نگار دو علیحدہ چیزیں نہیں ہیں۔ لیکن یہ بات تو آپ کو خود معلوم ہے یا کسی اور نے بھی کہی ہے۔ کوئی حرج نہیں۔ سچ کسی کی ملکیت نہیں۔ ہر شخص سچ کہنے کا مستحق ہے اور یہ تکرار یا تو اردو نہیں۔ تاکید ہے۔ نگار نے کبھی اچھے لباس کی خواہش نہیں کی۔ اس کا سادہ میلا سا کاغذ اور پھر نقش و نگار کی نمائش۔ اس کی خاص ادا رہی ہے۔ غالب نے شاید اسی قسم کی چیز کے بارے میں کہا ہے۔

لڑتے ہیں اور ہاتھ میں تلوار بھی نہیں۔ نگار رسالہ ہے یا ہیرے جواہرات کی چلتی پھرتی دوکان — ابھی اس کا تصفیہ ہونا ہے۔

میرا خیال تھا کہ ترکی سے صرف دو ہی شہزادیاں ہندوستان میں آئی ہیں۔ درشہوار اور نیلوفر۔ لیکن ان دونوں سے بہت پہلے نگار کی صورت میں نگار بنت عثمان ہندوستان منتقل ہو چکی تھیں۔ نیاز کو ترکی زبان سے واقفیت کی وجہ سے بڑا فائدہ پہنچا ہوگا۔ ہم نے بیسیوں کو تڑپتے دیکھا اور یہ کہتے سنا۔

زبانِ یار من ترکی و من ترکی نمی دانم

اسی بنا پر غالباً لوگوں نے بعد میں فارغ عشق کی رسم ایجاد کر لی تھی

نیاز عنفوانِ شباب ہی میں غالباً علامہ ہو گئے تھے۔ سب سے کم عمر علامہ نیاز ہی ہوں گے۔ بہت سے ادیب علامہ بنے لیکن اس وقت جب ان کے سر کے بال پک گئے تھے اور آپ کو معلوم ہے بال بڑی دیر میں پکا کرتے ہیں لیکن نیاز نے اس معاملہ میں بڑی جولانی دکھائی۔ ابوالکلام آزاد کے متعلق بھی یہی مشہور ہے کہ انہوں نے اپنی نوجوانی ہی میں ندوہ کے جید علماء کو سبق پڑھایا تھا اور ان لوگوں نے اپنی دستاریں ابوالکلام کے آگے رکھ دی تھیں۔ نیاز نے بھی گیتانجلی کا ترجمہ اس وقت کیا جب کہ لوگ انگریزی سیکھ رہے تھے۔

نیاز مصور بھی ہیں اور منجم بھی۔ نیاز کو دیکھنے اور پڑھنے کے بعد اندازہ ہوتا ہے کہ آدمی چاہے تو بہت کچھ کر سکتا ہے ورنہ ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھا رہے۔ اور دیکھیے کہ وقت کہاں ہے جو ہم مزدوروں کے لئے مصوری سیکھیں یا کوئی دستِ حنائی دیکھیں۔ نیاز کئی ادیبوں اور شاعروں کا خلاصہ ہیں۔ یا ان سب کا ملا جلا پروگرام ہیں۔ انشاء پردازی میں وہ ابوالکلام کے شانہ بشانہ چلتے ہیں۔ افسانہ نگاری میں وہ اور پریم چند ایک ہی پلٹن کے دو سپاہی معلوم ہوتے ہیں جو قدم ملا کر آگے بڑھتے ہوں۔ تنقید میں وہ اور ڈاکٹر عبدالرحمن بجنوری سرو شمشاد کی طرح بلند و بالا نظر آتے ہیں۔ اور مکتوب نگاری میں غالب کے ہم پیالہ و ہم نوالہ ہیں۔

نیاز جب کسی کو پسند کر لیتے ہیں تو پھر کسی کی نہیں مانتے۔ مومن پر وہ کچھ اس طرح فدا ہیں۔ محمد حسین آزاد کے ظلم کی تلافی شاید اسی طرح ہونی تھی۔ جوش سے وہ بگڑ گئے تو پھر منائے نہ منے۔ فراق گورکھپوری کو شہرت اور کامیابی کا وصل نیاز ہی کی سلسلہ جنبانی کی وجہ سے حاصل ہوا ہو تو کیا تعجب۔ علی اختر حیدرآبادی کے بھی وہ عاشق رہے ہیں اور حال حال میں یہ شکایت سنی گئی کہ ڈاکٹر سلام سندیلوی ان کے منظورِ نظر ہو گئے۔ جوش سے تو وہ اتنے خفا تھے کہ جوش کے یہاں سے چلے جانے کے بعد بھی انہوں نے ان کا پیچھا نہیں چھوڑا۔ یہ تقلید ہے یا تعاقب۔ ناز ہے یا نیاز۔

جلالی شاہجہاں پوری

ہند قدیم کے افادی فلسفہ کی پانچ دوسری شاخیں

ہند کے قدیم فلسفہ کو چھ شاخوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔ ان میں سے ویدانت درشن پر سب رس کے مئی نمبر میں سیر حاصل بحث کی جا چکی ہے۔ اس نمبر میں اس کی دوسری پانچ شاخوں پر تبصرہ آپ کے سامنے ہے۔

سانکھیہ درشن یہ درشن ہند کے قدیم درشنوں میں سے ہے اس کا مصنف یا بانی کپل منی کو بتایا جاتا ہے۔ اس میں ہر معلول کی علت اور ہر سبب کا سبب معلوم کرنے کی انسانی دماغ کو پوری آزادی دی گئی تھی جس کے نتیجہ میں ذہن انسانی کو روایات توڑنے کا مکمل موقع ملا اور انہی اسباب کی بنا پر اس فلسفہ میں اخلاقیات کے ساتھ تکوین عالم اور تخلیق کائنات کی بحثیں بھی ملتی ہیں، چونکہ بودھ فلسفہ میں مادہ ہی کو وجود کی اصل علت اور سبب تسلیم کیا گیا تھا اس لئے اس فلسفہ کو بودھ عہد میں کافی پیش رفت ہوئی بلکہ بودھ ازم کا یہ اصل فلسفہ بن گیا۔ اس فلسفہ کے زوال کی ابتدا چھٹی اور ساتویں صدی عیسوی میں ہوئی جبکہ واتساین اور اودوت کر کی تشریحات نے ایشور کے وجود کو ثابت کر دکھایا خصوصاً کمارل بھٹ کے سلجھے ہوئے طرز استدلال نے اس نظریہ کے ابطال میں اہم حصہ لیا۔ اگرچہ البیرونی نے گیارہویں صدی عیسوی میں بھی اس فلسفہ کے احترام کا ذکر کیا ہے، ممکن ہے کہ بحیثیت ایک علمی نظریہ کے یہ فلسفہ اس وقت کے علماء کے زیر مطالعہ رہتا ہو۔

سرزمین ہند مذہبی معاشرہ کا قدیم مرکز رہی ہے۔ یہاں مذہبی فلسفہ پروان چڑھا جس کی بنیاد عبد و معبود کے مابین تعلقات پر قائم تھی۔ ذہن ہندی میں اجتماعی صورت سے ایشور سے سرکشی کا جذبہ کبھی پرورش نہ پا سکا۔ اس عقل میں جس نغمہ کی تان عبد و معبود کے تعلق پر نہ ٹوٹی وہ کبھی تادیر قابل سماعت نہ ٹھہرا۔

سانکھیہ فلسفہ چونکہ وجود باری کے تصور سے عاری تھا اس لئے مذہبی تصورات کی نشاۃ ثانیہ کے ساتھ ہی اس قدیم فلسفہ کے تمام نظریات کو بھی روپوش ہونا پڑا۔

نیائے درشن اس فلسفہ کا بانی گوتم کو بتایا جاتا ہے اس نے جو ترقی پذیر نظریات پیش کئے ان کے پیش نظر یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ ہندوستان کا ارسطو کہنا بے جا نہ ہوگا۔ اس درشن کی بنیاد بعض کے نزدیک تین سو قبل مسیح رکھی گئی اور بعض کے نزدیک پہلی صدی عیسوی میں اس کا آغاز ہوا۔ اس فلسفہ میں منطق اور منیات کا اصول نمایاں تھا لیکن بحث و استدلال سے ہر بوط حقیقت میں ایک منطقی طریقہ استدلال تھا جس میں کسی شے کا حقیقی علم حاصل کرنے حاصل کے لئے استدلال سے کام لیا جاتا تھا۔ اور ایشور کو آتما کا خالق تسلیم کیا گیا تھا اور آتما کی طرح پرماتما بھی ادراک ارادہ اور علم وغیرہ صفات سے متصف مانا گیا تناسخ کی تکمیل میں یہ بودھ ازم کے تصورات سے ہم آہنگ تھا، چونکہ بودھ کے نزدیک ان کا تعلق جسم کے بجائے کرم سے ہے۔ اس لئے اس فلسفہ میں بھی پہلے جنم کے کرموں کے مطابق روح کا دوسرے اجسام میں حلول کرنا اک اصول

مشہور الہیاتی کے فلسفیانہ سوتروں کی تشریح و تفسیر واتسائن کی طرف منسوب ہے لیکن نیائے شاستر کے علما میں اُدیوت کر کی تشریحات جو ساتویں صدی عیسوی میں کی گئی تھیں کافی مقبول ہوئیں۔ اودیت کو صرف نیم مذہبی فلسفی نہ تھا بلکہ وہ آشپتی کی طرح وہ اپنے وقت کا ایک سائنسداں بھی تھا جس نے سورج کی طاقت سے روشنی اور حدت کے اصل مرکز کا پتہ چلایا چونکہ اس نے مسئلہ کشش ثقل پر بھی سیر حاصل بحث کی ہے اس لئے اس کو ہندوستان کا نیوٹن کہا جا سکتا ہے۔ دسویں صدی عیسوی کی مشہور تصنیف کسمانجلی میں نیائے شاستر کے مقررہ اصول سے توحید وجودی کو ثابت کیا گیا ہے۔ اگرچہ مسئلہ توحید وجودی پر اس سے پہلے متعدد تصانیف عالم تصنیف میں آ چکی تھیں۔ ان کے استدلال اور استخراج نتائج میں وہ پختگی نہ تھی جو کسمانجلی میں پائی جاتی ہے۔ علمائے بودھ کے انکار واجب کے نظریہ کی منطقیانہ استدلال سے تغلیط کر کے ہستی واجب کو اس انداز سے ثابت کیا ہے کہ ان کے نظریۂ انکار میں آثار تزلزل پیدا ہو گئے بلکہ پیروان بودھ کے دلوں میں بھی وجود باری کا تصور گھر کرنے لگا۔

ویشیشک درشن

لفظ ویشیشک، وشیش کا اسم ہے جس کے معنی خصوصیت کے ہیں چونکہ اس فلسفہ میں تو مفردات کی خصوصیات کو منکشف کیا گیا ہے اس لئے اس کا نام ویشیشک درشن رکھا گیا۔ یہ فلسفہ حقیقت میں نیائے درشن کی ترقی یافتہ صورت ہے۔ نیائے درشن میں کسی نتیجے کا تحقیقی علم حاصل کرنے کے لئے استدلال کی صورتیں قائم کی جاتی ہیں اور ویشیشک میں موجودات اور عناصر سے بحث و تحقیق کا آغاز ہوتا ہے۔ مہرشی کناد کو اس فلسفہ کا بانی کہا جاتا ہے۔ اس کے بنیادی اصول میں تمام مادی اشیاء "قوت سالمہ" ہی کا حصہ ہیں ان کا جاننا تھوڑا سالمہ ہی کا حصہ ہے اور سارا "قوت سالمہ" کے کسی چیز کو بقا اور سالمیت حاصل نہیں۔ مادہ میں حرکت کسی دیوتا کے حکم سے نہیں ہوتی بلکہ ایک مخفی طاقت کے ذریعہ جس کا دوسرا نام ایشور ہے۔ مجردات اور عناصر کی تحقیق کی بنا پر کناد منی کو ہندوستان کا ڈیماکریٹس کہا جاتا ہے گوتم کے نیائے درشن میں استدلال کا عنصر غالب ہے اور کناد منی کے ویشیشک فلسفہ میں مجردات و عناصر سماوات واجب روح اور موجودات کے بارے میں دونوں ایک راستہ اور مسلک پر گامزن ہیں لیکن تحقیق اشیاء اور کیفیت و ماہیت کے بیان میں یہ فلسفہ نیائے درشن سے بہت آگے ہے۔ کچھ عرصہ بعد بودھ فلسفہ کے اثرات اس فلسفہ پر بھی اثر انداز ہونے لگے جس کے نتیجہ میں یہ فلسفہ بھی مادہ کی قدامت کا حامل ہو گیا اور مادہ کی اجتماعیت تخلیق اشیا اور تکوین عالم کا سبب بن گئی۔

یوگ درشن

اس درشن میں روح اور موجودات کے بارے میں کچھ عجیب طلسماتی تخیلات کا اظہار کیا گیا ہے چونکہ اس درشن میں ایشور کی ذات میں جذب ہونے کے ذرائع پر غور کیا جاتا ہے۔ اسی لئے علائق عالم سے بے نیاز ہو کر "ذات واجب" کے تصور میں محو و مستغرق ہو جانے کا نام یوگ درشن ہے۔ یا یوں سمجھئے کہ انسان چونکہ جہالت و انانیت بغض و کینہ اور خواہشات کے جال میں گرفتار ہے اس لئے مکتی اور نجات کی خاطر ان مضرات خمسہ سے احتراز کی تدبیر یوگ درشن کہلاتی ہیں اور انہی مضرات خمسہ سے احتراز کی مشق و مزاولت انسان کو اوج اعلیٰ پر پہنچا دیتی ہے اور بالآخر مکتی اور نجات کے مکمل سامان میسر ہو جاتے ہیں۔ اس درشن میں دارالمحن سے ترک تعلق کے ذرائع آٹھ باتوں پر منحصر ہیں۔ تزکیۂ نفس، حبس دم، ضبط، تیقن، طرز نشست، تزکیۂ اخلاق، محویت و استغراق اور ترک خواہش۔ بعض نے نفس و اخلاق کے تزکیہ کو ایک رکن مان کر تہذیب بدنی کو آٹھواں رکن قرار دیا ہے۔ اس درشن میں ذات واجب کو ازلی، ابدی، مختار کل، لاشریک اور زمان و مکان کی قید سے آزاد مانا گیا ہے۔ اس کے علاوہ مذہب، روح اور اتصال واجب کے طریقوں سے بھی اس میں بحث کی گئی ہے۔ یہ فلسفہ چونکہ ہندی طبائع سے زیادہ مناسبت رکھتا تھا اس لئے

سرزمین علم و حکمت میں یہ خوب پھلا پھولا اور ہندی معاشرت و تہذیب پر ایک خاص انداز سے موثر ہوا۔ لوگ ورش کے سوتروں کی سب سے معتبر تفسیر واچسپتی مصر کی مانی جاتی ہے۔ ویاس بھوج کی بھی ایک مکمل تفسیر لوگ سوتروں پر موجود کہی گئی ہے۔

پوروا میمانسا

ابتدا میں یہ فلسفہ مذہبی تصورات پر مبنی تھا یعنی فلسفہ کم اور مذہب زیادہ۔ ویدوں کے عملی حصہ کی منطقیانہ تشریح اور یگیہ وغیرہ کے متعلق منتروں کی تشریحات سے بحث ہوتی تھی اس فلسفہ کا بانی جیمنی کو بتایا جاتا ہے۔ ابتداً اس میں نہ تو روح و جسم کے مسائل سے بحث تھی اور نہ موجودات کا کوئی تفصیلی ذکر تھا لیکن بعد کو دوسرے درشنوں کے اثرات اس میں شامل ہو گئے۔ اور مادیات سے بحث کی جانے لگی اور آخر میں سانکھیہ فلسفہ کے تصورات و نظریات نے اس پر غلبہ پا لیا جس کے نتیجہ میں وجود واجبہ کے انکار اور حدوث و قدم کے مباحث کا سلسلہ بھی شروع ہو گیا۔ سانکھیہ فلسفہ کے اثرات دیکھ کر میمانسا کے قدیم مقلدوں نے اس کی آسان اور قابل قبول تشریحات شروع کر دیں جن کی بنا پر یہ فلسفہ دو حصوں میں تقسیم ہو گیا۔ ایک حصہ کے بانی یا شارح کمارل بھٹ اور دوسرے کے مادھو اچاریہ ہیں۔

بقیہ:- **شاعر انسانیت**

انسانی کردار بڑا پیچیدہ ہوتا ہے اور اکثر خیر و شر یا اچھے برے اوصاف کی آمیزش ہوتی ہے یہی سبب ہے کہ وہ اوسط انسانیت کے ساتھ اپنا رشتہ پیش کرتے ہیں اور عوام کے ساتھ ربط رکھتے ہیں۔ وہ اس بات سے آگاہ ہیں کہ انسانوں کو مشترکہ ناکامیوں کا شعور ہی انہیں متحد کرتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ جب ان کی خامیوں کو دیکھتے ہیں تو قہقہہ نہیں لگاتے۔ ہنستے ہیں بلکہ مسکراتے ہیں اور اس میں بھی ایک (tolerant humour) کی لہر ہوتی ہے جس کی مثال انسانی فطرت کی عجیب و غریب حماقتوں سے آگاہی ہے اور تمام انسانوں کے ساتھ پھیلی ہوئی ہمدردی ہے جو ہمارا ناکہ ذہین فن کاروں میں ہمارا بہترین دوست بنا دیتی ہے۔

قاضی محمد عبدالغفار
سیدہ محترمہ فاطمہ عالم علیخاں

ایک کہانی

ٹیگور

برہما دیوتا کو دنیا کیلئے جو کچھ پیدا کرنا تھا تقریباً سب پیدا کر چکا تھا۔ اب وہ کچھ سوچ رہا تھا۔ شاید یہ چاہتا تھا کہ کوئی نئی چیز کوئی عجیب تر مخلوق اپنے کمالات آذہن بلیغ سے نکال کر عالم امکان میں لائے۔ دفعتاً اس کا چہرہ خوشی سے دمکنے لگا ...... اسے کوئی نئی بات سوجھی!

دیوتا نے اپنے کارخانۂ قدرت کے مہتمم کو طلب فرمایا ارشاد ہوا کہ "ہمارے کارخانۂ قدرت سے پانچوں عناصر کی کافی مقدار لے کر آؤ، ہم ایک نئی چیز پیدا کرنے والے ہیں!"

مہتمم نے عرض کیا "اے خالق کون و مکان! جب تو نے تخلیق کے جذبۂ بے اختیار کے ساتھ اپنے کارخانے کے عناصر کو بے دریغ خرچ کیا اور ہاتھی، ریچھ، اونٹ اور شیر جیسے کثیر الجثہ اور قوی الجسم جاندار پیدا کر ڈالے تو اے داتا! تو نے اپنے ذخائر پر ذرا بھی نظر نہ کی اب تو مخلوق کے جسم میں طاقت اور حرارت پیدا کرنے والے تمام عناصر تقریباً خرچ ہو چکے۔ خاک، پانی اور آگ بہت ہی قلیل مقدار میں باقی ہیں۔ ہاں! ہوا اور ایتھر جتنا چاہیے موجود ہے!"

چار سر والا دیوتا دریائے فکر میں غوطے کھانے لگا۔ اپنی چاروں مونچھوں پر بار بار ہاتھ پھیرتا تھا اور سوچتا تھا۔ آخر اس نے کہا "جا! اے داروغہ۔ عناصر کے ذخیرے میں جو کچھ باقی ہے وہی بھیج دے۔ پیرایہ طراز تخیل تیرے ذخائر کی کمی کو پورا کرے گا!" عناصر کی قلت نے برہما کو کفایت شعاری پر آمادہ کیا۔ اس نے خاک، پانی اور آگ کو بہت تھوڑی مقدار میں صرف کیا۔ بالآخر ایک نیا جانور بنکر تیار ہو گیا۔ اس کو ذخائر کی کمی کے باعث سینگ اور نوکدار پنجے نہیں دیے گئے، دانت ایسے دیئے گئے کہ سوائے چبانے کے کوئی کام نہ کر سکیں۔ کاٹ بھی نہ سکیں۔ پھر اس کے خمیر میں آگ نہ بہت زیادہ شامل کی گئی کہ وہ جنگجو ہو جائے۔ نہ اتنی کم کہ میدان جنگ سے بھاگ نکلے۔ اس طرح برہما نے اپنے نئے تخیل کو جامۂ ہستی پہنایا۔ ...... یہ جانور گھوڑا تھا!

اس کے خمیر میں ایتھر اور ہوا اس فیاضی سے ڈالی گئی تھی کہ وہ جب زمین پر کھڑا کیا گیا تو ایک منٹ کے لئے بھی بے حس و بے حرکت ہونا پسند نہ کرتا تھا۔ ہوا سے آگے جانا چاہتا تھا، سطح زمین کی وسعت کو اپنے ایک قدم کے برابر سمجھتا تھا۔ دوسرے جانور کوئی ضرورت یا سبب ہو تو دوڑتے ہیں۔ مگر گھوڑا بے ضرورت دوڑتا ہے گویا کہ خود اپنی کھال کے اندر سے نکل جائے گا۔ وہ نہ کسی کا تعاقب کرتا ہے نہ کسی کو مارنا چاہتا ہے۔ صرف یہ چاہتا ہے کہ بھاگتا چلا جائے۔ تا آنکہ حد نظر تک اس کا وجود ایک نقطہ موہوم ہو، اس کا وجود ایک دھندلا سا عکس ہو کر رہ جائے اور وہ خلائے بسیط میں گم ہو جائے!

چار مُنہ والا برہما اپنی اس نئی مخلوق کو دیکھ دیکھ کر خوش ہو رہا تھا! اس نے اپنی تمام مخلوقات کو مسکن دیے تھے۔ کسی کو جنگل کسی کو پہاڑوں کے غار۔ لیکن گھوڑے کی بے وجہ سرعت رفتار سے وہ اتنا خوش تھا کہ اس نے اس جدید مخلوق کو اپنے آسمان کے نیچے، اپنی نظر کے سامنے ایک سبزہ زار عطا کیا کہ وہ اس پہ اپنی تیز رفتاری کے مزے لوٹا کرے۔ مگر...... اس کھیت کے پاس ہی انسان کا مسکن تھا!

انسان کی مسرت کا مدار لوٹ مار اور قتل و غارت پر ہے، یہ لٹیرا اس قدر لوٹتا ہے کہ اس کا مال و اسباب اس کی گردن پر ایک ناقابل برداشت بوجھ ہو جاتا ہے! پس جب اس نے گھوڑے کو دیکھا کہ وہ ہوا کا تعاقب اور آسمان کو چھونے کی کوشش کرتا ہے۔ تب اس نے اپنے جی میں کہا کہ "اگر یہ گھوڑا میرے قبضہ میں آجائے تو میں اس کی چوڑی کمر پر اپنا بوجھ رکھا کروں" پس ایک دن اس نے گھوڑے کو پکڑ لیا!

پھر اس نے گھوڑے کی پیٹھ پہ زین کس دی۔ اور اس کے منہ میں ایک خاردار زنجیر لگا دی۔ اس نے تازیانہ اور مہمیز تیار کی تاکہ وہ گھوڑے کو بتائے کہ اپنی مرضی کے مطابق اور اس کی مرضی کے خلاف چلنا گناہ ہے!

انسان نے گھوڑے کے گرد اونچی دیواریں کھڑی کر دیں تاکہ وہ بھاگ نہ جائے۔ غرضیکہ شیر کا مسکن جنگل تھا۔ وہ بدستور جنگل میں رہا۔ چیتے کا مسکن پہاڑوں کے غار، وہ بدستور اپنے غاروں میں رہے۔ لیکن گھوڑے کا مسکن کھلے سبزہ زار تھے وہ اصطبل میں بند کر دیا گیا! اس کے خمیر میں ایتھر اور ہوا کا جزو غالب تھا اس لئے اس کے دل میں آزادی کی تمنائیں بیتابانہ پیدا ہوتی تھیں۔ لیکن اس جزو غالب کی بدولت اس کے پاؤں میں غلامی کی زنجیریں پڑ گئیں۔

گھوڑے نے دیکھا کہ اس کی گردن میں غلامی کا طوق ناقابل برداشت ہے تو اس نے اصطبل کی دیواروں پر دولتیاں جھاڑنی شروع کیں لیکن اس عمل سے دیوار کو اتنا صدمہ نہ پہونچا جتنا کہ خود گھوڑے کے سموں کو پہنچا۔ دیواروں کا تھوڑا سا چونا ٹوٹ کر گرا اور ان کی ظاہری خوبصورتی ضرور کم ہو گئی۔

مگر انسان کو گھوڑے کی یہ حرکتیں بہت ناگوار ہوئیں جھنجھلا کر کہنے لگا "دیکھو تو یہ جانور کیسا احسان فراموش ہے کیا میں اسے دانہ اور پانی نہیں دیتا؟ کیا میں اس کی حفاظت کے لئے بڑی بڑی تنخواہ کے ملازم نہیں رکھتا اور اس کو دیکھو کہ یہ کسی طرح خوش نہیں ہوتا!"

ملازموں نے گھوڑے کے خوش کرنے کی ایسی کوشش کی اور ایسی ایسی تدابیر استعمال کیں کہ آخر گھوڑا نہ صرف دولتی چلانا بھول گیا بلکہ اس کی بہت سی فطری طاقتیں سلب ہو گئیں۔ ایک دن انسان اپنے پڑوسیوں اور احباب کو جمع کر کے گھوڑے کے پاس لایا اور ازراہِ فخر کہنے لگا "دوستو"! جیسا میرا گھوڑا وفادار ہے ایسا کوئی دوسرا گھوڑا بھی تم نے نہیں دیکھا ہے؟ دوستوں نے کہا "کبھی نہیں"! یہ تو ایسا بے حس و حرکت ہے جیسے خندق کا پانی اور ایسا نرم مزاج ہے جیسا تمہارا مذہب"

یہ تو معلوم ہی ہے کہ گھوڑا جب پیدا ہوا تو نہ اس کے سینگ تھے نہ تیز دانت نہ نوکدار پنجے پھر جب اس کا دولتیاں پٹکیں مارنا بھی روک دیا گیا تو پھر اس کے لئے سوائے آواز کے اپنے محسوسات کے اظہار کا اور کونسا ذریعہ باقی تھا۔ لیکن اس کی

…وانے سے انسان کی نیند خراب ہوتی تھی۔ علاوہ ازیں اس قسم کی آوازیں سنکر دہ ہمسائے کیا کہیں گے جن کو گھوڑے کی …وفاداری کا یقین دلایا جا چکا ہے۔ بس انسان نے کچھ ایسی تدبیر کیں کہ گھوڑے کا منہ بھی بند ہو گیا۔

مگر جب تک جسم میں سانس ہے کچھ نہ کچھ آواز تو ضرور نکلے گی (جو لوگ آواز کو بند کرنا چاہیں وہ ہرگز یہ حماقت …کیا کریں کہ جسم میں سانس کو آنے جانے دیں۔) چنانچہ گھوڑے کا منہ تو بند تھا مگر کراہنے کی کچھ نہ کچھ آواز کبھی نہ کبھی …نکل جاتی تھی۔

ایک دن یہ آواز برہما کے کانوں تک پہنچی۔ دیوتا اپنے مراقبے سے چونکا۔ نیچے کی طرف نظر کی تو گھوڑے …و سبزہ زار پر نہ پایا جھنجھلا کر موت کے دیوتا کی جانب لوٹا اور بولا "یہ سب تمہاری کارروائی ہے۔ تم نے میرے …گھوڑے کو یہاں سے اٹھا لیا" موت نے ہاتھ باندھ کر عرض کیا "میرے دیوتا سارے عالم کے خالق تجھے جب …زمانی ہوتی ہے تو مجھ ہی پر ہوتی ہے لیکن تو اگر ایک نظر انسان کی جانب دیکھے تو تجھے اپنی دنیا کی بہت سی …باتوں کا راز معلوم ہو جائے۔" برہما نے پھر نیچے دیکھا اس نے اصطبل کی چار دیواری دیکھی اور اس کے اندر سے …اپنے گھوڑے کے کراہنے کی آواز آتی ہوئی سنی۔ برہما کی پیشانی پر غصہ کی شکن ظاہر ہوئی اس نے کہا "اگر …میرے گھوڑے کو آزاد نہ کرو گے تو میں اس کے بازوؤں کے ساتھ شیر کی طرح پنجے اور اس کے منہ میں چیتے …کے جیسے دانت پیدا کر دوں گا۔"

انسان نے برہما کی آواز سنی اور کہا "اے داتا دنیا میں خونخواری کو ترقی دینا تیری شان سے بعید ہے اور اگر …مجھے صاف گوئی کی اجازت ملے تو میں عرض کروں کہ تیرا یہ گھوڑا اس قابل نہیں ہے کہ اس کو آزاد رکھا جائے میں …نے تو اس کے لئے یہ اصطبل بنایا اے دیوتا! دیکھ تو! میں نے تیرے گھوڑے کے لئے کیسا خوب صورت اصطبل …بنایا ہے۔"

برہما خاموش تھا اور کچھ سوچ رہا تھا۔

انسان نے پھر کہا "اے میرے دیوتا! تیری عقل کے سامنے سر تسلیم خم ہے۔ لیکن ہفتہ بھر کی مہلت عنایت ہو …ایک ہفتہ گزرنے کے بعد بھی تیری رائے یہی ہو کہ اس جانور کے لئے میرے اصطبل کے مقابلے میں تیرا سبزہ زار بہتر …ہے تو میں تیرے حکم کے آگے سر جھکا دوں گا۔"

انسان نے مہلت کا یہ زمانہ ضائع نہیں کیا۔ اس نے گھوڑے کی دو ٹانگوں میں رسی باندھ کر کھیتوں میں چھوڑ دیا …وہ بری طرح لنگڑاتا تھا اور جنگل کے چرند پرند اس کی مسخرہ انگیز چال کو دیکھ کر ہنس رہے تھے۔ برہما نے اوپر سے …گھوڑے کی اس بدنما رفتار کو دیکھا لیکن اس رسی کو نہ دیکھا جو گھوڑے کی ٹانگوں میں بندھی ہوئی تھی۔ پس دیوتا …سوچنے لگا کہ اس گھوڑے کا وجود میری صناعی پر حرف لاتا ہے۔ دوسرے دیوتا میری اس جدت کو دیکھ کر ہنس رہے …اس نے اپنے دل سے کہا "میں نے کیسی غلطی کی کہ اس جانور کو پیدا کیا۔" …… انسان اس وقت کا منتظر تھا۔ …پکارا "اے میرے دیوتا! تو نے میرے گھوڑے کو دیکھ لیا۔ میں اس بدنصیب کے لئے کیا کروں۔ تیرا …حکم ہو تو میں اس کو تیرے آسمانوں کے کسی سبزہ زار میں ہوا دوں۔"

برہما نے حیران ہو کر ادھر ادھر دیکھا پھر کہا۔ نہیں! اے انسان نہیں!! لیجا تو اس گھوڑے کو! اپنے اصطبل میں لیجا!!"

انسان نے ذرا آواز بلند کر کے کہا "اے دو جہاں کے داتا! یہ گھوڑا انسانوں کے لئے ایک بار گراں ہو جائیگا۔"

برہما نے کہا "جا! اے انسان!! تیرے لئے یہ بار امانت ہے۔ تیری انسانیت کا تقاضا یہ ہونا چاہیئے کہ تو اس بار کو برداشت کرے۔ جاؤ گھوڑے کو اپنے اصطبل میں لیجاؤ۔ اور اس کی حفاظت کرو۔"

"خاموشی"

نتائج اردو امتحانات ادارہ ادبیات اردو منعقدہ جون ۱۹۶۳ء

بلحاظ رول نمبر

مرکز جلد ۵

امتحان اردو زباندانی

درجہ اول :-

۱۔ منیر اقبال

مرکز محبوب نگر

درجہ سوم

۳۔ محمد جہانگیر

۴۔ سید عبدالقدیر

۵۔ عطا رسید سلطان

امتحان اردو عالم

مرکز بلدہ کورواناث

دوم

۱۔ سیدہ شجاع الدین حسین قادری

۲۔ میر یوسف علی

۳۔ محمودہ فاطمہ

۵۔ رحمت جہاں

سوم

۴۔ محمد حسین

۳۷۔ محمد ظفر احمد

مرکز محبوب نگر :-

دوم

۱۲۔ محمد اکرام اللہ

۱۳۔ محمد عبدالرحیم

۱۵۔ محمد بشیر الدین

۱۸۔ محمد خواجہ معین الدین سردار

۱۹۔ حافظ سید معظم علی

۲۱۔ محمد صدیق

۲۶۔ سید امیر الدین قادری

۲۷۔ محمد سلیمان

سوم

۱۱۔ محمد انعام اللہ

۱۴۔ خواجہ معین الدین

۲۲۔ محمد حسین

۲۳۔ محمد عبدالرحیم

۲۵۔ عبدالغنی

۲۹۔ محمد مسعود احمد

۳۰۔ چاند عبدالصمد

۳۲۔ محمد مشتاق حسین خان مشتاق

۳۴۔ اسرار المعلی

۳۶۔ سید یوسف الدین

سیفی پریمی

شاعرِ انسانیت

مولانا محمد اسمٰعیل میرٹھی کو انسانوں سے گہری دلچسپی تھی۔ وہ ایک صوفی منش انسان تھے۔ تصوف اور علمی کتابوں سے ان کی زندگی کا بڑا گہرا تعلق تھا اور وسیع مطالعہ کی عادت ان کے اوقات گزاری کا سہارا تھی۔ پھر بھی ان کی سب سے بڑی خصوصیت "انسانیت" تھی۔ سماج۔ ماضی اور حال کی روشنی اور اپنے تمام رنگوں کے ساتھ ان کی نظموں کا مستقل موضوع رہا ہے۔ ان تمام باتوں سے بڑھ کر یہ بات تھی کہ وہ انسانوں کے شاعر تھے۔ (a poet of men.) اور ان کی انفرادیت اور اعمال کے ــ اس جہانِ رنگ و بو کی زندگی کے لئے ان میں بڑا ولولہ تھا۔ بنی نوعِ انسان کی سوسائٹی کے لئے بلند و پست، اچھے اور برے، بوڑھے، مرد، عورت، بچے، جگنو، چڑیا، بلی، کھیت اور کسان سب کی عزت تھی اور ان کی اچھائی سے خوشی حاصل کرتے تھے۔

زندگی کے بارے میں مجموعی طور پر ان کا تصور سمجھنے کے لئے ان کی نظم "شمعِ ہستی" کے چند اشعار ملاحظہ فرمائیے:-

اے زندگانی اے شمعِ ہستی
سونی پڑی تھی تجھ بن یہ بستی
بزمِ جہاں میں رونق ہے تجھ سے
اس میکدے میں ہو حق ہے تجھ سے
ہے تیرے دم سے اے عالم آرا
بزمِ عروسی آفاق سارا
سرگرم ہے تو جادوگری میں
ہیں تیرے جلوے خشکی تری میں
مٹی کا جوبن تو نے نکھارا
دے دے کے چھینٹے اس کو ابھارا
بے حس کو بخشا احساس تو نے
دی نکہتِ گل کو بو باس تو نے

جیتے ہیں جب تک مرتے ہیں تجھ پہ
سب کچھ تصدق کرتے ہیں تجھ پہ

لیکن ان کی خوشی چاند تاروں کی چمک، پھولوں کی مہک، عمارتوں کی سربلندی، جسموں کی شادابی اور لباس کی آراستگی تک محدود نہ تھی۔ بلکہ وہ سچی خوشی کا ذریعہ روح کی تسکین کو سمجھتے تھے۔ انسانی کردار کی عظمت ان کے نزدیک ذہن کو اطمینان اور دل کو غیر فانی لطافت و مسرت دے سکتی تھی۔ ایک نظم "انسان کی خام خیالی" میں ان کی فکر و نظریات جھلکتی ہے۔

ہو دل کو خوشی نہیں یہ ممکن
جب تک کہ نہ ہو صفائے باطن
یا نفس کو تابِ ضبط ہو
حاصل تب راحتِ ابد ہو
یا وہ دلِ صاف اور فیاض
ہو خود غرضی سے جس کو اعراض
یا صبر کہ خندہ زن ہو اکثر
مجبوری بخت نارسا پر
یا عقل کہ ہو سلیم و نیکو
اندوہ سے ہو نہ چیں با برو

یہ رمز کہ ہو چکے ہویدا
ہے اصل خوشی انہیں میں پیدا

دراصل مولانا مجموعی زندگی سے دلچسپی رکھتے ہیں۔ پوری انسانیت میں ان کی دلچسپی کی خصوصیت ان کا وسیع و فراخ جذبۂ ہمدردی ہے۔ جو تمام قسم کے لوگوں کیلئے تھا۔ زندہ ہونے کی خوشی، زندگی پر نظر، "انا" انسانوں کے بیچ اپنے وجود کی شادمانی۔ یہ ان کی نظموں میں ہر مقام پر ملتا ہے۔ یہ ضرور ہے کہ چند شخصیتوں کے ساتھ ان کا والہانہ عشق اور عظمت کا چلن دل و دماغ کی اعلیٰ قدروں کو چھوتا ہوا نظر آتا ہے۔ انھوں نے اپنے شیخ سید غوث علی شاہ پانی پتی کی توصیف میں مثنوی "نذر عقیدت" سنہ ۱۹۱۰ء میں لکھی تھی۔ چند اشعار سے ان کے خلوص کی گرمی اور عقیدت و احترام کی سرشاری کا اندازہ ہو سکتا ہے۔

لب پہ آیا نام شہ غوث علی　　بے تکلف کھل گئی دل کی کلی
پھر صبا سبزے کو لہرانے لگی　　باغ معنیٰ میں بہار آنے لگی

اس طرح کی ذہنی فضا پیدا کرنے کے بعد انھوں نے تشبیہات اور استعارات کے پردے میں "ہمہ اوست" کے مسلک کی توضیح کی ہے۔

پھر وہی ساغر وہی بزم سرور　　پھر لگا بہنے وہی دریائے نور
پھر وہی ساقی وہی دیرینہ خم　　کفر و ایماں کا ہوا سررشتہ گم

یہاں شیخ کے کمالات باطنی اور اوصاف حمیدہ کا تذکرہ بڑے اعتماد سے کیا ہے۔ پیش رو صوفیاء کرام اور شیوخ عظام کے اسمائے گرامی نظم کئے ہیں اور اس سلسلے میں اپنے شیخ کو "تجلی" قرار دیا ہے۔

اے تجلی آخریں ذوالجلال　　تھا کمال بندگی تیرا کمال

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ فنافی الشیخ کے مقام تک پہنچ چکے تھے۔ اسی لئے ان کے قلم سے یہ شعر موزوں ہو سکے۔

اے محیط اولیں و آخریں　　آفریں! صد آفریں! صد آفریں

مثنوی کے آخری حصے تک پہنچتے پہنچتے قاری کو احساس ہوگا کہ شاعر غائب ہے اور اس کی جگہ ایک معتقد اپنے پیر طریقت کی بارگاہ نیاز میں محو تجلی ہے اور اتنا کہہ کر اس پر سکوت طاری ہو جاتا ہے۔

ہے تری آواز، آواز خدا　　اور خاموشی تری راز خدا

ایک طرف وحدانیت کا یہ غلبہ ہے مگر عقل کو وہ اپنا پاسباں بنائے ہوئے ہیں۔ ان کی زندگی نے تصوف میں مستقل طور پر پناہ نہیں لی ہے۔ سماج پر ان کی نظر ہے وہ خود کو سماج کا ایک فرد سمجھتے ہیں اور اپنے طبقہ کی زندگی سے تجربات حاصل کرتے ہیں۔ اپنے عقائد اور محسوسات کو بیباکی سے پیش کرتے ہیں۔ سرسید جن کی مخالفت ہندوستان کے متعدد علماء نے کی۔ ملک میں ان کو "نیچری" کہہ کر ایک محاذ قائم کیا گیا اور نئے خیالات و رجحانات کو روکنے کی ہر ممکن کوشش کی گئی۔ مولانا محمد اسمٰعیل اپنی روحانیت اور عزلت نشینی کے باوجود زندگی کے مسائل میں سرسید کے ذہن سے پوری طرح متفق ہیں۔ علی گڑھ تحریک کا خیر مقدم کرتے ہیں۔ اور سرسید کو قوم کا عظیم رہنما سمجھتے ہیں۔ انہوں نے ۱۸۸۰ء میں "سرسید احمد خاں" کے عنوان سے ایک قطعہ لکھا تھا جس کے ابتدائی اشعار ملاحظہ فرمائیے۔

تن بے سر کی طرح قوم پڑی تھی بے جان　　سر جو پایا تو اٹھی پھر قیام اور قعود
سر قومی (سلمہ اللہ تعالیٰ) سید　　رہبری جس کو ہے بے راہ رووں کی مقصود
قوم بدحال کے اندیشۂ غمخواری سے　　کبھی خالی نہ رہا جس کا دل درد آمود
نہ گئی طالب صادق کی تگ و تاز عبث　　کھل گیا قوم کی بہبود کا باب مسدود
ڈالی آخر کو دبستانِ خرد کی بنیاد　　ہو گیا جلوہ نما وہ ۔ جو تھا ذہنی مشہود

اس کو ذہنی تضاد نہیں کہا جا سکتا بلکہ یہ ایک متوازن دل و دماغ کی کیفیت کا اظہار و عمل ہے۔ ان کو انسانی دار کی وہ خوبی پسند تھی جو سماج کے لئے کسی حیثیت سے بھی افادی پہلو رکھتی ہو۔ وہ سب طرح کے انسانوں میں دلچسپی لیتے تھے۔ اچھے بھی اور برے بھی۔ ان کے کلام کا مطالعہ کر کے کسی کا ذہن یہ فیصلہ کرنے پر آمادہ نہیں ہوتا کہ وہ سی محض پاکیزہ دنیا میں زیادہ خوش رہتے۔ لیکن یہ سمجھنا بھی غلطی ہوگی کہ وہ بدقوارہ آدمیوں کو سماج کے معزز افراد سے ادہ بہتر سمجھتے تھے۔ انہوں نے یہ عہد نامہ نہیں بھرا تھا کہ صرف گلیوں کی گندگی پر ہی نظر ڈالیں گے۔ لیکن شاہراہوں ے کنارے سے لگے پھولوں پر ان کی نگاہ جمتی ہے۔ مولانا کی ایک خصوصیت جو دوسروں کے یہاں کمیاب ہے۔ ان کا عام جذبۂ ردی ہے۔ دوسرے افراد بھی ان میں ایک تجسس پیدا کرتے ہیں۔ جو "دلچسپی" کا مرادف ہے۔ ان کی دنیا سے کسی کا راج نہیں ہوتا۔ کراہیت یا تلخی بغض ان کے یہاں کالعدم ہے۔ وہ ان سے بھی متنفر نہیں ہیں جن کے کردار کی خامیوں کو وں نے دکھایا ہے۔ وہ کٹ ملا اور فریبی خانقاہوں سے بھی بیزار ہیں جن کے مکر و ریا کی انہوں نے گرفت کی ہے۔ بدی کا ے اچھائی کے مقابل مطالعہ کیا جائے تو وہ دلچسپ بن جاتی ہے۔

اس زمانے میں قوم اور قومی رہنما کا وہ مفہوم نہیں تھا جو آج آزادی کے بعد جمہوریت میں سمجھا جاتا ہے۔ قوم اور لیڈر کے تعلقات نوعیت بھی مختلف تھی۔ آج زندگی کی بنیادی ضروریات "کھانا، کپڑا اور چھت" ہر شہری کو دلانا لیڈر کا فرض سمجھا جاتا ہے زمانے میں رہنما زندگی کے کسی ایک پہلو کی طرف توجہ کرتا تھا۔ اس کی حیثیت لیڈر کی کم اور سوشل ریفارمر کی زیادہ تھی۔ پھر بھی ے حد تک حکومت یا قومی فنڈ سے رہنما افراد کی مدد کر سکتا تھا۔ وہ عظمت کا نشان سمجھا جاتا تھا لیکن قوم کی بدحالی سے ناجائز دہ اٹھانے والے بھی تھے۔ وہ افراد کو سنہری خوابوں کی تعبیر کے ذریعہ احمق بنا کر اپنی معاش اور وجاہت کا اہتمام کرتے۔ ایسے لوگوں میں سماجی شعور تھا نہ قوم کے ساتھ خلوص ـــ مولانا نے اپنے زمانے کے سماج کا گہرا مشاہدہ کیا تھا اور ، کے ذہن نے جو خامیاں محسوس کیں ان کو ظاہر کیا ہے۔ اس سے ایک فائدہ یہ ہوا کہ اس سماج کے مختلف طبقوں کی زندگی ے ٹھہراؤ اور کثافت کا ہمیں علم ہو گیا۔ اور آج کے سماج کے بہتر بننے پر ہمیں خوشی محسوس ہوتی ہے۔

نام نہاد رہنمایانِ قوم

ان مدعیوں سے نہ کہو دردِ دل اپنا　　مر جائے بھی کوئی تو یہ ہرگز نہ کریں ہائے
جس رائے کی تائید ہو مضمون ریا سے　　جتنے حکما کہتے ہیں مردود ہے وہ رائے
سر پیٹ لوں یا اپنا گریبان کروں چاک　　اس درجہ کو پہنچا مرا احوال کہ ہے وائے
آئے ہیں مرے زخم جگر سینے کو وہ لوگ　　ناکے میں بھی سوئی کے جنہیں دھاگہ نہ ڈالا آئے

اسی طرح "جریدۂ عبرت" میں انہوں نے چند کردار اور پیش کئے ہیں۔ وہ شاعر کو سماج کی ریاست سے خارج یں کرتے بلکہ اس کو کسوٹی کا ایک اہم عنصر قرار دیتے ہیں اور توقع کرتے ہیں کہ شاعر اپنے فن سے سماج کو بہتر

بتانے گا۔ لیکن اس دور میں شاعر کے ذہن پر جمود طاری تھا اور شاعری بے مقصد ہو کر رہ گئی تھی ۔ ایسے شاعر اور شاعری سے مولانا کو الجھن ہوتی ہے اور وہ گندی فضا کا احساس دلا کر شاعر کو اپنے اعلیٰ منصب کی طرف رجوع کرتے ہیں۔

شاعر :

ہے ایک غار میں پانی سڑا ہوا لبریز　پڑا ہے نیم کا پتا اور اس پہ پشہ سوار
وہ پشہ آپ کو سمجھا ہے ناخدائے جہاز　اور اس سڑے ہوئے پانی کو بحر زخار
اسی طرح سے ہمارے زمانے کے شاعر　سمجھتے اپنی خرافات کو ہیں مین وقار

ایسے شاعر کی غزل کا نمونہ بھی پیش کیا ہے ۔

صفت ہے دوست کی جلاد ظالم و غدار　ستم شعار، دل آزار، بے وفا، مکار
ہے دلبروں کی بھی شامت نہ منہ رہا نہ کمر　بجائے زلف کے دو اژدہوں کی ہے پھنکار
یہ آپ کے گل عارض نہیں ہیں باسی پھول　پڑی ہے نزع کی حالت میں نرگس بیمار
زنخ کنواں ہے کہ جس میں ڈبو چکے لٹیا　بھنور ہے ناف کہ جس سے نہ ہوگا بیڑا پار
شب فراق کا دکھڑا اگر کروں تحریر　تو ایشیا کو ڈبو دیں گے دیدۂ خوں بار

جاگیرداری نظام میں علما رہی لیڈروں کا کام کرتے چلے آئے ہیں لیکن ۱۸۵۷ء کی قومی تحریک آزادی کے نتیجے اور سرسید کی علی گڑھ تحریک کی مقبولیت نے عالموں کے گروہ کو متاثر کیا۔ ایک طرف خود نگر، رجعت پسند تھے جن کی رائے میں زیادہ شدت پیدا ہوگئی اور وہ مسلمانوں کو ہندوستان کے اندر ایک جزیرے کی زندگی گزارنے پر مصر تھے ۔ دوسری جانب روشن خیال اور فراخ دل علما تھے جنھیں سماجی شعور کی دولت مل گئی اور وہ وقت کے جدید تقاضوں کو سمجھتے تھے اور مغربی علوم و فنون کی برکت سے قوم کو فیض یاب ہونے کی ترغیب دیتے تھے ۔ مولانا نے اول الذکر گروہ کا شکوہ کیا ہے

فلسفی علما :

نہ شاعروں ہی پہ تنہا پڑے ہیں یہ پتھر　کہ عالموں کا بھی اس دور میں ہی ہے شمار
وہیں ہیں آج جہاں تھے یہ دس صدی پہلے　گیا ہے قافلہ دور اب تو لیتے ہیں غبار

نہ ان مظاہر قدرت پہ ڈالتے ہیں نگاہ　نہ ان رموز کی تحقیق ہے نہ استفسار!
ہے جن علوم سے انسان کے حال کی برکت　ہیں جن فنون سے گلزار شہر و ملک و دیار
ہیں جو علوم صنائع کے قبلہ و کعبہ　ہے جن فنون سے صحن معاشرت کا سنگار
ہے جن علوم سے انسان کی زندگی سرسبز　ہیں جن فنون سے اہل زمانہ برسر کار

استاد کو " معمار قوم " (Nation builder) کہا جاتا ہے ۔ بچہ قوم کی امانت ہوتا ہے۔ بچہ کا پہلا مکتب ماں کی گود اور پھر خاندان ہوتا ہے۔
اسکول بچے کے لئے ایک نئی دنیا ہے جہاں سب اجنبی ملتے ہیں۔ اس اجنبی ماحول کے تجربوں سے بچے کی

زندگی بنتی ہے ــــ بچہ دوسروں سے مل کر نئے ماحول سے مطابقت پیدا کرتا ہے۔ یگانگی اور محبت کی فضا میں وہ اس دنیا کا ایک فرد بن جاتا ہے اس کی جسمانی طاقت کے فروغ اور ذہنی صلاحیتوں کی نشو و نما میں سہارا ملتا ہے بچے میں لیڈر شپ کے اوصاف پیدا ہوتے ہیں اور وہ مستقبل کی معاشرت کا ایک معزز فرد بنتا ہے لیکن اس کی بڑی ذمہ داری استاد پر ہوتی ہے۔ لکیر کے فقیر استاد۔ بچوں کی زندگی تباہ کرکے قوم و ملک کا مستقبل تاریک کر سکتے ہیں۔ مولانا نے زندگی بھر معلمی کا آزادانہ پیشہ کیا تھا۔ مکتب کی فرسودہ زندگی پر انھیں ملال ہے۔

معلم

معلموں کو جو دیکھو تو روح فیثاغورس   ہیں وہ بھی دخمۂ فارس کے استخواں بردار
وہی ہے ان کا پرانا طریقۂ تعلیم   کہ جس میں زندہ دلی کے نہیں ہیں آثار
وہی خوشامدی القاب اور وہی آداب   کہ جن سے تازہ ہے انشائے دلکشا کی بہار
ہوا ایک بچہ کا مطلب تو ہاتھ بھر کی دعا   اور ایک گز کی تمنائے دولت و دیدار
طریق ترجمہ اب تک رہا ہے اوٹ پٹانگ   پڑھیں جو لڑکے تو ہل ہل کے اور پکار پکار

ایک صحت مند جسم ہی میں ایک صحت مند ذہن کی تلاش ممکن ہے۔ طبیب معاشرے کا ایک معزز فرد ہوتا ہے خدمت خلق کا شاید اس سے زیادہ قابل قدر پیشہ ابھی تک سماج میں دوسرا نہیں ہے۔ طبیب کی ذمہ داری بہت بڑی ہے اس کا سینہ بہت سے رازوں کا امین ہوتا ہے اس کی تشخیص اور تجویز پر دوسروں کی زندگی کا انحصار ــــ نیک نیتی اور ہمدردی کے ساتھ حالات وقت کی تبدیلی میں طبیب کو اپنے علم کو تازہ رکھنے اور اپنے تجربوں سے انسانیت کو فیض پہنچانے کا عمل نہایت ضروری ہے۔ اسی جانب مولانا نے توجہ دلائی ہے۔

طبیب

اسی روش پہ اطبا کا ہے مرض مزمن   ہنوز نبض طبابت کی سست ہے رفتار
وہی ہے نسخہ وہی منضج اور وہی مسہل   وہی سنائے گل سرخ و شربت دینار
معالجہ میں ترقی نہ کچھ سوا وا میں   وہی سبب وہی تشخیص اور وہی تیمار
غذا بتائیں وہی دال مونگ یا کھچڑی   بلا سے ان کی مرے یا جئے کوئی بیمار
نہ کچھ دوا کی ہے تحقیق نے دوا سازی   وہی دوا ہے جو پڑیہ میں باندھتے عطار

قوم کا زوال ہوتا ہے تو معاشرے میں بہت سی خرابیاں پیدا ہو جاتی ہیں۔ ایک عام خرابی یہ کہ "بے عملی" کی زندگی افراد کو پسند ہوتی ہے اور اپنا رزق محنت کی بجائے دوسروں سے حاصل کرنا عادت میں داخل ہو جاتا ہے اس کو استحصال کا بھی نام دیا جا سکتا ہے۔ زبردست، زیردست کو ستا کر اپنی زندگی بچاتا ہے۔ کوئی اپنے علم و فضل سے کوئی تصنع سے ایک مخصوص گروہ کو متاثر کرکے اپنے مقصد کی تکمیل کرتا ہے۔ مولانا کے زمانے کی معاشرت میں یہ تمام خرابیاں عام تھیں اور ان کو اس طرح کی زوال آمادہ تہذیب سے تکلیف تھی۔

اس لئے انھوں نے اپنے کلام میں اس گروہ کا تذکرہ کیا ہے۔

دنیا پرست دیندار

زبس کہ دعوت و نذر و نیاز پر ہے معاش　　　ہوئے ہیں قوم میں پیدا بہت سے پیش خوار
نہ پوچھ لیتے ہیں ابھرتے ہیں فخر کرتے ہیں　　　فقط اسی پہ کہ ہم ہیں بڑے نماز گزار
نہ خلق نیک نہ ہمت بجا نہ عزم درست　　　نہ حب قوم نہ حب وطن نہ حب تبار

مدار دین ہے اس پر کہ جھٹ کترتے ڈالیں　　　جو پائیں ٹخنے سے نیچی ذرا کسی کی ازار
گھٹی جو دور میں ان کے تو راستی کی قدر　　　بڑھی جو عہد میں ان کے تو ریش کی مقدار

مشائخ

یہ مومنوں سے بھی جزیہ وصول کرتے ہیں　　　فتوح غیب رکھیں اس کا نام یا ادرار
جو بدعت ان کی کریں معتقد تو واجب ہے　　　کہ ان کے کھانے کو ہو شوربا بھی چھپلہ دار
رجوع خلق کی خاطر ہوئے ہیں گوشہ گزیں　　　کہ جیسے جھیل پہ بیٹھے سکڑ کے بوتیمار
یہ ناز ہے کہ بزرگوں کے نام لیوا ہیں
اگرچہ ننگ بزرگاں ہوں آپ کے اطوار

ہندوستان میں نئے متوسط طبقہ نے جنم لے لیا تھا مگر مولانا کے ذہن میں "عوام" کا مطلب نچلا طبقہ ہی تھا۔ اور اس معاملہ میں وہ سرسید کے رفیق راہ تھے۔ جمہوریت میں ہاتھ اور قلم کے ذریعہ روزی کمانے والے تمام محنت کش انسان "عوام" میں شامل ہیں۔ وہ معزز شہری تسلیم کیے جاتے ہیں اور جمہوری حکومت کی اصل طاقت عوام ہے۔ مولانا خود زمیندار تھے اس لئے وہ طبقاتی نظام کے قائل تھے۔ "قلی اور خدمت گار" کو وہ سماج کا معزز فرد نہیں سمجھتے تھے اور اس ذہن سے اختلاف کیا جا سکتا ہے۔ لیکن عام افراد کے کردار میں وہ جن اوصاف کی تمنا کرتے ہیں وہ نہایت قابل قدر ہے اور جمہوری دیس کے عوام میں اس کردار کی چمک اور بھی ضروری ہے۔

عوام

عوام کی ہے یہ صورت کہ بس خدا کی پناہ　　　ہر ایک پیشۂ بے غیرتی میں کار گزار
ہر ایک لہو میں شامل ہر ایک لعب میں شریک　　　کہیں کا سانگ تماشا کسی کا ہو تہوار
دغا فریب ہو، چوری ہو یا اچکا پن　　　نہیں ہے پاک کسی کام سے انہیں زنہار
اب ان کے واسطے یہ ہیں مدارج اعلیٰ　　　پولیس میں، قلی، کوچوان، خدمت گار

مولانا نے سرسید کی تحریک کی موافقت کی ہے اور ہر اعتبار سے معاون رہے ہیں لیکن وہ ظاہر پرستی کے خلاف تھے جدید مغربی علوم و فنون اور سائنس کی فیض رسانی کو نہایت ضروری سمجھتے تھے۔ لیکن وہ مشرقی تہذیب کی خوبیوں کو بھی برقرار رکھنا چاہتے تھے۔

انگریزی فیشن والے

وہ آنکھ میچ کے بزعم خود غلط بنے ایسے — کہ ایشیا کی ہر اک چیز پر پڑی دھتکار
جو پتلونوں میں ہے پوشش تو بس بریدہ کوٹ — سواریوں میں سواری تو دُم کٹا رہوار
جو اردو لی میں ہے کتّا تو ہاتھ میں اک بید — بجاتے جاتے ہیں سیٹی سلگ رہا ہے سگار
وہ اپنے آپ کو سمجھے ہوئے ہیں جنٹلمن! — اور اپنی قوم کے لوگوں کو جانتے ہیں گنوار

مولانا نے پہلی سانس اور مسکراہٹ سے لے کر جشنِ سالگرہ جوانی تک زندگی کا مشاہدہ ایک خاص زاویہ نگاہ اور ہمدردی کی فضا میں کیا تھا۔ چنانچہ مہر مادری اور بچہ کی نگہداشت اور غرض کی بجاآوری کے متعلق ان کے محسوسات و مشاہدات ملاحظہ فرمائیے۔

بچہ اور ماں

مسکراتا ہے کیا ہی خوش ہو کر — جیسے چڑیا مگن ہو ڈالی پر
جبکہ سونے کا وقت ہے آتا — میرے سینے سے ہے چمٹ جاتا
جبکہ آنکھوں میں نیند آتی ہے — بستر اس کا مری چھاتی ہے
نیند لے کر ہنسی خوشی سے اٹھا — پھول گویا کھلا چنبیلی کا!

ماں کی ممتا

بچہ سینے سے جو رہا ہے چمٹ — نہیں لے سکتی بے دھڑک کروٹ
پاؤں کی بھی نہ ہو ذرا آہٹ — کہیں ننھے کی نیند جائے اچٹ

اول اول کرتی تھپکتی جاتی ہے
ہولے ہولے سرکتی جاتی ہے

جب رہا وہ نہالچہ پر سو — چھوٹے تکیے لگا دیئے دو دو
کئے سب کام تھے ضروری جو — پر نہیں بھولتی ہے بچے کو

لیتی رہتی ہے ماں خبر ہر دم
اپنے بچے پہ ہے نظر ہر دم

پاؤں چلنا اسے سکھاتی ہے باتیں کرنا اسے بتاتی ہے

مولانا کے یہاں "افلاطونی محبت" ناپید ہے۔ وہ محبت کو ایک حسین جذبہ نہیں سمجھتے بلکہ اس کو ایک حسین ترفض قرار دیتے ہیں۔ وہ اس دنیا کو محبت کی جلوہ سامانی کے سوا کچھ نہیں سمجھتے۔ ان کے یہاں دنیوی محبت کے دو دور رہے ہیں۔

(۱) بچپن (۲) جوانی ـــــ اور اسی مجموعہ کا نام زندگی ہے

بچپن میں ماں باپ، بہن بھائی اور دوسرے رشتہ دار اں کر محبت کا ایک جہاں بناتے ہیں لیکن جوانی میں وہ محبت سمٹ کر ایک دوسرا نام اختیار کر لیتی ہے اور ایک دوسری دنیا آباد ہوتی ہے جس میں ایک شخص اجنبی کا اضافہ ہو جاتا ہے ـــ جس کو ایک مصرعہ میں مولانا نے یوں کہا ہے ـــ

"جوانی میں بڑھا اک اور ہمسر محرم جانی"

اور یہ اجنبی دو دل زندگی کا سفر کر کے ایک نئی منزل پر پہنچتے ہیں ـــ دونوں کی محبت کا ثمر "رشک لعل رمانی" بن کر زندگی کو سجاتا ہے۔ اور اس طرح نسل در نسل اس محبت سے انسانی زندگی کو ابدیت کا جام ملتا رہتا ہے۔ اب محبت پر مولانا کا انداز فکر ملاحظہ فرمائیے۔

محبت ہے ترے پرتو سے روشن عالم فانی
جو دھندلی ہو کرن تیری تو آبادی ہو ویرانی

جہاں مخلوق حیوانی میں چمکا فہم کا جوہر
وہاں تیری حکومت بھی تہہ دل سے گئی مانی

ترے قانون کے تابع ہیں وحشی و طیر و دام و دد
جھکا دیتی ہے تیرے سامنے سر طبع انسانی

تھے بچپن کے تو مونس مادر و بابا بہن بھائی
جوانی میں بڑھا اک اور ہمسر محرم جانی

پھر اس کے بعد بستان تمنا جب پھلا پھولا
تو اک غنچہ کھلا گلبن میں رشک لعل رمانی

وہ قوم و ملک کی بہبود اور انسانیت کی عام بھلائی کیلئے دو چیزوں کو بہت اہم سمجھتے تھے۔ (۱) تعلیم (۲) کاشتکاری ـ مزدوری ان کی نگاہ میں اچھی نہ تھی۔ مگر کسان کی عظمت ان کے دل میں بہت تھی وجہ ظاہر ہے ملک میں صنعتی پیمانے پر کام نہیں ہوا تھا۔ اور آج بھی اصل ہندوستان "دیہات" میں بستا ہے اور کسان ہی ملک کی اصلی طاقت ہے۔ ہندوستانی کسان کی طاقت میں انسانیت کا فروغ دیکھنا مولانا کی بلند نگاہی کا ضامن ہے

کاشتکاری

گنج زر خاک سے اگلوایا
کیمیا شغل کاشتکاری ہے

نہیں حاصل پہ دسترس نہ سہی
بیج بونا تو اختیاری ہے

سرسری ساگ پات کو مت جان
اس پہ تو زندگی ہماری ہے

ساہل سے گھٹا نہ پیداوار
یہ تو بڑھیا گنا بگاری ہے

کچھ نہ کچھ کام کر اگر سمجھو
آدمیت کی پاسداری ہے

تعلیم کی ان کے یہاں بہت اہمیت تھی — انہوں نے قوم کے ذہن کو ہموار بھی کیا اور عملی طور پر دلچسپی بھی لی مثلاً

جھوٹی نفرت

لا کے چیزیں بنا کے بیچیں انگریز — سب کرتے ہیں دندان ہوس ان پر تیز
چڑتے ہیں مگر علوم انگریزی سے — گڑ کھاتے ہیں اور گلگلوں سے پرہیز

امداد خدا

کرو امداد یونیورسٹی کی — کہ یہ امداد، امداد خدا ہے
مہم سر ہو چکی تھوڑی مدد اور — کنارے پر سفینہ آ لگا ہے

مامن اطفال

آپ کو معلوم ہے مامن اطفال قوم — شہر میں صرف ایک ہے مدرسہ فیض عام
اس کی مدد کیجئے خاص توجہ کے ساتھ — اپنی مدد آپ ہے اس کی مدد والسلام

وہ مدرسہ اب فیض عام انٹر کالج میرٹھ کی صورت میں جاری ہے۔ مولانا اس کے ٹرسٹی اور وائس پریسیڈنٹ رہ چکے ہیں مولانا لڑکوں سے زیادہ لڑکیوں کی تعلیم کے خواہاں تھے۔ وہ جانتے تھے کہ لڑکے کی تعلیم ایک فرد کی تعلیم ہے اور اور ایک لڑکی کی تعلیم ایک خاندان کی تعلیم ہے۔ اسی لئے ۱۹۰۹ء میں مدرسہ بنات المسلمین کی بنا ڈالی جو ۱۹۲۵ء میں محمد اسمٰعیل گرلز اسکول بنا اور اب ان کے صاحبزادے خان بہادر محمد اسلم سیفی صاحب کی توجہ اور محنت کی بدولت اسمٰعیلیہ گرلز ڈگری کالج کی صورت میں فیض عام کا سرچشمہ بنا ہوا ہے۔

مولانا کا ذہن سیاسی نہ تھا نہ سیاسی تحریکوں کے سمجھنے کی ان میں بصیرت تھی یعنی ان کی ہمدردی "مظلوم" کے ساتھ تھی۔ شہنشاہ زار روس نے ترکی پر یورش کی تو وہ بے تاب ہے اور اپنے خیال کو یوں ظاہر کیا ہے:" جنگ روم و روس" ۱۹/ اکتوبر ۱۸۷۷ء کی تخلیق کا ایک بند۔

محمود روز عید ہے دل سے دعا کرو — حامد یہ التجا بحضور خدا کرو
ترکی سپاہ میں علم فتح ہو بلند
پہنچے سپاہ زار کو آزار اور گزند

مولانا کم آمیز اور کم گو تھے لیکن میرٹھ میں ترک مجروحین کے امدادی جلسہ میں شرکت آور تقریر کی۔ یہ تقریر ۱۸۷۷ء میں نجم الاخبار میں چھپی تھی۔ اور سرسید نے تہذیب الاخلاق میں اس کا اثر کچھ اس انداز میں ظاہر کیا تھا: "اب مجھے اپنے مرنے کا افسوس نہیں کہ اردو میں ایسے لکھنے والے پیدا ہو گئے ہیں۔ جیسا یہ تحریر ہے۔"

مولانا بہترین مسلمان تھے۔ خدا کے سچے عاشق اور مخلوق خدا کے سچے فدائی انسان دوست۔ تعصب سے

بہت وبڑی محبت ہی محبت ۔ تعلقات کی پاسداری کا یہ عالم کہ پنڈت چمپا لال کی کتاب "سدرشن کا میلہ" جو تصوف کے موضوع پر ہے۔ اس طرح عبارت دیکھی کہ اس کو بدل کر مقبول کتاب بنا دیا۔ ڈاکٹر وزیر سنگھ اسسٹنٹ سرجن نے اناٹومی اور فزیالوجی کی کتابوں کا ترجمہ کیا اور مولانا سے اصلاحی نظر کی درخواست کی۔ مولانا نے دلچسپی اور محنت سے عبارت کو درست کیا۔ ڈاکٹر رام بخت سنگھ سیول سرجن اور رائے بہادر منشی پراگ نارائن بھارگو مولانا کے بہتر دوستوں میں تھے مولانا کی ایک خوبی کردار یہ تھی کہ وہ عام بھلائی کی خاطر اپنی رائے اور عمل سے پوری طرح سامنے آتے تھے۔ میرٹھ میونسپل بورڈ کے الکشن میں انہوں نے ہمیشہ حکیم فخرالدین اور لالہ نیادر سنگھ کی طرفداری کی اس لئے کہ وہ ان حضرات پر اعتماد رکھتے تھے کہ وہ شہریوں کی خدمت کرسکیں گے۔

مولانا کے یہاں زندگی صحت مند اور متحرک انداز میں ملتی ہے۔ معاشرے کی خامیوں سے ملول ہونے کے باوجود ان کا ذہن رجائی تھا اور وہ انسان کے مستقبل سے مطمئن تھے ۔ ان کی نظم ـــــ "وہ اچھا زمانہ آنے والا ہے" کے دو بند ملاحظہ فرمائیے ـــــ

عقیدوں کی مٹ جائے گی سب رقابت — مذاہب کو ہوگی تعصب سے فرصت
نگراں کی بڑھ جائے گی اور طاقت — کہ دو مژدہ آتا ہے اچھا زمانہ

کریں سب مدد ایک کی ایک مل کر — یہی بات واجب ہے ہر مرد و زن پر
لگے ہاتھ سب کا تو اٹھ جائے چھپر — کہ دو مژدہ آتا ہے اچھا زمانہ

انسان کا رتبہ ان کی نظر میں بہت بلند تھا۔ ان کی خواہش تھی کہ انسان محبت کے ذریعہ اس دنیا کی نعمتوں سے فیضیاب ہوکر اپنی زندگی کو بہتر بنائے ـــــ ۱۸۸۰ء میں ایک نظم "انسان" کہی تھی۔ ایک بند نہایت قابل توجہ ہے۔

ابر و باد و مہ و خورشید مرے کام میں ہیں
مرغ و ماہی و دد و دام مرے دام میں ہیں
آب و آتش مری خدمت کے سرانجام میں ہیں
کل جمادی و نباتی مرے خدام میں ہیں
مجھ میں قدرت نے عجب فضل و شرف رکھا ہے
میں نے فردوس کے میووں کا مزا چکھا ہے

وہ انسان کے اندر یہ اوصاف دیکھنا چاہتے تھے۔

حصول علم و رہ مستقیم و فہم سلیم
جمال صورت و معنی ۔ کمال عزّ و وقار

اور ان کی انسان دوستی سماج کے ہر فرد میں ـــــ "معاش نیک و دل پاک و خوبیٔ کردار" کی تلاش میں رہتی تھی۔ مولانا کا اس بچکانہ عقیدہ میں اعتقاد نہیں کہ بنی نوع انسان کو "برائی" اور "بھلائی" کے دو تنگ گھروندوں میں بانٹا جاسکتا ہے۔ وہ واقف ہیں کہ زیادہ

جگن ناتھ آزاد

اشعار

—(۱)—

منزل ہے اگر دور تو کیا اس کا مجھے غم
میرے لیے گردِ رہِ منزل ہی بہت ہے
بس ایک سہارے سے زیادہ نہیں درکار
اب دل جو نہیں ہے تو غمِ دل ہی بہت ہے
ہاں کہہ کے یہی ڈوب گیا ڈوبنے والا
ساحل نہ سہی حسرتِ ساحل ہی بہت ہے

—(۲)—

پہنچا ہے دردِ عشق بہت دور دور تک
تیری نظر سے میرے دلِ ناصبور تک
نام اس کے مختلف ہیں مگر حسن ایک ہے
ارضِ دکن سے لے کے بلندیٔ طور تک

—(۳)—

کس طرح اب مچے گی بہارِ چمن کی موج
اب میں ہوں اور کسی کے شمیم بدن کی موج
اے دل! ترے سفینۂ ضبطِ جنوں کی خیر
سمٹا ہوا بھنور ہے کہ بحرِ دکن کی موج
آزادؔ اپنے اپنے مقدر کی بات ہے
زنجیر بن گئی ہے نسیمِ چمن کی موج

مخدوم محی الدین

خوابِ بیداری

(ایک پرانی نظم جو "سرخ سویرا" میں شامل نہ ہو سکی اور نہ شاعر کے ذہن میں محفوظ تھی (ادارہ)

جمالِ حسن نے پھر گدگدایا دل کے تاروں کو
مری رگ رگ سے نکلیں گے تمناؤں کے فوارے
پری چہروں نے مجھ کو لے لیا ہے اپنے جھرمٹ میں!
تبسم سے اشاروں سے بلاتے ہیں مجھے سارے
قیامت قامتاں مژگاں دراز ان، شوخ رفتاراں
شرارے، چلبلے، سیماب تن، نوخیز مہ پارے
شراب آنکھوں سے ڈھلکاتے لبوں سے پھول برساتے
چلے منہ پھیر کر ترچھی نظر کی برچھیاں مارے
گلابی آنچلوں کی اوٹ سے ناوک فگن آنکھیں
نقاب ابر سے جس طرح جھانکیں چرخ پر تارے
بوقت رنگ پاشی کنگنوں کی زمزمہ ریزی
کہ گویا بج رہے ہیں چاندنی راتوں میں اکتارے
کسی کی سانس کی گرمی مرے ہونٹوں کو چھوتی ہے
مری آنکھوں میں چھا جاتا ہے نشہ نیند کے مارے

مطبوعہ "الاعظم" ہفتہ وار (ادبی نمبر) فروری ۱۹۳۵ء

محمد منظور احمد

غزل

(نذرِ فیض احمد فیض)

ہر دور میں انعام لیے بے بصری نے
موتی ہی لٹائے ہیں یہاں دیدہ وری نے

وہ جس نے ستاروں پہ بھی ڈالی ہیں کمندیں
برباد کیا اس کو فقط خود نگری نے

اک شہرِ غزل صاف نگاہوں کے ہے آگے
پہنچایا یہاں تک تو ہے شوریدہ سری نے

ہر مرحلۂ غم سے جو ہنستے ہوئے گزرے
اعجاز دکھایا ہے یہ صاحب نظری نے

الزام کسی پر نہیں بربادیٔ دل کا
وارفتہ کیا تھا ہمیں وحشت اثری نے

اک سوزشِ پنہاں ہے تڑپتے رہو منظور
سمجھا ہی نہیں اس کو کبھی چارہ گری نے

خرد غوث پوری

ابھی تزئینِ گلشن میں کمی معلوم ہوتی ہے
کہ پژمردہ ہر اک گل ہر کلی معلوم ہوتی ہے
مجھے اس وقت ہر سو تیرگی معلوم ہوتی ہے
نگاہِ دوست میں کچھ برہمی معلوم ہوتی ہے
نفس کی آمد و شد تک ہی دنیا میں بہاریں ہیں
کہ جب تک ہے چراغاں روشنی معلوم ہوتی ہے
سلوکِ اہلِ گلشن رقص کرتا ہے نگاہوں میں
بیاباں میں بھی مجھ کو دلکشی معلوم ہوتی ہے
حصولِ زر کی خاطر آدمی کا آدمی دشمن
جہاں سے آدمیت ختم ہی معلوم ہوتی ہے
فروزاں ہے چراغِ عزم جس کے خانۂ دل میں
اندھیرے میں بھی اس کو روشنی معلوم ہوتی ہے
وہی رنگینیٔ عالم وہی تم ہو وہی میں ہوں
مگر جوشِ محبت میں کمی معلوم ہوتی ہے
خزینہ ہے مرا دل آج اسرارِ محبت کا
ہمیں کونین کی دولت حقیر معلوم ہوتی ہے
زمانے کی خرد جس نے ہمیشہ ناخدائی کی
اسی کی آج کشتی ڈوبتی معلوم ہوتی ہے

شکیب (علیگ)

(سانیٹ)

طوفِ محمل

سُن اے محمل نشیں مجھ سے وہ آخر ماجرا کیا تھا؟
اٹھا کر پردۂ محمل جسے تو نے بھی دیکھا تھا
پرستار اپنا جس کو تو نے اس صحرا میں سمجھا تھا
جلو میں کارواں کی جو جنوں جولاں بھٹکتا تھا

وہ تیرے آستاں کا کوئی ٹھکرایا ہوا ہوگا
کوئی مجنونِ غم ہوگا کوئی وحشت ادا ہوگا
بگولا کوئی تیری رہ میں پاگل ہو گیا ہوگا
کوئی دیوانہ شعلہ محوِ طوفِ حسن تھا ہوگا
شبِ صحرا کے سینے سے کوئی نالہ اٹھا ہوگا
کسی کا دل بکھر کر گردِ ناقہ بن گیا ہوگا
ترا ہی خوابِ وحشت یوں نظر پہ چھا گیا ہوگا
کوئی آسیب کوئی وہم کوئی خواب تھا ہوگا

یہ ممکن ہے تری نظروں کو دھوکا ہو گیا ہوگا
وہ کچھ بھی ہو اسی صحرا میں آخر کھو گیا ہوگا

بلبلِ ہند مسز سروجنی نائیڈو

مترجم:- احمد حسین خاں

امپیریل دہلی

اے شہنشاہانہ دلی، حسنِ شاہانہ مدار
شوکتِ تازہ میں تیری رخِ قدما کا فشار
قومِ مفتوحہ کے شاہوں کے مصائب کا شکار
اشک ہائے یادِ ماضی، تیرے چہرہ کی بہار
گو بجھے لگتی ہے تیرے دل کی تازہ خرمی
بادشاہانِ سلف کی مرقدوں پر بار بار
گود کو تیری بنایا ہے جنھوں نے خوابگاہ
زندگی کی آخری نیندوں کے ماتے، صد ہزار

سلطنت کو منقلب گو بادشاہوں نے کیا
جن کے عہدِ رفتہ کے ہیں اب صرف قصے شاندار
ہاں مگر دلی نہیں تو منقلب ہرگز ہوی
فخر یہ تاریخ کا ہے تو نشانِ برقرار
ہے رموزِ سابقہ کی تو پجارن نوجواں
موت کا جادو بھی ہے درگزر میں تیری نابکار

روشن پٹیالوی

قطعات

جدّتِ فکر

زندگی اب بھی ہے پابندِ روایاتِ کہن — آدمی کا ہے وہی آج بھی فرسودہ چلن
بزمِ دنیا پہ ہے اوہام کی ظلمت طاری — جدّتِ فکر کی پھوٹی نہیں پُر نور کرن

پائے طلب

ہر ایک گام پہ تیرِ ستم نے وار کیا — فریبِ حسنِ نظر نے ذلیل و خوار کیا
ہمارے پائے طلب میں نہ آسکی لغزش — سہارے عزم کے راہِ وفا کو پار کیا

ہنستا ہوا سویرا

امید کی ضیا سے پھیلا ہے وہ اُجالا — کافور ہو گیا ہے آفات کا اندھیرا
راہِ حیات ایسی پُر نور ہو گئی ہے — جیسے ہو مسکراتا ہنستا ہوا سویرا

ہمتِ جواں

حوصلہ میرا فلک پیما ہے ہمت ہے جواں — ہاں اٹھالوں گا غمِ ہستی کا میں بارِ گراں
دل میں روشن ہے مرے پختہ ارادوں کا چراغ — مجھ سے پوشیدہ نہیں ہے اپنی منزل کا نشاں

نظامِ کہنہ

نظامِ کہنہ کی بنیاد تک ہلا ڈالو — نئی حیات کے ایوان کی بنا ڈالو
ضیائے علم سے روشن کرو وطن اپنا — نشانِ ظلمتِ اوہام کو مٹا ڈالو

مراحلِ دشوار

کئی مراحلِ دشوار سے گزرنا ہے — ابھی تو بحرِ حوادث کو پار کرنا ہے
بنی ہوئی ہے جو تصویرِ حال مدھم سی — حیاتِ نو کا حسین رنگ اس میں بھرنا ہے

حکیم یوسف حسین خاں

مرجھائے ہوئے پتے

خدا کے نغمے
جو گم گئے تھے
کبھی ازل میں
زمیں پہ اترے تو بن کے اترے
زبانِ شاعر، بیانِ شاعر!

چمن میں
شاخِ گلِ حنا پر
کبھی جو جھانکی
نئی نویلی سی ایک کونپل
(ضعیف و نازک
شبک سی کومل)
تو ہم نے پلکوں پہ لے کے اس کو
حرم سجائے
اور اس کی تقدیس و معرفت کے
تمام دنیا میں
گیت گائے!

خزاں جب آئی
خزاں۔ جو ہے غمزۂ بہاراں
تو اہلِ دنیا نے
یہ نہ سوچا
کبھی تو انگڑائی ختم ہوگی

ہر ایک برگ خزاں رسیدہ
گلوں کی قوس قزح سے نوچا
نہ روحِ لرزاں
نہ یادِ یاراں
نہ کوئی غمگیں۔ نہ آبدیدہ!

چمن چمن میں
روش روش پر
ہزار برگ خزاں رسیدہ
تمازتوں میں
لرز رہے ہیں
فریب خوردہ کرم گزیدہ!
اور آج اے رہبرانِ ملت
انھیں ہمارے نفس کے طوفاں
گلی گلی کھڑکھڑا رہے ہیں!
کبھی جو تھا آیت الٰہی
حدیث و قرآں کے درمیاں تھا
مقام جس کا
اٹھا کے اس کی صلیب کو ہم
دکھا دکھا کر نچا رہے ہیں!
ہم اپنی مضبوط
انگلیوں سے
شکستہ تارِ رباب دل پر
وہ غم زدہ

زرد زرد نغمہ
وہ ڈوبتی لَے
وہ ٹوٹتا سُر
برائیوں کو سنا رہے ہیں

خدا کے نغمے
جو بن چکے ہیں
زبانِ شاعر، بیانِ شاعر
مقام اُن کا
(معاف کرنا!)
حدیث و قرآں کے درمیاں ہے
جہانِ تازہ کے رہنماؤ!
صحیفۂ آسماں کے دل میں
انھیں بٹھاؤ
انھیں چھپاؤ!
نہ دو انھیں کاسۂ گدائی
برہنہ سر اُن کو مت پھراؤ!

خزاں کا کیا ہے؟
خزاں بہاروں کی اک ادا ہے
کبھی تو
انگڑائی ختم ہوگی!!!

سید حرمت الاکرام

شعورِ کیف وکم نے جب بھی کوئی راز کھولا ہے
تو دنیا نے مری ویران نظروں کو ٹٹولا ہے
خلاؤں میں کھنک اٹھے ہیں جیسے شہد کے پیالے
تمھاری اوٹ سے اے چاند تارو! کون بولا ہے
بقدرِ غم نشاطِ زندگی ملتا ہے انساں کو
ہمارے دل نے اس میزان پر دنیا کو تولا ہے
بڑی مشکل سے ٹھہری ہے طبیعت شامِ تنہائی
کبھی نظاروں سے الجھا ہوں کبھی دل کو ٹٹولا ہے
کچھ ایسے اپنے دشمن تو نہیں لیکن نہ جانے کیوں
خود اپنی زندگی میں ہم نے اکثر زہر گھولا ہے
حبابِ دوستاں کی بات ہے کچھ اور ہی لیکن
کبھی اے چشمِ تر! تو نے کوئی موتی بھی رولا ہے
وہ اک لمحہ کہ دنیا رک گئی تھی اپنے محور پر
کسی کی یاد بن کر وقت کی نبضوں میں ڈولا ہے
ہوا ہے سوزِ آدم داستاں در داستاں رسوا
یہ دنیا بھی کسی انسان کے دل کا پھپھولا ہے
کبھی مدت پہ جب پہنچا ہوں میں اپنے قریں حرمت
تو میرا دل بھی مجھ سے اجنبی کی طرح بولا ہے

ریورنڈ ہینسن ریحانی

جب نگاہوں میں ہے وہ جلوۂ ناز
میں جھکاؤں کہاں جبینِ نیاز
فخرِ ناقوس اور نازِ اذاں
میرے دل کی شکست کی آواز
عقل کس کس کا انکشاف کرے
سارا عالم ہے راز اندر راز
میرے نغمے نہیں مرے نغمے
میں ہوں اک دلربا کا پردۂ ساز
خاک کے پتلے اور ہوائے فلک
یہ ہیں اس دور کے نشیب و فراز
ان کی آواز کون سنتا ہے
جو نہیں سنتے وقت کی آواز
آدمی کو جگا دیا تو نے
جوہری دورا تیری عمر دراز
جب ہے مرنا ہی تو وطن پہ مریں
آج دیتا ہے فرض یہ آواز
حق اسی کا ہے گل پہ ریحانی
جو بشر ہے چمن میں خار نواز

عطاالرحمٰن ارشاد

اس طرف یقین والے اس طرف گمان والے
دیکھئے کدھر جائیں آج کارواں والے

محوِ نظمِ گلشن ہیں بے خبر گلستاں والے
کیا ہوئی تیری غیرت برقِ بے اماں والے

جب کبھی بھی للکارا ہے قلم کی عظمت نے
ہٹ گئے ہیں میداں سے خنجر و سناں والے

تیرگی کے دل میں بھی آفتاب پلتے ہیں
جانے کیا سمجھتے ہیں ہم کو کہکشاں والے

انقلاب دنیا ہے اور کیا کہے کوئی
تیرگی سے ڈرتے ہیں ہر ضو فشاں والے

گھوم پھر کے دیکھا ہے ہم نے ہر نگر ارشاد
جس طرف نظر اٹھی اس طرف دکاں والے

اختر نظمی

مجھ پہ اور ان کی نگاہِ التفات
کاش ہوتی معتبر یہ دل کی بات

اللہ اللہ آرزوؤں کا ہجوم
گوشۂ دل میں نہاں ہے کائنات

جو بسر ہو جائے اس کی بزم میں
رشکِ عمرِ خضر ہے وہ ایک رات

ناگہاں ان سے نگاہیں مل گئیں
روز کب ہوتے ہیں ایسے حادثات

سچ ہے غم کو زندگی سمجھا ہوں میں
یہ بھی سچ ہے زندگی ہے بے ثبات

جانے کیا ان کی نگاہیں کہہ گئیں
لب تک آکر رہ گئی کہنے کی بات

اب بھی ہیں نظمی وہی تاریکیاں
ڈھل گئی کہنے کو رنج و غم کی رات

مظفر حنفی ہسوی

"منظور ہے گزارشِ احوالِ واقعی"

میری غزل سے سیکھ ادائیں نئی نئی
انگڑائیاں جو یاد پڑیں رات آپ کی
زنجیر کی ہر ایک کڑی ٹوٹتی گئی

اس نے بچا بچا کے نظر داستاں مری
کچھ اس طرح سنی کہ بظاہر نہیں سنی

عرصے کے بعد اب جو میسر ہوئی خوشی
آنسو نہیں رہے کہ اتر جائے آرتی

کچھ اس ادا سے بزم تری چونک سی پڑی
جیسے مرے بغیر نہایت اداس تھی

ہاں اے نگاہِ ناز ذرا دیکھ بھال کے
دل کو فریب کھانے کی عادت نہیں رہی

کیسے کریں وفا کی تمنا جناب سے
یہ سوچتے ہوئے بھی ہمیں شرم آئے گی

یوں شوق سے بیان قیامت سنائیے
لیکن جنابِ شیخ کبھی بات بھی بنی؟

یہ طنز یہ زبان مظفر انھیں کی ہے
مطعونِ رامپور جو ہیں شاد عارفی[1]

---

[1] استاد محترم

مظفر حنفی ہسوی

مجھ کو بلا رہا ہے اڑا کر غبار کیوں
اے کاروانِ شوق مرا انتظار کیوں

پھولوں سے چھیڑ چھاڑ میں کچھ شاعری تو ہے
کانٹوں کو چھیڑتی ہے صبا بار بار کیوں

افواہِ ابر و بادِ خزاں سچ نہ ہو کہیں
مہندی رچا رہی ہے عروسِ بہار کیوں

اس عہد میں ضرور کوئی خاص بات ہے
دو ایک ہوں تو خیر سبھی بے قرار کیوں

میں دیکھنے کی طرح کبھی دیکھتا نہیں
پھر آپ کی نگاہ ہوئی شرمسار کیوں

دورِ شباب خود ہی قیامت سے کم نہ تھا
ہم دیکھتے شبابِ غمِ روزگار کیوں

اپنا ہی حالِ زار اگر زیرِ غور تھا
کرتے تمام رات ترا انتظار کیوں

ہر اک سپاٹ راہ پہ ہمراہ آپ کے
آتے رہے ہزار چڑھاؤ اتار کیوں

کیا ہو گیا مظفرِ آشفتہ حال کو
ہنستا ہے اپنے آپ پہ دیوانہ وار کیوں

سندھی سے

محترمہ کلا پرکاش

ترجمہ

ممتاز ارشد (اجمیری)

ممتا اور مسکان

ممتا کی یہ امر مورت میرے سامنے بے حس و حرکت پڑی ہوئی ہے۔ وہ خود تو مر چکی ہے مگر ممتا کو امر بنا گئی ہے۔ اس کی ایک ایک بات مجھے یاد آ رہی ہے اور میں اپنی پلکوں کے کناروں پر نمی محسوس کر رہی ہوں۔

جب رات کو میری باری آئی تو دن والی نرس نے مجھے بتایا کہ "شاید آج ہی رات کو اس کے بچہ ہو جائے کیونکہ آثار کچھ ایسے ہی نظر آ رہے ہیں۔"

"اچھا" میں نے خوشی سے اس کے دونوں ہاتھ پکڑ لیے۔ پھر اس کے زرد چہرے کی طرف دیکھ کر ایک شرارت بھری مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔

"اب صرف دو تین گھنٹوں کی دیر اور ہے۔ بولو تمہیں منو چاہیے یا منی؟"

حالانکہ درد زہ کی شدت سے اس کا چہرہ پسینہ میں تر تھا۔ مگر اس کے باوجود بھی وہ میرے اس سوال پر مسکرا اٹھی۔ شاید یہ اس کا پہلا بچہ تھا۔ میز سے گھنٹی اٹھا کر اسے دیتے ہوئے میں نے کہا — "یہ لو اگر درد زیادہ بڑھ جائے تو اسے زور زور سے بجانا۔ میں جہاں بھی ہوں گی فوراً تمہارے پاس پہنچ جاؤں گی۔"

اس نے گھنٹی لے کر تکیے کے نیچے رکھ لی۔

رات کو تقریباً تین بجے اس نے فوراً گھنٹی بجائی۔ میں فوراً اس کے پاس پہنچ گئی۔ وہ بستر سے اٹھی اور سرہانے رکھے ہوئے دو تین گلاب کے پھول اٹھا لیے۔ میں نے اسے سہارا دیتے ہوئے پوچھا۔

"کیا یہ پھول تم ڈلیوری روم میں بھی لے چلو گی؟"

اس نے جواب دیا — "نہیں! یہ تو میں تمہیں دے رہی ہوں سسٹر"

پھولوں سے اسے بے حد پیار تھا۔ اس سے میرا تعارف بھی انہیں پھولوں ہی کی وجہ سے ہوا تھا۔ نیچے "آؤٹ پیشنٹ ڈیپارٹمنٹ" میں جب وہ ہر روز انجکشن لگوانے آتی تو مجھے یاد نہیں آتا کہ کبھی بھی وہ چپ چاپ چلی گئی ہو۔ دوسری عورتوں کی طرح اس نے میرا وقت کبھی برباد نہیں کیا۔ اسی لئے جب وہ اسپتال کے کمرے میں داخل ہوتی تو میں مسکرا کر اس کا استقبال کرتی۔ ایک دن وہ مجھے گلاب کا ایک پھول دیتے ہوئے بولی — "حالانکہ تم مجھے نہیں جانتی ہو پھر بھی تم روزآنہ میرا استقبال مسکرا کر کرتی ہو اسی لئے یہ پھول تمہیں دے رہی ہوں۔ کیا تم انہیں قبول کرو گی؟"

میں نے خوش ہو کر کہا — "ضرور"

اس وارڈ میں وہ پچھلے ہفتہ سے تھی۔ اس کا شوہر چندر روزآنہ اس کے لئے گلاب کے پھول لاتا تھا۔ پہلے روز کی بات ہے۔ اس وقت میں ڈیوٹی پر تھی اور چندر اسے دیکھنے آیا تھا۔ اس نے مجھے بلایا اور اپنے شوہر سے میرا تعارف کرایا۔ ڈلیوری روم کی باہری دیواروں پر بہت سے خوب صورت اور صحت مند بچوں کی تصویریں آویزاں ہیں۔ چند

نگاہیں ان تصویروں پر جم گئیں۔ وہ کچھ جھجک کر بولا ـ" مجھے سڈول اور خوبصورت بچے بہت اچھے معلوم ہوتے ہیں۔
کہنے کو تو وہ یہ بات کہہ گیا مگر دوسرے ہی لمحے وہ جھینپ گیا۔ اب چندر آتا ہی ہوگا۔ اسے ایسی منحوس خبر سنانے
کے لئے میں ہی کیوں یہاں ڈیوٹی پر ہوں۔ میں اتنی ہمت اپنے اندر کیسے پیدا کر سکتی ہوں کہ اسے بتا سکوں کہ
س کی شریک حیات اب اس دنیا میں نہیں ہے ابھی تو تھی۔ تین گھنٹوں کے ان مختصر لمحات میں کیا سے کیا ہو گیا
یں گیارہ سال سے اسی اسپتال میں کام کر رہی ہوں میرے سامنے سینکڑوں موتیں ہوئی ہیں لیکن میں کبھی متاثر
ہیں ہوئی۔ مگر میں آج اپنے آپ کو اتنا بے بس کیوں محسوس کر رہی ہوں۔ ابھی تو وہ یہاں تھی۔
صبح کی بات ہے چار بجے کے قریب وہ بڑے زور سے کراہی۔ نزدیک جا کر میں نے اسے تسلی دیتے ہوئے
کہا ـ" گھبراؤ نہیں، کیا درد زیادہ بڑھ گیا ہے"؟
وہ سسکتے ہوئے بولی ـ" پتہ نہیں مجھے کیا ہو رہا ہے؟ سسٹر! میں کچھ بتا نہیں سکتی"۔
اس کی آواز میں کتنا درد تھا؟ میں نے کان لگا کر اس کے بچے کی حالت معلوم کرنے کی کوشش کی۔ حالت
کچھ بگڑی ہوئی معلوم ہوئی۔ میں نے وارڈ بوائے کو بھیج کر ڈاکٹر کماری شاہ کو بلوایا۔ ڈاکٹر نے پندرہ منٹ تک اس کا
جائزہ کیا اور پھر ماتھے پہ شکنیں ڈالتے ہوئے کہا" ڈلیوری جلد ہی ہو جانی چاہئیے۔ نہیں تو اس کو خطرہ ہے"۔
میں نے قریبی وارڈ سے دو نرسیں اور بھی بلوا لیں۔ صبح کے پانچ بجے تک اس کا درد لگاتار بڑھتا رہا۔ آخر
ں وہ برداشت نہ کر سکی اور رو اٹھی۔ میں نے اسے تسلی دیتے ہوئے کہا ـ" ایسا نہ کرو، دیکھو.......
وہ میرے ہاتھ کو دباتے ہوئے بولی" سسٹر میں کیا کروں؟ مجھے خود شرم آ رہی ہے کہ میں رو رہی ہوں لیکن
کیا کروں؟ نہ جانے مجھے کیا ہو رہا ہے؟"
اتنی ہی دیر میں ڈاکٹر کماری شاہ واپس آ گئیں۔ انہوں نے اس کے خون کا دباؤ دیکھا اور پھر مجھے پاس
لا کر کہنے لگیں ـ" حالت نازک ہے"۔
حالت نازک ہے۔ مجھ سے بھی پوشیدہ نہیں تھا۔ ڈاکٹر نے زیادہ وقت نہ برباد کرتے ہوئے اس سے
فارم پر دستخط لئے اور اپنا کام شروع کر دیا۔ دس پندرہ منٹ میں بچہ ہو گیا۔
بچے نے' اوں آں۔ اوں آں' کی، ماں کے ہونٹوں پر مسکراہٹ دوڑ گئی۔ وہ مسکراہٹ ممتا کو عام کرنے
الی تھی۔ بچے کی اس گلابی رلائی اوں آں۔ اوں آں سے کیا ملا؟ کتنا ملا؟ یہ ایک ماں ہی بتا سکتی ہے۔
اس کی حالت پھر بگڑنے لگی۔ نبض کی رفتار لحہ بہ لحہ سست ہونے لگی۔ میں نے جب چوتھی بار اس کے
انجکشن لگایا تو وہ پگلی کیا پوچھتی ہے؟ ـ" سسٹر! بے بی کتنے پاؤنڈ کا ہے؟
میں نے بھرے ہوئے دل سے کہا" پانچ پاؤنڈ کا"۔
اس نے اپنی آنکھیں بند کر لیں اور دھیرے سے کہا ـ" تم چندر کو بتانا کہ ہمارا بے بی چھ پاؤنڈ کا ہے"
یرے دل پر گھونسہ لگا لیکن چہرا ہونٹوں پر مسکراہٹ لا کر میں نے کہا ـــ" اگر تم کہتی ہو تو میں چندر کو چھ پاؤنڈ
ہی بتلاؤں گی"۔
اس نے اپنی آنکھیں کھولیں، مسکرائی اور بولی ـــ" تم بہت اچھی ہو سسٹر!"

لیکن یہ کیا تھا؟ اس کی نبض کی رفتار انتہائی سست ہو چکی تھی۔ مگر اتنی خطرناک حالت میں ہوتے ہوئے بھلا وہ کیسے بول رہی تھی، کیسے مسکرا رہی تھی؟ موت دوڑتی ہوئی اس کی طرف آرہی تھی۔ اسپتال کا سارا عملہ اسے موت سے دور رکھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ اس کی زندگی اور موت کے درمیان کشمکش ہو رہی تھی۔ حالانکہ اسے خود اس بات کا ذرا بھی علم نہ تھا۔

موت اس کی آنکھوں کی چمک تو چھین سکتی تھی۔ لیکن اس کے ہونٹوں کی مسکراہٹ چھیننا موت کے بس کی بات نہیں تھا کیونکہ اس نے ایک زندگی کی تخلیق کی تھی۔ موت کو شکست دی تھی۔

ایک لمحہ کے لئے میرے دل میں خیال آیا کہ اسے بتادوں کہ اب وہ صرف کچھ گھڑیوں کی مہمان ہے۔ لیکن اس کی آنکھوں میں جو خواب پل رہے تھے ان کو توڑنے کی طاقت مجھ میں نہیں تھی۔ میں بھی ایک ماں ہوں۔ میں جانتی ہوں کہ اس وقت وہ کس قسم کے خوابوں میں کھوئی ہوئی تھی۔ گھر میں بچے کے لئے وہ نرالا بنا کر رکھ آئی ہوگی۔ ننھے بچے کو کہاں سلائے گی؟ کون سا دودھ پلائے گی؟ یہی سب باتیں وہ سوچ رہی ہوگی۔ شاید وہ یہ بھی سوچ رہی ہو کہ تھوڑا بڑا ہونے پر وہ بچے کو کون سے اسکول میں داخل کرائے گی؟

سب سے زیادہ گدگدی اسے تب ہوئی ہوگی جب اس نے سوچا ہوگا کہ شام کو چندر آئے گا اور ننھے بچے کو گود میں لے کر شرارت بھرے لہجے میں پوچھے گا "بے بی کتنے پونڈ کا ہے"۔ اور وہ فخر سے کہے گی "چھ پاؤنڈ کا"۔ چندر کہے گا۔ "سچ!"

اس وقت وہ کچھ ایسے ہی خواب دیکھ رہی تھی۔ جب اس کے بچنے کی کوئی امید باقی نہ رہی تو میں نے اس سے پوچھا "تمہارے گھر کے پاس کوئی فون ہے؟"

"ہاں ہے۔ تم چندر کو فون کروگی سسٹر"؟

میں نے ہمت کر کے کہا "ہاں میں چندر کو فون کر کے بلوا رہی ہوں"

وہ کھل اٹھی۔

اور جب میں فون کر کے واپس ہوئی تو اس کا جسم بے جان ہو چکا تھا۔ میری آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھا گیا۔ تھوڑی دیر پہلے جو مجھ سے باتیں کر رہی تھی وہ اب کہاں تھی؟ وہ اس کمرے میں جن پھولوں کو لے کر آئی تھی ان کی پنکھڑیاں ادھر ادھر بکھری پڑی تھیں۔

میں نے ان مرجھائے ہوئے پھولوں کی پنکھڑیاں جمع کر کے اس کے جگر کے ٹکڑے کے ننھے ننھے ہاتھوں میں تھمادیں اور اسے چومتے ہوئے کہا "تمہاری ماں سخت تکلیف کی حالت میں بھی رونے سے ترساتی تھی۔ اسے ہنسنا بہت اچھا لگتا تھا، تم اس کی نشانی ہو، عمر بھر ہنستے رہنا"۔

میں نے ایک بار پھر اس کی ممتا کی مورت کی طرف دیکھا۔ اس کے بے جان ہونٹوں پر ابھی تک مسکراہٹ کھیل رہی تھی۔

(مرہٹی سے)

دی - ایس - کھانڈیکر
ہندی ترجمہ: مسز راشد (اجمیری)

زمین کیسے ٹھنڈی ہوئی؟

بہت پرانے زمانے کی بات ہے
کسی باعث ایک بہت بڑے اور روشن گولے کے ٹکڑے ٹکڑے ہو گئے۔
ایک ٹکڑا دور بہت دور جا گرا۔
بھگوان کو اس ٹکڑے پر ایک نئی دنیا بسانے کی خواہش ہوئی اور انھوں نے اسے پانی میں ڈال دیا۔ اس ٹکڑے کا باہری حصہ ٹھنڈا ہو گیا۔ بھگوان نے بڑے پیار سے اس کا نام رکھا۔ زمین
بھگوان نے زمین سے پوچھا — "ارے تو اتنی اداس کیوں ہے؟ ذرا کچھ ہنس بول۔"
زمین نے جواب دیا — "صرف کہنے سے کہیں ہنسی آتی ہے۔ تمہیں کیا خبر کہ میرے سینے میں کیسی آگ دہک رہی ہے اور اس آگ کے سرد ہوئے بغیر ......
اور اس آگ کے سبب ہی تمام زمین تھر تھر کانپنے لگی۔ اس زلزلے کو دیکھ کر بھگوان بھی گھبرا گئے۔ بہت دیر تک سوچنے کے بعد وہ زمین سے بولے۔ "تیری اندرونی آگ کو سرد کرنے کے لئے میں ایک نئے ذی روح کی تخلیق کروں گا۔ اور اس کا نام ہوگا ...... انسان۔"
انسان کی تخلیق ہوئی۔
انسان نے دن رات محنت کر کے اس مٹی سے بھری ہوئی زمین کو پھولوں سے سجا دیا۔
اس محنت کی وجہ سے انسانی جسم سے جو پسینہ نکلا اس نے زمین کو گیلا کر دیا۔ دیکھتے ہی دیکھتے اس پر ہریالی چھا گئی۔ بادلیاں رقص کرنے لگیں۔ درخت اپنے لمبے لمبے ہاتھ پھیلا کر آسمان کو چھو لینے کی کوشش کرنے لگے اور کھیت سنہری فصلوں سے لہلہا اٹھے۔
زمین کی اس خوبصورتی کو دیکھ کر بھگوان کو یقین ہو گیا کہ اب اس کی اندرونی آگ ضرور سرد ہو گئی ہوگی۔
انھوں نے زمین سے پوچھا — "اب تو تیرے سینے کی آگ سرد ہو گئی نا؟"
زمین نے کوئی جواب نہیں دیا۔ لیکن دل کو بہت کچھ سنبھالنے کے باوجود اس کے منہ سے ایک سسکی نکل گئی۔
انسان چلا اٹھے — "دیکھو آتش فشاں پھوٹ پڑا۔"
بھگوان غصے میں بولے۔ "یہ زمین کبھی بھی سرد نہیں ہوگی۔ اس کے لئے میں نے ایک نئے ذی روح کی تخلیق کی۔ اور اس ذی روح نے کسی جادوگر کی طرح اس کی شکل تبدیل کر دی۔ اس نے اپنا پسینہ بہا کر اسے خوبصورتی عطا کی۔ لیکن اتنا کچھ ہونے کے باوجود بھی زمین کا رونا جھینکنا ابھی تک ختم نہیں ہوا۔" اور غصے میں آ کر انھوں نے

یہ عہد کر لیا کہ اب وہ زمین سے کبھی بات نہیں کریں گے۔

ادھر زمین پر ساری چیزیں تیزی سے بڑھ رہی تھیں۔ روپیہ، پیسہ، شہر، انسان اور اس کے ساتھ سا انسان میں دوسروں کو غلام بنا کر اپنے قبضہ میں رکھنے کی خواہش پیدا ہوئی۔ اور ان میں آپس میں لڑا شروع ہو گئے۔ دیکھتے ہی دیکھتے ان جھگڑوں نے جنگ عظیم کی شکل اختیار کر لی۔ زمین پر خون کے دریا۔

بھگوان نے سوچا انسانوں کے خون سے زمین کی آگ ضرور سرد ہو جائے گی۔

اور اپنے عہد کو توڑ کر بھگوان زمین سے ہنستے ہوئے بولے — "انسان کے پسینے سے تو تیری آ نہیں ہوئی۔ لیکن اس کے خون سے تو........

"وہ اور بھی زیادہ دہک اٹھی ہے" — زمین سسکتے ہوئے بولی

بھگوان کو بے حد غصہ آیا۔ وہ چلانے لگے — "تب تو تیری آگ کبھی سرد نہیں ہوگی۔ کیونکہ خون سے قیمتی انسان کے پاس کوئی دوسری چیز نہیں ہے۔"

اور بھگوان جنت میں جا کر سو گئے۔

بہت وقت گزر گیا۔

ایک دن بھگوان کو اپنی خواب گاہ میں ایک مدھر گیت سنائی دیا۔ وہ سُر ان کا جانا پہچانا تھا۔ زمین کا بھگوان کے تعجب کی انتہا نہ رہی۔ وہ بھاگتے ہوئے جنت کے دروازے پر آئے۔ اور وہاں کھڑے گیت سننے لگے۔

کتنا پُر سکون سُر تھا — دکھی زمین کے گلے سے ایسا سُر کیسے نکل سکتا ہے — ناممکن — آ کبھی پھول بھی کھلے ہیں۔

بھگوان کی حالت اس وقت ایک بچے کی مانند تھی — آخر کار وہ ضبط نہ کر سکے۔ اور زمین سے ا

"یہ سب کیا ہو رہا ہے"؟

"ہنسنا گانا"

"گانا! — ارے تیرے سینے میں تو آگ دہک رہی ہے۔ پھر تو گانا کیسے گا رہی ہے!

"وہ آگ ٹھنڈی ہو چکی ہے"

"آگ ٹھنڈی ہو چکی ہے"

"آگ ٹھنڈی ہو چکی ہے! کس نے ٹھنڈی کی"؟

"انسان نے"

"کیسے"؟

"اس کے دل میں پیدا ہوئے انسانی ہمدردی کے جذبے سے اور اس جذبے کے تحت اس کی آ ٹپکتے ہوئے آنسوؤں سے"

بیادگار ڈاکٹر سید محی الدین قادری زورؔ مرحوم

ادارۂ ادبیاتِ اُردو کا ترجمان ماہنامہ

سنہ اجرا ۱۹۳۸ء	فون نمبر ۳۵۲۰۹
۲ شمارہ ۱۰، ۱۱، ۱۲	اکتوبر، نومبر و ڈسمبر

سب رس

زورؔ نمبر

نگران

(پروفیسر عبدالمجید صدیقی

مجلس مشاورت

ڈاکٹر گوپی چند نارنگ ۔ نصیر الدین ہاشمی ۔ رمن راج سکسینہ ۔ منظور احمد ۔ وقار خلیل

معتمد

محمد اکبر الدین صدیقی

نہ ہندو پاک سے	چھ روپے
ششماہی	تین روپے
ممالک سے	دس روپے
نمبر کی قیمت	چھ روپے

ن الدین مہتمم ادارۂ ادبیات اردو کے اہتمام سے نیشنل فائن پرنٹنگ پریس میں چھپ کر ایوان اُردو
خیریت آباد۔ حیدرآباد دکن ۴ سے شائع ہوا۔

ترتیب

حصّہ اوّل

(۱) شخصیت

۱	زور صاحب!	نواب مہدی نواز جنگ گورنر گجرات	۹
۲	ایسا کہاں سے لاؤں!	حیرت بدایونی	۱۰
۳	خدا رحمت کند!	پروفیسر رشید احمد صدیقی	۱۱
۴	زور ایک اونچا انسان اور مخلص عالم	ڈاکٹر محمد باقر	۱۴
۵	ایک تاثر	خواجہ حسن ثانی نظامی	۱۷
۶	زور مشاعروں میں	محمود عبدالقدیر	۲۱
۷	ڈاکٹر زور سے میری آخری ملاقات	سید بادشاہ حسین	۲۶
۸	چند تاثرات	بدر شکیب	۳۱
۹	ڈاکٹر زور مرحوم	پروفیسر محمود حسین	۳۴
۱۰	ڈاکٹر زور صاحب	محمد اکبر الدین صدیقی	۴۰
۱۱	ڈاکٹر زور شخصیت	ڈاکٹر رحیم الدین کمال	۴۹
۱۲	استاذِ محترم	پروفیسر سید مبارز الدین رفعت	۶۵
۱۳	ڈاکٹر زور چند تاثرات	ڈاکٹر گوپی چند نارنگ	۷۱
۱۴	ڈاکٹر زور مرحوم	سیدہ جعفر	۸۲
۱۵	ڈاکٹر زور مرحوم	سید محمد مورخ بیدری	۸۷
۱۶	ڈاکٹر زور سے ایک ادبی ملاقات	قاضی عبادہ انصاری	۸۹
۱۷	ڈاکٹر محی الدین قادری زور	احمد جمال پاشا	۹۴
۱۸	ڈاکٹر زور صاحب	یوسف ناظم	۹۵
۱۹	ڈاکٹر زور مرحوم چند تاثرات	پروفیسر سید احتشام حسین	۹۸
۲۰	اردو کا فدائے دکن ادیب	محمد خاں	۱۰۲
۲۱	ڈاکٹر زور کی شخصیت	سید محمد اکبر وفاقانی	۱۰۸
۲۲	شاہ گنج سے ایوانِ اردو تک	پروفیسر سید محمد	۱۱۲
۲۳	آسمان اردو ادب کا ایک اور تارہ	احمد الدین احمد	۱۱۵
۲۴	ڈاکٹر زور حیدرآباد سے کشمیر تک	حبیب ابراہیم	۱۱۸
۲۵	ڈاکٹر زور مرحوم	جہاں بانو نقوی	۱۲۱
۲۶	زور صاحب	نظر حیدرآبادی مرحوم	۱۲۴
۲۷	ڈاکٹر زور۔ ایک دوست	پنڈت ونشی دھر ودیالنکار	۱۲۷
۲۸	حسب قاعدہ	احمد جلیس	۱۳۱
۲۹	ڈاکٹر زور سے چار ملاقاتیں	کنور مہندر سنگھ بیدی سحر	۱۳۵
۳۰	چند یادیں چند آہیں	میر یٰسین علی خاں	۱۳۸
۳۱	ڈاکٹر زور کشمیر میں	محمد یوسف ٹینگ	۱۴۵
۳۲	ڈاکٹر زور کی شخصیت	وقار خلیل	۱۴۹
۳۳	بابا کی زندگی کے آخری تیس دن	سید رفیع الدین قادری	۱۵۵

(۲) فن

۱	تاریخ دکن میں ڈاکٹر زور کا حصہ	پروفیسر عبدالمجید صدیقی	۱۶۱
۲	میرے عزیز دوست ڈاکٹر زور مرحوم	نصیر الدین ہاشمی	۱۶۴
۳	ڈاکٹر زور کی شخصی اور ادبی زندگی	سید حرمت الاکرام	۱۷۰
۴	دکنی اردو ادب کا ایک محقق	ڈاکٹر موہن سنگھ دیوانہ	۱۷۹
۵	اردو لسانیات کے ابوالآبا	ڈاکٹر گیان چند	۱۸۷
۶	لسانیاتی ادب میں ڈاکٹر زور کا حصہ	مولوی غلام رسول	۱۹۱

۷	زورؔ - ایک ماہر لسانیات	ڈاکٹر خلیق انجم	۱۹۷	۱۰	ڈاکٹر زورؔ کی عظمت	انوار ظہوری	۲۰۹
۸	ڈاکٹر زورؔ کے تین لافانی کام	رشید الدین	۲۰۲	۱۱	ڈاکٹر زورؔ اور مخطوطات کے تذکرے	محمد اسحٰق ایوبی	۲۲۰
۹	ڈاکٹر زورؔ کا تنقیدی شعور	پروفیسر انور علی انور	۲۰۴	۱۲	زورؔ مرحوم کی شاعری	حکیم یوسف حسین خاں	۲۲۴
				۱۳	ادارۂ ایوانِ اردو	محمد اکبر الدین صدیقی	۱۳۴

۳

منظوم خراجِ عقیدت

۱	رباعیات	تلوک چند محروم	۲۲۱	۲۴	اے وادیٔ کشمیر ....!	میر یٰسین علی خاں	۲۶۲
۲	رستہ بتانے والا رستے میں کھو گیا جی	سلیمان خطیب	۲۲۲	۲۵	خلوص کا سلام	جمیل نقوی	۲۶۳
۳	زورِ دکن	پروفیسر بیگم ثریا سلیم	۲۲۳	۲۶	اے زورؔ	مجیب خیرآبادی	۲۶۴
۴	فخرِ تہذیبِ دکن	روحی علی اصغر	۲۲۴	۲۷	آہ ڈاکٹر زورؔ	نصیر عارف	۲۶۵
۵	جانِ دکن	خورشید نذیر	۲۲۵	۲۸	ادیبِ مشرق	انوار ظہوری	۰۶۶
۶	ڈاکٹر زورؔ	جگناتھ آزاد	۲۲۶	۲۹	ڈاکٹر زورؔ کی وفات پر	مظہر کامل	۶۹
۷	ڈاکٹر زورؔ	پروفیسر شیخ فرید	۲۲۷	۳۰	آہ ڈاکٹر زورؔ	محمد اکبر الدین صدیقی	۰۰
۸	زورؔ کی رحلت پر	معین الدین عارف بیابانی	۲۲۸	۳۱	ڈاکٹر زورؔ کی یاد میں	〃 〃	۰۱
۹	اردو کے قافلہ سالار	وامق بدایونی	۲۲۹	۳۲	قطعۂ تاریخ	پروفیسر ایس ایل بخشی اختر	
۱۰	گوہرِ ارضِ دکن	حمید رونق	۲۵۰	۳۳	میں نے تجھے دیکھا تو نہیں!	ڈاکٹر عزیز تمنائی	۰۲
۱۱	آہ حضرتِ زورؔ	سید احسان علی عرشی	۲۵۱	۳۴	قطعہ	سلیمان خطیب	۰۳
۱۲	آخری پیغمبرِ اردو	ابو سعد سید اسمٰعیل	۲۵۲	۳۵	〃	مغیث الدین فریدی	
۱۳	ڈاکٹر زورؔ	خورشید احمد جامی	۲۵۳	۳۶	〃	نفیس گلبرگوی	
۱۴	ایوانِ اردو کا چراغ	سعادت نظیر	۲۵۴	۳۷	قطعۂ تاریخ	محمد عزیز الدین مشہر اللہ ذکی	
۱۵	بیادِ ڈاکٹر زورؔ	بادا کرشن گوپال مغموم	۲۵۵	۳۸	〃 〃	ڈاکٹر من علی نیساں	
۱۶	آخری آنسو	صلاح الدین نیر	۲۵۶	۳۹	〃 〃	بشیر احمد خاں	۴
۱۷	حیف محی الدین قادری	صائب کوہیری	۲۵۷	۴۰	〃 〃	محمد احمد اللہ قادری	
۱۸	آہ ڈاکٹر زورؔ	وقار خلیل	۲۵۸	۴۱	رباعی	نجم آفندی	
۱۹	ڈاکٹر زورؔ	سلیمان اطہر جاوید	۲۵۹	۴۲	قطعہ	سید اکرم علی	
۲۰	رباعیات	اختر رضوانی	۲۶۰	۴۳	قطعۂ تاریخ	عظیم الدین محبت	
۲۱	یادِ زورؔ	وحید مرزا	〃	۴۴	〃 〃	عبدالحق برق	۰۵
۲۲	ماتمِ زورؔ	اسد احسن جعفری	۲۶۱	۴۵	〃 〃	الطاف شاہد	
۲۳	نقش فریادی	حکیم یوسف حسین خاں	۱۲۶				

۴۶ قطعات تاریخ — ابوالقاسم سید مہدی حسن قادری ۲۷۵
۴۷۔ میر کارواں — سید احمد اللہ قادری ۲۷۶

حصہ دوم

ڈاکٹر زور کے منتخب مضامین۔ خطبات۔ خطوط۔ نظمیں۔ غزلیں اور مقالہ نما

(۴)

منتخب مضامین

۱ محمد قلی قطب شاہ ۲۷۹ — ۴ پیش لفظ "سب رس کا پہلا اداریہ" ۲۹۴
۲ بھاگ متی اور بھاگ نگر ۲۸۱ — ۵ پنڈت ونسی دھر جی ۲۹۶
۳ بنام غالب ۲۹۱ — ۶ میرا کشمیر کا سفر ۲۹۷

(۵)

خطبات

۱ خطبۂ صدارت شعبہ اردو آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس جبل پور ۱۹۴۲ء ۳۰۱ — ۵ خیر مقدمی تقریر یوم محمد قلی قطب شاہ ۱۹۶۰ء ۳۲۱
۲ خطبۂ صدارت جلسہ سالانہ بزم ادب عثمانیہ انٹرمیڈیٹ کالج ورنگل ۱۹۴۵ء ۳۱۰ — ۶ خیر مقدم صدر جمہوریہ ہند ۱۹۶۱ء ۳۲۴
۳ خطبہ استقبالیہ کل ہند ترقی پسند کانفرنس ۱۹۴۵ء ۳۱۴ — ۷ روئداد ایوان اردو ۳۲۶
۴ خطبہ صدارت اردو کانفرنس برہان پور ۳۱۷ — ۸ خیر مقدمی تقریر بتقریب یوم محمد قلی قطب شاہ ۳۳۰

(۶)

خطوط

۱ بنام ڈاکٹر گوپی چند نارنگ ۳۳۳ — ۵ بنام خواجہ حمید الدین شاہد ۳۴۷
۲ بنام عارف الدین حسن معتمد شعبۂ امتحانات ادارہ تعلیم بالغاں ۳۴۱ — ۶ بنام سید محمد مورخ بیدری ۳۵۳
۳ بنام ممتاز حسن احسن صدر ترقی اردو بورڈ (کراچی) ۳۴۳ — ۷ بنام محترمہ جہاں بانو نقوی ۳۵۷
۴ بنام سید مبارز الدین رفعت ۳۴۴ — ۸ بنام ڈاکٹر خلیق انجم ۳۵۸
۹۔ بنام اسلم پرویز (دہلی) ۳۶۴

ڈاکٹر زور صاحب کی نظمیں اور غزلیں

۱ چاندنی ۳۶۵
۲ آسمان کی زبان سے ۳۶۶
۳ افسانۂ محبت ۳۶۷
۴ رہبرِ منزل کی جدائی ۶۸
۵ جامعۂ عثمانیہ اور نونہالانِ دکن ۹
۶ خیر مقدم شاہ ایران ۰

غزلیں

۱ شبِ غم کی نہ ہوگی انتہا کیا ۳۷۱
۲ دل جب سے ہوا ہے خوگرِ غم آزار میں لذت پاتا ہوں "
۳ یوں تو کہنے کو یاں سے گذر جائیں گے ۳۷۲
۴ بن کے انگشت اشارت جو اشارہ کردے "
۵ ہم اپنی گرمیٔ سوزِ دروں سے چیخ اٹھے ۳۷۳
۶ فردوس آب و گل کے نظاروں کا شوق ہے "
۷ ہم نے سیکھا ہی نہیں آپ کی چاہت کے سوا ۳۷۴
۸ عزم و ہمت ہے تخیل ہے کہ ہے ذوقِ یقیں "
۹ ہنوز ایسے بھی انسان روزگار میں ہیں ۔ ۱
۱۰ ٹوٹیں جو روز سر پہ بلائیں تو کیا کریں
۱۱ انقلاب زمانہ ہے شاید یہی دیکھتے دیکھتے کیا سے کیا بن گئے ۶
۱۲ احباب سے وفا کا صلہ گر نہ پائیے
۱۳ ایسے بے درد و بد اندیش یہاں ہیں کچھ لوگ ۷
۱۴ بعض ہمدرد سے آجاتے ہیں انسان سے قریب
۱۵ پونچھ بھی ڈالو اب چشمِ نم ساقیو ۸
۱۶ حیرت سے دیکھتا ہوں کہ یہ گلبدن ہیں کون
۱۷ آپ آئیں گے مگر آئیں گے کب کس کے لئے
۱۸ دریوزہ گر و کوتاہ نظر با عیش و فراغت بیٹھے ہیں

مقالہ نما ——— ۳۸۱
تبصرہ ——— ۳۹۲

اپنی بات

سب رس" کا یہ خصوصی نمبر کسی قدر اہتمام کے ساتھ ناظرین کی خدمت میں پیش ہو رہا ہے۔ اس میں تین مہینوں کا ذخیرہ جمع کر دیا
ناظرین جانتے ہیں کہ سب رس آج ۲۶ سال سے ادارۂ ادبیات اردو کی ترجمانی کر رہا ہے۔ اس مدت میں سب رس نے اردو زبان
کی جو مقدور بھر خدمت کی وہ بے مایہ نہیں ہے۔ ماہوار اشاعتوں کے علاوہ دوسری کئی خصوصی اشاعتیں بھی وقتاً فوقتاً شائع ہوتی
لیکن یہ خصوصی اشاعتیں کسی نہ کسی خوش آئند تقریب کی آئینہ دار ہوتی تھیں یا کسی خوشگوار واقعہ کا پیغام دیتی تھیں۔ لیکن یہ
اشاعت جو آج ناظرین کے سامنے پیش کی جا رہی ہے وہ خوش آئند تقریب کی حامل نہیں بلکہ حزن و ملال کا مرقع ہے۔ یہ اشاعت
اسے پیش کی جا رہی ہے کہ ہم سب مل کر سب رس کے بانی اور ادارۂ ادبیات اردو کے معمار ڈاکٹر زور مرحوم کی یاد تازہ کریں
ان کی حیات جاوید اور ان کے علمی اور اخلاقی کارناموں کو خراج تحسین پیش کریں۔ آج زور کو پیوند خاک ہوئے پورے بارہ مہینے
ہیں لیکن ان کی جیتی جاگتی تصویر ابھی ہماری آنکھوں کے سامنے ہے اور ان کی تازہ اور توانا یاد ہمارے دلوں کو مضطرب
ہے۔ اس اشاعت کی ہر سطر ایک "نالۂ خاموش" اور ہر لفظ "ایک اثر باختہ آہ" سے کم نہیں ہے۔ جہاں علماء نے اس اشاعت کے لیے
پر قلم کیے ہیں وہ سوز و گداز کی گھٹاؤں میں لکھے ہیں۔ یہ رشحات قلم نہیں بلکہ رشحات قلب اور قطرات اشک ہیں۔

ڈاکٹر زور ان شخصیتوں میں تھے جو ایک بیدار دل اور متلاطم ذہن لے کر پیدا ہوئے تھے، اور اس فرض سے پیدا ہوئے تھے
کہ دوسروں کو اپنے موجزن خیالات اور شعلہ پرور جذبات سے مضطرب کریں۔ اور سماج میں زندگی اور محویت کی روح پھونکیں۔ زور
صاحب عمل تھے کہ ان کا ہر لمحہ کیف پرور اور ان کی ہر ساعت محرک عمل ہوتی تھی۔ ان کے دل و دماغ میں ہر آن نت نئے خیالات
پیدا ہوتے تھیں، اور یہ موجیں وہیں ختم نہیں ہو جاتی تھیں بلکہ وہ اپنی پوری قوت کے ساتھ حیز عمل میں آتی تھیں۔ وہ خود کام کرتے
اور دوسروں کو کارآمد بناتے تھے۔ ان کی زندگی کا بڑا کرشمہ یہ ہے کہ انھوں نے اپنے اردگرد ایک نئی دنیا بسائی جس میں علم و عمل
بسنے لگے۔ اور اس میں تصنیف و تالیف کے چراغ روشن ہوئے۔ وہ دنیا ابھی قائم ہے اور قائم رہے گی۔ زور نے دنیا کو خیرباد
لیکن انھوں نے اپنے علم و عمل کا ایسا نقش بٹھایا ہے کہ وہ محو نہیں ہوگا۔ ان کی شخصیت میں ایسی جاذبیت تھی کہ صاحب ذوق خود
ان کی طرف کھنچے آتے تھے اور ان کے فیض صحبت سے دامن امید بھر لے جاتے تھے۔ یہ حلقۂ علم ہر روز وسیع ہوتا گیا۔ نئی نئی شخصیتیں
جذب ہوتی گئیں اور اس حلقۂ علم سے بڑے بڑے انشاپرداز اور صاحب تصنیف باہر نکلے جو اب حیدرآباد اور بیرون حیدرآباد
دنیا میں اپنا مقام رکھتے ہیں۔

اس کو کون نہیں جانتا کہ اردو کی بقا اور اس کی ترقی تو زور کا وظیفۂ حیات تھا۔ وہ یہ وظیفہ عمر بھر دہراتے رہے
اسی لیے زندہ تھے اور اسی لیے مرے۔ یہ مسلمہ حقیقت ہے کہ زور اردو کے بہت بڑے محسن اور علمبردار تھے۔ اردو کے لیے
انھوں نے وہ سب کچھ کیا جو ان کے بس میں تھا۔ ہندوستان کے جن مشاہیر نے اردو کی خدمت کی اور اس کی بقا کا سامان جمع کیا زور
ان سے کچھ کم نہیں ہے۔ بلکہ ان سے زیادہ ہی ہے۔ زور نے "ایوان اردو" کے نام سے اردو کا نہ صرف ایک بڑا مرکز بنایا
یہ عظیم الشان عمارت بنا کر اس میں اردو کو جلوہ گر کیا بلکہ اردو کے امتحانات جاری کر کے تمام ملک میں اس کو قبول عام بنایا۔ اور

سب رس جاری کر کے اردو کے نصب العین کو ملک کے ہر گوشے میں پہنچایا، اور تمام ملک کے علما کو دعوت دی کہ سب اردو کی بقا کی کوششوں میں ان کا ہاتھ بٹائیں۔ اس کے علاوہ اپنے مقالوں اور تصنیفوں سے جو بے گنتی ہیں اردو کا دامن ایسا بھر دیا کہ اس کی مثال نہیں۔

زورؔ جس طرح آسمان علم کے ستارے تھے اسی طرح دکنی سماج کے معمار بھی تھے۔ دکنی سماج کو سنوارنا اور احساس کمتری کی زنجیروں کو توڑ کر اس میں حریت اور خود اعتمادی کی روح پھونکنا زورؔ کا بڑا کارنامہ ہے۔ یہ اس وقت پیدا ہوئے تھے جب کہ اہل دکن نامساعد حالات میں دبے جا رہے تھے اور ان کے خدمات عمل پژمردہ ہو رہے تھے۔ اگر زورؔ اس وقت میدان عمل میں نہ آتے تو حیدرآباد کا مستقبل ایسا درخشاں نہ ہوتا جیسے آج ہے۔ اور یہ ذہنی پیداوار جو زورؔ کی رہبری میں منظر عام پر آئی ہے وہ کبھی نہ آتی۔ زورؔ نے وقت پر اہل دکن کو آواز دی، اور ان کی آواز سے سوتی بستیاں جاگ گئیں۔ اور ان میں ایسا جذبۂ عمل پیدا ہوا کہ اپنی توانائیوں کے ساتھ تمام شعبہ ہائے حیات پر چھا گئے۔ چنانچہ آج ڈاکٹر زورؔ کے فیض یافتہ بے شمار نوجوان میدان عمل میں سرگرم کار ہیں۔ اور ہر جگہ اپنی صلاحیتوں کا سکہ جما رہے ہیں۔ کلیات محمد قلی قطب شاہ کی اشاعت جو دکنی زبان اور ثقافت کا ایک خزانہ ہے، اسی جذبۂ عمل کی ایک کڑی ہے۔ جب یہ شائع ہوا تو ماضی کے تمام پردے کھل گئے اور جب اس کے چند روز بعد حیات محمد قلی قطب شاہ شائع ہوئی تو دکنی تہذیب کے زمین دوز چشمے باہر ابلنے لگے۔ ان گراں بہا اشاعتوں سے دکنی سماج کو ایسا تازیانہ لگا کہ اس سے ذہنی تلاطم برپا ہو گیا اور ہر طرف زندگی کی لہریں دوڑ گئیں۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ دکنی سماج تشنۂ مضراب تھا اور جب زورؔ نے اس کو چھیڑا تو تمام دلوں کے ساز بجنے لگے۔

یہ قومی اور علمی جذبہ زورؔ کو ان کے بزرگوں سے ملا تھا۔ زورؔ قدیم دکنی گھرانے کے چشم و چراغ تھے۔ ان کے آبا و اجداد وسطی دکن کے آبادکار اور تاریخ و تمدن کے معمار تھے۔ یہ سب کو معلوم ہے کہ چودھویں صدی کے اوائل میں دکن ترکوں نے آباد کیا تھا۔ جو خلجی اور تغلق حکمرانوں کے ساتھ یہاں آ کر بس گئے۔ ان آبادکاروں کو امیران صدہ کہتے ہیں۔ یہ وہ ترک تھے جنھوں نے وسطی دکن کو نئے قالب میں ڈھالا اور تہذیب و تمدن کے چراغ روشن کیے۔ ان لوگوں نے جو بستیاں بسائی تھیں ان میں قندھار کا ایک تاریخی قصبہ بھی ہے جو شمالی دکن میں واقع ہے۔ ڈاکٹر زورؔ کے بزرگ اسی قصبے کے رہنے والے تھے اور اکثر صوفی مشرب تھے۔ جنھوں نے دکنی سماج کی اخلاقی اور روحانی تربیت کی اور اپنے علم و اخلاق سے اس قصبے کو منور کیا۔ اسی علمی اور اخلاقی فضا میں زورؔ کی پرورش ہوئی تھی ان ہی تاثرات میں ان کی زندگی بنی اور شخصیت ابھری تھی۔ ان ہی تاثرات نے ان کو آگے بڑھایا۔ اور بالآخر وہ ایک بہت بڑے صاحب عمل کی حیثیت میں آئے اور علم و اخلاق کا بہت بڑا سرمایہ چھوڑ گئے جو کبھی فراموش نہیں ہوگا۔

کچھ نہیں تو "ایوان اردو" کی عظیم الشان عمارت زورؔ کے جذبۂ عمل کو ہمیشہ یاد دلائے گی۔ اور اس کا بلند مینار دور سے آواز دے گا کہ بیسویں صدی کے وسط میں حیدرآباد میں ایک صاحب عمل پیدا ہوا تھا جو آئندہ نسلوں کے لیے بڑا سرمایۂ حیات چھوڑ گیا اور آئندہ زمانے کے لیے ہدایت کی شمعیں روشن کر دیں۔

مجلس ادارت ڈاکٹر زور کی ابتدائی دور کی تصویروں کے لیے ان کی ہمشیرہ محترمہ عظیم النسا بیگم صاحبہ کی ممنون ہے اور آخری دور کی تصویروں کے لیے ان کے صاحبزادے الحاج سید شاہ تقی الدین صاحب قادری کی۔

(پروفیسر عبدالمجید صدیقی)

ڈاکٹر زور



کون ہوتا ہے حریف مئے مرد افگن عشق



ڈاکٹر زور اپنے والد حضرت سید شاہ غلام محمد قادری زعم کے ساتھ
۱۹۲۷ء

حیدر آباد کانفرنس منعقدہ لندن ۱۹۲۸ ء کا ایک تاریخی گروپ





ڈاکٹر بی گوپال ریڈی ادارہ میں (۱۹۵۶ ء) حیدر آباد کے ادیبوں کے ساتھ

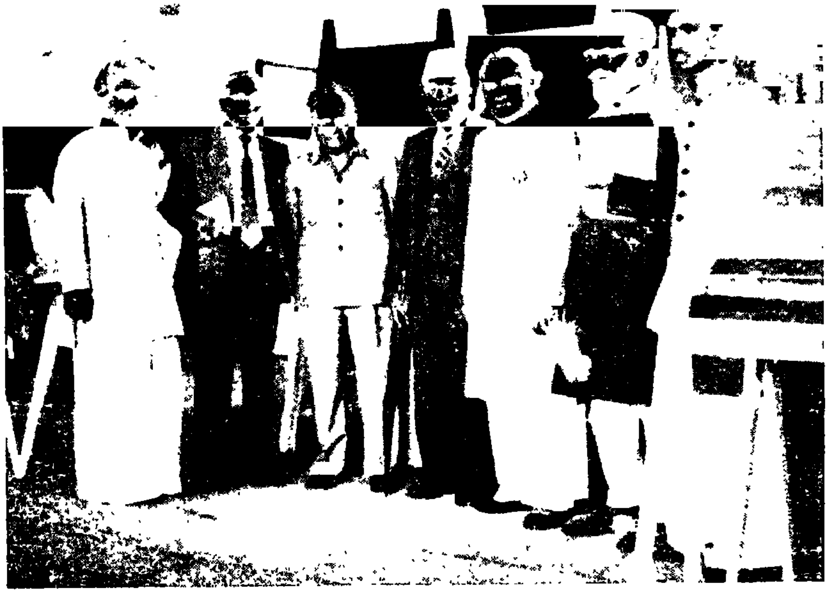


ہند و پاک مشاعرہ یوم محمد قلی قطب شاہ (۱۹۶۱ ء) جگن ناتھ آزاد کلام سنا رہے ہیں -
تلوک چند محروم ، ، حیرت بدایونی جوش ملیح آبادی اور ڈاکٹر زور



سجاد ظہیر ، ادارہ میں ، حیدر آباد کے شاعروں کے ساتھ ۱۹۶۲ ء

ساہتیہ اکاڈیمی حکومت ہند دہلی کے شعبہ اُردو کا یادگار گروپ ۔



خواجہ حسن ثانی نظامی دہلوی ، امتیاز علی خاں عرشی ، ڈاکٹر زور
پروفیسر مسعود حسن رضوی ۔ قاضی عبدالودود ۔ آل احمد سرور ۔ قیصر زیدی
۱۹۵۷ء



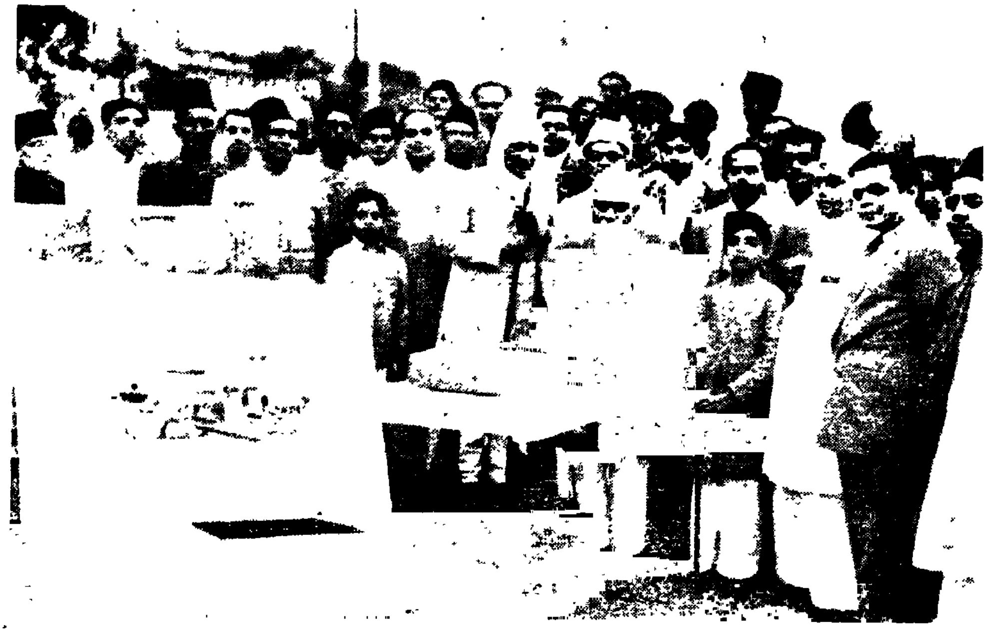
دہلی میں ڈاکٹر زور ، مرزا بیدل کے مزار پر ۔ خواجہ حسن ثانی نظامی
اور قیصر زیدی کے ساتھ (۱۹۵۷ء)



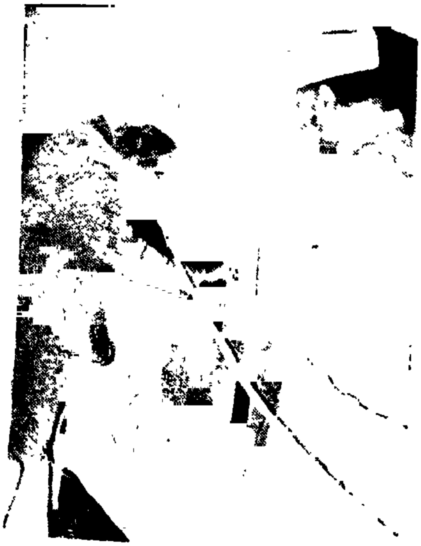
سر شیخ عبدالقادر اور نواب بہادر یار جنگ کے ساتھ ڈاکٹر زور (سوٹ میں)



حیدرآباد میں ادارہ کے زیر اہتمام منعقدہ تاریخی کل ہند اردو کانگریس (۱۹۴۴ء) کا گروپ
اگلی صف میں :۔ حمید الدین شاہد، سیف علی خان، سعادت علی رضوی، ڈاکٹر زور۔ مولوی عبدالحق،
سالار جنگ (سوٹ میں) عالم یار جنگ، پروفیسر رشید احمد صدیقی، اعظم جنگ۔ زین یار جنگ



ڈاکٹر بی رام کشن راؤ نے «ایوان اردو» کا سنگ بنیاد رکھا تھا۔ حضرت امجد حیدرآبادی نے دعا کی تھی۔ ڈاکٹر زور اور حیدرآباد کے مشاہیر سنگ بنیاد عمارت ادارہ کی تقریب میں
٦۔ نومبر ١٩٥٥ء



بخشی غلام محمد «ایوان اردو» کا افتتاح کررہے ہیں (١٩٦٠ء)



«ایوان اردو کی کہانی ... صاحب کی زبانی»
١٩٦٠ء



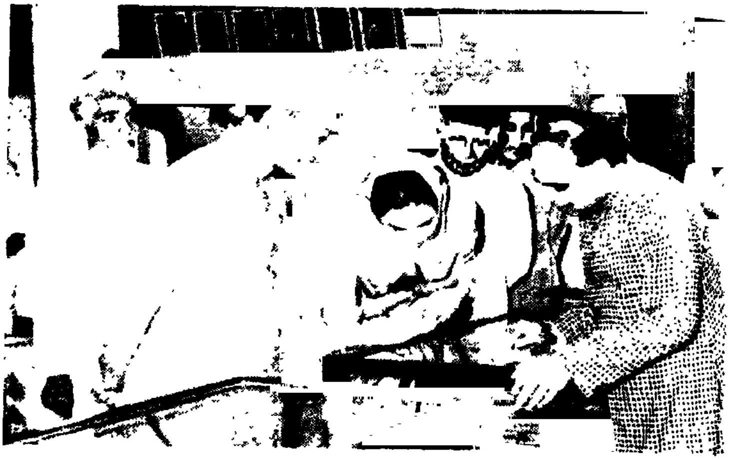
ڈاکٹر سید محمود،
ادارہ ادبیات اردو میں
۱۹۵۶ء



خواجہ غلام السید
« ادارہ ادبیات اردو »
کا معاینہ کر رہے ہیں، ڈ
اور ڈاکٹر یوسف حـ
بھی ہمراہ ہیں (۵۶،



ڈاکٹر شانتی سروپ بھٹناگر،
ڈاکٹر زور کے ساتھ ادارہ ادبیات اردو میں
حیدر آباد کے ادیبوں اور شاعروں کے ساتھ
۱۹۵۴ء



پرنس مکرم جاہ اور شہزادی اسر
ڈاکٹر زور کے ساتھ ادارہ ۔
۱۹۵۶ء



فیسر ہمایون کبیر
اور
ڈاکٹر زور
رہ کی خیر مقدمی
تقریب میں
۱۹۵۸ء



ٹر زور «یوم محمد قلی قطب شاہ» کے
ٖ۔ خیر مقدمی رپورٹ سنا رہے ہیں
سہ شہ نشین پر نواب زین یار جنگ
ادارہ اور ڈاکٹر بی ۔ گوپال ریڈی
صدر جلسہ ۱۹۵۸ء



ر اکبر حیدری صدر اعظم ریاست حیدر اباد
اکٹر زور کے ساتھ ۔ ادارہ ادبیات اردو میں
(۱۹۴۰ ء)



برطانوی سفیر مسٹر میلکم میکڈانلڈ۔ ڈاکٹر زور اور پروفیسر
ادارے میں (۱۹۵۹ ء)



ڈاکٹر تارا چند ادارے میں سنہ ۱۹۶۱ ء

سردار پانیکر ، ڈاکٹر زور ۔ ڈاکٹر ڈی ۔ یس ریڈی
اور پروفیسر مہندر راج سکسینہ ادارے میں ۱۹۶۱ ء

مجلۂ عثمانیہ کی ادارت کا ایک گروپ (۱۹۳۶ء)



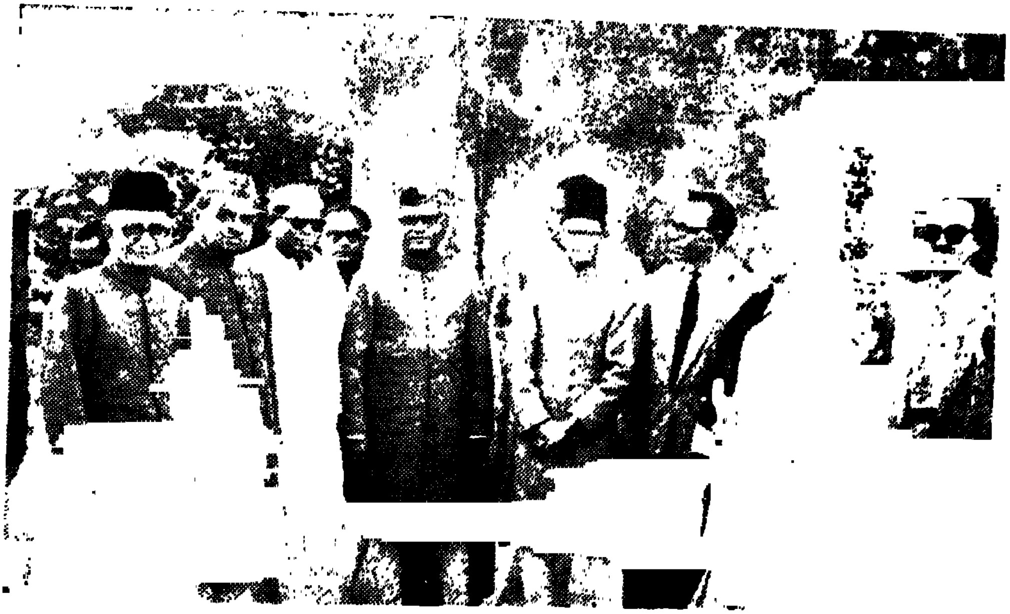
رحمن، پروفیسر اسپتھ، قاضی محمد حسین وائس چانسلر جامعہ عثمانیہ ۔ مولوی عبدالحق، ڈاکٹر زور
عباس علی خاں، زاہد علی کامل ۔ سکندر علی وجد، صاحبزادہ میر محمد علی خاں میکش



ستہ : ڈاکٹر زور، مہدی نواز جنگ، زین یار جنگ، بیگم مہدی نواز جنگ، ڈاکٹر غلام یزدانی
(۱۹۶۰ء)



ڈاکٹر زور کشمیر کے ایک مشاعرہ میں (۱۹۶۲ء)



یوم محمد قلی قطب شاہ (۱۹۶۲ء)



ڈاکٹر راجندر پرشاد صدر جمہوریہ ہند ادارہ میں (۱۹۶۲ء)



ڈاکٹر زور کی شادی کی یادگاری تصویر (۱۹۳۱ء)
معین یار جنگ، احمد حسن، عظیم الدین، مولانا نور الحیدر، رفعت یار جنگ، ڈاکٹر زور۔

ڈاکٹر زور

ایک شخصیت

پانچ روپ



۱۹۳۱ء میں



لندن جانے سے ۱۵ روز پہلے
۱۹۲۷ء میں



ڈاکٹر زور



لندن میں ۱۹۲۸ء



یورپ میں ۱۹۲۹ء



خانیار شریف (سری نگر)



خانیار شریف کے ایک گوشہ میں
مزار ڈاکٹر زور پر مرزا ضامن علی غازی معہ
صاحبزادگان ڈاکٹر زور فاتحہ خواں ہیں



← پروفیسر ہارون خاں شروانی معہ صاحبزادگان ڈاکٹر زور
مزار ڈاکٹر زور پر فاتحہ خواں ہیں۔



فاتحہ سوز کے موقع پر :- رفیع الدین ، علی الدین ، تقی الدین ۔ انسر یزدانی ، علی جواد زیدی
محمود حسین بدخشی ، سجادہ صاحب خانیار شریف (کوٹ اور بالوں کی ٹوپی) امین یزدانی
امین چشتی ۔ اسد اللہ کامل (شروانی میں) پنڈت شیام لال ، جناب خواجہ شمس الدین (سوٹ میں)
سابق وزیر تعمیرات و حال چیف منسٹر



الحاج سید شاہ تقی الدین قادری
سجادہ نشین درگاہ حضرت زعم



سید علی الدین قادری



سید صفی الدین قادری

صاحبزادگان



سید رفیع الدین قادری

ڈاکٹر

ز
و
ر



سید رضی الدین قادری

ڈاکٹر زور

★



کی

★

شخصیت



★

مہدی نواز جنگ
(گورنر گجرات)

زور صاحب

ڈاکٹر سید محی الدین قادری زورؔ مرحوم کی رحلت بڑا سانحہ ہے۔ یوں تو مرحوم کی قابلیت سے ہندوستان کے سب ہی اردو داں واقف ہیں لیکن مرحوم کی ادبی خدمات کے پیچھے جو ولولہ اور ایثار تھا اسکو وہی جانتے ہیں جو نزدیک یا دور سے ان کی کوششوں میں ان کی پسپائیوں یا کامیابیوں کے ردعمل کو دیکھا ہو۔ زورؔ مرحوم عالم با عمل، صاحب ایقان اور ایمان تھے جو جرأت رندانہ اور ہمت مردانہ سے اردو کی خدمت میں گامزن تھے۔

مرحوم کے ذہن رسا نے نت نئی تجویزوں کو ہاتھ میں لیا اور کامیابی سے انکو انتہا تک پہنچانے میں مقدور بھر کوشش کی۔

ادارۂ ادبیات اردو کی ابتدا، سب رس کے ذریعہ ثقہ ادبی خدمت، ایوان اردو کی تعمیر اور اس کی ایک میوزیم اور کتب خانہ کی شکل میں تکمیل، ابوالکلام آزاد اورنٹیل ریسرچ انسٹی ٹیوٹ کے قیام میں مرحوم کا انہماک اور اسی انسٹی ٹیوٹ کے ذریعہ ریسرچ میں جو کچھ کام اب تک ہوا ہے مرحوم کی حسن تدبیر کا روشن ثبوت ہے۔

مرحوم نے اپنی اسکیموں کے تعلق سے میرے خانگی اور سرکاری وقت پر تصرف کرنے میں کبھی تامل نہیں کیا اور میں اُن تصرفات پر ہمیشہ ان کی قدر اور عزت کرتا رہا۔ زورؔ مرحوم کے دنیا سے بے وقت گزر جانے کا مجھے گہرا رنج ہے اور مرحوم کے خدمات کا جو خاص ہیں انکو قائم اور جاری رکھنا ہمارا فرض ہے۔

حیرت بدایونی

”ایسا کہاں سے لاؤں کہ تجھ سا کہیں جسے“

آج ایوانِ اردو بھی ہے اور ادارۂ ادبیات بھی، کتب خانہ بھی ہے اور دارالمطالعہ بھی، سب رس بھی ہے اور سب تصنیفات و تالیفات بھی، آزاد انسٹی ٹیوٹ بھی ہے اور تمام علمی و ادبی تحقیقات بھی۔ غرض کہ ۳۰، ۳۵ برس کی ہمہ وقتی جدوجہد کیا تیار کی ہوئی ایک سجی سجائی بارات موجود ہے، مگر اس بارات کا دولھا کہاں ہے۔ ایوانِ اردو کا معمار موجود نہیں۔ ادارہ ادبیات کا بانی کدھر چلا گیا۔ کتب خانے اور دارالمطالعے کا مونس آج غیر حاضر ہے۔ سب رس کا مدیر اردو کا شاعر و ناقد، کتابوں کا مصنف و مولف کیا ہو گیا۔ علی اکبر، دلدار حسین، مہندر راج سکسینہ اکیلے رہ گئے۔ حبیب الرحمٰن کا مشیر و رفیق غائب ہے۔ آج وہ شخصیت کہاں ہے جس نے قلی قطب شاہ کو اردو کا سب سے پہلا شاعر ثابت کیا اور منوایا۔ یا اللہ یہ کشمیر سے کیسی ستاونی آئی۔ یقین نہیں آتا کہ زور صاحب چل بسے۔ وہ تو اچھے خاصے ہنستے گئے تھے! اللہ کرے خبر جھوٹی ہو۔ یہ ہوائی کسی دشمن نے اڑائی ہوگی۔ مگر دشمن، دشمن تو ان کا کوئی تھا ہی نہیں۔ خبر ٹھیک تھی ہے جھوٹی خبر سے کسی کو کیا مل جاتا مگر یا اللہ یہ کیا غضب ہو گیا۔ حیدرآباد کی تہنیت، کشمیر میں تعزیت بن گئی۔ پیرزادے یتیم ہو گئے۔ دکن کا کوہِ نور کشمیر کی وادی میں کھو گیا۔ جنوب کا خزانہ شمال نے لوٹ لیا۔ دکن کی عزت و شہرت کا زور ٹوٹ گیا۔ مشرقی روایت و شرافت کا چراغ بجھ گیا۔ جنوبی اردو ادب کی آبرو لٹ گئی۔ عزت چھن گئی۔ دکن کے فخر و عزت کا سر نیچا ہو گیا جیسے علم و ادب کے ایک مجسمے کو کسی نے ٹکڑے ٹکڑے کر دیا۔ جیسے ہم نے زندگی بھر ایک خواب دیکھا صبح کو اخبار میں پڑھا کہ وہ زور صاحب نہیں تھے ایک خواب تھا۔ جیسے دماغ میں کسی کے وجود کا ایک خیال جم گیا تھا۔ اچانک دماغ پر ایک ضرب کاری لگی اور وہ خیال خواب بن گیا۔ دل پر دوستی کا ایک گہرا نقش بیٹھ گیا تھا ایک تار آیا اور وہ دل کا نقش دل کا گھاؤ بن گیا۔ ہمارے ہاتھوں میں ایک دولت تھی اور کوئی اُچک کر لے گیا۔ ہم دوستی کے نشہ میں مست و بے خبر تھے کسی نے بھرپور وار کیا اور ہم آن کی آن میں زخمی ہو گئے۔ کسی کا دل ٹوٹا، کسی کا بازو ٹوٹا کسی کی کمر ٹوٹی کسی کی آس ٹوٹی۔ میر کارواں کے جانے سے سارا کارواں مجروح بسمل ہو گیا۔ اور سارے ملک پر قیامت ٹوٹ پڑی عبدالمجید و اکبر الدین کا دل چیر کر کوئی دیکھے کتنے ناسور پڑ گئے۔ خواجہ حمید الدین شاہد سے ملکر کوئی پوچھے تم پر کیا پہاڑ ٹوٹ پڑا۔ ایک عملی و علمی صلاحیت دفن ہو گئی، ایک ہمہ گیر جامعیت کا جنازہ اٹھ گیا ایک مخصوص انفرادیت نے دم توڑ دیا ملک قوم زبان کی تاریخ بنانے والا خود رہا ایک تاریخ بن گیا۔ دکن کو دنیا سے روشناس کرانے والا خود ہی روپوش ہو گیا جو کل تک حال تھا آج ماضی ہے۔ اچھی رفاقت کی خوب دوستی نباہی مذاق مذاق میں خنجر ہی بھونک دیا۔ ہنسی ہنسی میں نشتر چبھو دیا۔ ہنساتے ہنساتے رلانے لگے۔ بیگم کی آہ و زاری پر بھی رحم نہ آیا اور لاڈلے کے سر سے بھی ہاتھ اٹھا لیا۔ تقی میاں کی دلہن ڈھونڈتے ہی رہے سہرا بھی نہیں دیکھا۔ ایک جمِ غفیر کی چیخ پکار ہائے وائے پر بھی ترس نہ کھایا ایک دم سب سے منہ پھیر لیا۔ دنیا اور دنیا والوں کو اللہ حافظ کہا اور چلتے بنے۔ اک دھوپ تھی جو ساتھ گئی آفتاب کے تو گویا جاتے جاتے زندگی کی بیوفائی کا سبق دیتے ہوئے گئے۔ اور یہ بھی بتا گئے کہ موت ہر وقت ہر جگہ آ سکتی ہے مختصر یہ کہ آج وہ کل ہماری باری ہے۔ رہے نام اللہ کا۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

پروفیسر رشید احمد صدیقی

خدا رحمت کند!

مکرمی : تسلیم

نوازش نامہ ملا۔ جس میں آپ نے زور صاحب مرحوم پر کچھ لکھنے کی فرمایش کی ہے۔ ایک لمحے کے لئے دم بخود ہو گیا کہ زور صاحب رحلت فرما گئے' یہی نہیں بلکہ اس پر ایک سال ہونے کو آیا۔ کسے نہیں معلوم کہ زندگی ہے تو جلد یا بدیر ایک دوسرے سے ہمیشہ کے لئے جدا ہو کر رہیں گے۔ لیکن کافی مدت سے یہ خیال ذہن میں جاگزیں رہا کہ اس طرح کی مفارقت سب سے پہلے میرے حصے میں آئے گی لیکن ہوا یہ رہا کہ بیشتر عزیز عمر میں بڑے ہوں یا چھوٹے' بہت چھوٹے' برابر مفارقت کرتے جاتے ہیں اور ان سب کا ماتم کرنے کے لئے' میں باقی ہوں۔ کتنی غیرت و عبرت کی بات ہے۔

دیکھتا ہوں تو اب یہ نوبت آ گئی ہے کہ جتنے جاننے پہچاننے اور جان چھڑکنے والے تھے' دنیا کی دوسری سمت پہنچ چکے ہیں اور میں حیات کے مرض الموت میں گھٹتا ہوا چلا جا رہا ہوں۔ زندگی کے سفر میں نہ اتنی گرم روی اچھی نہ ایسی واماندگی جس میں اپنے کو مبتلا پاتا ہوں۔ ایسے ایسے عزیزوں کی جدائی سہنی پڑی ہے جس کے بدلے اپنی موت کتنی ارزاں اور کس درجہ قابل قبول معلوم ہوتی ہے۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ موت نے اپنے شکار کا معیار کیا مقرر کر رکھا ہے۔ جب سارے یا بیشتر ساتھی داغ مفارقت دے چکے ہوں تو یہ دنیا اور اس میں رہنے کی ہوس یا خوشی کیسی۔ یہ تو ایک قید ہوئی بے بسی اور تنہائی کی۔ روز افزوں شدت کے ساتھ۔ لیکن بقول اکبر ؎

بوڑھے بھی مر نہ جائیں تو ناچار کیا کریں!

یہ باتیں تو ہمیشہ سے ہوتی آئی ہیں اور ہوتی رہیں گی۔ چاہے ان پر کوئی خوش ہو' ناخوش' لیکن کوئی سانحہ پیش آ جاتا ہے تو ذہن میں یہ خیال آتے ہی ہیں۔ پہلے عریضے میں اس کا اعتراف کر چکا ہوں کہ کسی عزیز یا بزرگ کی رحلت پر کچھ لکھنا پڑتا ہے تو دل بہت بے قرار ہوتا ہے اس لئے جہاں تک ممکن ہوتا ہے ایسے مواقع سے بچنے کی کوشش کرتا ہوں۔ چنانچہ بعض عزیزوں اور دوستوں کی یاد میں کچھ لکھنا چاہتا تھا لیکن ایسا کر نہ پایا جس کا ہمیشہ افسوس رہے گا۔ بایں ہمہ دوستوں کے اصرار پر کچھ نہ کچھ کرنا ہی پڑتا ہے ؎

موج خوں سر سے گزر ہی کیوں نہ جائے

زور صاحب کی وفات سے چند سال پہلے ان کی صاحبزادیاں امتحان میں شریک ہونے علی گڑھ آئی تھیں۔ مجھ سے ملیں۔ دل خوش ہوا جیسے ان لڑکیوں کے ساتھ زور صاحب سے بھی ملاقات ہو گئی ہو۔ دیر تک اِدھر اُدھر کی باتیں ہوتی رہیں۔ پھر سب رخصت ہو گئیں۔ دن رات اس طرح گزرتے رہے جیسے ایسے ہی گزرتے رہیں گے۔ دفعتہً

ایک دن خبر آئی کہ زور صاحب کشمیر میں رحلت فرما گئے۔ ذہن بے اختیار ان لڑکیوں کی طرف منتقل ہو گیا کہ ان پر کیا گزر رہی ہو گی۔ لڑکیاں باپ سے بالعموم زیادہ مانوس ہوا کرتی ہیں اور باپ بھی بغیر کسی قصد و اہتمام کے لڑکوں سے زیادہ اپنی لڑکیوں کا خیال رکھتا ہے۔ پھر وہ شام یاد آئی جب ان لڑکیوں سے ملاقات ہوئی تھی اور زور صاحب سرگرمیوں کا تا دیر بڑا دلچسپ تذکرہ رہا۔

لیکن وہ ایک شام ہی تو تھی دوسری شاموں کی طرح۔ لڑکیوں کی شادی ہو گئی ہو گی، اپنے اپنے گھروں کو گئی ہوں گی اور خانہ داری کی مصروفیتوں اور ذمہ داریوں کے ہجوم میں اس سانحہ سے شاید اتنی بے قرار نہ ہوئی ہوں۔ ہوئی بھی ہوں گی تو خدا نے چاہا اس کو جلد ہی بھول جائیں گی۔ زندگی اتنی سخت گیر ہے کہ وہ کسی سانحے کی یاد کو تا دیر نہیں رہنے دیتی۔ دنیا کا یہی دستور ہے۔ اور ٹھیک بھی ہے۔ مصیبت میں گزشتہ خوشگوار یادوں سے بڑی مصیبت کوئی نہیں۔

مرحوم کیسے کیسے ارمانوں کے ساتھ کشمیر گئے ہوں گے۔ اپنے خلوص، محنت اور قابلیت سے اردو کے لئے کشمیر میں ایک نیا حیدر آباد قائم کر دینے کا حوصلہ رہا ہو گا۔ ہم سب کو امید تھی کہ اپنی ان تھک کوششوں اور کام کرنے اور کام لینے کے طریقوں سے وہ کشمیر کے باشندوں میں اردو کے تحفظ و ترقی کا ایسا حوصلہ پیدا کر دیں گے کہ اس زبان سے جو عام بے اعتنائی برتی جا رہی ہے اس کی تلافی ہو جائے گی۔ لیکن ہوا یہ کہ وہ اس وقت اجنبی چنار کے سائے میں ماضی کے اپنے تمام کارناموں اور مستقبل کے خوابوں اور منصوبوں کے ساتھ اس طرح محو خواب ہیں کہ اب اسی وقت اٹھیں گے جب خواب اور بیدار نہیں دنیا ہی کا تصور معدوم ہو چکا ہو گا۔

بالکل یاد نہیں آتا کہ زور صاحب سے پہلے پہل کب اور کہاں ملاقات ہوئی لیکن ان کی کتاب "اردو کے اسالیب" میں اپنے بارے میں تحسین کے کلمات پڑھ کر خوش ہوا۔ اپنے سے بھی زور صاحب سے بھی۔ زور صاحب اکثر علی گڑھ آتے رہے۔ دو بار میں بھی حیدر آباد گیا۔ جس میں ایک بار ان کی فرمائش پر کسی کانفرنس میں شریک ہونے کے لئے جانا ہوا۔ زور صاحب کے دولت کدہ اور ادارۂ ادبیہ میں حاضری کا بھی موقع ملا۔ مرحوم نے ادارہ اور اس کے نوادر بڑی لطف و شوق سے دکھلائے۔ اس زمانے میں مرحوم کو اس کا شوق تھا کہ حیدر آباد اور اس کے نواح کی تاریخی عمارات کی دیواروں پر جو کتبے نصب ہوں ان کا چربہ فراہم کریں۔ ایسے چند کتبے اسی زمانے میں حاصل کئے تھے۔ شاید بڑی تلاش اور دشواریوں میں۔ اس پر اتنے خوش تھے جیسے ان کو غیر متوقع طور پر کوئی دولت یا اعزاز مل گیا ہو۔ جیسے ادارہ کی حیثیت و اہمیت بہت بڑھ گئی ہو۔ ایسی خوشی اور سرفرازی صرف کوئی ادب شناس ہی محسوس کر سکتا ہے جو اپنے مشغلے کو دنیا کے تمام دوسرے مشاغل سے افضل اور قابل قدر سمجھتا ہے۔

میرا خیال ہے زور صاحب اور بابائے اردو مولوی عبدالحق صاحب مرحوم کے باہمی تعلقات شگفتہ نہ تھے۔ اس کے اسباب اور بھی ہوں لیکن قیاس ہے کہ اس میں اردو بالخصوص دکنی اردو کے ادب اور مشاہیر سے دونوں کے شغف کو بھی دخل ہو۔ دکنی اردو کو بقیہ ہندوستان سے روشناس کرانے میں دونوں پیش پیش تھے۔ دکنی اردو دریافت کرنے میں مولوی صاحب نے پہل کی اس کے بعد زور صاحب یورپ تشریف لے گئے اور وہاں سے جدید علم لسانیات

اور فنِ تنقید کا گہرا مطالعہ کرنے کے بعد دکن واپس ہوئے اور ایک ماہر تنقید نگار اور عالم لسانیات کی حیثیت سے حیدرآباد کے ادبی پلیٹ فارم پر نمودار ہوئے۔ اس میں شک نہیں کہ انھوں نے دکن اور "دکنیات" کو اپنے مختلف النوع تصانیف سے بیش از بیش ترقی دینے میں کوئی دقیقہ اٹھا نہیں رکھا اور اس بارۂ خاص میں دوسرا کوئی ان کا ہمسر نہیں ہے۔ یہ بھی بعید از قیاس نہیں معلوم ہوتا کہ مرحوم نے ادارۂ ادبیات کو انجمن ترقی اردو کے متوازی خطوط پر قائم کیا ہو۔ ممکن ہے یہ محض واہمہ ہو۔ بہرحال اس میں شک نہیں کہ اس وقت یہ دونوں ادارے اردو داں طبقے کی نظروں میں یکساں وقعت کی نگاہ سے دیکھے جاتے ہیں اور ان سے بڑی توقعات وابستہ ہیں۔

مرحوم نے کثیر التعداد، مختلف النوع اور گرانبہا تصانیف اور مضامین چھوڑے ہیں۔ ان تصانیف اور مرحوم کے دوسرے مشاغل جن میں فرائضِ منصبی کے علاوہ ادارۂ ادبیات اردو کی تنظیم کا بھی کام تھا۔ نظر میں رکھئے تو بڑا تعجب ہوتا ہے کہ اتنے طرح طرح کے فرائض وہ تنہا کس طرح انجام دیتے تھے۔ اس اعتبار سے ان کا شمار اردو کے عظیم خدمت گزاروں میں ہوتا ہے۔ میرا خیال ہے کہ اردو کے تحفظ اور ترقی کے سوا انکو زندگی کے کسی اور کاروبار سے اتنا شغف نہ تھا۔ اور یہ مبالغہ کی بات نہیں ہے۔

مرحوم سے آخری ملاقات کئی سال ہوئے علی گڑھ میں ہوئی۔ جب وہ "علی گڑھ ہسٹری آف اردو لٹریچر" کے پہلے جلسے میں شریک ہونے کے لئے تشریف لائے تھے۔ مرحوم کے بعض فقروں سے جلسے میں تھوڑی سی گرمی بھی آ گئی تھی لیکن وہ اتنے مخلص اور شریف الطبع تھے کہ صلح کا ہاتھ بڑھانے میں بے تکلف پہل کرتے اس لئے ناخوشگواری زیادہ دیر تک قائم نہیں رہ سکتی تھی اور اس طرح جلد گھل مل جاتے جیسے کوئی بات ہی نہیں ہوئی تھی۔

مرحوم کا صوفیا اور مشائخ گھرانے سے تعلق تھا جس کا وہ بڑا لحاظ رکھتے تھے اور چاہتے کہ دوسرے بھی رکھیں۔ متذکرہ صدر تاریخ کی پہلی جلد کے ابتدائی ابواب میں سے بعض کے ترتیب دینے کا کام مرحوم نے اپنے ذمے لیا تھا۔ توقف ہونے پر تقاضے کے جو خطوط میں نے لکھے اور جس انداز کے جواب مرحوم نے دئے ان سے پتہ چلتا ہے کہ مرحوم کے دل میں دوستوں کیلئے کتنی گنجایش تھی۔ میں نے ان کی صوفیا اور مشائخ کے گھرانے سے متعلق ہونے کا اشارہ کرتے ہوئے بعض تفریحی جملے بھی لکھ ڈالے تھے اس کا جواب مرحوم نے اس سے بھی زیادہ تفریحی انداز میں دیا تھا۔ اس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ مرحوم میں خوش طبعی کا بھی کتنا اچھا ذوق تھا۔

مرحوم کو دکن اور دکن کی ہر چیز سے عشق تھا۔ دکن کی ادبی و تہذیبی اہمیت کو واضح کرنے میں جو خدمات مرحوم نے جن عنوانات سے دیں، مرحوم کے محدود ذرائع اور وسائل کے شاید ہی کسی اور "باشندۂ دکن" نے دی ہو۔ سب سے اطمینان اور خوشی کی بات یہ ہے کہ مرحوم نے اپنے کام کو بڑھانے پھیلانے اور مستحکم کرنے کے لئے ایسے کارکن چھوڑے ہیں جو اس کام کی ذمہ داریوں سے عہدہ برآ ہونے کے نہ صرف اہل ہیں بلکہ اس پر اپنی اچھی سے اچھی صلاحیتوں کو صرف کرنا باعث افتخار سمجھتے ہیں۔ خدا ان کے عزائم میں برکت دے۔ آمین۔

بڑے آدمی کی ایک بڑی نشانی یہ بھی ہے کہ اس نے اپنے اعلیٰ مقاصد کے انصرام کے لئے کس پائے کے کتنے کام کرنے والے چھوڑے۔ اس اعتبار سے میں مرحوم کو بڑا آدمی سمجھتا ہوں۔ حق مغفرت کرے۔

پروفیسر ڈاکٹر محمد باقر

زور ـــــ ایک اونچا انسان اور مخلص عالم

یہ غالباً ۱۹۳ء کا ذکر ہے جب ادارۂ معارف اسلامیہ کا دوسرا اجلاس لاہور میں منعقد ہوا اور اردو سے چند بظاہر محبت رکھنے والوں نے اردو دوستی کا ڈھونگ رچانے کے لئے قراردادوں کے سلسلے میں اردو کا انسائیکلو پیڈیا مرتب کرنے کی قرارداد بھی پیش کی۔ اس وقت تک ڈاکٹر زور صاحب سے میری ذاتی ملاقات نہیں تھی لیکن خط و کتابت کا رابطہ قائم تھا۔ اور مجھے معلوم تھا کہ وہ اردو کا انسائیکلو پیڈیا مرتب کرنے کا منصوبہ تیار کر چکے ہیں۔

جب یہ قرارداد پیش ہوئی تو میں نے اطلاعاً اور برسبیل تذکرہ یہ کہہ دیا کہ: حضور زور صاحب یہ منصوبہ تیار کر چکے ہیں۔ بہتر یہ ہوگا کہ یہاں ہم ایک نیا منصوبہ تیار کرنے کی قرارداد منظور کرنے کی بجائے اُن کی کمک کریں۔ اس مجمع میں مرحوم سید سلیمان ندوی، ڈاکٹر سید عبداللہ اور ہندوستان کے نبی اور عالم حاضر تھے۔ مرحوم پروفیسر محمد شفیع (اس وقت پرنسپل اورینٹل کالج، لاہور) صدارت فرما رہے تھے۔ میرا یہ کہنا تھا کہ ان میں سے اکثر حضرات کف در دہان ہوگئے۔ اور ایک صاحب نے (اللہ تعالیٰ انھیں جوار رحمت میں جگہ دے) بپھر کر کہا: "زور صاحب کلکتہ میں گھوڑ رہے ہوں گے۔ ہمیں تو اس کی کوئی اطلاع نہیں۔"

اتفاق سے میرے پاس وہ ساری مطبوعہ سکیم موجود تھی جو زور صاحب نے تیار کی تھی۔ اور انھوں نے ازراہ کرم مجھے بھجوائی تھی میں نے وہ پیش کرتے ہوئے کہا: حضرات یہ سکیم سارے ہندوستان میں تقسیم کی گئی ہے۔ معلوم نہیں آپ تک کیوں نہیں پہنچی! اور اگر پہنچی ہے تو آپ خواہ مخواہ اس کام کے لئے کریڈٹ لینا چاہتے ہیں جو زور صاحب کر رہے ہیں۔

اس پر یہ حضرات جزبز ہوئے اور قرارداد منظور کر لی گئی۔ معلوم نہیں زور صاحب کے منصوبے کا کیا حشر ہوا۔ لیکن اتنا معلوم ہے کہ قرارداد پیش کرنے والے اور زور صاحب پر تعریض کرنے والے اللہ کو پیارے ہو گئے اور اردو انسائیکلو پیڈیا کا خواب شرمندۂ تعبیر ابھی تک نہیں ہو سکا۔ (یہ میرے علم میں ہے کہ انسائیکلو پیڈیا آف اسلام کا اردو ترجمہ پنجاب یونیورسٹی سے شایع ہونا شروع ہوا ہے) کہنا یہ مقصود ہے کہ میرا پہلا تعارف زور صاحب سے علمی میدان میں اس وقت ہوا جب بہت سے لوگ اردو سے عشق و محبت تو جتاتے تھے لیکن زور صاحب کی طرح علمی کام نہ کرتے تھے اور نہ کر سکتے تھے۔ صرف قراردادوں اور اخباری اشتہاروں پر زور تھا۔ چنانچہ بعد میں زور صاحب نے اپنی علمی سرگرمیوں اور ان کے نتائج سے جب مجھے مطلع فرمانا شروع کیا تو میں نے یہ محسوس کیا کہ وہ مرحوم مولوی عبدالحق کو بھی کوسوں پیچھے چھوڑ گئے ہیں۔ مولوی صاحب نے اول تو اردو کے سلسلے میں علمی سطح پر خود بہت کم کام کیا ہے۔ اور زور صاحب بہت اور بہت سے شرکائے کار سے مدد لے کر ہی کچھ شایع کیا ہے۔ لیکن زور صاحب نے لندن سے لے کر حیدر آباد (دکن) تک جو اونچی علمی سطح کا کام کیا ہے۔ اس کی نظیر ڈھونڈے سے بھی نہیں ملے گی۔ میری دانست میں زور صاحب نے بیک وقت۔

(۱) اردو کی اعلیٰ اور معیاری تدریس (۲) اردو کے متعلق تحقیقی کام (۳) ادارۂ ادبیات اردو کا قیام (۴) ادارۂ ادبیات اردو کے کتب خانے کی سمیں پر جو توجہ مرتکز کی اس کی مثال پاکستان اور ہندوستان میں اردو کے شیدائیوں کے ہاں نہیں ملے گی۔ اس سلسلے میں زور کا کردار جس قدر خلوص اور پامردی کا حامل تھا میں نے ایسا تاثر اس صدی کے اور کسی ادیب سے نہیں لیا۔ وہ ہر قسم کی تحریص، لالچ اور رتبہ خواہی سے بلند ہو کر صرف اردو کے لئے جیئے اور صرف اردو کے لئے مرے۔

میری باتوں سے شاید مبالغہ کی بُو آئے اور ایک انگریزی مثل کے بقول مقابلہ کرنا بھی مستحسن نہیں ہوتا لیکن بات جب تک مقابلہ تک نہ پہنچے دلیل قاطع نہیں بنتا۔ اس لئے ذاتی معلومات کی بنا پر صرف ایک واقعہ عرض کرنا چاہتا ہوں۔ شاید کچھ لوگوں کو معلوم ہے کہ تاسیس پاکستان کے بعد زور صاحب کو بھی پاکستان منتقل ہونے کی دعوت دی گئی تھی۔ وہ یہاں آتے تو کیا صورتِ حالات ہوتی لیکن انھوں نے فوراً اس دعوت کو یہ کہہ کر مسترد کر دیا کہ میں ادارہ اور حیدرآباد کو چھوڑ کر کہیں نہیں جاؤں گا۔ تقسیم ہند کے وقت میں دہلی میں صوبۂ دہلی کا ڈائرکٹر آف ایجوکیشن تھا اور مجھے یہ بیان کرتے ہوئے فخر محسوس ہوتا ہے کہ میں نے اس حیثیت سے پہلی دفعہ جامعہ ملیہ اور انجمن ترقی اردو کی گرانٹ حکومت ہند سے منظور کرائی تھی کیونکہ یہ امور مجھ سے متعلق تھے۔ دونوں گرانٹوں کی منظوری میں فرق صرف اتنا تھا کہ محب گرامی ڈاکٹر ذاکر حسین آخری وقت تک اس پر اڑے رہے کہ میں گرانٹ کے لئے حکومت ہند کو عرضی نہیں دوں گا کیونکہ ہم نے کبھی یہ کام نہیں کیا۔ اور میری منت سماجت کے باوجود وہ عرضی دینے پر رضامند نہ ہوئے اور گرانٹ کا کیس حکومت ہند کو خود ہی کرنا پڑا اور خود ہی جامعہ ملیہ کو گرانٹ پیش کی گئی۔ مولوی صاحب کا یہ وطیرہ تھا کہ میرے وزیر مولانا ابوالکلام آزاد سے لے کر لیاقت علی خاں کے حق میں ناروا باتیں کہتے تھے اور ادھر گرانٹ کے لئے دھڑا دھڑ عرضیاں دے رہے تھے۔ بالآخر میری وساطت سے یہ امر بخوبی طے پا گیا اور انجمن ترقی اردو کو پہلی دفعہ گرانٹ ۱۹۴۷ء میں دی گئی۔ میں اتفاق سے رہتا بھی دریا گنج میں مولوی صاحب کے قریب ہی تھا۔ انجمن کو گرانٹ ملنے کے چند دن بعد تقسیم ہند کی خبر عام ہوئی تو میں نے مولوی صاحب کو ان کے رفقائے کار (بالخصوص مولوی عبدالرشید) صاحب کے توسط سے یہ کہلوایا کہ آپ کو اب پاکستان کا رخ کرنا چاہیئے لیکن مولوی صاحب نے حسب معمول بڑی نخوت اور حقارت سے پاکستان پر دو حرف بھیجے اور دریا گنج (دہلی) میں ڈٹے رہے۔ میں اگسٹ ۱۹۴۷ء میں پاکستان چلا آیا۔ بعد میں جیسا کہ عام لوگوں کو معلوم ہے انجمن کا دفتر اور کتاب خانہ غلط میں لوگوں کی آتش اشتعال کی نذر ہو گیا اور مولوی صاحب بھاگ کر پاکستان آ گئے۔ اور زور صاحب کے علی الرغم یہاں آکر یہ کہنا شروع کر دیا کہ پاکستان صرف اردو کی وجہ سے بنا ہے اور ہندوؤں سے بنائے مخاصمت ہی اردو تھی۔ [حالانکہ عام لوگوں کو معلوم ہے کہ انجمن ترقی اردو اور اردو زبان و ادب کے سرپرستوں میں بڑے بڑے نامور لوگ مثلاً سر تیج بہادر سپرو، خود پنڈت جی (پنڈت جواہر لعل نہرو) اور کئی ادیب اور شاعر ہندو تھے] اور اسی پر اکتفا نہ کی بلکہ چند سال پیشتر آپ نے اسلامیہ کالج لاہور میں تقریر کرتے ہوئے فرمایا: جب میں ہندوستان کو چھوڑ نہیں رہا تھا مولانا ابوالکلام آزاد نے مجھ سے کہا کہ اگر تم پاکستان نہ گئے تو تمھارے مکان میں بھنگ یا چرس رکھوا کر تمھیں پکڑوا دیا جائے گا۔

اب ان دونوں بزرگوں کا معاملہ اللہ کے ساتھ ہے لیکن میں اور بہت سے اور دوست اس بات کے گواہ ہیں کہ زور صاحب کے برخلاف جب آپ کو پاکستان آنے کی دعوت دی گئی تو آپ نے یہاں آنے سے انکار کر دیا لیکن جب جان پر بنی تو ہندوستان سے فرار کیا اور یہاں پہنچ کر "اردو" کا نعرہ اس جوشیلے اور غلط انداز میں لگایا کہ لوگوں کو اس سے

نفرت ہونے لگی۔ اُن کے مقابلے میں زور بہت اونچا اور رنگین انسان تھا جس نے اردو دوستی میں کچھ اس انداز سے کام کیا کہ اردو ان حلقوں میں بہت محبوب ہے جہاں زور کا اثر موجود تھا۔

زور صاحب سے میری پہلی ملاقات اس وقت ہوئی جب میں انگلستان سے ۱۹۴۹ء میں واپس آیا۔ اب یہ صحیح طور پر یاد نہیں کہ سن ۱۹۴۰ء تھا یا اس کے بعد وہ غالباً کشمیر جا رہے تھے اور لاہور چند دنوں کے بعد رُکے۔ ڈاکٹر عبداللہ چغتائی کے مکان پر دعوت تھی اور ڈاکٹر صاحب نے بے تکلفی کا ماحول برقرار رکھنے کے لئے زور صاحب کے علاوہ صرف مجھے ہی سرفراز فرمایا تھا۔ گرمی کا موسم تھا لیکن سیاہ گاجریں ابھی تک مل رہی تھیں۔ ڈاکٹر صاحب نے غذا میں لاہوری عنصر شامل کرنے کے لئے ان کی کانجی بنائی ہوئی تھی۔ زور صاحب نے کئی گلاس پیئے اور اس لاہوری دعوت کی بڑی تعریف کی۔ اُس زمانے میں زور صاحب بڑے جوان اور توانا تھے۔ اردو ادب سے لے کر سیاسیات حاضرہ تک گفتگو رہی۔ اُس وقت وہ ادارہ ادبیات کے کتاب خانہ کی تاسیس میں مصروف تھے اور اس سلسلے میں بڑی سرگرمی کا اظہار کر رہے تھے۔

پھر غالباً ۱۹۵۹ یا ۱۹۶۰ء میں وہ لاہور تشریف لائے۔ اب وہ پیری سے ہم کنار ہو رہے تھے۔ مفصل صحبتیں رہیں اور میں نے یہ محسوس کیا کہ تیور اور دم خم وہی ہے۔ لاہور میں اب اردو کے بظاہر کئی نئے چاہنے والے پیدا ہو چکے تھے ۲۵ سال صدی کی چوتھائی ہوتی ہے۔ میرا تعلق خاطر زور صاحب سے اس عرصے سے تھا۔ جب نئے عشاق زور صاحب سے معرکہ استفارات گرم کرتے تو کبھی کبھی میری طرف اشارہ کر کے کہہ دیتے "بھئی آپ نے ڈاکٹر صاحب کے وہ مقالات نہیں پڑھے جو انھوں نے اردوئے قدیم کے متعلق لکھے ہیں" اور کچھ لوگ چونک چونک جاتے۔

زور کے بہت سے خطوط میرے پاس محفوظ ہیں۔ اور اُن کے کچھ عطیات بھی۔ افسوس ہے اس وقت میں مری میں ہوں جہاں میرا کتاب خانہ مجھ سے دور ہے اس لئے میں صرف یہ چند حروف زور کی یاد میں لکھ سکا ہوں۔ اور یہ بالکل ذاتی اور نجی چیزیں سی ہیں۔ کبھی فرصت ملی تو اُن کے علمی مرتبہ کے متعلق پھر کچھ عرض کروں گا۔

خواجہ حسن ثانی نظامی دہلوی

ایک تاثر

ڈاکٹر زور صاحب کے متعلق بہت سی ایسی باتیں سچائی کے ساتھ کہی جا سکتی ہیں جو ہر بڑے آدمی کے متعلق تھوڑے سے ردّ و بدل کے ساتھ اب تک کہی جا چکی ہیں۔ مثلاً یہ کہ انھوں نے اپنی ان تھک محنت سے بڑے کارہائے نمایاں انجام دیئے۔ وہ اپنی ذات سے ایک انجمن اور ایک ادارہ تھے۔ ان کی سیرت آنے والوں کے لئے ایک نمونہ بنی رہے گی وغیرہ!

مجھے اس قسم کی کوئی بات عرض نہیں کرنی ہے کیونکہ زور صاحب کی عوامی زندگی اور علمی ادبی خدمتوں سے بے شمار لوگ واقف ہیں۔ اور بہت عمدگی سے اس زندگی اور ان خدمات کا تذکرہ کر سکتے ہیں۔ میں تو صرف وہ واقعات اور وہ تاثرات لکھنے چاہتا ہوں جن سے مجھے زور صاحب کے قریب آنے کے بعد سابقہ پڑا۔ اور جن کی وجہ سے وہ مجھے بڑے آدمیوں میں بھی بڑے نظر آنے لگے۔

میرے والد حضرت خواجہ حسن نظامی مرحوم ڈاکٹر زور صاحب کے بڑے قدر داں تھے۔ ان کے "ادارۂ ادبیات اردو" کو "ایوانِ اردو" کا خطاب ۱۹۲۶ء میں خواجہ صاحب ہی نے دیا تھا۔ اور ڈاکٹر زور صاحب بھی خواجہ صاحب سے بڑا خلوص رکھتے تھے۔ اس لئے ہوش سنبھالنے کے بعد مجھے ڈاکٹر صاحب سے دلّی اور حیدرآباد میں ملنے کا اکثر اتفاق رہا۔ وہ ہمیشہ میرے ساتھ بزرگانہ شفقت سے پیش آتے اور میں ان سے اسی ادب اور احترام کے ساتھ ملتا جس ادب اور احترام کے ساتھ مجھے اپنے والد کے دوستوں سے ملنا چاہیئے تھا۔

لیکن والد کے انتقال کے بعد دسمبر ۱۹۵۵ء میں میں حیدرآباد گیا اور ڈاکٹر صاحب کے پاس حاضر ہوا تو وہ بالکل نئے انداز میں مجھ سے ملے۔ میں فیصلہ نہیں کر سکا کہ اس انداز میں بڑے بھائی کی جھلک زیادہ ہے یا بے تکلف اور مخلص ترین دوست کا رنگ نمایاں ہے۔ اس کے بعد ملاقات میں ان کی بے تکلفی بڑھتی چلی گئی۔ اور مجھے ان کو کسی قدر قریب سے دیکھنے کا موقعہ ملا۔ اور جتنا میں ان کے قریب ہوا اتنا ہی ان کی بڑائی کا احساس زیادہ ہوتا گیا۔

ڈاکٹر صاحب کی شخصیت میں بے شمار خوبیاں تھیں۔ خامیاں بھی یقیناً ہوں گی۔ لیکن ان کی شخصیت کا ایک پہلو مجھے ایسا نظر آیا جو غالباً سب پہلوؤں سے نمایاں تھا۔ اور جس کی وجہ سے ان کی ہر خوبی میں چار چاند لگ جایا کرتے تھے اور ہر کمزوری نظر کے سامنے سے ہٹ جاتی تھی۔ ڈاکٹر صاحب جب خلوص برتتے تھے تو اس میں بناوٹ اور دکھاوے کا شائبہ تک نہ ہوتا تھا۔ کہنے کو یہ بات معمولی سی ہے۔ لیکن اس کا علم مجھ کو ڈاکٹر صاحب کے خلوص سے آشنا ہونے کے بعد ہی ہوتا تھا کہ روزمرہ ہم کو جس قسم کے خلوص سے سابقہ رہتا ہے۔ اس میں کتنے فی صدی تکلف کی ملاوٹ ہے۔ کتنے فی صدی

مروت کا لحاظ ہے۔ کتنا دکھاوا ہے۔ کس قدر منافقت ہے اور اس کے بعد اصل خلوص کی مقدار کتنی رہ گئی ہے! ڈاکٹر زور کے خلوص میں منافقت اور بناوٹ تو کیا، مروت اور تکلف کو بھی دخل نہیں ہوتا تھا۔ کم از کم میں نے ایسا ہی محسوس کیا۔ وہ بڑے عملی آدمی تھے۔ تھوڑے وقت میں بہت سارا کام کر ڈالتے تھے۔ اور اس کا راز ان کی محنت کے علاوہ غالباً یہ تھا کہ وہ اِدھر اُدھر کی بیکار، فضول اور لاگ لپیٹ کی باتوں میں وقت ضائع نہیں کرتے تھے۔ ان کی ہر بات اور ان کا ہر کام ٹو دی پوائنٹ (Tothe Point) ہوتا تھا۔ ان کے اس خلوص میں اس قدر شدت تھی کہ بعض اوقات اپنی بار بہار طبیعت کے باوجود اجنبی آدمی کو وہ کچھ اکل کھرے سے معلوم ہونے لگتے تھے۔

ہر آدمی کے دل میں نمایاں کام کرنے کا جذبہ ہوتا ہے۔ تاکہ وہ سب کے سامنے آسکے اور اس کو خوش حالی میسر آئے۔ یہ جذبہ کچھ برا جذبہ نہیں ہے۔ لیکن اس جذبے کو ہماری تہذیب کے تکلفات اور بناوٹوں نے ایسا گھیر رکھا ہے کہ کچھ لوگ بے غرض کام کے نام پر اغراض پوری کر کے اپنے آپ کو ساری عمر دھوکا دیتے رہتے ہیں اور کچھ یا تو خاکساری کے مارے کچھ نہیں کر پاتے یا چوروں کی طرح میدان میں آتے ہیں۔ اور دوسری طرف بہت سے لوگ اس جذبے کی شدت میں اپنی حد سے آگے بڑھتے ہیں کہ شہرت طلبی کی تہمت ان کے سر دھری جاتی ہے اور ان کے اچھے کام کو بھی نہایت بے اعتنائی کے ساتھ نظر انداز کر دیا جاتا ہے۔ ڈاکٹر صاحب کا خلوص اس بت کدۂ آذری میں ابراہیمی انداز رکھتا تھا۔ میرے خیال میں ڈاکٹر صاحب نے جن جن لوگوں سے کام لیا اور جن جن کو وہ کچھ بنا گئے ان سب کو انھوں نے پہلے کام کے مقصد اور اصلی خلوص سے آگاہ کیا۔

بے تکلفی کی پہلی ہی ملاقات میں ڈاکٹر صاحب نے مجھ پر واضح کر دیا کہ "حسن میاں ہم اس دنیا میں کچھ کام کرنے آئے ہیں اور یقیناً کام کریں گے اس کا پورا پورا معاوضہ چاہے وہ کسی بھی شکل میں ہو ہم کو ملنا چاہئے۔ اس لئے کام کروا ایسے سلیقے سے کرو کہ وہ کام دنیا کو نظر بھی آئے اور لوگ اس کو دیکھ کر فائدہ بھی اٹھا سکیں اور تم کو اس کا کسی نہ کسی شکل میں معاوضہ بھی ملے!"

ایک دفعہ میں ہندوستان کے مشہور آرکیٹیکٹ برادرم مولوی فیاض الدین نظامی صاحب کے بلاوے پر اور کسی اطلاع دئے بغیر حیدرآباد گیا تھا تاکہ کچھ دن سکون کے ساتھ حیدرآباد کے موسم اور خلوص کا لطف اٹھایا جائے۔ ڈاکٹر صاحب سے ملنا ضروری تھا۔ "رفعت منزل" پہنچا تو مجھے دیکھ کر بہت بگڑے کہ یہ کیا طریقہ ہے۔ نہ تمھارے آنے کی خبر اخبار میں چھپی نہ کسی مخلص کو خط سے اطلاع ملی۔ یہ ڈھنگ اچھے نہیں۔ میں نے ہنس کر عرض کیا کہ ڈاکٹر صاحب ان باتوں میں کیا رکھا ہے۔ ہم لوگ پیدا ہونے سے پہلے ہی خواجہ صاحب کے روزنامچے میں چھپنے لگے تھے اس لئے چھپنے اور شائع ہونے کا شوق نہیں رہا۔ کہنے لگے نہیں یہ سب بیکار باتیں ہیں۔ مجھے شمالی ہندوستان میں خواجہ صاحب نے بہت متعارف کرایا، میرے تعارف سے لوگ "ادارۂ ادبیات اردو" سے واقف ہوئے اور اس واقفیت نے سب کو فائدہ پہنچایا۔ تم بھی ایک مشن اور ایک ادارے سے وابستہ ہو۔ اس لئے خواہ مخواہ کی خاکساری دکھا کر آنے کا مطلب یہ ہے کہ اپنے مشن کو نقصان پہنچاتے ہو جس پر ملنا جلنا بہت ضروری ہے۔ تم کو تفریح کے وقت بھی کام کو یاد رکھنا چاہئے۔ آج کل کُٹیا میں بیٹھنے سے تصوف کی کوئی خدمت نہیں ہو سکتی!

ڈاکٹر صاحب حیدرآباد کے ایک مشہور قادری بزرگ کے صاحبزادے تھے۔ لیکن انھوں نے اپنے بجائے اپنے بڑے فرزند حضرت میاں تقی الدین صاحب کو گدی پر بٹھا دیا تھا اور خود اپنے لئے کام کی دوسری اور ذرا آزاد روش مقرر کر لی تھی جس سے سب واقف ہیں۔ چند سال پہلے کا ذکر ہے کہ ڈاکٹر صاحب دلی آئے اور معمول کے مطابق میرے ساتھ درگاہ حضرت خواجہ نظام الدین اولیاء میں بھی حاضری دی۔ وہ روضے شریف کے اندر فاتحہ پڑھ رہے تھے اور میں باہر کھڑا تھا۔ اتنے میں کسی خادم نے مجھ سے پوچھا کہ اندر کون صاحب ہیں؟ میں نے بتایا کہ حیدرآباد کے فلاں مشہور بزرگ کے صاحبزادے ہیں اور یہ نام ہے۔ خادم صاحب بڑے منہ پھٹ تھے۔ انھوں نے بڑی بدتمیزی سے ایک فقرہ کہا جسے ڈاکٹر صاحب نے بھی روضے کے اندر سن لیا۔ تھوڑی دیر بعد مسکراتے ہوئے باہر نکلے اور بڑی زندہ دلی سے پوچھنے لگے کہ یہ شخص تم سے کیا دریافت کر رہا تھا۔ میں نے کہا آپ کو پوچھتا تھا۔ میں نے بتا دیا کہ فلاں صاحب ہیں۔ بولے اور کچھ؟ میں نے عرض کیا اور کچھ بھی نہیں! خوب ہنسے اور کہنے لگے کہ حسن میاں! میں نے اس کا ریمارک سن لیا ہے مگر ایک دفعہ تمھاری زبان سے اور سننا چاہتا ہوں تکلف نہ کرو کہہ دو! چنانچہ مجھے کہنا پڑا کہ خادم نے یہ کہا تھا کہ "یہ بزرگ کے صاحبزادے ہیں! شکل سے تو ایکٹر معلوم ہوتے ہیں!" ڈاکٹر صاحب پھر خوب ہنسے اور اس کے بعد ایک دم سنجیدہ ہو گئے اور کہنے لگے۔ "کیسی سچی بات کہی اس نے! بالکل ٹھیک کہا! مگر افسوس کہ اس کو یہ خبر نہیں ہے کہ وہ خود بھی ایکٹر ہے۔ ہم سب ایکٹر ہیں اور اپنا اپنا پارٹ ادا کر رہے ہیں۔ مگر کسی کو اپنے پارٹ کی خبر ہے۔ کسی کو نہیں۔ شکر ہے کہ میں اپنا پارٹ جانتا ہوں! آئندہ تم کسی سے میرا یہ "بزرگانہ" تعارف نہ کرانا۔ یہ تعارف تقی میاں کے لئے مخصوص رکھو۔ کیونکہ انکو یہی پارٹ ادا کرنا ہے۔ میرا پارٹ دوسرا ہے!"

پھر کہنے لگے کہ میرا بڑا جی چاہتا ہے کہ تقی میاں کچھ دن تمھارے ساتھ رہیں اور تم میرے ساتھ رہو۔ تقی میاں یہاں رہیں گے تو ان میں طریقت اور شریعت کا ذوق پیدا ہوگا۔ اور تم میرے ساتھ رہو گے تو تمھیں معلوم ہوگا کہ دنیا سے کس طرح فائدہ اٹھانا چاہیے۔ تم نہ لمبا کرتا پہنتے ہو۔ نہ سر کے اور ڈاڑھی کے بال بڑھاتے ہو۔ نہ پیروں اور مرشدوں کی طرح برتاؤ کرتے ہو اور شوق یہ ہے کہ کچھ بزرگوں کے مشن کا کام کریں! مجھے اس نصیحت پر ہنسی آ گئی۔ کہنے لگے کہ تم ہنستے ہو! واقعی یہ بات ہنسی کی بھی ہے کہ ایک معقول کام اور معقول طریقے کو لوگوں نے تماشا بنا لیا ہے مگر یاد رکھو اس وضع قطع اختیار کئے بغیر لوگ تم سے متاثر نہیں ہوں گے اور متاثر کئے بغیر تمھیں کامیابی نہیں ہو سکتی!

مجھے ڈاکٹر صاحب کی اس آخری رائے سے اختلاف تھا اور اب بھی ہے۔ لیکن یہ ایک حقیقت ہے کہ کام کے متعلق جو اصول انھوں نے بنا رکھے تھے۔ یہ مشورہ ان کے عین مطابق تھا۔

ڈاکٹر صاحب کے انتقال سے شاید ڈیڑھ دو ہفتے پہلے "ایوان اردو" حیدرآباد میں قوالی کی مجلس ہوئی۔ اس وقت ڈاکٹر صاحب کی بیگم صاحبہ اور بچے سب کشمیر میں تھے۔ ڈاکٹر صاحب اکیلے حیدرآباد آئے ہوئے تھے۔ اتفاق سے انھی دنوں میں بھی حیدرآباد پہنچ گیا۔ ڈاکٹر صاحب افسردہ سے تھے۔ نشست کی چوکی کے پاس خلاف معمول سوٹ کیس رکھا تھا۔ اور گھر کے دوسرے کمروں کے دروازے بند تھے۔ کہنے لگے دیکھو گھر میں بھی پا بہ رکاب ہوں! طبیعت بہت گھبرا رہی ہے۔ تم آ گئے بڑا اچھا ہوا۔ ایوان اردو میں تعمیر کے بعد سے اب تک قوالی کی کوئی مجلس نہیں ہوئی ہے۔

ایک زوردار محفل ہوجائے۔ چنانچہ پروگرام بنا اور حیدرآباد کے بہت سے عمائد اور مشائخ مدعو کئے گئے۔ اور عزیز احمد خاں قوالی ہوئی (افسوس ڈاکٹر صاحب کی زندگی میں ایوان اردو کی یہ آخری مجلس تھی!) ڈاکٹر صاحب کے ہاں جو محفل ہوتی تھی ان کے بڑے فرزند تقی میاں صاحب کو مشائخ کے ساتھ صدر میں بٹھایا جاتا تھا۔ اور ڈاکٹر صاحب الگ مودب ہوکر بیٹھ جاتے تھے۔ اس دفعہ تقی میاں کشمیر میں تھے۔ اس لئے میں نے بڑے اصرار سے ڈاکٹر صاحب کو اپنے پاس بٹھایا اور قوالی میں نذریں ان کی طرف بڑھانی شروع کیں تو وہ بہت جز بز ہوئے۔ بار بار میرا ہاتھ تھامتے اور جھک کر کان میں کہتے تھے کہ مجھے نذر نہ دو۔ یہ میرا کام نہیں ہے!

ڈاکٹر صاحب کو اگر محض بڑا بننے کا شوق ہوتا تو وہ اپنے والد کی گدی نہ چھوڑتے۔ سجادہ نشیں ہوتے ہوئے وہ اپنے علمی اور ادبی مشاغل جاری رکھ سکتے تھے۔ اردو کی تو تاریخ ہی سجادہ نشینوں اور صوفیوں کے ذکر سے بھری ہے۔ لیکن انھوں نے دوسری روش اختیار کی اور اس روش کا حق کسی شرک کے بغیر اس طرح ادا کیا کہ دنیا جانتی ہے۔ ان کی شخصیت کا یہی پرخلوص رنگ تھا جسے دیکھ کر دل میں ان کی عزت دن بدن بڑھتی تھی اور جب وہ کام کے معاوضے کی تلقین کرتے تھے تو نیچے ہونے کے بجائے اور بلند ہوجاتے تھے!

اردو کے نامی گرامی قلمکار اور خدمت گزار ایک ایک کرکے اٹھتے جاتے ہیں۔ ہر روز کسی نہ کسی کا دھڑکا لگا رہتا ہے۔ بڈھوں کے بارے میں تو یہ کہہ کر دل کو تسلی دے لیتے ہیں کہ وہ اپنی عمر طبعی کو پہنچ چکے تھے لیکن یہاں تو آئے دن بڑے بڑے کڑیل جوانوں کو رونا پڑتا ہے مگر موت کی اس گرم بازاری کے باوجود یہ خیال کسی کو نہیں ہوتا تھا کہ ڈاکٹر محی الدین قادری زور بھی یوں آناً فاناً ہم سے رخصت ہوجائیں گے۔ ڈاکٹر صاحب کے کام نے اور اُن کی رفتار کی توانائی نے اور ان کے زندگی بخش ولولے نے سب کو یہ باور کرا رکھا تھا کہ ڈاکٹر صاحب نوجوانوں سے زیادہ جوان اور زندوں سے زیادہ زندہ ہیں۔ موت ان کے قریب بھی نہیں پھٹک سکتی۔ لیکن موت آئی اور ایسے دبے پاؤں آئی کہ لوگ ڈاکٹر صاحب کے جانے کے بعد بھی چونک بھی سکے۔ بچانے والوں کو یہ حسرت ہی رہی کہ کاش کچھ کوشش تو کر سکتے۔ نتیجہ جو بھی ہوتا۔ لیکن ڈاکٹر صاحب کے لئے کچھ کرنے کا ارمان تو ضرور نکل جاتا۔

ڈاکٹر صاحب نے کشمیر یونیورسٹی میں اردو ڈپارٹمنٹ کو سنبھال رکھا تھا۔ وہیں یکایک دل کا دورہ پڑا اور ڈاکٹر صاحب دیکھتے دیکھتے ختم ہوگئے۔ ڈاکٹر صاحب ایوان اردو کو سنسان کر گئے۔ اللہ اردو والوں کو صبر دے اور جانے والے کی مغفرت فرمائے۔

(ماہنامہ "منادی" نمبر ۹۔۱۰۔ ۱۹۹۲ء)

ابوالبیان محمد عبدالقدیر (نظامی)

زور مشاعروں میں

سچ ہے:—

دو چیز آدمی را کشد زور زور
یکے آب و دانہ، دوم خاک گور

آہ! کس کو خبر تھی کہ ہمارا زور اپنی بہتر قابلیت اور اچھی صلاحیتوں کا ثبوت دینے وادیٔ کشمیر پہنچے گا۔ اور وہاں اس طرح سلب ہو جائے گا کہ ہم جدیدۂ پرنم اس کے کارناموں کی یاد تازہ کرنے بھولی بسری باتوں کو طاق نسیاں سے ٹٹول کر پیش کر رہے ہیں کہ زور کے کاروان حیات کا ہر غبار آئینہ تاریخ پر محفوظ رہے۔ چنانچہ جب مجھ سے میرے احباب نے سب رس کے زور نمبر میں کچھ لکھنے کے لئے ارشاد فرمایا تو میں عجیب کشمکش میں پڑ گیا کہ آخر ایسے شخص کے لئے جو دنیائے ادب اردو میں اپنے زور قلم سے ادب قدیم و جدید کے ایسے دریا بہا دیئے کہ جس کا نام ادبیات اردو کے سلسلہ میں آب زر سے لکھے جانے کے قابل ہے۔ جو بلاشبہ زور کے نام کے ساتھ زندۂ جاوید رہیں گے۔ جس کے آثار بے شک عیاں ہیں اور یقیناً بیاں ہوں گے۔ مگر وہ خاک پُر زور جو ایک خطۂ مردم خیز قندھار سے بگولہ بن کر اٹھی، مکتب نظامیہ میں آ کلی بن کر چکی اور پھر دارالعلوم پر گھٹا بن کر چھائی اور وہی گھنگھور گھٹا جامعہ عثمانیہ پر رحمت کی طرح ایسی برسی کہ پھر فضائے ادب میں تا دم آخر اپنی ضیا پاشی سے ادب کو منور کرتی رہی اور پھر ظاہر ہے کہ علوم جامعہ سے فارغ ہونے کے بعد زور نے اپنی ذہنی کاوشوں سے جو نقشہ کار چھوڑے وہ سندِ دوام حاصل کر چکے۔ اس پر یقیناً ان کے کالج کے ساتھی۔ رفقائے ادارہ اور ایوان اردو کے عمائدین روشنی ڈالیں گے۔ مگر یہ تمام علمی بوجھ جس کندھے پر فطرت کو ڈالنا مطلوب تھا اس کی بنیاد جس کردار پر تھی اور اس کا نشو و نما جس آب و ہوا پر ہوا اس کا ورق بھی الٹ لیا جائے تو وہ قنوطیت میں طلباء کے لئے مشعل ہدایت ثابت ہوگا۔ اسی لئے میرے دلی و جانی دوست زور مرحوم کے ان مشاعروں کا تذکرہ اجمالاً کروں گا جس میں ہم شریک رہے۔

زور کے والد محترم حضرت زعم اپنے وطن مالوفہ قندھار شریف سے زور کو ساتھ لاتے ہیں۔ ۱۹۱۹-۲۰ء کا زمانہ ہے۔ میں اور زور مدرسہ نظامیہ کی یکجائی کی وجہ سے مسجد چوک کے کتب خانہ میں ملتے اور وہیں طبع آزمائی ہوتی۔ زور کے والد محترم حضرت زعم خود بھی ایک اچھے شاعر تھے جس کی وجہ سے زور کی طبیعت پر بھی شاعرانہ زور غالب تھا۔ اب زور میرے ساتھ نصاب مولوی کی تکمیل کر کے میٹرک کا امتحان دے رہے ہیں۔ اسی زمانہ میں ایک دفعہ ہم دونوں افضل گنج کے چمن میں بیٹھے باتیں کر رہے تھے ایک ہمارے ساتھی تشریف لائے۔ یہ بھی فن ادب سے دلچسپی رکھتے اور اخبارات میں مضامین لکھتے تھے۔ انھوں نے ہم سے کہا کہ بارہ دری چندولال میں طرحی مشاعرہ ہے۔ جس میں مصرعہ —

جس گھر میں پھوٹ ہوگی وہ گھر خراب ہوگا۔

مصرعہ ہے۔ جوں ہی زور نے سنا اپنی خاص مسکراہٹ و انداز سے میری طرف دیکھ کر کہا چلو قدیر بھائی اس مشاعرہ میں غزلیں سنائیں، میں نے بھی سر ہلا دیا۔ بس ہم نے وہیں سونٹھ کی ناس لی اور الگ الگ فکر کرنے لگے۔

ابھی مشاعرہ کے لئے دس روز باقی تھے۔ غزل کی فکر ہو رہی ہے۔ زور مجھ سے اور میں زور سے کرید کرید کر قافیے اور مصرعے پوچھ رہے۔ میرے دل میں بار بار یہ خیال آتا ہے کہ حضرت زعم ؔ زور کو پُر زور کریں گے۔ اور زور سمجھتے ہیں کہ میرے فارسی کے استاد حضرت علامہ رفعت کیفیؔ میری غزل میں کیفیت بھر دیں گے۔ چنانچہ عین مشاعرہ سے چند گھنٹے قبل جب ہم دونوں ملے تو آپس کی فقرہ بازی نے مجبور کر دیا کہ ایک دوسرے کو غزل سنا دیں۔ زور نے غزل سنائی۔ پھر میں نے بھی اپنی غزل سنائی۔ مجھے میری غزل کا ایک شعر یاد ہے۔ اور زور کی غزل کا بھی ایک ہی یاد رہا۔ جس کے یاد رہنے کا سبب آپ بھی سنیں گے تو بہت لطف اٹھائیں گے۔ اس مشاعرہ میں شرکت سے پہلے ذرا ہماری حالت بھی دیکھئے کہ ہم نے بچپن کو خدا حافظ کہہ کر لڑکپن کے کھیل کود کو سلام کرنے کا زمانہ محسوس کر لیا ہے جس کو تمدن و تہذیب میں شاید عنفوانِ شباب کہا جائے۔ اللہ غریق رحمت کرے زور کا حسن و جمال جو آخری زمانہ میں حسن مقدس تھا تو اس زمانہ کا اندازہ لگائیے کہ وہ کیسے گلاب کی پنکھڑی ہوں گے اور میں بھی اپنا آپ سمجھئے کہ ؎

جمالِ ہم نشیں بر من اثر کرد

کچھ جامہ زیب ضرور تھا۔ بہرکیف وقت آیا اور ہم دونوں چلے۔ پہلے مشاعرہ کا مقام دیکھئے کہ بارہ دری کی اونچی کرسی کے بڑے دالان کے سامنے لبالب حوض میں چٹک چاندنی نے آسمان کو زمین دوز کر دیا ہے اور دو دھراؤں کے دروازہ سے بارہ دری تک بجلی کے گولے پچاس قدم پر دودھ ہی دودھ اگل رہے ہیں۔ بارہ دری میں بہترین سفید فرش گاؤ تکئے اور اس کا لوازمہ جما ہوا ہے جب ہم وہاں پہنچے تو دیکھا کہ اس وقت کے نامور اساتذہ حضرت ضیا گورگانی دہلوی، حضرت جلیل، حضرت ثاقب، حضرت ضیغم، حضرت برتر، حضرت ضامن کنتوری، حضرت کیفی، حضرت ساقی، حکیم ظہور احمد صاحب، جناب صغیر صاحب، وغیرہ سب جمع ہیں اور مہاراجہ کشن پرشاد شاد کی آمد کا انتظار ہے۔ فرزل آئی اور نرسنگ راج عالی نے ان کی غزل سے مشاعرہ کا آغاز کیا اور اب مبتدی شعرا پکارے جانے لگے۔ ایک دو غریب شاعر تھے وہ جیسے ان کے بعد دو ایک طلبا بھی بیٹھے۔ یہ غریب داد کیا پاتے بلکہ آگ بگولہ شمع کو چھوڑ کر چلے جاتے۔ اب ایسے سید محی الدین قادری جناب زور پکارے گئے جو نہایت سفید ملبوس سے مکلف سر پر بانکی ترکی ٹوپی سجائے صبا رفتار شمع کے قریب تشریف لے گئے مطلع پڑھا اور اس کے بعد یہ شعر سنایا ؎

اپنے کئے پہ ظالم کیوں اس قدر ہے نازاں
ہم کو خراب کر کے تو بھی خراب ہوگا

زور تحت اللفظ پڑھتے اور اس زمانہ میں یہ ہی شائستگی سمجھی جاتی تھی جب "خراب ہوگا" اپنی گرجدار آواز سے کہا تو مجمع کے ایک کونہ سے آواز آئی "ہائے میری جان کس نے" بس مشاعرہ میں ایک آن قہقہہ پڑا اور ساتھ ہی اہل ذوق برہم ہوئے کہ یہ کون ہے۔ پکڑو۔ پھر ایک مغل بچہ کے لٹھ باز گردن جھکائے سامنے لائے گئے اور ابراہیم خاں صاحب صدر امین نے کچھ ان کی مرمت کی اور پھر طوفان تھا تو راقم الحروف کو پکارا گیا۔ اب یہاں میرا سانس پھولنے لگا کہ الٰہی وہ ذاتِ شریف تو قہر الٰہی کی طرح محفل میں موجود ہے۔ میرا غریب ساتھی اس طرح عرق عرق ہو گیا ہے کہ ہمارا آئندہ مشاعروں میں جانا ختم ہے گویا یہ پہلا مشاعرہ ہمارے حق میں آخری مشاعرہ ہے اور میں نے یہ تصفیہ کر لیا کہ اب غزل پڑھنے سے انکار کر دیا جائے۔ لیکن حضرت کیفی اور حضرت ضیا گورگانی نے اصرار آیا د فرمایا مجھے بھی میرا مطلع یاد

گر دو شعر کے بعد جب یہ تیسرا شعر پڑھا ؎

ان بے وفائیوں کو کیا گن سکے گا کوئی
تیرا حساب ظالم یوم الحساب ہوگا

پس یوم الحساب کا قافیہ زبان سے نکلنا تھا کہ اس اللہ کے بندے نے اک زور کا نعرہ "اللہ اکبر ابھی سے" ایسا کہا کہ مجمع پر ایک بجلی گری۔ مگر ساتھ ہی حضرت نجم کے کہنے پر لوگ اس پر ٹوٹ پڑے اور مشاعرہ درہم برہم ہو گیا۔ اور وہ صاحب کشاں کشاں دست بہ دست دگراں باہر نکال دیئے گئے۔ اور اس گڑبڑ میں ہم دونوں بھی باہر نکل گئے اور آتے ہوئے یہ سوچنے پر مجبور ہونے لگا کہ شاعروں کو ان غیر شائستہ عناصر سے کیسے محفوظ رکھا جا سکے گا۔

زور کی یہ رائے تھی کہ مشاعرے دعوت ناموں تک محدود رہیں اور طلبا کے داخلہ کے لئے اساتذہ کی سفارش لازم کی جائے۔ اسی اصول پر ہم نے تفصیلات سوچیں اور دوسرے روز حضرت علامہ کیفی کی خدمت میں حاضر ہوئے اور اپنے خیالات کا اظہار کیا۔ چنانچہ اسی اصول پر ایک اور طرحی مشاعرہ عید کی خوشی میں حضرت کیفی کی صدارت میں بہ طرح ؎

عید آتی ہے تو کیا لاتی ہے

بہ دیوڑھی فیروز یار جنگ قرار پایا۔ زور پیدائشی منتظم اور اپنے ساتھیوں سے کام لینے میں ماہر تھے۔ چنانچہ افسر اور نواب حمید الدین عمر کو بھی انھوں نے ساتھ لے لیا۔ تقریباً دو سو رقعے تقسیم کئے گئے مشروبات کا انتظام بھی رکھا گیا اور مشاعرہ کا وقت پانچ ساعت مقرر کیا گیا تھا۔ وقت مقررہ پر مدعو شعرا کرام جن کی تعداد (۲۱) یا (۲۲) ہوگی جن میں حضرت صدر کے ساتھ ان کے تلامذہ مرحوم صفی اورنگ آبادی اور منتی بھائی جناب اشرف علی صاحب اشرف اور اساتذہ میں حضرت ضیا گورگانی، نواب ضیغم، علامہ زمخشری، مولانا مجیب اشد صاحب مجیب، مولانا ابوالحمید صاحب آزاد، حضرت فروغ، حضرت باغ، اور ان کے ساتھ دوسرے شعرا جناب محمد حسین صاحب آزاد، جناب رنگ اور جناب نفیر صاحب وغیرہ بھی موجود تھے۔ تقریباً مغرب تک بجز شعرا سامعین میں صرف ایک جناب عمر یافعی صاحب اور چار محلے کے دوست موجود تھے۔ مغرب کی نماز کے بعد حضرت ضیا کے اصرار پر مشاعرہ کا آغاز ہوا۔ چنانچہ افسر نے اپنی غزل پڑھی۔ مطلع سے تخلص تک اساتذہ ہر شعر پر سر ہلاتے۔ "خوب فرمایا" "کیا کہنا" "اچھا آگے چلیے" "ارشاد فرمایا" اور ہم دم بخود اساتذہ کے سامنے ٹک ٹک دیکھتے رہے کہ کہیں ہماری آہ یا واہ کو بے ادبی نہ سمجھیں۔ مگر اب وہ بھی مولانا جنھیں اپنی ادبیت کا بہت خیال تھا۔ تیوری چڑھائے ہوئے ہمارے بازو بیٹھے بیٹھے یہ بھی کہہ دیا کہ آپ لوگ تو بت بنے ہوئے ہیں۔ افسر کے بعد حمید الدین عمر نے اپنی غزل سنائی۔ ان کی غزل پر حضرت فروغ نے کچھ داد و تحسین کا اظہار بھی فرمایا تھا کہ حضرت رنگ نے فرمایا کہ ماشاء اللہ استادی کا رنگ معلوم ہوتا ہے۔ عمر میاں خدا غریق رحمت کرے بڑے غیور تھے تین ہی شعر پر غزل ختم کی اور اٹھ گئے۔ میں اور زور دم بخود تھے کہ ایسا روکھا پھیکا مشاعرہ گزر رہا ہے۔ ایسے میں جناب سعید جو معتمد مشاعرہ کے فرائض انجام دے رہے تھے بھائی نقد کو پکارا۔ اور وہ اپنی جگہ سے اٹھ کر غزل سنبھالے ہوئے چلے تھے کہ حضرت فروغ نے کہا کہ نجم کے صاحبزادے زور آرہے ہیں۔ شعرا نے بہت ہی نازک مسکراہٹ سے ان کا خیر مقدم کیا گیا اور انھوں نے اپنی غزل سنائی۔ اب حضرت نجم بھی خاموش سن رہے ہیں کہ محمد حسین صاحب آزاد نے زور کے مصرعہ ؎

موت کیا بار بار آتی ہے

پر داد دی اور بار بار کے قافیہ پر دوبارہ زور دیا اور بار کے بجائے "باد" کہہ دیا۔ جس سے ایک قہقہہ بلند ہوا اور فوری زور صاحب

تیوری چڑھائے ہوئے سلام کر کے اپنی جگہ پر آ گئے۔ اس کے ساتھ ہی راقم الحروف کا نام عقیل صاحب نے پکارا "قدیر نواب ترنم سے" میں نے اپنے استاد حضرت ضیاء کی طرف دیکھا ہی تھا کہ شہزادگی کی شان و متانت سے تیوری چڑھا کر فرمایا کہ "کیا سازندوں کو بھی بلوایا ہے" اب کیا بتاؤں اور کیا لکھوں کہ مجھ پر کیا عالم طاری تھا۔ گردن جھکائے ہوئے میں نے تحت اللفظ ایک ہی سانس میں غزل سنا دی۔ اس زمانہ میں ترنم سے پڑھنا عیب سمجھا جاتا تھا۔ مگر نواب سراج الدین خاں سائل دہلوی جو داغ اسکول کے بڑے استاد تھے ہمیشہ ترنم سے ہی پڑھتے۔ مگر دوسرے قدیم وضع دار بزرگ خوش الحانی کو کلاونت کی میراث سمجھتے اور بہت بڑا عیب مانتے بہرکیف اساتذہ نے اپنا اپنا کلام سنایا اور خوب جی کھول کر ایک دوسرے پر داد و تحسین کے پھول برسائے۔ اور ہم لوگ ایک دوسرے کی صورت دیکھتے ہی رہ گئے۔ پھر چائے کا دور چلا۔ اساتذہ تشریف لے گئے۔ اور ہم ایک دوسرے پر برسنے لگے۔ افسر نے یہاں تک زور صاحب سے کہدیا کہ میری غزل حاصل مشاعرہ تھی مگر تم دونوں نے جل بھن کر خموشی اختیار کی اور عمداً سر تک نہ ہلایا تو پھر مجھے کیا ضرورت تھی کہ آپ کے رد کیے پھیکے اشعار پر داد سخن دیتا۔ چلو ہٹاؤ۔ اب نہ شعر ہوں گے اور نہ مشاعرے۔

اب ہم نے پھر سوچا کہ مشاعرہ کی نوعیت جس میں صاحبانِ ذوق کے ساتھ شوخ و شنگ لوگ جمع ہو جاتے ہیں بہتر ہے یا یہ دعوتی ناموں کے مشاعرے جہاں مبتدی آہ و واہ کی ہمت بھی نہ کر سکیں؟ پس اسی طرح ہم مشاعروں میں شریک ہوتے اور ایک آخری مشاعرہ جو یادگار ہے لکھ کر قلم کوتاہ کرتا ہوں۔ وہ یہ کہ سٹی کالج اپنی جدید عمارت میں منتقل ہو چکا ہے اور یہاں جناب اعظم صاحب (اعظم یار جنگ) کی صدارت کا دور دورہ ہے۔ سر اقبال کا یہ مصرعہ طرحی ہے ؎

اے عندلیب اب تک نالہ ہے خام تیرا

یہ مشاعرہ علامہ حیدر یار جنگ نظم طباطبائی کی صدارت میں منعقد ہوا ہے۔ زور کالج میں شریک ہیں اور اپنے استاد مولانا وحید الدین سلیم کے منظورِ نظر ہیں اور اپنا اچھا اثر ان پر رکھتے ہیں اور مشاعرہ میں بالکل مولانا سلیم ہی کی طرح تحت اللفظ بہت ہی گرجدار آواز میں پڑھتے ہیں۔ اس مشاعرہ میں تلمیذانِ حضرت سلیم اکثر موجود ہیں۔ میں اس زمانہ میں مدرسہ نظامیہ سے نکل کر گورنمنٹ لا کلاس اور مشیر قانونی رائے بیجناتھ صاحب کے ہاں متعین ہوں اور قانونی شغف کا آغاز ہے۔ مجھے اس مشاعرہ میں شرکت کا دعوت نامہ خود زور نے دیا اور خواہش کی کہ ضرور شریک رہوں۔ چنانچہ مشاعرہ میں شریک رہا۔ دیکھا کہ حیدرآباد اور بیرونِ ہند کے نامی گرامی شعرا موجود ہیں۔ پرنسپل کالج بھی براجمان ہیں۔ آغاز مشاعرہ پر ہی سامعین (طلبا) نت نئے انداز سے شور و غل کر رہے ہیں۔ اسی اثنا میں زور پکارے جاتے ہیں وہ اپنے خاص انداز میں ڈائس پر میر مشاعرہ سے کچھ پہلو لئے ہوئے اپنی غزل سناتے ہیں اور ظاہر ہے کہ وہی طرز جیسے کہیے کہ شعر کا وزن نمایاں ہو گرجدار آواز میں سنا رہے ہیں۔ جوں ہی سامعین سے کچھ بدذوقی کا اظہار ہوا وہ واپس لوٹ کر اپنی جگہ پر بیٹھ گئے۔ اور مجھ سے فرمایا بھئی ان مشاعروں کی اصلاح ناممکن معلوم ہوتی ہے اور اب تو ہم کسی مشاعرہ میں غزل نہیں سنائیں گے۔ میں بہت متاثر ہوا اور سامعین سے مخاطب ہو کر کچھ کہنا ہی چاہتا تھا کہ کالج کے اسٹاف سے ایک بلند ہمت استاد نے ایک اچھی ڈانٹ پلائی اور ان کی اس تقریر کا اثر مشاعرہ کے سکون میں نمایاں ہوا۔ اور میرا نام پکارا گیا۔ مجھے خوب یاد ہے کہ میں نے حضرت حافظ علیہ الرحمہ کے اس شعر سے غزل کا آغاز کیا ؎

آسایشِ دو گیتی تفسیر ایں دو حرف است
با دوستاں تلطف با دشمناں مدارا

جس پر مولانا تسلیم نے حسبِ عادت بڑے زور سے کہا کہ کیا خوب" یہ آپ کے مکتب کا اثر ہے۔" چنانچہ اس کے بعد جس جس مشاعرے میں زور نے اپنی محبت سے مجھے یاد فرمایا۔ وہ خود پڑھنے کے لئے تیار نہیں ہوئے۔ حتیٰ کہ اپنے والدِ مرحوم کے یادگار طرحی مشاعروں میں بھی وہ خاموش ہی رہنا پسند کرتے تھے۔ مگر اس خاموشی کا بدل بہ حیثیت صدر مشاعرہ اس عمدگی سے ادا کرتے تھے کہ ان کی صدارت کے مشاعرے جس قدر منظم و کامیاب رہے آج ان کی مثال مشکل ہے۔ صدارت کے فرائض میں حاضر جوابی و بذلہ سنجی سے شاعر و مشاعرہ کو اس طرح متوازن رکھتے تھے کہ صاحبانِ ذوق بعض وقت بدذوقی کے گھونٹ بھی ہنستے ہوئے پی جاتے تھے اور یہی زور کی صدارت کا کمال تھا۔ لیکن خدا معلوم یہ مہرِ سکوت کیوں آج سے غالباً دو سال پہلے اس طرح ٹوٹی کہ وہ خود حضرت فیض علیہ الرحمہ کے سالانہ مشاعرہ کی طرح ؎

آگہی کب تھی انھیں رسمِ وفا سے پہلے

لیتے آئے اور کہا کہ قدیر بھائی یہ اپنا آخری مشاعرہ ہوگا ضرور آئیے۔ میں نے وعدہ کر لیا اور غزل بھی کہی مگر عین مشاعرہ کے روز بیمار ہو گیا۔ اس لئے اپنی غزل ان کے ایک شاگردِ رشید کے ذریعہ بھیج دی تاکہ مشاعرہ میں سنا دیں۔

زور نے اپنا آخری کلام جو مجھے سنایا اس میں زیادہ تر روحانیت کا رنگ غالب تھا۔ چنانچہ مصرعہ محولہ بالا کی غزل میں سراسر انھوں نے تصوف کے موتی پروئے تھے۔

یقیناً زور ہمیشہ ادارۂ ادبیات اردو اور اپنی تصنیفات کے عکس میں زندہ رہیں گے ؎

زندہ وارد مرد آثار دارد

"خدمتِ اردو و شغف و انہماک کے لحاظ سے بابائے اردو مرحوم کی جانشینی کا مستحق اگر کوئی فرد واحد ہو سکتا تھا تو وہ زور مرحوم ہی تھے۔ ولایت سے ڈاکٹریٹ کی ڈگری لانے کے بعد اپنے وطن حیدرآباد میں خدمتِ اردو پر لگ گئے اور علاوہ عثمانیہ یونیورسٹی میں منسلک ہونے کے خانگی طور پر بھی ایک زبردست "ادارۂ ادبیات اردو" قائم کر دیا۔ اس نے بھی خوب خوب کام کیا اور ایک مستقل سلسلہ امتحانات کا جاری کر دیا۔ ایک اردو انسائیکلو پیڈیا کی بھی طرح ڈال دی تھی۔ غالباً مخزن العلوم کے نام سے اور اس کے ابتدائی حصے شائع بھی کر دئے تھے۔ متعدد کتابیں تصنیف، تالیف اور ترتیب کے بعد شائع کیں۔ دن گزرتے کچھ دیر نہیں لگتی۔ ابھی کل تک اُن کا شمار نوجوان اور ہونہار ادیبوں اور ناقدوں میں تھا۔ دیکھتے دیکھتے پچپن اور ساٹھ کے درمیان ہو گئے۔

مذہبی رنگ کے تھے اور بڑے شریف النفس۔ اللہ بال بال مغفرت فرمائے۔"

عبدالماجد دریابادی

(صدقِ جدید لکھنؤ ۵ اکتوبر ۱۹۶۲ء)

سید بادشاہ حسین

ڈاکٹر زور سے میری آخری مُلاقات

ستمبر ۱۹۶۱ء کا ذکر ہے۔ اُن دنوں میں چند ہفتوں کے لئے حیدرآباد گیا ہوا تھا۔ ایک شام میں زور صاحب کے گھر پہنچا۔ موٹر کی آواز سن کر وہ کمرے سے باہر برانڈے میں آئے۔ ڈھیلی ڈھالی چیک ڈزائن کی شیروانی۔ ڈھیلا پاجامہ۔ پاؤں میں سلیپر، سر ننگا اور بال بڑے بڑے اور منتشر۔ پان چباتے اور سیدھے ہاتھ کی چٹکی سے ہونٹوں کے دونوں گوشے پونچھتے۔ نوکر کو ہدایتیں دیتے آہستہ آہستہ سیڑھیاں اترنے لگے۔

"میں کئی روز سے آپ کا انتظار کر رہا تھا۔ مجھے معلوم ہو گیا تھا کہ آپ آئے ہوئے ہیں ———"

میں نے مناسب لفظوں میں معذرت شروع کی مگر انھوں نے سنی اَن سنی کر دی۔

"آئیے! میں آپ کو پہلے "ایوان اردو" کی نئی عمارت دکھا دوں ——— ابتدا سے تو آپ واقف ہیں ——— اب چل کر دیکھئے خواب کی تعبیر۔"

زور صاحب میں مجھے کوئی فرق دکھائی نہ دیتا تھا۔ چہرہ مہرہ، جسم جسامت، چال ڈھال، بول چال اور وضع قطع، سب وہی بارہ تیرہ سال والی تھی۔ "چشم بد دور! زور صاحب آپ تو بالکل نہیں بدلے ———" میں نے کہنا شروع کیا ہی تھا کہ انھوں نے ایک قہقہہ لگایا جوان کا اپنا خاصا تھا جو نہ تو نقرئی تھا اور نہ سنہری بلکہ "زوردار" تھا۔

"آپ بوڑھے ہو رہے ہیں تو سمجھتے ہیں کہ سبھی بوڑھے ہو جائیں گے۔" پھر اسی انداز کا قہقہہ دُہرایا۔

میں نے اکثر سنا تھا کہ پُرخلوص کارکن بوڑھے نہیں ہوتے۔ آج اس کی تصدیق ہو گئی۔ زور صاحب دن رات دماغی کاموں میں تو مصروف رہتے تھے لیکن جسمانی محنت و مشقت کی طرف زیادہ توجہ نہ کرتے تھے۔ بس کبھی کبھار باغبانی سے شوق کر لیا کرتے تھے یا کسی کے کہنے سننے پر تھوڑی سی چہل قدمی بھی کر لیتے تھے۔ صبح اور شام جو دو وقت عام طور پر تفریح کے ہوتے ہیں، ان اوقات میں بھی لکھنے پڑھنے یا ادارہ کے کام کاج میں مصروف رہتے۔ اردو دوستی میں منہمک رہتے یا ادارہ ادبیات اردو کی بقا اور ترقی کی فکر کرتے۔ کبھی کبھی تو ایسا معلوم ہونے لگتا کہ ملازمت اور اس کی مصروفیات بھی ضمنی حیثیت اختیار کر لیتی ہیں اور اصل مطمع نظر اُردو اور ادارہ کی ترقی ہے۔ دن رات اسی کی فکر کرتے اٹھتے بیٹھتے یہی سوچتے۔ اس سلسلہ میں کسی نے کوئی نئی بات بتا دی یا خود کی سمجھ میں کوئی بات آ گئی تو اس کو فوراً روبہ عمل لانے کی تگ و دو شروع کر دیتے۔ مشکلات کو خاطر میں نہ لاتے اور مخالفتوں کی پروا نہ کرتے۔ نہ صرف معاونین سے کام لینا جانتے تھے بلکہ مخالفوں کو بھی شریک کار بنا لیتے تھے۔

تقریباً ایک گھنٹہ تک وہ عمارت اور اس میں سلیقہ سے رکھی ہوئی نوادرات دکھاتے رہے بلکہ اس سارے عرصہ میں

عمارت کی خوبیاں، سنٹرل گورنمنٹ کی فیاضی، فیاض الدین صاحب کا ذوقِ تعمیر، ولدار حسین صاحب کی فنی کارکردگی، عنایت جنگ کی روایتی اعانت، نرسنگ راج عالی کا شوق، سکینہ صاحبہ کی تگ و دو اور خدا معلوم کتنے ایسے نام انھوں نے لیے اور ان کی مہربانیاں گنائیں۔ پھر صدر ہندوستان کی آمد، عمارت کا افتتاح اور بہت سی تفصیلات بتائیں۔ نوادرات میں سے کچھ میرے پہلے کے دیکھے ہوئے، کچھ نئے تھے اور کچھ کے بارے میں میرا ذہن کام نہ کرتا تھا۔ ہال میں لگی ہوئی تصاویر دکھاتے ہوئے انھوں نے خاص طور پر کہا "حمید الدین صاحب شاہد سے کہہ دیناکہ ان کی تصویر بھی میں نے ٹانگ دی ہے" وہ شاہد صاحب پر اسی طرح مہربان تھے جس طرح وہ ان کا اور ادارہ کا کام انتہائی خلوص کے ساتھ کرتے تھے۔

واپس آکر ڈرائنگ روم میں بیٹھے اور میں نے دیکھاکہ ہمیشہ کی طرح سلیپر چھوڑ کر دونوں پاؤں کرسی پر رکھ کر اطمینان اور آرام کے ساتھ بیٹھ گئے۔ فوراً ہی وہ تپائی کھسکائی جس پر پاندان رکھا تھا اور پان لگانے میں مصروف ہوگئے۔ متعلقین کی خیر و عافیت پوچھی اور ان ساتھیوں اور احباب کو بھی پوچھا جو اس وقت پاکستان میں تھے۔

"آپ کو دیکھ کر دفعتاً مرحوم فیض محمد یاد آ گئے ـــــ کاش اردو انسائیکلو پیڈیا کا کام مکمل ہو جاتا!"

اکیس بائیس برس کی پرانی یاد تازہ ہوگئی اور ایسا محسوس ہونے لگا کہ یہ کل کی بات ہے۔ مرحوم فیض محمد ہی مجھے زور صاحب کے پاس اردو انسائیکلو پیڈیا کی تجویز پیش کرنے لے گئے تھے۔ دو چار دفعہ کی تفصیلی گفتگو کے بعد ہم نے کام شروع کر دیا اور ساتھ ہی ایک کمیٹی قرار پاگئی۔ ہم نے طے یہ کیا تھاکہ انسائیکلو پیڈیا بریٹانیکا اور انسائیکلو پیڈیا اسلام اور دوسری حوالہ جاتی کتابوں کی تمام جلدوں کا سرسری معائنہ کیا جاکر عنوانات کا انتخاب کیا جائے۔ ظاہر تھاکہ یہ کام بڑا وقت، بڑی ہمت اور بڑا استقلال چاہتا تھا اور وہ ایک آدمی کے کرنے کا بھی نہ تھا۔ میں نے اپنے دوستوں میں سے کاظم حسین، غلام جیلانی، منظور حسین، ڈاکٹر مہدی علی وغیرہ کا انتخاب کیا اور اس سرسری مطالعہ میں اور عنوانات کی فہرستیں مرتب کرنے میں اعانت طلب کی۔ منظور حسین تو چند روز بعد اپنی بعض مصروفیات کی وجہ کام جاری نہ رکھ سکے، البتہ کاظم حسین، غلام جیلانی اور ڈاکٹر مہدی علی نے مدتوں ساتھ دیا۔ ان کے علاوہ کچھ اور ساتھی بھی کام پر لگ گئے۔ روزانہ کئی گھنٹوں تک یہ سلسلہ مہینوں جاری رہا۔ شروع شروع میں ایسا معلوم ہوتا تھاکہ خود ادارہ کے بعض افراد کو یقین نہ آتا تھا۔ کبھی کبھار ادھر ادھر سے کچھ ایسی باتیں بھی کان میں پڑتی تھیں کہ جس سے ہمت شکنی ہوتی تھی لیکن زور صاحب تھے کہ سب سے نبٹ لیتے تھے اور اپنے مخصوص انداز میں نہ صرف کام کو سراہتے بلکہ خود بھی زیادہ سے زیادہ دلچسپی لیتے۔ جب سے انسائیکلو پیڈیا کا کام شروع ہوا ان کی توجہ سب سے زیادہ اسی شعبہ کی طرف ہوگئی تھی۔

تقریباً سات آٹھ مہینے بعد عنوانات کی فہرست کا پہلا مسودہ مرتب ہوا۔ طے پایا کہ ان عنوانات کی تقسیم علوم و فنون کے لحاظ سے ہونی چاہیے۔ دو چار مہینے اس کی بھی نذر ہوگئے۔ پھر مختلف علوم و فنون کی ذیلی کمیٹیاں بنیں۔ تراجم ہوئے، اضافے اور اخراج کا کام ہوا۔ اس درمیان میں میں نے سارے ہندوستان کے چار پانچ سو دانشوروں سے قلمی اعانت کی درخواست کی۔ تقریباً تین سو ماہرین علوم و فنون نے اپنے اپنے مضامین پر دئے ہوئے عنوانات کے تحت مضامین لکھنے کا تحریری وعدہ کیا۔ بیرون ہند سے بھی بعض ماہرین نے اعانت کے وعدے کئے۔

ان تمام چیزوں کے باوجود بھی بہت سوں کو یہ کام نہ صرف مشکل بلکہ ناممکن نظر آتا تھا۔ حکومت حیدرآباد کا دروازہ بھی

مالی امداد کے لئے کھٹکھٹایا گیا تھا۔ کچھ اعلیٰ عہدہ داروں کو کام کے معیاری ہونے کا یقین نہ آتا تھا اور اس کی ہمہ گیری پر بھی شک و شبہ تھا۔ زور صاحب نے طے کیا کہ نمونہ شائع کیا جائے۔ اب ان کا سارا وقت اسی پر صرف ہوتا تھا انھیں اصرار تھا کہ نمونہ جلد بلکہ فوراً ہی شائع کر دیا جائے تاکہ لوگوں کو نہ صرف اندازہ ہو جائے بلکہ یقین بھی آجائے۔ جوں توں کرکے بہرحال ایک نمونہ کی شائع کر دیا گیا۔

نواب علی یاور جنگ (جو اُس وقت معتمد محکمہ امور عامہ تھے) اور مرحوم غلام محمد صاحب (جو اُس وقت وزیر مالیات تھے) نے دلچسپی لینی شروع کی۔ کبھی زور صاحب ان کے ہاں جاکر تفصیل سمجھاتے اور کبھی یہ حضرات خود ادارہ آکر حالات کا اندازہ کرتے۔ کبھی امداد کی رقم کا تعین کیا جاتا۔ کبھی اس کی طباعت کا انتظام دارالطبع سرکار عالی میں کیا جانا طے پاتا اور کبھی ایک علاحدہ محکمہ کے قیام کی تجویز ہوتی۔ زور صاحب کام کی رفتار سے بہت خوش تھے اور ہر دوسرے تیسرے دن کسی نہ کسی اعلیٰ عہدہ دار کو گھیر کے لاتے اور کام کی تفصیلات بتاتے۔ انھیں دن رات یہی فکر تھی کہ کام جلد سے جلد آگے بڑھے اور اشاعت کا انتظام ہو جائے۔ وہ مشکلات سے گھبرانے والے انسان نہ تھے بلکہ میرا یہ اندازہ ہے کہ عین مشکلات ہی میں وہ ڈٹ کر کام کرنے کے عادی تھے۔ گھبرا جانا یا مایوس ہونا تو وہ جانتے ہی نہ تھے۔

کام کرنے والوں کی تعداد میں اضافہ ہونے لگا اور لوگوں کو یہ امید بندھنے لگی کہ اگر رات دن کی یہی سرگرمیاں جاری رہیں تو اردو انسائیکلو پیڈیا مرتب اور شائع بھی ہو جائے گی۔ حیدرآباد کے ایسے ایسے صاحبان ذوق بھی اس حلقے میں شامل ہونے لگے جن سے توقع نہیں کی جا سکتی تھی کہ وہ عملی حصہ لیں گے۔ فہرستوں کی تکمیل اور عنوانات کے تعین اور تراجم کا کام بڑا ہی کٹھن اور صبر آزما تھا۔ اس بنیادی کام کی تکمیل کے بعد مستقبل روشن نظر آنے لگا۔ فہرستوں کے کارڈ تیار کئے گئے اور ان کی ترتیب عمل میں آئی۔

اردو انسائیکلو پیڈیا کی انتظامی کمیٹی اور اس کے مشیروں کو اب اس بات کی فکر لاحق ہوئی کہ کام کا معیار بلند سطح پر رکھنے کے لئے مضامین صرف ماہرین علم و فن ہی سے لکھوائے جائیں اور یہ کہ اس میں بڑا تنوع بھی ہو۔ معاونین کی فہرست طویل تھی اور اس میں ہر صوبہ، ہر زبان اور ہر علم و فن کے مستند مشاہیر شامل تھے۔ ایک طرف مہاتما گاندھی، پنڈت جواہر لال نہرو، قائد اعظم محمد علی جناح، شری راجگوپال چاری، ابوالکلام آزاد، شریمتی سروجنی نائیڈو وغیرہ جیسی شہرۂ آفاق ہستیاں شامل تھیں۔ اور دوسری طرف سر رامن، سر رادھا کرشنن، ڈاکٹر ذاکر حسین، ڈاکٹر تارا چند، مولوی عبدالحق، خواجہ غلام السیدین، ڈاکٹر بینی پرشاد، ڈاکٹر رضی الدین صدیقی، پروفیسر ہمایوں جیسی علوم و فنون کے مستند ماہرین اور مصنفین شامل تھے۔

شریمتی سروجنی نائیڈو کو جب اردو انسائیکلو پیڈیا کا کام دکھایا گیا تو یہ خواہش بھی کی گئی کہ وہ بعض بزرگان سند کو بھی چھپیاں لکھ کر ادارہ کے اس کام میں عملی حصہ لینے کی ترغیب دیں۔ یوں تو وہ حیدرآباد اور حیدرآباد کے ہر کام میں دلچسپی لیتی تھیں لیکن ادارہ کے اس کام سے وہ بہت متاثر ہوئی تھیں اور انھوں نے بڑی خوشی سے اپنے بعض رفقاء کار رہنماؤں کو بڑے زور سے لکھا تھا کہ وہ اس علمی ادبی کام میں ادارہ کا ہاتھ بٹائیں۔ چنانچہ "الف" کی پہلی جلد میں ان سبھوں نے مضامین لکھنے کا وعدہ کر لیا تھا اور بعضوں نے تو وعدہ وفا بھی کیا۔

اس سلسلہ میں ایک دلچسپ واقعہ بیان کرنا چاہتا ہوں۔ ان دنوں پنڈت جواہر لال نہرو قید میں تھے۔ سروجنی نائیڈو کا

تعارف نامہ اور میرا خط انھیں وہیں ملا۔ جواب میں انھوں نے کام کو سراہا اور جذبہ کی تعریف کی۔ لفظ "آزادی" ان کے تفویض ہوا تھا۔ مضمون لکھنے پر آمادگی کا اظہار کیا لیکن ساتھ ہی یہ بھی لکھا کہ وہ اس وقت قید میں ہیں اور جیل میں حوالہ جاتی کتب فراہم نہیں کی جاتیں اور بغیر ان کتب کے انسائیکلوپیڈیا کے لئے شایان شان علمی مضمون لکھنا ممکن نہیں۔ اس لئے ان کی آزادی اور رہائی تک کا انتظار کیا جائے۔ میں نے لکھا کہ ادارہ کی طرف سے صوبائی حکومت کے سربراہ سے درخواست کی جائے گی کہ وہ یہ سہولتیں پنڈت جی کو مہیا کریں تاکہ وہ ایک خالص علمی کام میں اعانت فرما سکیں۔ جواب میں پنڈت جی نے فوراً لکھا کہ ایسا ہرگز نہ کیا جائے کیونکہ وہ حکومت ہند سے کسی قسم کی مراعات حاصل کرنا ہرگز ہرگز گوارا نہیں کرتے ـــــ جب میں نے یہ خط زور صاحب کو دکھایا تو کہنے لگے "اسے کہتے ہیں کردار کی بلندی اور اصول پرستی!"

گاندھی جی کی پوسٹ کارڈ نویسی کا حال ان سے خط و کتابت کرنے والوں کو معلوم ہے لیکن عوام زیادہ واقف نہیں ہیں۔ سروجنی کی اور میری چٹھی کے جواب میں مہاتما جی کے پرائیوٹ سکریٹری کا پوسٹ کارڈ آیا کہ وہ ان دنوں بہت مصروف ہیں اس لئے شاید "اہنسا" پر مضمون نہ لکھ سکیں۔ ادارہ کی جانب سے اصرار پر اصرار کیا گیا کہ ان کا مضمون ضروری ہے اور بغیر اس کے پہلی جلد شائع نہ ہو سکیگی۔ بالآخر ایک پوسٹ کارڈ ملا کہ وہ مضمون لکھنے آمادہ ہیں ـــــ خطوں کا جواب پوسٹ کارڈ سے دینے والوں میں مشرق میں گاندھی جی اور مغرب میں جارج برنارڈ شا مشہور تھے۔

قائد اعظم نے بھی بڑی رد و قدح کے بعد "اقلیت" پر مضمون لکھنا منظور کر لیا تھا۔ مغربی علما و مصنفین میں سے جن مشاہیر نے خندہ پیشانی سے اور بہ آسانی مضامین لکھنے پر رضامندی ظاہر کی تھی ان میں "برٹرانڈ رسل" نمایاں تھے۔

ترتیب کی طرف سے مطمئن ہو کر زور صاحب نے طباعت کی فکر شروع کی۔ وزیر مالیات مرحوم غلام محمد صاحب نے دار الطبع میں اس کی طباعت کا انتظام کرنا منظور کر لیا اور قیوم صاحب جو اس وقت ناظم دار الطبع تھے کو ہدایات دیدیں۔ چند ملاقاتوں کے بعد دار الطبع کے نئے ٹائپ میں انسائیکلوپیڈیا کی اشاعت طے پائی۔ یہ ٹائپ خوبصورت بھی تھا اور پڑھنے میں آسان بھی۔

چند سو صفحات کمپوز ہوئے اور دو سو کے قریب چھپ بھی گئے کہ حکومت حیدرآباد میں بھونچال آیا۔ جلد جلد تبدیلیاں ہونے لگیں اور انتشار تیز سے تیز تر ہوتا رہا۔ حکومت کی سرپرستی باقی نہ رہی۔ کام رک گیا حتیٰ کہ زور صاحب کے زور سے بھی بات نہ بنی۔

انسائیکلوپیڈیا کا ذکر چھیڑ کر زور صاحب نے میری یادوں کو تازہ کر دیا تھا اور نہ جانے کب تک میں اُن میں گُم سُم رہتا کہ دفعتاً انھوں نے مجھے چونکا دیا "کیا سوچ رہے ہیں آپ؟" میں نے جواب دیا "انسائیکلوپیڈیا کے مراحل"، ہنسنے لگے اور کہا "پان کھائیے"۔ زور صاحب کو پان کھانے کا شوق تو تھا لیکن کوئی خاص اہتمام نہ کرتے تھے۔ جالی دار پاندان جس کی ظاہری حالت بھی کچھ ایسی اچھی نہ تھی ہمیشہ ان کے آس پاس ہی ہوا کرتا تھا۔ ایک پان خود کھایا اور تمباکو کی چٹکی منہ میں ڈالی۔ دوسرا مجھے دیا۔ اگالدان میں پیک تھوکا اور کہا:

"آپ سے ایک مشورہ کرنا ہے ـــــ اسی سال کے ختم پر میں وظیفہ حسن خدمت پر سبکدوش ہو جاؤں گا ـــــ حکومت کشمیر مجھے بلا رہی ہے ـــــ"

"کس خدمت پر"

" اردو کی پروفیسری یا نظامت تعلیمات پر"

" ایک پیشین گوئی تو زور صاحب آپ کے بارے میں پوری ہوئی' دوسری کا بھی انتظار کیجئے"

" کونسی پیشین گوئی ؟"

" ٹوپا صاحب نے آپ کا ہاتھ دیکھ کر بتایا تھا کہ آپ کو حکومت سے خطاب ملے گا۔ چنانچہ حکومت ہند نے خطاب دے دیا۔ دوسری بات انھوں نے یہ بتائی تھی کہ آپ کو وائس چانسلری قسم کا کوئی عہدہ ملے گا"

" آپ کو یاد ہے مراد علی صاحب طالع نے بھی کچھ اسی قسم کی باتیں بتائی تھیں ؟"

ایک زمانہ میں زور صاحب علم جفر' نجوم' رمل وغیرہ سے دلچسپی لیتے لگے تھے۔ طالع صاحب کو ان ہی میں سے کسی علم ویسے وہ ادارہ کے بعض شعبہ جات میں کام کرتے رہتے تھے مگر ان کا زیادہ رجحان بزرگان دین کی طرف تھا۔ سیدھے سادے انسان تھے۔ فرصت کے اوقات میں زور صاحب ان سے اس سلسلہ میں گفتگو کیا کرتے تھے۔ جلسوں اور تقاریب کی تاریخیں مقرر کرنے ان سے مشورہ کر لیا کرتے تھے کہ کونسی تاریخ نیک اور کونسی بد ہے۔

میں نے کہا کہ زور صاحب پہلے تو مجھے آپ کا حیدرآباد سے باہر جانا اسلئے پسند نہیں کہ ادارہ کی صحیح معنوں میں دیکھ بھال کریگا۔ میرے اندازہ میں آپ کی راست نگرانی کے بغیر وہ ٹھیک سے چل نہیں سکیگا۔ دوسرے یہ کہ وظیفہ پر سبکدوشی کے بعد آپ وقت اسکی تنظیم اور ترقی پر صرف کر سکیں گے۔ میرے خیال میں تو یہی کام آپ کے کرنے کا ہے اور آپ کو اسی پر لگے رہنا چاہیے۔

کہنے لگے کہ اب ادارہ ایک اہتمام اور انتظام کے تحت چل رہا ہے۔ میری خاص توجہ کی ضرورت محسوس نہیں ہوتی۔ دوسرے کشمیر میں بھی اردو کی ترویج کے اچھے مواقع ہیں اور کیوں نہ میں ان سے فائدہ اٹھاؤں۔ شاید حیدرآباد کی طرح کشمیر میں بھی اردو کو عام اور زیادہ مقبول کرنے کا کام کر سکوں۔

" تو پھر یونیورسٹی کی وائس چانسلری مانگئے "

" حکومت کشمیر سے مراسلت کا کام میں نے ولد ارحسین صاحب کے ذمہ کر دیا ہے۔ وہ زیادہ سے زیادہ مراعات کا مطالبہ کر رہے ہیں۔ ویسے بخشی صاحب سے میرے بھی ذاتی تعلقات اچھے ہیں" انھوں نے کہا

" معلوم ایسا ہوتا ہے کہ آپ نے جانے کا فیصلہ کر لیا ہے ——— جائیے اور اس کی وادیوں کی خوب سیر کیجئے" میں نے کہا۔

اُن کی خواہش پر میں نے کشمیر اور جموں کے اپنے سفر کے وہ حالات سنائے جو میں نے ۱۹۳۹ء کی گرمیوں میں کیا تھا۔ رات کافی ہو چکی تھی۔ میں نے دوبارہ آنے کا وعدہ کر کے اجازت لی مگر پھر جا نہ سکا۔ کیا معلوم تھا کہ یہ ملاقات آخری ہو گی۔ پچھلے سال روز نامہ جنگ میں ان کے انتقال کی خبر پڑھی تو دل پر ایک دھکا سا لگا۔ دل اس منحوس خبر کو ماننے پر آمادہ نہ تھا۔ دن بھر کوفت میں گزرا۔ شام کو حمید الدین صاحب شاہد سے ملا۔ وہ اتنے متاثر تھے کہ بیان سے باہر۔ بڑی دیر تک پچھلے دنوں کا ذکر ہوتا رہا اور کئی بھولی بسری باتیں تازہ ہو گئیں۔ حق مغفرت کرے عجب زور مرد تھا! فقط

شکیب

ڈاکٹر زور ــــ چند تاثرات

فرزندان جامعہ عثمانیہ میں ڈاکٹر زور شہاب ثاقب کی طرح چمکے اور دیکھتے دیکھتے سارے دکن کو اور اس کے بعد پورے برصغیر کو فیضان علم وعمل سے منور کر دیا۔ حیدرآباد میں آج تک اردو کا اتنا بڑا شیدائی پیدا نہیں ہوا اور سارے برصغیر میں بجز ٹر مولوی عبدالحق کے کوئی دوسرا ان کی ہمسری کا دعویٰ نہیں کر سکتا۔ جہاں تک حیدرآباد اور دکن کی زبان و ادب اور یب ومعاشرت کے اجاگر کرنے کا تعلق ہے ڈاکٹر زور کا ثانی نہ دکن میں پیدا ہوا اور نہ آئندہ اس کی توقع ہے۔

اردو زبان اور ادب کی خدمت کی لگن ان کو زمانۂ طالب علمی ہی سے تھی۔ اپنی مشہور کتاب "روح تنقید" کی تالیف کا ، جس سے علمی دنیا میں وہ پہلی مرتبہ روشناس ہوئے انھوں نے اس وقت شروع کیا تھا جبکہ وہ سال سوم کے طالب علم لے۔ اسی زمانہ میں ایک ادبی رسالہ "ارتقا" کی ادارت کے فرائض بھی انجام دیتے تھے جو سکندرآباد سے افضل شریف ایک صاحب نکالتے تھے۔[۲] ان کے توسط سے جامعہ کے اکثر طلبا کے مضامین اس پرچہ میں چھپنے لگے تھے۔ یہ رسالہ انکی ، کاوشوں کی پہلی جولانگاہ ہے۔ جامعہ سے بی۔ اے کرنے کے بعد ہی ان کی پہلی کتاب "روح تنقید" منظر عام پر آئی اس کے ذریعہ پورے ہندوستان میں انھوں نے شہرت حاصل کی۔ جب یم۔ اے کے طالب علم تھے مجلہ عثمانیہ کا اجرا یں آیا اور معین الدین قریشی کے ساتھ ڈاکٹر زور اس کے اولیں مدیر منتخب ہوئے۔ مجلہ عثمانیہ نے علمی دنیا میں جو معیار ل کیا تھا وہ ان ہی دونوں مدیروں کی بالغ نظری کا نتیجہ تھا۔ اسی زمانہ میں ڈاکٹر زور کو حکومت حیدرآباد کی ہسے یورپی وظیفہ عطا ہوا اور وہ لندن یونیورسٹی ڈاکٹریٹ حاصل کرنے چلے گئے۔ یہاں ڈاکٹر زور کی علمی زندگی کا ائی باب ختم ہوتا ہے۔

قیام یورپ کے زمانہ میں ڈاکٹر زور کے ذوق علم وادب میں بڑا نکھار پیدا ہوا۔ ان کی مشہور کتاب "اردو شہ پارے" ملنے لندن کے قیام کے زمانہ میں تصنیف کی اور ان کے یورپ سے واپسی کے قبل ہی وہ حیدرآباد سے شائع ۔ اس کتاب نے ان کی ادبی شہرت کو چار چاند لگا دئے۔ صوتیات پران کی معرکۃ الآرا کتاب یورپ سے واپس نے کے بعد لکھی گئی۔ ڈاکٹریٹ کے لئے انھوں نے لسانیات جیسا ادق مضمون لیا تھا اور اس کے بعد علم صوتیات بل کے لئے پیرس کی مشہور درسگاہ جامعہ سوبوران میں بھی انھوں نے شرکت کی تھی۔

یورپ سے ڈاکٹر زور کی واپسی ایک منجھے ہوئے عالم کی حیثیت سے ہوئی۔ اردو زبان اور ادب کی خدمت کیلئے

ڈاکٹر زور مسرت منزل ہاسٹل میں میرے ہم کمرہ تھے۔ وہ سال سوم اور میں سال اول میں تھا۔ [۲] اب رسالہ دینا! نکالتے ہیں۔

انھوں نے جو خاکے اور نقشے تیار کئے تھے اس کو عملی جامہ انھوں نے جامعہ عثمانیہ کی مددگار پروفیسری پر تقرر کے بعد شروع کیا۔ زمانہ ان کے حیدرآباد مراجعت کے بعد ہی شروع ہوتا ہے۔

ادارۂ ادبیاتِ اردو کا قیام ڈاکٹر زور کا ایک عظیم کارنامہ ہے جو اس وقت تک ان کے نام کو روشن رکھیگا جب تک اردو زندہ ہے۔ ادارہ کے قیام میں ڈاکٹر زور کو مشکلات کا سامنا بھی کرنا پڑا کیونکہ اس کو حیدرآباد کے ایک طبقہ نے انجمن ترقی اردو مدمقابل قرار دے لیا تھا اور یہ سمجھتے تھے کہ انجمن کے موجود ہوتے ہوئے ادارہ کے قیام کی ضرورت ہی نہیں ہے۔ لیکن یہ حقیقت کے خلاف ہے۔ انجمن ترقی اردو دراصل مولوی عبدالحق کی سرکردگی میں ان کے اپنے مخصوص دائرہ کی حد تک محدود تھی۔ جامعہ عثمانیہ کی بجٹ سے انجمن کو سالانہ ۵ ہزار کی رقم اس غرض سے منظور کی گئی تھی کہ مختلف علوم و فن پر سالانہ کم از کم بیس کتب عام فہم انداز میں پیش کی جائینگی۔ فرزندانِ جامعہ کے ذریعہ یہ کام بہت آسانی سے انجام جا سکتا تھا لیکن انجمن کئی سال تک یہ رقم یوں ہی اٹھاتی رہی اور کوئی قابل ذکر کام نہیں کیا۔ اس کے خلاف پہلی مرتبہ میں نے آواز اٹھائی تھی جس کی بنا پر سر مرزا اسماعیل کے دور صدارت عظمیٰ میں یہ امداد مسدود کردی گئی تھی۔ یہ بھی حکومت کا ایک غلط عمل تھا۔ بجائے اس کے کہ انجمن کو اس رقم کے صحیح مصرف کے لئے پابند کیا جاتا اس کو بند کرنا صحیح نہ تھا۔ اس پر میں نے احتجاج کیا تھا اور یہ رقم بعد میں بحال بھی ہوگئی تھی لیکن ایک سال کے بعد حیدرآباد کی بساطِ سیاست ہی الٹ گئی۔ علاوہ ازیں انجمن کو تحتانیہ اور فوقانیہ جماعتوں کی درسی کتب کا بھی اجارہ تھا جو برسوں اس کے پاس رہا جس سے انجمن لاکھوں روپیہ کمایا لیکن ان کتب کی ترتیب اور طباعت تک بھی حیدرآباد میں نہیں ہوتی تھی۔ انجمن کے طرزِ عمل سے جامعہ کی نئی پود مایوس تھی اور اردو کی خدمت کیلئے انھیں ایک علٰحدہ میدان کی ضرورت تھی۔ اس کمی کو ڈاکٹر زور نے ادارہ کے قیام ذریعہ پورا کیا۔ ابتدا میں حکومت نے ادارہ کی کوئی حوصلہ افزائی نہیں کی اور ڈاکٹر زور نے تنہا اپنے وسائل کے ذریعہ اس ادارہ کو اپنے پاؤں پر کھڑا کیا۔ چند ہی سال میں اس ادارہ نے حیدرآباد میں اپنا مقام پیدا کرلیا۔ ڈاکٹر زور نے چن چن اہلِ علم کو اپنے اطراف جمع کیا اور ادارہ کے کام کو اتنی وسعت دی کہ ہندوستان کے طول و عرض میں خادمانِ اردو کی ایسی جماعت کوئی بھی نہ تھی۔ ادارہ کے سامنے انجمن ترقی اردو کا کام بھی ماند پڑ گیا تھا۔

ڈاکٹر زور میں غیر معمولی تنظیمی صلاحیت تھی۔ اپنی پرکشش شخصیت سے انھوں نے ایک طرف عہدہ داروں کو اپنا گرویدہ بنا رکھا تھا تو دوسری طرف امراء جاگیردار اور ملک کے ہر طبقہ کو اپنے ساتھ رکھا تھا جس میں ہندو مسلمان کی کوئی تخصیص نہ تھی۔ جامعہ عثمانیہ نے اردو کا جو چراغ روشن کیا تھا اس کی روشنی کو ڈاکٹر زور نے ادارۂ ادبیاتِ اردو کے ذریعہ ملک کے گوشہ گوشہ تک پہنچایا۔ اردو امتحانات کی جو طرح انھوں نے ڈالی تھی وہ ان کا ایک بڑا کارنامہ تھا۔ اس کے مراکز حیدرآباد اس کے باہر ہر صوبہ میں قائم تھے۔ اس سے اردو کی تحریک کے فروغ میں بڑی مدد ملی۔

ادارہ ادبیات اردو کو اگر وہ سہولتیں حاصل رہتیں جو حکومت حیدرآباد نے انجمن ترقی اردو کو مہیا کر رکھی تھیں تو ادارہ جانب سے بہت قبل اردو انسائکلو پیڈیا کی عظیم الشان اسکیم پایۂ تکمیل کو پہنچ گئی ہوتی۔ ادارہ نے یہ کام ایسے زمانہ میں کیا جبکہ حیدرآباد کے سیاسی مطلع پر سیاہ بادل چھانے لگے تھے اور جب یہ برسے تو اس کے سیلاب میں حیدرآباد کی مسلم سلطنت غرقاب ہوگئی۔ انسائیکلو پیڈیا کا کام ادھورا رہ گیا۔ ڈاکٹر زور نے اس کی جو اسکیم مرتب کی تھی اور سارے ہندوستان

ئوزادیب اور مضمون کو جس طرح اس سے متعلق کر لیا تھا اور اس کام کے انجام دینے کے لئے جو اصول اور سانچے مرتب کئے تھے ان سے ت ان کی شخصیت کی ہمہ گیری اور غیر معمولی تنظیمی صلاحیتوں کا اندازہ ہوتا ہے بلکہ یہ چیز بھی ظاہر ہوتی ہے کہ اگر یہ کام پایۂ ل کو پہنچتا تو اردو زبان کی کتنی بڑی خدمت ہوتی اور اس کا دامن کتنا مالا مال ہو جاتا۔ کاش حیدرآباد کی موجودہ حکومت کو ام کی اہمیت کا اندازہ ہوتا۔ اگر ڈاکٹر زور بقید حیات ہوتے تو وہ ممکن ہے اس کی تکمیل کی کوئی صورت پیدا کرتے لیکن بعد تو ساری امیدیں منقطع ہو گئی ہیں۔ ممکن ہے پاکستان میں یہ کام کبھی تکمیل پائے۔

ڈاکٹر زور کا ایک اور بڑا کارنامہ تو وہ ہے جو اپنی تحقیقات کے ذریعہ انھوں نے اردو کے سب سے پہلے صاحبِ دیوان شاعر ن قلی قطب شاہ کو علمی دنیا سے روشناس کرایا اور اردو میں شعر گوئی کی تاریخ کو ولی دکھنی سے بھی ڈیڑھ سو سال قبل کر دیا۔ یہ کام ڈاکٹر زور ہی انجام دے سکتے تھے کیونکہ "دکھنیات" پر انھیں غیر معمولی دسترس حاصل تھی۔ سلطان محمد قلی شاہ کے ضخیم کلیات کو جو بڑے سائز کے ایک ہزار صفحات سے زائد پر مشتمل ہے، مرتب کر کے ڈاکٹر زور نے اردو پر ایک ا کیا ہے۔ یہ ضخیم جلد خاص اہتمام سے مجلس اشاعت دکنی مخطوطات کی جانب سے ۱۹۴۰ء میں شائع ہوئی تھی۔

ڈاکٹر زور نے ادارۂ ادبیات اردو کے کتب خانہ کو ایک خاص نظم و تنظیم کے ساتھ قائم کیا تھا اور اس میں تقریباً ہزار فارسی اور عربی مخطوطات جمع کئے تھے۔ یہ انھوں نے بہت بڑا کام کیا۔ انجمن ترقی اردو کا مشہور کتب خانہ دلی منتقل ہونے تقسیم ہند کے بعد بیشتر کتب کے ضائع یا تلف ہونے کے بعد اردو زبان کی ابتدائی تاریخ اور ارتقاء پر ادارۂ ادبیات اردو خانہ کو بڑی اہمیت حاصل ہو گئی ہے۔ قلمی کتب کا اتنا بڑا ذخیرہ آج برصغیر کے کسی کتب خانہ میں نہیں ہے۔ ڈاکٹر زور نے طات کی ایک خاص حسن و ترتیب کے ساتھ تہذیب کی تھی اور ان کا تفصیلی مواد پانچ جلدوں میں "تذکرۂ مخطوطات" دبیات اردو کے نام سے شائع کیا تھا۔ اس کی مزید جلدیں بھی زیر ترتیب تھیں جو ادارہ کے موجودہ ارباب کی نگرانی ئع ہوں گی۔

یسویں صدی کے ربع اول میں دکن میں دو شخصیتیں پیدا ہوئیں۔ ایک بہادر یار جنگ اور دوسرے ڈاکٹر زور۔ پہلے یارت کے شہسوار تھے اور دوسرے زبان و ادب کے، اور دونوں نے اپنی پر وقار شخصیت سے دکن اور پورے برصغیر یدہ بنا لیا تھا۔ ایک نے خطابت میں نام پیدا کیا تھا اور دوسرے نے ادبیات میں۔ اول الذکر کی جواں مرگی نے ان شن کو ناکام کر دیا لیکن ثانی الذکر کے کارنامے اسوقت تک زندہ رہیں گے جب تک اردو زبان زندہ ہے۔

یاں شخصیتیں پیدا ہوتی ہیں، ابھرتی ہیں اور ختم ہو جاتی ہیں لیکن ان کا کام باقی رہ جاتا ہے۔ ڈاکٹر زور جسمانی سے اب دنیا میں نہیں رہے لیکن ان کا کام ان کے نام کو باقی رکھیگا۔ اردو کی جس تحریک کو وہ لیکر اٹھے تھے اور اپنے یدایان علم کی جس جماعت کو پیدا کیا تھا وہ انکے کام کو آگے بڑھائے گی۔ اسی طرح ادارۂ ادبیات اردو اپنے وجود ہ رکھیگا اور اردو زبان کی خدمت کا جو بیڑا ڈاکٹر زور نے اٹھایا تھا وہ جاری رہے گا۔

پروفیسر محمود حسین

ڈاکٹر زور مرحوم

آج ڈاکٹر زور صاحب کی تیسری بچی کی شادی میں "تہنیت منزل" گیا تو ڈاکٹر صاحب کی یاد بُری طرح ستانے لگی' ہر لمحہ محسوس ہوتا تھا کہ وہ اُس دروازے سے نکل کر آرہے ہیں یا اُن صاحب سے ہاتھ ملا رہے ہیں۔ ایوان اردو میں مہمانوں کو بٹھا تھا۔ ایوان کی دیواروں پر اردو کے ادیبوں اور شاعروں کی تصاویر لگی ہیں۔ ان ہی میں ڈاکٹر زور کی جوانی کی تصویر ہے۔ اس تصویر کو دیر تک دیکھتا رہا اور جب آنکھیں اشک آلود ہونے لگیں تو محفل و موقع کا لحاظ کرتے آنسو پی گیا او سے ہٹ گیا۔ ڈاکٹر صاحب کے بڑے صاحبزادے سے بغل گیر ہو کر مبارک باد دی تو میری آواز بھی گلوگیر تھی اور ان کی آ واپسی میں وقار خلیل صاحب سے ملاقات ہوئی تو انہوں نے اکبر الدین صاحب سے کئے ہوئے وعدہ کی یاد دہانی کی کہ سب زور نمبر کے لئے مجھے کچھ لکھنا ہے۔

میں نے ڈاکٹر صاحب کی زندگی میں ان پر ایک مضمون لکھا تھا۔ مرحوم کے دوست عزیز ساتھی محمد بن عمر صاحب نے جب کی سلور جوبلی کے موقع پر ڈاکٹر زور صاحب کی خدمات کے اعتراف میں ایک کتاب پیش کرنے کا خیال کیا اور اس کا خا بنایا کہ ڈاکٹر صاحب کے دوست احباب ساتھی اور شاگرد ان پر اپنے اپنے خیالات کا اظہار کریں اور محمد بن عمر صاحب تعارف کے ساتھ ان مضامین کو ایک کتاب کی شکل دے دیں تو میں نے اس کی بھرپور تائید کی تھی۔ مرحوم نے مجھے پکڑ لیا جب تک مضمون کا وعدہ نہ لے لیا نہیں چھوڑا۔ ڈاکٹر صاحب کو معلوم ہوا تو انہوں نے بھی اصرار کیا کہ میں ضرور لکھ لیکن جب دوسری مرتبہ ستمبر ۱۹۶۲ء میں میں نے ڈاکٹر زور پر مضمون لکھا تو اس وقت نہ تو محمد بن عمر نے تحریک ڈاکٹر زور نے تائید۔ دونوں اس دار فانی کو چھوڑ چکے تھے' غم و الم کے جذبات نے جو لکھوایا وہ لکھ دیا۔ مو اس مرتبہ ڈاکٹر صاحب کے ادبی و علمی کارناموں سے متعلق کچھ لکھوں لیکن ڈاکٹر صاحب کی یاد کے ساتھ ہی جذ عنصر غالب آجاتا ہے۔ اس کے علاوہ ڈاکٹر صاحب کے علمی و ادبی کارنامے اپنی تابناکیوں کی وجہ سے اتنے نما ہیں کہ ان پر کچھ لکھنے کی زیادہ ضرورت نہیں۔ خصوصاً اس وجہ سے بھی کہ ان کے بہت سے مداحوں اور نقادوں علمی و ادبی کارناموں پر اب تک بہت کچھ لکھا ہے اور لکھ رہے ہیں۔

ڈاکٹر زور صاحب کی زندگی کے سب ہی پہلو بہت نمایاں رہے ہیں اور ان کے دوست احباب اور سا والوں کی نظر سے سرکاری' ادبی' علمی' خانگی کوئی پہلو چھپا نہیں رہا پھر بھی ممکن ہے بعض ایسے گوشے ہوں جو ا شخصیت کے تابناک پہلوؤں کی وجہ سے نظروں سے اوجھل رہے ہوں اور اب اس مجسم روشنی کے غیاب میں میں ایسے ہی کچھ گوشوں کو منظر عام پر لانے کی کوشش کروں گا۔

اس موقع پر مجھے انگریزی کی ایک نظم یاد آرہی ہے جس میں شاعر نے ایک اچھوتے خیال کو اجاگر کیا ہے ۔ اَن دیکھی چیزیں ا خوف پیدا کرتی ہیں ۔ چنانچہ جنت میں جب آدم سے یہ کہا گیا کہ دن کے بعد رات آنے والی ہے تو انھیں بڑا خوف معلوم نے لگا ۔ لیکن جب رات آئی تو چاند اور ستارے بھی ساتھ لائی ۔ انھیں رات کا سکون' چاندنی کی ٹھنڈی روشنی اور تاروں ے آسمان کی سجاوٹ بہت اچھی معلوم ہوئی ۔ انھیں اس پر سخت تعجب بھی ہوا کہ سورج کی روشنی نے جہاں ہر چھوٹی بڑی چیز کو یاں کر دیا تھا وہیں چاند اور ستاروں کو آدم کی نظروں سے اوجھل رکھا تھا رات کے اندھیرے نے انھیں روشنی بخشی ۔

اسی طرح ڈاکٹر زور صاحب کی زندگی میں ان کے علمی ادبی کارناموں' اُن کی شہرت اور ان کی اقبال مندی نے عام ں کی نظروں سے ممکن ہے بعض گوشوں کو اوجھل رکھا ہو جو اب ان کے غیاب میں نمایاں ہو جائیں تو ان کی شخصیت پر مزید شنی ڈال سکیں اور ہمیں ڈاکٹر صاحب کو سمجھنے میں مدد دیں ۔

میں ڈاکٹر صاحب مرحوم کی زندگی کے چند معمولی سے واقعات کا تذکرہ کروں گا اور آپ ان سے بخوبی اندازہ لگا سکیں گے س واقعہ سے ان کی زندگی کے کس پہلو پر روشنی پڑتی ہے ۔ میں ان پر اپنی رائے کے اظہار سے عمداً گریز کروں گا اسلئے ن ہے میری رائے متاثرہ قرار دی جائے اور یہ صحیح بھی ہے اس لئے کہ ڈاکٹر صاحب کے اور میرے جو تعلقات رہے ہیں انکے ظر میری رائے کا متاثر ہونا ضروری ہے ۔

میں نے انٹرمیڈیٹ اور بی ۔ اے میں چار سال ڈاکٹر صاحب سے اردو پڑھی ہے اور گو مجھے ڈاکٹر مولوی عبدالحق مرحوم' کٹر سید سجاد مرحوم' پروفیسر سروری اور پروفیسر سید محمد سے بھی شرف تلمذ حاصل رہا لیکن یہ واقعہ ہے کہ میں ڈاکٹر زور مرحوم سے زیادہ متاثر رہا ۔ ممکن ہے اس کی وجہ یہ بھی ہو کہ ڈاکٹر صاحب نے میرے بڑے بھائی صاحب کو چھ سال اردو پڑھائی ر ان کے والد اور میرے والد دونوں دوست تھے ۔ چنانچہ ۱۹۳۶ء میں جب میرے والد بیمار تھے اور دواخانہ عثمانیہ میں ریک تھے تو حضرت زعم ایک روز ڈاکٹر صاحب کو اپنے ساتھ عیادت کے لئے لائے اور یہ کہہ کر میرے والد صاحب سے یا کہ میرے بہت قدیم دوست ہیں اس لئے میں چاہتا تھا کہ تم ان سے مل لو ۔ دواخانہ کے کمرے میں بھائی صاحب کو اور مجھے کر جب انھیں معلوم ہوا کہ ان کے والد کے دوست ہمارے والد ہیں تو انھیں بڑی خوشی ہوئی اور ہمارے رشتے اور ار ہو گئے ۔ اس طرح میرے اپنے خاندان سے قدیمی تعلقات کے علاوہ ڈاکٹر صاحب کے میرے سسرال سے بھی برادرانہ لقات تھے ۔ میرے چچا خسر مولوی ضامن علی صاحب غازی سے ان کے اتنے گہرے تعلقات تھے کہ ڈاکٹر صاحب کے قال کے بعد حیدرآباد سے اگر ان کا کوئی دوست کشمیر صرف اس غرض سے گیا کہ وہ ڈاکٹر صاحب کی قبر پر فاتحہ پڑھے ہ غازی صاحب تھے ۔ غازی صاحب کی بیگم صاحبہ بشیرالنسا بیگم حیدرآباد کی مشہور شاعرہ ہیں اور ڈاکٹر صاحب ے بہت مداح تھے اور بڑی عزت کرتے تھے ۔ ڈاکٹر صاحب کے انتقال پر بشیرالنسا بیگم صاحبہ کو اتنا صدمہ ہوا کہ ن کو یہ شبہ ہونے لگا تھا کہ ان کا دماغی توازن متاثر ہو گیا ۔ اقبال کی موت کے بعد ڈاکٹر صاحب کی موت ہی نے یں سب سے زیادہ متاثر کیا ۔

ان واقعات کا اظہار یہاں شاید کچھ بیجا سا معلوم ہو لیکن اس سے میں صرف یہ بتلانا چاہتا ہوں کہ ڈاکٹر صاحب سے ے تعلقات ان رشتوں کی وجہ سے بھی بہت قریب کے ہو گئے تھے اور پھر تعلیم و تعلم کے چار سالوں کے علاوہ میں نے

بحیثیت لکچرار تقریباً بارہ سال ان کی ماتحتی کی ہے۔ کبھی اپنے گھر پر، کبھی دبیر پورے میں کبھی تہنیت منزل میں اکثر اوارے میں اور تقریباً روزانہ کالج میں میں نے ڈاکٹر صاحب مرحوم کو بہت قریب سے دیکھا ہے۔ یہ ان سے محبت کا تھی کہ میرا تبادلہ ہو جانے کے بعد بھی میں تقریباً روزانہ چادر گھاٹ کالج جایا کرتا تھا اور اس کالج ہی سے جیسے ایک محبت ہوگئی۔ اس طرح یہ غلط نہ ہوگا اگر یہ کہا جائے کہ میری رائے ان سے متعلق بے لاگ نہیں ہوسکتی۔ اسی سبب سے اوپر ارادہ ظاہر کیا ہے کہ چند واقعات بیان کردوں اور آپ پر چھوڑ دوں کہ آپ جو چاہیں نتیجہ اخذ کرلیں۔

۱۹۴۶ء میں جب ڈاکٹر زور صاحب دارالعلوم کالج کے پرنسپل بن کر آئے تو انھوں نے سب سے پہلے باقی صاحب مصافحہ کیا اور کہا کہ آج آپ کی اور ہماری دوستی کا نیا باب شروع ہو رہا ہے۔ میں نے یہ خیال کیا کہ باقی صاحب اشاف سب سے سینیر تھے شاید اس لئے ان سے پہلے مصافحہ کیا گیا لیکن بعد میں معلوم ہوا کہ باقی مرحوم اور ڈاکٹر صاحب مرحوم رنجش تھی اس لئے سب سے پہلے ان سے مصافحہ کرکے دوستی کی تجدید کی اور نئے باب کے اضافہ کے ساتھ رنجش کے باب کو بالکل کردیا۔ بعد میں باقی مرحوم اکثر کہا کرتے تھے کہ میں ڈاکٹر زور کے پرنسپل بن جانے پر ڈر رہا تھا لیکن انھوں نے بڑی فرا اور بڑی شرافت کا ثبوت دیا۔

دارالعلوم کالج میں ایک مرتبہ ایک اہلکار نے گمنام درخواست دی اور ڈاکٹر صاحب کی شکایت کی۔ وائس چا وہ درخواست ڈاکٹر صاحب کے پاس بھجوادی۔ اس کے جواب میں ڈاکٹر صاحب نے اس اہلکار کے استقلال کی تحریک جامعہ کو بھجوا ڈاکٹر ولی محمد جامعہ عثمانیہ کے وائس چانسلر تھے اور سخت آدمی مشہور تھے۔ انھوں نے ایک حکم نکالا کہ ہر پرنسپا ہفتہ میں کم از کم چھ گھنٹے پڑھانا چاہئے۔ کچھ دنوں بعد وہ سالانہ جلسہ کی صدارت کے لئے آئے اور پرنسپل صاحب کے ا کچھ دیر تک بیٹھے رہے۔ میں بھی وہیں موجود تھا۔ ڈاکٹر صاحب نے ان سے صاف کہہ دیا کہ اگر آپ چاہتے ہوں کہ طلبا مجھ فائدہ اٹھائیں تو مجھے ام۔ اے کی کلاس کے چند گھنٹے دے دیجئے یا پھر پی ایچ ڈی کے طلبا بھجوا دیجئے۔ اس کے بعد ہی۔ ڈاکٹر صاحب کے پاس دارالعلوم کالج میں پی ایچ ڈی کے طلبہ اپنے مقالے بتلانے کے لئے لاتے رہے۔

اپنے ایک طالب علم سے جو ایم۔ اے کامیاب کرچکے تھے ڈاکٹر صاحب دارالعلوم کالج میں ادارے کی کتابوں کی فہر بنوا رہے تھے۔ کسی بات پر ناراض ہو کر انھیں ڈانٹ دیا۔ اتفاق سے میں بھی وہاں تھا۔ ان صاحب نے شاید میری موجو میں برا بھلا کہنے کا برا مانا۔ ان کے اترے ہوئے چہرے نے ڈاکٹر صاحب کو متاثر کیا۔ اسی وقت ایک کالج کے پرنسپل صاحب نام خود بھی چٹھی لکھ دی اور مجھ سے بھی لکھوادی۔ ان طالب علم صاحب کو اس کالج میں بھیج دیا گیا اور وہ وہاں لکچرار بن گئے وہ کافی ترقی کرچکے ہیں۔

۱۹۵۰ء میں دارالعلوم اور چادر گھاٹ کالج کا انضمام عمل میں آیا۔ چادر گھاٹ کالج کی موجودہ عمارت میں نیچے کالج کے پرنسپل صاحب اجلاس کرتے تھے۔ انھوں نے ڈاکٹر زور صاحب سے اپنے اجلاس پر بیٹھنے کی خواہش کی لیکن انھ کہا نہیں میں علحدہ بیٹھ جایا کروں گا آپ اپنے اجلاس پر تشریف رکھیں۔ چنانچہ اوپر ایک علحدہ کمرے میں انتظام کیا ایک ہی کالج میں دو پرنسپل، دو دفتر مع اشاف و اساتذہ عجیب قسم کی دو عملی تھی۔ ایک مرتبہ یہ سنا گیا کہ چادر گھاٹ کالج کے صاحب نے اس کالج کے ایک استاد کو اس بات پر ڈانٹا کہ وہ زور صاحب کے اجلاس پر کیوں گئے تھے۔ زور صاحب کو معلو

ل نے دارالعلوم کے اساتذہ سے خواہش کی کہ وہ چادرگھاٹ کے اساتذہ اور پرنسپل صاحب سے روزانہ ملا کریں اس لئے کہ
ں خواہ کوئی ہو انھیں تو نہیں رہنا ہے۔

جب جامعہ کی کونسل نے اس کا تصفیہ کیا کہ زور صاحب ہی دارالعلوم اور چادرگھاٹ کالج کے مستقل پرنسپل رہیں گے تو
صاحب کو اس کا افسوس ہوا کہ ان کی وجہ سے چادرگھاٹ کالج کے پرنسپل صاحب کو ہٹنا پڑا۔ جامعہ نے اس نئے کالج کا نام
لعلوم چادرگھاٹ کالج رکھا لیکن زور صاحب نے اس لمبے سے نام کو جس سے پرانی یادوں کے ساتھ پرانی تلخیاں بھی ابھر
ھتیں صرف چادرگھاٹ کالج کر دیا۔

اکثر ایسا ہوا کہ دفتر کے کسی اہلکار سے کوئی غلطی سرزد ہوئی یا کسی استاد نے متعلق جامعہ سے کوئی سرزنش ہوئی تو ڈاکٹر صاحب نے
اپنے سر لے لیا اور اہلکار ہو کہ لکچرار اس کو بچا لیا۔ کبھی غصہ میں آ کر کسی کی شکایت لکھ دی لیکن مراسلہ جاری ہونے سے پہلے ہی
منگوا کر اپنے پاس رکھ لیا۔ لکچرار صاحب اس غلط فہمی میں رہے کہ ان کی شکایت ہوئی اور جب انھوں نے جامعہ جا کر
ھا کی کہ ان پر برا اثر نہ پڑے تو انھیں معلوم ہوا کہ شکایت ہی نہیں ہوئی۔ کچھ عرصے کے بعد جب وہ لکچرار صاحب خود
ندہ نظر آئے تو انھیں بلا کر ڈاکٹر صاحب نے وہ شکایتی مراسلہ دے دیا کہ وہ پڑھ لیں اور چاک کر دیں۔

ایک مرتبہ ایک لکچرار صاحب سے گرمائی تعطیلات سے استفادے کے سلسلہ میں ایک غلطی سرزد ہو گئی۔ انھوں نے جامعہ
را اثر استعمال کیا کہ ان کے ساتھ رعایت کی جائے لیکن جب ہر طرف ناکامی ہوئی تو ڈاکٹر صاحب سے رجوع ہوئے۔ یہ وہ
ب تھے جنھوں نے ڈاکٹر زور صاحب سے متعلق بعض غلط فہمیاں پیدا کرنے کی کوشش کی تھی لیکن ڈاکٹر صاحب نے ماضی
ں کو بھلا دیا اور بہ یک جنبش قلم ان کے ساتھ وہ رعایت کی جو کوئی اور شاید ہی کرتا۔ وہ صاحب آج تک ان کے
نا احسان ہیں۔

ڈاکٹر صاحب نے اپنے والد کا عرس کیا اس سلسلہ میں کالج کے سب اساتذہ کو تناول طعام کی دعوت دی۔ ہندو اساتذہ
ء علحدہ بریانی پکوائی۔ ان کا علحدہ دسترخوان بچھوایا اور خود انتظام کے لئے وہیں کھڑے رہے۔ جب ان لوگوں نے
ہ اتنی زحمت نہ کرنے کو کہا تو ہنس کے کہنے لگے کہیں گوشت کی بریانی آپ کے پاس نہ بھیج دی جائے ممکن ہے آپ لوگ
ں لیکن دوسروں کا نقصان ہو جائے گا اس کی نگرانی کر رہا ہوں۔ ایک ہندو لکچرار صاحب نے ایک عیسائی لڑکی کو
لیا تھا۔ ڈاکٹر صاحب بالالتزام ان کے ساتھ اس بچی کو بھی دعوت دیتے تھے اور اصرار کر کے اس کو لانے کے لئے
تھے۔

چادرگھاٹ کالج کی پرنسپلی کے اجلاس پر ڈاکٹر صاحب سے مختلف لوگ ملنے کے لئے آیا کرتے تھے۔ جن میں ڈاکٹر صاحب کے
یم احباب بھی تھے۔ اگر چند روز ان میں سے کوئی نہ آتا تو خط لکھ کر دریافت کرتے یا آدمی بھجواتے کہ صحت تو اچھی ہے کہ نہ آئے
تو نہیں کہ مجھ سے ناراض ہیں۔ ایک مرتبہ ایک دوست سے فرمانے لگے "نواب صاحب میرا نہیں تو اس چائے کی
! تو خیال کیجئے جسے آپ کے نہ آنے کی وجہ سے چپراسی پی لیا کرتے ہیں۔"

ایک دفعہ کالج کے داروغہ صاحب نے شکایت کی کہ ایک چپراسی جس کے ذمہ پانی بھرنے کے فرائض تھے کئی روز سے کام
کر رہا ہے۔ ڈاکٹر صاحب نے بلا کر اس سے دریافت کیا اس نے کہا کہ کمر میں درد ہے اس لئے پانی کے گھڑے نہیں اٹھا سکتا

ڈاکٹر صاحب نے ہنس کر دار وغہ سے کہا اس کے لئے "ٹھلیاں" یا "کلیاں" منگوا دیجئے تاکہ اس پر گھوڑے اٹھاتے۔
کچھ روز بعد اسی شخص کی پھر شکایت پیش ہوئی۔ شاید کسی بات پر پہلے ہی سے خفا تھے اس کو سخت سست کہہ دیا۔ چ
روئی صورت بنالی اور چلا گیا۔ تھوڑی دیر بعد ہی اسے بلایا اور نزدیک آنے کو کہا۔ وہ کچھ کھچا کھچا سا رہا تو ا
بلا کر اس کی پیٹھ پر آہستہ سے ایک ہتڑ مارا اور کہا میں پیٹھ پر مارتا ہوں پیٹ پر نہیں مارتا۔ دوسرا ہوتا تو
تو کم از کم برطرف ہی کر دیتا۔ میری باتوں کا اگر برا مانا ہو تو مجھے معاف کر دو۔ چپراسی نے پیر پکڑ لئے اور آنکھول
گرا دیے۔ شفقت سے اس کی پیٹھ پر ہاتھ رکھ کر کہا کہ آئندہ شکایت کا موقع نہ دو۔ ڈاکٹر صاحب کے زمانہ
اس کی شکایت نہیں آئی۔

آٹیلو' اجلاس کا چپراسی تھا اس سے بہت کام لیتے تھے اور اسے بہت چاہتے بھی تھے۔ بعض لوگوں نے ا
کہنا شروع کر دیا۔ ڈاکٹر صاحب نے سنا تو کہا مجھے تو برا نہیں معلوم ہوتا لیکن اس سے کہیں کسی لکچرار صاحب کا
دفتر کے محاسب صاحب نے ایک مرتبہ تین سو روپیوں کی ضرورت ظاہر کی۔ بچوں کی علالت خانگی پریشا
سرکاری مصروفیات سے وہ پریشان تھے۔ دوسرے روز ڈاکٹر صاحب نے اپنے قلمدان سے مجھے تین سو روپیہ
اور کہنے لگے اپنے نام سے محاسب کو قرض دے دو اور پرامیسری نوٹ لکھوا لو۔ میں نے محاسب صاحب کو رو
اور کاغذ لکھوا لیا۔ لیکن شاید اس کا علم ہو گیا تھا اس لئے انہوں نے ڈاکٹر صاحب کے نام سے کاغذ لکھ دیا۔ ا
ہوئے، کہنے لگے میں تو گواہی کی حیثیت سے اس کاغذ پر دستخط کرنا چاہتا تھا۔ یہ تمہارے نام سے ہونا چاہیئے تھا
اسے اپنے پاس ہی رکھو محاسب صاحب کیا روپے واپس دیں گے جب کہ پرامیسری نوٹ میرے نام سے لکھا گیا۔

دفتر کے ایک اہلکار اکثر غائب رہتے۔ دفتر آتے بھی تو تھوڑی دیر کے لئے۔ کبھی کبھار پوچھ لیا تو کہتے کہ
گیا تھا۔ آدمی باتونی تھے اور بڑی دل لبھانے والی درباری گفتگو کرتے تھے۔ اس پر ڈاکٹر صاحب ہنس کر کہتے
آپ کو تو واجد علی شاہ کے دربار میں ہونا چاہیئے تھا۔ ارباب قضا و قدر کی بھول سے آپ چادر گھاٹ کالج
بن گئے۔

ایک مرتبہ جنوبی ہند کی کسی اہم کانفرنس میں شرکت کی' ایک اجلاس کی صدارت پنڈت نہرو نے کی تھی
زوردار خطبہ پڑھا اور اردو کو اس کا جائز مقام دلانے کی طرف حکومت ہند کی توجہ منعطف کرائی۔ ڈاکٹر صاحب
آنے کے بعد کانفرنس کے سکرٹری (ایک پارسی خاتون) کی طرف سے توصیفی خط وصول ہوا۔ اجلاس پر بہت سے لوگ
سب کے سامنے خط پڑھ کر سنایا اور آخر میں مسکرا کر کہنے لگے اس تعریف کے مستحق ایک اور صاحب بھی ہیں جنھوں
سلسلہ میں مدد کی تھی۔ لوگوں نے اشارہ سمجھ لیا۔ ایک بہی خواہ نے بعد میں ڈاکٹر صاحب سے کہا کہ سب کے سامنے
کے ظاہر کرنے کی کیا ضرورت تھی۔ چند روز بعد اجلاس پر پھر لوگ موجود تھے وہ بہی خواہ بھی موجود تھے ان کے
پورا واقعہ دہرایا اور کہا کہ حقیقت کے اظہار میں شریف آدمی کو بے باک ہونا چاہیے۔

ڈاکٹر صاحب آل انڈیا لٹریری اکاڈمی کے رکن مقرر ہوئے اور اجلاس میں شرکت کے لئے دلی گئے تو وہاں
اجلاس مولانا ابوالکلام آزاد مرحوم کے کمرے میں ہونے والا تھا۔ ڈاکٹر صاحب کمرے میں داخل ہوئے تو انھوں

السلام علیکم کہا۔ مولانا نے جواب میں جے ہند کہا۔ آواز بھی بلند تھی نظریں بھی معنی خیز۔ آل احمد صاحب سرور بھی بیٹھے تھے انہوں نے مولانا کا مطلب تاڑ لیا اور مسکرانے لگے۔ اجلاس برخاست ہوا تو ڈاکٹر صاحب نے جاتے ہوئے پھر "السلام علیکم" کہا۔ اس پر مولانا بھی مسکرائے بغیر نہ رہ سکے۔ اکاڈمی کے اجلاس میں مولانا کے منشا کے خلاف کہنے کی کسی کو جرأت نہ ہوتی تھی لیکن ڈاکٹر صاحب نے مولانا کے منشا کے خلاف ڈاکٹر ابو الفضل (مرحوم) کی کتاب "تاریخ ادب عربی" پر انعام دئے جانے کے لئے دو بار اصرار کیا۔ ایک اور سلسلہ میں ایک مرتبہ انہوں نے (Note of dissent) بھی بھیجا تھا۔

ایک مرتبہ پرنسپل صاحب چادر گھاٹ کالج کے اجلاس پر ایک شاعر صاحب کو اپنی غزلیں لہک لہک کر پڑھتے سنا گیا جو لوگ موجود تھے اُن کی رائے شاعر کے موافق نہیں تھی لیکن ڈاکٹر صاحب نے ان شاعر صاحب کی تائید میں پرزور خط لکھا جس کی بنا پر انہیں وظیفہ جاری ہوگیا۔ جب دریافت کیا گیا تو کہنے لگے اس شخص کو فراغت حاصل نہیں۔ یہ نصیب ہوجائے تو لکھے گا بھی اچھا اور پڑھے گا بھی اچھا۔ آپ اسے چند دنوں بعد سنئے۔

ڈاکٹر صاحب کی مہربانیوں نے ہم سب لوگوں کو کچھ گستاخ سا بنا دیا تھا اسی لئے بعض اوقات ان کے عزیز شاگرد صاف گوئی پر اتر آتے تھے۔ ایک مرتبہ زینت ساجدہ صاحبہ نے بھی اجلاس پر ایسی ہی کوئی بات کہہ دی جو شائد خطرات کو صاف گوئی پر ترجیح دینے والوں کو اچھی نہ لگی۔ ڈاکٹر صاحب نے اسے تاڑ لیا اور کہا زینت میری شاگرد ہیں اور مجھے ان کی یہ بات اچھی معلوم ہوتی ہے کہ وہ میری ہی طرح بے باک ہیں۔

۱۹۶۰ء میں جب ڈاکٹر صاحب کے وظیفہ پر علحدہ ہونے کا وقت آیا ان کے سب ہی دوست، احباب، ساتھی، شاگرد اور چادر گھاٹ کالج کے اساتذہ اور عملے کے لوگ دلگیر نظر آرہے تھے۔ لیکن ڈاکٹر صاحب کے چہرے پر بشاشت کا وہی عالم تھا۔ ڈاکٹر صاحب کا جو وداعی جلسہ ہوا وہ ایک یادگار جلسہ تھا۔ اس میں جامعہ کے جتنے اساتذہ کو ان کے ساتھ کسی نہ کسی حیثیت سے کام کرنے کا موقع ملا تھا (خواہ اس وقت وہ کسی کالج میں کام کر رہے ہوں) سب ہی کم و بیش شریک تھے۔ جلسہ ہوا، تقریریں ہوئیں، تحفہ دیا گیا اور پرتکلف ڈنر ہوا۔ کئی کالجوں کے پرنسپلوں نے تقریریں کیں۔ خواجہ حمید الدین شاہد پاکستان سے اس میں شرکت کے لئے آئے تھے، وہ تقریر کرتے ہوئے رو پڑے۔ لیکن جب ڈاکٹر صاحب نے تقریر کی تو معلوم ہوا کہ وظیفہ پر علحدہ ہوتے ہوئے بھی ان کی امنگیں اتنی ہی جوان تھیں جتنی کہ اس شخص کی جو اپنی زندگی شروع کر رہا ہو۔ کام کرنے کی دُھن میں کوئی فرق نہیں تھا۔ اس موقع پر جہاں مختلف اساتذہ نے یہ کہا کہ ڈاکٹر صاحب نے کبھی افسر و ماتحت کے فرق کو محسوس نہیں ہونے دیا وہیں دفتر کے عملہ اور چپراسیوں کے نمائندوں نے بھی اسی قسم کے احساسات کا اظہار کیا۔

جس روز پرنسپلی کا ڈاکٹر صاحب نے جائزہ دیا کرسی سے اٹھ کر مولوی باقر فریدی صاحب نامزد پرنسپل کو اپنی کرسی پر بٹھلایا اور کچھ دیر تک خود سامنے بیٹھے مسکرا مسکرا کر گفتگو کرتے رہے۔

یہ ڈاکٹر صاحب کی زندگی کے چند گوشے تھے۔ اگر یہ ان کی خوبیاں تھیں تو آج بھی یہ ہمارے لئے مشعل ہدایت ثابت ہوسکتی ہیں۔ وہ آج ہم میں نہیں ہیں لیکن اُن کی خوبیوں کی یاد باقی ہے ؎

حق مغفرت کرے عجب آزاد مرد تھا

محمد اکبر الدین صدیقی

ڈاکٹر زور صاحب

۲۵ ستمبر ۱۹۶۲ء کی صبح اخباروں اور ریڈیو کے ذریعہ ڈاکٹر زور صاحب کے بارے میں خبر ملی کہ وہ ۲۴ ستمبر کو ساڑھے آٹھ بجے شب سری نگر میں اچانک قلب پر حملہ ہونے کی وجہ سے انتقال کر گئے۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ۔

ڈاکٹر زور صاحب کیا تھے اور کیا نہیں تھے کا جواب آسان بھی ہے اور مشکل بھی۔ آسان اس طرح کہ وہ رجائیت پسند تھے۔ مایوسی، بے کسی اور بے بسی کے الفاظ اُن کی لغت میں تھے ہی نہیں۔ انھوں نے جس کام میں ہاتھ ڈالا اس کو اس سلیقے سے کر دکھایا کہ دنیا انگشت بدنداں رہ گئی۔ گویا ڈاکٹر زور صاحب مجسم عمل تھے لوگ ۲۴ گھنٹے کا پروگرام بناتے ہیں، ڈاکٹر صاحب نے ساری زندگی کا پروگرام بنا لیا تھا۔ اور کام کئے چلے جا رہے تھے۔ کہ کہیں سفینۂ حیات ساحل پر نہ آ لگے۔ یہ آج کل کی بات نہیں کہہ رہا ہوں بلکہ ابتدا ہی سے یہ بات ان کی فطرت میں داخل تھی۔

میں بچہ تھا ۸-۹ سال کا، اور ڈاکٹر صاحب ۱۸-۱۹ سال کے ہوں گے حیدرآباد کے ایک قدیم محلے شاہ گنج میں "آبدار خانہ بشیر الدولہ" کے پیچھے دو منزلہ مکان میں رہتے تھے۔ ان کا کمرہ اوپر کی منزل میں تھا جو ۱۲-۱۴ فٹ لمبا اور ۸-۹ فٹ چوڑا تھا۔ درمیان میں ایک میز اور اس کے ساتھ ایک کرسی لگی ہوئی، پانچ چھے الماریاں کتابوں سے بھری دیوار سے لگی کھڑی تھیں۔ ۸-۱۰ تصویریں بھی ادھر ادھر آویزاں تھیں۔ میز پر کاغذات بکھرے ہوئے اور مختلف رسالے زبان، شباب اردو، نگار، مخزن، تحفہ وغیرہ۔ یہ ڈاکٹر زور صاحب کی طالب علمی کا دور تھا۔ وہ ابھی گرائجویٹ نہیں ہوئے تھے لیکن اتنی زیادہ کتابیں جمع کر لی تھیں، اور اتنے رسائل میں مضامین لکھ کر نام آوری حاصل کر لی تھی۔ صرف مضامین ہی نہیں بلکہ نظمیں بھی۔ یہ نظمیں "شعرائے عثمانیہ" مرتبہ عبدالقیوم خاں باقی میں دیکھی جا سکتی ہیں۔ میں اس کمرے سے متصل نچلی منزل میں اپنے والدین کے ساتھ بحیثیت ایک مہمان کے ٹھیرا ہوا تھا۔ ایک مہینے کے قیام کے دوران میں میں نے انھیں کبھی گپ شپ اڑاتے، دوست احباب میں وقت ضائع کرتے یا دن میں سوتے ہوئے نہیں دیکھا جب بھی کمرے پر پہنچا تو یا تو مطالعے میں مصروف نظر آئے یا لکھتے ہوئے۔ دسترخوان پر بیٹھتے تو معلوم ہوتا کہ خوردن برائے زیستن پر عمل پیرا ہیں۔ جسم تو انتہائی نحیف، دبلے پتلے۔ جو شیروانی پہنتے ڈھیلی معلوم ہوتی۔ لیکن آواز میں گھن گرج تھی۔ طنطنہ تھا۔ رعب تھا۔

میرے والد کا وہ بڑا احترام کرتے اور ان سے اکثر فارسی شعرا اور حالی اور سر سید وغیرہ کے متعلق گفتگو ہوتی۔ یہ سب گفتگو میری سمجھ باہر ہوتی۔ ناموں کے سوا اور کچھ پلے نہ پڑتا۔ وہ کبھی افسانے سناتے اور کبھی نظمیں۔ مہینہ دیکھتے دیکھتے گزر گیا ہم لوگ واپس ہو گئے کچھ دن بعد ڈاکٹر صاحب کی کتاب "روح تنقید" اور پھر "طلسم تقدیر" اور "فسانۂ تازیانہ" والد کے نام آئی۔ روحِ تنقید تو میرے لئے بیکار سی کتاب تھی۔ البتہ "طلسم تقدیر" اور "فسانۂ تازیانہ" کو دو تین بار پڑھا۔ سبب یہ کہ قصہ دلچسپ تھا اور ایک دیکھے بھالے شخص کا لکھا ہوا تھا۔ اس وقت تو اس میں حسن ہی حسن نظر آیا۔ قبح کا سوال ہی نہ تھا۔ یہ ۱۹۲۶ء کی بات تھی۔ جبکہ ڈاکٹر صاحب گرائجویٹ ہو گئے تھے۔ اس کے بعد رسائل میں مضمون

آتے رہے۔ ۱۹۲۶ء میں "تنقیدی مقالات" شایع ہوئی۔ ڈاکٹر صاحب کو ایم اے کی ڈگری ملی۔ اور معلوم ہوا کہ وہ لندن جارہے ہیں۔ اور تین سال رہ کر ڈاکٹر ہوں گے۔ ان دنوں میں اپنی تعلیم کے سلسلے میں حیدرآباد آیا تو ۱۹۲۹ء میں یعنی دو ہی سال بعد ڈاکٹر صاحب لندن سے واپس ہوئے اور تین مہینے کے اندر اندر لگاتار کام کرکے "اردو شہ پارے" شائع کی اور پھر لندن واپس چلے گئے۔

ایسی مثالیں تو مل جائیں گی کہ کسی نے تین سال کی تعلیم کو دو سال میں مکمل کرلیا اور ڈگری حاصل کرلی لیکن ایسی مثال ابھی تک ایک بھی نہ ملی کہ ایک طالب علم تین سال کے لئے لندن جائے دو سال میں ڈگری لے اور ہندوستان آکر تین مہینے میں بڑی سائز کے ساڑھے تین سو صفحات سے زائد کی کتاب بتصویروں وغیرہ سے مزین چھاپے اور پھر الٹے پاؤں لندن واپس ہوکر تعلیم کی تکمیل کرے۔ اردو شہ پارے دکنی ادب کی تاریخ میں شاہکار کا درجہ رکھتی ہے۔ اتنی گراں مایہ کتاب اس سے پہلے کبھی شایع نہیں ہوئی تھی۔ اس نے اپنے مصنف کو دکنی زبان کا ماہر اور ادیب بنادیا ہے۔ ۱۹۳۰ء میں ڈاکٹر صاحب ماہر لسانیات بن کر لوٹے۔ عثمانیہ یونیورسٹی میں ریڈری پر تقرر ہوا ان کی انگریزی کتاب ہندوستانی صوتیات اسی سال شایع ہوئی جس سے اردو لسانیات کا ایک نیا باب کھلا۔

ڈاکٹر صاحب اور ان کے چند اور نوجوان ساتھیوں نے جن میں سے چند نے یورپ میں تعلیم حاصل کی تھی ایک علمی انجمن قائم کی جس کی ہفتہ وار نشستیں ہوتی تھیں۔ مضامین پڑھے جاتے اور ان پر تنقید کی جاتی۔ ان نوجوانوں میں میر خاں (میر نواز جنگ)، ڈاکٹر طاہر علی خاں مسلم۔ ڈاکٹر رضی الدین صدیقی۔ ڈاکٹر میر ولی الدین۔ ڈاکٹر سیادت علی خاں۔ نسیم علی خاں انجنیر۔ پروفیسر محمد علی خاں۔ پروفیسر سید محمد۔ عبدالرحمن شریف عبدالرزاق راشد اور عمر یافعی شریک تھے۔ اس وقت حیدرآباد میں چند ایسے متنفذ حضرات بھی تھے جنھیں ان نوجوانوں کا اس طرح جمع ہونا اور علمی مباحثے کرنا پسند نہ آیا۔ اور انھوں نے راست سر اکبر حیدری صدر المہام وقت سے ان کی شکایت کردی کہ چند نوجوانوں نے ایک سیاسی انجمن بنائی ہے اور ریاست کے نظم و نسق کے خلاف زہر اگلتے رہتے ہیں۔ ان کا فوراً ہی تدارک نہ ہوا تو یہ ریاست کو لے ڈوبیں گے۔ حیدری صاحب نے سب کو فرداً فرداً چائے پر بلایا اور افہام و تفہیم کی۔ یہ انجمن برخواست ہوگئی۔ لیکن اس وقت ان نوجوانوں کو پتہ چلا کہ ع

کوئی معشوق ہے اس پردۂ زنگاری میں

اور ہمیں اپنے علمی کاموں کو تیز تر کرنے کے لئے کھلے بندوں کام کرنا پڑے گا۔ چنانچہ ڈاکٹر صاحب نے اپنے چند ساتھیوں کے تعاون سے ۱۹۳۱ء میں "ادارۂ ادبیاتِ اردو" قائم کیا جس کے حسب ذیل مقاصد تھے۔

۱۔ اردو زبان اور ادب کی توسیع و اشاعت اور حفاظت۔
۲۔ سرزمین دکن میں اردو زبان اور ادب کا صحیح مذاق پیدا کرنا۔
۳۔ ملک کے نوجوانوں میں انشاپردازی اور شاعری کا ذوق پیدا کرنا اور تصنیف و تالیف میں رہبری اور مدد کرنا۔
۴۔ عوام میں اردو کی تعلیم اور مطالعے کا شوق پیدا کرنا۔ اور اس کے لئے ضروری وسائل اختیار کرنا۔
۵۔ اردو کو مختلف علوم و فنون سے روشناس کرنا۔
۶۔ تاریخ دکن کی خدمت اور ملک کے تاریخی اور ادبی آثار کی حفاظت۔
۷۔ ایک ایسا مکمل کتب خانہ قائم کرنا جس میں اردو کی بالعموم اور خاص طور پر دکن کی تمام تحریریں اور آثار محفوظ ہو سکیں اور جس کا ایک حصہ اناث کے لئے وقف رہے گا۔

ڈاکٹر زور صاحب نے ایک انجمن کو جو محدود وسائل اور گنجائش میں کام کر رہی تھی لوٹتے ہوئے دیکھا لیکن انہی اغراض و مقاصد کی

تکمیل کے لئے علی الاعلان ایک بہت بڑے ادارے کے قیام کا اعلان کیا۔ جس کی بعد میں بارہ[12] شاخیں بنائیں اور رفتہ رفتہ ان میں ا... کو بھی شریک کر لیا جو ان کے مخالف تھے حتیٰ کہ حیدری صاحب خود ادارے کے سرپرست بن گئے ان کے دل میں جو شبہات ہوگئے اور ڈاکٹر صاحب کے مخالفین کو منہ کی کھانی پڑی۔

جب ادارہ کا قیام عمل میں آیا تو لوگوں نے یہی سمجھا اور ہم میں سے چند طلبہ نے بھی کہ ادارے کا قیام ہوا کوئی کام۔ ذاتی ضرور وابستہ ہوتے ہیں۔ اور ہوشیار لوگ استحصال کے مختلف طریقے سوچتے ہیں۔ رقم جمع ہوگی۔ معتمد اور موسسین ادارہ شایع ہوں گی۔ کھٹیا میں گڑ پھوڑا جائے گا۔ استحصال اور طلب منفعت کا یہ سلسلہ جاری رہے گا۔ لیکن جب میر حسن اور مخدوم محی الدین کی "ہوش کے ناخن" ادارے کی پہلی کتاب کے طور پر شایع ہوا تو ہم میں سے کتنوں کی گردنیں ندامت سے خم اور جبینیں عرق انفعال سے تر ہوگئیں۔ یہ کتاب پروفیسر عبدالرحمن خاں سابق پرنسپل کلیہ جامعہ عثمانیہ کے نام پر معنون تھی جن کی موت پر ڈاکٹر صاحب نے چند دن قبل لکھا تھا کہ

"وہ جامعہ کے ایک ایسے مزدور ثابت ہوئے جس کو عمارت کی تکمیل کے بعد ہی برضاست کر دیا جاتا ہے۔"

یہ ایک حقیر سا نذرانۂ عقیدت تھا اپنے استاذ مشفق کی بارگاہ میں۔ ادارے کی سب سے پہلی کتاب اس کے بانیوں کے شاگردوں نے ان کے استاد کے نام معنون ہوئی۔ ڈاکٹر زور صاحب نے اس کا دیباچہ لکھتے ہوئے اس خیال کا اظہار کیا ہے کہ

"اس سلسلے کی اشاعت و طباعت ممنونِ منت ہے بعض احباب کے ایثار کی۔ جنھوں نے از راہِ علم دوستی اس کے لئے ایک ایک سو روپے کا عطیہ عنایت کیا۔ اور اس سلسلے کی بنیاد ڈالی جو ممکن ہے کہ آج حقیر نظر آئے لیکن اس حقیقت سے کون انکار کر سکتا ہے کہ تمام بڑے کام ابتدا میں بڑے نہیں ہوتے اور نہ نظر آتے ہیں۔"

سنہ ۱۹۳۱ء کی بات کو آج آپ سنہ ۱۹۶۲ء میں کسوٹی پر پرکھئے ڈیڑھ لاکھ روپے کی لاگت سے بنی ہوئی ادارے کی حسین و جمیل عمارت اور لاکھوں روپیوں کا لاقیمت ذخیرہ جو اردو اور صرف اردو زبان سے تعلق رکھتا ہے۔ برصغیر ہند و پاکستان کا کوئی ادارہ اس کا جواب پیش نہیں کر سکتا۔

ادارے کی دو نہیں چار نہیں بلکہ بارہ شاخیں تھیں۔ ہر شاخ کے اراکین اور معتمدین الگ الگ تھے لیکن ہر بات کا فیصلہ ڈاکٹر صاحب پر چھوڑا جاتا تھا۔ اس لئے کہ فیصلہ کرنا آسان ہے اور اس پر عمل پیرا ہونا بہت مشکل۔ ڈاکٹر صاحب مشکل سے مشکل فیصلے کرتے اور ان کو جن طریقوں سے عملی جامہ پہناتے وہ انہی کا حوصلہ تھا انہی کا دل گردہ تھا کوئی دوسرا اس کا عشر عشیر بھی کرے تو اس کا پتّا پانی ہو جائے۔ مخالفین رشک نہیں بلکہ حسد سے ان کی راہ میں روڑے اٹکاتے کانٹے بچھاتے پتھر نہیں بلکہ ڈھوڈ کے ڈھوڈ کھڑے کر دیتے۔ لیکن وہ ایک ایسا سیلاب تھا کہ سب کو بہا لے جاتا اور حاسد منہ تکتا رہ جاتا۔ عمل ہی میں ان کا یہ حال نہ تھا وہ اپنے زورِ قلم سے بھی ہر شخص کو شکست دے دیتے نہ کوئی ان کے برابر لکھ پڑھ سکتا۔ اس کی مثال سنیئے۔

سنہ ۱۹۳۵ء میں مرقع سخن کی اشاعت کا فیصلہ ہوا۔ طے پایا کہ دورِ آصفیہ کے سو[100] شعراء کا تذکرہ لکھا جائے لیکن عملی دشواری یہ تھی کہ شعراء منتخب کئے گئے۔ پہلی جلد کے لئے پچیس اور دوسری کے لئے پچاس۔ شعراء کو انھوں نے اپنے دو احباب اور تینتیس[33] طلبہ میں تقسیم کیا پھر کالج میں جہاں اور جس سے مڈبھیڑ ہوئی انھوں نے پوچھا کہ "مضمون لائے" اور ایسے شدید تقاضے کئے کہ دو تین ہفتے کے اندر اندر تمام مضامین وصول ہوگئے۔ اب مضامین کی تنقیح ہوئی ہر ہر مضمون کے نوک پلک درست کئے جانے لگے کسی کو دوبارہ لکھ کر لانے کا حکم ہوا اور فوری تعمیل کی تاکید۔ تقاضوں پر

ئی کہیں گری۔ کسی کو گری سے بسورتا دیکھا تو پیٹھ تھپک کر اتنی حوصلہ افزائی کر دی کہ اس کی شکایت کا گلا رندھ گیا۔

وہ پڑھانے سے زیادہ کام لینے میں استاد تھے۔ انھیں کام لینے کے ایسے ایسے گر یاد تھے کہ اگر وہ سرسید کے معاصر ہوتے اور انھیں مل جاتے ید سرسید ایک لمحے کے لئے بھی انھیں جدا نہ کرتے۔ کس سے کیا کام لینا چاہیئے وہ بہت جلد تاڑ جاتے تھے۔ اور اس سے وہی کام لیتے۔ ان کے رنے والوں میں لدو بیل کی طرح کام کرنے والے بھی تھے اور ہرن کی طرح پھرتیلے بھی۔ وہ خود اس سے بڑھ کر پھرتیلے تھے۔ اگر ان میں اتنی پھرت نہ ہوتی تو وہ اردو دنیا کے لئے اتنا بڑا کارنامہ نہ چھوڑتے۔ ان تمام کاموں کے ساتھ ساتھ علمی کام بھی رکا ہوا نہ تھا ہمیشہ کوئی نہ کوئی زیر ترتیب رہتی۔ کبھی تو یہ ہوتا کہ خود ان کی ایک کتاب پریس میں ہے تو دوسری کاتب لکھ رہا ہے۔ تیسری کاتب کے انتظار میں ہے وتی زیر ترتیب۔ کبھی یہ بھی ہوا کہ دو دو کتابوں کی ترتیب کا کام ایک ساتھ چل رہا ہے۔ چنانچہ شعرا کے کلام کے انتخابات اسی طرح ہوئے اور یہ سب یعنی متاع سخن، کیف سخن، بادۂ سخن۔ ایک ہی سال ۱۹۳۵ء میں شائع ہوئے۔

شامتِ اعمال کہ میں نے ایک دن ڈاکٹر صاحب سے کہہ دیا کہ میں اپنے خاندان کے بزرگوں اور علماء کے حالات لکھ رہا ہوں۔ کہنے لاؤ ذرا میں بھی دیکھوں ایک دو مضامین کے مسودے ساتھ تھے حوالے کر دیا الٹ پلٹ کر دیکھا اور کہا کتاب کب تک مکمل ہوگی۔

دو مہینے۔

جب تک تو قیامت آجائے گی۔

میں اس سے پہلے پیش کر دوں گا۔

ایک مہینہ گذر گیا لیکن کام کچھ زیادہ آگے نہ بڑھ سکا۔ ایک دن فرمانے لگے چلو میرے ساتھ اور کتاب مکمل کرو۔ میں ہاسٹل جا کر مسودہ لایا اور ڈاکٹر صاحب کے ساتھ رفعت منزل پہنچ گیا۔ کھانا کھا کر وہ ادھر اپنی میز پر ڈٹ گئے ادھر میں نے ایک چھوٹی سی میز کرسی سنبھالی۔ بجے، گیارہ بجے، بارہ بجے، غنودگی طاری ہوئی آہستہ سے ڈاکٹر صاحب کی نظر بچا کر اٹھا اور بستر پر دراز ہو گیا۔ یہ سوچ کر کہ صبح جلد اٹھوں گا اور پر جُٹ جاؤں گا لیکن صبح جب اٹھا ہوں تو ڈاکٹر صاحب اپنی میز سے لگے صفحے کالے کر رہے ہیں۔ ہمت نہ ہوئی کہ کچھ پوچھوں۔ دس دن صاحب کے بنگلے پر ہی رہا۔ یونیورسٹی ان کے ساتھ آتا جاتا رہا اور کتاب ختم کر کے حوالے کی۔ لیکن دس دن میں ایک رات بھی انھیں سوتے نہیں ۔ وہ ہمیشہ میرے بعد سوتے اور مجھ سے پہلے اٹھ جاتے۔ دن گذرتے گئے اور ڈاکٹر صاحب نے اپنے پروگرام میں سونے کے لئے وقت نکال جلد سوتے سویرے اٹھتے۔ دوپہر میں کچھ دیر قیلولہ ضروری ہو گیا تھا۔ اور یہ پابندیاں انھوں نے کچھ تو اپنی صحت اور کچھ اپنے جگری دوست عت اور فیملی ڈاکٹر۔ ڈاکٹر رگھو نندن راج سکسینہ کے اصرار پر اور ان کی خاطر اپنے اوپر عائد کر لی تھیں۔

ڈاکٹر صاحب طالب علمی کے دور میں پروفیسر وحید الدین سلیم کی نگرانی میں مجلۂ عثمانیہ نکالنے کے محرک اور پھر ایڈیٹر بن چکے تھے۔ انجمن طیلسانین کے سہ ماہی ترجمان مجلۂ طیلسانین کی ادارت کی تھی۔ اب اپنا ادارہ قائم کرنے کے بعد وہ رسالہ کیسے نہ نکالتے۔ چنانچہ انھوں نے دو نوجوانوں زادہ میر محمد علی خاں میکش اور خواجہ حمید الدین شاہد کو منتخب کیا۔ ان کی کاوشوں سے جنوری ۱۹۳۸ء سے "سب رس" جاری ہوا اور اب تک جاری ہے اس کے بعد "بچوں کا سب رس" نکلا اور پھر ..... "سب رس معلومات" بھی۔ سب کے ایڈیٹر الگ الگ تھے نگراں ایک۔ مجلس ادارت بدلتی رہی لیکن اب موت نے نگراں کو چھین لیا۔ ۱۹۴۰ء تک اضلاع اور قصبات میں ادارے کی ستر سے دہ شاخیں قائم ہو چکی تھیں۔ اس لئے اشاعت اردو کی غرض سے اردو امتحانات کا سلسلہ شروع کیا۔

ڈاکٹر صاحب نے ملازمین درجۂ چہارم سررشتۂ آبکاری اور افواج باقاعدہ کے لئے اس کا ابتدائی امتحان لازمی کروا دیا۔ شرکت کرنے

والے امیدواروں کی تعداد سیکڑوں سے ہزاروں تک پہنچی اور اس طرح سیکڑوں اور ہزاروں کو اردو داں بنا دیا۔

ڈاکٹر صاحب کو ہر کس و ناکس سے اپنے کاموں میں تعاون کرانے کا جو ملکہ تھا اس کی ایک مثال ملاحظہ ہو۔ ۱۹۴۴ء میں یہاں ایک بڑی شان دار کل ہند اردو کانگریس منعقد ہوئی۔ اس قدر شاندار کانگریس ہندستان میں اردو کے بارے میں شاید ہی کہیں ہوئی ہو۔ انتظام سب کچھ ڈاکٹر صاحب کے ذمے تھا۔ لیکن انھوں نے بڑے بڑے نوابوں، جاگیرداروں اور عہدہ داروں کا تعاون حاصل کیا۔ نواب ظہیر یار جنگ امیر پائیگاہ ان کے شاگرد تھے ان سے کہہ کر بشیر باغ پیلیس میں باہر سے آنے والے ذی مرتبت ارکان کے قیام کا انتظام کیا۔ بشیر باغ پیلیس وہ قصر ہے جس کی زیارت بھی کسی کو نصیب نہ ہوتی تھی۔ اور ایسے قصر میں اردو کے امیران کارواں نے قیام کیا ہے۔ شرکت کرنے والوں میں پنجاب سے سر شیخ عبدالقادر۔ دہلی سے پنڈت برج موہن دتاتریہ کیفی۔ علی گڑھ سے رشید احمد صدیقی۔ اور مدراس سے افضل العلماء ڈاکٹر محمد عبدالحق۔ تینوں تو اللہ کے پیارے ہو گئے۔ رشید احمد صدیقی (خدا انھیں طول عمر دے) اس کی تصدیق کریں گے۔ ڈاکٹر صاحب کا کمال تو یہی تھا کہ رشید احمد صدیقی جیسے گھر گھسنے قسم کے آدمی کو انھوں نے حیدرآباد کھینچ بلایا۔ بابائے اردو تو یہیں تھے غرض کہ حیدرآباد کی سرزمین اردو کے ان روشن ستاروں سے آسمان بن گئی تھی۔

اب سب کی خدمت کے لئے شاگردوں کا ایک جم غفیر کھڑا کر دیا تھا جنگ کا زمانہ۔ پٹرول پر راشن۔ لیکن مہمانوں کے لئے موٹریں حاضر تھیں۔ حکومت سے کانگریس کے لئے پٹرول کے کوپنس بھی حاصل کرلئے تھے گویا اس وقت پٹرول بھی جوئے شیر سے کم نہ تھا اور بے تیشے کا کوہ کن ساری دشواریوں پر قابو پاتا چلا جا رہا تھا۔

اب تک ادارہ اپنے پیروں پر کھڑا تھا۔ حکومت کی کوئی امداد نہ تھی۔ کتابوں کی فروخت اور سب رس ہی اس کی آمدنی کا ذریعہ تھے۔ یا پھر کچھ امتحانات سے مل جاتا تھا۔ ادارے کا دفتر ڈاکٹر صاحب کا ڈرائینگ روم تھا۔ کام بڑھتا گیا دفتر بھی پھیلتا گیا۔ اور ڈاکٹر صاحب نے اپنے بنگلے سے متصل ایک چھوٹی سی عمارت جس میں پانچ کمرے اور ایک ہال تھا تعمیر کی اور ادارے کو اس میں منتقل کر دیا۔ اس سے پہلے اور بعد بڑی بڑی شخصیتوں نے ادارے کا معائنہ کیا تھا اور خوب خوب داد دی تھی۔ جب غلام محمد وزیر فینانس حیدرآباد (بعد کو گورنر جنرل پاکستان) نے ادارے کا معائنہ کیا تو فرمایا۔

"زور صاحب جی چاہتا ہے کہ آپ کو خزانۂ عامرہ لے چلوں اور کہوں کہ جتنا روپیہ لے جا سکتے ہو لیجاؤ۔"

اس کے بعد ہی انھوں نے ادارے کے لئے معاشی رقم منظور کی۔ جس کا سلسلہ کمی و بیشی کے ساتھ ابھی تک جاری ہے۔ حکومت آندھرا پردیش بھی جس نے ہندوستان میں اردو کے تعلق سے وسیع القلبی اور بالغ نظری سے کام لیا ہے ادارے کو گرانٹ دے رہی ہے۔ اس امداد کے بعد سے ادارے کے کام کی رفتار بہت تیز ہو گئی اور کام کرنے والوں کے حوصلے بہت بڑھ گئے۔

انسائیکلو پیڈیا کا کام بہت اہم تھا۔ علماء کے تعاون سے ایک جلد تیار ہو گئی۔ نمونے کے ستر صفحے چھپ گئے لیکن جنگ، گرانی، کاغذ کی قلت۔ اور درآمد کی مسدودی نے کمر توڑ دی۔ اور وہ کام دھرے کا دھرا رہ گیا۔

ڈاکٹر حفیظ سید پروفیسر الہ آباد یونیورسٹی نے خط لکھا کہ مجھے شاہ نعمت اللہ ولی کے مزار پر جو کتبہ ہے اس کے چربے کی ضرورت ہے۔ شاہ صاحب نے محمد قلی قطب شاہ کے زمانے میں ۱۰۲۰ھ میں انتقال کیا۔ ڈاکٹر صاحب نے کاغذ کا ایک تختہ ساتھ لیا مجھے ساتھ بیٹھ جانے کا حکم ملا اور ہم قلعہ گولکنڈہ کے شمالی حصے میں نہایت خراب راستے سے ہوتے ہوئے ایک جگہ رکے کچھ دور پیدل گئے جہاں ایک پھوٹی ٹوٹی سی گنبد نظر آئی۔ اندر مزار پر سنگ سیاہ کا نہایت شاندار کتبہ لگا ہے اس کا چربہ لیا اور روضے کے خادموں سے گفتگو ہوئی۔

شاہ صاحب کی زندگی کے حالات خادموں سے بیان کئے۔ خادم دم تحو اور دنگ کہ ہم خدمت کرنے کے باوجود لاعلم اور یہ لندن پلیٹ ڈاکٹر
صاحب درگاہ کی جزویات سے واقف۔ کس نے کب اور کیوں بنائی۔ صاحبِ مزار نے کیا کیا کتابیں لکھیں اور اب ان کی کونسی کتاب پر ترتیب
زر رہی ہے۔

۱۹۴۵ء میں ڈاکٹر صاحب پروفیسر ہوئے لیکن جامعہ عثمانیہ سے نکل کر اس کے نئے ملحقہ قائم کردہ دارالعلوم کالج کے پرنسپل کی
حیثیت سے جائزہ حاصل کیا۔ انھیں اس کا افسوس تھا کہ اس سے ان کے کاموں میں رکاوٹ پیدا ہوگی۔ کیوں کہ اب اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے والے
سے ان کا تعلق باقی نہیں رہے گا۔ اور سارا کام انھیں کو انجام دینا پڑے گا۔ ان کا خیال صحیح نکلا وہ یونیورسٹی کیمپس سے باہر ہوئے اور
وہاں علمی ذوق کو مہمیز کرنے اور شوق کو تازیانہ لگانے والا کوئی نہ رہا۔ البتہ انھیں اس کالج میں آنے سے سہولتیں زیادہ حاصل ہوئیں
اداروں کے کاموں کی رفتار میں تیزی پیدا ہوئی۔ ان کے بہت سے شاگرد لیکچرار بن کر ان کے پاس پہنچے اور انھوں نے ان سے خوب ہی
لیا۔ اب طلبہ کی بجائے وہ لکچراروں ہی سے زیادہ کام لینے لگے اگر کوئی پہلو تہی کرتا تو بری طرح اس کی خبر لیتے۔ عہدہ دار کی حیثیت سے نہیں
بزرگ اور استاد کی حیثیت سے۔ اور کبھی نرمی پر آجاتے تو لکچرار بھی میاں اور بابا کی صف میں کھڑے نظر آتے اور غصہ آتا تو بیوقوف نامعقول
نالائق بن جاتے۔ اور ان گالیوں کو شربت کا گھونٹ سمجھتے۔ کتنی شیرینی تھی ان لبوں میں جو پان کی لالی سے ہمیشہ سرخ رہتے۔

۱۹۵۰ء میں یونیورسٹی نے دارالعلوم کالج کو چادر گھاٹ کالج سے موسوم کیا اور مقام بھی بدل دیا۔ یہاں ڈاکٹر صاحب کو کچھ فرصت
سکون ملا۔ اندرون شہر کی گھٹی ہوئی فضا سے باہر آئے۔ تذکرۂ مخطوطات کی دوسری جلد۔ داستان ادب حیدرآباد۔ چہر حیدرآباد فرخندہ بنیاد
یا لکھی۔ لکھنے کا یہ حال تھا کہ لوگ آرہے ہیں۔ باتیں ہو رہی ہیں۔ سامنے کچھ کتابیں اور مخطوطے کھلے ہیں۔ بازو پانوں کا پیاکٹ دھرا ہے۔
پان نکالتے ہیں کھاتے ہیں۔ قلم بھی چلتا ہے۔ منہ بھی چلتا ہے اور زبان بھی چلتی رہتی ہے۔ لوگوں سے بھی باتیں ہوتی ہیں اور ٹیلی فون پر
اور تذکرۂ اردو مخطوطات جیسی اہم کتاب لکھی جاتی ہے۔ ان سب پر مستزاد دفتر کی مشکلوں اور کردی کمانوں پر بھی دستخطوں کا کام
کا ہے۔ —— ع

رند کے رند رہے ہاتھ سے جنت نہ گئی

ایک وقت میں ایک کام کرنا تضیع اوقات سمجھتے تھے۔ اور چاہتے تھے کہ ہر شخص ان کی طرح چوکھا وار کرتا رہے۔ اتنی ہمت کوئی اور
لاتے لاتا۔ ڈاکٹر صاحب کے کام کی اس رفتار کو دیکھ کر لوگ ہیبت کھا جاتے اور انگشت بہ دنداں ہوتے۔

ڈاکٹر صاحب کے والد حافظ ابوالبرکات سید شاہ غلام محمد زعم قادری الرفاعی نے انتقال کیا۔ ڈاکٹر صاحب نے ان کی تدفین
لئے اس جگہ کا انتخاب کیا جہاں رود موسیٰ کی طغیانی میں ان کے جد امجد سید شاہ عنایت اللہ غرق ہوئے تھے۔ یہاں انھوں
ایک بڑا قطعۂ اراضی خریدا اور والد کی قبر پر شاندار گنبد قائم کیا۔ ڈاکٹر صاحب کی والدہ ایک بہن اور ایک چھوٹے بھائی جلال الدین
بھی اس گنبد میں آسودہ ہیں۔ وہ خود بھی یہیں رہنا چاہتے تھے لیکن گردشِ روزگار نے موقع نہ دیا اور یہاں سے ہزاروں میل
سری نگر کے ایک شہر خموشاں "خانیار شریف" کے ایک گوشے میں جگہ پائی۔ اس گنبد سے متصل ڈاکٹر صاحب نے ایک خانقاہ تعمیر
س کا نام "خانقاہِ عنایت الٰہی" رکھا۔ اس میں ایک کتب خانۂ اسلامیات قائم کیا جس میں مطبوعات کے علاوہ فن تصوف پر
ولات کا بھی کافی تعداد محفوظ ہے۔ اور پھر اپنے بڑے صاحبزادے سید شاہ تقی الدین قادری کو اپنے والد مرحوم کی جگہ سجادہ بنا دیا۔
ال دھوم سے عرس ہوتا۔ قوالی کی محفلیں منعقد ہوتیں۔ طرحی مشاعرے ہوتے۔ اور تین دن بزرگان دین اور اماميان شیخ مشین کی صحبت

میں گزرتے۔

حکومت حیدرآباد، حکومت آندھرا پردیش بن گئی۔ لسانی بنیاد پر حیدرآباد کے تین ٹکڑے ہوئے اس کو مدراس سے کچھ ملا، میسور سے کچھ اور حیدرآباد دے مدھیہ پردیش کو کچھ ملا اور بمبئی کو کچھ۔ لوگ واویلا مچا رہے تھے اور ڈاکٹر صاحب نے کہا کہ یہ کوئی نئی تقسیم نہیں بالکل اصولی ہے بعض لوگوں نے کہا آپ ماہر لسانیات داد نہ دیں تو اور کون دے گا۔

"دیکھیے طنز کی ضرورت نہیں اگر تھوڑی تاریخ سے واقفیت ہو تو یہ بھی یاد ہوگا کہ محمد قلی قطب شاہ کی سلطنت کے حدود یہی تھے۔ اور موجودہ آندھرا پردیش کا پورا علاقہ اس کے زیر نگیں تھا۔ آج لسانی بنیادوں پر تقسیم میں اسی کی روح کار فرما ہے۔ چلو آؤ اس کا عرس منائیں قلی قطب شاہ کی جئے۔"

پھر یوم محمد قلی منانے میں ڈاکٹر صاحب تن من دھن سے لگ گئے۔ اور ساتھیوں کی پرسکون زندگی میں ہلچل ڈال دی۔ گورنر سے لے کر ایک عام آدمی تک قلی قطب شاہ کا کلمہ پڑھنے لگا۔ نوبت نقارے ہوں گے۔ نشان کا ہاتھی ہوگا۔ ماہی مراتب ہوں گے نقیب اور چوبدار ہوں گے۔ پھر قلی قطب شاہ کی جگہ ہاتھی پر صندل کی کشتی ہوگی۔ ہاتھیوں پر شاہی جھولیں ہوں گی۔ گھنٹیاں ہوں گی۔ سارا ساز و سامان ہوگا۔ پھر پالکی۔ نالکی۔ میانہ۔ ہوادار۔ بوچہ۔ رتھ۔ اور بینڈیاں ہوں گی۔ غرض کہ جلوس کی ساری تفصیل سمجھا دی۔ اور ایک اچھا سیج بنا دیا۔ وقتاً فوقتاً دیکھتے رہے کہ ہدایتوں پر عمل ہو رہا ہے کہ نہیں گورنر صاحب سے کہا کہ محمد قلی قطب شاہ کے گنبد پر جلسہ آپ صدارت کریں گے۔ میئر بلدہ اور وزراء سے کہا کہ آپ لوگ جلوس کی قیادت کریں گے۔

اس سے بڑھ کر ایک بڑا کارنامہ یہ انجام دیا کہ قلعہ کا چپہ چپہ عوام کو بتلانے کے لئے گائیڈز کی تربیتی جماعت قائم کی۔ تاریخی لکچرز۔ پروفیسر عبدالمجید صدیقی نے دیئے اور ادبی حالات پر ڈاکٹر صاحب نے۔ اور اس تربیتی جماعت کو قلعہ کا ایک ایک چپہ بتلاتے ہوئے دیکھئے ہم اب قلعہ میں داخل ہوتے ہیں۔ اس کمان میں تالی بجائیے تو بالا حصار پر سنیئے۔ آگے بڑھیئے تو سیدھے ہاتھ نگینہ باغ تھا۔ وہ اس نیم کے درخت کے نیچے عبدالرزاق لاری اپنے گھوڑے سے گر کر بے ہوش پڑا ہوا ملا۔ سامنے اس باؤلی سے جو نل نظر آ رہے ہیں ان سے پانی اوپر لیجایا جاتا تھا۔ بائیں طرف یہ محل ہیں۔ یہ ابراہیم قطب شاہ کا محل ہے۔ محمد قلی قطب شاہ یہاں پیدا ہوا۔ بھاگ متی اس کمرے میں رہتی تھی۔ وہ اس دیول میں پوجا کرتی اور قلی قطب شاہ اس سے لگی ہوئی اس مسجد میں نماز پڑھتا تھا یہ محلات سے متصل دوسری باؤلی ہے۔ جب اورنگ زیب کی فوجیں قلعہ میں داخل ہوئیں تو ابوالحسن تاناشاہ کی حرم سرا سے سیکڑوں عورتیں اس میں کود گئیں۔

غرض ایک ایک اینٹ کی تاریخ اس طرح سمجھاتے گویا قلی قطب الملک سے ابوالحسن تاناشاہ تک کا سارا زمانہ انھوں نے دیکھا۔ اس اعتماد کے ساتھ میں نے کسی کو پڑھاتے نہیں دیکھا۔

میں نے ذکر کیا ہے کہ ادارے کے کارنامے حکومت کی نظر میں وقیع ہو گئے تھے اس لئے ڈاکٹر صاحب نے بھی موقع سے فائدہ اٹھایا اور ادارے کی عمارت کی تعمیر کے لئے امداد مانگی مولانا ابوالکلام آزاد اور پروفیسر ہمایوں کبیر ادارے کے بارے میں سن چکے تھے۔ مرکز سے امداد دینے میں انھیں تامل نہ ہوا۔ عمارت بننی شروع ہوئی۔ اور ڈاکٹر صاحب کے پاؤں میں گردش پرکار آ گئی۔ اپنے گھر سے ادارے کی عمارت تک دن بھر میں بیسیوں چکر ہو جاتے۔

اینٹ بھگاؤ، چونا باریک پیسو، ریت برابر ناپو۔ گولا لگا کر دیکھو اینٹ باہر نہ نکلے، معماروں کو ہدایت دیتے کبھی

کبھی تلنگی میں اور کبھی اوریسیر کو انگریزی میں۔

خدا خدا کرکے عمارت بنی۔ اور آرائش کی باری آئی۔ دن رات سوچ رہے ہیں کہ کونسی چیز کیسی ہو۔ فیاض الدین صاحب سے مشورے ہو رہے ہیں۔ دلدار حسین صاحب سے تبادلۂ خیال ہو رہا ہے۔ عبدالرحمٰن شریف صاحب سے رائے لیجا رہی ہے۔ اور سب کی رائے کا خلاصہ بنا کر عمل کر رہے ہیں۔ طغرے لگانے اور میوزیم سجانے کی باری آئی تو نواب عنایت جنگ بہادر کو زحمت دی۔ نواب صاحب تشریف لائے مسلسل چار پانچ گھنٹے بیٹھے ہی بیٹھے باتیں ہوئیں۔ مشورے ہوئے۔ کچھ تاریخ دہرائی اور ایوان سجنے لگا۔ ایوان کے اکثر و بیشتر نوادر خواہ وہ ہتیار ہوں یا مواہیر۔ طغرے ہوں یا مخطوطات۔ نواب صاحب ہی کا عطیہ ہیں۔

افتتاح کے لئے بخشی غلام محمد صاحب وزیر اعظم کشمیر کے نام قرعہ پڑا کیونکہ عمارت کی تعمیر میں حکومت کشمیر کی امداد کا بھی دخل تھا۔ وہ آئے۔ بڑی شان سے افتتاح ہوا۔ اور اردو کی اپنی ایک شاندار عمارت "ایوان اردو" کے نام سے وجود میں آگئی۔

حیدرآباد میں انجمن ترقی اردو کے لئے "اردو ہال" کی تعمیر شروع ہوئی بعضوں نے کہا کہ ڈاکٹر صاحب اردو ہال بن رہا ہے اور آپ بھی ایوان بنانا چاہتے ہیں۔ انھوں نے جواب دیا کہ اگر دس ہال اور دس ایوان بن جائیں تو میں کہوں گا کہ گیارھواں ہال اور ایوان بننا چاہیئے۔ اردو سے یہ عشق تھا ڈاکٹر صاحب کو۔ اسی لئے ڈاکٹر صاحب انجمن ترقی اردو میں بھی موجود ہوتے اور ہندی پرچار سبھا میں بھی۔ مہاراشٹرا منڈل میں بھی نظر آتے اور آندھرا سرسوتی پریشد میں بھی۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ان اداروں کی تقریبیں ڈاکٹر صاحب کے بغیر مکمل نہیں ہوتیں۔ اور ڈاکٹر صاحب ادارے میں سب اداروں کے عہدہ داروں کو مدعو کرتے۔

ڈاکٹر صاحب کچھ اچھے مقرر نہ تھے لیکن ان کی شہرت ان کے کام اور ان کی مقبولیت نے بہت ہر دل عزیز بنا دیا تھا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ لوگ انھیں کہیں جلسوں کی صدارت یونینوں کے افتتاح اور مشاعروں کی میرا کے لئے بلاتے صرف مقامی طور پر ہی نہیں بلکہ حیدرآباد سے باہر بھی۔ ڈاکٹر صاحب کسی کی درخواست شاذ ہی رد کرتے اس کا فائدہ انہیں ہوا کہ اچھے مقررین گئے۔ تقریر کا انداز نہایت شگفتہ اور دلاویز ہوتا۔ بعض موقعوں پر ایسی دلکش تقریریں کی ہیں کہ باید و شاید ہی ایسی تقریریں سننے کا موقع ملا ہو۔ اس سلسلے میں وہ بمبئی، ناگپور، برہان پور، کرنول، اورنگ آباد اور بیدر وغیرہ بھی گئے تھے۔

چالیس پینتالیس سال کے نظر آنے والے زور صاحب ایک دم پچپن سال کے ہو کر وظیفہ حسن خدمت پر علٰحدہ ہو گئے۔ خیال ہوا کہ اب ابوالکلام آزاد اورنٹیل ریسرچ انسٹی ٹیوٹ اور ادارۂ ادبیات اردو پر پوری توجہ صرف کریں گے لیکن کشمیر سے پروفیسری کا پیش کش ہوا اور ساتھ ہی بخشی صاحب وزیر اعظم کشمیر کا تقاضا۔ کچھ خانگی اور کچھ سرکاری باتیں حیدرآباد میں خبر پھیلی کہ ڈاکٹر صاحب کشمیر کی پروفیسری قبول کر رہے ہیں۔ کوئی کہتا ہے پیسے کی خاطر جا رہے ہیں۔ جاننے والے کہتے ہیں وہاں بھی ادارہ قائم کرنا اور اردو کا گڑھ بنانا ہے۔ ڈاکٹر صاحب کے بعض شاگردوں نے صاف کہہ دیا کہ آپ کو حیدرآباد نہیں چھوڑنا چاہیئے۔ جب کہ آزاد اور ادارے کے دو کام آپ کے ذمے ہیں۔ اردو کی خدمت کا جذبہ آخر انھیں کشمیر لے گیا۔

اکتوبر ۱۹۶۱ء میں سری نگر میں اورنٹیل کانفرنس کا اجلاس تھا۔ ڈاکٹر صاحب نے ہمیں شرکت کے لئے لکھا۔ ڈاکٹر شریف النسار مولوی غلام رسول، پروفیسر سید محمد، اور میں نے ان کی دعوت پر شرکت کی۔ ڈاکٹر صاحب ہی کے مہمان رہے یونیورسٹی سے واپس ہوتے ہوئے ڈاکٹر شریف النسار سے کہا تم کلیم پر کام کر رہی ہو چلو اس کی قبر کی زیارت کر لو۔ پیچ در پیچ گلیوں سے ہوتے ہوئے، مصاب صفہ پہنچے جس کا ذکر ڈاکٹر صاحب نے اسی عنوان پر اپنے ایک مضمون میں کیا ہے۔ چبوترہ نہایت بلند جو اب چو طرف سے گر گیا ہے۔

اس پر پڑھنا مشکل لیکن ڈاکٹر صاحب کے ذوقِ جستجو کے مقابلے میں ہر کوہ کاہ اور ہر مشکل سہل گویا اس قفل ابجد کا کھولنا ڈاکٹر صاحب جانتے تھے۔ اگر انھیں مہلت ملتی تو نہ معلوم وہ سری نگر کے بھی ایسے ہی مورخ بن جاتے جیسے گولکنڈے کے تھے۔

وہ خود بہت بڑے آدمی تھے وہ کسی سے مرعوب ہونا جانتے ہی نہ تھے۔ لیکن بزرگوں کا ادب بھی ان کے خمیر میں تھا۔ کئی کئی مرتبہ دیکھا گیا کہ حضرت جذب عالمپوری، علامہ حیرت بدایونی، حکیم ونسرائے وہمی اور کئی دوسرے حضرات اکثر ڈاکٹر کے پاس آتے اور ڈاکٹر صاحب اٹھ کر اور خم ہو کر ملتے۔ اور نیشنل کانفرنس کے اجلاس میں ایٹ ہوم کے موقع پر خواجہ غلام السیدین اور ڈاکٹر عابد حسین ایک میز پر تھے۔ ڈاکٹر صاحب نے مولوی غلام رسول صاحب کا ہاتھ پکڑ لیے جاکر تعارف کرایا آپ میرے استاد مولوی صاحب ہیں۔ جن سے میں اب تک بھی کچھ نہ کچھ سیکھتا ہوں۔ ایسے سعادت مند شاگرد کتنے ہوں گے۔

ڈاکٹر صاحب جانے کو تو کشمیر گئے لیکن دل ایوانِ اردو میں رہا۔ خطوں میں ہدایتیں ہیں فلاں کتاب پریس کو وقت پر نکالو۔ پروف ریڈنگ اچھی ہو۔ طباعت کا اہتمام کرو۔ دروازے کو پالش کراؤ اس کا رنگ جا رہا ہے۔ بارش کا موسم رسالے بھیگ نہ جائیں ان کا خیال رکھو۔ ہر کام سلیقے سے ہوتا رہے تم لوگوں کی سمجھ میں نہ آئے تو مجید صدیقی صاحب یا سکسینہ سے مشورہ کرو یا مجھے لکھو میرے پاس روز کی روز ڈائری آتی رہے۔ کوئی دن ناغہ نہ ہو۔

ہمیں مشورے دینے والا۔ ہمیں زجر و توبیخ کرنے والا۔ پیٹھ تھپک کر حوصلے بلند کرنے والا تھک جانے تک کام لینے والا ادارے اور آزاد انسٹی ٹیوٹ کا بانی سینکڑوں شاگردوں کا استاد اور ہزاروں کا مرجع اعتقاد آج ہم میں نہیں۔ آج ہم پر پھول بھی چڑھانے کے قابل نہیں۔ کہ وہ ہم سے ہزاروں میل دور سری نگر کے ایک شہر خموشاں خانیار شریف میں محو خواب ہے

"آسماں اس کی لحد پر شبنم افشانی کرے
سبزۂ نورستہ اس گھر کی نگہبانی کرے"

(بشکریہ "نقوش" لاہور)

ڈاکٹر زور کی ذات اس دور میں اردو کے لئے مینارۂ نور تھی۔ مرحوم کے انتقال سے اردو میں جو خلا پیدا ہو گیا ہے اس کا پُر ہونا بظاہر مشکل ہے۔ مرحوم نے اردو زبان و ادب خصوصاً قدیم دکنی ادب کی جو خدمت کی ہے وہ تاریخ میں ہمیشہ یادگار رہے گی۔ مرحوم نے دکن میں "ادارۂ ادبیاتِ اردو" قائم کر کے وہاں اُردو کو ختم ہونے سے بچا لیا۔

ماہنامہ "فروغ اردو" لکھنؤ۔ اکتوبر ۶۲ء

ڈاکٹر رحیم الدین کمال

ڈاکٹر زور ـــ شخصیت

ڈاکٹر زور کو میں ربع صدی سے بھی زیادہ عرصہ سے جانتا تھا۔ وہ میرے بزرگ بھی تھے اور دوست بھی۔ میں ان کا حلیف و مددگار بھی تھا اور حریف و ناقد بھی۔ بے شمار کاموں میں میں اُن کا شریک تھا اور بہت سے موقعوں پر میں نے اپنے آپ کو بالکل الگ بھی کر لیا تھا۔ وہ میرے بزرگ اسلئے تھے کہ مجھ سے عمر میں بہت بڑے تھے۔ یوں تو میں نے ان سے درسی تعلیم حاصل نہیں کی تھی لیکن ان سے بہت کچھ سیکھا اور پایا۔ اُن کا ہم کار بن کر کاموں کے ڈھنگ سیکھے۔ میں ان کا دوست اس لئے تھا کہ اِن سے ملاقات کے چند ہی دنوں بعد وہ بہت سی باتوں میں مجھ سے رائے مشورہ کرنے لگے اور عمر اور مرتبہ کے فرق کے باوجود وہ مجھ سے دوستوں ہی جیسا سلوک کرتے رہے۔ یہ اُن کی بزرگی بھی تھی اور طبیعت کی افتاد بھی۔ میری خود اعتمادی بھی تھی اور طبیعت کی اُٹھان بھی۔ میں اُن کا حلیف و مددگار اس لئے تھا کہ ربع صدی کے عرصہ میں ادارہ ادبیات اردو، سب رس، شعبہ طلبہ، تعلیم بالغان، کتب خانہ، مخطوطات کی ترتیب، کانفرنسوں اور جلسوں کے انعقاد اور اسی نوعیت کے بے شمار منصوبوں اور مشغلوں میں ان کا شریک کار رہا۔ میں ان کا حریف و ناقد اس لئے تھا کہ اکثر مسائل اور معاملات میں ہم دونوں میں شدید اختلاف رائے تھا۔ اور ہم دونوں کی طبیعتوں کی افتاد جداگانہ تھی۔ طبیعتوں کے اس اختلاف اور رائیوں کے تصادم کے باوجود ہماری محبت و دوستی آخر دم تک متاثر نہ ہوئی۔ وہ تادم مرگ میرے بہی خواہ رہے اور میں ہر وقت اُن کی خیر خواہی اور خیر سگالی کی صورتیں پیدا کرتا رہتا۔ ڈاکٹر زور کی زندگی پر کچھ لکھنا در اصل ربع صدی سے بھی زیادہ عرصہ کے انھیں واقعات و تعلقات کی یاد تازہ کرنا ہے۔ ان ہی واقعات و حالات کے آئینہ سے دراصل ڈاکٹر زور کی شخصیت جھلکتی ہے۔

(۲)

ڈاکٹر زور سے میری پہلی ملاقات ایک روز سر شام "رفعت منزل" کے پائیں باغ میں ہوئی۔ میں اس زمانہ میں مڈل اسکول کے آخری درجہ میں پڑھتا تھا۔ اور ڈاکٹر زور جامعہ عثمانیہ کی اُردو ریڈری کی خدمت پر مامور تھے۔ مجھے مضمون نگاری کا چسکا پڑ چکا تھا۔ اور میرے چھوٹے چھوٹے مضامین ادبی رسالوں میں شائع ہو رہے تھے۔ بیگم زور کے بھانجے معین الدین احمد انصاری اور چند طالب علموں نے مل کر ایک "انجمن پیام برادری" کے نام سے قائم کی تھی۔ اور میں اس کا صدر بنایا گیا تھا معین الدین احمد انصاری جو گھر والوں میں مقبول کے نام سے مشہور تھے اس کے معتمد تھے۔ انجمن کا دفتر بھی "رفعت منزل" کے پائیں باغ کے ایک کمرے میں قائم تھا۔ اس طرح میرا "رفعت منزل" آنا جانا شروع ہوا۔ ہمارے اکثر جلسے بھی رفعت منزل ہی پر ہوتے تھے۔ غرض ایک شام ہم رفعت منزل کی بلندیوں سے نیچے کی طرف آ رہے تھے کہ ایک صاحب سے

مڈبھیڑ ہوئی۔ یہ صاحب ململ کا کرتہ پہنے، زلف انداختہ، ٹہلتے ٹہلتے رفعت منزل کی طرف آرہے تھے۔ سرخ و سفید چہرہ، بھاری بھرکم بدن، مستانہ چال، لب رنگین، گلوری اس طرح چباتے تھے کہ گویا اس کو سزا دے رہے ہیں۔ تیز آنکھیں، ناک، کشادہ پیشانی، لبوں پر مسکراہٹ جو اکثر بلند قہقہوں میں ڈوب جاتی تھی۔ پاؤں میں آپ ہی جوتا۔ یہ ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور۔ تعارف ہوا، گفتگو شروع ہوئی۔ ہم ایک دوسرے سے غائبانہ متعارف تھے گھنٹہ بھر اِدھر اُدھر کی گفتگو میں گزرا۔ بے تکلفی کے ساتھ ہی ساتھ حوصلہ افزائی اور فراخ دلی کے بھی آثار۔ یہ ان بڑائی تھی کہ اسکول کے ایک طالب علم کو اتنا وقت دینا انھوں نے تضیع اوقات نہ سمجھا۔ پہلی ملاقات ہی میں زور صاحب نے مجھے ادارہ ادبیات اردو کے کاموں میں دلچسپی لینے کی دعوت دے دی۔ پیام برادری کے خطوط پر ادارۂ ادبیات میں ایک شعبۂ طلباء قائم کیا گیا۔ میں اس کا صدر اور معین الدین احمد انصاری اس کے معتمد بنائے گئے۔ اس شعبہ سے طلبہ میں اردو پھیلانے، لکھنے لکھانے اور تقریریں کرنے کا شوق دلانے اور علمی و ادبی صلاحیتوں کو ابھارنے" کچھ کام ہوا۔ کہنے کو تو ادارۂ ادبیات اردو جانے کا ایک بہانا نکل آیا تھا۔ لیکن اس طرح مجھے ڈاکٹر زور سے قریب ہونے کا موقع مل گیا۔ اور رفتہ رفتہ نوبت یہاں تک پہنچی کہ میری اکثر شامیں اور چھٹیاں ادارۂ ادبیات اردو ڈاکٹر زور کی نذر ہونے لگیں۔ ان ہی صحبتوں میں ہندوستان کے نامور ادیبوں، شاعروں اور عالموں سے ملاقاتیں ہوئیں۔ یہ عجیب بات ہے کہ ان صحبتوں میں مجھے کبھی اپنی علمی بے مائگی کا احساس نہیں ہوا۔ ان صحبتوں میں نیاز فتح پوری، جوش، جگر، قاضی عبدالغفار، حسرت موہانی، سر اکبر، نواب صاحب چھتاری، علی یاور جنگ، سروجنی نائیڈو، علی منظور، علی اکبر صاحب، حسین علی خاں صاحب، عبدالمجید صدیقی صاحب، سروری صاحب، سید محمد صاحب، ہاشمی صاحب، صمد ساز رضوانی، وجد، مخدوم، میکش، غرض ان سب کو دیکھنے ملنے اور سننے کا موقع ملا۔ میں نے حیدرآباد کی ادبی بیٹھکوں میں وہ سب کچھ پایا جو شاید عمر بھر کی کتابوں کے مطالعہ سے نہ مل سکتا تھا۔ مطالعہ بجائے خود اہمیت رکھتا ہے، اس کو چیز بنانے کے لئے صحبت کا فیض بھی ضروری ہے۔

ڈاکٹر زور کی شخصیت کا عجیب رنگ تھا۔ ہندوستان بھر میں ان کے تحقیقی اور ادبی کاموں کی شہرت ہو چکی تھی ادیب، شاعر یا عالم ایسا نہ ہوتا جو حیدرآباد آکر ادارہ دیکھے بغیر جا سکتا تھا۔ زور صاحب کوئی نہ کوئی صورت ان کو ادبیات اردو بلانے کی کرتے۔ جب کوئی مہمان ادارہ میں آتا تو زور صاحب نہایت سادگی لیکن پرکاری سے اپنے کاموں کی تفصیل بتاتے تھے۔ کام اتنے زیادہ تھے کہ کوئی بھی ان سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا تھا۔ ڈاکٹر زور کا مشرب وسیع تھا اس لئے ان مہمانوں میں مسلمان بھی تھے، ہندو، عیسائی اور پارسی بھی۔ ان میں ہر سیاسی مسلک کے لوگ شامل تھے۔ ان کو کسی سیاسی عقائد سے کوئی سروکار نہ تھا۔ وہ اردو دوستی کو دیکھتے تھے۔ جن کی ذات سے ادارۂ ادبیات اردو اور اردو کو فائدہ پہنچتا وہ اُسے بلاتے، کاموں سے واقف کراتے اور ادارہ کو ترقی دینے کی کوئی نہ کوئی سبیل نکال لیتے۔ یہ گُر ان کو آتا تھا۔ اُن کی جگہ کوئی اور اس منصب پر فائز ہو کر ادارہ کو اتنا فائدہ نہیں پہنچا سکتا تھا۔ حیدرآباد میں سر اکبر اور بہادر یار جنگ ایک دوسرے کے مخالف تھے۔ ان دونوں میں عقائد کا اختلاف بھی تھا اور عزائم و آرزوؤں کا ٹکراؤ بھی لیکن ڈاکٹر زور کو ان دونوں کی یکساں تائید حاصل رہی۔ انتہا یہ ہے کہ علی یاور جنگ جیسے سیاس بھی جو اپنے آپکو دیکھ

اداروں سے متعلق کرنے کے فن کو خوب جانتے تھے۔ ان سے بے تعلق نہ رہ سکے۔

جامعہ عثمانیہ میں شریک ہوا تو میں نے معاشیات و سیاسیات کو اپنایا۔ اس طرح شعبہ اردو سے میرا کوئی رسمی تعلق نہ تھا لیکن فرصت کے تمام اوقات ڈاکٹر زور ہی کے کمرے میں گزرتے تھے۔ یہاں سب پروفیسر اور طالب علم جمع ہوتے۔ پروفیسر مجید صدیقی، پروفیسر سروری، پروفیسر ٹوپا، پروفیسر فاروقی، پروفیسر ستار او غرض وہ سب اصحاب جو کسی نہ کسی طرح زور صاحب کے شریک کار تھے یہاں آتے۔ ان میں استاد اور طالب علم بھی شامل تھے۔ ارض و سما کا ہر موضوع زیر بحث آتا۔ انسانی کرداروں پر بھی تبصرہ ہوتا۔ لوگوں پر پھبتیاں کسی جاتیں۔ قہقہے بلند ہوتے۔ زور صاحب عام طور پر دس بجے آرٹس کالج پہنچتے اور ایک بجے تک ملاقاتیوں کا یہ تانتا بندھا رہتا۔ زور صاحب خندہ پیشانی سے ان سب سے ملتے۔ جوں ہی آنے والے پر نظر پڑتی جملہ چُست کر دیتے۔ زور صاحب کے ساتھیوں میں سے اکثر اور ہم طالب علم سب بلا کے حاضر جواب تھے۔ ہم بھی کوئی نہ کوئی وار کر ہی دیتے۔ مجھے یاد نہیں کہ کبھی زور صاحب نے کسی کے وار پر ناراضگی کا اظہار کیا ہو۔ انہیں دوایک حد سے زیادہ متین بھی تھے اور ان کی متانت ہماری تفریح طبع کا سامان فراہم کرتی تھی۔ غرض زور صاحب کو کہنے سننے میں بڑا مزا آتا تھا۔ یہ محفلیں ایک بجے کے قریب دم توڑتیں۔ واپسی میں ہم میں سے کوئی نہ کوئی ان کے ساتھ ضرور ہوتا۔ وہ کالج سے نکل کر دارالطبع پہنچتے وہاں کاتب کو مسودات دیتے اور جو کاپیاں لکھی جا چکی ہوتیں انکو ساتھ لیتے اور گھر کا رخ کرتے۔ چند دن ایسے بھی گزرے جبکہ زور صاحب دوپہر کا کھانا کالج ہی پر کھاتے تھے۔ ان کا یہ کھانا بہت مختصر تھا۔ اس پر طرفہ تماشہ یہ کہ وہ کسی نہ کسی کو اپنے ساتھ شریک کر لیتے تھے۔ اگر کوئی اُن کی اس مختصر سی غذا پر جملہ چُست کرتا تو کہتے "خوردن برائے زیستن و ذکر کردن است"۔

میں ابھی سال اول ہی میں تھا۔ ایک روز سر شام حسب معمول ان کے مکان تہنیت منزل پہنچا۔ زور صاحب کتابوں کے ذخیرے کو صاف کروا رہے تھے۔ مجھے دیکھتے ہی کہنے لگے "مبارک باشد مبارک" میں حیران تھا کہ یہ ماجرا کیا ہے۔ میں نے وجہ پوچھی! کہا کہ مہاراجہ کشن پرشاد پر میرے مقالہ کو پہلا انعام دیا گیا ہے۔ میں مسکرا کر خاموش ہو گیا۔ زور صاحب نے مجھے بغور دیکھا گویا میری نفسیاتی کیفیت کا مطالعہ کر رہے ہوں۔ کہنے لگے انعام اول اسلئے ملا ہے کہ مضمون اچھا لکھا ہے۔ میں خاموش زور صاحب کی طرف دیکھتا رہا۔ زور صاحب نے کہا میں اس لئے یہ واضح کر دینا چاہتا ہوں کہ کہیں آپ کو یہ خیال نہ گزرے کہ دوستی اور تعلقات انعام دلاتے ہیں۔ انعام لیاقت اور محنت کا نتیجہ ہوتا ہے۔ میں پھر بھی خاموش ہو گیا وہ ایک شیر کی طرح گرج کر کہنے لگے۔ کچھ سمجھے بھی آپ مولانا!! میں نے کہا آپ کہتے رہے میں سنتا رہا۔ زور صاحب نے بڑے زور کا قہقہہ لگایا اور کہا کہ اجی مولانا۔ میں آپ سے کچھ سننا بھی چاہتا ہوں۔ یہ ان کی طبیعت کی افتاد تھی۔ وہ اپنے جذبات و احساسات کو بالکل چھپا نہیں سکتے تھے۔ رنج و خوشی کے احساسات اُن کے چہرے کے اُتار چڑھاؤ سے غمازی کرنے لگتے تھے۔ غصہ میں اکثر وہ بے قابو ہو جاتے اور ہمیشہ یہ چاہتے تھے کہ کوئی نہ کوئی اُن کو اس حالت میں سہارا دے۔ اگر یہ نہ ہوتا تو وہ بے چین ہو جاتے اُن کا غصہ جتنی جلدی آتا اتنی ہی جلدی دفع بھی ہو جاتا تھا۔ ابھی کسی پر برس رہے تھے ابھی قہقہے بلند ہونے لگے۔ ایک روز کا ذکر ہے کچھ کتابیں میز پر رکھی تھیں۔ زور صاحب میری کتاب کا مسودہ پڑھ رہے تھے۔ پڑھتے پڑھتے مسودہ کتابوں کے

نیچے دبا دیا اور کسی طرف کو چل دیئے۔ واپس ہوئے تو مسودہ نہ ملا۔ اِدھر اُدھر دیکھا نہ پایا۔ اب کیا تھا برسنے لگے۔ کتا
درمیان کا غذات صاف دکھائی دے رہے تھے۔ میں نے آگے بڑھ کر مسودہ نکال کر سامنے رکھ دیا۔ دیکھا وہی تھ
جس کی وہ تلاش کر رہے تھے۔ برہمی پہلے ہی کافور ہو چکی تھی۔ وہ بہانہ ہی ڈھونڈ رہے تھے کہ گفتگو کا رخ اور ط
ڈالیں۔ یہ مسودہ کیا ملا گویا ان کو بہانہ ہاتھ آ گیا۔ ایک قہقہہ بلند ہوا اور بات آئی گئی ہو گئی۔ یہ ان کی طبیعت
رنگ تھا۔ وہ بہت جلد متاثر ہوتے تھے۔ لیکن اس کے باوجود غضب کا ہمت و حوصلہ رکھتے تھے ان کی ط
اس افتاد اور ان کے عزم و ارادے کی اٹھان میں تضاد تھا۔ اور اسی تضاد نے ان کے قواء میں وقت سے
اضمحلال پیدا کر دیا تھا۔ وہ ایک بہت ہی حساس دل رکھتے تھے۔ مخالفت کا ان پر بجلی کی طرح اثر ہوتا تھا
وہ اپنے عزائم اور ارادوں کے سہارے اس کو پی جاتے تھے۔ اور رفتہ رفتہ ان احساسات و جذبات پر
تھے۔ میرا اپنا خیال ہے کہ وہ وقت سے پہلے مرے اور ان کی قبل از وقت موت کا سبب بھی یہی تھا۔

(۳)

ڈاکٹر زور کی زندگی اور اُن کے علمی و ادبی کارناموں کو ہم پانچ حصوں میں تقسیم کر سکتے ہیں۔ طالب علمی کا زمانہ
وقت ختم ہوا جب کہ زور صاحب یورپ سے ڈاکٹریٹ کر کے واپس ہوئے اور جامعہ عثمانیہ سے وابستہ ہو گئے۔ ا
مطالعہ میں چند باتوں کا خیال رکھنا چاہئے۔ ڈاکٹر زور مشائخ خاندان کے فرد تھے۔ اُن کے والد اپنے مواعظ کی
مشہور تھے۔ یہ بڑے محنتی طالب علم تھے۔ انھوں نے بڑی محنت اور جانفشانی سے تعلیم حاصل کی تھی۔ یہ زمانہ وہ
حیدرآباد میں جامعہ عثمانیہ کے قیام کی وجہ سے علمی بیداری پیدا ہو رہی تھی۔ اُن کو وحید الدین سلیم جیسا یگانہ رو
مل گیا تھا۔ انھوں نے اسی دور میں مضامین لکھنا شروع کئے۔ اس زمانہ میں مکتبۂ ابراہیمیہ کو حیدرآباد میں علم
مرکز خیال کرنا چاہئے۔ ابتدا میں ڈاکٹر زور کی تحریری مشق بھی اسی ادارہ سے شروع ہوئی۔ بہت جلد ڈاکٹر
روح تنقید لکھ کر اپنے مرتبہ کو بلند کر لیا۔ یہ کتاب اس موضوع پر پہلی کتاب تھی۔ اور اس موضوع کی انگریزی کتابو
استفادہ کیا تھا۔ استادوں کی ہمت افزائی اور ان کی محنت نے ان کو اپنے ساتھیوں میں ممتاز کر دیا۔ اسی
رفعت یار جنگ اور سر نظامت جنگ سے بھی ملے۔ سر نظامت جنگ کو حیدرآباد کی علمی زندگی میں بڑی اہم
تھی وہ سیاسی اقتدار بھی رکھتے تھے۔ انگریزوں سے اُن کے تعلقات بہت اچھے تھے۔ یورپین وظیفہ کی کمیٹی
تھے غالباً صدر تھے۔ اس خاندان کو حیدرآباد میں دکھنی تحریک کا محرک کہنا چاہئے۔ یہی وہ اسباب ہوئے
کو بہت جلد اس خاندان سے قرب حاصل ہو گیا۔ زور صاحب کی محنت اور اس خاندان کی سرپرستی نے ا
مواقع فراہم کر دئے۔ وہ یورپ کا وظیفہ پا کر اعلیٰ تعلیم کے لئے یورپ چلے گئے۔ جب واپس ہوئے تو اُن کو
ریڈر کی خدمت پر مامور کیا گیا۔ فیلالوجی کا شعبہ قائم نہیں ہوا تھا۔ ورنہ کوشش تو یہ ہوئی تھی کہ ایک فیلا
قائم کیا جاتا اور اُن کو فیلالوجی کا پروفیسر مقرر کیا جاتا۔ لیکن یہ نہ ہو سکا اور آخر تک اردو کے شعبہ ہی
اس دور میں انھوں نے بے شمار مضامین مقالے اور نئے نئے موضوعات پر کتابیں لکھیں۔ ان میں
افسانے، لسانی اور صوتیاتی مسائل پر کتابیں شامل ہیں۔ لیکن اُن کی یہ دلچسپی زیادہ دنوں تک قائم نہ

انھیں دکھنی موضوع اور خاص کر گولکنڈہ کی طرف متوجہ ہو جانا پڑا۔ اور ان ہی اسباب نے اُن کو ایک طرح منفرد بھی بنا دیا اور ایک دوسرے نقطۂ نظر سے اُن کے میدان کو تنگ بھی کر دیا۔

(۴)

اُن کی زندگی کا دوسرا دور ادارۂ ادبیات اردو کے قیام سے شروع ہوا۔ ادارۂ ادبیات اردو در اصل دکھنی تحریک کا مرکز بننے والا تھا۔ اس مسئلہ کو زیادہ وضاحت سے سمجھنے کے لئے یہ ضروری ہے کہ دکھنی تحریک کے خد و خال سے واقفیت پیدا کی جائے۔ جب محمد بن تغلق بادشاہ نے اپنی سلطنت کا مرکز دولت آباد بنالیا تو اس نے اپنے ساتھ منتخب امیر اور سپاہی صوفی، شاعر اور اہل حرفہ لئے تاکہ اس نئے شہر کو اپنی نئی امیدوں اور آرزوں کا مرکز بنا سکے۔ اس نے علما کو اور خاص طور پر ان علما کو جو اس ملک ہندی خیالات کی مخالفت کرتے تھے دلی ہی میں چھوڑ دیا۔ وہ چاہتا تھا کہ ہندی قومیت اور شہنشاہیت کا ایک ایسا تصور پیدا کیا جائے جس سے اس کی سلطنت اور حکومت کی پشت پناہی ہو سکے۔ اس مقصد میں یہ خود کامیاب نہ ہو سکا۔ کیونکہ ۱۳۵۱ء میں اس کا سندھ میں بہت جلد انتقال ہو گیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اس کے سرداروں نے جو امیران صدہ کہلاتے دکن میں اس کے ہندی اور شہنشاہی منصوبوں کے خلاف ایک نئی سلطنت بہمنیہ کی داغ بیل ڈالی۔ وہ سب لوگ جو اس جماعت کے ساتھ دکن آئے تھے اور مخالفانہ جذبات سے ملو تھے دکھنی کہلانے لگے۔ اس کے بعد جو نو وارد ایرانی و ترکی دکن میں آنے لگے وہ آفاقی کہلاتے تھے۔ ایک تیسرا فریق حبشیوں کا تھا۔ چنانچہ دکھن کی سلطنتوں کے عروج و زوال کی داستانیں در اصل ان تینوں گروہوں کے تصادم، چشمک اور آویزش پر مشتمل ہیں۔ زور صاحب کے اجداد بھی کہتے ہیں کہ صوفیوں اور مشائخوں کے اس گروہ میں شامل تھے۔ جو اپنے آپ کو دکھنی کہتے تھے۔ زور صاحب کے جب رفعت یار جنگ اور سر نظامت جنگ سے تعلقات بڑھے تو ان پر دکھنیت کا رنگ بھی چڑھ گیا۔ انھوں نے ادارۂ ادبیات اردو کی بنیاد رکھی۔ اس ادارہ کی حیثیت در اصل اس وقت کی اردو دنیا میں ایسی ہی تھی جیسے ایک باغی آزاد سلطنت کی ہوتی ہے۔ کیونکہ اس وقت کی اردو دنیا پر مولوی عبدالحق کی عملداری قائم تھی۔ یہ ناممکن تھا کہ کوئی اور اس عملداری کے خلاف بغاوت کر سکے۔ مولوی عبدالحق صاحب کو کل ہند حیثیت حاصل تھی۔ مہاراجہ سر کشن پرشاد اور سر اکبر جیسے با اثر اور با اقتدار وزرا ان کا دل سے احترام کرتے تھے۔ وہ انجمن ترقی اردو کے معتمد تھے۔ علی گڈھ یونیورسٹی کے اولڈ بوائے تھے۔ علی گڈھ کے تعلیم یافتہ اصحاب ملک میں با اقتدار تھے۔ ان حالات میں مولوی عبدالحق صاحب کی مخالفت کسی کے بس کی بات نہ تھی۔ لیکن ڈاکٹر زور اس بات کو خوب سمجھے ہوئے تھے کہ مولوی عبدالحق صاحب سے ان کا اشتراک عمل نہیں ہو سکتا۔ دونوں کی طبیعتوں کی افتاد جداگانہ تھی۔ دونوں قوی شخصیتوں اور کرداروں کے مالک تھے۔ سر نظامت جنگ کی وجہ سے زور صاحب میں خود اعتمادی پیدا ہو چکی تھی۔ زور صاحب نے انھیں حالات میں ادارۂ ادبیات اُردو کی بنیاد رکھی اور چند دکھنی ساتھیوں کو اس کام میں شریک کر لیا۔ ان کے رفیقوں میں عبدالقادر صدیقی۔ عبدالمجید صدیقی عبدالقادر سروری اور نصیر الدین ہاشمی وغیرہ شامل تھے۔ واقعی ان نوجوانوں کا یہ بڑا ہی حوصلہ مندانہ اقدام تھا۔ اس میں بغاوت کے آثار بھی تھے اور اپنے آپ کو پانے کی جستجو اور دھن بھی۔ دکھن کے اُمرا دولت و ثروت کے نشہ میں بدمست آنے والے انقلاب سے غافل اپنی رنگ رلیوں میں وقت گزارتے تھے۔ دوسری طرف شمالی ہند کے بیشمار افراد

اپنی قابلیت اور تجربہ کی بدولت ملک کی اعلیٰ خدمات پر فائز تھے۔ ان کا دربار اور رزیڈنسی میں بڑا عمل دخل تھا۔ جا کے تقریباً سب پروفیسر شمالی ہند سے بلائے گئے تھے لیکن ان کے اوپر پروفیسر عبدالرحمٰن خاں پرنسپل کی خدمت پر فائز دکھنی تحریک کے علمبردار تھے۔ ادارہ اس تحریک کا مرکز بن گیا اور ڈاکٹر زور نے ادارۂ ادبیات اردو قائم کر کے گو جماعت کے لئے نہ صرف کام کرنے کا بہانہ نکال لیا بلکہ اس تحریک کے لئے ایک مرکز بھی فراہم کر دیا۔

ڈاکٹر زور نے ادارۂ ادبیات اردو کی تنظیم میں اس بات کا خاص خیال رکھا کہ اس قلعہ کی اندرونی فصیل اور نوجوانوں سے بنائی جائے جو ٹھیٹ دکھنی تھے۔ اور جامعہ عثمانیہ سے تعلیم پا کر نئے حوصلوں کے ساتھ نکل رہے۔ زور صاحب نے اس بات کا بھی خیال رکھا کہ ایسی بزرگ ہستیاں بھی فراہم ہوں جن کی مولوی عبدالحق صاحب سے تھی۔ مولوی عبدالحق صاحب اپنے قول و فعل کی شدت کے سبب لوگوں کو بہت جلد مخالف بھی بنا لیتے تھے۔ زور صا ان مخالف افراد سے کام لیا اور ان سے ادارۂ ادبیات اردو کی دوسری فصیل تیار کی۔ اس ادارے کی تعمیر دوسرا مقصد یہ تھا کہ دکھنی ذہنوں سے احساس کمتری مٹائیں اور ان میں خود اعتمادی پیدا کریں ــــ یہی ا خود شناسی کا زمانہ بھی ہے۔ اسی خود شناسی کے بل بوتے پر وہ اپنے کارناموں کے ایوان کھڑے کرنا چاہتے تھے۔ انھوں نے چن چن کر دکھنی ادیبوں اور شاعروں کو منظر عام پر لانا شروع کیا۔ اس طرح وہ اپنی ذات میں اور اپنے کے سبو میں خود اعتمادی کی شراب بھرنے کی کوشش کرنے لگے۔ جب یہ سبو تخلیق کی شراب سے چھلکنے لگے تو ان کو عا میں زور صاحب نے بڑی بے باکی اور جرأت سے کام لیا۔ اور ان کی نشر و اشاعت کے فن کو اس ہنرمندی سے انجام د ہی عرصہ میں ان کا لگایا ہوا یہ پودا ایک درخت کی صورت میں نمودار ہو گیا۔

اس کامیابی کے باوجود زور صاحب کی شخصیت اور تحریک خود اعتمادی مولوی عبدالحق صاحب کی سیادت پر اثر ا نہ ہو سکی۔ ہاں یہ صحیح ہے کہ وہ رفتہ رفتہ اپنا اثر اور نفوذ ضرور بڑھاتے رہے۔ لیکن مقابلہ بہت سخت تھا۔ اس صور کی وجہ سے ڈاکٹر زور نے ایک منزل پر اپنے ادارہ کے کاموں کی راہیں بدل دیں اور انجمن ترقی اردو سے کسی حد تک کر لیں۔ یعنے تحقیقی کام کا آغاز کر دیا اور خاص طور پر دکھنی ادب کی تحقیق پر توجہ مرکوز کر لی۔ اس طرح انھوں نے ادبیات اردو کو ایک تحقیقی ادارہ بنا کر اس کی انفرادیت کو منوانے کی صورت بھی پیدا کر دی۔ جب انجمن ترقیٔ اردو ہندی کے جھگڑے میں الجھ پڑا اور انجمن کا دفتر دلی منتقل کیا گیا تو ادارۂ ادبیات اردو کو زیادہ اہمیت حا لیکن مولوی صاحب کا اثر باقی رہا اور انجمن ترقی اردو کا کام برابر جاری رہا۔ ڈاکٹر محی الدین انجمن ترقی اردو کے معتمد گئے جو ڈاکٹر زور کے مدمقابل تھے۔ اس نوبت پر ڈاکٹر زور نے اس بات کی مخالفت کی تھی کہ انجمن کا دفتر دلی کیا جائے۔

مولوی عبدالحق صاحب کو ان حالات میں کل ہند سطح پر معرکہ آرائی کرنی تھی۔ کہنے کو تو مولوی عبدالحق دلی منتقل تھے لیکن اُن کے حلیف و مددگار بڑی تعداد میں حیدرآباد میں موجود تھے اور انجمن ترقی اردو کی قیادت کھونے کے لئے نہ تھے اور اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ زور صاحب اس تبدیلی کے بعد بھی اپنی عملداری کی توسیع نہ کر سکے۔ چنانچہ حیدرآباد دنیا دو عملداریوں میں بٹ گئی تھی۔ اس کشمکش حیات میں وہ کبھو کبھار بقائے باہم کے اصول پر اتر آتے تھے۔ اور ایک دو

دکو تسلیم بھی کرنے لگے تھے۔ بلکہ ایک دوسرے کی تقریبوں میں شریک بھی ہونے لگے تھے۔ جب اعظم یار جنگ ناظم تعلیمات ، انجمن ترقی اردو کی درسی کتابوں کی جگہ نئی کتابیں مرتب ہوئیں تو اس میں ان دونوں سلطنتوں کے نمائندوں نے برابر صہ لیا۔ اس سے اتنا ضرور ہوا کہ بری یا بھلی ایک تبدیلی ضرور ہوئی اور اس طرح ادارۂ ادبیات اردو نے اپنے اثرو ؛ کو ایک اور سمت میں آگے کی طرف بڑھا دیا۔

ڈاکٹر زور کی تصانیف کا بھی اتفاق سے یہ دوسرا دور تھا۔ ابتدائی تنقیدی مقالوں کے بعد ڈاکٹر زور اب اردو ن' ادب اور تنقید کے نئے نئے موضوعات پر قلم اٹھا رہے تھے۔ جب ادارۂ ادبیات اردو قائم ہوا تو ان کو اپنے مقصد ؛ال کرنے کی غرض سے بہت جلد دکھنی ادب کی طرف توجہ کرنی پڑی۔ انھوں نے اس دور میں دکھن کے بیشمار شاعروں کے ؛ات شائع کئے۔ اس عہد کی ادبی کاوشوں کی سب سے زیادہ خصوصیت یہ ہے کہ وہ ایک خاص موضوع کی طرف رخ پلٹ ۔ اور وہ تاریخ وتمدن گولکنڈے کا موضوع تھا۔ اس سے پہلے بھی ڈاکٹر زور نے گولکنڈہ کے افسانے لکھے تھے اور اس طرح ؛نیم تاریخی افسانوں کا ذخیرہ جمع کر لیا تھا۔ جو دکھنی قومیت کے جذبات ابھارنے میں بھی کام آسکتا تھا۔ ان افسانوں پڑھنے سے یہ بات واضح ہوجاتی ہے کہ زور صاحب نے دکھنی قومیت کے جذبات ان میں بڑی کامیابی سے سموئے ،۔ دکھنی قومیت کے جن تصورات کو ان ادبی کاوشوں میں پیش کیا ہے۔ یہ بجائے خود ایک بہت ہی دلچسپ نوع ہے۔ لیکن اس کے اظہار کا یہاں موقعہ نہیں ہے۔

اسی دور میں ڈاکٹر زور صاحب کے سرسالار جنگ سے تعلقات پیدا ہوگئے۔ زور صاحب نے سالار جنگ کو ؛یب دی کہ دکھنی مخطوطات کو شائع کرنے کا انتظام کریں۔ چنانچہ نواب صاحب کی سرپرستی سے ایک نیا ادارہ دکھنی وطات کی اشاعت کے لئے قائم ہوگیا۔ اور اس ادارے سے مختلف مخطوطات شائع بھی ہوئے۔ ڈاکٹر زور یہ خوب نتے تھے کہ سالار جنگ کے یہاں دکھنی مخطوطات کا اچھا ذخیرہ محفوظ ہے۔ اور جب تک اُن کی دلجوئی نہ کی جائے ؛ ملنے گا۔ نواب سالار جنگ بھی صاحب ذوق انسان تھے۔ اصل ونقل کو خوب پہچانتے تھے مگر اُن کا سوادِ علم کم تھا۔ ؛ک ان کے ملازم اور کارندے تھے اُن سے یہ کام نہیں ہوسکتا تھا۔ اس لئے زور صاحب نے اپنے شرکائے کار کیا تھ ، کام کی پہل کردی۔

مولوی عبدالحق صاحب نے محمد قلی قطب شاہ کے دیوان پر ایک مقالہ اردو میں شائع کیا تھا۔ موصوف نے مجھے اس موں میں ایک خط میں لکھا تھا۔ "میں پہلا شخص ہوں جس نے دنیا کو محمد قلی قطب شاہ کے کلام سے روشناس کیا اور اس کے ؛ال لکھا۔ مگر محمد قلی کی یاد منانے والوں نے اس خصوص میں کہیں میرا ذکر نہیں کیا۔ یہ کوئی نئی بات نہیں ہے۔ اسلئے ؛اس کی مطلق شکایت بھی نہیں ہے۔ ان حضرات کو ابھی تک محمد قلی قطب شاہ کا اصل کلام دستیاب نہیں ہوا۔ ؛کا مستند کلیات جس پر اس کے جانشین قطب شاہ کی مہر اور دستخط اور اس کا منظوم دیباچہ اور مغل بادشاہوں کی ریاتیں اب غائب ہے۔" یہ سچ ہے کہ اس کام کی ابتداء دراصل مولوی عبدالحق صاحب نے کی تھی لیکن اس کام کی ؛یل ڈاکٹر زور کے ہاتھوں ہوئی۔ وہ عمر بھر اسی کام کو کرتے رہے۔

میں جس زمانہ میں یونیورسٹی میں پڑھ رہا تھا ڈاکٹر زور قلی قطب شاہ کے کلیات کی اشاعت میں منہمک تھے۔

اس کے فوری بعد انھوں نے محمد قلی قطب شاہ کی زندگی پر ایک مبسوط کتاب لکھی اور اس کے چند روز بعد اس کے وزیر اعظم (پیشوا) میر مومن کے حیات و حالات پر دوسری کتاب شائع کی اس دوران میں اکثر ان سے قطب شاہی بادشاہوں ان کے کارناموں اور حالات پر میری گفتگو ہوتی رہتی تھی۔ وہ تاریخ ہند پر وسیع انداز پر غور نہیں کرتے تھے۔ وہ صرف قطب شاہی تاریخ میں کھوئے گئے تھے۔ وہ اس تاریخ کے اتنے دلدادہ تھے کہ قطب شاہوں کی تباہی کی ساری ذمہ داری مغلوں کے سر تھوپتے اور جب کبھی اس موضوع پر گفتگو کرتے تو ان کے احساسات اور ان کے دلی لگاؤ کا اندازہ ہو جاتا تھا۔ ان کا کہنا تھا کہ یورپ کے زمانہ قیام میں انھوں نے قطب شاہیوں کے متعلق بہت کچھ مواد اکٹھا کر لیا تھا۔ وہ کلیات کے مرتب ہو جانے کے بعد "حیات قلی" کو بڑی برق رفتاری سے لکھتے جاتے تھے جو لوگ ان کے کاموں سے واقف نہیں ہیں ان کو اس بات کا گمان ہو سکتا ہے کہ وہ تحقیق اور تفتیش میں زیادہ محنت نہیں کرتے تھے۔ یہ سچ ہے کہ ان کا ماخذ چند تاریخی مخطوطات تھے۔ وہ مورخ نہیں تھے بلکہ ادیب تھے۔ چنانچہ اس کتاب میں انھوں نے محمد قلی قطب شاہ کی زندگی کے حالات صرف اس کی شاعری سے اخذ کئے ہیں۔ اور اس لحاظ سے یہ کتاب بڑی اہمیت کی حامل ہے۔ ہر روز مسودے ایک ناسی کاغذ میں لپیٹے ہوئے لاتے اور کالج سے واپسی پر دارالطبع میں کاتب کے حوالے کرتے۔ جو کاپیاں لکھی جاتی تھیں وہ اپنے ساتھ لے جاتے۔ چلتے چلتے موٹر میں باتیں بھی کرتے اور کاپیوں پر نظر بھی دوڑاتے جاتے۔ پنسل سے تصحیح بھی کرتے تھے۔ ادھر ادھر لکیریں کھینچتے اور گھر پہنچتے پہنچتے کام پورا کرتے تھے۔ اور جو کام باقی رہ جاتا اس کو شام کی نشست میں پورا کر لیتے تھے۔ ان کا سب کام اسی ڈھنگ سے سرانجام پاتا تھا۔

وہ گولکنڈہ کے آثار قدیمہ کے بڑے دلدادہ تھے۔ وہ ان کی تلاش و جستجو میں اپنی زندگی کا ایک حصہ صرف کر چکے تھے۔ جہاں تک گولکنڈہ کا تعلق ہے ڈاکٹر زور کو اس کی بابت بہت سی دلچسپ معلومات حاصل تھیں۔ ان معلومات میں تاریخی، نیم تاریخی اور افسانوی سب واقعات شامل تھے۔ اگر ان کو یہ معلوم ہو جاتا کہ کوئی شخص کسی بادشاہ یا کسی تاریخی واقعہ یا شخصیت کے بارے میں کچھ جانتا ہے تو اس سے ملنے کی کوئی نہ کوئی صورت نکالتے تھے۔ خاندانی روایات جو سینہ بہ سینہ چلی آتی ہیں ان کو سن کر محفوظ کر لیتے۔ گولکنڈہ پر جو کچھ لکھا ہے اس میں تاریخ، روایت، ادب اور افسانے کو اس طرح سمویا ہے کہ گویا حقیقت اور افسانے میں کوئی فرق باقی نہیں رہا۔ انھوں نے گولکنڈہ سے متعلق جو افسانے لکھے ہیں ان سب میں یہی عناصر شامل ہیں۔ اور ان ہی عناصر سے انھوں نے دکھنی قومیت کا خمیر تیار کیا تھا۔

ڈاکٹر زور نے گولکنڈہ پر اس قدر محویت اور انہماک سے کام کیا تھا کہ لوگ ان کے مذہبی عقائد کے بارے میں خوش فہمی یا بدگمانی میں مبتلا ہو گئے تھے۔ وہ خود بھی اس سے لطف لیتے تھے۔ زور نہ ہوتے تو یقیناً گولکنڈہ پر اس انہماک اور دلچسپی سے کام کرنے والا مشکل سے ملتا۔ البتہ ڈاکٹر زور کے کاموں کا نقص یہ تھا کہ اگر وہ گہرائی میں جاتے تو وسعت کھو بیٹھتے اور اگر وسعت کا دامن تھامتے تو گہرائی کھو بیٹھتے۔ لیکن جو کچھ انھوں نے کیا وہ غنیمت اور بیمثال ہے اور آئندہ کام کرنے والوں کے لئے تادیر رہنمائی کا کام دیگا۔

اس دور میں ڈاکٹر زور کے بے شمار ساتھی زندہ تھے۔ ان میں سے اکثر وہ تھے جن کو مسابقت کے میدان میں

شکست کھانی پڑی تھی۔ وہ شکست کھاکر خاموش ہوگئے تھے۔ لیکن زور صاحب کے بارے میں غلط باتیں پھیلاتے تھے۔ غیر تو خیر غیر تھے لیکن ان کے ساتھی اور دوست بھی ان پر پھبتیاں کستے تھے۔ ان کے کاموں پر اعتراض کرتے تھے اور اپنی تنقید اور تنقیص سے ان کے احساسات مجروح کرتے تھے۔ زور صاحب پر ان باتوں کا اثر ضرور ہوتا تھا۔ لیکن یہ مخالفتیں رفتہ رفتہ ہٹتی گئیں اور وہ بالآخر ایک بزرگ ہستی کی حیثیت سے حیدرآباد کے آسمان ادب پر جگمگانے لگے۔ یہ اس وقت ہوا جب کہ ان کے قوا میں اضمحلال آچکا تھا۔

یورپ سے آنے کے بعد ڈاکٹر زور جامعہ عثمانیہ سے وابستہ ہوگئے تھے۔ ان کا ابتدائی تقرر شعبہ اردو میں ریڈر رہا تھا۔ مولانا وحیدالدین کے بعد مولوی عبدالحق صاحب شعبہ اردو کی صدارت پر فائز ہوئے۔ مولوی صاحب کی موجودگی میں زور صاحب یہ توقع نہیں کرسکتے تھے کہ اُن کو صدارت کا منصب ملتا۔ مولوی عبدالحق اس قید سے آزاد ہوکر اردو ادب کی خدمت کرنا چاہتے تھے۔ اس لئے انھوں نے صدارت شعبہ سے سبکدوشی اختیار کی لیکن اس کے بعد اس منصب کے ایک اور دعویدار پیدا ہوگئے۔ وہ سجاد صاحب تھے۔ آخر الذکر زور صاحب کے مقابلہ میں زیادہ عرصہ سے ملازم تھے۔ لیکن ان کا ابتدائی تقرر لکچراری پر ہوا تھا۔ جب زور صاحب یورپ سے واپس آئے تو اُن کو ریڈر کا درجہ دیا گیا۔ اس لئے گریڈ کے اعتبار سے زور صاحب سینیر قرار پاتے تھے لیکن سجاد صاحب کی موجودگی میں ان کو عہدہ صدارت نہیں مل سکا۔ بالآخر صدارت کی کرسی ان دونوں میں تقسیم ہوگئی۔ زور صاحب صدارت پر اُس وقت فائز ہوئے جب سجاد صاحب وظیفہ پر علحدہ ہوگئے۔ ان دونوں میں بھی شدید اختلافات تھے کیونکہ طبائع مختلف تھے۔ اس شعبہ میں عبدالقیوم خاں باقی مرحوم بھی تھے۔ چونکہ یہ اپنے طرز ادا اور مزاج کے اعتبار سے منفرد واقع ہوئے تھے اس لئے وہ بھی زور صاحب کے ہم کار نہ بن سکے یہ صحیح معنوں میں آرٹسٹ تھے لیکن آرٹسٹ کی طرح بے انتہا بے عمل اور لاابالی انسان تھے۔

(۵)

ڈاکٹر زور کی زندگی کا تیسرا دور اس وقت شروع ہوا جب سر اکبر حیدری نے ادارۂ ادبیات اُردو کا معائنہ کیا۔ اور ادارہ کی سرپرستی اور مالی اعانت کی۔ اس وقت تک ادارہ کو جو مالی امداد ملتی تھی وہ قابل لحاظ تھی سر اکبر نے اس امداد کو بہت بڑھادیا۔ اور خود ذاتی طور پر اُن کے کاموں میں دلچسپی لینے لگے۔ جب مالیہ کا انتظام ہوا تو ادارہ کے کاموں کو وسعت دینے کا مسئلہ بھی پیش ہوا۔ یہی وہ دور ہے جب کہ ادارہ کے ذریعہ اردو امتحانات کا سارے ملک میں ایک جال سا بچھا دیا۔ حمیدالدین شاہد اور میں نے سارے ملک کا دورہ کیا۔ گرمی، بارش کی پروا کئے بغیر چھوٹے چھوٹے دیہاتوں میں پہنچکر ادارہ کی شاخیں قائم کیں۔ شبینہ مدارس میں تعلیم بالغان کا انتظام کیا اور دیکھتے ہی دیکھتے یہ تحریک سارے ملک میں پھیل گئی۔ جلسہ تقسیم اسناد ہوا تو کامیاب امیدواروں کو سر اکبر اور اعظم جاہ نے اپنے ہاتھوں سے اسناد تقسیم کئے۔ میں نے تمام ملک کے حالات کا جائزہ لے کر تعلیم بالغان پر مبسوط رپورٹ لکھی تاکہ ادارہ آئندہ اپنا کام ان ہی خطوط پر زیادہ بہتر اور منظم طریقے سے چلاسکے۔ اسی دور میں اردو انسائیکلو پیڈیا کی تحریک بھی ہوئی اور بڑے پیمانہ پر کام شروع کیا گیا۔ اضلاع کی شاخوں کی ایک

خصوصیت یہ بھی تھی کہ اس میں کام کرنے والوں میں ہندو مسلمان برابر کے شریک تھے بلکہ اکثر دیہاتوں میں
کرنے والوں میں ہندو بھی پیش پیش تھے ۔ ڈاکٹر زور کی یہ حالت تھی کہ جو لوگ ان کو مشورہ دیتے تھے او
کو مفید اور حسب حال پاتے تو مشورہ دینے والے کے سر ہو جاتے تھے ۔ وہ سوچنے اور عمل کرنے میں زیادہ
کرتے تھے ۔ ادھر بات زبان سے نکلی اُدھر انھوں نے اس پر عمل کرنا شروع کر دیا ۔ یہ سچ ہے اُن کی اس
کی وجہ سے کام میں بہت سی کوتاہیاں رہ جاتی تھیں ۔ لیکن اس حقیقت کو بھی تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ
روایتی کاہلی کو مٹانے اور توڑنے کی عمر بھر کوشش کرتے رہے ۔ جب ادارہ ادبیات اردو کی داغ
ساتھ ایک ایسی جماعت تیار کرلی اور نئے نئے کاموں کی سبیلیں پیدا کیں ۔ ادارہ کے تمام کاموں
کو ایک مرکزی حیثیت حاصل تھی ۔ آخری زمانہ میں یہ ضرور ہوا کہ ادارہ کی مرکزی جماعت کمزور ہو
ایسے ناخوشگوار حالات پیدا ہوگئے کہ سروری صاحب اور زور صاحب میں ٹھن گئی ۔ پروفیسر عبدالمجید صدیقی اور بعض
کی کوشش کی کہ یہ اختلافات ختم ہو جائیں ۔ ان کی شدت میں کچھ کمی ضرور ہوئی لیکن وہ بے عیب
برسوں سے قائم تھی پھر اُبھر نہ سکی ۔

ادارہ کو اپنی ترقی کی آخری منزل پر پہنچے ابھی چند دن بھی نہ گزرے تھے کہ ملک میں سیاسی ا
انقلاب کے دوران میں ڈاکٹر زور صاحب پر ایک سکتے کا سا عالم طاری ہوگیا تھا ۔ اور جب میں ۳
سے واپس آیا تو مجھے بہت جلد یہ محسوس ہوا کہ زور صاحب اپنی دلی پژمردگی اور مایوسی کو اپنے قہقہ
ہیں ۔ وہ خود یہ نہیں جانتے تھے کہ ادارے کا انجام کیا ہوگا ۔ میں ایک دن سر شام اُن کے ہاں
باغ میں اِدھر اُدھر ٹہل رہے تھے ۔ اُن کے چہرے سے کرب و اضطراب کی حالت نمایاں تھی ۔ میں
کسی خاص واقعہ سے متاثر ہیں ۔ رسمی گفتگو کے بعد انھوں نے ادارے کا مسئلہ چھیڑ دیا اور ادارے
عمارت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے جس میں اُن کے عمر بھر کی محنت کا سرمایہ تھا کہنے لگے "کیا معلوم
کی محنت کے اِس ذخیرہ کا کیا انجام ہوگا" میں نے کہا زور صاحب آپ پر نئے حالات کا زیادہ ا
سچ تو یہ ہے کہ اس زمانہ میں سارے حیدرآباد پر مایوسی کی گھٹائیں چھائی ہوئی تھیں ۔ میں نے کہا
ہو تو کیوں نہ ایسی تقریبیں رچائی جائیں جن کی گہما گہمی میں آپ اپنی دلی پژمردگی کو بہلا سکیں اور ا
ہمت کو سہارا مل جائے ۔ چنانچہ میرے کہنے کے بعد ادارہ ادبیات اردو نے مختلف تقریبیں ت
اردو کانفرنسوں اور کانگرسوں کا انعقاد ہوا ۔ ہندوستان کے مشہور اور نامور ادیب بلائے
کے اہتمام میں "شام غزل" جیسی شہری تقریب نے ماضی کی یاد تازہ کردی ۔ یہ تقریبیں ایسی کامیاب ہوئیں کہ
مایوسی اور حسرت کا اثر رفتہ رفتہ زائل ہوگیا ۔ زور صاحب کی خود اعتمادی پھر تازہ ہوگئی ۔ اسی
ادبیات اردو کی سلور جوبلی اور امجد صاحب کی ڈائمنڈ جوبلی کی تقریبیں منعقد ہوئیں ۔ اس طرح انقا
صاحبانِ اقتدار کو ادارے کی سرگرمیوں سے واقف کرانے کا موقع مل گیا ۔ ڈاکٹر زور کے امجد صاحب
مراسم تھے اور وہ ایک دوسرے سے بہت محبت رکھتے تھے ۔ زور، امجد کو اُن کی زندگی میں علیہ ا

ایک صاحب نے اس پر اعتراض کیا تو مسکرا کر کہنے لگے جناب یہ ہم دونوں کے راز و نیاز کی باتیں ہیں ۔

جب آندھرا پردیش بن چکا تو زور یوں محسوس کرنے لگے گویا کہ گولکنڈہ کے بادشاہوں کی کھوئی ہوئی سلطنت انھیں مل گئی۔ وہ قبل از وقت کسی باضابطہ منصوبہ کے بنانے کے عادی نہ تھے۔ اس لئے انھوں نے تلنگانہ و آندھرا پردیش کی تحریک سے کوئی دلچسپی نہ لی۔ لیکن جب آندھرا پردیش بن چکا تو ان کو ایسا محسوس ہوا کہ گویا قطب شاہی زمانہ لوٹ آیا ہے۔ تقریبیں منانے کا سلسلہ تو پہلے ہی سے چل چکا تھا اور کامیابی حاصل ہو رہی تھی۔ اس وقت ایک نئی تقریب کی تجویز تھی اور یہ سوچا کہ کیوں نہ محمد قلی قطب شاہ کی یادگار ہر سال منانے کی روایت قائم کی جائے تاکہ اس زمانہ کی مشترکہ تہذیب کی یاد تازہ ہو۔ اور ہندوؤں اور مسلمانوں کو یہ یاد آجائے کہ وہ خلوص و محبت کے ایسے مضبوط رشتوں میں بندھے ہوئے ہیں کہ زمانہ حال کے حوادث ان رشتوں کو توڑ نہیں سکتے۔ مختلف بیٹھکوں میں محمد قلی قطب شاہ کی اس سالانہ یادگار کو منانے کے منصوبے طے ہوئے اور یہ قرار پایا کہ محمد قلی قطب شاہ کی سواری گولکنڈہ سے چار مینار تک جس تزک و احتشام اور لوازمات شاہی کے ساتھ آیا کرتی تھی اسی شان و شوکت اور اہتمام کے ساتھ ایک جلوس چار مینار سے اس کی گنبد تک لیجایا جائے۔ اس کے لئے ہاتھی گھوڑے لاؤلشکر سپاہی چوبدار نیزے بھالے ڈھال تلوار ہودہ عماری پالکی ہوادار ماہی مراتب زربفت لباس عطر و گل عود و لوبان غرض وہ سارے لوازمات جو اس سواری کی زیب و زینت اور شان و شوکت کے لئے ضروری تھے فراہم کئے گئے۔ یہ جلوس جدید حیدرآباد کی تاریخ کا نیا واقعہ تھا اس نے از سر نو دکن کے مردہ دلوں میں زندگی کی تازگی اور حرارت پیدا کی۔ نئی امنگیں بیدار ہوئیں۔ حوصلے اور امیدیں جاگیں۔ ہزاروں آدمی جوق در جوق اس جلوس میں شریک ہوئے۔ کئی دن تک ان تقریبوں کا سلسلہ جاری رہا۔ میں یوم قلی قطب شاہ کی مالیاتی کمیٹی کا معتمد تھا۔ کم سے کم عرصہ میں ایک ایسا مالیہ فراہم کرنا جو ایسی شاہانہ تقاریب کے اخراجات کا کفیل ہو سکے بڑا مشکل کام تھا۔ لیکن مسلسل کوششوں اور جستجو نے اس کو ممکن بنا دیا۔

اب انہماک گولکنڈے کے نتائج دیکھئے ڈاکٹر زور گولکنڈہ کی تاریخ میں کھو گئے تھے۔ ان کا استغراق اور انہماک اس قدر شدید تھا کہ مستقبل کو دیکھنا ان کے لئے ناممکن تھا۔ وہ تاریخ کی ان بھول بھلیوں اور ان تقریبوں کے ایسے دلدادہ تھے کہ مستقبل تو کیا حال کی مصیبتوں اور مایوسیوں کو بھلانے لگے۔ میں ان تقریبوں سے صرف اتنا کام لینا چاہتا تھا کہ تاریخ کا تسلسل مل جائے اور بدلے ہوئے حالات میں ایسی روایت کو جو بھلا دی گئی تھی تازہ کریں تاکہ دلوں کی پژمردگی تازگی سے بدل جائے۔ اور ہم اس تازگی اور حرارت کے سہارے زندگی کا نیا سامان فراہم کرسکیں۔ لیکن یہ تجویز زور صاحب کی افتاد طبع کے وزن سے دب گئی اور یہی وہ نکتہ تھا جہاں سے ہم دونوں کا اختلاف اور زیادہ شدید ہو گیا۔

ان ہی دو چار برسوں میں ادارۂ ادبیات اردو کی عمارت کی تعمیر کا مسئلہ بھی اٹھ کھڑا ہوا۔ سابقہ حکومت نے پچیس ہزار کی رقم اس غرض سے محفوظ کی تھی اور شرط یہ لگا دی تھی کہ اگر زمین مل جائے تو یہ رقم تعمیر کیلئے دیجائیگی۔ ایک عرصہ سے زمین کا مسئلہ بحث میں پڑا ہوا تھا۔ میں اس زمانہ میں حیدرآباد پر مامور تھا۔ میں نے اس مقام کی

نشان دہی کی جہاں اب تمثیل تعمیر، رویندر بھارتی بن چکا ہے۔ اُس سے لگی ہوئی زمین بھی خالی پڑی تھی۔ زور صاحب اس کا محل وقوع تو بہت پسند آیا لیکن اُس کی خریدی کے لئے سرمایہ کی فراہمی ناممکن نظر آئی۔ میں کہتا تھا کہ آپ ار کر لیجئے تو مالیہ خود بخود فراہم ہو جائے گا۔ لیکن ان حالات میں وہ اس اقدام کے لئے تیار نہ تھے۔ ایک دو مہینے اسی و تکرار میں گزر گئے۔ آخر زور صاحب نے طبعی حقیقت پسندی کے زیر اثر یہی مناسب جانا کہ اپنے احاطہ مکان قطعہ بطور عطیہ دے دیں یا دوسرے الفاظ میں کہ اپنی بیگم صاحبہ سے عطیہ دلوا دیں۔ پھر کیا تھا تعمیر کے کام کا شروع ہوا اور دو چار سال میں ایک اچھی عمارت کھڑی ہو گئی۔ اُس کے نقشہ اور طرز تعمیر سے بھی مجھے اختلا تھا۔ ڈاکٹر زور اُس کے طرز تعمیر سے دکن کی تاریخ کو ظاہر کرنا چاہتے تھے۔ میں کہتا تھا جناب یہ داستان پا ہے۔ کب تک آپ اس کو سینے سے لگائے رکھیں گے۔ کیوں اس مصیبت کو آپ آئندہ نسلوں کے سر تھوپنا چا ہیں۔ کوئی ایسی نئی طرز کی عمارت بنا ڈالئے کہ ایوان اردو اور اردو گولکنڈہ طرز تعمیر میں بند نہ ہو جائیں زور صاحب کو اس بات پر آمادہ کرنا کہ وہ گولکنڈہ کے اثر سے باہر نکل آئیں اور نئے محرکات اور نئے تقاضو محسوس کریں بہت مشکل کام تھا۔ ان کے دل و دماغ پر گولکنڈہ کی تہذیب اور دکھنی اثر چھائے ہوئے تھے۔ ایک مرکز کا بن جانا غنیمت تھا۔ زور صاحب میرے استدلال کو محسوس کرتے تھے لیکن اُن کا دل اس کی طرف مائل نہ ہوتا تھا۔

(۶)

ان تقریبوں کے ساتھ ڈاکٹر زور کی زندگی کا چوتھا دور بھی اُبھر رہا تھا۔ اس دور میں وہ ایک بزرگ کی حیثیت سے جانے اور پہچانے جانے لگے۔ رفتہ رفتہ وہ لوگ مٹ مٹا گئے تھے جو ان پر پھبتیاں کسا کرتے تھے۔ اس کے ساتھ ہی ساتھ انھیں یہ بات بھی محسوس ہونے لگی تھی کہ عمر بھر کی کوششوں کے باوجود وہ اپنے مقصد میں پورے کامیاب نہ ہو سکے تھے۔ اردو کی عملداری میں اُن کی مطلق العنانی قائم نہ ہو سکی۔ مولوی عبدالحق صاحب اورنگ آباد ملک چھوڑ چکے تھے۔ لیکن ان کے کام کو آگے بڑھانے والے اصحاب یہاں موجود تھے۔ اردو کا ایک اور مرکز بھی یہاں تھا۔ اردو ہال کی تعمیر کا سلسلہ بھی شروع ہو چکا تھا۔ انھوں نے اس گھما گھمی کو دیکھ کر اور میرے مسلسل اصرار پر دو اداروں کی سرگرمیوں کے راستے کسی قدر بدل دئے کیونکہ دونوں کے انضمام کا خطرہ تھا۔ ادارہ ادبیات ا کو تحقیق اور تلاش علم کے لئے مختص کر دیا اور زور صاحب نے اس طرح ادارہ ادبیات اردو اور انجمن ترقی ار اردو ہال سے ٹکراؤ کے بجائے ربط و تعاون کی ایک نئی صورت نکال لی۔ اُن کی زندگی کا یہ چوتھا دور ان دلی اعتراف پر ختم ہوتا ہے کہ اردو کی عملداری میں ان دونوں اداروں کی بقائے باہم ناگزیر تھی اور اُن آرزوئیں و تمنائیں کہ دکھن کی اُردو دنیا میں دکھنیوں کا کھویا ہوا اقتدار پھر سے مل جائے تشنہ و ناکام رہ گئ وہ حقیقت پسند بھی واقع ہوئے تھے۔ اُن کی ذات میں کرب و اضطراب کی وجہ ایک یہ بھی تھی کہ اُردو کے تعلق وہ مایوس سے ہو گئے تھے۔ اور اپنی نجی ملاقاتوں میں وہ بے چینی و بے کلی کا اظہار کرتے تھے۔ جب میں اپنے ات اور تاریخی استخراج سے اُن کے خیال کی مخالفت کرتا تو وہ یہ کہہ کر خاموش ہو جاتے کہ دیکھئے کیا ہوتا ہے۔

ساہتیہ اکیڈیمی کے ممبر بنائے گئے اور اس طرح ان کا دلی آنا جانا عام ہوا تو گویا ان کی زندگی کے پانچویں دور کی ابتدا ہوی
دلی کیا گئے ترک وطن کی صورتیں پیدا کرنے لگے۔

جب میں نے اخباروں میں یہ پڑھا کہ کشمیر کے وزیر اعظم حیدرآباد بلائے جا رہے ہیں تو میرے دل نے گواہی دی کہ یہ دوستی
نیا رنگ لا کر رہے گی۔ چند ہی مہینوں میں اس بات کی تصدیق ہو گئی۔ اخباروں میں اطلاع چھپی کہ ڈاکٹر زور کشمیر یونیورسٹی
شعبہ اردو کی صدارت پر فائز کئے گئے ہیں وہ بہت جلد کشمیر کا قصد رکھتے ہیں۔ میرے دل کو دھکا سا لگا۔ جانے کیا بات
تھی کہ میرے دل میں خدشہ پیدا ہوا کہ ڈاکٹر زور کا کشمیر جانا راس نہ آئے گا۔ میں نے فوراً ٹیلیفون ملایا اور کہا کہ زور صاحب
کے کشمیر جانے کی خبر شائع ہوی ہے۔ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ آپ کشمیر جا کر کیا پائیں گے۔ زور صاحب پروفیسر تو آپ
ہے ہیں۔ اس سے زیادہ آپ کو کیا ملے گا۔ آپ یہاں جو کام کر سکتے ہیں اس کے مواقع کشمیر میں حاصل ہو سکیں گے
یہ کہتا جاتا اور زور صاحب حسب عادت تاویلیں کرتے جاتے۔ کہنے لگے کشمیر میں اردو کا بہت کچھ کام کرنا ہے۔
لئے میرا کشمیر جانا ضروری ہے ۔ میں ان کی اس تاویل اور استدلال کے محرکات کو سمجھ گیا۔ پھر میں نے دل میں
کیا۔ جب زور صاحب نے جانے کا فیصلہ کر ہی لیا ہے تو ان کے دل میں کوئی خدشہ پیدا کرنا مناسب نہیں۔ پھر
نے گفتگو کی پنج بدل دی۔ میں نے کہا اچھا ہے آپ کشمیر جائیے۔ ہم آپ کے طفیل میں کشمیر کی سیر کو آئیں گے۔ اس لئے
ٹر زور نے شکایت کی کہ آپ حیدرآباد ہی میں نہیں ملتے تو کشمیر آ کر کیا ملیں گے۔ اس عرصہ میں ہم ایک دوسرے
بہت کم مل رہے تھے۔ ان کو میرے نہ ملنے کا قلق تھا اور مجھے دلی رنج۔ لیکن ہم اپنی اپنی افتاد طبع کے دھاروں
رہے تھے۔ کبھی کبھار شادی بیاہ کی تقریبوں، سرکاری دعوتوں میں جہاں ہم دونوں مدعو ہوتے مل لیتے تھے۔
ہی ایک تقریب میں ہماری گفتگو اردو کے مسائل پر ہونے لگی۔ کہنے لگے جی چاہتا ہے کہ آپ سے باتیں کروں
دنیا سے کچھ الگ ہی سوچتے ہیں۔ شاید آپ کی باتیں صحیح ہوں۔ ویسے تو آپ میرے ہاں آتے نہیں لیکن
ن میں آپ کو کھانے پر بلاؤں گا اور آپ اسے ٹال نہ سکیں گے۔ کچھ آپ کی سنوں گا کچھ اپنی سناؤں گا۔

زور صاحب کے کشمیر جانے کی غالباً دو باتیں محرک ہوئیں۔ ایک تو ان کو یہ خیال ہوا کہ وہاں جامعاتی اور سرکاری
اردو ہے۔ اور وہاں اردو کی وسعت اور ترقی کے بیش بہا موقعے ہاتھ آ سکیں گے۔ وہ دکھن اور کشمیر کا رشتہ
ڑنا چاہتے تھے۔ اور یہ واقعہ ہے کہ کشمیر پہنچ کر انہوں نے ان روایتوں کو جو سرزمین دکھن میں قائم کر چکے تھے زندہ
و کشمیری ادیبوں اور شاعروں کے شاہکاروں کی تلاش میں مصروف ہو گئے۔ اگر ان کی عمر وفا کرتی تو یہ کام ان
یادہ بہتر کوئی اور نہ کر سکتا تھا۔ اب حسن اتفاق سے یہ امیدیں ان کے قدیم رفیق کار پروفیسر سروری کے دامن
ابستہ ہو گئی ہیں۔ زور کے کشمیر جانے کا ایک سبب یہ بھی تھا کہ وہ دکھن سے دل برداشتہ سے ہو گئے تھے۔ ایک تو
دیکھ رہے تھے کہ دکھن کی اردو دنیا آخری زمانہ میں بھی دو عملداریوں میں منقسم تھی۔ دوسرے ان کے بیشتر ساتھی
ست ان سے ٹوٹ گئے رہے۔ پھر اردو کے تعلق سے ان کے دل میں خدشے پیدا ہو چکے تھے۔ وہ اس درجہ
ت پسند تھے کہ کسی طرح ان مایوسیوں پر غالب نہ آ سکتے تھے۔ چنانچہ جب حجاز میں یونیورسٹی کے قیام کی اطلاع
انھوں نے ڈاکٹر فاکر حسین صاحب کو لکھا کہ وہ اردو کے شعبہ کو سنبھالنے کے لئے آمادہ ہیں۔ میں نے اسوقت بھی

اس تجویز کی مخالفت کی تو کہنے لگے ہماری بیگم صاحب کو اُس طرف کا تخلیہ ہے۔ اب ہمارا یہاں دھرا ہی کیا ہے۔
ان باتوں سے یہ صاف معلوم ہوتا ہے کہ ان کے دل میں مایوسی اور ناامیدی نے گھر کر لیا تھا۔ وہ مخالفتوں کو
اور برداشت کرنے کے عادی ہو چکے تھے۔ اس دلی مایوسی کو بھی وہ برداشت کر گئے اور شاید ہی کسی اور کو اس کا انداز
ہوگا۔ لیکن یہ ایک حقیقت ہے کہ زور صاحب کو یہ خیالات اندر سے گھن لگا رہے تھے۔ ان کے قوا میں اضمحلال آ
تھا۔ وہ تمام صورتیں جو ان کی زندگی کو بڑھاتیں اور ان میں آب و تاب پیدا کرسکتیں ان سے چھوٹ رہی تھیں
ایک آدھ ہی واقعہ نے بھی ان کے دلی درد کو بہت بڑھا دیا تھا۔ سچ پوچھئے تو زور دکھنی قومیت اور اردو کے شہ
ہوئے۔ ان کا نام تادیران کی اس شہادت کے سہارے زندہ رہیگا۔

(۷)

ڈاکٹر زور آخری عمر میں تصوف کی طرف زیادہ مائل ہو گئے تھے۔ یوں تو یہ خود بھی مشائخ خاندان سے تعلق رکھتے
تھے۔ اور ان کے والد بزرگوار واعظ، حافظ اور صوفی کی حیثیت سے مشہور تھے۔ لیکن زور صاحب ابتدائی عمر
اس مشرب سے نا آشنا تھے۔ یوں انھوں نے سلوک کی کوئی باضابطہ منزل توطے نہیں کی تھی۔ لیکن کچھ خاندانی
روایتوں اور کچھ اس بہانے سے اپنے والد کی جانشینی اپنے فرزند کے سپرد کر دی اور اس طرف زیادہ مائل ہو گئے
مائل کیا ہوئے اس میں بھی غلو کیا۔ اپنے والد کی خانقاہ بنوائی۔ عرس کروایا۔ پیری مریدی کے سلسلے کو جاری کیا
رود موسیٰ کے کنارے اپنے والد کی خانقاہ میں اپنے لئے بھی ایک جگہ محفوظ کر دی۔ لیکن کیا معلوم تھا کہ وہ کسی ا
ملک میں سپردخاک ہونے والے ہیں۔

زور صاحب کو تصوف کے ساتھ علم نجوم کا بھی چسکا پڑ گیا تھا۔ ایک صاحب جو علم نجوم اور رمل سے خوب واقف
ہیں ان کے ہاں ہر روز آتے تھے۔ میرا تو یہ گمان بھی ہے کہ وہ ہر روز کا زائچہ نکلواتے تھے۔ جو احباب ان کے ہاں
جاتے ان کو بھی اس کا چسکا دلاتے۔ افسوس کہ بعض پیشین گوئیاں جو زور صاحب کو بھاتی تھیں پوری نہ ہو
ہوسکتا ہے کہ اس کا احساس بھی تلخ ہو گیا تھا۔

زور عمر بھر اس کوشش میں لگے رہے کہ دکھنی نوجوانوں میں خود اعتمادی پیدا ہو۔ اس کوشش میں انھوں نے سخت
مخالفتیں جھیلیں۔ شدید مصائب کا مقابلہ کیا۔ لیکن اپنے کام سے ہٹے نہیں۔ البتہ آخری عمر میں ان کو یہ احساس
ہو گیا تھا کہ عمر بھر وہ جس چیز کو حاصل کرنے کی کوشش کر رہے تھے وہ بے حقیقت ہو کر رہ گئی تھی کیونکہ ملک کا انقلاب
سارے فرق کو مٹا چکا تھا اور زندگی کی وہ قدریں جو کسی زمانہ میں اہمیت رکھتی تھیں بے وقعت اور بے معنی ہو گئی تھیں

زور صاحب میں محبت اور نفرت کے جذبات ملے جلے موجود تھے۔ وہ محبت کرتے تو بے حساب اور نفرت
کرتے تو بے پناہ۔ وہ دور اندیش بھی تھے لیکن ان کے جذبات ان کی دور اندیشی پر غالب آجاتے تھے۔ بے
آزاد مزاج انسان تھے۔ لیکن ان کے کاموں کے منصب نے ان کی آزادہ روی پر قید و بند کی مہر لگا دی
وہ اگر اردو کے پروفیسر نہ بنتے اور ان کو ترقی اور شہرت کا چسکا نہ پڑتا اور وہ قلندر بن جاتے۔ عاشقی اور عاشقانہ
ان کی طبیعت میں کوٹ کوٹ کر بھری تھی۔ لیکن روایت پرستی نے ان کے ان لطیف جذبات کو بھی دبا دیا

حسن پرست تھے اور اچھی صورت دیکھ کر مچل جاتے تھے۔ تعریف میں بے تکان تھے۔ وہ اچھے دوست تھے اور دوستی کو خوب نبھاتے تھے۔ اُن کو کام لینا اور کام نکالنا بھی خوب آتا تھا۔ دوسروں کے کاموں کا اعتراف بھی فراخ دلی سے کرتے تھے۔ جب اردو مخطوطات کی پہلی جلد چھپ کر آگئی تو میں نے دیکھا کہ دیباچہ میں ٹیکنش کے اور میرے کاموں کا خاطر خواہ اعتراف تھا۔ ہر وقت اس فکر میں لگے رہتے تھے کہ جو لوگ اُن کے ساتھ کاموں میں شریک ہوں اُن کا فراخ دلی سے نام لیا جائے لیکن اگر کسی سے ان کی کسی بات پر ٹھن جاتی تو اُس کو اس طرح مٹا دیتے کہ گویا وہ اس کو جانتے ہی نہ تھے۔ اُن کی طبیعت میں احتیاط بھی تھی۔ ذہین اور طباع لوگوں سے چوکنے سے رہتے تھے۔ اُن کے ساتھ کام کرنے والوں کی فہرست بڑی طویل ہے جامعہ عثمانیہ کا کوئی نوجوان ایسا نہیں ہے جو کبھی نہ کسی حیثیت سے اُن کے ساتھ شریک نہ رہا ہو۔ لیکن حمید الدین شاہد جیسا وفادار اُنھیں کوئی نہ ملا جب مجھے یہ معلوم ہوا کہ حمید الدین شاہد ترک وطن کر رہے ہیں تو مجھے بڑا اچنبھا ہوا۔ میں نے پوچھا اجی حضرت یہ آپ کے یار وفادار میں ہیں سمجھا تھا کہ اس آسانی سے آپ کو داغ دے جائیں گے۔ زور صاحب کی زبان سے نکلا۔ میں نے ہمیشہ اپنے اللہ پر تکیہ کیا ہے، کیا حمید الدین کے جانے سے میرے کام رک جائیں گے۔ میں نے اس جملہ میں جدائی کی تلخی محسوس کی۔ پھر خود ہی کہنے لگے اُن کی بیوی اب اُنھیں یہاں رہنے نہ دیگی اُنھیں روکنا لاحاصل ہے۔ یہ زور صاحب کی حقیقت پسندی تھی۔ زور صاحب بلا کے حقیقت پسند تھے۔ ایک دن میں نے کہا آپ اب ساہتیہ اکیڈیمی کے ممبر بن چکے ہیں۔ ایک طرح آپ کو مرکزی حیثیت حاصل ہو چکی ہے۔ قاضی عبدالغفار نہیں رہے۔ کیوں نہ آپ انجمن ترقی اردو کو سنبھالیں اور اس کام کو آگے بڑھائیں۔ کہنے لگے۔ وہاں آل احمد سرور اور دوسرے لوگ موجود ہیں۔ میری کوشش کامیاب نہ ہو سکیں گی۔ زندگی کے ہر مسئلہ پر وہ اسی نقطہ نظر سے سوچتے تھے۔

زور صاحب کے سوچنے کے سانچے دراصل چند شخصی نمونوں کے گرد گھومتے تھے۔ اعظم یار جنگ اور پروفیسر حسن علی خاں کے وہ بڑے گرویدہ تھے۔ بہت بڑی حد تک اُن کی زندگی پر اُن کے اثرات غالب تھے۔ وہ اُن نمونوں پر اپنی زندگی ڈھالنا چاہتے تھے۔ وہ یہ نہیں جانتے تھے کہ بدلے ہوئے حالات میں پرانے نمونے کام نہیں دیتے۔ احسانمندی اور وفاداری کے جذبات ان کو اس طرز فکر سے آزاد ہونے نہیں دیتے تھے۔ چنانچہ جب پروفیسری سے چادر گھاٹ کالج کی پرنسپلی پر آئے تو ان کے ذہن میں دراصل سٹی کالج والے اعظم صاحب کی پرنسپلی اور ان کی ترقی کے نمونے جگمگا رہے تھے وہ اس کی پیروی کرتے تھے۔ لیکن افسوس کہ وہ حالات بدل چکے تھے۔

زور صاحب چاہتے تھے کہ میں محمد قلی قطب شاہ کی زندگی کو انگریزی میں منتقل کروں یا اس کی اساس پر کوئی انگریزی کتاب لکھوں۔ ہم دونوں نے یہ بھی طے کیا تھا کہ حیدرآباد کے علم و ادب کی تاریخ پر براؤن کی تاریخ ادبیات ایران کے معیار پر ایک مبسوط کتاب لکھیں۔ وہ ادبی مواد فراہم کرتے اور میں سماجی معاشی اور سیاسی تحرکات کا تجزیہ کرتا۔ اور وہ اس کو اردو میں لکھتے اور میں انگریزی میں لکھتا۔ افسوس کہ یہ دونوں کام اُن کی زندگی میں نہ ہو سکے۔ ہم دونوں کی طبیعت کی افتاد ہی جدا تھی۔ یہ ہماری شراکت کا حزنیہ ہے لیکن بہرحال یہ دونوں کام کرنے کے ہیں۔ میں نے تاریخ ادبیات دکن پر بہت کچھ مواد اکٹھا کر لیا ہے۔ جانے یہ کام کب پورا ہو۔ ڈاکٹر زور نے داستان ادب حیدرآباد لکھ کر یہ کمی بہت بڑی حد تک پوری کر لی ہے۔ اور آئندہ کے کاموں کی بنیادیں رکھی ہیں۔

زور صاحب کسی کی سفارش میں کبھی کوتاہی نہ کرتے تھے۔ ان سے سفارش کروانے کا چند اصحاب نے خوب فن سیکھا تھا۔ اور وہ اس فن دانی کے شکار ہو جاتے تھے اور خود ہی کہتے تھے۔ بہرحال مقصود یہ ہے کہ کسی نہ کسی طرح لوگوں کے کام نکل جائیں۔

کیوں نہ ہو وہ اپنے عزیزوں، دوستوں اور محسنوں کے کام کرتے بھی تھے اور ان سے کام لیتے بھی تھے۔

زور صاحب کے اسلوب بیان سے ان کا کردار جھلکتا ہے۔ اور اس سے ان کے کردار و شخصیت کے ارتقاء کا
ہوتا ہے۔ ان کے اسلوب بیان میں سادگی ہے لیکن وہ اپنے مفہوم کو بڑی کامیابی سے ادا کرتے ہیں۔ البتہ ان کا
ان کی زندگی کے چوتھے اور پانچویں دور میں ظاہر ہوا۔ قلی قطب شاہ کی شاعری کے مطالعہ نے ان کے بعض سو
جذبات کو بیدار کیا اور اظہار بیان کا ان کو ایک نیا انداز ملا۔ انھوں نے اپنی تحریر میں قدیم دکھنی اردو کے
اور پر اثر الفاظ کو پھر سے برتنا شروع کیا اور یہ انداز بیان حیات قلی کی زندگی کے لئے بہت ہی موزوں تھا۔
کانفرنسوں کے خطبوں میں بھی ان کا انداز بیان نئے طرز میں نکھر رہا تھا۔ وہ آزادانہ طریقہ سے اپنے خیا
کرنے لگے تھے۔ وہ اپنی عادت کے خلاف اردو کے مسائل اور مشکلات پر بے باکی سے اپنی رائے کو ظاہر کرنے لگے تھے
باتوں نے ان کے کردار میں ایک نئی تاب و توانائی پیدا کردی تھی۔ وہ ایک بڑی کمی خود داری سے محسوس ہوتی
دکھائی دے رہی تھی اور زور بہت بازور انداز میں نمایاں ہو رہے تھے۔

زور صاحب شاعر تھے۔ انھوں نے اپنے بچپن اور جوانی میں نظمیں اور غزلیں کہی تھیں لیکن جب پروفیسر
تحقیقات کا چسکا لگا تو وہ شاعری کو بھول گئے۔ کشمیر کے رنگ و گل نے پھر ان میں شاعرانہ جذبات کو ا
نے دو چار غزلیں کہیں۔ جب میں نے اُن کی یہ غزلیں پڑھیں تو مجھے خیال ہوا کہ ان کی شاعری کی عمر گزر چلی تھی
ساتھ ہی مجھے ایسا محسوس ہوا کہ وہ اپنے احساس تلخی اور زندگی کی بے تاب تمناؤں کو شعر کے سانچوں میں
کی کوشش کر رہے ہیں۔ چنانچہ ان کی ان غزلوں میں اکثر اشعار ایسے ملتے ہیں جس سے ان کی موت کی پیش
ہوتی ہے۔ میں ان اشعار کو پڑھ کر آنے والے حادثہ کے خیال سے سہم سا جاتا تھا۔ اور ان دنوں میں اس خیا
ذہن سے نکالنے کی ناکام کوشش کرتا رہتا تھا۔ لیکن ہوا وہی جس کا مجھے خدشہ تھا اور اس خدا کے بن
خود اپنے اشعار میں ظاہر کر دیا تھا۔ زور اوصاف، نیکیوں اور چند کمزوریوں کا پتلا تھا۔ اور ان ہی خصوصیا
اس کے کردار کو بہت دلچسپ بھی بنا دیا تھا۔ اس نے اپنی ساری توانائیاں اور صلاحیتیں و کھینت، گولکنڈہ
ادبیات اردو کی نذر کر دیں۔ جب یکایک خبر بجلی کی طرح اردو کے چاہنے والوں کے دلوں پر گری کہ دکھنہ
و ادب کا یہ فدائی کشمیر کی وادی میں آخری نیند سو گیا تو سارا ملک ایک ماتم کدہ بن گیا۔

پروفیسر سید مبارز الدین رفعت

استاد محترم

بعض انسان زندگی، قوت اور حرکت کا ایسا ابلتا چشمہ ہوتے ہیں کہ موت کا تصور ان کے ساتھ جڑ ہی نہیں سکتا۔ خیال ہی نہیں آتا کہ ایسے انسان موت سے زیر ہو سکتے ہیں، بچھڑ سکتے ہیں۔ زندگی قوت اور حرکت کا ایسا ہی ابلتا چشمہ استاد محترم ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور بھی تھے۔ ان کی زندگی میں یہ خیال بھولے سے بھی نہ آیا کہ ایک روز وہ بھی مر جائیں گے۔ یکایک ایک روز اخبار میں ان کی موت کی خبر نظر سے گزری تو جو کچھ دیکھا اس پر دھوکے کا گمان ہوا لیکن بار بار اس خبر کو پڑھنے کے بعد دھوکے میں رہنے کی گنجایش نہ رہی۔ پھر یاد آیا کہ انسان زندگی، حرکت اور قوت کا چاہے کتنا ہی زبردست سرچشمہ کیوں نہ ہو، آخر فانی ہے۔ بڑے سے بڑے پیغمبر، بڑے سے بڑے ولی، بڑے سے بڑے عالم و فاضل، بڑے سے بڑے باجبروت ملک اور امیر اور آج کے اونچے سے اونچے نیتا اور قائد سب ہی اسی راستے سے گزرے۔ موت سے کسی کو بھی رستگاری نہیں۔ کسی کو بھی معافی اور چھٹی نہیں ـــ کل من علیہا فان و یبقیٰ وجہ ربک ذوالجلال والاکرام۔

کئی دنوں تک استاد محترم کی غیر متوقع اور اچانک موت نے مجھے گم سم رکھا۔ میرے ذہن میں مولانا محمد علی پر لکھے ہوئے پروفیسر رشید احمد صدیقی کے لازوال شاہکار مضمون کی آخری سطریں گھومتی رہیں۔ معلوم نہیں موت نے زور کو کس طرح زیر کیا ہوگا۔ اس زور آزمائی میں خود موت پر کیا بیت رہی ہوگی!

اسکول کی جماعتوں سے پروفیسر ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور کا نام سنتا چلا آ رہا تھا۔ ۱۹۳۶ء کی بات ہے، میں حیدرآباد کے سٹی کالج میں انٹرمیڈیٹ کی جماعت میں پڑھتا تھا۔ اس سال اس کالج نے اپنے شہرۂ آفاق پرنسپل جناب سید محمد اعظم صاحب کی سرپرستی اور استاد محترم پروفیسر سید محمد صاحب مدظلہ کی سعی و کوشش سے بڑے شاندار پیمانے پر "جشن ولی" منایا تھا۔ ڈاکٹر زور کو میں نے پہلی بار اسی جشن ولی میں دیکھا۔ ان کے بارعب چہرے، ان کے ڈیل ڈول، ان کی پاٹ دار آواز اور ان کے بالوں کی مخصوص تراش، یہ سب چیزیں میرے لئے بہت مرعوب کن رہیں۔ وہ مجھے بیک وقت فلسفی، شاعر، عالم اور پروفیسر نظر آئے۔ ان کی شخصیت واقعی مرعوب کن تھی۔ اور اکثر حضرات میری طرح پہلی ہی ملاقات میں ان سے متاثر اور مرعوب ہو جاتے تھے۔

پھر ۱۹۳۸ء میں میں نے جامعہ عثمانیہ میں داخلہ لیا اور بی۔ اے میں اردو مضمون اختیاری لیا تو دو سال تک مجھے ڈاکٹر زور کی شاگردی کا شرف بھی حاصل ہوگیا۔ ان دو سالوں میں مجھے ان کو قریب سے دیکھنے کا موقع ملا۔ میں نے ان کو پڑھاتے دیکھا۔ میں نے ان کو لکھتے پڑھتے دیکھا۔ میں نے انھیں لگاتار کام کرتے دیکھا۔ اسی کام کرنے کی

لگن نے مجھے سب سے زیادہ متاثر کیا۔ مجھ میں بھی دونوں کام کرنے کی ایک امنگ تھی۔ ایک ولولہ تھا۔ تھا۔ استاد محترم جس کسی طالب علم میں ایسا جوش، ایسا ولولہ اور ایسی امنگ دیکھتے، اس کی پیٹھ ٹ کا دل بڑھاتے، اس کی قدر کرتے اور تحریر سے تقریر سے اس کی ہمت افزائی کرتے۔ طالب علمی کے ز انھوں نے جس جس طرح میری ہمت افزائی کی اور جس جس انداز سے میرا دل بڑھایا، اسے یاد کرتا ہو دل مسرور ہوتا ہے اور اپنے اولین محسنوں میں سے اس ایک محسن کے لئے دل سے دعائے خیر نکلتی ہے بڑھانے اور قدر کرنے کا یہ انداز وہ مجھ سے مرتے دم تک برتتے رہے۔ بیس طویل سالوں میں وہ جب جس شفقت، اور جس مہربانی سے پیش آتے رہے، اس کا نقش میرے دل سے کبھی محو نہ ہو سکے گا۔ کم سواد، ہیچ مداں اور کج مج بیاں کے بہت بڑے قدرداں رہے۔

ظاہر بینوں کو تو شاید یہی نظر آتا ہوگا کہ استاد محترم ڈاکٹر زور کے کارنامے یہ ہیں کہ انھوں کتابیں تصنیف کر ڈالیں، بے حساب مضامین اور مقالے لکھ ڈالے، اردو کا وسیع ادارہ "ادار کے نام سے قائم کر ڈالا اور اس ادارے کے لئے ایک نہایت خوبصورت اور شاندار عمارت "ایو کے نام سے بنوا ڈالی۔ بے شک یہ کارنامے ہیں اور زبردست کارنامے ہیں۔ ان کے نام کو شہرت عام اور کی خلعت بخشنے والے ہیں۔ لیکن استاد محترم کے ان سب کارناموں سے بھی بڑھ کر ایک کارنامے کی طرف کی نظر جاتی ہے اور وہ دکن اور خاص طور پر مرحوم ریاست حیدرآباد دکن میں لکھنے والوں کی ایک ا تیار کر دینا ہے۔ اس ٹیم میں آج کتنے ہی ایسے شاعر ہیں، ادیب ہیں، محقق اور عالم ہیں جن کا نا دنیا میں جانا پہچانا ہی نہیں مانا ہوا نام ہے۔ دور حاضر کے حیدرآبادی شاعروں، ادیبوں محقق میں شاید ہی کوئی شاعر، ادیب، عالم اور محقق ایسا ہوگا جس کی ہمت افزائی، تربیت یا کسی نہ کس رہنمائی استاد محترم نے نہ فرمائی ہو۔

دکنی عام طور پر طبعاً منکسر المزاج واقع ہوئے ہیں۔ اپنا آپ پروپگنڈا کرنا تو انھیں آتا ہی نہیں تہذیب اور ان کی شائستگی آپ اپنا ڈھول پیٹنے کی قائل نہیں۔ اگر وہ کسی علم میں طاق ہوں انھیں درجۂ کمال حاصل ہو تو اپنی کم گوئی کی وجہ سے وہ اس کے سو درجوں میں سے ایک درجے کا بھی اش دے سکتے۔ اس خطہ، ملک میں بڑے سے بڑے عالم، بڑے سے بڑے شاعر، بڑے سے بڑے ادیب اور بڑے سے بڑ پیدا ہوئے، لیکن اپنی اسی صفت کی وجہ سے ایک محدود حلقے کے سوا ان کے کمال فن کو کسی نے نہ جانا۔ انھ شہرت حاصل نہ ہو سکی جو شمال کے بعض دوسرے بلکہ تیسرے درجے کے شاعروں، عالموں اور ادیبوں کو حا استاد محترم ان اولین دکنیوں میں ہیں جنھوں نے محض اپنے وقیع کام .... ---م کو سلیقے سے پیش، شمال پر بھی اپنا سکہ چلایا اور ہندوستان گیر شہرت کے مالک بنے۔ ایک مستند ادیب، ایک بڑے محقق ا کے ایک عالم کی حیثیت سے ہر جگہ ان کا نام ادب و احترام کے ساتھ لیا گیا۔ وہ اس زور سے اٹھے ا کے ساتھ آگے بڑھے کہ آخر کار انھیں ادیبوں اور عالموں کی صف اول میں جگہ دینی ہی پڑی۔ انتہا

ہنا نہیں اٹھے، اکیلے آگے نہیں بڑھے اپنے ساتھ اپنے رفیقوں اور اپنے شاگردوں کو لے کر اٹھے۔ انھیں اپنے جلو میں لے کر گے بڑھے۔ ان کے ساتھ اٹھنے اور ان کے ساتھ آگے بڑھنے کا نتیجہ یہ ہوا کہ ان میں سے بہتوں کو عالموں، ادیبوں اور لم کاروں کی اگلی صف میں نہ سہی صف دوم میں تو بہر حال جگہ مل ہی گئی۔ دکن میں پیدا ہونے کے باوجود استاد محترم کا یہ حال رہا۔ اگر کہیں قدرت انھیں شمال میں اور خاص کر پنجاب میں پیدا کرتی تو خدا جانے روم و شام سے بڑھ کر ان کا نکا کہاں کہاں بجتا !

۱۸۸۴ء میں مرحوم ریاست حیدرآباد نے فارسی کی جگہ اردو کو ریاست کی سرکاری زبان قرار دیا۔ پھر اس ریاست کے زبردست وزیر اعظم نواب سر سالار جنگ اول نے ریاست کے نظم و نسق کو بہتر بنانے کے لئے شمال کے قابل ترین فراد کی خدمات حاصل کرنے کی مہم شروع کی۔ پھر تو شمال سے یہاں آ کر قسمت آزمانے والوں کا تانتا ہی بندھ گیا۔ ان میں سے اکثر حضرات اپنے آپ کو "اہل زبان" مان کر بڑے تبختر کے ساتھ دکنیوں کی اردو کو حقارت کی نظر سے دیکھتے تھے۔ اگلے وقتوں کے یہ بزرگ اردو زبان اور اردو ادب کی تاریخ سے بالکل نابلد تھے۔ ان بے چاروں کو کیا معلوم تھی کہ اردو ادب کی اصل ولادت گاہ شمال نہیں دکن ہے۔ اس بے خبری نے ان کو ایک طرح کے احساس برتری کا شکار بنا رکھا تھا۔ اِدھر خود اہل دکن اس حقیقت کو فراموش کر کے ان "اہل زبان" حضرات کے آگے مدتوں احساس کمتری میں مبتلا رہے۔

۱۹۱۹ء میں اردو کی پہلی اور اس وقت تک آخری اردو جامعہ، جامعہ عثمانیہ کا قیام عمل میں آیا۔ اس جامعہ سے اردو میں تعلیم پا کر نکلنے والے سپوتوں نے سب سے پہلے اس احساس کمتری کے خلاف جہاد شروع کیا۔ ان مجاہدوں کے سردار استاد محترم تھے۔ اس جہاد کے ایک محاذ کے طور پر انھوں نے اردو ادب کے اولین دور یعنی دکنی ادب پر تحقیقاتی کام کو، جو ابھی عالم طفولیت ہی میں تھا بہت آگے بڑھایا۔ اس وقت تک اس دور کے زبردست ادیبوں اور شاعروں کے نام سے تک کوئی واقف نہ تھا۔ اور اردو ادب کا آغاز اچھے خاصے پڑھے لکھے حضرات کے نزدیک بس ولی اورنگ آبادی سے ہوتا تھا۔ عبدالحق، حکیم شمس اللہ قادری، نصیر الدین ہاشمی اور استاد محترم کی مساعی جمیلہ سے اردو ادب کا درخشاں دور بڑی حد تک سامنے آ گیا۔ استاد محترم کو یوں تو دکنی دور کے پورے ادب ہی سے گہری دلچسپی تھی، لیکن شاید وطن کی مناسبت سے گولکنڈے کے ادبی کارناموں سے انھیں خصوصی لگاؤ رہا۔ اس طرح استاد محترم کی سعی و کوشش سے دکن کے کتنے ہی شعرا اور ادیبوں کے کارنامے منظر عام پر آئے۔ شہر حیدرآباد کے عاشق مزاج بانی، پانچویں قطب شاہی فرماں روا سلطان محمد قلی قطب شاہ پر تو استاد محترم نے ایک ضخیم کتاب ہی لکھ ڈالی اور اس کے اس سے بھی زیادہ ضخیم کلیات کو بڑے اہتمام کے ساتھ مرتب کر کے شائع کیا۔ ہر سال اس کے یوم وفات کو حیدرآباد کی ایک شاندار سماجی تقریب بنا دیا اور آج استاد محترم کے طفیل ہی سے یہ بات اردو ادب کے ایک معمولی طالب علم کو بھی معلوم ہے کہ اردو کا پہلا صاحب دیوان شاعر اور کوئی نہیں، گولکنڈے کا یہی قطب شاہی فرماں روا سلطان محمد قلی قطب شاہ ہے۔

دکنیوں کے احساس کمتری اور "اہل زبان" حضرات کے احساس برتری کے خلاف جہاد کا دوسرا محاذ استاد محترم نے

تعلیم یافتہ نوجوانوں کا اردو لکھنے کے میدان میں دل بڑھا کر اور ہمت افزائی کرکے کھولا۔ انھوں نے خود ہی مضمون بر مضمون مقالے پر مقالہ اور کتاب پر کتاب لکھنے پر ہی اکتفا نہیں کی بلکہ اپنے ساتھیوں کو بھی تصنیف و تالیف پر کمر بستہ کر دیا۔ اس کے بعد انھوں نے اپنے طالب علموں اور شاگردوں کی طرف توجہ کی۔ اور اُن سے بھی مختلف موضوعات پر اردو میں مضامین، مقالے اور کتابیں لکھواتے لگے۔ اپنے شاگردوں کا وہ کس کس طرح دل بڑھاتے تھے اور کس کس طرح ان کی ہمت بندھاتے تھے اس کا اندازہ کچھ اس واقعہ سے لگایا جا سکتا ہے کہ جامعہ عثمانیہ میں اپنے مضمون کے ٹیوٹوریل کے طور پر بی۔ اے میں کم سے کم چھ مضامین سال بھر میں لکھ کر پیش کرنا ضروری تھا۔ متعلقہ استاد کی اس تصدیق کے بغیر کہ ٹیوٹوریل کے مضامین کی تکمیل کر لی گئی ہے امتحان میں شرکت ممکن نہ تھی۔ میرے بی۔ اے کے دونوں میں مضمون اردو کا ٹیوٹوریل استاد محترم سے متعلق تھا۔ مضامین کی وہ بیاض آج بھی میں نے بڑے جتن سے اٹھا رکھی ہے جس کے ہر مضمون کے آخر میں دس میں سے نو نمبر دیتے ہوئے استاد محترم نے "خوب۔ بہت خوب۔ قابل اشاعت" لکھ کر اپنے دستخط ثبت فرمائے ہیں۔ آج ان مضامین کو دیکھتا ہوں تو ان میں مجھے کوئی خاص بات نظر نہیں آتی لیکن میری یہ بیاض استاد محترم کے اس طرز عمل کی ایک تسلیمی دستاویز ہے کہ وہ اپنے کسی بھی شاگرد میں لکھنے کی تھوڑی بہت صلاحیت دیکھتے تو کس طرح اس کی ہمت افزائی کرتے اور اس کی اس صلاحیت کو پروان چڑھانے کے کیا کیا جتن کرتے تھے۔ مجھے یقین ہے ہمت افزائی اور دل بڑھانے کا یہ انداز اکیلے مجھ ہی سے استاد محترم نے نہ برتا ہوگا۔ مجھ جیسے اور بھی بہت سے طالب علم ہوں گے جن کا دل بڑھانے کے لئے انھوں نے ایسا ہی فراخ دلانہ طرز عمل اختیار کیا ہوگا۔

اپنے ساتھیوں اور اپنے شاگردوں کی تحریری صلاحیتوں کو اُجاگر کرنے اور ان کے علمی اظہار کے لئے انھوں نے "ادارۂ ادبیات اردو" جیسا وقیع ادارہ قائم کیا جس کے وہ عمر بھر معتمد رہے۔ "ادارۂ ادبیات اردو" اور "ڈاکٹر زور" حقیقت میں ہم معنیٰ الفاظ ہیں۔ کیونکہ ڈاکٹر زور کے بغیر ادارہ ادبیات اُردو کا تصور ہی ممکن نہیں۔ اس ادارے کے ترجمان کی حیثیت سے انھوں نے ایک ادبی ماہنامہ "سب رس" بھی اپنی نگرانی میں جاری کیا۔ اس رسالے میں لکھ لکھ کر کتنے ہی دکنی ادیب اور شاعر اردو دنیا سے متعارف ہوئے۔ ادارۂ ادبیات اُردو نے کتنے ہی نوخیز دکنی مصنفوں کی کتابوں کی اشاعت کا اہتمام کرکے علمی دنیا سے ان کو متعارف کرایا۔

جن مخصوص حالات میں ادارۂ ادبیات اردو قائم ہوا اور جن تقاضوں کو پورا کرنے کے لئے ماہنامہ سب رس جاری ہوا ان سے ناواقف حضرات کو میں نے کہیں یہ بھی کہتے سنا ہے کہ ادارہ ادبیات اردو سے جو کتابیں شائع ہوئی ہیں وہ کچھ ایسی معیاری نہیں ہیں اور ماہنامہ سب رس کا معیار ایسا کچھ زیادہ اونچا نہیں ہے لیکن یہ تنقید بڑی حد تک ناروا ہے۔ جو ادارہ اصل میں نومشق مصنفوں اور نوخیز لکھنے والوں کی ہمت افزائی کیلئے عالم وجود میں آیا ہو۔ اس کی ابتدائی مطبوعات کچھ ایسی وقیع نہ ہوں تو اس سے کیا ہوتا ہے۔ اس ادارے نے اپنا بنیادی مقصد پورا کیا اور بتدریج اس نے ایسی ایسی کتابیں شائع کیں جن کی اشاعت پر اردو کا کوئی بھی ادارہ فخر کر سکتا ہے۔ یہی حال ماہنامہ سب رس کا ہے۔ استاد محترم نے قصداً اس کا معیار اتنا اونچا نہ رکھا کہ اردو دنیا کے ایک مخصوص طبقے ہی

اس کی پذیرائی ہو اور عام اردو پڑھنے والے اس سے استفادہ کر سکیں۔ میرے کانوں میں آج تک استاد محترم کے الفاظ گونجتے ہیں کہ "میں چاہتا ہوں کہ سب رس اتنا مقبول ہو اور اس کے پڑھنے والے اتنے ہوں کہ معمولی پڑھا لکھا پان والا بھی بے شوق سے پڑھے اور اس کے ہاتھوں میں یہ رسالہ نظر آئے۔" "سب رس" "شمع" یا اس کی سی دل چسپیاں رکھنے والا رسالہ نہیں بنا، لیکن اس میں اصلا شک نہیں کہ اسی کے صفحات میں لکھ لکھ کر بہت سے مقالہ نگاروں، افسانہ نویسوں اور نظم گویوں نے مقالہ نگاری، افسانہ نویسی اور نظم گوئی کا سلیقہ سیکھا۔ اس طرح ادارۂ ادبیات اردو اور اس کے ترجمان سب رس نے دکنی ادیبوں، عالموں اور شاعروں کا ایک دلکش چمن کھلانے میں بظاہر دکھائی نہ دینے والی کھاد کا کام دے کر نہایت اہم حصہ ادا کیا ہے۔

استاد محترم کو اپنے دکنی ہونے پر فخر تھا۔ انھیں دکن کے ممتاز تمدن کی عظمت کا پورا پورا احساس تھا۔ اس تمدن کے مظاہر میں اجنتہ کی نقاشی، ایلورا کی بت تراشی، بیجا پور، گولکنڈے اور بیدر کی تعمیر کاری، چالوکیہ راجاؤں سے لے کر شاہان آصفیہ کی علم و ہنر پروری، حضرت خواجہ بندہ نواز گیسو دراز کی اردو نثر سے لے کر جامعۂ عثمانیہ کی عظیم الشان علمی خدمات سب ہی کو وہ شمار کرتے تھے۔ اپنے ہم عصر دکنیوں کو وہ اس بات کا احساس دلانا چاہتے تھے کہ وہ اپنے اسلاف کے کتنے عظیم الشان ورثے کے امین ہیں۔ ان کی سرا پا یہی کوشش رہی کہ اہل دکن اس ورثے کی عظمت سے نہ صرف واقف ہوں بلکہ ایسے ہی شاندار کارنامے وہ خود بھی انجام دے جائیں۔

استاد محترم کی زندگی میں غالباً سب سے بڑا حزنیہ جو پیش آیا وہ ۱۹۴۸ء میں ریاست حیدر آباد پر پولیس ایکشن کا دل دوز واقعہ ہے۔ اس قیامت صغریٰ کے اور مضمرات کے ساتھ سب سے بڑا جانکاہ حادثہ ایک ہندوستانی زبان کی اولیں جامعہ کا خاتمہ ہے۔ جامعہ عثمانیہ جس نے اردو کو اپنا ذریعہ تعلیم قرار دے کر تیس بتیس سال تک نہایت اونچے درجے تک کی تعلیم کا نہایت کامیاب تجربہ کیا تھا، اسی جامعہ میں یہ زبان حرف غلط کی طرح میٹ دی گئی۔ غضب خدا کا یہ صدمہ اردو کو بدیسیوں کے ظالم ہاتھوں نہیں اپنے ہی دیس کے مہربان ہاتھوں سہنا پڑا۔ استاد محترم کی خدمت میں مجھے بیس بائیس سال تک نیاز حاصل رہا۔ اس دوران میں بس ان ہی دنوں میں میں نے انھیں مضمحل، مغموم اور ایک حد تک مایوس دیکھا۔ انھیں ان دنوں ایسا محسوس ہوتا تھا جیسے کسی نے ان کی عمر بھر کی کمائی لوٹ لی، ان کے عمر بھر کے کئے دھرے پر پانی پھیر دیا۔ میں پھر عرض کروں گا استاد محترم زندگی، قوت اور حرکت کا ایک ابلتا ہوا چشمہ تھے۔ ۱۹۴۸ء کے بعد سے اس چشمہ کے جوش و خروش میں کچھ کمی آ گئی تھی۔ لیکن یہ کیفیت عارضی رہی۔ بدلے ہوئے حالات سے دل شکستہ ہو کر ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھے رہنے کی جگہ انھوں نے ایک باہمت سپاہی کی طرح پھر ایک بار کمر ہمت کس لی، اور پھر ایک تازہ ولولے اور ایک نئے جوش کے ساتھ وہ اپنی زندگی بھر کے مشن کو پورا کرنے میں منہمک ہو گئے۔ اسی دور میں اپنی ان تھک محنت سے انھوں نے ادارۂ ادبیات اردو کی شاندار اور خوب صورت عمارت "ایوان اردو" بنوائی جس کی تعمیر میں ہزاروں نہیں لاکھوں روپیہ صرف ہوئے۔ مایوسی اور اضمحلال کے دور میں استاد محترم وہ کارنامے انجام دے گئے جو اوروں سے تازہ امنگوں اور ولولوں کے دنوں میں بھی انجام نہ پا سکے۔

دکن میں اردو کی شاندار خدمات انجام دینے کے بعد استاد محترم نے ملک کے انتہائی شمال میں ایسی ہی شاندار خدمات

انجام دینے کے عزم و ارادے کے ساتھ کشمیر کی سرزمیں پر قدم رکھا کشمیر کی حکومت اور خاص طور پر اس کے وزیر اعلیٰ بخشی غلام محمد صاحب کے فیاضانہ اور ہمدردانہ سلوک کی بنیادوں پر استاد محترم ایسے ہی شاندار انجام کا آغاز کر چکے تھے کہ قضا کے بے رحم ہاتھوں نے انھیں ہم سے اور اہل کشمیر سے ہمیشہ ہمیشہ کے لئے چھین لیا۔ استاد محترم ایک ایسی سرزمین میں جو اپنی زرخیزی کے لئے عالم میں ضرب المثل ہے، اُردو کی محبت کا تخم بو گئے ہیں۔ انشاءاللہ ایک سیدزادے کی یہ محنت رائگاں نہ جائے گی۔ اس کے مبارک ہاتھوں کا لگایا ہوا یہ پودا ایک دن بڑا گھنا درخت بنے گا اور اس کے سایے میں مستقبل کے کشمیری ادیب، شاعر اور ادب نواز پروان چڑھیں گے۔ اس سرزمین میں ایک غریب الدیار خادم اردو، عاشق اردو اور مخدوم اردو کا مزار اہل کشمیر کے دلوں میں اردو کے تعلق سے آتش شوق کو بھڑکاتا ہی رہے گا۔

ہم دکنیوں کے لئے استاد محترم روشنی کا ایک بہت بڑا مینار تھے۔ وہ ہمارے گوہر شب چراغ تھے۔ وہ ہمارے سب سے بڑے ادبی رہنما اور ہمارا سب سے بڑا سہارا تھے۔ کوئی علمی کام ہوتا، کسی مجلس آرائی کی بات ہوتی، کوئی ادبی مسئلہ سامنے آتا، کسی کتاب کی طباعت اور اشاعت کی اسکیم ہوتی تو اس سلسلہ کی تمام دشواریوں اور الجھنوں میں ذہن سب سے پہلے استاد محترم ہی کی طرف جاتا اور ایک طرح کی طمانیت کا احساس ہوتا کہ یقیناً وہ ان تمام دشواریوں اور الجھنوں کا بہترین حل تلاش کر دیں گے۔ اردو کے اس دور ابتلا میں قدرت نے روشنی کا یہ مینار، یہ گوہر شب چراغ بھی ہم سے چھین لیا۔ شاید اس لئے چھین لیا کہ ہم اور بھی چوکنے اور چوکس ہو کر کام کریں، اتفاق و اتحاد سے کام لیں۔ جو کام وہ تمام چھوڑ گئے ہیں ان کو پایہ تکمیل کو پہنچائیں۔ اس منزل کی طرف گامزن رہیں جس کی وہ نشان دہی کر گئے ہیں۔ بس یہی ایک صورت اردو کے اس مرد توانا اور بطل عظیم کی روح کو شاد کرنے اور اسکے احسانوں کی سپاس گزاری کی مہم ہم دکنیوں کی طرف سے ہو سکتی ہے۔

استاد محترم ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور کی موت کا خیال آتا ہے تو میرے ذہن میں بے اختیار ایک عرب شاعر کے لکھے ہوئے مرثیے کے شعر گھومنے لگتے ہیں۔ کہتا ہے:۔

> تیرے مرنے سے پہلے میں کبھی یہ باور نہ کر سکتا تھا کہ ایک زبردست
> پہاڑ بھی زیر زمیں ہو سکتا ہے۔ لیکن جب لوگ تجھے دفن کر چکے تو
> مجھے معلوم ہوا کہ ہاں، یہ لئیم بڑے سے بڑے پہاڑ کو بھی نگل سکتی ہے!

ڈاکٹر گوپی چند نارنگ (امریکہ سے)

ڈاکٹر زور — چند تاثرات

زندگی اگر نعمت ہے تو موت بھی نعمت سے کم نہیں، کیونکہ زندگی کا بھرم اگر کسی چیز سے قائم ہے تو وہ موت ہی ہے۔ امیدوں کے چراغ جلانے ہی بجھانے کے لئے جاتے ہیں۔ لیکن موت سے شکوہ یوں کیا جاتا ہے کہ کم بخت وقت بے وقت آتی ہے۔ ڈاکٹر زور کا انتقال بھی ایک ایسا ہی صدمہ ہے۔ کسے معلوم تھا کہ اردو کا یہ بے لوث خدمت گذار، دکنی ادب و تہذیب کا یہ عاشق صادق اور سعی و عمل کا یہ آتش فشاں اس قدر جلد خاموش ہو جائے گا۔ کئی دنوں تک مجھے ان کی موت کا یقین نہ آیا۔ ان کا وہ مسکراتا ہوا چہرہ، پان چباتے ہوئے ہونٹ، کشادہ پیشانی، دل کی گہرائیوں سے جھانکتی ہوئی آنکھیں اور لہک لہک کے باتیں کرنے کا انداز جب بھی یاد آتا ہے، ان کی جدائی کا احساس شدید سے شدید تر ہو جاتا ہے۔ ان سے آخری ملاقات انتقال سے چار ہی روز پہلے ۱۹ ستمبر ۱۹۶۲ء کو پالم پر ہوئی تھی، جب وہ بمبئی سے کشمیر واپس جا رہے تھے۔ جہاز کے روانہ ہونے میں کچھ دیر تھی۔ میں نے کہا:

"اب اجازت دیجئے۔ پالم سے دہلی یونیورسٹی بس سے دو تین گھنٹے کا راستہ ہے۔ جتنی دیر میں آپ سری نگر پہنچیں گے، میں یونیورسٹی پہنچوں گا۔"

کہنے لگے، "خوب! کیا آدھا گھنٹہ بھی آپ ساتھ نہیں رہیں گے۔" پھر کچھ دیر رک کر بولے: "ابھی تو آپ سے بہت سی باتیں کرنی ہیں۔ یہ تو آپ نے بتایا ہی نہیں کہ سری نگر کب آ رہے ہیں"؟

"تیس ۳۰ کو پہنچ رہا ہوں"

"کہاں ٹھیریں گے۔ اب کے بھی میرے ہاں نہیں ٹھیریں گے کیا"؟

ان کی گفتگو کا ایک خاص انداز یہ تھا کہ جملے کے آخری حصے کو کھینچ کے بولتے تھے، جس سے لہجے میں ترنم کی سی کیفیت پیدا ہو جاتی تھی

میں نے جواب دیا:

حضور آپ 'ولی' ہیں، مجھے ڈر لگتا ہے کہیں پھر کوئی بد دعا نہ کر بیٹھیں۔"

اس پر انھوں نے قہقہہ لگایا اور پچھلی باتوں کو یاد کر کے ہنسنے لگے۔ ہوا یوں کہ اکتوبر ۱۹۶۱ء میں میں آل انڈیا اورینٹل کانفرنس میں شرکت کے لئے سری نگر پہنچا۔ زور صاحب کا اصرار تھا کہ میرے ہاں رکیئے۔ لیکن ایک تو میں اکیلا نہیں تھا، دوسرے مجھے یہ احساس تھا کہ تلسی باغ کا مکان رفعت منزل تو ہے نہیں سکتا، چنانچہ میں نے فیصلہ کیا کہ زور صاحب کی مہمان نوازی کا ناجائز یا جائز فائدہ فی الحال نہ اٹھایا جائے۔ سوء اتفاق کہ میں بیمار پڑ گیا۔ انھیں معلوم ہوا تو موٹر میں بیٹھ کر فوراً ٹورسٹ سنٹر آئے اور نہایت شگفتہ انداز میں بولے

"یہ میرے ہاں نہ ٹھیرنے کا نتیجہ ہے" میں نے کہا "نہیں تھا کہ کسی باغ ہر طرح آرام سے رہیں گے۔"
چنانچہ اب کی بار میں نے زور صاحب کو یقین دلایا کہ میں کوئی خطرہ مول لینے کو تیار نہیں ہوں۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ واپس ہی، وہ اکتوبر کو میری ایک عزیزہ کی شادی تھی۔ اس پر کچھ سخت لہجے میں بولے:
"تو کیا ایک ہی دن رہیں گے؟"
"جی ہاں"
"یہ نہیں ہو سکتا، کچھ پہلے کیوں نہیں آتے۔ صرف یونیورسٹی ہی کا کام نہیں، کچھ اور بھی پروگرام رکھئے۔ گلمرگ نہیں دیکھیں گے"
میں نے کہا: "۲۴ تک کلاس ہیں، ۲۵ کو آ سکتا ہوں۔"
کہنے لگے: "بہت خوب، میاں جب سفر کیا جائے تو کچھ رکنا بھی چاہئے۔" لیکن کسے معلوم تھا کہ ان کی مہلتِ عمر ختم ہو چکی ہے خود ہی رکنا پسند نہ کریں گے!
ڈاکٹر زور ایک اچھے انسان اور ایک اچھے ادیب تھے۔ ان کے ساتھ ساتھ دکنی ادب کا ایک روشن باب ختم ہو گیا۔ افسوس "خاک کے پردے" سے روز روز باہر نہیں آتے:

گلے برفت کہ شاید بعد بہار دگر

موجودہ دور میں اردو والوں کے نزدیک دکن کے بغیر زور اور زور کے بغیر دکن دونوں ادھوری سچائیاں ہیں۔ اردو بھیونا تھی۔ ان کی ایک ایک سانس اردو کے لئے وقف تھی اور انھوں نے اپنی پوری زندگی اسی کی خدمت میں کھپا دی۔ اگرچہ کی دکن کی سماجی اور علمی زندگی کی تاریخ مرتب کی جائے تو زور مرحوم کے جذبے کی آنچ قدم قدم پر محسوس کی جا سکے گی۔ اٹھتے بیٹھتے جاگتے انھیں اگر کسی چیز کا خیال تھا تو اردو کا۔ مقصد سے ایسی والہانہ وابستگی کم ہی لوگوں میں نظر آتی ہے۔ ویسے اعتراض والوں کی زبان کس نے روکی ہے۔ اعتراض تو اقرار کی آبرو ہے، ہاں انسان ہم سب ہیں اور فرشتہ ہم میں کوئی نہیں۔ اگر کو دعویٰ اپنے فرشتہ ہونے کا ہے تو پھر اس کے لئے فخر و ناز کا محل نہیں، کیونکہ انسان ہونے کی سعادت تو اسے حاصل ہی نہ بات تو انسان ہی کے حصے میں آتی ہے کہ وہ "مجموعۂ اضداد" ہے، بھلائی اور برائی کا، خوبی و خامی کا۔ اور زور اور کمزوری سے بڑے ادیب و مصنف کا نفسیاتی تجزیہ کیا جائے تو وہ بھی "سماجی جانور" کی سطح پر یا تو مالی منفعت کے لئے کام کرتا ہے یا منصب کے لئے یا اور اگر کسی نے بڑا تیر مارا اور مصلحتوں کے دروازے بند بھی کر لئے تو یا وہ اپنی محرومیوں کا بدلہ دوسروں ہو لے گا، یا تعریف و تحسین اور شہرت کی زلفِ گرہ گیر سے کھیلتا ہوا دکھائی دے گا۔ انھیں کمزوریوں میں بشریت کی شان ہے۔ کوتاہیوں کے "باوصف" اگر کوئی علمی سطح پر قدیم ادبی جواہر پاروں کی بازیافت کرے اور تاریخِ قدیم و جدید کی کڑیاں ملانے میں مدد خدمتِ زبان کی سطح پر زبان کی نشر و اشاعت کے دائرے کو وسیع کرے اور زبان سے محبت کے جذبے کو عام کرے، تو اس اس کی زبان کے لئے قابلِ فخر قرار دینا ہی پڑے گا۔ ڈاکٹر زور کے کارناموں کی بنیادی نوعیت یہی ہے۔ انھوں نے بیسویں تیسری دہائی میں قلم سنبھالا تھا۔ حیدر آباد میں شاعروں کی کمی نہ اس وقت تھی، اب ہے۔ لیکن سنجیدہ علمی و ادبی کام کرنے وقت کتنے تھے اور آج کتنے ہیں، اس فرق کو جان لینا ہی زور صاحب کی خدمات کا اعتراف کرنا ہے۔ یہ تعداد اب بھی زیادہ اور شاید کبھی زیادہ نہ ہو سکے۔ قحط الرجال کا ماتم ہر دور میں رہا ہے اور فطرت کی فیاضیوں کی ایک ادنیٰ سی مثال یہ ہے

ے کے مقابلے میں جہالت کا دائرہ ہمیشہ وسیع تر ہی رکھا گیا ہے۔ پھر بھی اس میں کلام نہیں کہ حیدرآباد کی ادبی زندگی میں پچھلی ربع صدی ں بعض اہم تبدیلیاں ہوئی ہیں۔ حیدرآباد کے موجودہ لکھنے والوں کی خاصی بڑی تعداد (بشمول شعرا کے) زور صاحب کی تربیت یافتہ ہے۔ ان کے تربیت یافتہ نہیں، وہ بھی زور صاحب کی تصانیف یا ان کی شخصیت سے بالواسطہ یا بلاواسطہ کسی نہ کسی طرح ضرور متاثر رہے ہیں؛

آہ کس انداز سے گذرا بیاباں سے کہ میر
جی ہر اک نخچیر کا اس صید افگن میں رہا

کنیات پر باقاعدہ کام کی ابتدا تیسری دہائی کے شروع میں مولوی عبدالحق کی تحریروں سے ہوئی تھی، اس وقت کون جانتا تھا کہ کام بُرا بھلا دکنیوں ہی سے انجام پائے گا۔ محی الدین اس وقت بی اے میں وحید الدین سلیم سے درس لیا کرتے ہوں گے۔ معلوم تا ہے کہ نئی دریافتوں کے نقش ان کے حساس ذہن نے نہایت تیزی سے قبول کرنا شروع کر دیئے اور فارغ التحصیل ہونے کے بعد ند ہی برسوں میں دکنی سرمائے کا بڑا حصہ انھیں کی اور ان کے ساتھیوں کی کوششوں سے شائع ہونا شروع ہو گیا۔ یہ ہر شخص جانتا ہے کہ زور صاحب کے نام سے ان کا تخلص زیادہ مشہور ہے۔ یہ بات تو شاید ان کا کوئی ہم عمر ہی بتا سکے گا کہ بچپن میں انھیں کس محرومی کا شدید حاس رہا، لیکن اتنا ظاہر ہے کہ طالب علمی کے زمانے میں جب وہ شمالی ہندوستان والوں سے اپنے زمانے کے دکنیوں کا مقابلہ کرتے وں گے تو انھیں دکنیوں کی کوتاہ قلمی یا کم مائگی بری طرح کھٹکتی ہوگی۔ چنانچہ اس کا ردِ عمل طالب علمی ہی کے زمانے میں جوشِ نمو کی صورت میں ظاہر ہوا، اور روحِ تنقید کے مصنف کی حیثیت سے وہ ادبی افق پر ایک روشن ستارے کی طرح چمکنے لگے۔ اس کے بعد انھوں نے زبردست د اعتمادی سے کام لیا اور تصنیف و تالیف میں اس طرح جُٹ گئے کہ کتاب پہ کتاب شائع ہوتی چلی گئی۔ ان کی تحریروں سے ان کے ذوقِ عمل ام کی دکن اور اردو سے بے انتہا محبت کا پتہ چلتا ہے۔ انھیں اس بات کا بھی شدید احساس تھا کہ شمالی ہندوستان والوں کے فطری احساس تری کی بنا پر اردو کی ادبی تاریخ میں اور ہندوستان کی تہذیبی تاریخ میں دکن کے کارناموں کو ان کا جائز مقام دلانا ایک انسان کا کام نہیں، س کے لئے ایک جماعت کی، ایک تحریک کی ضرورت ہے۔ چنانچہ وہ جرأتِ رندانہ سے آگے بڑھے۔ انھوں نے ادارے بنائے، انجمنوں کی بیاد ڈالی، شبینہ مدرسے قائم کئے، روساء کے سامنے گڑگڑائے، دوستوں سے مدد لی، شاگردوں کو پکڑا، خود لکھا، دوسروں سے لکھوایا۔ س جو بھی ملتا گیا، وہ اسے کچھ نہ کچھ بنانے کی کوشش کرتے گئے۔ زور صاحب کی ایک خوبی یا خامی یہ تھی کہ ہر شخص کو جوہر قابل سمجھ لیتے۔ بی اس لئے کہ اس سے اردو کا پرچم لہراتے رہنے میں مدد ملی اور خامی اس لئے کہ وہ اپنی قوتوں کو مجتمع نہ کر سکے۔ انھیں جہاں امید کی ہلکی ی کرن بھی نظر آتی، ریجھ جاتے، ہر چنگاری کو شعلہ بنا دینے کی فکر کرتے۔ ادارہ ادبیات اردو کی مطبوعات اس کی بہترین مثال ہیں۔ یں نے ان سے ایک بار معلوم کرنا چاہا کہ آپ نے اپنی معیار کی ترازو کو اتنا ڈھیلا کیوں چھوڑ دیا ہے؟ کہنے لگے —— ہیرے کنکریوں ہی سے تو ملتے ہیں۔ لیکن شاید انھوں نے اس بات کو ہمیشہ نظر انداز کر دیا کہ ہر سنگریزہ ہیرا نہیں ہوتا۔

زور صاحب کا خیال تھا کہ اہلِ دکن، 'اہل نہیں' کاہل ہیں۔ جب کسی کو نصیحت کرتے، کہتے:

درختِ کاہلی کفر آورد بار

ن کے حلقۂ ارادت میں آنے کی شرط یہی تھی کہ انسان پہلے ہی قدم پر مجنون ہو جائے۔ ڈاکٹر حفیظ قتیل سے ان کی طالب علمی کے زمانے میں انھوں نے ایک بار کہا تھا:

— بیوقوف صاحب! کوئی قلم اٹھاتے ہی نوبل پرائز ہولڈر نہیں بن جاتا۔ برسوں قلم گھسنا پڑتا ہے،

تب کہیں ایک معیار پیدا ہوتا ہے۔ مگر یہ بات ہم دکھنیوں کی سمجھ میں نہیں آتی۔ وہ چاہتے ہیں کہ
لکھیں گے تو مو کے کی کتاب لکھیں گے، ورنہ نہیں لکھیں گے۔ نتیجۃً اسی طرح گمنام مر جاتے ہیں۔"

جب خلوص و محبت اور نیک نیتی سے وہ لوگوں کی ہمت افزائی کرتے تھے، وہ ہر لحاظ سے قابلِ قدر ہے، اور ماتم اسی بات کا ہے کہ اب ایسے استاد کہاں پیدا ہوں گے!

زور صاحب کا سلسلۂ نسب حضرت سید شاہ علی سانگڑے سلطان سے ملتا ہے۔ صوفیانہ روایتیں انھیں ورثے میں ملی تھیں۔ سینہ بے کینہ رکھتے تھے اور رواداری اور اخلاص و اخوت کا پیکر تھے۔ وہ ان لوگوں میں سے تھے جو اس اصول کو ایمان بنا لیتے ہیں:

از ہزاراں کعبہ یک دل بہتر است

دہلی اور اتر پردیش کے مقابلے میں دکن کی سماجی زندگی باہمی یگانگت اور تہذیبی اشتراک کی بہتر مثال پیش کرتی ہے۔ ڈاکٹر زور دکن کی اتحاد پسندانہ روایتوں کے رمز شناس تھے اور ان کے فروغ کے لئے دل و جان سے کوشاں رہتے تھے۔ محمد قلی قطب شاہ سے ان کی نسبت کا ایک پہلو یہ بھی ہے کہ اپنے وطن سے، مقامی معاشرت سے اور مشترکہ تہذیبی سرمائے سے انھیں گہری محبت تھی۔ بڑے صاف گو "کھرے" قسم کے انسان تھے، جو دل میں ہوتا تھا بے باکی سے زبان پر لے آتے تھے۔ میں نے انھیں دوسروں کی نجی باتیں کرتے اور چٹکیاں لیتے بھی دیکھا ہے۔ لیکن مذہب یا عقیدے کی بنا پر انھوں نے کبھی کسی پر چوٹ نہیں کی۔ وہ سرے سے دل میں ایسا کوئی چور رکھتے ہی نہ تھے۔ آئندہ نسل جب ان کی ادبی اور تاریخی تحریروں کو موجودہ زمانے کی تحریکوں کے پس منظر میں دیکھے گا تو محسوس کرے گا کہ سماجی تعلقات کو خوشگوار بنانے میں بھی ان کی خدمات لائقِ رشک رہی ہیں۔ پولیس ایکشن کے بعد حیدرآباد کی زندگی میں کیا انقلاب آیا، اس کا ذکر کرتے ہوئے زور صاحب نے کہا تھا:

"تقسیم ہند اور انقلاب حیدرآباد کے بعد اردو والوں کی ضروریات اور حالات میں جو تبدیلی آئی ہے اس کے باعث کام کرنے کے مواقع اور میدان بدل گئے ہیں اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ پھر از سرِ نو جد و جہد شروع کرنے کی ضرورت ہے۔ طوفان اور ہنگامہ آرائی کے آثار نمایاں ہیں، کام کرنے کا یہی تو اصل وقت ہے۔"

اس کے بعد اردو پر کیا کچھ گزری اور مشترکہ تہذیبی عناصر پر کیا کچھ گزر سکتی تھی، اس کا تصور مشکل نہیں۔ آزادی کے بعد پورا ہندوستان احیا پرستی کا شکار ہے اور فرقہ واریت، صوبائیت اور لسانی تعصب جگہ جگہ اپنی انتہا پر پہنچ گیا ہے۔ لیکن کیا وجہ ہے کہ حیدرآباد کی سماجی زندگی خود ان زہریلی ہواؤں کے اثر سے محفوظ رکھنے میں ایک حد تک کامیاب رہی ہے۔ ایک حد تک کا اضافہ اس لئے کیا گیا کہ کلیتاً تو ہندوستان کا کوئی گوشہ ان اثرات سے بری نہیں۔ حیدرآباد میں بھی بھاگ نگر کی بحث اس کی ادنیٰ سی مثال ہے۔ لیکن اس کے باوجود مجموعی طور پر حیدرآباد کے عوام کو آج بھی اپنے اس مشترکہ ماضی کا احساس ہے جس نے مذہب و ملت کی بنا پر ایک دوسرے سے نفرت کرنے کا درس نہیں دیا تھا بلکہ سماجی اتحاد کی بدولت سب کو قومیت کے ایک ہی رشتے میں پرو دیا تھا۔ ماضی کے اس قابلِ فخر سرمائے سے لوگوں کو روشناس کرانے اور قدیم دور کی صحت مند روایتوں کو حال کے تقاضوں کی روشنی میں پرکھنے کے کام میں یوں تو کئی حضرات کی کوششیں شامل رہی ہیں، لیکن جو شخص ان کاموں میں سب سے پیش پیش رہا، وہ ڈاکٹر زور ہی تھے۔ آزادی سے پہلے انھیں طعنے دیئے جاتے تھے کہ وہ سلاطینِ آصفیہ سے منہ موڑ کر قطب شاہیوں کی مدح گستری کر رہے ہیں۔ آزادی کے بعد بعض کوتاہ بیں انھیں حیدرآباد کی اسلامی تاریخ کا پرستار سمجھتے تھے، لیکن انھوں نے ہم

نہیں ہاری اور وہی کرتے رہے جسے انھوں نے ضروری خیال کیا۔ اگر یہ کہا جائے کہ انھوں نے یوم محمد قلی قطب شاہ کی تقریبیں منعقد کیں، جلسے کرائے، جلوس نکالے، نمائشیں کرائیں، مقالے پڑھوائے، مضمون چھاپے، کتبے لگوائے یا روشنی کے انتظام کئے، تو یہ سب چھوٹی باتیں ہوں گی۔ اصل چیز تو یہ ہے کہ انھوں نے قدیم کلچر کی انسان دوستی کے پیغام کو عام کیا اور قطب شاہی تمدن کے اصلی روپ کو اس خوبی سے پیش کیا کہ پورا آندھرا اپنی اس مشترکہ میراث پر فخر کرنے لگا۔ تاریخ کے ایک نازک موڑ پر ڈاکٹر زور کا یہ ایسا کارنامہ ہے جس کی جتنی داد دی جائے کم ہے۔

زور صاحب خوش وضع اور خوش مزاج انسان تھے۔ زود رنج بھی تھے۔ میں نے انھیں بہت جلد بگڑتے اور منتے دیکھا ہے۔ اکثر ان کا غصہ خلوص کا رنگ لئے ہوتا تھا۔ جہاں رنجیدہ ہوئے، بول اٹھے اور دل کا بوجھ ہلکا کرلیا۔ وہ ان لوگوں میں نہیں تھے جو بات بات پر خفت ہو جاتے ہیں۔ اور دل میں گرہ لگا لیتے ہیں۔ ان سے میرے تعلقات کی ابتدا خط و کتابت کے ذریعے ہوئی، اور سوئے اتفاق کہ وہ پہلے ہی خط پر بگڑ بیٹھے۔ میں نے ان سے وجہی کے ایک ممدوح سے متعلق کچھ معلوم کیا تھا۔ انھوں نے نہایت محبت سے دو تین صفحوں کا خط لکھا اور تمام ضروری معلومات فراہم کر دی۔ میں بوجہ شکریہ کا خط لکھ سکا نہ رسید سے مطلع کرسکا۔ تین چار مہینے کے بعد دلی میں ان سے ملاقات ہوئی تو پہلا سوال طنزاً انھوں نے یوں داغا:

"اچھا تو آپ ہی نے وہ خط لکھا تھا"

میں نے اقرار کیا۔ وہ دھم سے ایک صوفے پر جاکے بیٹھ گئے۔ پاندان کھولا، گلوری منہ میں رکھی، انگلیوں کو ہتھیلی پر مسلا اور اس کے بعد جو انھوں نے نوجوانوں کی بدتمیزی، آداب سے ناواقفیت اور بے پروائی پر وعظ دینا شروع کیا تو مجھے سر جھکائے سننے ہی بنی۔ لیکن مجھے کیا برا تھا "سننا" اگر ایک بار ہوتا!

دوسرا واقعہ اس سے بھی سخت گزرا۔ چند ماہ بعد زور صاحب کا پھر دلی آنا ہوا: میں نے سوچا چلو اب گناہ بخشوالیں۔ جگن ناتھ آزاد، حسن نعیم اور میں زور صاحب کے ساتھ پارلیمنٹ اسٹریٹ سے نکل کر کناٹ پلیس آئے۔ گھنٹہ ڈیڑھ گھنٹہ کافی ہاؤس میں نشست رہی۔ اس کے بعد زور صاحب نے گھر کے لئے کچھ سامان اور بچوں کے لئے کھلونے اور چمک دار کاغذ کے دو رول خریدے۔۔۔ رات کے دس بج چکے تھے۔ زور صاحب کو یونیورسٹی واپس پہنچنا تھا۔ قرار پایا کہ زور صاحب ناحق ٹیکسی پر روپیہ کیوں برباد کریں، اس وقت بس آسانی سے مل جائے گی۔ چنانچہ تھوڑی دیر کی انتظار کے بعد ہم تینوں نے بڑے اہتمام سے زور صاحب کو بس میں سوار کیا اور ان کا سامان بھی احتیاط سے ان کے ساتھ کر دیا۔ جگن ناتھ آزاد اور حسن نعیم کی تو خیریت رہی، یونیورسٹی میں دوسرے دن میری زور صاحب سے مڈبھیڑ ہوگئی۔ اور میری جو شامت آئی، تو مزاج پرسی کے بعد پوچھ بیٹھا:

"کل رات واپس پہنچنے میں کوئی دقت تو نہیں ہوئی؟"

اس پر بڑے سخت لہجے میں بولے: "آپ سب نااہل ہیں، بالکل نکمے! میرے بار بار منع کرنے پر بھی آپ لوگوں نے مجھے بس میں بٹھا دیا۔ یونیورسٹی کاہے کو ہے، جنگل ہے۔ مجھے کیا معلوم مکان کہاں ہے۔ رات کے بارہ بجے تک ڈھونڈھتا پھرا۔" ایک لمحہ رک کر پھر بولے: "اور بچوں کے لئے جو سامان خریدا تھا، وہ بھی کہیں رہ گیا۔ یہ سب آپ کی وجہ سے ہوا۔"

بعد میں یہ معلوم ہوکر مجھے افسوس ہوا کہ زور صاحب نوابانہ آن بان سے زندگی بسر کرنے کے عادی تھے۔ ہوا خوری کو نکلتے تو بھی موٹر پر۔ شہر کا بس سے سفر کرنے کا شاید پہلا اتفاق تھا۔

اس واقعہ کے بعد میں نے سوچ لیا کہ اب زور صاحب سے ملاقات تو کیا ہوگی۔ لیکن چند ہی مہینوں کے بعد ان کا خط ملا کہ فلاں تاریخ کو آ رہا ہوں اور حیدرآباد ہاؤس میں ملاقات ہوگی۔ اس کے بعد جو سلسلہ شروع ہوا ہے تو آخری دم تک ان کی وضعداری میں فرق نہیں آیا۔ جب آتے، ضرور اطلاع کرتے اور زیادہ تر وقت ساتھ ہی گزرتا۔ وزارت کے کاموں اور ادارے کی مصروفیتوں سے لے کر دہلی کے گرد و غبار اور جن پتھ کی جلوہ سامانیوں تک ہر موضوع پر گفتگو ہوتی، اور نہایت بے تکلف۔

ان کے اکثر ملنے والوں نے لکھا ہے کہ زور صاحب چائے خوب پلاتے ہیں۔ کھانے کا وقت ہو تو کبھی چائے پلاتے ہیں۔ پاندان ساتھ رکھتے ہیں، لیکن پان خود کھاتے ہیں، دوسروں کو نہیں کھلاتے۔ پلکوں سے پائی تو نہیں اٹھاتے، لیکن خرچ کی کڑی نگرانی ضرور کیا کرتے ہیں۔ اگر یہ سب سچ ہے تو بھی دہلی میں ان کا رویہ نسبتاً مختلف تھا۔ یہاں وہ پان دوسروں کو بھی پیش کرتے تھے۔ کھانا یا تو کسی دوست کے ہاں ہوتا تھا یا میرے ساتھ کھایا کرتے تھے۔ میں ٹھیرا بے گھر، بے در آدمی، کبھی یہ توفیق نہ ہوئی کہ گھر لے جاکے ان کی ضیافت کا اہتمام کروں۔ ان کی نوابی کے پیشِ نظر میں ہمیشہ اپنے ہاں "بوریا" نہ ہونے ہی کے احساس سے مغلوب رہا۔ کھانا موتی محل، کناٹ پلیس یا جامع مسجد پر کھاتے تھے۔ بارہا میں نے یا میرے دوستوں نے بل ادا کرنے کی کوشش کی، لیکن وہ خود ہی دام ادا کرنے میں مسرت محسوس کرتے تھے۔ یہی عالم دوسرے اخراجات کا تھا۔ کسی پر بوجھ نہ بنتے، بلکہ فیاضانہ خرچ کرتے تھے۔

سال میں چار پانچ بار ان کا دہلی آنا ہوتا رہتا تھا۔ فراش خانے سے پان ضرور خریدتے۔ بلی ماراں میں سلیم شاہی جوتے دیکھتے، کباب نعیم جامع مسجد کے پسند تھے۔ بچوں کے لئے ٹکٹ اور معمول کے مطابق کناٹ پلیس سے لیتے اور اگر فرصت ہوتی تو اردو بازار میں کتابیں بھی دیکھتے۔ میں نے بارہا محسوس کیا دہلی کے سفر سے انھیں ایک طرح کی جذباتی آسودگی حاصل ہوتی تھی، سفر انھیں پسند تھا۔ ایک دن حیدرآباد کو واپس جاتے ہوئے نئی دہلی اسٹیشن پر بیگم پٹودی سے ملاقات ہوگئی، بولیں: "جب بھی آپ سے ملنا ہوتا ہے، اسٹیشن پر۔ حیدرآباد پہنچ بھی پاتے ہیں یا راستے ہی سے لوٹ آتے ہیں؟"

دہلی کی بے تکلف صحبتوں میں نہایت شگفتہ رہتے تھے۔ ادھیڑ عمر کی نفسیاتی گھٹن کے لئے دہلی کا قیام SAFETY VALVE کا کام دیتا ہوگا۔ وہ جی کھول کر ہنستے اور مذاق کرتے تھے۔ نئی دہلی میں ایک خاندان سے ان کے پرانے تعلقات تھے۔ اس خاندان کے ایک شخص کا اکثر تذکرہ رہتا۔ جب آتے فون پر اطلاع کرتے اور کسی نہ کسی طرح ملنے کا وقت نکال ہی لیتے۔ کبھی کبھار تحفے کی نوبت بھی آجاتی۔ ان کی سیرت و صورت کا ذکر اشاروں اشاروں میں کیا کرتے تھے۔ ایک دن دہلی کے دوستوں نے اصرار کیا۔ کہ حضرت، آخر یہ کیا پردہ داری ہے:

صاف چھپتے بھی نہیں سامنے آتے بھی نہیں!

یا تو انھیں کسی موقعے سے یہاں بلائیے یا پھر ہم خود ڈھونڈ نکالیں گے کہنے لگے: اچھا اگر آپ اتنے ہی بے چین ہیں، تو وہ آج ہمیں اسٹیشن پر پہنچانے آئیں گی، اذنِ عام ہے۔ شام کو اسٹیشن پر بہت دیر انتظار رہا۔ کسی نے آنا تھا نہ کوئی آیا۔ جب گاڑی چلنے لگی تو زور صاحب فاتحانہ انداز سے ہاتھ ہلاتے ہوئے اور غالب کا یہ شعر پڑھتے ہوئے سوار ہوگئے:

تھی خبر گرم کہ غالب کے اڑیں گے پرزے
دیکھنے ہم بھی گئے تھے پہ تماشا نہ ہوا

کبھی کبھی ان سے لندن کا تذکرہ بھی رہتا۔ جس زمانے میں زور صاحب لندن میں تھے، اردو کے دو تین اہل ادیب بھی وہیں تھے۔ قریب ایک ہوسٹل میں ایک غیر ملکی شہزادی بھی بہ سلسلۂ تعلیم مقیم تھیں۔ ان کے حسن و جوانی اور غمزہ و ادا کا بڑا شہرہ تھا۔ زور صاحب کے ایک دوست

کسی اخبار سے اس کی تصویر کاٹ لائے اور گھنٹوں اسے سامنے رکھ کر آہیں بھرا کرتے۔ بالآخر زورؔ صاحب اور ان کے ایک ساتھی نے اس ملکۂ حسن کی طرف سے ایک جعلی خط ان مجنونِ ثانی کو لکھا کہ میاں تم عاشقِ صادق ہو، کیوں ناحق مجھے تڑپاتے ہو، فلاں دن فلاں جگہ آکر ملو۔ مقررہ وقت پر زورؔ صاحب اور ان کے ساتھی بھی چھپتے چھپاتے وہاں پہنچے۔ دیکھا تو بہترین لباس پہنے، عطر مجموعہ لگائے،
دیوار سے لگے وہ تصویر سے کھڑے ہیں
اور اگر کوئی ہندوستانی متوجہ کرنے کی کوشش کرتا ہے تو وہ نظر اٹھا کے بھی نہیں دیکھتے!

ابھی چند برس کی بات ہے کہ زورؔ صاحب کے ایک دوست یورپ گئے۔ وہاں سے انھوں نے بلاؤز کے ایک خاص حیدرآبادی کپڑے کی فرمائش کی۔ زورؔ صاحب نے کپڑا بھجوا دیا۔ چند سال بعد جب دہلی میں ان صاحب سے ملاقات ہوئی، تو بغل گیر ہوتے ہوئے چھوٹتے ہی ان سے پوچھا:

"کیوں صاحب! وہ کپڑا آپ کی معشوقہ کو پسند آیا تھا کیا"؟

زورؔ صاحب باتیں ٹھیٹھ دکنی ترنگ میں کیا کرتے تھے۔ ایک بار ادارے کے کام سے ایک ایسے صاحب کے ہاں جانا ہوا جن کا شمار عمائدینِ علی گڈھ میں ہوتا ہے۔ ان کی سلیقہ شعار اور باوقار بیگم بھی دلکش تھیں۔ اتفاق سے ان کی دخترِ نیک اختر بھی جو اس زمانے میں ویمنز ہاؤس میں زیرِ تعلیم تھیں، تشریف لے آئیں۔ چائے پر ساتھ رہا۔ جب ہم دونوں باہر آئے تو زورؔ صاحب نے کہا:

"بھئی، اولاد اور والدین میں کیسا کیسا فرق دیکھا ہے لیکن عجیب اتفاق ہے کہ یہاں ماں بیٹی کی بہ نسبت نوجوان نظر آتی ہے اور بیٹی اس کی بہ نسبت بوڑھی!"

زورؔ صاحب باغ و بہار انسان تھے۔ باتیں کرنے پر آتے تو محفل کو زعفران زار بنا دیتے۔ ان میں ایک خوبی یہ تھی کہ نہ بیجا طور پر کسی سے مرعوب ہوتے نہ مرعوب کرنے کی کوشش کرتے۔ تکبر، غرور اور خود پسندی انھیں چھو بھی نہیں گئی تھی۔ "انا و لاغیری" قسم کے لوگوں میں نہ تھے، ہر کسی سے برابر کا سلوک کر کے خوش ہوتے۔ پھولوں میں پھول اور کانٹوں میں کانٹا بن جاتے تھے۔

ان کے تصنیفی و تالیفی کام کو دیکھا جائے تو حیرت ہوتی ہے کہ وہ ایسی بھرپور زندگی کیسے بسر کر لیتے تھے۔ حیدرآباد کی سوشل زندگی میں ان کا ایک خاص مقام تھا، جلسے جلوس، مشاعرے، عرس، تقریبیں، دعوتیں، ملاقاتیں، کیا یہ ہر کام کے لئے ان کے پاس وقت تھا، اس پر بھی ان کی تصنیفی رفتار میں کبھی فرق نہیں آیا۔ ان کے حیدرآباد کے دوستوں میں مشہور تھا کہ ان کی تازہ کتاب کسی نے پڑھی ہے کسی نے نہیں، کو خبر ملتی ہے کہ ان کی ایک اور تصنیف طباعت کے آخری مراحل طے کر رہی ہے۔ ایک صاحب نے تو یہاں تک کہا کہ زورؔ صاحب جب سوتے ہیں تو صبح تکیے کے نیچے سے نئی کتاب نکلتی ہے۔ زود نویسی اور بسیار نویسی نے اچھوں تک کو نقصان پہنچایا تو زورؔ صاحب اس کے منفی اثرات سے کیسے بچ سکتے تھے۔ ان کی تصانیف کی تعداد پچاس کے لگ بھگ ہوگی۔ اس سے چار گنا تعداد ان کے متفرق مضامین کی ہے۔

ان کی نگارشات کے موضوعات کو سرسری نظر سے بھی دیکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ تنقید و تحقیق اور انشا و افسانے سے لے کر صوتیات و لسانیات اور تذکرہ نگاری و تاریخ نویسی ہر چیز ان کی زد میں تھی۔ ان کی بعض تصانیف کو اولیات کا درجہ حاصل ہے اور بعض کو قبولِ عام کی سند بھی ملی۔ روحِ تنقید، ہندوستانی لسانیات، سیرِ گولکنڈہ اور اردو کے اسالیبِ بیان کے چار چار، پانچ پانچ ایڈیشن شائع ہوئے۔ یوں تو انھوں نے تقریباً ہر موضوع پر لکھا، لیکن ان کے اصل کام کو بآسانی دو شقوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ دکنیات اور لسانیات، دکنیات میں اردو شہ پارے، کلیاتِ محمد قلی قطب شاہ، داستانِ ادبِ حیدرآباد اور دکنی ادب کی تاریخ ان کی ایسی تصانیف اور تالیفات ہیں جن کی اہمیت ہمیشہ باقی رہے گی۔

جیسا کہ پہلے لکھا جا چکا ہے چونکہ انھوں نے یہ کام ایک نفسیاتی جوش اور ولولے سے شروع کیا تھا، کہیں کہیں علمی معروضیت کا دامن ہاتھ
سے چھوٹ گیا ہے۔ اس کی مثالیں اردو شہ پارے پر محمود شیرانی کے اس تبصرے میں دیکھی جا سکتی ہیں۔ جو اورینٹیل کالج میگزین لاہور
میں شائع ہوا تھا۔ اس کے باوجود زور صاحب دکنیات کے امام تھے۔ اور اس سے متعلق انھوں نے ایسے بیش بہا مواد کا ڈھیر لگا دیا جس کی
تاریخی وادبی حیثیت مسلّم ہے۔ لسانیات سے متعلق انھوں نے جتنا بھی کام کیا وہ زمانۂ یورپ کی یادگار ہے۔ ہندوستانی صوتیات اور ہندوستانی
لسانیات لندن اور پیرس میں لکھی گئیں، اور اردو کے اسالیب بیان کا بیشتر حصہ بھی وہیں مکمل ہوا۔ اول الذکر دو کتابیں اپنی نوعیت کے اعتبار سے
اردو میں سنگ میل کا درجہ رکھتی ہیں۔ اس کا سہرا ابتدائے شباب کی لگن اور انہماک کے سر باندھیے یا یورپی یونیورسٹیوں کی اعلیٰ تعلیم کے یا گراہم بیلی اور
جولیس بلاک جیسے بے مثل اساتذہ کی تربیت کے بہر حال یہ تسلیم کرنا ہی پڑے گا کہ زور صاحب کی ان کتابوں کا تحقیقی پایہ بلند ہے۔ یہ اردو میں لسانیات
کی پہلی باقاعدہ کتابیں ہیں۔ اور تیس پینتیس (۳۰، ۳۵) برس گزر جانے کے بعد بھی ان کی افادیت میں زیادہ فرق نہیں آیا۔ آج بھی لسانیات پر کام کرنے والا
کوئی بھی شخص ان کارناموں کو نظر انداز کر کے آگے نہیں بڑھ سکتا۔ ڈاکٹر زور نے یہ کام اس وقت کیا جب اردو کو عام طور پر برج بھاشا کی بیٹی سمجھا جاتا
تھا۔ زور صاحب اور پروفیسر محمود شیرانی نے تقریباً ایک ساتھ تقابلی لسانیات کی راہ دکھائی اور اردو کی ابتدا کے بارے میں پنجابی زبان کی اہمیت
پر زور دیا۔ پروفیسر محمود شیرانی کی تحقیقی ژرف نگاہی اور وسعت مطالعہ اپنی جگہ خوب ہیں لیکن اردو کا رشتہ اب بھرنش اور پراکرتوں کے ذریعے
سنسکرت سے ملانے اور ہند آریائی زبان کے ساڑھے تین ہزار سال کی تدریجی تاریخ سے اردو والوں کو روشناس کرانے کی سعادت ڈاکٹر زور ہی کے
حصے میں آئی۔ زمانہ نہایت تیزی سے بدل رہا ہے اور تحقیق میں کوئی بات حرف آخر نہیں۔ اردو کی ابتدا سے متعلق بھی تحقیق ترقی کی کئی
منزلیں طے کر چکی ہے۔ گو ابھی تک ماہرین کسی نتیجے پر نہیں پہنچے لیکن اس میں شک نہیں کہ دکنی کی تشکیل کے سلسلے میں خطۂ پنجاب کی ابتدائی
اہمیت کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔

تقابلی اور تاریخی لسانیات میں تو ہم پھر بھی کچھ نہ کچھ آگے بڑھے ہیں لیکن صوتیات میں ہنوز روز اول کا سا معاملہ ہے۔ تھوڑا بہت کام
ہوا ہے اور کچھ ہو بھی رہا ہے لیکن مبسوط انداز میں ہم ابھی "ہندوستانی صوتیات" سے بہتر کتاب پیش نہیں کر سکے۔ دنیا کے مختلف ملکوں
میں آج بھی اس سے کتاب حوالہ کا کام لیا جاتا ہے اور سنیتی کمار چیٹرجی جیسے ماہرین لسانیات اس سے استفادے کا اقرار
کرتے ہیں۔

زور صاحب اس لحاظ سے "تحفۂ روزگار" شخصیت کے مالک تھے کہ تصنیفی صلاحیت کے ساتھ ساتھ وہ بے پناہ تنظیمی صلاحیت
بھی رکھتے تھے۔ ادارۂ ادبیات اردو کی بنیاد رکھی اور اپنے لئے کام کا ایسا خاکہ بنا لیا جس میں وہ تمام عمر رنگ بھرتے رہے۔ یہ زور صاحب
کی بے لوث کوشش اور گہری لگن ہی کا نتیجہ ہے کہ تیس پینتیس سال کی قلیل مدت کے اندر اندر ادارے کے کتب خانے میں ۲۵ ہزار کتابیں اور
۵ ہزار مخطوطات جمع ہو چکے ہیں۔ دستاویزات، شجروں، چربوں، سکوں، فرامین، کتبوں، مہروں، وصلیوں، سندوں اور تصویروں کا تو
کوئی شمار ہی نہیں۔ اردو ادب اور اردو والوں کی ثقافتی اور سماجی زندگی سے متعلق یہ اتنا بڑا سرمایہ ہے کہ آج اس کی بدولت ادارۂ ادبیات
کا شمار ہندوستان کے اہم ترین تحقیقی مرکزوں میں ہوتا ہے۔ ادارے کا ماہنامہ سب رس ۱۹۳۸ء میں جاری ہوا تھا، ان پچیس سالوں
میں ایک آدھ بار بند ہوا، لیکن ابھی تک جاری ہے اور اسے اردو کے اہم ترین ادیبوں کا تعاون حاصل رہا ہے۔
ادارۂ ادبیات اردو سے ہر سال اوسطاً دس کتابیں شائع ہوتی رہی ہیں یعنی تیس سالوں میں تقریباً تین سو کتابیں شائع کی جا چکی ہیں۔
مخطوطات و مطبوعات کے تذکروں کی بھی سات جلدیں شائع ہو چکی ہیں۔ پچھلے کئی سالوں سے زور صاحب نے اپنی ساری توجہ انھیں توضیحی تذکرہ

مبذول کر رکھی تھی۔ ساہتیہ اکادمی سے جس کے وہ رکن بھی تھے، اس کام کے لئے مالی امداد مل رہی تھی۔ ان کا خیال تھا کہ یہ سلسلہ کم از کم بیس جلدوں میں ختم ہوگا۔ اردو کے مخطوطات ہندوستان کے کونے کونے میں بکھرے ہوئے ہیں۔ بعض کتب خانوں میں بھی اہم ذخیرے ہیں۔ لیکن چونکہ ان کی توضیحی فہرستیں شایع نہیں کی گئیں، ان سے استفادے کا دائرہ محدود ہے۔ دنیا کے ترقی یافتہ ملکوں میں علمی کاموں کے سلسلے میں سب سے پہلے توضیحی فہرستوں ہی پر توجہ کی جاتی ہے، تحقیق میں ان کی حیثیت ریڑھ کی ہڈی کی سی ہے۔ زور صاحب نے ان فہرستوں کے ذریعے نہ صرف اردو کے بعض غیر معروف مخطوطات کا تعارف کرایا بلکہ ادارے سے استفادے کے امکانات کو بھی وسیع کر دیا۔ اردو میں ان توضیحی فہرستوں کی حیثیت بنیادی کتبِ حوالہ کی ہے۔ افسوس ہے یہ کام ادھورا ہی رہا۔ کشمیر کی پروفیسری سے اس میں تعطل پیدا ہوا تو موت نے اس نخلِ آرزو کی جڑ ہی کاٹ کر رکھ دی۔

"ایوانِ اردو" کی تعمیر کو بھی زور صاحب کے کارناموں میں شمار کرنا چاہیے۔ اردو کے کاموں میں اپنوں کی بے اتفاقی اور "غیروں" کی بے اعتنائی ضرب المثل کا درجہ رکھتی ہے، اس پر نامساعد حالات! جب عمارت کے لئے زمین حاصل کرنے کی سب کوششیں ناکام ہو گئیں تو بیگم زور نے آگے بڑھ کر یہ مشکل آسان کر دی۔ جس زمانے میں زور صاحب سے میرے تعلقات شروع ہوئے۔ تو نواب زین یار جنگ کے قائم کردہ فنڈ سے ایوانِ اردو کی تعمیر کا کام شروع ہو چکا تھا، لیکن رقم بہت جلد ختم ہو جانے سے عمارت ادھوری پڑی تھی۔ زور صاحب دہلی آتے تو ان کی بیقراری اور بے چینی دیکھنے کے لایق ہوتی۔ اربابِ اقتدار کے دروازوں پر حاضری دینے ہی میں صبح سے شام ہو جاتی، کبھی کبھی تو دوپہر کا کھانا بھی نصیب نہ ہوتا۔ کہا کرتے تھے ——— "میرا تعلق تصوف و عرفان کے خاندان سے ہے اور میں کبھی ناامید نہیں ہو سکتا۔ میں نے بڑے ہی ناموافق ماحول میں ادارہ قائم کیا تھا تو اب کیسے جی چھوڑ دوں۔" ہندوستان میں ایسے کام کس قدر مشکل ہیں، اس کا صحیح اندازہ وہی لوگ کر سکتے ہیں جنھیں اس طرح کے کاموں سے واسطہ پڑا ہے۔ سیاست کی دنیا میں آج کچھ ہے تو کل کچھ اور۔ کبھی سر اکبر حیدری اور مرزا اسمٰعیل نے سرپرستی کی تو کبھی سالار جنگ اور صدر المہام فینانس غلام محمد نے۔ غرض ایک کے بعد ایک کے سامنے دستِ سوال دراز کرنا پڑا، لیکن ڈاکٹر زور نے ہمت نہیں ہاری، گویا:

بہر یک گل منتِ صد خار می باید کشید

بالآخر مولانا آزاد، بخشی غلام محمد، گوپال ریڈی اور ہمایوں کبیر کی مدد سے وہ عمارت مکمل ہو ہی گئی جس کی ایک ایک اینٹ سے ڈاکٹر زور کے صبر و استقلال اور عزم و ارادے کا درس لیا جا سکتا ہے۔

۱۹۵۹ء میں انھوں نے ادارے ہی کی عمارت میں عارضی طور پر ابوالکلام آزاد ریسرچ انسٹی ٹیوٹ کا کام شروع کر دیا تھا۔ اس ادارے کے مقاصد نسبتاً زیادہ وسیع اور ہمہ گیر ہیں۔ اس کی علمی سرگرمیوں میں اردو، فارسی اور عربی کے علاوہ سنسکرت، ہندی، مراٹھی اور تلگو کو بھی شامل کرنے کی تجویز ہے۔ ڈاکٹر ذاکر حسین اس کے چیرمن ہیں اور نواب مہدی نواز جنگ مجلس انتظامیہ کے صدر۔ ترجمان القرآن کے بعض حصوں کا ترجمہ تلگو میں کیا جا رہا ہے۔ صحیفہ یادگارِ آزاد، اردو، ہندی اور تلگو تین زبانوں میں مرتب ہو رہا ہے۔ دکنی زبان کی گرامر، من سمجھاون، شاہ تراب، فلسفۂ رادھا کرشنن اور بعض دوسرے اہم موضوعات پر کام جاری ہے۔ اشر رام چندرا اور کتاب التذکرہ شایع ہو چکی ہیں۔ کام کی اٹھان حوصلہ افزا ہے کہ آگے چل کر یہ انسٹی ٹیوٹ ہندوستانی زبانوں کے باہمی میل جول میں اہم حصہ لے گا۔

بخشی غلام محمد جب ایوانِ اردو کا افتتاح کرنے کے لئے حیدرآباد آئے تھے تو شاید اسی وقت انھوں نے ڈاکٹر زور کو کشمیر یونیورسٹی میں آنے کی دعوت دی تھی۔ زور صاحب کی ملازمت کا آخری سال تھا۔ ایک مدت تک وہ اس ششں و پنج میں رہے کہ سری نگر جائیں یا نہ جائیں۔ حیدرآباد سے انھیں لگاؤ تھا تو سری نگر میں خدمتِ زبان کے لئے امکانات تھے۔ بہر حال جذبۂ خدمت ان کی ذاتی محبت پر غالب آیا اور ۱۹۶۰ء میں

ریٹائر ہونے کے بعد فروری ۱۹۶۱ء میں وہ سری نگر چلے گئے۔ اپنے اس فیصلے کے حق میں زور صاحب جو دلائل لاتے تھے، ان کا [illegible] تمکین کاظمی کی یاد میں لکھے گئے مضمون میں کیا ہے۔ کشمیر یونیورسٹی کے شعبہ اردو اور سری نگر کی ادبی فضاؤں میں جلد ہی انھوں نے حرکت کے آثار پیدا کر دیئے۔ آئندہ کام کے خاکے بنائے، تقریریں کیں، مضمون لکھے، لوگوں کو ابھارا اور نئے ادیبوں کی ہمت افزائی کی۔ دو تین کتابیں ادبیات اردو کے سلسلۂ ادب کشمیر میں بھی شائع کیں۔ کشمیر لاکھ جنت نظیر سہی، لیکن حیدرآباد تو نہیں۔ زور صاحب اس زمانے میں غیر مطمئن اور ناآسودہ نظر آئے۔ جب بھی ملے، ازراہِ مذاق انھوں نے یہ ضرور کہا:

"آپ بھی تو میری جلاوطنی کے حق میں تھے۔ اب تو خوش ہیں نا؟"

اس میں شک نہیں کہ کشمیر میں محنت و کوشش میں انھوں نے کوئی کسر اٹھا نہیں رکھی، اور انھیں کسی حد تک کامیابی بھی حاصل ہوئی تھی اور کیسے نئے حالات سے مطابقت پیدا کرنا آسان نہ تھا۔ یونیورسٹی میں اردو لیکچرر کی ایک جگہ خالی ہوئی۔ ریاست سے حکم نازل ہوا کہ فلاں شخص کا تقرر کیا جائے۔ زور صاحب نے صاف کہہ دیا یہ نہیں ہو سکتا۔ چند ہی روز بعد معلوم ہوا کہ انھیں صا[illegible] ہوگیا اور زور صاحب کو اگرچہ شعبہ اردو فارسی کے صدر اور فیکلٹی آف آرٹس کے ڈین تھے، انٹرویو میں بلایا تک نہیں گیا۔ انھیں ریاستی اختلافات ہو سکتا تھا، لیکن ان کی اصل شکایت کشمیر کے موسم سے تھی جو "مرغِ سوختہ" کے حق میں مفید ہو تو ہو، انسٹھ سال کی عمر میں مضر ثابت ہوا جس کی زندگی کا بیشتر حصہ حیدرآباد کی معتدل آب و ہوا میں بسر ہوا تھا۔ بار بار کہا کرتے تھے —— لندن کی ر[illegible] ہے اور پیرس کی بھی۔ لیکن ایسی سردی کہیں نہ دیکھی تھی۔ یہ جگہ چاروں طرف سے بند ہے اور جب ایک بار سردی در آتی ہے تو پھر جا[illegible] نہیں لیتی۔ فروری ۱۹۶۲ء میں سرما کی چھٹیاں حیدرآباد گزارنے کے بعد جب دوبارہ سری نگر پہنچے تو لکھا: "لیجیے اب کر خوش [illegible] دوبارہ برف دان میں بند ہوگیا ہوں۔"

یہی وہ زمانہ تھا جب انھیں اپنا مجموعۂ مضامین شائع کرنے کا خیال آیا۔ حیدرآباد سے آتے جاتے ہوئے قیام زیادہ [illegible] احمد محی الدین صاحب ہی کے ہاں رہا کرتا تھا۔ کہنے لگے، کشمیر میں تذکرۂ مخطوطات کا کام تو جاری رہ نہیں سکتا، ادھر ادھر کے کچھ مضامین ہیں۔ ارادہ ہے کہ ایک مجموعہ شائع کر دیا جائے، لیکن اس شرط پر کہ اس کی کتابت آپ دہلی میں کرائیں، جو بات دہلی کی کتابت میں ہے وہ اور کہیں نہیں آسکتی۔ میں نے حامی بھر لی۔ امید تھی کہ مہینے ڈیڑھ مہینے میں کام نمٹ جائے گا۔ لیکن کئی مہینے گزر گئے اور کام آگے نہ بڑھ سکا۔ بعد میں انھوں نے مضامین کے انتخاب اور ترتیب کا فیصلہ بھی مجھ پر چھوڑ دیا۔ میں نے کئی مضمون الگ کر دیئے، [illegible] کئے۔ جیسے جیسے وقت گزرتا گیا، زور صاحب کا تقاضا بھی شدید سے شدید تر ہوتا گیا۔ لیکن کسے خبر تھی کہ یہ بات مقدر ہو چکی ہے انتقال کے بعد ہی ان کے باقیات کے طور پر شائع کیا جائے۔

گرمیوں کے زمانے میں زور صاحب سے ایک اور ملاقات بھی احمد محی الدین صاحب ہی کے ہاں ہوئی۔ شریف احمد صا[illegible] ساتھ تھے۔ شاید جولائی کا مہینہ تھا اور صبح کا وقت۔ بادل چھائے ہوئے تھے۔ خوب پانی پڑ رہا تھا۔ مہمان خانے میں [illegible] لکھنوی عزیز بھی تشریف فرما تھے۔ کسی زمانے میں نیشنلسٹ رہے تھے لیکن بعد میں تاجرانہ اغراض سے ڈھاکے منتقل ہو چکے۔ کا نوابی حصہ ان کے ساتھ تھا۔ علم کو ضروریاتِ انسانی میں خیال کرتے تھے۔ خود تو شاعر نہیں تھے، لیکن شعر کا اتنا عمدہ ذوق تھا، میں شعر پڑھتے تھے اور ایک سے ایک لاجواب۔ معلوم ہوتا تھا اساتذہ کے پورے پورے دیوان چاٹ گئے ہیں۔ جھوم جھوم کے کہتے [illegible] سے علاقہ نہیں، وہ انسان ہی نہیں، یہ سعادت تو اشرف المخلوقات ہی کے حصے میں آئی ہے۔ بہت دیر تک لہک لہک کے شعر سناتے۔

...ت پیدا کرکے سماں باندھتے رہے۔ اس کے بعد زورؔ صاحب نے اپنی ایک تازہ غزل سنائی۔ کہنے لگے یہ چند شعر سفر ہی میں ہوئے ہیں۔ آجکل ...گوئی کا پرانا ذوق کبھی کبھی تازہ ہوجاتا ہے:

ہم اپنی گرمیٔ سوز دروں سے چیخ اٹھے — خوشا کہ مستیٔ فیض جنوں سے چیخ اٹھے
بہ نازِ طبعِ بلند و بہ زعمِ کم نگہی — زمانہ سازیٔ دنیائے دوں سے چیخ اٹھے
ذرا سی بات سے سارے جہاں میں دھوم ہوئی — جو کم سوادیٔ صبر و سکوں سے چیخ اٹھے
بہ پاس خاطر جاناں خموش بیٹھے تھے — مگر خرابیٔ بازیٔ خوں سے چیخ اٹھے

کہاں ہے وعدۂ پرویز و جلوۂ شیریں
عجب نہیں جو دل بے ستوں سے چیخ اٹھے

دو ڈھائی گھنٹے تک یہ لطف صحبت جاری رہا۔ اس کے بعد ہم لوگ تھوڑی دیر کے لئے دیوان خانے میں چلے گئے۔ واپس آئے تو دیکھا کہ ...ازم نے کمرے میں تین بستر لگا دیئے تھے۔ ڈاکٹر زورؔ صاحب نے قہقہہ لگایا اور باتیں بناتے ہوئے کہنے لگے: اس نے شاید سوچا ہوگا کہ آپ ...لا میرے ساتھ ہیں اور یہیں ٹھیر رہے گے۔ چندے توقف کے بعد بولے: کفن چور کا لطیفہ تو آپ نے سنا ہوگا۔ پیر و مرید کا معاملہ تھا۔ پیر مُردوں کے ...ن اتارنے میں ماہر تھا۔ کچھ پڑھتا، مردہ قبر سے نکل آتا اور کفن اتار کے دے دیتا۔ بڑی کوشش سے مرید نے بھی یہ ترکیب معلوم کرلی۔ کچھ دنوں ...میں پیر کا انتقال ہوگیا۔ مرید قبرستان پہنچا، منتر پڑھا، مردہ اٹھ کھڑا ہوا اور مرید کفن لے کر چلنے لگا۔ مردہ بھی پیچھے ہولیا۔ وہ گھبرایا۔ سوچا مردے ...واپس قبر میں داخل کرنے کی ترکیب تو سیکھی ہی نہیں، استاد سے پوچھنا چاہیئے۔ چنانچہ استاد کی قبر پر آکے وہی منتر پڑھا۔ استاد نے بھی قبر سے نکل کر ...پنا کفن اتار دیا۔ اب وہ دوسرا منتر پوچھتا ہے تو مردہ بولتا ہی نہیں۔ غرض گھبرا کے بھاگا۔ پہلے ایک سے جان چھڑانی مشکل ہوگئی تھی، اب دو ...پیچھے ہولئے۔ یک نہ شد دو شد۔ یہاں حالت اس سے بھی بری ہے یعنی یک نہ شد سہ شد!

اس کے دو ماہ بعد پالم پر زورؔ صاحب سے آخری ملاقات ہوئی۔ اس موقع پر انھوں نے یہ بھی بتایا کہ کشمیر سے جی بھر گیا ہے۔ بچوں کے ...متحانات کا منتظر ہوں۔ دسمبر میں ملازمت سے سبکدوش ہو جاؤں گا۔ علی جواد صاحب زیدی، کشمیر سے دامن چھڑانے میں کامیاب ہوگئے ہیں۔ ...اہر غلام السیدین نے بھی استعفیٰ داخل کردیا ہے، بس اب میری باری ہے۔ اس ملاقات کے پانچویں روز یعنی ۲۵ ستمبر کو مجھے سری نگر پہنچنا ...تھا۔ اسی روز صبح اطلاع ملی کہ دل کی دھڑکن بند ہوجانے سے ڈاکٹر زورؔ کا انتقال ہوگیا:

مجلس آفاق میں پروانہ ساں
میرؔ بھی شام اپنی سحر کر گیا

پہلے تو اس خبر کا یقین ہی نہ آیا۔ لیکن جب دوسرے ذرائع سے اس کی تصدیق ہوگئی تو سارا دن اس انتظار میں رہا کہ شاید ...اش حیدرآباد لے جانے کے لئے دہلی لائی جائے۔ اس دن موسم سخت خراب تھا۔ نہ ادھر سے جہاز گیا نہ اُدھر سے آیا۔ دوسرے ...دن بھی یہی حالت رہی اور شام تک معلوم ہوگیا کہ انھیں وہیں سری نگر کے قبرستان خانیار شریف میں دفن کردیا گیا۔ اس خبر سے ...اور بھی رنج ہوا۔ میں نے ریزرویشن منسوخ کرادی، میرے لئے اب وہاں کیا رکھا تھا:

آں قدح بشکست و آں ساقی نماند

حیدرآباد کے دیوانوں میں محمد قلی کے بعد زور صاحب کا نام سب سے زیادہ روشن نظر آتا ہے۔ وہ صحیح معنوں میں بندۂ عشق تھے۔ محمد قلی نے بھاگ متی سے محبت کی تو زور صاحب نے اس محبت کی یادگار سے محبت کی اور دونوں کو حیاتِ نو بخشی۔ کسی نے ٹھیک کہا ہے کہ عجلت ان کی افتادِ طبع بن گئی تھی۔ تصنیفی کام میں بھی وہ جلدی کرتے تھے اور مرنے میں بھی انھوں نے جلدی کی۔ اچھے تن و توش کے انسان تھے۔ اس پر کھلا ہوا رنگ۔ بظاہر ان کی صحت پر اس عمر میں بھی رشک کیا جا سکتا تھا۔ لیکن صحت نے چونکہ زندگی بھر خوب ساتھ دیا تھا، وہ اس کی طرف سے کچھ بے پروا سے ہو گئے تھے۔ اندر ہی اندر گھن لگنا شروع ہوا۔ ذیابیطس کا عارضہ تھا۔ لیکن انھوں نے ذاکٹر سے ذکر کیا نہ علاج ہی کیا۔ اور تو اور شکر سے بھی پرہیز نہیں تھا۔ "شوقِ عنان گسیختہ" نے کبھی آرام کی مہلت نہ دی۔ بالآخر کام کی زیادتی رنگ لائی۔ ۱۹ ستمبر کو دہلی سے سری نگر واپس جاتے ہوئے انھیں وائی کاؤنٹ جہاز نہیں مل سکا۔ ڈکوٹے میں سوار ہو گئے۔ اس میں فضائی دباؤ سے تحفظ کا پورا انتظام نہیں ہوتا۔ ممکن ہے دل وہیں سے متاثر ہوا ہو۔ تین دن کے بعد رات کو شدید درد اٹھا۔ حالت قابو میں نہ رہی تو ہارٹ فیل کا دورہ دیا گیا۔ یہ گویا موت کی آمد کا اعلان تھا۔ جب جب ہوش میں آتے، کہتے "اب حیدرآباد چلیں گے"۔ گویا

قید میں تھی ترے وحشی کو وہی زلف کی یاد
ہاں کچھ اک رنجِ گراں باریِ زنجیر بھی تھا

بہرحال ڈاکٹروں کی امکانی کوششوں کے باوجود وہ سری رات تک وہ ابدی نیند سو گئے: انا للہ وانا الیہ راجعون۔ ایک تو بے وقت موت اور وطن سے دور، اس پر اس المیے کی انتہا یہ ہے کہ لاش بھی حیدرآباد نہ لائی جا سکی۔ خاندانی قبرستان میں انھوں نے ایک شاندار گنبد اور خانقاہ تعمیر کرائی تھی، یہاں ہر سال ان کے والد کا عرس منایا جاتا تھا۔ زور صاحب بھی اسی قبرستان میں دفن ہونے کے آرزومند رہے۔ حالات کی ستم ظریفی کہ جس شہر کی خدمت میں انھوں نے پوری زندگی کھپا دی اور جس کے ایک ایک ذرے کی وہ عمر بھر پرستش کرتے رہے۔ مرکر اس کی خاک سے بھی ہزاروں میل دور رہے۔

ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور ایک وسیع النظر نقاد، محقق اور ماہر لسانیات کی حیثیت سے ہمارے ادب میں بلند مقام رکھتے تھے۔ انھوں نے اردو زبان کی خدمت جس وسیع پیمانہ پر کی اس کی مثالیں بہت کم ملتی ہیں۔ بابائے اردو کے بعد اگر کسی ایسے شخص کا نام لیا جائے کہ جس نے عملی اور علمی دونوں محاذوں پر اردو زبان کے لئے معرکہ آرائی کی ہے تو بلاشبہ ڈاکٹر زور ہی کا نام زبان پر آئے گا۔ انھوں نے اپنی متعدد تصانیف اور "ادارۂ ادبیات اردو" (دکن) کی صورت میں اردو دنیا کو بہت کچھ دیا۔ اس لئے اردو زبان کے ساتھ ساتھ ڈاکٹر زور کا نام بھی زندہ رہے گا۔

ـــــــ (ہم قلم کراچی۔ (اکتوبر، نومبر ۱۹۶۲ء) ـــــــ

ڈاکٹر سیدہ جعفر

ڈاکٹر زور مرحوم

زور صاحب کی "ذات" "ایک انجمن" تھی۔ وہ صرف ایک محقق، ماہر لسانیات، شاعر اور ادیب ہی نہ تھے بلکہ ان میں غیر معمولی عملی صلاحیتیں بھی موجود تھیں۔ علم اور عمل کا ایسا حیرت انگیز امتزاج بہت کم دیکھنے میں آتا ہے۔ اُن کی تمام علمی اور عملی صلاحیتوں سے قطع نظر، دکھنی ادبیات کے تعلق سے لوگ انھیں یاد رکھیں گے۔ زور صاحب دکنی تہذیب، دکنی زبان اور دکنی ادب کے سب سے بڑے رسیا تھے۔ دکن کی ثقافت اور زبان و ادب کی انھوں نے والہانہ پرستش کی، اس کی روایات کے گن گائے اور اس چمن کی اپنے خونِ جگر سے آبیاری کی۔ اُردو سے انھیں بے پناہ محبت تھی اور انھوں نے اس محبت کا حق ادا کر دیا۔ ایوانِ اردو زور صاحب کے لئے سنگ و خشت کی ایک خوب صورت عمارت ہی نہیں تھی، ان کے خوابوں کی تعبیر، ان کے تخیل کا رنگ محل، ان کی مشقوں اور آرزوؤں کی جادو نگری اور ان کا "شہر آرزو" تھا۔ جب تک ادارۂ ادبیات اردو کی ایک کتاب اور ایوان اردو کی ایک اینٹ بھی باقی رہے گی، لوگوں کے دلوں سے زور صاحب کی یاد محو نہ ہو سکے گی۔ ادارے اور انسٹیوٹ کے کاروبار ان کی زندگی کا جزو لاینفک تھے۔ اٹھتے بیٹھتے سوتے جاگتے، سفر اور حضر میں ان کے خیال سے غافل ہونا زور صاحب کے لئے ناممکن تھا۔ ڈاکٹر زور کے بعض احباب ان کا ایک واقعہ بیان کرتے ہیں۔ ایک رات یکایک طوفانی بارش شروع ہو گئی، زور صاحب چونک کر اٹھ بیٹھے، سب سے پہلے انھیں ایوان اردو کے دارالمطالعے کا خیال آیا (اس میں جالی لگی ہوئی ہے اور یہاں میزوں پر ہندو پاکستان کے تمام معیاری رسالے مطالعہ کے لئے رکھے جاتے ہیں) اکثر زور سے ہوا چلے یا زیادہ بارش ہو تو پانی اندر بھی آجاتا ہے۔ اس خیال سے زور صاحب بے چین ہو گئے کہ کہیں تمام رسالے بھیگ کر خراب نہ ہو جائیں۔ انھوں نے اپنے کمرے کا سوچ آن کیا لیکن روشنی ندارد تھی کیونکہ فیوز جل گیا تھا۔ بہ دقت تمام مکان کے کسی گوشے سے قندیل اٹھا لائے، اسے روشن کیا۔ اور بھیگتے ہوئے ایوان اردو پہنچے۔ چوکیدار کو بیدار کیا اور دونوں نے مل کر تمام رسالے محفوظ مقام پر پہنچا دیئے اور انھیں خبر بھی نہ ہوئی کہ اس مشقت میں رات کا کتنا حصہ گزر گیا۔

زور صاحب نے نہ جانے کتنے ادیبوں اور شاعروں کو گمنامی کی تاریکی سے باہر نکالا۔ کتنے حق کاروں کے ساتھ انصاف کیا، کتنے شاعروں کو تاج پہنائے، کتنے ادیبوں کو ان کا حق دلایا اور کتنی بھولی بسری یادوں کو صفحۂ قرطاس پر ہمیشہ کیلئے محفوظ کر دیا۔ دکن کے ایک ایک ذرے سے انھیں پیار تھا۔ وہ اس سرزمین کی معمولی سی معمولی روایت کا بھی احترام کرتے تھے۔ وہ چاہتے تھے کہ دکن کے سب ہی قدیم شاعروں اور ادیبوں کے فنی اکتسابات منظر عام پر آجائیں اور اس مقصد کی لگن میں انھوں نے تاریخ ادب اُردو کے ایک بڑے خلا کو پُر کر دیا۔ انھوں نے سختیاں جھیلتے اور راستے کی

صعوبتوں کو برداشت کرتے ہوئے اورنگ آباد' بیدر' گلبرگہ' بیجاپور اور حیدرآباد کے سینکڑوں مواضعات کا سفر کیا ا
بہت سے ہیرے جو خس و خاشاک کے انبار میں دب گئے تھے ڈھونڈ نکالے۔ ایک سچے محقق کی طرح وہ تحقیق کے کسی گو
کو ادھورا چھوڑنے کے لئے تیار نہ ہوتے تھے۔ شاعر کے حالات زندگی اور اس کے ادبی کارناموں کی تلاش کے علاوہ وہ ا
ابدی خوابگاہوں کو بھی ڈھونڈ نکالتے۔ ان پر روشنی کا انتظام کرواتے' لوحِ مزار نصب کرائی جاتی اور وہ ان کی تعمیر
میں کوئی دقیقہ اٹھا نہ رکھتے تھے۔ دکن کے ایک شاعر فیض کے مزار کے متعلق انھوں نے مجھے ایک بڑا دلچسپ واقعہ سنایا
وہ کہتے تھے کہ میں نے بڑی تلاش اور تحقیق کے بعد لال دروازے کے اس گورستان کا پتہ چلایا جہاں فیض مدفون
یہاں ہر طرف ایک ہو کا عالم تھا۔ قبریں انتہائی شکستہ حالت میں تھیں اور ہر طرف مٹی کے ڈھیر اور کوڑا کرکٹ کے
لگے ہوئے تھے۔ یہاں دریافت کرنے پر لوگوں نے فیض کی قبر کی نشان دہی کی۔ زور صاحب کہتے تھے یہ قبر دوس
قبروں کے مقابلے میں بہت صاف اور گرد و غبار سے پاک تھی۔ مجھے یہ سوچ کر حیرت ہوی کہ اس ویرانے میں فیض
مزار کی دیکھ بھال کون کرتا ہے۔ غرض میں اپنے ساتھیوں کو ضروری ہدایت کرنے کے بعد گھر واپس آ گیا۔ مجھے بار بار
فکر ستاتی تھی۔ میں نے فیض کا دیوان اٹھالیا' اسی تصور کو ذہن میں رکھتے ہوئے میں نے دیوان کھولا۔ اب جو
صفحے پر نظر کی تو یہ شعر لکھا تھا ؎

موجۂ بادِ بہار چمنستان بہشت
مشہد فیض پہ جاروب کشی کرتا ہے

اور اس شعر کو پڑھ کر مجھے اپنے سوال کا جواب مل گیا۔

جن لوگوں نے قدیم ادب پر تحقیقی کام کیا ہے وہ اس بات سے واقف ہیں کہ قدیم دکنی مخطوطات کا پڑھنا اور سمجھ
جوئے شیر لانے سے کم نہیں ہوتا۔ جن اسکالرز نے سالہا سال تک دکنی ادب پر کام کیا وہ بھی ان مخطوطات کے مطا
میں دقت محسوس کرتے ہیں۔ کیونکہ کاغذ کی کہنگی' زبان کی اجنبیت اور خط کی قدامت اور خرابی کے باعث جذ
ناطقہ سر بگریباں ہو جاتا ہے۔ بعض کاتبوں کو مرکزوں اور شوشوں سے بغض ہوتا ہے' بعض کاتب کاغذ سے قلم ا
جانتے ہی نہیں' جب صفحہ ختم ہوتا ہے اسی وقت وہ قلم اٹھاتے ہیں۔ اکثر نسخوں میں حروف ایک دوسرے
اتنے گتھے ہوئے اور ایک لفظ دوسرے لفظ سے اتنا پیوستہ ہوتا ہے کہ بعض دفعہ دلوں سر مارئیے ایک مصرا
یا ایک بند بھی پڑھا نہیں جا سکتا۔ زور صاحب میں مخطوطات کو پڑھنے کی بڑی غیر معمولی صلاحیت تھی اور
نئے حاصل کئے ہوئے مخطوطے کو پہلی بار اس روانی' بے تکلفی اور آسانی کے ساتھ پڑھ ڈالتے' جیسے ہم اخبار یا کو
رسالہ پڑھتے ہیں۔ تقریباً چالیس سال سے انھیں دکنی مخطوطات پڑھنے کی مشق تھی۔ زور صاحب کہا کرتے تھے کہ
طالب علمی میں ان کا پروگرام یہ ہوتا تھا کہ وہ اور پروفیسر سید محمد روزانہ شام میں حیدرآباد کی مختلف لائبریریوں
بیٹھ کر مخطوطات کا مطالعہ کرتے تھے یہاں تک کہ رات ہو جاتی۔

ایک دفعہ نواب عنایت جنگ بہادر نے ان کے پاس "من سمجھاون" کا ایک مخطوطہ بطور تحفہ روانہ کیا
اس مخطوطے کو آئے تھوڑی دیر ہوی تھی کہ میں زور صاحب کے یہاں پہنچی۔ مجھے دیکھتے ہی انھوں نے کہا۔ ہما

لائبریری کے لئے آج ایک بڑا نایاب اور کارآمد مخطوطہ آیا ہے اگر آپ اسے ایڈٹ کریں تو ایک اچھا کام ہو جائے گا۔

اس کے بعد زور صاحب نے پہلے بند سے نظم سنانی شروع کی اور اس روانی سے دس پندرہ منٹ تک "من سمجھاون" سناتے رہے گویا وہ سلیس زبان میں خوش خط لکھی ہوئی کوئی کہانی پڑھ رہے ہوں۔ کمرے میں جو حضرات بیٹھے ہوئے تھے وہ دنگ رہ گئے۔

میں ایک عرصے تک اس موضوع پر کام کرتی رہی اور اس کے دوسرے نسخوں کا تقابلی مطالعہ بھی کیا لیکن ایک لفظ کسی طرح سمجھ میں نہ آتا تھا۔ کسی مخطوطے میں یہ لفظ حسرت، کسی میں جنتر اور کسی میں حیرت لکھا ہوا ملا اور ان الفاظ سے مصرعے کا مفہوم زیادہ میل نہیں کھاتا تھا۔ میں نے زور صاحب سے مشورہ کیا۔ انھوں نے کہا "یہ لفظ نہ تو حسرت ہے اور نہ جنتر اور حیرت بلکہ یہ تو دکنی لفظ "جترب" ہے۔ اس کے بعد انھوں نے ایک بڑی عجیب و غریب بات کہی کہنے لگے "اس مخطوطے کا کاتب بوڑھا اور سن رسیدہ شخص معلوم ہوتا ہے" میں نے پوچھا۔ "یہ آپ نے کیسے جانا" زور صاحب نے جواب دیا۔ بوڑھے کاتب اپنے ضعف اور رعشے کی وجہ سے اکثر شوشے بڑھا دیتے ہیں اور یہ کہ قلم کو نیچے اوپر حرکت دینے کی زحمت سے بچنے کے لئے اکثر لفظ میں جتنے نقطے ہوتے ہیں وہ صرف نیچے لگا دیتے ہیں۔ بعد میں یہ غور کر کے مجھے انتہائی حیرت ہوئی کہ اس مخطوطے میں اکثر و بیشتر جگہ ایسا ہی کیا گیا تھا۔ زور صاحب کا اندازہ صد فی صد صحیح تھا۔

دکنی ادب گویا ان کا اوڑھنا بچھونا تھا۔ انھیں اس سے غیر معمولی محبت تھی اور وہ اس کی کسی کمزوری یا کوتاہی کو تسلیم کرنے کے لئے بڑی مشکل سے تیار ہوتے تھے۔ ان کا حافظہ بھی اس غضب کا تھا کہ انھیں وجہی۔ نصرتی۔ غواصی اور خاص طور پر محمد قلی قطب شاہ کے بلا مبالغہ سینکڑوں شعر یاد تھے۔ شعر بہت سے لوگوں کو حفظ ہوتے ہیں، لیکن نثر کے مسلسل کئی پیراگراف مخطوطات کے نمبر اور ان کی الماریاں یاد رکھنا غیر معمولی حافظہ رکھنے والوں ہی کا کام ہے۔ ایک دفعہ مجھے "گیان سروپ" کے مطالعے کی ضرورت پیش آئی اور میں نے زور صاحب سے اس مخطوطے کو حاصل کرنے کی اجازت طلب کی۔ انھوں نے کہا اوپر کے برآمدے میں جو گاڈرج کی نئی الماریاں رکھی گئی ہیں ان میں کی آخری الماری کے تیسرے خانے میں سیدھے ہاتھ کی طرف یہ مخطوطہ ملے گا۔ دوسرے دن میں نے "گیان سروپ" اسی مقام سے نکالی جس کا پتہ زور صاحب نے بتایا تھا۔

علمی اور ادبی معاملات میں زور صاحب کے خیالات اپنے بعض احباب کے تصورات سے ہم آہنگ نہیں تھے، اور تصورات کے اس اختلاف نے ذرا گہرا رنگ بھی اختیار کر لیا تھا۔ یہ صحیح ہے کہ زور صاحب جب ان حضرات کا ذکر کرتے تو ان کا لہجہ کسی قدر تلخ ہو جاتا اور ان کی گفتگو کا دائرہ وسیع ہو کر نجی زندگی کے حوالوں کا بھی احاطہ کر لیتا۔ لیکن زور صاحب نے اپنے قلم یا عمل سے کبھی کسی کی راہ میں روڑے نہیں اٹکائے اور یہ بات ان کی عظمت کی شاہد ہے۔ انسان کی چھوٹی چھوٹی اور غیر مضرت رساں کمزوریوں میں بشریت کی شان نظر آتی ہے۔ آدمی کی حقیقی عظمت اس میں نہیں کہ وہ اوتاروں کی صف میں جا کھڑا ہو، انسان کی بڑائی اس میں ہے کہ وہ بشریت کے تقاضوں کی تکمیل کرتے ہوئے بھی انسانیت کی سطح سے نیچے نہ آئے۔

زور صاحب کے طرز تکلم کا ایک خاص پہلو بھی ذکر کے قابل ہے۔ جن احباب اور خاص طور پر شاگردوں اور نیاز مندوں سے ان کی خاص راہ و رسم ہوئی اور جن پر زور صاحب کی جتنی زیادہ شفقت و مہربانی ہوتی وہ اُن سے اتنی ہی زیادہ

بے تکلفی کے ساتھ باتیں کرتے ۔ اپنے خلوص کے اظہار کا ان کے یہاں ایک طریقہ یہ بھی تھا کہ وہ اس شخص کی غلطی یا کبھی کبھا[ر] کسی غلط فہمی پر اس کی اچھی طرح تنبیہ کرتے تھے اور اگر وہ شخص ان کی باتوں کا برا مان لیتا تو انھیں دکھ ہوتا کہ ان کے خلو[ص کی] قدر نہیں کی گئی اور ان کے شفقت کے جذبے کو صحیح طور پر نہیں سمجھا گیا ۔ یہ خلوص اور شفقت و نوازش کا پہلو ان کی حر[کات و] سکنات اور ان کی گفتگو میں ہر وقت نمایاں رہتا ۔ اب خیال آتا ہے کہ ایسی میٹھی ڈانٹ کون سنائے گا ؎

تلخی اٹھائی موت کی چکھ کے خاک سب انکو چاٹ گئی
جن کی باتیں میٹھی میٹھی مصری کی سی ڈلیاں تھیں (ظفر)

زور صاحب بڑے کشادہ قلب اور وسیع النظر شخص تھے ۔ وہ صحیح معنی میں ایک " موحد " تھے جن کا کیش " ترک " تھا ۔ تمام مذاہب کے پیرو ان کی نظر میں برابر تھے ۔ یہ وسعتِ نظری اور روشن خیالی شاید انھیں اپنے مشائخ خاندا[ن سے] ورثے میں ملی تھی کیونکہ صوفی کا عقیدہ تو یہ ہوتا ہے ؎

کفر و ایماں دو ندی ہیں عشق کی
آخرش دونوں کا سنگم ہو گیا (سراج اورنگ آبادی)

زور صاحب کے پیام تعزیت میں حیدر آباد کی ایک سربرآوردہ سیاسی شخصیت نے صحیح کہا تھا کہ یوم محمد قلی قطب شاہ [کے ذریعے] زور صاحب نے ہندوؤں اور مسلمانوں کو ایک دوسرے سے قریب لانے کی کوشش کی تھی ۔ زور صاحب ہر مذہب کی [تقاریب] میں شریک ہوتے اور ان سے دلچسپی لیتے تھے ۔ جو لوگ مذہب کی حقیقی روح کو پالیتے ہیں ان کے دل میں تنگ نظ[ری اور] تعصب کے جذبات کے لئے کوئی جگہ باقی نہیں رہتی اور ان کا دل دوستی اور خلوص کے جذبات سے لبریز ہو جاتا [ہے] ؎

شد است سینۂ ظہوری پر از محبت یار
برائے کینۂ اغیار در دلم جا نیست

زور صاحب کی شخصیت بڑی بارعب ، متین اور پروقار تھی ۔ اعلیٰ سماجی حیثیت اور سیاسی اقتدار رکھنے [والے] لوگ بھی ان سے برابر کی سطح پر ملتے اور ان کا احترام کرتے تھے ۔ ان کے لہجے میں بڑی گونج اور آواز میں ایک خاص [طرح کی] گرج تھی ۔ جو شخص ان سے ایک بار بھی مل لیتا وہ ان سے ضرور مرعوب ہو جاتا تھا ۔ ایک دفعہ ایوان اردو میں مشا[عرہ تھا] ہال میں تیس چالیس لوگ جمع ہو چکے تھے ابھی شاعروں کی آمد میں دیر تھی ۔ زور صاحب حسب معمول کے عقبی دروا[زے سے] داخل ہوئے اور اپنے مخصوص انداز میں اسٹیج پر ٹہلنے لگے ۔ پیچھے بیٹھے ہوئے ایک بذلہ سنج نے برجستہ اپنے ساتھی [سے کہا] " ادھر کیا دیکھتے ہو ادھر دیکھو اسٹیج پر شیر اردو ٹہل رہا ہے " ۔

زور صاحب بڑے محنتی ، بڑے مخلص ، بڑے صاحب نظر اور جوہر شناس آدمی تھے ۔ ان کی خوبیاں یا[د کر کے] موت سے یہ شکوہ کرنے کو جی چاہتا ہے کہ ؎

توڑا جو تو نے آئینہ تمثال دار تھا

سید محمد مورخ بیدری

ڈاکٹر زور مرحوم

(یہ مضمون "ترقی اردو بورڈ" جمشید روڈ کراچی کے دفتر میں ۹ دسمبر ۱۹۶۲ء کو ڈاکٹر زور مرحوم کے تعزیتی جلسہ کے موقع پر جو سندھ یونیورسٹی کے وائس چانسلر ڈاکٹر رضی الدین صدیقی کے زیر صدارت ہوا تھا سنایا گیا تھا۔)

بقول حضرت حافظ علیہ الرحمۃ ؎

ہرگز نہ میرد آنکہ دلش زندہ شد بہ عشق
ثبت است بر جریدۂ عالم دوام ما

ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور مرحوم کے خاندانی حالات۔ علمی خدمات اور زبانِ اردو سے متعلق مرحوم کے ناقابلِ فراموش کارنامے قطب شاہی گلزاروں سے بے لوث محبت سے متعلق مرحوم نے جو شہ کار چھوڑے ہیں ان کو صراحت کے ساتھ لکھنے کے لئے زیادہ سے زیادہ وقت چاہئے اور کافی محنت کا کام ہے۔ اور اس کے ساتھ ہی بڑی قابلیت اور استعداد والا ہی یہ کام انجام دے سکتا ہے مجھ جیسا بے بضاعت علم ڈاکٹر زور مرحوم کے کارناموں کو چند الفاظ میں محیط نہیں کر سکتا۔ چونکہ میں مرحوم کے معتقدین میں سے ہوں لہٰذا میں اپنا فرض سمجھ کر مختصر طور پر چند واقعات پیش کرتا ہوں :—

ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور مرحوم ۵ار دسمبر ۱۹۰۵ء کو حیدر آباد دکن کے محلہ شاہ گنج میں پیدا ہوئے۔ دکن کے مشہور تاریخی شہر قندھار شریف کے رفاعی اور قادری خاندان سے آپ کا تعلق تھا۔ آپ کے جد اعلیٰ حضرت ساگرڑے سلطان مشکل آسان قدس سرہٗ معتقدین کی کثیر تعداد کے ساتھ دعوتِ اسلام کرتے ہوئے تعلقی دور میں دکن وارد ہوئے اور قندھار دکن میں آپ نے سکونت اختیار کی۔ سیکڑوں سال سے قندھار دکن میں آپ کا مزار زیارت گاہ خاص و عام ہے حضرت کی اولاد کا سلسلہ دکن اور بیرونِ دکن میں دور دور تک پھیلا ہوا ہے۔ ڈاکٹر زور مرحوم کے والد بزرگوار ابوالبرکات حافظ سید شاہ غلام محمد صاحب قادری رحمۃ اللہ علیہ ایک باخدا۔ پاک باز۔ نیک دل اور صاحب تصرف صوفی تھے۔ وعظ و نصیحت اور ممکنہ طریقوں سے مسلمانوں کے خیالات کو درست کرنے میں آپ نے اپنی عمر صرف کردی۔ اس سلسلہ میں میرے آبائی وطن شہر محمد آباد بیدر دکن کا آپ نے کئی بار دورہ فرمایا تھا اور بیدر کے چھوٹے بڑے محلوں میں مہینوں آپ کا وعظ ہوتا رہتا جس میں میں خود بھی کئی مرتبہ . . . . . . شریک رہا ہوں۔ دوران وعظ میں لفظ بابا آپ کا تکیہ کلام تھا اور عوام میں آپ بابا جی کے نام سے مشہور ہوئے۔ پیری مریدی کے تعلق سے آپ کے کئی معتقدین آج بھی بیدر شریف میں موجود ہیں۔ غرض حضرت ابوالبرکات حافظ سید شاہ غلام محمد صاحب قادری زندہ مشکل آسان ثانی کا شمار حیدر آباد دکن میں دور عثمانیہ کے ان بزرگان دین میں ہوتا ہے جو نسل اور زبردست اعتبار سے کامل شمار ہوتے ہیں۔ ایسے معرفت میں ڈوبے ہوئے پدر بزرگوار کے آغوش میں ڈاکٹر زور مرحوم کی ابتدائی مذہبی تعلیم و تربیت ہوئی تھی اور حیدر آباد دکن کے سررشتہ امور مذہبی کے وزیر اعلیٰ آصف سادس و آصف سابع کے استاد و اتالیق مولانا حافظ محمد انوار اللہ خاں صاحب المخاطب نواب فضیلت جنگ بہادر مرحوم کی ہمشیر حضرت بشیر النساء بیگم صاحبہ مرحومہ کے دامن مادری میں نشو و نما پائی تھی۔

ڈاکٹر زور مرحوم کے پرنانا حیدرآباد دکن کے ضلع نظام آباد میں بودھن کے خطیب تھے اپنے وقت کے مشہور عالم اور کئی کتابوں کے مصنف تھے۔ حیدرآباد کے امرا، عظام میں آپ کی بڑی قدر و منزلت تھی۔ ڈاکٹر زور مرحوم کے نانا منشی محمد وقارالدین صاحب بھی عالم فاضل ہونے علاوہ کئی کتابوں کے مصنف تھے۔ ڈاکٹر زور مرحوم نے تذکرہ مخطوطات جلد چہارم میں آپ کا تفصیل سے ذکر فرمایا ہے۔

اس علمی ماحول میں ڈاکٹر سید محی الدین زور مرحوم نے عقل اور سمجھ فہم و فراست کے میدان میں قدم رکھتے ہی خطہ دکن اور اردو زبان کو سمجھنے کی کوشش کی۔ انتہائی غور و فکر تلاش و جستجو کے بعد اس کے تعلق سے ہمیشہ رنگا رنگ، کے پیچیدہ مسئلوں کا حل مرحوم کے پیش رہا۔ دکن دیار اردو زبان۔ دکنی مصنفین مولفین، شعرا و صوفیائے کرام کی سیکڑوں سال کی پرانی بوسیدہ۔ کرم خوردہ۔ آب چشیدہ تصنیفات و تالیفات اور بلند پایہ بزرگوں کے خیالات اور ان کی زندگی کے راز سربستہ کو کھولنے کی مرحوم نے جو انتہائی کوششیں کیں اپنی تقریروں۔ تحریروں تصنیفوں اور تذکروں غرض کسی نہ کسی صورت میں دنیا والوں کے سامنے پیش کرکے اپنی روشن خیالی کا جو ثبوت ہے وہ مرحوم کا ناقابل فراموش شہ کار ہے جس سے اردو کے ادیب بے خبر نہیں ہیں۔ حیدرآباد اور لندن میں آپ کی طالب علم زندگی بھی ایک مثالی زندگی رہی ہے میں یہ تفصیلات بھی ضرور تحریر میں لاتا مگر طوالت مضمون کے خیال سے اس کو ترک کرتا ہوں چونکہ واجب الاحترام مقررین نے اس پر کافی روشنی ڈالی ہے۔ البتہ مختصر طور پر عرض کروں گا کہ ڈاکٹر زور مرحوم کی شادی حیدرآباد کے ممتاز اور رفیع الشان امیری خاندان میں نواب رفعت یار جنگ ثانی کی صاحبزادی محترمہ تہنیت النسا بیگم سے ہوئی تھی۔ نواب صاحب ۱۳۱۹ھ میں بیدر کے اول تعلقدار تھے آپ کا سلسلہ نسب خلیفہ اول حضرت ابوبکر صدیقؓ سے ملتا ہے۔ آپ کے اجداد کا وطن عرب تھا۔ ان میں لاعطا واللہ محمود اہل و عیال کے ساتھ ..... میں ہندوستان آئے۔ دہلی میں سکونت اختیار کی حکمران وقت کی طرف ناگور کی قضاۃ آپ کو عطا ہوئی۔ اسی سلسلہ کے حضرت قاضی حمیدالدین ناگوریؒ ہندوستان و پاکستان کے مشہور اولیائے کرام سے ہیں۔ الحاج تہنیت النساء بیگم صاحبہ نے جد اعلیٰ مولانا عبدالعزیز یمنی دکن کے اکثر مقامات کی سیر کرتے ہوئے بہمنی زمانہ کے دارالسلطنت شہر میں چند روز قیام فرمایا تھے اس کے بعد صوبہ بیدر کے ضلع اندور حال نظام آباد میں اقامت گزیں ہوئے۔ غرض ڈاکٹر زور مرحوم کی زوجہ بھی خاندانی عظمت و تقدس ورثہ میں پایا ہے۔ بلاشبہ ہم یہ عرض کریں گے کہ ڈاکٹر زور مرحوم کو خاندان جدی و مادری سے ہی نہیں بلکہ مرحوم کی رفیقۂ حیات الحاج محترمہ تہنیت النساء بیگم کی طرف سے بھی ستھرے ادبی ذوق کی ورثہ میں لازوال دولت ملی تھی۔ جس ماحول میں نشو و نما پائی وہ ایک خاص اسلامی تہذیب و تمدن کا ماحول تھا۔ آپ کے دل و دماغ پر اسلامی تعلیم کا گہرا اثر تھا۔ تین سال مغربی دنیا میں گذارے لیکن ان میں مغربیت نہیں آئی۔ آپ کی شان دار شخصیت، مردانہ حسن اور جامہ زیبی حیدرآبادی تہذیب و شائستگی کی واحد مثال تھی۔ آپ کا انداز نگارش بھی علمی دنیا میں ایک تاریخی، ادبی اور مسجع حیثیت رکھتا ہے۔

غرض ہند و پاکستان کے ادیب، مورخ اور محقق جن کے نام زبان اردو سے وابستہ ہیں۔ ان میں ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور کا نام ادبی، تاریخی اور تحقیقی دنیا میں ہمیشہ درخشاں و تاباں رہے گا۔ دکن کی علمی اہمیت کو جس دیدہ دلیری و مستعدی سے زور مرحوم نے عوام کے سامنے پیش کیا اس کے بارے میں لکھنے والے کا قلم لکھتے لکھتے تھک جائے گا۔ لیکن زور مرحوم کی داستان علم ختم نہ ہوگی۔ قدیم کرم فرما ڈاکٹر زور کی اچانک اور بے وقت دائمی مفارقت سے زبان اردو اور حیدرآباد دکن کو جو نقصان پہونچا ہے اس کی تلافی ناممکن ہے اور میرے دل و دماغ پر جو صدمہ ہوا ہے وہ ناقابل بیان ہے۔ لیکن سب کے لئے یہ دن مقرر ہے۔ صبر و سکون سے کام لیتا ہوں اور خدا سے دعا کرتا ہوں کہ مرحوم کو جوار رحمت میں جگہ دے اور پسماندگان کو صبر جمیل عطا فرمائے۔ (آمین)

قاضی عیاذ انصاری

ڈاکٹر سیّد محی الدّین قادری زورؔ سے ادبی ملاقات

تمہیدی نوٹ حیدرآباد میں ڈاکٹر سید محی الدین قادری زورؔ سے آپ ملاقات کو جائیے تو خیریت آباد ریلوے اسٹیشن سے طیران گاہ جاتے ہوئے سوماجی گوڑہ کی پرسکون آبادی میں لب سڑک آپ کو نئی وضع کی ایک خوب صورت عمارت یوان اردو کی نظر آئے گی۔ ادارۂ ادبیات اردو کا شاندار کتب خانہ ـــ اردو کے ماضی و حال اور مستقبل کا سارا ادب مطبوعہ اور غیر مطبوعہ مخطوطات کے اعلیٰ نمونوں۔ کتابوں۔ کتبوں اور نقشوں کا بے بہا خزانہ آپ کو اس ہال کے اطراف ملے گا۔ ایوان اردو۔ ادارۂ ادبیات اردو اور ڈاکٹر زورؔ۔ دراصل ایک ہی شخصیت کے یہ تین مختلف روپ ہیں۔ ایوان سے ملحقہ تحتانی منزل آپ کی جائے قیام ہے۔ یہاں ایک چھوٹے سے کمرے میں ایک تخت بچھا ہے۔ ضروری کاغذات اور کتابوں کے انبار میں سفید تن زیب کا کرتہ اور چوڑی مہری کا پاجامہ پہنے مسکراتے ڈاکٹر زورؔ سے آپ کی ملاقات ہوگی۔ سامنے پاندان رکھا ہوا۔ بار بار پان بناتے ہوں۔ خود کھاتے ہوں اور آپ کو کھلاتے ہوں تو آئے گا آپ کو ڈاکٹر زور سے باتیں کرنا ہے۔

سوال نمبر (۱) ہاں ڈاکٹر صاحب! آپ نے اپنی زندگی روح تنقید سے شروع کی اور شاعری سے زیادہ آپ کا تخلص مشہور ہے۔ شاعری۔ افسانہ نگاری اور تنقید جیسے تخلیقی کاموں کو چھوڑ کر آپ نے تحقیق جیسے خشک اور سنگلاخ زمین کی آبیاری میں اپنی زندگی گزار دی ہے۔ ایسا تو نہیں ہوا کہ ہم نے آرٹ کے ایک زبردست خلاق کو کھو کر یہ سب کچھ پایا ہو جو ہمارے سامنے ہے۔

جواب نمبر (۱) عیاذ صاحب! میں نے اسکول کے زمانے ہی سے شاعری شروع کر دی تھی جو کالج کے زمانے میں بھی جاری رہی۔ اس وقت حیدرآباد شعر و سخن کا مرکز تھا اور پورے ہندوستان کے اچھے اچھے شاعر مثلاً نظم طباطبائی۔ جوش ملیح آبادی۔ فانی بدایونی۔ صدق جائسی۔ ماہر القادری۔ نظام شاہ لبیب۔ جلیل مانک پوری۔ کیفی۔ عزیز۔ صفی۔ امجد۔ علی اختر اور ان کے والد باغ وغیرہ یہاں موجود تھے اور کثرت سے مشاعرے ہوتے رہتے تھے۔ حیدرآباد کے گلی کوچوں میں شعر و سخن کا چرچا تھا۔ اور ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ہر شخص شاعر بن سکتا ہے۔ لیکن ادیب۔ نقاد اور محقق بننا ہر کس و ناکس کے بس کی بات نہ تھی۔ ہمارے کالج کے استاذ وحید الدین سلیم ہمیشہ اردو کی جدید ضرورتوں کی طرف متوجہ کرتے رہتے تھے۔ اسی لیے میں نے بھی عام راستے سے ہٹ کر ٹھوس کام کرنے اور اپنی مادر جامعہ کا نام روشن کرنے کی خاطر شاعری کی جگہ نثر اور اس میں بھی تنقید و تحقیق کی طرف بطورِ خاص توجہ کی۔ یوں تو کہنے کو میں نے افسانے بھی لکھے ہیں جن کے دو مجموعے "سیر گولکنڈہ" اور "گولکنڈے کے ہیرے" چھپ چکے ہیں۔ اسی طرح میرا کلام بھی اتنا موجود ہے کہ ایک اچھا خاصا دیوان چھپ سکتا ہے۔ مگر دوسرے کاموں کے مقابلے میں اس کو میں

اہم نہیں سمجھتا۔

سوال نمبر(۲) جامعہ عثمانیہ کے آپ ایک مایۂ ناز فرزند ہیں۔ اس کی تعمیر و ترقی کو آپ نے محسوس شکل میں دیکھا ہے۔ پہلے اس کی پرانی عمارت سے وہ یکایک آج کے آرٹس کالج کی حسین و عظیم عمارت میں منتقل ہوگئی۔ ذرا تکلیف کیجئے فردوس گوش کہانی کے سننے کا ہیاؤ رکھتا ہوں۔

جواب نمبر(۲) ہم جب کالج میں پڑھتے تھے تو جامعہ عثمانیہ کی مختلف جماعتیں توپ کے سانچے کے ان متعدد چھوٹے بڑے میں ہوا کرتی تھیں جن میں سے اکثر اب بڑی بڑی دوکانوں اور اسٹیٹ بنک کی عالی شان عمارت کی منتقل ہو چکی ہیں۔

جامعہ کے اساتذہ اور دارالترجمہ کے ارکان اس محلے کے اطراف مختلف مکانوں میں قیام پذیر تھے۔ مولانا سلیم۔ خلیفہ عبدالحکیم۔ مولوی عبدالمجید۔ الیاس برنی۔ مولوی عنایت اللہ۔ جمیل الرحمٰن۔ مولوی عبدالرحمٰن خاں مناظر احسن گیلانی۔ مسٹر اسپیٹ۔ مسٹر ولنکر اور ڈاکٹر لطیف وغیرہ سے ان کی قیام گاہوں پر آسانی سے ملاقات؛ اور اوقات تعلیم کے بعد ہم اور ہمارے اکثر ساتھی اپنے اپنے اساتذہ کے یہاں شام تک حاضر رہا کرتے۔

جامعہ سے سر اکبر حیدری کی گہری دلچسپی مولوی عبدالحق کی کوششیں۔ ناظم تعلیمات سر راس مسعود کے لیے جامعہ عثمانیہ کے صدر ڈاکٹر عبدالستار صدیقی کے علم و فضل کے قصے اور جامعہ کے لیے اپنی ایک عمارت بنانے اور اس کے بارے میں نئی نئی خبریں سُننے میں آتیں۔ اساتذہ اپنے شاگردوں کو علمی و ادبی کاموں کے نئے نئے خاکے بتاتے نیازمند قسم کے شاگردوں سے جو اندرون شہر مقیم تھے اپنی اپنی پسند اور ضرورت کی اشیا طلب کیا کرتے تھے۔ کی علمی و ادبی چہل پہل اور سماجی مصروفیتوں سے واقف ہونے کی کوشش کرتے تھے۔ یہ مخلصانہ فضا اسی روز تک جس روز کہ کلیہ جامعہ عثمانیہ۔ آرٹس کالج کی حسین و عظیم عمارت میں منتقل ہوگیا۔ اس کے بعد سے جامعہ کی زندگی کا دو شروع ہوا اور اب تو یہی تیسرا دور چل رہا ہے۔

سوال نمبر(۳) جدید حیدرآباد کی ذہنی تعمیر میں بے شک جامعہ عثمانیہ کا بڑا حصہ ہے۔ لیکن میں تو آپ کو بھی حید ذہنی تعمیر کا ایک بڑا معمار سمجھتا ہوں۔ زمانہ آپ کا بڑا ساز گار رہا۔ اس دور کے اپنے کچھ ہم عصر کرنا مناسب تصور فرمائیں گے آپ؟

جواب نمبر(۳) چونکہ جامعہ کے اساتذہ مختلف مقامات مثلاً پنجاب۔ دہلی۔ لکھنو۔ بہار۔ مدراس اور بنگال سے اس لیے حیدرآبادی طلبا میں ان کے میل جول سے وسعت نظر پیدا ہونے لگی اور سوچنے کرنے کے نئے سانچے ملنے لگے۔ سچ تو یہ ہے کہ اس وقت حیدرآباد کی نوجوان نسلوں کی جس خوبی سے ذہنی تعمیر اور جس قدر جلد حیدرآباد کی علمی و ادبی فضا بدلی ہے اس کا موجودہ نسلیں اندازہ بھی نہیں کر سکتیں۔ میں خود بھی کا آفریدہ و پروردہ ہوں اور میری اور میرے ساتھیوں کی یہ کوشش رہی کہ یہ فضا حیدرآباد کی گلی گلی کو متاثر کر یہاں کے رہنے بسنے والوں میں وہ خود اعتمادی پیدا ہو سکے جس کی بنا پر وہ کل ہند نوعیت کے شاعر۔ افسانہ نگار محقق بن سکیں۔

ڈاکٹر رضی الدین صدیقی۔ ڈاکٹر مقبول علی۔ پروفیسر مجید صدیقی۔ حسن الدین۔ ڈاکٹر سید حسین۔ ڈاکٹر ولی

ضیاءالدین انصاری اور اکبر وفاقانی وہ ابتدائی فرزندانِ جامعہ ہیں جنھوں نے اس کام میں اپنی اپنی حد تک بہت جدوجہد کی۔ کالج سے باہر نواب عالی رفاہی۔ نواب عنایت جنگ بہادر۔ مولوی خورشید علی مرحوم۔ مولوی سید محمد اعظم۔ صفی اورنگ آبادی۔ سالار جنگ مرحوم۔ اور عزیز یار جنگ مرحوم میرے وہ مشفق احباب تھے۔ جنھوں نے میری اس تعمیر کاری میں بڑی مدد کی۔ اور میرے ماحول کو سازگار بنایا۔

وال نمبر (۴) معاف کیجئے۔ ایک بات میرے دماغ میں کھٹک رہی ہے۔ اگر وہ صاف ہو جائے تو اچھا ہے۔ قدامت پسندی میں جو تضاد ہے اس میں آپ کی حیثیت میں پوری طرح متعین نہیں کر سکا اور لطف یہ ہے کہ ہر دو دبستانِ خیال آپ کو اپنے ضمیر کی آواز سمجھتے رہے ہیں۔ ذرا کچھ تفصیل طلب ہے یہ بات۔ کیا کوئی نیا تصور آپ نے اپنی آستین میں چھپا رکھا ہے جس کا سہارا لے کر آپ اس تضاد سے بچ نکلتے ہیں۔

اب نمبر (۴) یہ مسئلہ اتنا نازک نہیں ہے۔ میری نظر میں ہر زمانے میں یہ دونوں گروہ موجود رہے ہیں۔ موجودہ ترقی پسندی اگرچہ سیاست سے زیادہ متاثر ہے مگر ہر دور میں بعض شاعروں نے اپنے زمانے کی سیاست اس سرکار دربار کے رجحان کو اپنے کلام میں پیشِ نظر رکھا ہے۔ بلکہ بادشاہوں اور صاحبانِ اقتدار اور خاص خاص مذہب و مسلک کی جا و بے جا مدح سرائی اور پروپگنڈا بھی کیا ہے مگر ایسے شاعروں اور ان کی شاعری کی آج جو قدر و قیمت ہے وہ معلوم۔

جو شعرا آج کل کمیونزم کے نظریوں کے مطابق نظمیں لکھ رہے ہیں ان کو میں انہی خاص خاص قدیم شعرا کی صف میں شمار کرتا ہوں اور سمجھتا ہوں کہ ان کی قدر ان کے موضوع سے زیادہ ان کے کلام کی عمدہ خصوصیات اور شعر و سخن کے اصلی معیار کے مطابق ہوگی اور آئندہ باقی رہے گی۔ مجھے خوشی ہے کہ ان کی وجہ سے اردو میں نئے نئے تجربے ہو رہے ہیں۔ اور ایسا تنوع پیدا ہو رہا ہے جس پر زندگی اور شگفتگی کا انحصار ہے۔ غرض شاید میں اپنے خاندانی یا موروثی مزاج کے مطابق دونوں میں خوبیاں دیکھتا ہوں۔ رواداری اور مرنج و مرنجان طرزِ زندگی میرے حصے میں آئی ہے غالباً آپ کو یہ بھی معلوم ہے کہ میں پیرس میں دو سال بہت ہی اعلیٰ پایہ کے کمیونسٹ احباب کے ساتھ رہا ہوں اور اب بھی سجاد ظہیر جیسے ترقی پسند ادیبوں کا شمار میرے مخصوص دوستوں میں ہے۔

میں کام کی قدر و قیمت کرنا ضروری سمجھتا ہوں۔ یہ نہیں دیکھتا کہ یہ کس گروہ یا کس مذہب و مسلک کے ادیب، شاعر کی محنتوں اور کاوشوں کا ثمر ہے۔ اگر آپ اس کو کوئی نیا تصور سمجھتے ہیں جس کو میں نے اپنی آستین میں چھپا رکھا ہے تو اور بات ہے مگر میری نظر میں تو یہ ایک بہت ہی پرانا نسخہ ہے اور صدیوں کا آزمایا ہوا۔

ال نمبر (۵) آپ کی زندگی میں "سب رس" اور ادارہ ادبیات اُردو ایسے گھل مل گئے ہیں کہ بقول شخصے آپ کی شخصیت اب خود ایک ادارہ بن گئی ہے۔ آپ کی کامیابیاں اور کامرانیاں مسلّم۔ میں جانتا ہوں زندگی کے ہر مرحلے پر آپ کامیاب اور ہر بازی میں آپ کی فتح ہوئی۔ ایسے حالات میں زندگی کا فلسفہ کچھ رجائی سا بن جاتا ہے۔ اُردو کو اب سرفروشی کی ضرورت ہے۔ وہ چنگاری جسے ہم لو کہتے ہیں کہیں راکھ کے تلے تو نہیں دب گئی ہے۔ آپ اپنی زندگی میں اب کچھ ٹھہراؤ تو نہیں محسوس کرتے۔ میرا مطلب ہے مستقبلِ قریب کا زور اب کیا سوچ رہا ہے۔

ب نمبر (۵) ادارہ ادبیاتِ اُردو اور اس کی عمارت "ایوان اُردو" میرے ابتدائی خوابوں کی تعبیر ہے۔ لیکن تقسیم اور انقلاب

حیدر آباد کے بعد اُردو دانوں کی ترجیحات اور حالات میں جو تبدیلی آئی ہے اس کے باعث کام کرنے کے مواقع اور بدل گئے ہیں اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ پھر از سر نو جد و جہد شروع کرنے کی ضرورت ہے۔

میں اپنی زندگی میں ٹھیراؤ کیوں کر محسوس کر سکتا ہوں جبکہ طوفان اور ہنگامہ آرائی کے آثار نمایاں ہیں۔ کام تو یہی اصل وقت ہے۔ مگر اہلِ اُردو کی خستہ حالی دیکھ کر بعض اوقات شبہ ہونے لگتا ہے کہ اب پہلی جیسی فتح بھی ہوتی ہے یا نہیں۔ پھر بھی آپ جانتے ہیں کہ میرا تعلق تصوف و عرفان کے خاندان سے ہے اور میں کبھی نا امید ہو سکتا۔ میں نے بڑے ہی ناموافق ماحول میں ادارہ قایم کیا تھا۔ اور ہر مخالفت اور اختلاف سے فائدہ اٹھایا کی ہے۔ میں اس وقت زیادہ کام کرتا ہوں جب کسی کی ذات اور کوششوں کو سدِ راہ پاتا ہوں۔ مگر اب مجھے کوئی نظر نہیں آتا۔ اس لیے اندیشہ ہے تو یہی ہے کہ کہیں یہ چنگاری تعریف و تحسین کی راکھ میں نہ دب جائے۔

سوال نمبر (۶) آپ کو اپنی تصانیف میں سے کون سی سب سے زیادہ عزیز ہے؟

جواب نمبر (۶) مجھے اپنی کتابوں میں سیر گولکنڈہ اور داستانِ ادب حیدر آباد زیادہ پسند ہیں اور میں چاہتا کبھی فرصت ملے تو موخر الذکر داستان کو اور شرح و بسط سے بیان کروں۔

سوال نمبر (۷) دن رات کے اوقات میں لکھنے پڑھنے کو کس قدر دخل حاصل رہا؟

جواب نمبر (۷) دن رات میں لکھنے پڑھنے کے سوا کسی اور معاملے کو کبھی دخل ہی نہیں رہا۔ اور اس کے بیوی کا شکر گزار ہوں کہ انھوں نے سارے گھریلو کاروبار سے مجھے آج تک بے نیاز رکھا نہ صرف یہی بلکہ میرے علمی و ادبی کاموں میں بھی انھوں نے میرا دُور دُور تک ہاتھ بٹایا ہے۔

سوال نمبر (۸) اپنی ادبی مصروفیات کے ساتھ حیدر آباد فرخندہ بنیاد کی سماجی زندگی کا آپ ساتھ دیا ہوگا؟

جواب نمبر (۸) حیدر آباد کی سماجی زندگی کے صرف اسی پہلو میں مجھے دلچسپی نظر آئی جو میری ادبی مصروفیات معاون ہو سکتا تھا اور اسی لیے میں دعوتوں اور تقریبوں میں بہت ہی کم شریک ہوتا اس کا اعتراف ہے کہ میں نے بہت سے احباب اور اعزا کو مایوس بلکہ ناخوش کیا مگر ان سبھوں نے میرے کاموں اور مصروفیتوں کے پیشِ نظر غالباً مجھے معاف بھی کر دیا۔ اس معاملے میں مجھے اپنی خوش قسمتی پر باہمہ اور بے ہمہ زندگی بسر کرنے کا سلیقہ میں برت سکا اور خاموشی کے ساتھ وہ بُرا یا بھلا کر سکا جس کے نظر آتے ہیں۔

سوال نمبر (۹) کیا پُرانے شاہی دور کے مقابلے میں ہندوستان کی جمہوری زندگی آپ کے لیے پوری طرح ہے۔ اور ہے تو آپ کی آئندہ کیا توقعات ہیں؟

جواب نمبر (۹) پُرانے شاہی دَور کو میں نے کبھی اچھی نظر سے نہیں دیکھا نہ اس دَور کی خصوصیات میر مفید ہو سکیں۔ جمہوری زندگی ظاہر ہے کہ زیادہ خوش گوار ہوتی ہے۔ بشرطیکہ وہ صحیح معنوں ہو۔ ہمارا ملک ابھی تک ایک عبوری دَور سے گزر رہا ہے۔ اور افراتفری اس کا لازمی نتیجہ ہے۔

اُردو کے لیے ابھی سازگار فضا پیدا نہیں ہوئی ہے اور جو کچھ حالات موجود ہیں ان سے اہلِ اُردو فائدہ

موقف میں ابھی نہیں آئے ہیں۔

سوال نمبر (۱۰) اُردو کے مستقبل کے متعلق تو مجھے معلوم ہے کہ آپ کچھ زیادہ مایوس نہیں ہیں لیکن حیدرآباد کو اُردو کے تعلق سے جو مرکزی حیثیت حاصل رہی ہے۔ اس کے تسلسل کو آپ قایم رکھ سکیں گے یا نہیں؟

جواب نمبر (۱۰) اُردو کا مستقبل ابھی تک مایوس کن نہیں ہے۔ حیدرآباد کو جو مرکزی حیثیت حاصل تھی وہ اب بھی باقی ہے۔ مگر یہ تسلسل قایم رہ سکے گا یا نہیں۔ اس کے بارے میں صحیح رائے قایم کرنے کا ابھی وقت نہیں آیا۔ جب تک قدیم نسل کے افراد موجود ہیں کوشش کرتے رہیں گے جدید نسل اس کے لیے تیار ہو رہی ہے۔ ابھی نقش اُبھر رہے ہیں مگر نا تمام ہیں۔ ان کی تکمیل کے لیے جس خونِ جگر کی ضرورت ہے وہ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ابھی ملا ہی نہیں اور اگر مل بھی رہا ہے تو دوسری اقتصادی اور سماجی ضرورتوں کی تکمیل ہی کے لیے کافی نہیں ہو رہا ہے۔

"سید محی الدین قادری زورؔ عرف عام تھا۔ لیکن ہم لوگ انھیں زور صاحب کے نام سے پکارتے تھے۔ حال ہی میں واصل جنت ہونے والی یہ پُر خلوص شخصیت جنت نظیر کشمیر کی سرزمین میں انتقال فرما گئی۔ ان کے اوصاف کو کہاں تک گنایا جائے، اُن کی علمی خدمات کو کہاں تک بیان کیا جائے اور ان کے شخصی محاسن کا ذکر کہاں تک کیا جائے۔ آواز میں وقار، صورت میں ایک وجاہت اور سیرت میں ایک دلکشی لیے ہوئے زور صاحب جس محفل میں جاتے اس پر چھا جاتے۔ بڑے صاحبِ علم انسان تھے۔ ۱۹۲۴ء سے اب تک اُردو کی خدمت کرتے رہے۔ ان کی تحقیق و تنقید کا معیار بعض اہلِ نظر کی نظر میں مستند نہیں تھا لیکن ان کی تالیفات و تصنیفات کی تعداد اتنی زیادہ ہے کہ ہم انھیں اُردو کا ایک بہت بڑا محسن سمجھتے ہیں۔

وہ ادارۂ ادبیات اُردو کے بانیوں میں سے تھے۔ یہ حقیقت ہے کہ ادارۂ ادبیاتِ اُردو اور زورؔ صاحب دو علحدہ چیزیں نہیں تھیں۔ ادارہ اگر جسم تھا تو زورؔ صاحب جان۔ اس ادارے کا مفید کام اور حیدرآباد میں ایوانِ اُردو کی تعمیر دو ایسے کارنامے ہیں جن سے ان کا نام محسنانِ اُردو کی صفِ اول میں لکھا جائے گا۔

زورؔ صاحب نہایت مخلص، صاف باطن اور بے باک انسان تھے۔ اُنھیں کسی کی بُرائی کرتے نہیں دیکھا۔ جو لوگ درس و تدریس کے سلسلے میں ان سے متعلق ہوئے وہ ہمیشہ اُن کی ترقی درجات کے خواہاں رہے۔ وہ حیدرآباد کی ثقافتی زندگی کی جان تھے۔ عثمانیہ یونیورسٹی کی علمی سرگرمیوں کی ایک زمانے میں رُوح بنے رہے۔ ادارۂ ادبیاتِ اُردو کی سلور جوبلی منائی، امجد حیدرآبادی کی جوبلی کا جشن منعقد کیا اور اب ہر سال یوم محمد قلی قطب شاہ مناتے تھے۔ افسوس یہ عظیم شخصیت ہم میں موجود نہیں ع
اُٹھ گیا ناوک فگن مارے گا دل پر تیر کون "

(ماہنامہ آجکل دہلی۔ نومبر ۱۹۶۲ء)

احمد جمال پاشا

ڈاکٹر محی الدین قادری زور

(قلمی چہروں کے زیر ترتیب مجموعے "آئینے" کی ایک جھلک)

ان کی آمد کی خوشبو پاتے ہی پہونچا، مگر ڈرتے ڈرتے اطلاع کرائی اس کی ایک معقول وجہ یہ تھی کہ اس زبردست شخصیت سے تھا جس کی علمیت اور قابلیت کی یورپ کے علمی و ادبی حلقوں میں دھوم تھی جو جامعہ عثمانیہ میں پرنسپل، پروفیسر اور کشمیر یونیورسٹی میں اردو کے پر ساہتیہ اکیڈمی کے مشیر خصوصی، مجلۂ عثمانیہ، سب رس اور ادارۂ ادبیاتِ اردو کے بانی، روح تنقید، اردو شہ پارے، ہندستانی ل اور ہندستانی صوتیات جیسی گرانقدر تصنیفات کے علاوہ کئی سو کتب و رسائل کے خالق، صوتیات، لسانیات، تنقید، تحقیق، مض افسانہ نگاری اور شاعری پر بیک وقت قادر، اس کے بعد بھی اتنا عظیم ادیب اگر صحت میں مجنوں گورکھپوری اور وقار عظیم، مزاج میں اور ابوالکلام آزاد سے بہت آگے نہ ہو تب بھی اس میں کیا شک ہے کہ ان کے سر کے بال غائب ہوں گے، دوسروں کو نظرانداز کر عینک چڑھائے ساتویں آسمان پر بیٹھے کھٹا کھٹ سقراط اور بقراط کی روحیں قبض کر رہے ہوں گے، دیکھتے ہی عالمی ادب کا سارا بخا اتار دیں گے کیا عجب کہ سرے سے ملنے ہی سے انکار کر دیں ابھی یہ سب الٹا سیدھا سوچ ہی رہا تھا کہ اچانک طلبی ہو گئی۔

آیۃ الکرسی پڑھتا ہوا داخل ہوا، ایک نہایت خوش پوشاک، خوش اندام، خوش شکل و خوش مزاج سے صاحب سے بزرگ جو ہرگز اتنے بزرگ نہ جتنا کہ ان کو ہونا چاہیئے تھا اور جو مشرقی ادب اور تہذیب کے جامے میں مارے اخلاق کے بچھے جا رہے تھے لپک کر مجھ سے بغل گیر میں نے اپنا تعارف کرانا چاہا تو بولے "آپ کو اچھی طرح سے جانتا ہوں، ملاقات کا مجھے بھی اشتیاق تھا" باخیر و عافیت کے تبادلے کے

"آپ کے لئے کیا منگاؤں چائے یا کافی؟" میں نے عرض کیا۔

"دونوں" —— بے اختیار کھلکھلا کر ہنس دیئے۔

پان کھانے اور کھلانے کے مشغلے کے ساتھ ساتھ مختلف خشک و تر موضوعات پر انتہائی دلچسپ گفتگو کرتے رہے۔ ان کی ذہانت، علم و اخلاق سے میں بے حد متاثر ہوا۔

دوسرے دن ایک ادبی نشست میں پھر ملاقات ہو گئی، اس وقت زور صاحب نہایت ہی اعلیٰ درجے کے سوٹ میں بالکل انگریز معلوم تھے، مگر اس لباسِ مغربی کے باوجود پہلے سے بھی زیادہ گرمجوشی، تپاک، اخلاق اور انکساری سے ملے۔

یہ زور صاحب سے میری آخری ملاقات تھی، آج زور صاحب اس دنیا میں نہیں ہیں۔ مگر ان کے کارنامے اور یاد میرے دل اسی طرح تازہ ہے ان کی باتوں میں جو گلوں کی خوشبو تھی اس کی مہک سے آج بھی دماغ اسی طرح معطر ہے۔

سف ناظم

ڈاکٹر زور صاحب

ڈاکٹر زور صاحب مرحوم کا جب بھی خیال آتا ہے تو آج سے ۲۳ سال پہلے کے زور صاحب نظروں میں گھوم جاتے ہیں۔
م جسم، دبیز چہرہ، لمبے بال، چوغانہ کی ڈھیلی ڈھالی شیروانی، شیروانی کے جیبوں میں پان کے بیڑے۔

یہ تھے زور صاحب مرحوم جو جامعہ عثمانیہ کے شعبۂ اردو کے ایک چیمبر میں اردو کے درس دیا کرتے تھے۔ بی۔اے
ہ تک تو اساتذہ کو کلاس روم میں آکر لیکچر دینا پڑتا تھا لیکن ام۔اے کے طالب علم اساتذہ کے چیمبر ہی میں ام۔اے
ڈگری حاصل کر لیتے تھے۔ اُس زمانہ میں اردو کے طالب علموں پر اردو ادب سے دلچسپی یا رغبت لازمی نہ تھی،
ب کسی ایک استاد سے وابستگی ضروری تھی کیونکہ اس عہد زرّیں میں شعبۂ اردو امور خارجہ کا دفتر تھا۔ یہ بات
ہنے کی نہیں ہے اس لئے اسے یہیں چھوڑ دینا چاہئے۔ ام۔اے کرنے کا زمانہ واقعی بڑے مزے کا زمانہ ہوا کرتا ہے۔
ہتا ہے کہ عمر بھر ام۔اے ہی کرتے رہئے۔ ام۔اے کرنے کے دو بڑے فائدے جو ہمیں نظر آئے یہ تھے کہ اس میں تو طالب علم
نت ضائع ہوتی ہے اور نہ اُستاد کو محنت کرنی پڑتی ہے۔ طالب علم غیب سے ام۔اے ہو جایا کرتا ہے۔ ہم جب ام۔اے
ہے تھے تو دو اور ساتھی بھی یہی شوق پورا کر رہے تھے۔ ایک تھے محمد علی تیرؔ اور دوسرے تھے خواجہ حمیدالدین شاہد
دں مقالہ لکھا کرتے اور ام۔اے کی ڈگری پر نشانہ لگایا کرتے۔ ڈاکٹر زور ہمیں اردو نثر کے درس دیا کرتے
۔بی۔اے کی جماعتوں میں ڈاکٹر زور سے اتنا قرب حاصل نہ ہوا تھا جتنا کہ بعد میں ہوا۔ ایک کمرہ میں تین
ب علم اور ایک استاد۔ ہمیں اچھی طرح یاد ہے کہ ہماری نشستیں بھی مقرر ہو گئی تھیں۔ ڈاکٹر زور صاحب کی داہنی
۔محمد علی تیرؔ مجلہ عثمانیہ کے سودے لے کر بیٹھتے تھے تو مرحوم کی بائیں سمت حمیدالدین شاہد سب رس کا پلندہ
ال کر متمکن ہوا کرتے تھے۔ میں عام طور پر زور صاحب کے بالمقابل بیٹھا کرتا تھا۔ میں غریب نہ مدیر نہ معاونؔ
۔اس لئے ڈاکٹر صاحب مجھ سے بڑے خفا رہا کرتے تھے۔ میں کرتا بھی تو کیا۔ اُس زمانہ میں مجلہ دو ہی پرچے تو تھے
پر سورج کی کرنیں بکھری ہوئی تھیں تو دوسرے پر شہد کی چاشنی۔ ڈاکٹر صاحب مرحوم مجبوراً مجھ سے ٹیوٹوریل لکھوایا
اور اس دوران میں مجلہ اور سب رس پر غازہ اور پاؤڈر چڑھتا رہتا۔

واقعہ یہ ہے کہ ڈاکٹر زور نہایت غیر محسوس طریقہ پر درس دیا کرتے تھے۔ ایک طالب علم اُن کی عظمت اور بڑائی کا
کبھی نہیں کر سکتا تھا۔ اردو ادب اور اردو زبان کے خدمت گزاروں میں اُن کی حیثیت کو متعین کرنا کسی
علم کے بس کی بات نہیں۔ یہ کام ایک ان دیکھی طاقت کرتی ہے جسے زمانہ کہا جاتا ہے۔ ڈاکٹر زور کی حیثیت
ہی متعین کرے گا۔ اگر میں انہیں حیدرآباد کا مولوی عبدالحق کہوں تو قطعی مبالغہ نہ ہو گا۔ دکھنی زبان اور محمد قلی قطب شاہ

سے ڈاکٹر زور کی محبت اور عقیدت کو بہتوں نے عصبیت پر محمول کیا لیکن حقیقت یہ ہے کہ اگر ڈاکٹر زور دامن بچا لیتے دکھنی ادب کا بڑا خزانہ عدم کی گود میں سویا پڑا رہتا۔ دکھنی ادب کے محقق کی حیثیت سے زور مرحوم اس کے تنہا وارث ہیں یہ ایسی سنگلاخ زمین تھی جس پر چلنا ہر کسی کا کام نہ تھا۔ ہم نے تو بہتوں کو دیکھا ہے کہ وہ قلی قطب شاہ کا ایک شعر بھی ٹھیک سے پڑھ نہیں سکتے تھے۔ خود ہمارا بھی ایسی لوگوں میں شمار ہوتا ہے۔ محمد قلی قطب شاہ کے شعر کو وزن کے ساتھ پڑھنے میں خود قاری کا بیلنس آؤٹ ہو جانے کا اندیشہ رہتا ہے۔ زور صاحب نے اس باب میں تحقیق و جستجو کا بیڑا اٹھایا وہ کما حقہ اس سے عہدہ برآ ہوئے۔ کوئی اور دُبلا پتلا آدمی ہوتا تو چیں بول جاتا۔ ہمالیہ پہاڑ پر چڑھنے اور دکنی ادب پر قلم اٹھانے میں کوئی خاص فرق نہیں۔ قلی قطب شاہ کا دیوان شائع کر کے زور صاحب نے درحقیقت ایک شکر محل کھڑا کر دیا۔ اگر بودھن کی شکر فیکٹری ریاست حیدرآباد میں قائم نہ ہوتی تب بھی حیدرآباد کی شیرینی اور مٹھاس میں کمی واقع نہ ہوتی۔ قلی قطب شاہ کے نام کے ساتھ اب ڈاکٹر زور کا نام پیوست ہو کر رہ گیا ہے۔

ڈاکٹر زور نے اردو کی خدمت میں اپنی عمر صرف کی وہ ابتدائے عمر ہی سے اس راہ پر بھٹک گئے تھے ورنہ حیدرآباد کی سرزمین پر عرق ریزی اور محنت کا کام کرنے والوں کا پیدا ہونا معجزہ سے کم نہیں۔ ڈاکٹر زور کو اپنے گھر کی طرف سے مرشد بننے کا حق تھا تو سسرال کے تعلق سے نواب بننے کا۔ لیکن پتہ نہیں زور صاحب کیسے اردو کے خدمت گزار بن گئے اور عشق کی طرح خدمت گزاری کا رستہ بھی بڑا پُر پیچ اور خار دار ہے۔ اس راہ پر آدمی ایک مرتبہ بھٹک جائے تو اس کا بخیر و خوبی واپس آنا ممکن نہیں۔ ’سب رس‘ اور ’ادارہ ادبیات اردو‘ اُن کی دو ایسی یادگاریں ہیں جن کی موجودگی میں اُن کی مزید کوئی یادگار قائم کرنا عبث ہے۔ اگر یہی یادگاریں آن بان اور کرّوفر کے ساتھ باقی رہیں تو کہا جائے گا لوگ زور صاحب کو بھولے نہیں۔

ادارۂ ادبیات اردو تو کئی ادیبوں اور شاعروں کا میٹرنٹی وارڈ ہے۔ زور صاحب نے حیدرآباد میں ــ پڑھنے والوں کی ایک منظم جمعیت کھڑی کر دی۔ یہ سب کچھ نہایت غیر محسوس طریقہ پر ہوا ہے اور بہت کم لوگوں کو اس بات کا اندازہ ہوگا کہ روشنی کی کرن انہیں کہاں سے نصیب ہوئی۔ ادارۂ ادبیاتِ اردو جنوبی ہند میں اس وقت اردو کا سب سے بڑا مرکز ہے اور جب یہ قایم کیا گیا ہوگا تو شاید خود زور صاحب کو اندازہ نہ ہوگا کہ یہ آگے چل کر ایک اور مکتبۂ جامعہ کی حیثیت کا ادارہ بن جائے گا۔ میں نہیں سمجھتا کہ ڈاکٹر زور صاحب کوئی پلان رکھنے والے آدمی تھے وہ تو بس یونہی کوئی کام شروع کر دیا کرتے تھے اور پھر اقبال مندی خود اس کی دیکھ بھال کر لیتی۔ ورنہ ہم نے کئی سوچے سمجھے منصوبوں پر پانی پھرتے دیکھا ہے۔ ”سب رس“ کی زندگی بھی آپ اپنی نظیر ہے۔ یہ بوڑھا ہو تو ملے اور پھر جوان ہو جاتا ہے۔ یہ پیرانہ سالی اور یہ عہدِ شباب، ایسا معلوم ہوتا ہے پنڈت مدن موہن مالویہ کایا کلپ کروا کے بیٹھے ہوئے ہیں۔ میں تو واقعی شکر کرتا ہوں کہ اس کا وہ زرد رنگ کا ملگجا اور کھردرا سرورق اس پر سے اتار کر صدقے کر دیا گیا۔ پیلے پیلے کاغذ پر سیاہ حروف میں ”سب رس“ کے الفاظ دیکھ کر شبہ ہوتا تھا کہ یہ کسی یہ سرورق ہے یا کڑاھی میں جلا ہوا بھجیا۔ وہ پیلا کاغذ یوں سمجھئے اس کا صدقہ گیا اور اب اس پر کوئی آفت نہ آئے زور صاحب کی بھاری بھر کم شخصیت ان دو یادگاروں کے پس منظر میں ہمیشہ تاباں اور درخشاں رہے!

ڈاکٹر زور مرحوم کچھ نہیں تو پینتیس چالیس کتابوں کے مصنف ہوں گے۔ تحقیق اور تنقید کے موضوع پر اتنی ساری کتابیں
ملکیت ہوں اُسے اور کیا چاہیئے۔ ہم نے تو بہتوں کو صرف ایک کتاب چھپ جانے پر رقص کرتے دیکھا ہے۔ ہمارا
ایسے ہی لوگوں میں ہوتا ہے۔ ہم نے اس کے علاوہ اور بھی لوگوں کو دیکھا ہے جنھوں نے شاید پینتیس چالیس
پڑھی بھی نہ ہوں۔ زور صاحب کو صرف کتابیں لکھنے کا شوق نہیں تھا وہ دوسروں کی کتابیں بھی بڑے شوق
چاپتے۔ اس لیے بعض لوگوں نے مشہور کر رکھا تھا کہ ادارہ ادبیات اُردو والے کتابیں چھاپ کر ان کا ڈھیر
ب جانتے ہیں۔ ظاہر ہے ڈاکٹر صاحب کو تجارت سے کیا تعلق۔ کتابیں کس طرح بیچی جاتی ہیں اور اُن کا بھاؤ
چاہیئے زور صاحب کو اس سے شاید سروکار نہ تھا۔

ہمارا خیال ہے کہ زور صاحب کا آخیر زمانہ بہت جلد آ گیا' حیدر آباد سے دوری ان کے آخیر زمانہ کو قریب کھینچ
نہ اصولاً آدمی کو اس وقت وفات پانا چاہیئے جب وہ تھک جائے اور زور صاحب ابھی کہاں تھکے
اُن میں تو کام کرنے کی اب بھی توانائی تھی یہ سب اُن کے تخلص کی برکت تھی کہ آخیر تک وہ جوان تھے'
جواں قسمت تھے۔ اور زندہ دلی تو جیسے ان کا پیشہ تھا۔

اُن کے ایک دوست ڈاکٹر مدنی نے وَلی دکھنی کو اپنی تحقیق سے وَلی گجراتی بنا دیا۔ اور ڈاکٹر زور اُن سے لڑ بیٹھے
نا ہمیں بے حد پسند آئی یوں بھی ہم شر پسند واقع ہوئے ہیں دو آدمی لڑتے ہوں تو ہمیں بڑا لطف آتا ہے۔
زور کی لڑائی آخیر تک جاری رہی اور وہ جب بھی بمبئی جاتے انتقاماً ڈاکٹر مدنی کے مہمان، ہوا کرتے۔ انتقال
ب ہفتہ پہلے بھی وہ بمبئی میں ڈاکٹر مدنی کے مہمان تھے۔

ڈاکٹر زور بڑی لااُبالی طبیعت کے آدمی تھے۔ اُنھوں نے مرنے کا بھی کوئی پلان نہیں بنایا تھا وہ تو بس مرت کا
ہوگئے۔ ڈاکٹر زور کی موت ہی سے ہمیں معلوم ہوا کہ کشمیر کی سرسبز و شاداب وادی میں بھی آدمی مر سکتا ہے۔
قدرت کے کاروبار اور اُس کے نظم و نسق سے ہمیں مطلق دلچسپی نہیں ہے ورنہ ہم کو یہ کہنے میں قطعی باک نہ ہوتا کہ
ٹر زور چند دن اور زندہ رہتے تو قدرت کا کیا بگڑ جاتا۔ پھر ہمیں یہ خیال ہوتا ہے کہ آدمی مر کر بھی تو زندہ
ملتا ہے۔

پروفیسر سید احتشام حسین
(الہ آباد)

ڈاکٹر زور مرحوم — چند تاثرات

مجھے ڈاکٹر زور مرحوم کے قریب رہنے کا موقع کبھی نہیں ملا۔ ملاقاتیں کئی بار ہوئیں لیکن سب مختصر اور سرسری تھیں۔ یہ نہیں جن میں ہیں اُن کے دل کے اندر جھانک سکتا اس لئے مرحوم کے متعلق میری معلومات کتابی ہیں یا پھر وہ جو مشترک دوستوں کے تاثرات کی شکل میں مجھ تک پہنچی ہیں۔ ان تاثرات میں خوبیاں اور خامیاں دونوں شامل تھیں لیکن مجھے براہ راست اُن کا تجربہ نہیں ہے اس لئے زیادہ کچھ نہیں کہہ سکتا۔ انتقال سے پہلے ایک "سخن گسترانہ" بات پر مرحوم مجھ سے ناراض ہو گئے اور اس کا اظہار انھوں نے ایک خط میں کیا۔ لیکن جب میں نے اپنے خیال کی وضاحت کی تو انھوں نے ایک محبت آمیز خط لکھا۔ اتفاق سے وہ خط میرے پاس محفوظ رہ گیا ہے، اُس کے بعض حصے یہ ہیں:

> آپ کا مکرمت نامہ مورخہ ۱۹ر جولائی ملا اور دلی خوشی ہوئی کہ آپ نے اپنی شرافت نفس اور حسن اخلاق سے مجھے گرویدہ بنا لیا اور سچ تو یہ ہے کہ انہی کی بنا پر اور اسی توقع پر وہ خط لکھا تھا ورنہ
>
> کیا کسی کا گلہ کرے کوئی

یہ خط ۲۷ر جولائی کو سری نگر سے لکھا گیا تھا اور میرے نام اُن کا آخری خط تھا۔ ہم نے ایک دوسرے کو زیادہ خط نہیں لکھے، اس لئے کبھی بے تکلف خط کتابت کی نوبت نہیں آئی۔

مجھے یہ اچھی طرح یاد نہیں کہ میں نے زور صاحب کی پہلی تحریر کب اور کون سی پڑھی لیکن یہ ضرور یاد ہے کہ میں الہ آباد یونیورسٹی میں بی۔ اے کا طالب علم تھا تو اُن کی کتابوں سے واقف ہو چکا تھا۔ روحِ تنقید۔ تنقید اردو کے اسالیب بیان، مطالعہ میں آ چکے تھے اور جب ایم۔ اے میں پہنچا تو ہندوستانی لسانیات اور اردو شہ پارے سے فیض یاب ہوا۔ جہاں تک یاد آتا ہے ۱۹۳۶ء میں ہندوستانی اکیڈمی کے ایک جلسے میں انھیں دیکھنے کا اتفاق ہوا تھا مگر ملاقات نہیں ہوئی۔

ڈاکٹر محی الدین قادری زور کی تصانیف جلد جلد شائع ہو رہی تھیں اور میں کسی نہ کسی طرح انھیں پڑھ بھی لیا کرتا۔ اگرچہ یہ میری بدقسمتی تھی کہ میں بعض تنقیدی مسائل اور ادبی تصورات میں اُن سے متفق نہ تھا۔ اس کا یہ مقصد نہیں کہ احترام میں کوئی کمی کرتا تھا یا اُن کے نقطۂ نظر کے خلاف کچھ کہتا یا لکھتا تھا، نہیں بلکہ خاص طرح کے ادبی خیالات رکھنے سے میں اُن سے اتفاق نہ کر سکتا تھا۔

۱۹۴۵ء میں مجھے پہلی دفعہ حیدر آباد جانے کا اتفاق ہوا۔ اس سال وہاں ترقی پسند مصنفین کی ایک بہت

نفرنس ہوئی تھی اور میں بھی ایک سیشن کی صدارت کرنے کے لئے وہاں پہنچ گیا تھا۔ اسی کانفرنس میں پہلی دفعہ ڈاکٹر زور سے
متعارف ہوا۔ "ادارہ ادبیات اردو" دیکھنے گیا اور کچھ وقت مرحوم کے ساتھ دکن کی علمی خدمات اور قلمی نوادر پر گفتگو کرنے
یں صرف ہوا۔ مرحوم کانفرنس کے کئی جلسوں میں تشریف لائے لیکن کارکنوں سے گھل مل نہ سکے۔ لوگوں نے طرح طرح کی
تیں کہیں لیکن میرا خیال ہے کہ ان کی عدم دلچسپی کا اصل سبب اختلاف نگاہ تھا جس پر ریاست کی اس جاگیردارانہ فضا
نے اور جلا کر دی تھی جس سے وہ بہت قریب تھے۔ اس میں شک نہیں کہ اس فضا سے انھوں نے وہ فائدہ بھی اٹھایا جو
ردو زبان و ادب کی ترقی کے کام آیا۔

اس کے بعد مرحوم سے کئی بار حیدرآباد میں اور کئی بار دہلی میں ملاقاتیں ہوئیں لیکن جیسا کہ عرض کر چکا ہوں ہم ایک
وسرے کے بہت قریب نہ آسکے۔ کبھی بھولے بھٹکے کوئی خط یا کوئی کتاب ادھر سے ادھر ہو جاتی تھی۔ آخری ملاقات
ت ۱۹۶۱ء میں الہ آباد میں ہوئی۔ میں الہ آباد یونیورسٹی کی اردو کی پروفیسری کا امیدوار تھا اور مرحوم منتخبہ کمیٹی میں
ہر کی حیثیت سے تشریف لائے تھے۔ کسی وجہ سے ان کا خیال تھا کہ میں اس جگہ کے لئے موزوں نہیں ہوں۔ چنانچہ
نھوں نے میری مخالفت کی۔ باہر نکل کر ملاقات ہوئی تو فرمایا کہ بھائی بعض وجوہ سے میں نے آپ کی مخالفت کی ہے
یں نے کہا اس سے کیا ہوتا ہے آپ نے کچھ سوچ ہی کر کی ہوگی اور ہر شخص ہر دوسرے شخص کو پسند بھی کیسے کر سکتا ہے، کہنے لگے نہیں
ند کی بات نہیں تھی۔ کچھ لوگ اور آگئے اور بات ختم ہو گئی۔ الہ آباد میں میرا تقرر ہو گیا اور مجھے معلوم نہ ہو سکا کہ وہ اس بات
ے خوش ہوئے یا رنجیدہ۔ جون ۱۹۶۲ء میں دہلی یونیورسٹی کے رسالہ "اردوئے معلی" کا لسانیات نمبر نکلا جس میں مرحوم زور صاحب
بھی ایک مضمون تھا۔ یہ مضمون اس سے پہلے بھی ایک دوسرے عنوان سے چھپ چکا تھا۔ میں نے وہ مضمون جب پھر اسی
شکل میں دیکھا تو مجھے بعض باتوں کے متعلق کچھ عرض کرنے کی ضرورت پیش آئی کیونکہ اس میں میرا ذکر بھی تھا۔ میں نے ایک
نقرسا نوٹ اس کے متعلق ہماری زبان علی گڑھ میں شائع کرا دیا۔ یہ بات زور صاحب مرحوم کو پسند نہیں آئی اور انھوں نے مجھے
ے خط لکھا جس میں کسی بات کا جواب دینے کے بجائے انھوں نے یہ خیال ظاہر کیا کہ میں (زور صاحب) نے جو آپ کے تقرر کے
سلسلہ میں مخالفت کی تھی اسی سے آپ مجھ سے ناخوش ہیں اور یہ مضمون اسی کا نتیجہ ہے۔ مجھے خط پڑھ کر بہت رنج ہوا اور
ں نے موصوف کو ایک طویل خط لکھ کر یقین دلایا کہ یہ محض ایک علمی مسئلہ ہے اس کا کوئی تعلق آپ کی ذات سے نہیں۔
ں خط میں میں نے ان کی علمی اور ادبی خدمات کو سراہا تھا اور اپنی جانب سے یقین دلایا تھا کہ میرے دل میں ان کی طرف سے
ئی کدورت نہیں ہے۔ اوپر جس خط کا ایک اقتباس دیا گیا ہے وہی خط جواب میں آیا۔ افسوس کہ وہ آخری خط تھا
ں کے دو مہینے کے اندر زور صاحب وہاں چلے گئے جہاں اب کسی قسم کے خط یا خیال کی رسائی نہیں ہے۔ اسی طرح ایک بار
س سے پہلے بھی ولی کے دکنی یا گجراتی ہونے کے سلسلہ میں انھیں مجھ سے شکایت پیدا ہو گئی تھی کیونکہ میں نے ایک جگہ یہ لکھ
یا تھا کہ ولی دکن کا ہو یا گجرات کا اس کی شاعری سارے ہندوستان کی ہے اور اب تو اس کا اورنگ آبادی ہونا اچھا خاصا
شکوک ہے۔ بہر حال ممکن ہے وہ زود رنج رہے ہوں اور اختلاف برداشت نہ کرتے رہے ہوں لیکن میں یقین سے کچھ نہیں کہہ سکتا
باتیں ان کے ساتھ چلی گئیں جو چیز زندہ ہے وہ ان کی خدمات ہیں جن کی اہمیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ وہ ادارۂ
دبیات اردو میں، سب رس میں، اردو کے امتحانات کی تنظیم میں، آزاد ریسرچ انسٹی ٹیوٹ میں، دکنی مخطوطات

شائع کرنے کی تحریک دی اپنے شاگردوں کے جوشِ خدمت میں اور اپنی چار درجن سے زیادہ کتابوں میں زندہ ہیں۔

ڈاکٹر زور نے افسانے لکھے، لسانیات پر تحقیق کی، تنقیدی مضامین لکھے، دکنی ادب کی تحقیق میں عمر کا بڑا حصہ تاریخی کتابیں تیار کیں، دواوین مرتب کئے، حواشی لکھے، انتخابات شائع کئے، شعر کہے، بیانات دئے۔ کانفرا شرکت کی، یونیورسٹیوں میں اردو کی تعلیم اور معیار کی فکر کی، ادارے قائم کئے، خود کام کیا اور دوسروں کے اندر ا کی۔ یہ ساری باتیں ایسی ہیں جن کا دسواں حصہ بھی بہت سے ادیبوں کے حصے میں نہیں آیا ہے۔ اگر یہ سب کچھ اُن کی ادبی اور علمی خدمات انھیں زندہ رکھتیں۔

جب انھوں نے اپنی کتاب روحِ تنقید شائع کی اُس وقت اُن کی عمر بیس اکیس سال سے زیادہ نہ تھی، ا اردو تنقید پر مغربی تنقید کا اثر پڑ چکا تھا اور اس کا تذکرہ بھی آتا رہتا تھا لیکن انھوں نے مغربی ادیبوں وہ اقوال اور خیالات یکجا کر دئے جن کی مدد سے تنقیدی مسائل کو سمجھنے کی کوشش کی جا سکتی تھی۔ اب ا اکثر خیالات عام ہو کر تنقیدی ادب کا جزو بن چکے ہیں لیکن اس وقت یہ کام اہم تھا۔ اس میں شک نہ وہ طالب علم تھے اور یہ کوشش طالبعلمانہ تھی لیکن اُس وقت بھی اُن کی محنت اور سوجھ بوجھ نے ایک نمو دیا تھا۔ تنقیدی مقالات اور تین شاعر کے مضامین جو جلد جلد تھوڑی ہی مدت میں لکھے گئے، یکساں پائے کے لیکن ان میں سے بعض مضامین پہلی دفعہ ایک نئے تنقیدی اسلوب کا پتہ دیتے ہیں۔ ڈاکٹر زور کے اسلوب میں ا نہ تھی لیکن اُن کا ذہن رسا تھا اور اپنے خیالات کو ایک مرتب انداز میں اس طرح پیش کرتے تھے کہ مضامین بڑھ جاتی ——— یہی حال اردو کے اسالیب بیان کا ہے جس میں اچھے یاد رکھنے کے قابل اور چونکانے والے جملے لیکن مفید اور ضروری باتیں بہت سی سامنے آجاتی ہیں۔

میرا خیال ہے کہ اُن کے افسانے افسانوی ادب میں کوئی خاص مقام حاصل نہیں کر سکیں گے لیکن دکن کی گوشے اُن سے ضرور منور ہو جاتے ہیں۔ غالباً اُن کا مقصد بھی یہی تھا کہ افسانوں کے پیرایہ میں ان کی طرف متوجہ ہوگا۔ اسی طرح دکن کی تاریخ سے لوگوں کو دلچسپی پیدا ہوگی اور اس کا تہذیبی حسن نمایاں ہوگا۔ سیر گولکنڈہ او کے ہیرے، اس حیثیت سے بہت اہم ہیں۔

اردو میں لسانیاتی مسائل پر جو تھوڑا بہت مواد جمع ہو گیا تھا، اُس کی بنیاد پر پروفیسر محمود شیرانی نے ا کام کیا تھا لیکن باقاعدہ لسانیات کی تعلیم حاصل کر کے اردو کے آغاز، اس کی تشکیل اور توسیع پر غور کرنے کا زور ہی کے سر ہے۔ ہندوستانی لسانیات اور صوتیات پر اُن کے مقالوں نے لسانیاتی مطالعہ کی راہیں اردو کر دیں۔ گو انھوں نے بعد میں اس سلسلہ کو جاری نہیں رکھا جس سے اردو کا دامن اور وسیع ہوتا لیکن اُن کی وجہ تعلیم کی طرف طلبا ضرور متوجہ ہوتے رہے۔ انھوں نے لسانیات کی ابتدائی تاریخ، اصول اور مسائل کے متعلق اور سرسری اشارے کئے ہیں، آریائی زبانوں کے ارتقا کی داستان بھی اجمالاً بیان کی ہے لیکن دکنی زبان کی صوتیاتی ہیئت کے بارے میں بعض بڑی گراں قدر باتیں کہی ہیں۔ اس وقت جب کہ دکنی اردو کو دکنی ہندی بنا اچھی طرح جڑ پکڑ چکی ہے، اُن کی تحقیقات کو اچھی طرح سمجھنے اور پھیلانے کی ضرورت ہے۔

ڈاکٹر زور کا سب سے گراں بہا کام دکنی ادب اور تاریخ کو علمی رکھ رکھاؤ کے ساتھ ہر دلعزیز بنانا ہے۔ گو اس سلسلہ میں اُن کے پیشرو بھی تھے لیکن انھوں نے منظم طور سے اسی کام کو اپنی زندگی کا مشن بنا لیا۔ اُردو شہ پارے، کلیاتِ محمد قلی قطب شاہ، حیاتِ محمد قلی قطب شاہ، حیاتِ میر مومن، داستانِ ادبِ حیدرآباد، حیدرآباد فرخندہ بنیاد، دکنی اردو ادب اس سلسلہ کے بہت اہم کام ہیں۔ اگر ان میں عہدِ عثمانی میں اردو کی ترقی، مرقعِ سخن، فیضِ سخن، متاعِ سخن، کیفِ سخن، معانیِ سخن وغیرہ کو بھی شامل کر لیا جائے تو اس کا وزن اور بڑھ جاتا ہے۔ ان کتابوں کے مطالعہ سے یہ اندازہ ہو جاتا ہے کہ انھیں حیدرآباد اُس کے بانی سلطان محمد قلی قطب شاہ اور اُس کے اثر سے وجود میں آنے والی تہذیب سے والہانہ عشق تھا، اس عشق میں وہ یہ بھی بھول جاتے تھے کہ زبان و ادب کے ارتقا میں شاہی سرپرستی کے علاوہ بہت سے اور عناصر بھی کام کرتے رہے ہیں۔ تاہم انھوں نے اُس عہد کے مختلف پہلوؤں کو بار بار اس طرح پیش کیا ہے کہ مطالعہ کرنے والا متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ اس میں شک نہیں کہ محمد قلی قطب شاہ کی شخصیت غیر معمولی اور بے حد پرکشش تھی، تاریخ نے اُس میں وہ بہت سی خصوصیات جمع کر دی تھیں جو مشکل سے یکجا ہوتی ہیں، اُس کی ذات دکنی تہذیب کی ارتقاپذیر قدروں کی علامت بن گئی تھی پھر بھی ڈاکٹر زور کو اُس عام زندگی کو بھی پیشِ نگاہ رکھنا چاہیے تھا، سلطان جس کا زائیدہ تھا۔ اسی طرح دکن کے دوسرے شعراء اور ادیب بھی جن کا ذکر انھوں نے اکثر کیا ہے، اپنے سماجی پس منظر سے الگ ہو کر سامنے آتے ہیں۔ ان باتوں کے باوجود ان کے تحقیقی اور تنقیدی کام ناقابلِ فراموش ہیں۔

ڈاکٹر زور کام جلد کرتے تھے، زیادہ گہرائی میں جانے کے بجائے وہ ضروری اجزا کو یکجا کر دینے کو اہمیت دیتے تھے۔ ایک ہی وقت میں کئی کتابوں کا مواد فراہم کرتے جاتے تھے اور اس طرح کئی کتابیں ایک ساتھ ترتیب پا جاتی تھیں۔ حیاتِ قلی قطب شاہ کے لئے مواد فراہم کرتے ہوئے انھیں بڑی آسانی سے میر محمد مومن استرابادی کے متعلق معلومات حاصل ہوتی گئیں اور حیاتِ سلطان کا کام ختم کر کے انھوں نے حیاتِ میر مومن مرتب کر ڈالی۔ یوں ہی حیدرآباد کی تاریخ کے لئے مواد یکجا کرتے ہوئے انھیں ادبِ حیدرآباد کی داستان مرتب کر لینے میں کوئی دشواری پیش نہیں آئی۔ اس طرح اُن کے تصنیفی کاموں میں تیز رفتاری آ جاتی تھی اگرچہ معیار کو نقصان پہنچ جاتا تھا۔

ڈاکٹر زور مرحوم تنہا ایک اِدارہ تھے، اُردو کے بہت بڑے مخدوم اور خادم تھے، ادیب اور نقاد تھے، مورخ تھے، بہت اچھے معلم تھے، غیر معمولی تنظیمی صلاحیتیں رکھتے تھے۔ اُن میں بہت سے مختلف النوع کام کرنے والوں کی خوبیاں جمع ہو گئی تھیں جن سے نئی نسل کو واقف کرانا ضروری ہے۔ یہ کام اُن اِداروں اور رسالوں کے ذریعہ ہو سکتا ہے جن کی آبیاری میں اُن کا لہو شامل ہے۔

پروفیسر محمد خاں
(میسور)

اُردو کا فدائے دکن ادیب

پروفیسر سید محی الدین قادری زور دکن میں اردو کے ادیب تھے، ان کی صحیح حیثیت کو سمجھنے کے لئے ایک پس منظر کی ضرورت ہے۔ میں اسی کو پیش کرنے کی کوشش کروں گا اسی میں دعوت فکر ہے۔

تینتیس ۳۳ برس پہلے پروفیسر آغا محمد عباس شوستری نے جامعہ میسور میں مجھے "اردو و فارسی منشی" کے طور پر مامور کیا اس زمانے میں بمصداق ع تکلف برطرف تھا، ایک انداز جنوں وہ بھی، میرے ذہن میں یہ بات جم گئی تھی کہ اردو زبان بس وہی ہے جو دبستان دہلی و لکھنؤ کے ادیبوں اور شاعروں کی تحریروں میں محفوظ ہے اور دکن میں اردو کا کامیاب مقلد وہ ہے جو ان دبستانوں کے اختلافوں سے بخوبی واقف ہو کر کسی ایک دبستان کی تقلید کرے لیکن اتنی احتیاط رکھے کہ یہ دونوں دبستان خلط ملط نہ ہو جائیں مثلاً "میری معلومات اچھی ہے" میں معلومات کو واحد مونث استعمال کرنا دلی کی تقلید اور "میرے معلومات اچھے ہیں" میں معلومات کو جمع مذکر استعمال کرنا لکھنؤ کی تقلید ہے اور ان دونوں کو گڈ مڈ کر کے "میری معلومات اچھی ہیں" لکھنا ہمہ داری کے خلاف ہے، چنانچہ میں دبستان دہلی کی تقلید کرنے لگا۔ اس تقلید پر سید انشا کا یہ قول ایک اونتازیانہ ہوا:—

> " شاہ جہاں آباد کی زبان وہ ہے جو درباری اور مصاحبت پیشہ
> قابل اشخاص، خوبصورت معشوقوں، مسلمان اہل حرفہ، شہروں اور امرا
> کے شاگرد پیشہ ملازموں حتیٰ کہ ان کے خاکروبوں کی زبانی ہے۔"
>
> (دریائے لطافت ترجمہ کیفی صفحہ ۱۲۱)

چنانچہ مذکورہ تقلید میں وہ شدت ہوئی کہ میں دلی کے ہر کس و ناکس کی تحریروں کو پورے اعتماد اور اطمینان سے پڑھتا تھا کہ اس سے اردو سنورتی ہے لیکن دکن کے بہترین ادیبوں کی تحریریں پڑھنے سے خوف کھاتا تھا کہ نہیں معلوم یہ کہاں چوک جائیں گے اور کہاں میری نقالی میں نقص آ جائے گا اور میر کا یہ قول ہمیشہ پیش نظر رہتا تھا کہ "خیر آپ کا شغل ہے میری زبان خراب ہوتی ہے۔" اب سوچتا ہوں تو اس میں قصور میرا نہیں تھا کیونکہ دکن کے ادیبوں اور شاعروں نے تقریباً ڈیڑھ صدی سے ہندوستان کی تقلید میں اپنی انفرادیت تفصیلی طور پر کھو دی تھی، انھوں نے اپنی زبان، اپنے اجتہاد، اپنی آزادی اپنے وقار سب کو تج دیا تھا، دلی سے لکھنؤ کا جو فاصلہ ہے اس سے کتنا فاصلہ دلی سے دکن میں اردو کے مرکزوں گلبرگے، بیجاپور اور گولکنڈے کا ہے لیکن دلی اور لکھنؤ کے ماحول میں جو لفظ پہلے مذکر تھے اب مؤنث اور جو مونث تھے اب مذکر بولے جاتے ہیں اور چند الفاظ کو ایک ہی شہر میں مذکر اور مونث دونوں طرح اور بعض الفاظ کو ایک شہر میں مذکر اور دوسرے شہر میں مونث اور واحد مونث کی جمع کہیں

ے ہیں اور متعدی فعلوں کے ساتھ 'نے' کا استعمال کرتے ہیں اور نہیں بھی کرتے اور بعض لازم افعال کے ساتھ 'نے' ضرور استعمال کرتے
ں اور بعض متعدی فعلوں کے ساتھ 'نے' نہیں لاتے اور ایک ہی چیز کے لئے ایک جگہ ایک نام اور دوسری جگہ دوسرا نام بولتے
ں۔ کوئی غیر اردو داں اردو سیکھنا چاہے تو اردو میں ایسی بے شمار بے ربطیوں، بے اصولیوں بلکہ صاحب 'آب حیات' کے الفاظ
سینہ زوریوں سے سابقہ پڑتا ہے جن کی کوئی تاویل نہیں ہو سکتی، پھر بھی ان کا تحفظ ان دبستانوں کو جان سے زیادہ عزیز ہے
بستان ان اختلافوں کو اپنے اجتہاد، اپنی آزادی اور اپنے وقار کا سرمایہ سمجھتے ہیں۔ ان باقاعدہ بے قاعدگیوں کو دور کر کے
دو کی صرف و نحو اور لغات میں حتی الامکان یکسانی اور ہم آہنگی پیدا کرنے کی پرخلوص اور بے لاگ کوششیں جماعتی طور پر
ہمارے ہاں نہیں ہوئیں اور کسی فرد نے یہ خدمت انجام دینی چاہی تو اس کو ادھر قرار دے دیا۔ یہ عیب چھوٹے یا بڑے پیمانے پر ہر زبان
پائے جاتے ہیں بلکہ زبانوں کی خصوصیات بن گئے ہیں، اس لئے کسی زبان میں دس عیب اس قسم کے پہلے سے ہیں تو دس اور سہی
ے زبان کی مقبولیت اور افادیت میں کوئی فرق نہیں پڑتا۔ فکر چاہے مذکر ہو چاہے مونث اگر صحیح ہے تو کام کی ہے
بے کار اور فضول۔

گھاس کا لفظ پورے دکن میں مذکر اور شمال میں مونث ہے، نہ شمال کے پاس گھاس کے مونث ہونے کی دلیل ہے نہ دکن کے پاس
کے مذکر ہونے کی۔ اور کبھی دلی نے لکھنؤ سے یہ نہیں پوچھا کہ تمہارے نزدیک 'گیند' مذکر اور مونث دونوں اور 'مالا' صرف مذکر کیوں
جیسے کوئی بھلا آدمی اپنے پڑوسی کے رہنے سہنے، کھانے پینے کے طور طریقوں پر اعتراض نہیں کرتا کہ اس نے فلاں رنگ اور فلاں وضع
باس کیوں پہنا ہے یا وہ کسی خاص قسم کا کھانا کیوں کھاتا ہے یا اس کے یہاں سالن میں املی کی کھٹائی اور ناریل کیوں پڑتا ہے۔

جامعۂ میسور میں عبدالقادر سروری اردو کے پروفیسر کی حیثیت سے غالباً ۱۹۴۵ء میں انٹرمیڈیٹ کالج بنگلور میں اردو کی جماعتوں
معائنہ کے لئے آئے۔ میں اردو پڑھا رہا تھا کسی شعر میں گھاس کا لفظ آیا تھا۔ میں نے شعر کی تشریح میں گھاس کو مونث استعمال
گھنٹہ ختم ہو گیا اور طلبہ چلے گئے تو سروری صاحب نے مجھ سے پوچھا کہ گھاس مذکر ہے یا مونث۔ میں نے کہا دلی اور لکھنؤ میں مونث
کالج کے کتب خانہ سے نور اللغات اور فرہنگ آصفیہ منگوا کے دیکھیں، پھر حیرت سے پوچھا کہ میری زبان پر یہ لفظ مذکر کیوں ہے
نے کہا اس میں حیرت کی کیا بات ہے جو لفظ جس طرح آپ اپنے ماحول میں سنتے آئے ہیں ویسا ہی کہتے ہیں، میں بھی گھاس کے
اس کو مذکر ہی کہتا۔ کہا کہ جیراج پوری نے ٹھیک کہا ہے کہ بے جان چیزوں کی تذکیر و تانیث کے اختلاف کو مٹا دینا چاہیے۔ غرض
کہ جانداروں کی تذکیر و تانیث کو بھی فارسی والوں کی طرح مٹا دینا چاہیے۔ لیکن اس مشورے کو شمال نہیں ماننے کا اور آپ
ن کو مذکر استعمال کرنے کی جرأت نہیں کر سکیں گے۔ کوئی ایسی تدبیر ہو سکتی ہے کہ کم از کم اردو کے ماحول سے گھاس مفقود
جائے تو آسانی ہوگی۔

یہ واقعہ دکن کے ادیبوں اور شاعروں کی توجہ چاہتا ہے، سروری صاحب دکن میں اردو کے پروفیسر کی حیثیت سے چالیس
کی پختہ عمر میں گھاس کو مذکر استعمال کرتے ہیں، اس لئے نہیں کہ وہ اردو میں کوئی ترمیم کرنا چاہتے ہیں بلکہ اس لئے کہ وہ جس
ماحول میں پلے بڑھے ہیں وہاں کے لاکھوں اردو بولنے والے گھاس کو مذکر بولتے ہیں لیکن وہ دلی اور لکھنؤ کے اس قدر دیانت دار
پیرو ہیں کہ گھاس کو مذکر کہہ کر جھینپ جاتے ہیں اور تاویلیں کرتے ہیں۔ مذکورہ موقع پر ان کا ذہن اس طرف منتقل ہی نہ ہو سکا
کیوں گھاس کو مذکر استعمال نہ کریں اور جیسا دلی اور لکھنؤ والے آپس کے اختلافوں کو جن کی بنیاد صرف شوق اختلاف پر ہے

عزت کی نظر سے دیکھتے اور ان کی بحالی کی کوشش کرتے ہیں۔ مثلاً نورالحسن نیر دبستان لکھنو کے نمائندہ ہونے کے باوجود نوراللغات میں لکھتے ہیں کہ " فاتحہ " لکھنو میں مذکر دہلی میں مونث ۔ اور اسی طرح انھوں نے کہیں بھی ان اختلافوں کو نظرانداز کیا بلکہ دیانت داری سے انھیں محفوظ کردیا ہے ۔ ایسا ہی دکن میں گھاس کے مذکر، گھوڑے کے زین کے مونث اور لونگ کے مذکر ہونے کا ذکر اور دکنی میں جمع بنانے کے قاعدوں مثلاً ع غنیاں کے بھیجیاں کو کھاتے شتاب ۔ غنیم اور بھیجے کی جمعوں کا ذکر ہونا چاہیے تھا، وعلیٰ ہذا القیاس ۔ لغات اور قواعد نویسوں نے پورے دکن کا اتنا بھی نہیں رکھا جتنا کہ دلی یا لکھنو کے شہروں کا دلی میں کوئی "میں نے مصوری سیکھی ہے" کی جگہ "میں مصوری سیکھا ہوں" کہے تو عیب نہیں اور دکن میں کوئی "میں نے کتاب پڑھی ہے" کی جگہ "میں کتاب پڑھا ہوں" کہے تو کوئی عیب نہیں کیونکہ دلی میں یوں کہنا عیب نہیں، لیکن کوئی دکنی کہے کہ "میں روٹی کھایا ہوں" تو بالکل غلط کیونکہ دلی میں ایسا نہیں کہتے حالانکہ دلی کے "میں کتاب پڑھا ہوں" صحیح ہونے کی روایت کے سوا کوئی عقلی یا قیاسی دلیل ہے اور نہ "میں روٹی کھایا ہوں" کے غلط کی ۔ اگر اردو کی کوئی ترکیب جو دلی میں کہی جاتی ہے مستثنیٰ ہے اور اسی لئے سند ہے تو جو ترکیب پورے دکن میں استعمال ہوتی وہ کیوں مستثنیٰ اور سند نہیں ہوسکتی اور اس کا مذکور قواعد کی کتابوں میں کیوں نہیں ہوتا کہ دکن میں "نے" علامت فاعل کا استعمال نہیں ہوتا لیکن اس سے مطلب کی ادائی میں کوئی کمی نہیں ہوتی، اس قسم کا مطالبہ نہ کبھی دکن نے کیا اور نہ دلی اور لکھنو کا ذہن اس طرف گیا کہ ایسا مطالبہ ہوسکتا ہے، حیرت ہوتی ہے کہ شمال جس دکنی کو اردو کہتا ہے اس کی کوئی بات معتبر نہیں تو صرف شمال کی اپنی زبان ہے، دکنیاں در گور و دکنی در کتاب ۔ اس کی مثال ایسی ہے کہ کوئی ناٹک کمپنی شمال سے دکن کو آتی ہے اور اس کے اداکار اپنی اداکاریاں دکھلاتے ہیں تو پورا دکن اس کو تسلیم کرلیتا ہے کہ ناٹک وہی ہیں جن کی کمپنیاں شمال سے آتی ہیں اور اداکار وہی ہے جو شمال کے اداکار جانتے ہیں، دکن کے ناٹک نہ ناٹک ہیں اور نہ یہاں کی اداکاری اداکاری، اور حد یہ کہ جب دکن شمال کو مخاطب کرتا ہے تو اس کا اسلوب وہی ہوتا ہے جو شمال کا ہے اور اگر اس سوانگ میں کہیں دکنی اسالیب کی جھلک آجاتی ہے تو شمال اپنی ناواقفیت کی بنا پر دکن کو ٹوک دیتا ہے تو دکن پر گھڑوں پانی پڑجاتا ہے، دکن کو نہ یہ پوچھنے کی جرأت ہوتی ہے کہ آپ کیوں ہمارے اسلوب سے ناواقف ہیں جب کہ آپ کو اپنے آپس کے اختلاف نوک زباں یاد اور نہ شمال کو کبھی اس کا خیال آیا کہ دکن کے اسالیب کو قواعد اور لغات میں احترام کے ساتھ جگہ دی جائے، شمال نے یہ ایک ایسا طلسم باندھا اور اس میں دکن ایسا گھرا کہ خود دکنی اپنے ادیبوں اور شاعروں کی صلاحیتوں کو کسنے کے لئے شمال کی کسوٹی کے محتاج ہوگئے اور دکن کی جانچنے پرکھنے کی صلاحیتیں اور استعدادیں ایسی مفلوج ہوئیں کہ اگر شمال اپنے کرم سے ہمیں یہ کہتا ہے کہ تم شاعر اور ادیب ہو تو ہمیں باور آتا ہے کہ ہم شاعر اور ادیب ہیں اور اگر شمال بے اعتنائی سے کہہ دیتا ہے کہ تم ہیچ ہو تو پھر ہمیں باور ہوجاتا ہے کہ ہم ہیچ ہیں۔ شمال کی وہی ہستیاں دکن کی داد دیتی ہیں جو اردو زبان کی حقیقی عاشق ہیں وہ بمصداق ع من انداز قدت را می شناسم اپنے معشوق کو کیا شمال اور کیا دکن دونوں جگہ پہچان لیتی ہیں، اردو کے یہ پروانے "چراغ حرم و دیر" میں فرق نہیں جانتے ۔ ان ابدال کی بدولت دکن شمال کی اردو پر جان دیتا ہے، ورنہ شمال کے علم اردو والوں کے دکن سے سلوک کی مکمل تصویر مرزا غالب کے اس شعر میں نظر آتی ہے ؎

گدا سمجھ کے وہ چپ تھا مری جو شامت آئے   اٹھا اور اٹھ کے قدم میں نے پاسباں کے لئے

پروفیسر سید محی الدین قادری زور دکن میں اسی ماحول میں پیدا ہوئے تھے لیکن فطرت نے ان میں خود اعتمادی کے احساس اور یکے اعلان کی فراواں نعمت ودیعت کی تھی۔ انھوں نے دیکھا کہ شمالی ہند کے لوگ اگرچہ اردو کے اہل زبان ہیں لیکن ان میں بالکل تک کے چند ہی لوگ ہیں، ان میں سے اکثر کی نظر خود انھیں کے بنائے ہوئے قاعدوں اور اصولوں پر نہیں ہوتی اور جیسے انسان دائشی طور پر پست یا بلند قامت اور سفید یا سیاہ فام ہوتا ہے ویسے کوئی اہل زبان پیدائشی طور پر زباں داں نہیں ہوتا ر جو زبان تحصیلی اور اکتسابی طور پر آتی ہے اس کی تحصیل کے لئے ہندوستانی ہونے کی کوئی قید نہیں، دنیا کے کسی خطے کا باشندہ اردو کا زباں داں ہو سکتا ہے اور خصوصاً دکن میں جو اردو کا گہوارہ ہے ایک دکنی اردو کا زباں داں یقیناً ہو سکتا ہے اور زندہ زبان میں جو ترمیمیں اور اضافے ہوتے ہیں ان میں اس زبان کے سب بولنے والوں کا مساوی حصہ ہوتا ہے اس لئے دھوکے میں رہنا کہ کوئی دکنی اردو کا پروفیسر نہیں ہو سکتا۔ یہ عہدہ کوئی ہندوستانی ہی سنبھال سکتا ہے حیرت انگیز ہے۔ اس مانے میں شمال حیدرآباد پر چھایا ہوا تھا۔ اگر پروفیسر زور کہتے کہ اردو کے سوا دنیا کی کسی بھی زبان میں وہ کسی بھی ہندوستانی کے ابر سوچ سکتے اور درست نتائج پر پہنچ سکتے اور انھیں قلمبند کر سکتے ہیں تو شمال ان سے تعرض نہ کرتا، دیکھئے اردو میں ن کا بہت بڑا جرم یہ تھا کہ انھیں اردو میں شمال کی برابری کا دعویٰ تھا پروفیسر زور کی اس آزادی پر قدیم عادت کے ت شمال کو حیرت اور اس سے بڑھ کر حیرت بلکہ ہیبت دکن کو ہوئی، اس کی سمجھ میں یہ بات آ ہی نہیں سکتی تھی کہ اس ئی صورت کسی ہندوستانی کے برابر اردو کا زباں داں ہو سکتا ہے۔ آج بھی شاید ایسے دکنی جن کی رائے دکن میں اردو کی ترویج ر ترقی کے اسباب فراہم کرنے میں ضروری سمجھی جاتی ہے لیکن جن کا ایمان ہے کہ کسی دکنی کو اردو میں مہارت حاصل نہیں ہو سکتی مفقود نہیں۔ نتیجہ یہ ہوا کہ دکنیوں نے پروفیسر زور کو اردو داں کی حیثیت سے کوئی اہمیت نہیں دی اور پروفیسر زور کو اپنے زم میں تنہائی محسوس ہونے لگی۔ انجمن ترقی اردو کل ہند کا دفتر حیدرآباد میں تھا اور دکنی اپنی پرانی عادت کی بنا پر سمجھتے تھے کہ دکن میں اردو کی خدمت وہی ادارہ کر سکتا ہے جس پر شمال کی چھاپ ہو، پروفیسر زور نے حیدرآباد میں "ادارۂ ادبیات اردو" کا دفتر اپنے گھر میں قائم کر کے اردو کی خدمت میں اپنی آزادی کا مزید ثبوت دیا۔ اس پر نوں کی وہی کیفیت ہوئی جو کانگریس کے انگریزی حکومت سے ٹکراؤ کے زمانے میں اکثر ہندوستانیوں کی تھی، وہ سمجھتے تھے ہندوستان سے انگریزی حکومت کا ہٹنا ناممکن ہے، فضول کشمکش میں ہم کیوں اپنا غلامانہ عیش و آرام بھی برباد کریں بلکہ وفیسر زور کو اردو کے معاملے میں شمال کے حاکمانہ اور دکن کے محکومانہ خوشگوار اور پرامن تعلقات میں رخنہ سمجھا۔

جیسا کہ پہلے ہی اعتراف کر چکا ہوں میں اپنے ماحول کا شکار تھا اس لئے اردو میں شمال کا مقلد اور اس تقلید سے آزادی سا اپنا تباہی کا قائل تھا، میں اس نتیجے پر پہنچا کم اور پہنچایا گیا زیادہ تھا کیونکہ دکن میں جو بھی اردو سیکھتا تھا اس کی داد دکن سے اسی وقت ملتی تھی جب کہ شمال کا کوئی ادیب اس کی داد دیتا تھا، دکن کی داد صرف آواز بازگشت ہوتی تھی، آج بھی دکن لے اردو دانوں کو تھوڑی بہت جو شہرت حاصل ہے وہ شمال کی مرہون منت ہے اور اس کے اظہار میں کوئی بے شرمی نہیں ہے ر دکن کے بس مزمن احساس کمتری سے شمال اچھی طرح واقف ہے اور وہ کوئی ایسی غلطی نہیں کرتا جس سے دکن میں اپنی لیت اور سخن رجال وہم رجال کی قسم کا احساس جاگ اٹھے اور اپنے آپ کو صحیح سالم اور تنومند سمجھنے لگے، اور اس میں یہ اعتماد پیدا ہو جائے کہ اسے اب کسی طبیب کی نگرانی کی ضرورت نہیں رہی یہاں تک کہ کوئی دکن کا اردو داں کسی دکن کے اردو داں کی

داد دیتا ہے تو اس کی داد معتبر نہیں سمجھی جاتی۔ پروفیسر زور کو اپنے ماحول میں یہ منوانے کا عزم تھا کہ دکن اردو داں ہے اور اس کی اردو دانی پر دکنیوں کو یقین ہونا چاہیے۔ اس عزم میں آپ کو جن بے پایاں مشکلوں اور مایوسیوں کا سامنا کرنا پڑا ہوگا اس کا اندازہ وہی کر سکتے ہیں جنھیں دکن کے اردو دانوں کی مذکورہ مشکلوں کا تجربہ ہے۔

۱۹۴۲ء میں جامعہ میسور میں عبدالقادر سروری اردو کے پروفیسر مقرر ہوئے۔ اگرچہ وہ اردو کے ایم۔ اے اور صاحب تصنیف تھے لیکن اُس زمانے میں ریاست میسور کے اردو داں ان سے متاثر نہ ہو سکے۔ اس کی کئی وجوہ تھیں۔ ایک یہ کہ سروری صاحب باشندے دکن کے تھے اور یہ خیال کہ دکنی اردو کا پروفیسر نہیں ہو سکتا دکن میں راسخ تھا اور شاید آج بھی ہے۔ دوسری یہ کہ سروری صاحب اس زمانے میں جیسی اردو بولتے اور لکھتے تھے اس سے ریاست میسور کے شاعر اور ادیب جو اردو کا اعلیٰ مذاق رکھتے تھے مطمئن نہیں ہوئے۔ تیسری یہ کہ اس زمانے میں شمال کے چوٹی کے ادیبوں، خصوصاً پروفیسر کلیم الدین احمد نے سروری صاحب کی تصانیف پر سخت تنقیدیں کی تھیں۔ چوتھی یہ کہ خود میسوریوں نے ان پر سخت تنقیدیں کیں جو کئی اخباروں، خصوصاً لاہور میں بکثرت شائع ہوئیں اور کسی دکنی کی تنقید اگر شمال کے اخباروں میں شائع ہو جائے تو گویا اس تنقید پر مہر تصدیق ہو گئی۔ شاید اسی لئے شمال کے اخبار کسی دکنی کی کسی دکنی پر تنقید تو شائع کر دیتے ہیں لیکن کسی ہندوستانی پر دکنی کی تنقید شائع نہیں کرتے، ان کی نظر میں زبان کے تحفظ سے شخص کا تحفظ اہم ہوتا ہے۔ پانچویں یہ کہ جامعہ میسور کے طلبہ جن اساتذہ کی مقبولیت اور اثر سے بی۔ اے میں اردو کو اختیاری زبان کے طور پر پڑھنے لگے تھے اور پھر اردو آنرز کی جماعتوں کا اجرا ہوا تھا جس کی بنا پر جامعہ میں پہلی بار اردو کے پروفیسر کا تقرر ہوا تھا ان اساتذہ کو سروری صاحب نے مہاراجا کالج سے ہٹا دیا۔ غرض سروری صاحب کی پروفیسری میں ایسے پیچ پڑے کہ تقرر کے دو برس بعد ان کا جامعہ میں متعلق ہونا نہایت سے مشتبہ تھا۔ اس وقت میں جب کہ بحالی کی کوئی امید نہیں تھی اور سروری صاحب کو صرف ع مردے از غیب بروں آید و کارے بکند کا آسرا تھا۔ پروفیسر زور رحمت کا فرشتہ بن کر میسور پہنچے اور جامعہ کے ارباب اور میسور اور بنگلور کے با اثر اور معتبر مسلمانوں سے ملاقاتیں کیں۔ آپ کے خلوص، آپ کی مقبولیت و وجاہت اور خاندانی شرافت نے میسور میں سروری صاحب کے بارے میں رائے بدل دی۔ پروفیسر زور کی اس موروثی کرامت نے میسوریوں کو قائل کر دیا۔

۱۹۴۷ء میں سروری صاحب اگر خود ہو کر حیدرآباد نہ جاتے اور وہاں سے اپنا استعفیٰ نہ بھیج دیتے تو وہ آج میسور کے پنشن خوار ہوتے۔ پروفیسر زور نے سروری صاحب کی حیدرآباد میں بھی دستگیری کی اور چادر گھاٹ کالج کی پرنسپلی قبول کر کے سروری صاحب کے لئے جامعہ عثمانیہ میں اردو کی کرسی خالی کر دی۔ یہ واقعہ اس امر کا شاہد عادل ہے کہ زور کے نزدیک ایک دکنی اور اس کی اردو دانی کی کس قدر اہمیت تھی۔ اللہ تعالیٰ ہر دکنی ادیب اور شاعر کو زور کے نقش قدم پر چلنے اور اپنے ہم مشرب دکنیوں کی عزت کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔

میں نے جو کچھ لکھا ہے اس سے یہ خیال پھیلانا ہرگز میرا مقصد نہیں کہ دکنیوں کو دبستان دلی و لکھنؤ کے اتباع میں دکنی میں جو دکن کی زندہ زبان ہے تحریر اور تقریر کو رواج دینا چاہیے۔ ہم اردو کی تحصیل میں اس قدر آگے بڑھ گئے ہیں کہ پیچھے ہٹنا خودداری کے خلاف اور نمایاں بزدلی ہے لیکن یہ حقیقت ہے کہ سلاطین بہمنیہ اور ابراہیم عادل شاہ اوّل نے شاہی دفتر میں دکنی کو رواج دیا تھا، اور ظاہر ہے کہ جب کوئی زبان سرکاری زبان بن جاتی ہے تو اس کے

نا اضافہ ہوتا ہے اور آج ہندی کو سرکاری زبان بنانے کے لئے کس قدر اہتمام اور جتن ہو رہے ہیں، دکنی بھی یقیناً ان مرحلوں سے ری تھی تو سرکاری زبان رہی تھی۔ کسی نے دکنی کا اس نقطۂ نظر سے ابھی تک مطالعہ نہیں کیا، اور شمال میں کبھی سرکاری زبان نہیں ی پھر بھی آج وہ زبان پورے ہندوستان میں مقبول ہے اور اس میں علوم وفنون کا قابل رشک ذخیرہ ہے۔

دکنی اپنے بے مثال ایثار سے کام نہ لیتے اور اپنے بزرگوں کی عزیز زبان کو ترک کرنے اور شمال کی اردو کو اپنانے نہ لگتے تو ج دکنی بھی دستور ہند میں پندرھویں زبان ہوتی اور اپنے شاندار ماضی کی بنیادوں پر ترقی کے مدارج طے کرتی ہوئی ہندوستان اسی بھی ترقی یافتہ زبان کی ہم پلہ ہوتی لیکن دکنی ہندوستان بھر میں اردو کی ہم آہنگی اور یکسانی کی خاطر دکنی زبان سے گریز نے بلکہ اس سے اپنے تعلق سے شرمانے لگے اور اپنی خاص خاص مجلسوں اور اپنے گھروں میں دکنی بول لینے پر اکتفا کیا۔ دکن کے اس ظیم تاریخی ایثار اور کسر نفسی کی شمال نے مدتوں قدر نہیں پہچانی اور دکن کو اسی مغالطے میں رکھا کہ تمھاری کوئی بات معتبر نہیں جو بولتے اور لکھتے ہیں وہی بولو اور لکھو، دکنیوں نے محنت شاقہ سے یہ وار خالی دے بھی تو آخری وار کیا کہ تمھارا لہجہ درست یں! لیکن شکر ہے کہ شمال کو اپنی بے اعتنائیوں کا احساس ہونے لگا ہے اور آج جو لغاتیں لکھی جاتی ہیں ان میں پہلی بار دکنی الفاظ محاورے جگہ پا رہے ہیں اور ان کا تحفظ ہو رہا ہے، اور شمال میں قدیم اردو کے تتبع میں شعر کہے جا رہے ہیں۔ آج اس امر کی ند ید ضرورت ہے کہ دلی اور لکھنو کے دبستان اپنے اختلافوں کو مٹا کر اپنے ہی ہاتھوں ایک ایسی ہندوستان گیر اردو کی بنیاد میں جس میں شمالی ہند، دکن اور جنوبی ہند کی عام اور شائع خصوصیات اکٹھی ہوگئی ہوں تاکہ کمتری و برتری کے احساسات باقی رہیں۔ آج شمال کو اس کی بھی ضرورت ہے کہ دکن کے [illegible] سلیمان خطیب اور اسی قبیل کے مقبول شاعروں کی زبان خیالات کا سنجیدگی اور ذمہ داری سے مطالعہ کر کے جدید اردو اور جدید دکنی میں جو خلیج ہے اس کو پاٹنے کی سعی کرے، ال کے اردو والوں نے جنوب کی تالیف قلب سے غفلت کی تو اردو کی ہندوستان گیر صلاحیت کو ضرور نقصان پہنچیگا۔

آخر میں ایک بات اور عرض کرنی ہے کہ ماہنامہ "سب رس" دکن میں "ادارۂ ادبیات اردو" کا ترجمان ہے۔ ی کی ترقی اور حفاظت میں ادارے کا ہاتھ بٹانا دکنیوں کا فرض ہے، اسی کے ذریعے اندازہ ہو سکتا ہے کہ شمال کی شاگردی ا دکن اردو دانی کی کن منزلوں پر پہنچا ہے، اللھم زد فزد۔ فقط

سید محمد اکبر وفاقانی

ڈاکٹر زور کی شخصیت

گولکنڈہ دنیا کے بہترین اور درخشاں ترین ہیروں کا معدن رہا ہے۔ لیکن مدت ہوئی کہ وہاں یہ نایاب جواہر ناپید ہو گئے۔ سرزمین دکن کے ہیروں کی پیداوار بھی ولی و سراج کے بعد ذہنی غلامی کی وجہ سے معدوم تھی۔ مدتوں کے بعد پھر اس سرزمین میں قلب و دماغ کی تراشیدگی کا انتظام ہوا جس کا نام جامعہ عثمانیہ رکھا گیا۔ اسی جامعہ عثمانیہ کے درخشندہ ہیروں میں سے ایک سید محی الدین قادری زور تھے۔ میں بھی چونکہ اسی جامعہ عثمانیہ کا ایک ذرۂ ناچیز رہا ہوں اس لئے اپنی قدر مفر سمجھ کر ہر درخشاں عثمانیہ کی شخصیت سے وابستہ کرنے میں اپنی قدر اضافہ کرتا ہوں۔

زور میرے ہم جماعت تھے۔ اور انھوں نے ابتدا ہی سے اردو فارسی ادب اپنے مضامین قرار دئے تھے میں تاریخ کا طالب علم تھا۔ اس لئے صرف انگریزی کی مشترکہ جماعت کے سوائے دوسری جماعتوں میں ان کا شریک نہیں رہا۔ لیکن بہ حیثیت ہم جماعت اُن سے قربت رہی اور چونکہ وہ "مسرت منزل" کے مقیم طالب علم تھے اس لئے دارالاقامہ میں ان سے اکثر ملاقاتیں رہتی تھیں۔ ابتدائی زمانہ ہی سے یہ بات صاف تھی کہ زور اپنے تخلص کی طرح ایک طاقتور شخصیت ہیں ایک سنجیدہ۔ محنتی با اخلاق اور وضعدار طالب علم کی حیثیت۔ ان کے ہم عصر ان کو بڑی وقعت کی نگاہ سے دیکھتے۔ زور کے اساتذہ جن میں بالخصوص وحید الدین سلیم ان کے ادبی رجحانات اور حوصلوں کے بڑھانے میں بڑے ممد و معاون ثابت ہوئے۔ جامعہ عثمانیہ کے طلباء کی یہ خوش قسمتی تھی کہ ان کو جیسے پُرخلوص صاحب علم اساتذہ ملے شاید ہی کسی جامعہ کو نصیب ہوئے ہوں۔

زور اپنی قدرتی صلاحیتوں کے ساتھ ساتھ زمانہ طالب علمی میں دو چیزوں کے قائل تھے۔ وہ سمجھتے تھے کہ محض ذہانت و طباعی سے انسان ترقی نہیں کرتا بلکہ ان کے ساتھ ساتھ انتہائی محنت و عرق ریزی کی بھی ضرورت ہے۔ یہی وجہ تھی کہ زور کی طالب علمی کے زمانہ میں اس کے قریبی دوست مفقود تھے۔ البتہ ان کی وضعداری خوش اخلاقی کی وجہ سے ہر شخص ان کو اپنا دوست سمجھتے تھے۔ اگر زور کے طالب علمی کے زمانہ کی کوئی ڈائری مل سکتی تو اس سے آنے والی نسل کو بڑا فائدہ پہنچتا کہ زور اپنی عملی زندگی سے کس طرح عملی مثال قائم کرتے ہیں۔

میں نے زور کے ساتھ ہی بی۔ اے کامیاب کیا یہ شاید ۱۹۲۵ء کا واقعہ ہے۔ زور اردو میں جامعہ میں اول آئے اور اسی طرح ایم۔ اے میں تعلیم پانے لگے۔ میں نے اپنے ایک دوست معین الدین قریشی کے مشورہ سے "وکیل ماہر" بننے کے لئے ایل ایل بی میں شرکت مناسب سمجھی۔ چنانچہ ایل ایل بی کی خاطر میں "نظامت عدالت"

ارالاقامتہ میں شریک ہوگیا اور اس طرح زور کا دوبارہ ساتھ ہوگیا۔ یہ زمانہ زور صاحب کے ادبی زندگی کے آغاز کا تھا اور ہندوستان کے اکثر ادبی پرچوں میں ان کے مضامین شائع ہونا شروع ہوگئے تھے۔ خاص طور پر نگار میں ان کے تنقیدی مضامین براہ آیا کرتے تھے۔ زور اس تیزی سے مضامین لکھ رہے تھے کہ ایک مرتبہ معین الدین قریشی نے اس سے متعلق یہ کہا تھا کہ زور اپنے مضامین رات کو سوچتے ہیں اور صبح کو تکیے کے نیچے سے مسودات برآمد کرتے ہیں۔ اس زمانہ میں میرا تعلق انجمن اتحاد سے وگیا تھا جس کے صدر معین الدین قریشی تھے اور جہاں مجلہ عثمانیہ کی اشاعت کی تحریک پیش ہوئی تھی۔

مولوی عبدالرحمن خاں صاحب پرنسپل تھے اور ہمارے دوسرے اساتذہ کے ساتھ ان کا خیال تھا کہ ابھی جامعہ کے طلباء یں وہ استطاعت پیدا نہیں ہوئی ہے کہ ان کو مجلہ عثمانیہ کی ذمہ داری سونپی جائے۔ بہتر یہ ہے کہ کسی پروفیسر کو مدیر بنایا جائے ور اس کے تحت جامعہ کے ایک دو طالب علموں کی تربیت کی جائے۔

انجمن اتحاد اس کی مخالف تھی اور اس پر مصر تھی کہ اب چونکہ جامعہ کے طلباء اپنی ذمہ داری محسوس کرتے ہیں اور اس کو پورا رنے کی اہلیت رکھتے ہیں اس لئے ان کو ادارت کا موقع دیا جائے۔ اس درمیان میں کسی وجہ سے مولوی وحیدالدین سلیم نے جلہ کی ادارت قبول کرنے سے تحریری انکار کردیا اور مولوی عبدالرحمن خاں نے انجمن کو ادارت کے لئے نام روانہ کرنے کی ہدایت کی۔

انجمن اتحاد میں قریشی صاحب جیسا ادیب موجود تھا جن کے احباب اسلوب تحریر اور ادبی ذوق کے تمام لوگ مداح تھے نجمن نے ان کا نام ادارت کے لئے تجویز کیا۔ لیکن معین الدین قریشی نے بہ حیثیت صدر یہ تحریک پیش کی کہ دو مدیر ہوں اور دونوں کی حیثیت برابر ہو۔ جس کے لئے انھوں نے پہلا نام سید محی الدین قادری زور کا اور دوسرا اپنا پیش کیا۔ اس طرح جلہ عثمانیہ کے اولیں مدیر یہ دو حضرات قرار پائے۔ چونکہ میں مجلہ سے بہت قریب تھا۔ اس لئے مجھے زور صاحب سے اور زیادہ واقفیت کا موقع ملا۔ یہ وہ زمانہ تھا کہ زور ایم اے کے امتحان کی تیاری کر رہے تھے اور یورپ کے وظیفہ کے لئے بھی کوشاں تھے۔ اسی زمانہ میں زور کی مصروفیت کا یہ عالم تھا کہ وہ دن رات مجلہ کے لئے اور دوسرے رسائل کے لئے مضامین لکھتے۔ ایم۔ اے کی تیاری کرتے اور ساتھ ہی وظیفہ کی کوشش میں لگے رہتے۔ ان کے اوقات بالکل تقسیم شدہ تھے۔ اور ایک سانس بھی وہ ضائع کرنا جائز قرار نہیں دیتے تھے۔ حیرت ہوتی تھی کہ زور صاحب اس قدر کام اتنی قلیل مدت میں اس طرح انجام دیتے ہیں۔ زور صاحب یورپ گئے اور وہاں نمایاں کامیابی حاصل کرکے واپس ہوئے۔ پھر جامعہ عثمانیہ میں استاد بنائے گئے۔ مسلسل ادبی اور علمی کاموں میں مشغول ہوگئے۔

زور کی ادبی زندگی تو سب کو معلوم ہے کہ انھوں نے جتنی عمر پائی اسے کتنے سلیقے کفایت اور قابلیت سے استعمال کیا۔ لیکن بہت کم لوگ یہ جانتے ہیں کہ زور کے ان انتھک مساعی کے پیچھے کون سا جذبہ کارفرما تھا۔

میں جامعہ میں اس لئے نمایاں تھا کہ پڑھنے سے زیادہ کھیل کے میدان۔ ڈرامہ و تفریح اور دوسرے غیر علمی مشاغل میں مجھے بڑی شہرت حاصل تھی۔ میں ایم۔ اے کرنے علیگڈھ گیا اور ایک سال بعد واپس آگیا۔ اس زمانہ میں زور صاحب اور ڈاکٹر سیادت علی خاں صاحب کی نگرانی میں یوم کلیہ جامعہ عثمانیہ کے لئے ایک ڈرامہ پیش ہو رہا تھا جس کے مصنف سال دوم کے طالب علم عزیز احمد تھے۔ جو بعد میں بڑے ناول نگار ثابت ہوئے اور اب انگریزی کے پروفیسر ہیں۔ مجھے

اس ڈرامہ کی ہدایت کاری کے فرائض سپرد ہوئے۔ اس ڈرامہ میں مخدوم محی الدین، شکور بیگ (وکیل مڈنگل) جمیل احمد، رفعت، ظفر الحسن اور بہت سے طالب علموں نے حصہ لیا۔

اس ڈرامہ کو دیکھنے کے لئے ولیعہد بہادر نواب اعظم جاہ تشریف لائے۔ شاہ پرستی تو ہماری بیماری تھی۔ ا... یہ پیدا ہوا کہ اتنی بڑی شخصیت کے سامنے اس ڈرامہ کو کون پیش کرے گا۔ اور کس کو تقریر کا اعزاز حاصل ہوگا۔ مولوی عبا... نے ڈاکٹر زور اور ڈاکٹر سیادت علی خاں سے کہا کہ تم دونوں میں سے کوئی اس فرض کو انجام دے۔ ڈاکٹر زور نے کہا چونکہ سید محمد اکبر وفا قانی نے اس ڈرامہ کی ہدایت کاری کی ہے اس لئے وہی اس فریضہ کو انجام دیں گے۔ سیادت علی خا... کہا اکبر وفا قانی کچھ عجیب آدمی ہیں۔ بہتر یہ ہے کہ ایک تقریر لکھ کر انھیں دے دی جائے۔ لیکن میں نے لکھی ہوئی تقریر سے انکار کیا۔ زور نے میری تائید کی۔ جس پر ڈاکٹر سیادت علیخاں نے کہا آپ اپنی تقریر میں یہ کہہ دیجئے "یہ طالب علما... ہے۔ اسے اسی نظر سے دیکھا جائے اور ہماری کمزوریوں کو معاف کیا جائے۔" اس پر زور نے کہا دنیا میں سب سے بڑ... کمزوری کا اعتراف ہے۔ مجھے اکبر پر پورا بھروسہ ہے۔ اور اکبر یہ کہہ دیں کہ ہم نے اردو زبان کا یہ ڈرامہ بہترین ہوا کیا ہے۔ چنانچہ میں نے ایسی ہی تقریر کی اور ڈرامہ کامیاب رہا۔

اس واقعہ کے بیان سے یہ مقصد ہے کہ اس سے زور کی اصلی شخصیت نظر کے سامنے آجاتی ہے۔ جو لوگ حیدرآباد کی تار... واقف ہیں وہ جانتے ہیں کہ دکن مغلوں کے تصرف تک آزاد تھا اور وہاں کے ادیب اردو زبان کے باقی ہونے کی حیثیت... اپنا جواب نہیں رکھتے تھے۔ نصرتی، غواصی، سعدی، شاہ راجو، ہاشمی اور لاتعداد شعرا و ادیبوں کا نام لیا جا سکتا... قلب و دماغ پر کوئی غلامانہ پابندی نہیں تھی۔ مغلوں نے فارسی زبان مسلط کی جو آصف جاہی دور میں بھی جاری رہ... تک کہ سالار جنگ ثانی نواب لائق علیخاں نے فارسی کے بجائے اردو کو دفتری زبان قرار دیا یوں تو دکنی صا... کے ابھرنے کا زمانہ مغلوں کی یورش ہی سے ختم ہوگیا تھا لیکن دفتری زبان کی تبدیلی کے واقعہ نے دکنی ذہنیت پ... ضرب لگائی۔ دکنی زبان تو قطب شاہ کی زبان تھی جو لکھی اور بولی جاتی تھی۔ اور اردو زبان جس کی ابتدائی... دکنی زبان ہے شمالی ہند میں ترقی پا چکی تھی۔ دفتری زبان کی تبدیلی نے حیدرآباد کے نظم و نسق کو لکھنؤ و دہلی جاننے والوں کے ہاتھ میں منتقل کر دیا۔ یہ وہ زمانہ تھا جب کہ جاگیردار طبقہ میں صلاحیتیں باقی نہ رہی تھیں... زبان میں دفتری کام کرنا ناممکن ہوگیا تھا۔ نتیجہ ظاہر ہے کہ شمالی ہند کی زبان کو اختیار کرنا اور اسے دفتر کے... کرنا ایک مدت کا متقاضی تھا۔ یہی وہ دور تھا جس میں ہم پیدا ہوئے یا خود زور پیدا ہوئے۔ ہماری حیثیت یتیموں کی حیثیت بن گئی اور ہمارے بزرگ اسی سیاسی تبدیلی کی وجہ سے احساس کمتری کے شکار ہوگئے تھے۔

یہ جامعہ عثمانیہ کی برکت تھی کہ وہاں کے طالب علم اس احساس کمتری کے بندھن کو توڑنے کے قابل بنے۔ اس کے تھے۔ ایک تو یہ کہ انگریزوں کے اقتدار نے اسی طرح انگریزی حاکم بنا دیا تھا جس طرح فارسی مغلوں کے زمانہ میں ار... اردو میں جامعہ کے قیام نے حکومت کے با اقتدار طبقہ کی اکثریت کو اس کا مخالف کر دیا۔ اور جو اس کے موافق — مصلحت وقت سمجھ کر یا شبہ کی نظر سے اس کی بادل ناخواستہ تائید کرتے تھے۔ مجھے یاد ہے ایک صدر المہا... اپنی تقریر میں کہا جامعہ عثمانیہ کیا ہے صرف ایک گاجر کی پونگی۔ ایک دوسرے با اقتدار نے کہا یہاں کے گریجو...

ے جاپان ہیں۔ اس سے اس مضحکہ خیز سلوک کا اندازہ ہو سکتا ہے جو جامعہ کے ساتھ کیا جاتا تھا۔ اس کا ردعمل
ر نہایت شدید پڑا چنانچہ وہ خود کو اہل ثابت کرنے کے درپے ہو گئے۔ اساتذہ اکثر اردو کے شیدا تھے وہ چاہتے
پے طلباء کے ذریعہ یہ ثابت کردیں کہ دنیا کی ترقی یافتہ زبانوں میں سے اردو ایک ترقی یافتہ زبان ہے۔
جہ یہ نکلا کہ وہ حیدرآباد جہاں اسداللہ نے حفظان صحت پر پچاس صفحہ کا ایک چھوٹا سا رسالہ "جان کی دشمن مکھی"
ے ادبی انعام حاصل کیا۔ اور خورشید علی جو بعد میں "ناظم دفتر دیوانی ومال" ہوئے، اسی قسم کا چھوٹا سا رسالہ "گوکھلے"
ی پر لکھ کر ادیب کہلائے۔ ان کتابوں کی اشاعت کا زمانہ جامعہ عثمانیہ کے قیام سے کچھ پہلے کا ہے لیکن جیسے ہی جامعہ عثمانیہ
غ التحصیل میدان میں آئے تو انھوں نے اس پوری مرعوب ذہنیت کا خاتمہ کر دیا۔
بلہ عثمانیہ رسائل اردو کے مقابل آیا۔ اور زور کی کتابیں شائع ہوتے ہی ادب وتنقید کے صفِ اول میں شمار کیجانے لگیں۔
امعہ عثمانیہ کے طلباء نے مختلف مضامین کے ہر فن پر معیاری کتابیں لکھیں اور نام حاصل کیا۔
صوصی بات ہے کہ پروفیسر زور کا تذکرہ جامعہ عثمانیہ کی تاریخ سے الگ نہیں کیا جاسکتا۔ اس لئے ہم نے جامعہ عثمانیہ کا
زری سمجھا۔
پنے ساتھیوں میں خود زور سے بڑھ کر کسی کو عملی آدمی نہیں سمجھتا۔ انھوں نے خود کام کیا اور دوسروں کو کام کرنے کا
نایا۔
ور اپنی زندگی ہی میں انھوں نے دکن میں "ادارہ ادبیات اردو" اور "ایوان اردو" قائم کیا تاکہ اس کے کام کو قیام
ماحل رہے۔

زور خودداری، خوداعتمادی اور مسلسل محنت کا مجسمہ تھے

پروفیسر سیّد محمد

شاہ گنج سے ایوانِ اُردو تک

حیدرآباد میں اردو زبان و ادب کی خدمت کرنے والے ہر دور اور ہر عہد میں گزرے ہیں۔ یہاں کے اکثر و بیشتر مصنف اور شعرا نے ناموافق حالات اور ناقدردانی و کس مپرسی کے باوجود خلوص دل سے اپنی اپنی بساط کے مطابق اس زبان کی خدمت کی ہے لیکن پچھلے پچاس برس کے عرصے میں ڈاکٹر زور نے اردو زبان و ادب کی جو خدمت کی ہے وہ اپنی آپ نظیر ہے۔ انہوں نے انتہائی ناموافق حالات اور مخالف فضا میں شاہ گنج کے قدیم اور پس افتادہ محلے سے اردو ادب کی خدمت کا آغاز کیا اور اپنی مسلسل اور مستقل کوشش سے نہ صرف "ادارۂ ادبیات اردو" کو مستحکم بنیادوں پر قائم کر دیا بلکہ خیریت آباد کے پر فضا مقام پر "ایوان اردو" کی وسیع الشان عمارت تعمیر کر کے اس کو ہزاروں بیش قیمت مخطوطات، مطبوعات، دکن کی تہذیب و تمدن کے نوادرات اور ادبی آثار کا ایسا قابل دید مخزن بنا دیا کہ آج ہندوستان بھر کے محققینِ اُردو اس سے استفادہ کر رہے ہیں۔

ڈاکٹر زور نہ صرف اردو کے پروفیسر، ادیب، نقاد اور محقق زبان و ادب ہی تھے بلکہ وہ بلاشبہ اردو کے ایک بڑے محسن اور ادیبوں کی سرپرست بھی تھے۔ انھوں نے ہر ادبی تحریک کے ساتھ دل سے تعاون کیا اور بیسیوں کو ادیب بنا دیا۔ ان کی ذات روشنی کا ایک ایسا اونچا مینار تھی جس کی روشنی سے نزدیک اور دور کے سب ہی ادیب مستفید تھے۔ بڑی مخلص طبیعت اور بے لوث خدمات کی وجہ سے وہ ایک ایسا مرکز بن گئے تھے جس کی طرف ہر ادیب اور ہر شاعر کھنچا چلا آتا تھا۔ حیدرآباد کے ادیبوں اور شاعروں کے تو وہ میرکارواں تھے جن کی خوئے دل نوازی نے ہر کہ و مہ کو ان کا گرویدہ بنا دیا تھا۔ وہ ترقی اور رفعت کی منازل پر فائز ہو کر خود ہی ان سے استفادہ کرنا نہیں چاہتے تھے بلکہ کشادہ دلی اور وسیع القلبی سے دوسرے ادیبوں اور شاعروں اور خاص کر نوجوانوں کے جوہروں کو پرکھ کر ان کو بھی آگے بڑھانے کی دھن میں لگے رہتے۔ یہی چیز تھی جس نے ان کو اپنے تمام ساتھیوں اور ہمسروں میں ممتاز درجہ عطا کیا اور کیا دوست اور کیا دشمن سب ان کی خدمات کے قائل ہو گئے۔

زور صاحب کا خاندانی تعلق حیدرآباد کے مشہور طبقہ "معاش داران و اہل خدمات شرعیہ" سے تھا۔ ان کی برادری میں علم و ادب کا خاصا چرچا تھا۔ ان کی برادری کے کئی افراد تصنیف و تالیف کا مشغلہ رکھتے تھے۔ ان کے والد بھی شاعر اور اپنے زمانے کی ادبی دلچسپیوں میں برابر شریک رہتے تھے۔ زور صاحب اسکول کی زندگی میں مفید الانام اور ہائی اسکول میں میرے ہم مکتب تھے۔ اسکول کی تعلیم کے زمانے میں تو کوئی بات ایسی نمایاں نہیں معلوم ہوئی جو ان کی ادبی زندگی کی نشان دہی کرنے والی ہو، البتہ کالج کی زندگی کے آغاز سے ہی ان میں ایک نمایاں فرق محسوس ہو

ایک سال پہلے ہی کالج میں داخل ہوگئے۔ انھوں نے اسکول میں باقاعدہ تعلیم پاتے ہوئے خانگی طور پر میٹرک کا امتحان
امتحان پاس کرکے انٹرمیڈیٹ میں شریک ہوگئے۔ دوسرے سال جب میں نے ایچ۔ ایس سی کا امتحان پاس کرکے
داخلہ لیا تو اُن سے اسکول کی ملاقات کی تجدید ہوئی اور ہم دونوں پھر ہم مکتب ہوگئے۔ انھی دنوں انھوں
لص اختیار کیا جو ان کے والد مرحوم کے استاد کا تخلص تھا اور والد نے ہی تبرکاً اپنے بیٹے کے لئے یہ تخلص پسند کیا
یدالدین سلیم کے فیضِ تعلیم نے ان میں بہت جلد ایسا ستھرا ادبی ذوق پیدا کر دیا کہ جب چار سال پڑھنے کے
بجویٹ ہوگئے تو انھوں نے بڑی سلیقہ مندی سے ادبی تنقید پر اپنی پہلی کتاب ”روحِ تنقید“ پیش کی۔ جس کا تمام
ں اور ادو کے پروفیسروں یعنی پروفیسر اسپیٹ، پروفیسر حسین علی خاں اور پروفیسر سلیم کے لکچروں اور اُن کی تبالی
سے حاصل کیا گیا تھا۔ یہ جامعہ عثمانیہ کی پہلی ادبی پیش کش تھی۔ اس کا نام ”روحِ تنقید“ خود پروفیسر سلیم نے
ھا۔ اُن کی اس ابتدائی ادبی کاوش کا ملا جلا خیر مقدم کیا گیا۔ بعض انصاف پسند اور علم دوست جیسے حبیب الرحمٰن خاں
روفیسر محمود شیرانی، سر راس مسعود، عظمت اللہ خاں وغیرہ نے حوصلہ افزا رائیں لکھیں تو بعض تنگ نظر
اس کی مخالفت شروع کی۔ اربابِ جامعہ نے زور صاحب کی اعلیٰ قابلیت اور اردو ادب سے مناسبت
فیس یورپین اسکالرشپ دے کر مزید تحقیقی کام کرنے جامعہ لندن میں داخلہ دلایا اور یہ طے کیا کہ یہی وحید الدین
فد پر سبکدوش ہونے کے بعد جامعہ عثمانیہ میں ان کے جانشین اردو کے پروفیسر مقرر کئے جائیں۔
ماحب نے تین سال یورپ میں تعلیم پائی۔ انھوں نے وہاں نہ صرف قدیم اردو پر پہلی بار تحقیقاتی کام کیا اور
اور قطب شاہی دور کے مخطوطات پر جو یورپ کے کتب خانوں میں محفوظ تھے ایک بسیط نظر ڈال کر ”اردو شہ پارے“
۔ برٹش میوزیم اور انڈیا آفس میں اردو کے جو اہم تذکرے اور شعرا کے کلام کے مجموعے تھے، ان میں سے بہت
سے نقل کئے۔ نیز اردو کی لسانیات کا مطالعہ کرکے پیرس کے مشہور ماہرِ لسانیات جولس بلاک کے زیرِ نگرانی اس
حاصل کیا۔ جب وہ اپنی تعلیم ختم کرکے واپس ہوئے تو جامعہ عثمانیہ کا سابقہ ماحول جہاں تک شعبۂ اردو کا
ل گیا تھا۔ بعض حضرات نے ایسی فضا پیدا کر دی تھی کہ اردو پڑھنے والے بھی عجب احساسِ کمتری میں مبتلا تھے۔
ادبی صلاحیتوں کے باوجود قلم اٹھاتے ہوئے جھجکتے تھے۔ زور صاحب نے شعبۂ اردو میں بہ حیثیت استاد
سب سے پہلا کام جو کیا وہ یہ تھا کہ ہونہار طلبا میں لکھنے کا جذبہ شدت کے ساتھ پیدا کیا۔ ان کی کوشش سے
یہ اردو کے طلبا میں مضمون نگاری اور شعر و شاعری کا ایسا ذوق پیدا ہوگیا کہ اب ہر محفل اور مجلس میں ان کی
سراہا جانے لگا۔ دو تین سال کے اندر زور صاحب نے ملک کے ہونہار ادیبوں اور شاعروں کی خدمات کے
ن کی نشر و اشاعت اور اردو ادب میں قدیم دکنی سرمایے کو اس کا جائز مقام دلانے کے لئے ادارۂ ادبیاتِ اردو
ا۔ اس ادارے کی طرف سے سب سے پہلے مخدوم اور میر حسن کی مشترکہ تصنیف ”ہوش کے ناخن“ نامی ڈراما
ہری کتاب ”ٹیگور اور اس کی شاعری“ اور میر حسن کی کتاب ”ورڈس ورتھ اور اس کی شاعری“ میکش کا مجموعہ کلام
وغیرہ پیش کی گئیں تو جہاں ادب کے بعض ٹھیکے داروں نے ناک بھوں چڑھائی اور ان نوواردان کو جو ادب
شروع کیا وہیں بعض مخلص سرپرستوں نے ان کی قدر افزائی کی۔ مہاراجہ سر کشن پرشاد مرحوم نے حوصلہ افزا

مکتوب کے ساتھ گراں قدر عطیہ مرحمت فرمایا۔ اس طرح ایک اور مخلص ادب دوست سجاد مرزا صاحب نے بلا طلب و …
کے ایک سو روپے بھیج کر بڑا حوصلہ افزا خط لکھا۔ مخالفتوں کے طوفان میں اتنی سی حوصلہ افزائی اور چند مخلص احباب
ہمت افزائی نے زور صاحب کے حوصلے بلند کر دیے اور انھوں نے عزم بالجزم کے ساتھ اپنی مساعی کو تیز سے تیز تر کر
قطب شاہی دور کے شاعروں کے مخطوطات کی تلاش، گولکنڈہ اور اس کے قرب و جوار میں قطب شاہی آثار
جستجو اور اس عہد کی روایات کی فراہمی کا ایک مستقل پروگرام بنایا گیا اور اس سلسلے میں گولکنڈے کی تاریخ "قدیم
استاد" کتبوں کے چربوں اور کئی نامعلوم شاعروں کے دواوین اور مثنویات کے بیش بہا مواد سے اردو د…
واقف کرایا گیا۔ ولی کے عہد سے لیکر عہد حاضر تک دکن کے ممتاز شعرا کے منتخب کلام سے روشناس کرانے کے لئے مرقع سخن
نام سے تین جلدیں اور کئی انتخابات شائع کئے گئے۔ تقریباً پانچ ہزار مخطوطات جمع کرکے تذکرۂ مخطوطات کی پانچ جلدیں
وشایع کی گئیں جس سے ادبی تحقیقات کے سلسلے میں محققین کو بڑی سہولت حاصل ہوئی۔ اردو میں انسائیکلوپیڈیا تیار کر…
ایک جامع اسکیم بنائی گئی اور نمونتاً جو کتابچہ شایع کیا گیا اس سے اسکیم کی اہمیت و افادیت ظاہر ہوتی ہے۔ بد قسم…
حیدرآباد کے سیاسی حالات کی تبدیلی نے اس اسکیم کو آگے بڑھنے سے روک دیا ورنہ یہ بھی ایک یادگار کارنامہ ثابت
"نام نیک رفتگاں" کی یاد تازہ کرنے کے سلسلے میں زور صاحب کے کاموں کی ایک آخری کڑی "یوم…
ہے جس کو وہ ہر سال بڑے اہتمام سے منایا کرتے تھے۔ یہ ایک ادبی مذاکرہ، ایک تفریحی میلہ اور قومی یکجہتی و جذباتی
کی ایک ایسی تقریب تھی جس سے خاص و عام میں نہ صرف ایک ادبی بیداری ہی پیدا ہوئی بلکہ ماضی کی عظمت ر…
یاد کے ساتھ ساتھ مستقبل کی ترقی کے احساسات بھی بیدار ہونے لگے۔ آج ایوان اردو اپنی خوب صورت عمارت
بلکہ اپنے قیمتی ذخیرۂ علم و فن اور بیش بہا نوادرات تہذیب و تمدن کی وجہ سے حیدرآباد کی ایک قومی یادگار اور ار…
ادب کے لئے ایک ایسا مرکز ہے جس کی سیر اور جس سے استفادہ ہر اردو ادب کیلئے ازبس ضروری ہے۔

ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور مرحوم اُن محسنین اُردو میں سے تھے جنھوں نے اردو ادب کے دامن کو بیش …
جواہر پاروں سے مزین کیا۔ آپ انشا پرداز بھی تھے اور افسانہ نگار بھی، ناقد بھی تھے اور شاعر بھی۔ آپ نے
متعدد کتابیں مختلف موضوعات پر تصنیف کیں، جن میں سے اکثر شائع ہو کر یونیورسٹیوں کے نصاب میں
داخل ہیں۔ آپ ہی کی کوششوں سے حیدرآباد دکن میں ۱۹۳۰ء میں "ادارۂ ادبیات اردو" قائم ہوا…
اردو کے فروغ دینے میں برابر کوشاں رہا ہے۔ اس ادارہ نے سینکڑوں کتابیں شائع کی ہیں اور ایک وقیع
ماہنامہ "سب رس" نکال رہا ہے، افسوس کہ آج اردو ایسے بلند پایہ ادیب کی سرپرستی سے محروم ہو گئی حیف صد حیف

ــــــــــــ (سہ ماہی "جام جم" سکھر پاکستان۔ جلد ۲۔ شمارہ ۱، ۱۹۶۲ء)

احمد الدین احمد

آسمانِ اُردو ادب کا ایک اور سیارہ

خاورِ ادب سے طلوع ہُوا، اُبھرا، اُبھر کر چمکا، اور سیارہ بن کر جگمگاتا رہا۔ مگر قسمت میں شہابِ ثاقب کا روپ دھارن کرنا تھا، اس لیے آسمانِ اَدب سے ٹوٹا اور ٹوٹ کر ایک اَن مِٹ کرن چھوڑ گیا:۔

دُنیا عجیب مرحلۂ بے ثبات ہے
ہر ذی حیات کو یہاں آخر ممات ہے

جناب سیّد محی الدین قادری زورؔ مرحوم میرے حقیقی دوست تھے۔ اِن کے والدِ مرحوم سے میرے چچا زاد بھائی جناب تمیزالدین احمد صاحب وکیل مرحوم ساکن پٹن، ضلع اورنگ آباد کو بڑی عقیدت تھی۔ وہ گاہے ماہے تشریف لاتے تھے اور مرحوم بھائی صاحب کے پاس ہی قیام فرماتے تھے۔ میرا بچپن تھا۔ مدرسہ میں زیرِ تعلیم تھا۔ گو آج اس دیرینہ مدت کو پچاس سال سے زائد عرصہ بیت گیا۔ میں اس وقت دس گیارہ میں تھا۔

طبیعت لاکھ مانوس قفس ہے ایک مدت سے
مگر پھر بھی چمن کی یاد اکثر آہی جاتی ہے

مجھے وہ دلچسپ مناظر اب تک یاد ہیں۔ وہ سادہ سادہ زندگی، معصومانہ بندگی، اخوت، محبت، خلوص و اخلاص سب کے سب بے لوث، تصنّع اور بناوٹ سے مُعرّا تھے۔ آج یہ چیزیں قلبِ انسانی سے ایسی غائب ہوگئی ہیں، جیسے گدھے کے سر سے سینگ۔ یہ کوئی اَن ہونی چیزیں نہیں ہیں بلکہ یہ "ہر کمالِ را زوال" کی پابند ہیں۔

میں نے زورؔ مرحوم کو بچپن میں نہیں دیکھا، نہ وہ کبھی اپنے والدِ بزرگوار کے ہمراہ بلدہ سے پٹن تشریف لائے۔ جب میں ۱۹۲۱ء میں اقامت خانہ مسرت منزل میں قیام پذیر ہوا تو زور صاحب مرحوم سے پہلی ملاقات ہوئی۔ گورا گورا آفتابی چہرہ، ہلکے ہلکے گلابی رخسار، گداز جسم، ہلکی ہلکی سیاہی مائل مونچھیں، سر پر رومی ٹوپی، سفید سلک کی شیروانی زیب تن کئے۔ جب وہ میرے کمرے میں داخل ہوئے تو میں تنہا تھا۔ سلام ہوا، مصافحہ کیا۔ اس کے بعد وہ کرسی پر بیٹھ گئے۔ رسمی باتوں کے بعد فرمایا کہ آپ کے مضامین کیا ہیں۔ میں نے کہا۔ تاریخ، اسلامیات، معاشیات اور سیاسیات۔ پھر خود ہی فرمایا کہ "میں نے السنہ لی ہیں۔ مجھے ان سے بے حد دلچسپی ہے۔ آپ بھی ہمارے ساتھ ہوجاتے تو بہت اچھا تھا۔ مجھے اُردو زبان کے شوق نے مجبور کیا کہ آپ سے ضرور ملوں۔ مجھے دوستوں نے بتایا کہ آپ کی اُردو زبان بڑی پیاری ہے۔ میں نے عرض کیا کہ مادری زبان ہوتی ہی پیاری ہے جو ایک متمدن ماں کی پیاری آغوش سے ورثہ میں ملتی ہے۔ سیکھنے سے نہیں آتی۔ انھوں نے فرمایا کہ ہم حیدرآبادیوں کی زبان بڑی خراب ہے۔

رفتہ رفتہ سدھر جائے گی۔ ابھی تو داغ بیل پڑی ہے۔ آگے آگے دیکھئے ہوتا ہے کیا۔ اورنگ آباد کا ذکر چھڑا تو فرمایا کہ میرے والد بھی اورنگ آباد اور پٹن جایا کرتے تھے۔ پٹن میں خاص کر وکیل صاحب کے پاس ٹھیرا کرتے تھے۔ اس پر مجھے اپنا بچپن یاد آگیا۔ میں نے جب تفصیل بتائی تو بے حد مسرور ہوئے۔ فرمایا کہ پھر تو آپ کے ہمارے تعلقات پہلے ہی سے ایک دوسرے سے وابستہ ہیں۔ آپ سے مل کر بے حد خوشی ہوئی۔ انشاء اللہ حاضر خدمت ہوتا رہوں گا۔ میں بھی اس طرح زورؔ صاحب سے قریب تر ہوتا گیا۔

زور صاحب حقیقت میں پاک باز، پارسا، بے حد ملنسار، سادہ مزاج اور خوش گفتار تھے۔ میں نے اپنی زندگی میں، جب تک میں ان کے ساتھ رہا اُن کو کبھی متفکر، اُداس اور غمگین نہیں دیکھا۔ ہمیشہ ہنس مکھ دیکھا۔ ان کا وہ ہنس مکھ اور بھولا چہرہ اب تک مجھے یاد ہے۔ جب آپ آتے، ہمیشہ خندہ پیشانی سے ملتے اور کہتے بھیا! آپ کو دیکھے بغیر چین نہیں آتا، اس لیے آپ کے آرام اور مطالعے میں مخل ہوتا ہوں۔ آپ کو میرا آنا بارِ گراں تو محسوس نہیں ہوتا۔ میں عرض کرتا۔ زور صاحب! آپ یہ کیا فرماتے ہیں۔ آپ جیسے بے لوث محبت کے دیوتاؤں سے ملاقات اور دو گھڑی مل بیٹھنے کے وقفے کو میں خدا کی اُن انمول نعمتوں اور رحمتوں میں سے ایک بیش بہا نعمت سمجھتا ہوں۔ یہ درس ہم نے اپنی ماں کے آغوش سے پایا ہے۔ ہم ان لوگوں میں سے ہیں جو کسی کے آنے کو رحمت تصور کرتے ہیں۔ اور اگر کوئی کسی روز نہ آئے تو ہم اسے اپنی بدبختی پر محمول کرتے ہیں۔ آپ کے آنے سے مجھے کوئی نہ کوئی درس مل جاتا ہے۔ اس کی سب سے بڑی وجہ یہ ہے میرے خاندان کو آپ کے خاندان سے جو گہری عقیدت ہے میرے ذہن کے تو کسی بھی گوشے میں یہ احساس ہی موجود نہ تھا کہ ایسے بھی لوگ دُنیا میں موجود ہیں کیونکہ ہم ایسے ماحول سے واقف ہی نہ تھے۔ زور صاحب نے متاثر ہو کر فرمایا بھیا! جب آپ کے پاس آتا ہوں تو آپ کی باتوں سے بہت لطف اندوز ہوتا ہوں۔ میں عرض کرتا کہ مجھے بھی آپ سے بہت کچھ حاصل ہوتا رہتا ہے اس لیے میں بھی آپ کی آمد کو باعثِ رحمت سمجھتا ہوں۔

الغرض ایک مدت کے بعد تو یہ حالت ہوئی کہ زور صاحب کے بہت سے ملاقاتی اور دوست احباب میرے پاس آنے لگے۔ اب تو میرے کمرے نے لندن کے "ٹی ہاؤس" کی صورت اختیار کر لی تھی۔ روزانہ کسی نہ کسی عنوان پر بحث ہوتی تھی۔ کھل کر خیالات کا اظہار ہوتا تھا۔ کبھی کبھی ہنسی مذاق کی باتیں ہوتی تھیں مگر وہ حدِ ادب سے گرنے نہ پاتی تھیں۔ اس کا اثر یہ ہوا کہ اقامت خانے کے ملازمین بھی بڑے مودب اور مہذب بن گئے۔ ان کے آپس کا مذاق اور دل لگی بھی ادب کی حد میں رہتی تھی۔ میں نے تو اس تبدیلی کو محسوس نہیں کیا مگر زور صاحب نے اسے محسوس کیا کیونکہ وہ بہت باریک بین تھے۔ ذرا ذرا سی چیزوں پر نظر رکھتے تھے۔ ایک روز فرمانے لگے۔ احمد بھیا! ذرا ان ملازموں کو تو دیکھو کیسا شستہ مذاق کر رہے ہیں۔ صحبتوں کا بھی ان پر کتنا نایاب اثر ہوا ہے اور کیوں نہ ہو بھیا! دیکھو نا! ریڈیم جس کان یا مٹی سے نکلتی ہے اس کو بھی نور سے منور کر دیتی ہے۔ بھلا! ہم تو انسان یعنی اشرف المخلوقات ٹھیرے۔ ہم کو ریڈیم سے زیادہ اپنے ماحول کو متاثر کرنا ایسا نورانی کہ حقیقی نور کا دھوکا ہو۔ میں نے عرض کیا۔ زور صاحب! آپ بہت حساس ہیں۔ بہت ہی اعلیٰ و ارفع خیالات سے مرصع ہیں۔ خدا آپ کی دعا قبول کرے اور آپ بھی اسم با مسمیٰ ثابت ہوں۔ آمین ثم آمین۔

کسی نے کیا سچ کہا ہے کہ "پوت کے پاؤں پالنے میں"۔ زور صاحب نے مادرِ علمی کے پالنے میں یہ ثابت کر دیا تھا کہ وہ "ہونہار بروا کے چکنے چکنے پات" تھے۔ مجھے ان کی رفاقت سے یہ اندازہ ہو گیا تھا کہ یہ دُھندلی کرن ضرور ایک نہ ایک دن جگمگا اُٹھے گی، اور اپنے نور سے ایک عالم کو ریڈیم کی طرح ضرور منور کرے گی۔ گو وہ آج ہم میں موجود نہیں ہیں، مگر اُن کی انتھک کاوشوں کا نچوڑ، ذہنی صلاحیتوں کا ثمر، بے پناہ اُمنگوں کا ٹھاٹھیں مارتا ہوا سمندر، علمی اور ادبی تحقیقاتوں کے لب

ہونے سوتے، وہ ادبی کان کے اَن مول سنگ ریزے اور جواہرات، جو انھوں نے بڑی محنت اور جاں فشانی سے برآمد کئے ہیں وہ سب ہمارے سامنے موجود ہیں۔

ان کا مطمح نظر حیاتی معاتی زندگی میں نور صاحب نے جب میری تحریرات کو بغور دیکھنا شروع کیا تو نہایت متاثر ہوئے۔ ایک روز مجھ سے فرمایا کہ بھیا! ان کو شائع کیوں نہیں کرتے۔ کب تک دبائے رکھو گے۔ کسی رسالے میں بھیج دو۔ عرض کیا نور صاحب! میں شہرت کا خواہاں نہیں ہیں۔ اور ابھی تو میں طفلِ مکتب ہوں۔ میں کیا اور میری تحریر کیا! اس پر انھوں نے فرمایا کہ بات قطعی غلط ہے۔ میرا تو مطمح نظر یہ ہے کہ ادبی کاوشوں کو ضرور منظرِ عام پر آنا چاہئے۔ ان پر قید و بند کی مصیبت نازل کرنا ایک قسم کا گناہ ہے۔ میں تو کم از کم ایسا نہیں کرسکتا اور نہ کروں گا۔ میں تو ہر اس چیز کو کھود کر نکالوں گا جو قابلِ اشاعت ہو اور اس کو ساری دُنیا کے سامنے پیش کروں گا۔

اس واقعہ کے بعد ایک عرصہ گزر گیا۔ میں اپنی تحریرات اور مضامین مُقفل رکھتا تھا۔ ایک روز نور صاحب بڑے زور سے کمرے میں آدھمکے اور زوردار سلام کے بعد مسکراتے ہوئے میز کے پاس آگئے۔ ایک رسالہ میز پر رکھا اور فرمایا بھیا! رسالہ کیسا ہے۔ عرض کیا بہت اچھا اور خوشنما ہے۔ فرمایا۔ ذرا دیکھو نا! کیا پیارا نام ہے! عرض کیا بے شک بہت پیارا نام ہے۔ "غنچہ"! پھر فرمایا۔ ذرا اندر تو دیکھو پہلے صفحے پر نظر ڈالی تو میرے مضمون کا عنوان تھا اور اس کے نیچے میرا نام چھپا ہوا تھا۔ میں حیران تھا کہ یہ کیا معمہ ہے۔ یہ تو مقفل ہے، چھپا کیسے۔ میں نے نور صاحب پر نظر ڈالی تو جھٹ کہنیوں تک ہاتھ جوڑ کر فرمایا کہ۔ مجھے معاف کیجے تو بتاتا ہوں۔ فرمایا کہ میں نے چوری کی اپنے مطمح نظر کے تحت۔ قفل کھول کر یہ مضمون نکالا اور شائع کرا دیا۔ اب آپ وہ سزا دیں جو چور کی ہے۔ میں بجائے خفا ہونے کے مسکرا دیا اور کہا۔ نور صاحب اتنی عجلت کی ضرورت نہ تھی۔ خیر اب آپ کی مرضی۔ پھر تو وہ مضامین لے جاتے تھے اور مجھے اطلاع دیئے بغیر رسالوں میں چھپوا دیتے تھے۔ غرض کہ ان کا یہ کردار حقیقت میں قابلِ تعریف تھا۔

مخصوص کردار نور صاحب بچپن ہی سے صلح کل واقع ہوئے تھے۔ لڑائی ہو یا کشمکش، شکر رنجی ہو یا نفاق، اپنوں میں یا ہو یا غیروں میں، دوستوں میں ہو یا ملنساروں میں، وہ ان سب کو کبھی برداشت نہ کرتے تھے۔ ان کو میں نے کبھی کسی پر خفا ہوتے نہیں دیکھا۔ جب دیکھا تو پیار محبت سے بات کرتے ہی دیکھا۔ خواہ وہ ملازم ہی کیوں نہ ہو۔ دوستوں میں ذرا بھی اَن بن ہوگئی تو فوراً ملاپ کرا دیتے تھے۔ وہ فرمایا کرتے تھے کہ دُنیا دو روزہ ہے۔ چند روز گزارنے ہیں تو ہنس کھیل کر کیوں نہ گزاریں اور ہنستے کھیلتے قادرِ مطلق سے کیوں نہ جا ملیں تاکہ ہمارے بعد دُنیا ہمارا ذکرِ خیر کرتی رہے۔ یہی زندگی کا سب سے بڑا انعام ہے۔

اب میں پروفیسر عبد المجید ملک کی مشہور نظم "ہم لوگ" کے دو شعر درج کرکے ختم کرتا ہوں۔
تھوڑی سی ترمیم اور معافی کے ساتھ۔

"ادیب"

لکھتے ہیں شہ رگ سے تواریخ ادب کی — اور فتح میں ہوتی جدھر جاتے ہیں یہ لوگ
تاروں پہ فضاؤں پہ سمندر پہ کمندیں — سب تابع و مسجود جدھر جاتے ہیں یہ لوگ

حبیب ابراہیم

ڈاکٹر زور ـ حیدرآباد سے کشمیر تک

ڈاکٹر زور پر جب کبھی بھی قلم اٹھانا چاہا تو یہ خیال آیا کہ ان پر لکھوں تو کیا لکھوں۔ شاید آپ یہ سوچ رہے ہوں کہ
شخصیت کی زندگی کے ہر پہلو پر بہت کچھ لکھا جا سکتا ہے۔ ہاں سچ تو ہے۔ لیکن ان کے پرستاروں نے ان
میں ان کی زندگی کے ہر رخ کی جیتی جاگتی تصویریں کھینچ کر دکھا دی ہیں۔ کسی نے خاندانی حالات بیان کیے
مدرسہ سے لندن میں اعلیٰ تعلیم کا حال بیان کر دیا۔ کسی اور نے ان کی تصانیف و تالیفات پر روشنی ڈالی، تو کسی
انتظامی صلاحیتوں کو سراہا، اور کسی نے ان کی اردو کی خدمات کے ترانے گائے۔ اور جب کسی کو کچھ نہ سوجھا
کا پیکر صفحۂ قرطاس پر کھینچ کر رکھ دیا۔ ان کے چاہنے والوں نے یہاں تک لکھ دیا کہ وہ بات کس انداز سے کرتے
کیا ہیں، کس قسم کے کپڑے پہنتے ہیں اور کونسا لباس ان پر جچتا ہے۔ شاگردوں اور دوستوں کی محفلوں میں کیسے
بنے رہتے ہیں، مہمان نوازی کا کیا حال ہے۔ کوئی ملاقاتی آئے تو اسے چائے ضرور پلوائیں گے اور خود و
پان کھاتے جائیں گے۔

اب آپ ہی بتائیے کہ سرسری نظر رکھنے والا ایک طالب علم ان کی زندگی کا کونسا نیا پہلو اپنے لیے ڈھونڈ نکا
تو پھر میں کیوں نہ یہ کروں کہ ان کی زندگی کے ہر پہلو پر مختصراً کہہ دوں ـــــ

ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور حیدرآباد کے اس خاندان سے تعلق رکھتے ہیں جو حیدرآبادی روا
مشائخانہ زندگی اور مذہبی پیشوائی میں اپنی ایک مثال رکھتا ہے۔ وہ دکن کے ایک صوفی حافظ سید شاہ ابوا
غلام محمد زعم رفاعی القادری کے صاحبزادے تھے۔ ان کا سلسلۂ نسب دکن کے مشہور صوفی اور ولی سید شاہ
مشکل آسان قندھاری سے ملتا ہے۔ حافظ سید شاہ ابوالبرکات غلام محمد زعم نہ صرف مذہبی پیشوا تھے
کے ایک اچھے شاعر بھی تھے۔ اس طرح ڈاکٹر زور مذہبی اور ساتھ ساتھ ادبی ماحول میں پروان چڑھے۔ ان
صلاحیت و ذہانت نے سونے پر سہاگے کا کام کیا۔ علمی مراحل اعلیٰ کامیابی کے ساتھ طے کئے۔ انھوں نے
جامعہ عثمانیہ سے ایم۔ اے کا امتحان درجہ اول سے کامیاب کیا۔ اور اپنے مضامین اختیاری اردو و فار
امتیاز حاصل کیا، جس کی بنا پر وہ سرکاری وظیفہ سے اعلیٰ تعلیم کے لئے لندن روانہ ہوئے۔ وہاں ڈاکٹر زور
زبانوں کے تقابلی مطالعہ اور اردو پر تحقیقاتی کام کر کے پی۔ ایچ۔ ڈی کی ڈگری مدت معینہ تین
دو سال ہی میں حاصل کرلی۔ وہاں سے پیرس گئے اور صوتیاتی تحقیق کے ادارے میں "تجرباتی صوتیات پر
تعلیم حاصل کر کے ہندوستان واپس آئے اور جامعہ عثمانیہ کے شعبۂ اردو سے وابستہ ہوگئے۔

ڈاکٹر زور زمانۂ طالب علمی سے اپنی زندگی کے آخر لمحہ تک تصنیف و تالیف کے کاموں میں منہمک رہے۔ اردو ادب کی کونسی ایسی صنف ہے جو ان سے چھوٹی ہے۔ وہ ایک ادیب، ناقد، محقق، مورخ، شاعر اور افسانہ نگار تھے۔ ڈاکٹر زور سے اگر کوئی یہ سوال کرتا کہ آپ کی تصانیف کی جملہ تعداد کیا ہے تو مجھے یقین ہے کہ وہ صحیح تعداد نہ بتلا سکتے۔ چنانچہ ایک دن میں نے یہی پوچھا تو فرمانے لگے "میرا کام لکھنا ہے اور بس، تعداد کسے یاد ہے۔" ایک لمحہ توقف کے بعد پھر کہا "دیکھو وہاں میری نئی کتاب کا پروف رکھا ہوا ہے، شروع کے صفحات پر میری تصانیف و تالیفات کی فہرست فن واری دی گئی ہے، اسے گن لو۔" میں نے اسے گنا، لیکن وہ بھی مکمل نہ تھی۔ ہاں ان کی مشہور کتابوں کے نام یاد ہیں جو درج ذیل ہیں:—

"روح تنقید۔ تنقیدی مقالات۔ روح غالب۔ اردو شہ پارے۔ اردو کے اسالیب بیان۔ عہد عثمانی میں اردو کی ترقی۔ داستان ادب حیدرآباد۔ حیات میر مومن۔ فرخندہ بنیاد۔ حیات سلطان محمد قلی قطب شاہ۔ سرگزشت غالب۔ سرگزشت حاتم۔ گارساں دتاسی۔ تذکرہ گلزار ابراہیم۔ دیوان زادہ حاتم۔ مرقع سخن جلد اول و دوم۔ متاع سخن۔ کیف سخن۔ بادۂ سخن۔ فیض سخن۔ رمز سخن۔ مکتوبات شاد عظیم آبادی۔ شاد اقبال۔ ارشاد نامہ۔ ابراہیم نامہ۔ سیر گولکنڈہ۔ طلسم تقدیر۔ اور گولکنڈے کے ہیرے۔"

ڈاکٹر زور نے تصنیف و تالیف کے علاوہ اردو ادب کی خدمات کے لئے "ادارۂ ادبیات اردو" کی بنیاد ڈالی۔ اور اس ادارہ سے اردو کی ترقی و ترویج کے لئے ہر ممکن کام کیا۔ ناخواندہ بالغان اور بچوں کے لئے اردو کے پڑھائی گھر اور مختلف مدارج کے امتحانات کا انتظام کیا۔ ڈاکٹر صاحب بہ نفس نفیس ان انتظامات میں مصروف رہتے تھے۔ یہ تحریک اتنی عام ہوئی کہ ریاست حیدرآباد کے کونے کونے میں اردو کے امتحانات منعقد ہوئے۔ ڈاکٹر زور نہ صرف خود لکھتے تھے بلکہ دوسروں میں بھی لکھنے کا شوق پیدا کرتے تھے۔ انھوں نے بے شمار ادیبوں کو اردو دنیا سے متعارف کرایا۔ وہ لوگ جو قلم پکڑنا بھی نہیں جانتے تھے ان کی بدولت لکھنے پڑھنے کے قابل ہو گئے اور صاحب کتاب یا دیوان کہلائے۔ ڈاکٹر زور جب کشمیر تشریف لائے تو یہاں بھی نوجوانوں اور طالب علموں میں تصنیف و تالیف کا شوق پیدا کیا، اور ہمت افزائی کے لئے ان کی تحقیقات کی اشاعت کا ادارۂ ادبیات اردو سے انتظام کیا۔

ڈاکٹر زور کی ایک کمزوری دکن سے محبت تھی۔ وہ اس والہانہ محبت میں اتنے گرفتار تھے کہ وہ ہمیشہ دکھنی تہذیب اور دکھنی اردو ادب کے علاوہ کسی پر قلم نہ اٹھاتے۔ یہاں تک کہ بات کرتے تو دکھنی لہجہ میں ڈوبی ہوئی۔ ان کی اس محبت کا اگر کسی کو تاج محل دیکھنا ہو تو وہ "ایوان اردو" دیکھے جو دکھنی تہذیب و تمدن کا ایک میوزیم ہے۔ اور جس کے ہر زاویہ میں دکھنی تہذیب و تمدن کی ان گنت کہانیاں کروٹیں لے رہی ہیں۔ ان کا کہنا تھا کہ اردو نے دلی اور لکھنؤ میں جنم لیا۔ لیکن حیدرآباد کے گہوارے میں پروان چڑھ کر کافی جوانی میں قدم رکھا۔ غالباً یہی وہ بات تھی کہ ڈاکٹر عبدالحق سے ان کی نہیں بنتی تھی۔

ڈاکٹر زور، سرزمین دکن کا وہ کوہ نور ہے جس نے اپنے مادر وطن کو دنیائے اردو ادب میں ایک اونچا مقام دیا۔ انھوں ہی نے تحقیق سے یہ ثابت کر دکھایا کہ اردو کا سب سے پہلا صاحب دیوان شاعر سلطان محمد قلی قطب شاہ حیدرآباد کا ہے

ڈاکٹر زور کو دکھن اور دکھنی ادیبوں اور شاعروں سے اتنا پیار تھا کہ وہ دکھن کی بھولی بسری کہانیوں کو زندہ کر انھیں کوئی یہ بتاتا کہ فلاں قبرستان میں فلاں شاعر کی قبر ہے تو ڈاکٹر صاحب اس کے سر ہی ہو جاتے اور اس وقت تک نہ بیٹھتے جب تک قبر دیکھ نہ آتے۔ اگر قبر شکستہ حالت میں ہوتی تو اسے درست کرواتے اور ایک کتبہ لگواتے۔

ڈاکٹر زور کو قلعہ گولکنڈہ اور سلاطین قطب شاہیہ کی تاریخ سے بہت پیار تھا۔ قطب شاہی دور اور قلعہ گویا وہ ایک انسائیکلو پیڈیا تھے۔ قطب شاہی دور کا ہر واقعہ ان کی نوک زباں پر تھا اور اس طرح سناتے وہ ان کے مصاحب رہے ہوں۔ انھیں قطب شاہی عمارتوں کے متعلق اتنی معلومات تھیں کہ وہ ان کے طرز یہ بتاتے کہ کس بادشاہ کی بنائی ہوئی ہے۔ حیدرآباد کے تقریباً بہت سارے علم قطب شاہی بادشاہو گئے ہیں اور وہ علم کو دیکھتے ہی کہہ دیتے کہ فلاں بادشاہ نے فلاں منت کی تھی اور منت بر آنے پر یہ علم ایس مختصر یہ کہ ڈاکٹر زور دکن کی زندہ تاریخ تھے۔

جامعہ عثمانیہ سے وظیفہ حسن خدمت پر سبکدوش ہو کر دکھنی تہذیب و تمدن کا یہ دلدادہ اور حیدرآباد اپنے وطن سے بہت دور کشمیر چلا آیا ـــ وہ کونسی کشش تھی جس نے ان کی دکھنی تہذیب و تمدن سے والہا غلبہ پا لیا ـــ اردو کی ترقی و ترویج کی خواہش کے سوا کیا ہو سکتی تھی مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ کشمیر آنے کے چند ایک صاحب نے ڈاکٹر صاحب سے پوچھا تھا کہ دکن چھوڑنا آپ کیسے گوارا کر رہے ہیں۔ تو کہا کہ شاید خدا مجھ اردو کی خدمت لینا چاہتا ہے۔ اور اسی لگن میں وہ وطن سے نکل پڑے۔ کسے معلوم تھا کہ زور کو عزیز نہ آئے گی اور وطن بھی چھوٹ جائے گا۔

ان ہی تمناؤں سے لبریز وہ وادی بے نظیر کشمیر جنت نظیر آئے۔ لیکن ابھی سنبھلنے بھی نہ پائے تھے کہ ستمگر مہینہ آن پہنچا۔ ستمبر کا تیئیسواں ۲۳ دن ان کی صحت مند زندگی کا آخری دن تھا۔ اور وہ دن بھر احباب سے ملاقات کی۔ رات میں کھانے کے بعد $\frac{1}{2}$ ۔ ۱ بجے تک اپنے چھوٹے لڑکے کو پڑھاتے رہے۔ سو گئے ـــ رات کو کوئی ساڑھے بارہ بجے ہوں گے۔ وہ تکلیف سے کراہنے لگے آواز سنکر بیگم صاحبہ ان سے کہا بیگم صاحبہ میرے دل اور بائیں ہاتھ میں درد ہو رہا ہے۔ بیگم صاحبہ کے ہاتھوں کے طوطے ا سہم کر رہ گئیں۔ اتنی دیر میں ان کے بڑے لڑکے سید تقی الدین صاحب قادری نیند سے بیدار ہوئے اور دوڑ ڈاکٹر کے ہاں پہنچے۔ علاج ہوتا رہا۔ دن بھر دل کا درد زوروں پر رہا۔ شہر کے مشہور ڈاکٹروں نے متفقہ کیا لیکن مشیت ایزدی کے آگے کچھ نہ چل سکی۔ ۲۴ اور ۲۵ ستمبر کی درمیانی رات میں ساڑھے سات اور ۸ بجے ڈاکٹر زور سبھوں کو داغ مفارقت دے گئے۔

انا للہ و انا الیہ راجعون

جہاں بانو نقوی

ڈاکٹر زور مرحوم

سمجھ میں نہیں آتا کیا لکھوں۔ میں تو اس موضوع پر کچھ لکھنے کو ٹال رہی تھی۔ مگر اس طرح پہلو بچانے بھی کون دیتا ہے۔ دل کہتا ہے ڈاکٹر صاحب پر کچھ کہنے سننے کو۔ مجھے تو اب بھی ایسے محسوس ہوتا ہے کہ ڈاکٹر زور زندہ ہیں۔ اور وہ کشمیر سے حیدرآباد اور حیدرآباد سے کشمیر طیاروں میں گھوم رہے ہیں۔ آ جا رہے ہیں۔ جیسے گھر آنگن کی بات ہو۔ مگر نہیں۔ وہ تو اب ہمیشہ کے لیے چُپ ہو گئے ہیں۔ گویا اب اُردو سے انھیں کوئی واسطہ ہی نہیں رہا۔ اس روٹھے ہوئے معشوق سے وہی خفا ہو گئے۔ زخمِ تمنا کہاں تک کھاتے۔ کوئی حد بھی تھی آخر۔ صرف وعدے ہی وعدے۔ وفا جن کی مشکل ہو۔ انسان ہونے کے ناطے اپنے چوڑے چکلے سینے میں بھی ایک دھڑکتا ہوا دل رکھتے تھے۔ اُردو پر آئے دن کے ظلم و ستم سہتے سہتے ایک ایسا بھی دن آیا کہ اس کے ساتھ ساتھ ان کی اُمنگیں بھی سو گئیں۔ وہ بھی چُپ ہو گئے۔ دل نے بھی ہمت ہار دی۔ انا للہ۔

مولوی عبدالحق مرحوم کے بیچ سے ہی ایسا لگتا ہے کہ اُردو کے مستقبل پر ماضی کی دھند چھاتی چلی جا رہی ہے۔ مولوی صاحب تو اُردو کو کس مپرسی کے عالم میں چھوڑ چھاڑ کر پاکستان چل دیئے۔ اور وہیں اللہ کو پیارے ہوئے۔ علامہ راشد الخیری اور مولوی نذیر احمد کا سارا خاندان اپنے عصمت و ساقی کی خیر مناتے ہوئے پاکستان منتقل ہو گیا۔ حمید الدین شاہد بھی سوچے کہ اگر یہاں رہوں تو بار بار اُردو کے جلسوں میں اس زبان کی خوبصورتی، دلکشی، نکھار اور تیکھے پن کی خواہ مخواہ بھی گواہی دینی ہوگی وہ حضرت بھی اس زبان کی ناؤ کو منجدھار میں ڈولتا ڈگمگاتا چھوڑ کر ساحل کا سہارا لے چکے۔ نیاز صاحب کی بے نیازی بھی حد سے گزری کہ نصف سے زائد عمر عشقِ بتاں کا دم بھرنے کے بعد جی بھر گیا۔ اور اب مسلمان ہونے کی سوجھی۔ چلو یوں ہوا کافر تو وہ کافر مسلماں ہو گیا۔ اور ان سے پہلے جوش بھی دیارِ ہند سے روٹھ کر ارضِ پاک میں مقیم ہو گئے —— اور یوں بس پاسباں ملتے رہے کعبہ کو صنم خانہ سے —— زور نے یہ سب کچھ دیکھا۔ بڑے ٹھنڈے دل سے۔ غور کرتے رہے۔ سوچتے رہے۔ اور پھر خیال آیا کہ نہیں —— ع عاشقوں آپ بھلے اپنا دل آرام بھلا —— مصیبت کے وقت ہی ساتھ دینا کمال ہے۔ ہمدردی کا تو یہی موقع و محل ہے ؎

دل ناکام سہی، پھر بھی تو اپنا دل ہے
یہی ناکام بُرے وقت میں کام آتا ہے

ان کے نام میں زندگی اور تخلص میں طاقت تھی۔ وہ اس طاقت کے سہارے اُردو کو بھی طاقتور بنانا چاہتے تھے۔ اس کو زندہ رکھنے پر تلے ہوئے تھے۔ منصوبے بناتے۔ کام کرتے۔ کام کرواتے۔ کام سے جی چرانے والوں کو ڈانٹ بھی رہے ہیں جھاڑ بھی

ہو رہے ہیں ۔ طنز بھی کر رہے ہیں ۔ ایسا طنز جس کو سُن کر اپنے لاجوں آپ مرنے کی نوبت آئے ——— مگر اب یہ سا
اظہار خفگی کہاں گیا ۔ ایسے چپ چپاتے ، بیٹھے بیٹھے چل پڑے کہ گویا جنت سے کسی اردو جلسہ کی صدارت کا بلاوا آیا
ناگزیر ہو گیا ہو ۔ اب ان کی بلا سے ، ان کو کیا کہ ان کے بعد ان کے پس ماندوں پہ کیا گزری ۔ بچوں کو یتیمی دے گئے
ہو گئی ۔ ایک ایک کا منہ تکنے لگی ۔ اور بیگم زور پر جو قیامت ٹوٹی اس کے اظہار کے لیے تو قلم سرنگوں ہے ۔ کشمیر جنت
مناظر بھی ان کو کاٹ کھانے کو آ رہے ہوں گے ——— اُداسیاں ہی اُداسیاں ؎

دو چیز آدمی را کشد زور زور
یکے آب و دانہ ، دوم خاک گور

ڈاکٹر صاحب کو تو دونوں ہی لے گئے ——— آب و دانہ بھی اور خاک گور بھی ؎

آسماں تیری لحد پر شبنم افشانی کرے

زور ایک ادارہ تھے ۔ ایک جامعہ ۔ ایک لائبریری ——— ہر لفظ ان کے لیے موزوں بیٹھتا ہے ۔ اپنے چھو
کو ایک ادارہ کی شکل دی ۔ اور پھر وہ ایوانِ اُردو بن گیا ——— دُنیا کے کونے کونے سے ریسرچ سکالر یہاں آ
پیاس بجھانے لگے ۔ جو چیز کہیں نہ ملی ——— وہ یہاں مل گئی ——— ڈاکٹر صاحب عمر بھر ادارہ کی علمی و ادبی وسعتو
رہے ۔ بڑھاتے رہے ——— ادھر ادارہ نے ان کی شخصیت میں چار چاند لگا دیئے ۔ ایک ہی بات ہے ۔ اور یہ
بات سب رس تک پہنچی ———

خیر اُردو غریب کو رہنے دیجئے ۔ اس کے حالِ زار پر ترس کھانے والے اب بھی گنتی کے رہ گئے ہیں ۔ زور ا
اور دبد بہ لے گئے ——— مگر پھر بھی یہ لشٹم پشٹم لڑ پڑ کر زندہ رہے گی ۔ مرے گی نہیں ——— زبان اور ایسی
زندہ زبان ۔ سخت جان ہونے پر بھی اس میں اتنی لچک ہے کہ مُڑ جائے گی مگر ٹوٹے گی نہیں ۔

زور مرحوم بڑے عزم اور حوصلے کے آدمی تھے ۔ وہ اپنی زبان کی طاقت سے اپنے شاگردوں کو بلند حوصلگی د
ہی نہیں ۔ بہت اچھے کار فرما بھی تھے ۔ کام کرنے کی جتنی صلاحیت ، کام لینے کا بھی خوب مہارت ۔ بڑی سختی سے کا
ان کو قریب سے جس نے دیکھا وہی انھیں سمجھ سکا ۔ ان کی مصروفیات میں کتنا تنوع تھا ۔ ایک انار سو بیماروں
تھا ۔ ادھر ایک کالج کے پرنسپل بھی ہیں ۔ اُدھر زنانہ کالج میں اُردو ایم ۔ اے کی طالبات کو لکچر دینے بھی آ رہے ہیں
کے بیسیوں کام ۔ ان سے بھی بے تعلق نہیں ۔ ادارہ تو ان کی شہ رگ سے بھی قریب تھا ۔ دعوتیں ہو رہی ہیں ۔
جلسے ۔ کسی مہمان کی آمد پر عصرانہ ۔ جہاں ہر مہمان سے بطورِ خاص پوچھتے پھریں گے ۔ " ارے آپ تو کچھ بھی نہیں
باتوں سے پیٹ بھرتے آئے ہیں ۔ " اور پھر دیکھتے دیکھتے سینی بھر لوازمات آپ کے سامنے ہوں گے ۔ اصرار ہو گا ۔ جیسے
پر جبر ہوتا تھا ویسے کھلانے پر بھی مُصر ہو جاتے ۔

لباس دیکھو تو درویشوں کا سا ۔ اور انھیں درویشوں جیسے صاف گو اور صاف باطن بھی ۔ لگی لپٹی نہیں ،
میں آ گیا کہہ دیا ۔ مگر ایسی کوئی بات نہیں جس سے دل دُکھے ۔ حساس بالکل نہیں لگتے تھے ۔ مگر حساس دل کی گہرائیوں
ابھی قہقہہ سنائی دیا کہ دیکھتے دیکھتے ایک دم سنجیدہ ہو گئے ۔
طالبِ علموں کی جان کے ساتھ ساتھ پان بھی بہ کثرت کھاتے ——— جان کھانا اس لیے لکھ رہی ہوں کہ ان کے

ابتدائی کا سال بڑا کٹھن گزرا۔ وہ سمجھتے تھے کہ ہم دل لگا کر نہیں پڑھتے۔ کچھ کھوئے کھوئے سے رہتے ہیں۔ انھیں ہم سے غلط فہمی اور ہمیں اپنی حد تک یہ خوش فہمی کہ سب کچھ جی جان سے سُن رہے ہیں۔ "کچھ سمجھ میں آیا میں جو کہہ رہا ہوں؟" ——— اور کلاس سے آواز آئی۔

"بالکل ڈاکٹر صاحب ——— آپ کو ہم سے آخر یہ بدگمانی کیوں ہے کہ ہم کلاس میں حاضر رہ کر بھی غیر حاضر رہتے ہیں ———"

"میں کہہ رہا ہوں مطالعہ کو وسیع کیجئے۔ پڑھئے۔ خوب پڑھئے۔ پڑھنے کے بعد ہی طالبِ علم لکھنے کا اہل ہوتا ہے" ———
مگر ان کو کیا خبر کہ یہ نامراد نصابی کتب سے ہٹ کر ہمارا مطالعہ کافی وسیع ہے۔ اور دوسرے سال جب انھوں نے دیکھا کہ پڑھتے ورھتے تو خاک نہیں مگر امتحان میں کامیاب ہو جاتے ہیں۔ اب ذرا ان سے نرمی سے پیش آؤ۔ ویسے ہم غائب تو نہ تھے۔ لیکن جی چاہتا تھا ان کی ڈانٹ سُننے کو۔

اِن کی بیسیوں کتابوں میں سے مجھے سیرِ گولکنڈہ اور گولکنڈے کے ہیرے بہت پسند ہیں۔

اِن کے نہ جانے ہماری طرح کتنے ڈھیر سارے طالبِ علم ہوں گے۔ جو ہندو بیرونِ ہند میں بکھرے ہوئے ہوں۔ اور اس "استادگر" کے کتنے ہی شاگرد آج اُستاد بن گئے۔ اور بس یونہی چراغ سے چراغ جلتے رہیں گے۔ ہر جلتا ہوا چراغ یہی سمجھے گا کہ یہ تو میری اپنی ہی روشنی ہے۔ کسی شمع نے اسے جل جل کر، پگھل پگھل کر جلایا ہی کب تھا۔ اور اس طرح اپنے اُستاد کو سب ہی بھول جاتے ہیں۔ کون بھلا کس کس کو یاد رکھے۔ بھلا استاد بھی کوئی یاد رکھنے کی مخلوق ہے۔ بقول ظ۔ انصاری "کندھوں پر چڑھ کر بیٹا کہتا ہے میں باپ سے بڑا ہوں۔ بیٹا یہ نہیں دیکھتا کہ اس کے قد میں باپ کا قد بھی شریک ہے" ——— اور شاید ایسے موقعوں کے لیے ناز شِس پرتاپ گڑھی کہہ گئے ہیں ؎

بٹھا کے دوش پہ جن کو نکالا پستی سے
پہنچ کے عرش پہ وہ لوگ ہم کو بھول گئے

اور بھی یہ جانے والے اکثر بس ایسے ہی کسی چور دروازے سے کھسک جاتے ہیں۔ کسی سے کچھ کہتے سُنتے نہیں۔ اور ان کے پیچھے ایک خیال نغمہ بن کر فضاؤں میں گونجتا گنگناتا رہ جاتا ہے ؎

سمجھو گے ہمارے بعد ہم کو
پر حیف کہ روبرو نہ سمجھے

بس رہے نام اللہ کا۔

ڈاکٹر زورؔ کی موت دُنیائے ادب اردو کے لیے ایک بہت بڑا سانحہ ہے۔ مدتوں اس نقصانِ عظیم کی تلافی نہ ہو سکے گی۔ انھوں نے اپنی زندگی میں اُردو کے استحکام و بقا کے لیے اتنے کام کئے ہیں ان کا نام امٹ ہو گیا ہے۔

ضیاالدین احمد برنی

نظر حیدر آبادی

زورؔ صاحب!

کیا زندگی کبھی مر سکتی ہے؟ ـــــ کیا جہد و عمل کے جلائے ہوئے چراغ کبھی فنا کے جھونکوں کی زد میں آسکتے ہیں؟ ـــــ اگر نفی میں ہے تو میں کیسے مان لوں کہ زورؔ صاحب مر گئے، مجھے یقین ہے کہ اب بھی سورج کی پہلی کرن دبے پاؤں جب ادارۂ ادبیات ا[illegible] دلکش اور سادہ و پُرکار عمارت میں داخل ہوتی ہوگی تو ضرور زورؔ صاحب کو مصروفِ عمل دیکھتی ہوگی!

بظاہر ساز کے تار ٹوٹ جاتے ہیں اور آواز خاموش ہو جاتی ہے لیکن اس کی گونج ہمیشہ ہمیشہ کے لیے فضاؤں میں محفوظ ہو پھر وہ آواز ایک قوم کے اجتماعی شعور کی آواز تھی، کس طرح خاموش ہو سکتی ہے۔ موت کا وار صرف جسموں پر چل سکتا ہے، زندگی زد میں کبھی نہیں آسکتی۔ زورؔ صاحب کی آنکھیں ضرور بند ہو گئی ہیں لیکن ان کی آواز کی شفقت آمیز گونج تو میں اب بھی یہاں میل دور کراچی میں بیٹھا سن رہا ہوں!

"نظرؔ ـــــ "سب رس" کے لیے کوئی تازہ چیز"

ڈاکٹر صاحب! تازہ چیز حاضر ہے، جو بیک وقت نوحۂ غم بھی ہے اور پیغامِ عمل بھی، اور اس "احساس پارے" [illegible] خود آپ کی شخصیت ہے۔ کیا آپ اس کو "سب رس" میں شائع فرما دیں گے۔

نہیں میاں نہیں، کوئی کام کی چیز دو، میں نے کیا ہی کیا ہے جو میرے متعلق کچھ لکھا جائے"!

ڈاکٹر صاحب! یہ آپ کیا فرما رہے ہیں، یہ ڈھیروں تصانیف و تالیفات، یہ ادارے کا عظیم الشان کتب خانہ ا[illegible] یہ اردو زبان کی ترقی و بقا کے لیے شبانہ روز بے غرضانہ سعی و کاوش، یہ اردو کی ترویج و حفاظت کے سلسلے میں اردو کا انعقاد، یہ دکن کے احساس کمتری میں مبتلا اہل قلم کی ہمت افزائیاں اور...

"بس نظرؔ بس، ایسی باتوں سے قوائے عمل مضمحل ہو جایا کرتے ہیں، کبھی کبھی وجدؔ کا یہ مصرع پڑھ لیا کرو:

ہر بڑے کام کی تکمیل ہے خود اس کا صلہ!"

سُن لیا آپ نے، اگرچہ یہ عالمِ خیال کی باتیں تھیں لیکن یہ ایک حقیقت ہے کہ ان کی زندگی عالمِ خیال کے مذکورہ با[illegible] کا مکمل نمونہ تھی۔ آج جب کہ ان کا مادی جسم ان کی محبوب سرزمین دکن کی سوندھی مٹی میں نہیں بلکہ اس سے سیکڑوں [illegible] کشمیر کی گلپوش وادیوں میں کہیں دفن ہے، مجھے یقین ہے کہ اب بھی سورج کی پہلی کرن دبے پاؤں جب ادارۂ ادبیات ا[illegible] اور سادہ و پُرکار عمارت میں داخل ہوتی ہوگی تو ضرور زورؔ صاحب کو مصروفِ عمل دیکھتی ہوگی!

دس بیس مہینوں کی نہیں بلکہ ربع صدی، اُدھر کی بات ہے ... سٹی کالج کے احاطے میں "یوم ولی" کے موقع پر میں.

پہلی بار دیکھا۔ عجیب اتفاق ہے کہ اُردو زبان کے ایک اور محسن مولوی عبدالحق کو بھی میں نے پہلی بار اسی جلسے میں دیکھا اور سُنا۔ اُس زمانے میں زور صاحب کی شخصیت میں طلوع صبح کی نرم شعاعوں کی سی کیفیت تھی اور مولوی صاحب کی شخصیت و شہرت کا آفتاب نصف النہار پر تھا!

زور صاحب سے پہلی ملاقات کا شرف اُن کے ایک عزیز شاگرد خواجہ حمید الدین شاہد کے ادارۂ حمیدیہ کے ایک سالانہ مشاعرے کے موقع پر ہوا تھا۔ اس مشاعرے اور اس کے انتظام و اہتمام کی کیفیت میرے ذہن میں آج بھی اس لیے تازہ ہے کہ اسی مشاعرے میں پہلی بار میں مخدوم، وجد اور میکش مرحوم سے بھی ملا تھا۔ زور صاحب ہی اس محفل کے صدر تھے اور ان کی داہنی جانب وجد اور بائیں مخدوم بیٹھے ہوئے تھے۔ میں ایک گوشے میں دبکا دبکا یا سا بیٹھا تھا۔ میزبان نے زور صاحب کو سگریٹ اور پان پیش کئے انھوں نے صرف پان کا بیڑا اٹھا لیا اور چونکہ سگریٹ نہیں پیتے تھے اس لیے سگریٹ والی طشتری کو مخدوم کی طرف بڑھا دیا، مخدوم نے مخصوص حیدرآبادی سلام کیا اور اُستاد کے سامنے سگریٹ پینے سے انکار کر دیا لیکن زور صاحب نے مجبور کر کے انھیں سگریٹ دیا اور خود ہی جلا بھی دیا۔ کہنے سُننے کے لیے یہ ایک معمولی سا واقعہ ہے لیکن یہ قدیم حیدرآباد کی تہذیب و شائستگی کی ایک عمدہ مثال بھی ہے! ــــ زور صاحب کو بہ حیثیت شاعر کے میں نے پہلی بار اسی محفل میں سُنا تھا۔ شعر تحت اللفظ پڑھتے تھے اور بڑے ٹھاٹ سے پڑھتے تھے۔ مشاعرے کے اختتام پر چلتے چلتے زور صاحب نے مجھے دوبارہ ملنے کی تاکید فرمائی یہ میرے لیے بڑی ہمت افزائی کی بات تھی۔ کچھ عرصے بعد میں اپنے عزیز دوست محمد عمر مہاجر کے ساتھ جامعہ عثمانیہ گیا تاکہ زور صاحب سے ملاقات کا شرف حاصل کروں۔ اس زمانے میں جامعہ کے کام عارضی عمارات میں انجام پاتے تھے اور آرٹس کالج کی موجودہ عظیم الشان عمارت کی بنیاد تعمیر ہو رہی تھی۔ یعنی وجد کی زبان میں "ابھی نظم کہسار درہم برہم ہو رہا تھا اور قوم کے ایک خواب کو مجسم ہونے میں" ایک مدت درکار تھی! ــــ زور صاحب کے کمرے میں ایک چھوٹی سی محفل مشاعرہ برپا ہو گئی، ایک نو وارد اور نوخیز شاعر کی ایسی پذیرائی کہیں کاہے کو ہوئی ہو گی۔ زور صاحب کی ہمت افزائیوں کا ایک ایک نقش میرے دل میں آج بھی تازہ ہے۔ "سب رس" نیا نیا نکلا تھا اس کے لیے انھوں نے میری اُس زمانے کی تازہ نظم "تجدید شوق" طلب فرمائی اور بڑے اہتمام سے شائع بھی کر دی۔ وہ دن ہے اور آج کا دن، سب رس میں میرا کلام برابر شائع ہوتا رہا۔ کبھی کبھی "دیر حاضری" ضرور ہوئی لیکن غیر حاضری کا امکان نہ تھا، یہ سلسلہ اب تک جاری ہے لیکن زور صاحب اب کہاں!

ایک سرزار اور ایک بزرگ غمگسار کا ذکر چھیڑا تو ان گنت واقعات اپنی ساری جزئیات کے ساتھ سینما کی متحرک تصویروں کی طرح نظروں کے سامنے آتے اور گزرتے چلے جاتے ہیں، ضبط کا پیمانہ چھلک پڑا ہے، ہاتھوں پر اتنا قابو نہیں کہ ان سب کو قلم بند کر دوں۔ لیکن چند ایسے واقعات کا ذکر ضروری معلوم ہوتا ہے جن سے مرحوم کے کردار کا ایک اہم پہلو نمایاں ہوتا ہے۔

یوں تو شہر حیدرآباد ہمیشہ سے علمی معرکوں اور ادبی ہنگاموں کا شہر رہا ہے لیکن ادارۂ ادبیات اُردو یعنی دوسرے لفظوں میں ڈاکٹر زور کی منعقد کردہ اُردو کانگریس کو ایک تاریخی اہمیت حاصل ہے۔ یہ کانگریس ایک ایسے زمانے میں بلائی گئی تھی جب برصغیر کی تقسیم کے خاکے بننے لگے تھے۔ اور اُن میں صرف انسانیت کے خون سے رنگ بھرنا باقی تھا۔ ان حالات میں اس کانگریس کو طے کرنا تھا کہ مستقبل میں اُردو کے پراگندہ کارواں کو کن راہوں پر آگے بڑھایا جائے۔ ایک ایسے موقع پر جبکہ برصغیر کے مشاہیر اس کانگریس میں شریک ہونے والے تھے، حیدرآباد کے ترقی پسند مصنفین نے سوچا کہ اُن کی اپنی تحریک کے تعارف کے لیے بھی اس سے اچھا موقع نہیں۔ کانگریس سے الگ کسی جلسے کا انعقاد غیر مناسب اور ناممکن تھا، اور اس کانگریس میں اس اجلاس کی اجازت

ملنا دشوار معلوم ہوتا تھا، یہ وہ زمانہ ہے جب حکومت کی نظروں میں ترقی پسندوں کی پوزیشن مشکوک تھی اور چاروں طرف سے اس پر طعن و تشنیع کی بوچھار ہو رہی تھی، حالات کے اس پس منظر میں حیدر آبادی ترقی پسندوں کے جیالے رہنما مخدوم اور انجمن کے پست بلند ہمت معتمد عابد علی خاں کے ساتھ کچھ احباب جھجکتے جھجکتے زور صاحب سے ملے، اور یہ دیکھ کر حیران رہ گئے کہ انھوں نے بغیر کسی کے اس اجلاس کے انعقاد کی اجازت دے دی اور ساتھ ہی ترقی پسندوں کے مہمانوں کو بھی اُردو کانگریس کے مہمانوں کے سا باغ کے شاندار محل میں ٹھیرانے کے لیے بڑی خوشی سے راضی ہو گئے، یہی نہیں بلکہ اس موقع پر اپنی تحریک کے تعارف کے لیے رسالہ کا ایک خاص نمبر بھی شائع کرنے کی اجازت دے دی۔ "سب رس" کے اس خاص شمارے کو اُس کے مدیران نے نہیں بلکہ ترقی پسند مصنفین کے معتمد عابد علی خاں نے مرتب کیا تھا اور اس کے اخراجات بھی ادارۂ ادبیاتِ اُردو نے برداشت کئے تھے ترقی پسند مصنفین کے لیے مسرت و انبساط کا یہ موقع ظاہر ہے ڈاکٹر زورؔ کی فراخ حوصلگی نے ہی فراہم کیا تھا، سچ ہے اتنا ور درخ گھنے سایوں کا سکوں ریز آغوش، نئے اور پُرانے مسافر میں فرق نہیں کرتا !

اُردو کانگریس میں اپنی اس کامیابی سے ترقی پسند مصنفین کے حوصلے بلند ہو گئے اور اُس زمانے کے غیر یقینی حالات کم حیدر آباد میں ان کی پوزیشن واضح اور مستحکم ہو گئی۔ ایک سال بعد مرکزی انجمن ترقی پسند مصنفین (شاخ اُردو) کی طرف سے میں سالانہ اجلاس منعقد کرنے کے لیے لکھا گیا۔ اس مراسلے کے ملتے ہی حیدر آباد کے ترقی پسند مصنفین کے ہاتھ پاؤں پھول گئے سے نہیں بلکہ اپنی تنگ دامانی اور کام کی وسعت کے خیال سے۔ روپئے کی فراہمی کا مرحلہ سب سے دشوار تھا، اُردو کانگریس تو کی شخصیت اور ذاتی اثر و رسوخ کی وجہ سے کامیاب ہو گئی تھی اور اُس میں ترقی پسند مصنفین کا اجلاس ایک ضمنی حیثیت ر اب ساری ذمہ داری خود ترقی پسندوں کو اُٹھانی تھی، طویل بحث و گفتگو کے بعد اور ترقی پسندوں کے ایک بزرگ اور مخلص ر قاضی عبد الغفار مرحوم کے مشورے پر اس سلسلے میں ڈاکٹر زورؔ سے رجوع کیا گیا اور انھوں نے بڑی خندہ پیشانی سے مدد کا وعد اجلاس کی مجلس استقبالیہ کی صدارت بھی قبول کر لی، اب کام آسان ہو گیا، ڈاکٹر زورؔ کی طرف سے چندے کی اپیل شائع کی گ لے کر انجمن کے کارکن دیہات دیہات پھیل گئے اور تھوڑے ہی سے عرصے میں سیکڑوں نہیں ہزاروں روپئے چندہ جمع ہو گیا ہے یہ بھی زورؔ صاحب کے عملی تعاون کا کرشمہ تھا، اس واقعہ سے ترقی پسندوں کو بھی اندازہ ہو گیا کہ ملک میں زور صاحب عزت تھی۔ ترقی پسندوں کے گروہ کو اُس زمانے کے حیدر آباد میں بڑا "خطرناک" سمجھا جاتا تھا اور اس تحریک میں کوئی شخصیت شامل نہیں تھی جسے ملک کے سارے طبقے پسند کرتے ہوں، ایسے حالات میں زور صاحب کی غیر سیاسی اور علمی شخصیت کا وجود کام آگیا اور اتنی شاندار کانفرنس منعقد کی جا سکی۔ یہ واقعات میں نے یہ ثابت کرنے کے لیے بیان کئے زورؔ صاحب نام کے شیدائی نہیں بلکہ کام کے دھنی تھے اور اس لگن کو جس میں اور جہاں دیکھتے، اُس سے تعاون کے لیے رہتے۔ اس میں حکومتِ وقت کی برہمی کی بھی انھوں نے کبھی پرواہ نہیں کی۔

پیدا کہاں ہیں ایسے پراگندہ طبع لوگ
افسوس تم کو میرؔ سے صحبت نہیں رہی

پنڈت ونشی دھر ودیا النکار

ڈاکٹر زور، ایک دوست

عثمانیہ یونیورسٹی نے اُردو کے جتنے بڑے شاعر، ادیب اور اردو کے خدمت گزار پیدا کئے ہیں ان میں ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور کا نام بہت اونچا ہے۔ اور ہمیشہ عزت کے ساتھ یاد کیا جائے گا۔ اپنے طالب علمی کے زمانے سے انھیں اردو زبان کی خدمت کرنے کی دھن لگ گئی تھی۔ انھیں اردو زبان اور اردو ادب کی خدمت کرنے کے لئے بابائے اردو ڈاکٹر عبدالحق اور مولانا وحید الدین سلیم جیسی اردو کی عظیم المرتبت ممتاز ہستیوں سے تحریک ملی۔ عثمانیہ یونیورسٹی سے اردو میں ایم۔ اے کرنے کے بعد وہ لندن گئے اور وہاں سے ڈاکٹریٹ کی ڈگری لے کر پھر عثمانیہ یونیورسٹی میں اردو کے شعبہ میں کام کرنا شروع کیا۔

ان کا دن رات یہی خیال رہتا تھا کہ وہ اردو زبان اور اردو ادب کی کچھ ایسی خدمت کر جائیں کہ اردو لوگوں میں زیادہ مقبول اور عام ہو۔ لوگوں کے دلوں میں اردو کی عزت بڑھے اور اردو ادب مالا مال ہو جائے۔ انھوں نے عثمانیہ یونیورسٹی سے پڑھے ہوئے اردو کے ادیبوں، شاعروں اور انشاپردازوں کی حوصلہ افزائی کی اور ان کو ایک مرکز پر جمع کرنے کی کوشش کی۔ اس زمانے میں عام طور پر یہ سمجھا جاتا تھا کہ دکن کے اونچی سے اونچی ڈگریاں یافتہ لوگ بھی اردو کو اس طرح نہ لکھ سکتے ہیں اور نہ بول سکتے ہیں جیسے کہ شمالی ہندوستان کے اردو داں لوگ۔

انھوں نے اس بات کو غلط ثابت کر دیا۔ انھوں نے اپنی اردو کی علمیت کا سکہ شمالی ہندوستان کے اردو کے ادیبوں کے دل پر بٹھا دیا اور اس طرح کی غلط فہمی کو ہمیشہ کے لئے دور کر دیا۔ زندگی کی آخری سانس تک اگر وہ کسی چیز کے بارے میں سوچتے تھے تو وہ اردو کے بارے میں۔ عثمانیہ یونیورسٹی سے نکلے ہوئے ان ڈگری یافتہ لوگوں میں جو حیدرآباد کے ہی رہنے والے تھے، اردو زبان کی جیسی خدمت ڈاکٹر زور نے کی، ویسی شاید ہی کوئی دوسرا شخص کر سکے گا۔ انھیں دکن سے بہت محبت تھی اگرچہ ان کی موت کشمیر میں ہوئی اور کشمیر کو جنت کہا جاتا ہے تو بھی اگر ان کا بس چلتا تو ان کی یہی خواہش تھی کہ وہ دکن کی سرزمین میں ہی سپرد خاک کئے جائیں اور اس کے لئے انھوں نے پہلے ہی سے اس کی تیاری کر لی تھی۔

میری ان کی سب سے پہلی ملاقات اورنگ آباد میں ہوئی۔ میں اس وقت اورنگ آباد میں لکچراری کا کام کرتا تھا۔ عثمانیہ کالج اورنگ آباد کی طرف سے مولانا حالی کا صد سالہ جشن منایا گیا تھا جس کی صدارت سر اکبر حیدری نے کی تھی۔ اور حیدرآباد سے بھی بہت سی ممتاز ہستیاں اس میں شریک ہوئی تھیں۔ ڈاکٹر زور نے اس جلسے میں ایک مقالہ پڑھا تھا۔ مقالہ بڑی محنت اور بڑی سوجھ بوجھ سے لکھا گیا تھا اور میں نے بھی اس جلسے میں مولانا حالی پر ایک نظم پڑھی تھی۔ مجھ سے ڈاکٹر زور نے تو کہنے لگے آپ کے مضمون اکثر انجمن ترقی اردو کے رسالے "اردو" میں پڑھتا ہوں۔ مضامین کو پڑھ کر مجھے تو کچھ ایسا اندازہ ہوا تھا کہ آپ ایک بوڑھے آدمی ہوں گے لیکن ماشاءاللہ آپ تو بالکل نوجوان ہیں۔ اس وقت میری عمر کوئی تیس سال

ہوگی۔ کچھ برسوں کے بعد میں حیدرآباد میں آگیا۔ میرا تقرر سنسکرت اور ہندی کے شعبہ میں ہوا۔ میرا میل ملاپ ڈاکٹر زور سے بڑھا۔ یہ میل ملاپ آہستہ آہستہ دوستی کی شکل میں بدل گیا۔ میں دیکھا کرتا تھا کہ وہ اُن دنوں دکنی کی کچھ کتابوں کو ایڈیٹ کر رہے تھے۔ دکنی میں چونکہ ہندی کے الفاظ بہت ہیں اس لئے ان دکنی میں آئے ہوئے ہندی کے الفاظ کے معنے جاننے کے لئے وہ اکثر ہر روز انٹرول کے وقت شعبہ سنسکرت اور ہندی میں آیا کرتے تھے۔ اور ان الفاظ کے معنی پر بحث و مباحثہ ہوتا تھا اور وہ ان کے معنی لکھتے تھے۔ دکنی شعرا کی کتابوں کو کسی اسکالر نے شاید اس لئے ایڈیٹ کیا ہو کہ وہ اردو کے پہلے اور قدیم شاعر تھے۔ لیکن ڈاکٹر زور کو دکن کے ان شاعروں سے خاص دلچسپی تھی اور وہ ان کے ساتھ اپنا ایک گہرا تعلق محسوس کرتے تھے۔ وہ ان کی کتابوں کو صرف اس لئے ایڈیٹ نہیں کرتے تھے کہ وہ اردو کے شاعر یا ادیب تھے بلکہ اس لئے کہ انھوں نے دکن کی سرزمین میں پیدا ہو کر ایسی عظیم الشان خدمت کی تھی۔ انھوں نے ادارۂ ادبیات اردو سے دکن کے شاعروں کے کلام کو نہایت عمدہ طور پر شائع کیا۔

پولیس ایکشن کے بعد جو دکنی کو چھپانے کے لئے ہندی اور اردو دونوں میں کمیٹیاں بنیں ان میں بھی انھوں نے بہت دلچسپی لی اور دکنی کے شاعروں کے کلام کو ہندی رسم الخط میں چھپانے میں بیحد تعاون کیا۔ ہم کہتے ہیں کہ ڈاکٹر زور کی موت سے دکن کا ایک بہت بڑا عالم اس دنیا سے اٹھ گیا۔ میں ان سے اکثر کہا کرتا تھا کہ دکن کے ان شاعروں کی ابھی گہری نظر سے مطالعہ کی ضرورت ہے اور اس کے لئے اردو اور ہندی کے عالموں کو مل کر ایک جگہ بیٹھ کر ہر پہلو پر سوچتے ہوئے کام کرنا چاہیے۔ وہ اس بارے میں میرے ساتھ مل کر کام بھی کرنا چاہتے تھے۔ انھوں نے اس بات کی کوشش کی تھی کہ وہ مجھے کشمیر یونیورسٹی میں بلالیں۔ لیکن واقعات کچھ ایسے ہوئے کہ میں وہاں نہ جاسکا اور ہم جو مل جل کر کام کرنا چاہتے تھے وہ ویسا ہی پڑا رہ گیا۔

حیدرآباد سے چلے جانے کے بعد ڈاکٹر زور تمام ہندوستان کی اردو کی ایک عظیم ہستی بن گئے تھے۔ وہ اردو کی سب بڑی کمیٹیوں کے رکن تھے۔ آج بمبئی جا رہے تھے تو کل علی گڑھ۔ کشمیر سے دہلی کے تو ان کے اکثر چکر لگے رہتے تھے۔ کشمیر سے حیدرآباد بھی بہت دور پڑتا تھا۔ اس کا نتیجہ یہ تھا کہ وہ اپنی آخری عمر میں اردو ادب کی جو خدمت کرنا چاہتے تھے وہ نہ کر سکے۔ ان کا بہت سارا وقت اردو کی ایسی ہی کمیٹیوں کی نذر ہو جاتا تھا۔ سری نگر میں اردو کا وہ ماحول بھی نہیں تھا جو حیدرآباد میں تھا۔ وہاں کوئی ایسے اردو کے عالم نہیں تھے جن سے وہ اردو کے مسائل پر غور و خوض کر سکتے۔ مجھے ان کے ساتھ دلی سے جموں تک سفر کرنے کا موقع ملا تھا۔ میں جموں جب ان کے ساتھ پہنچا تو میں نے دیکھا تھا کہ وہ کس قدر تھک گئے تھے اور کافی دیر تک انھیں اس طرح لیٹے رہنا پڑا۔ کشمیر میں جا کر ان کے سامنے کچھ اور ہی طرح کے مسئلے پیش آتے تھے۔ ان مسئلوں کا ذکر یوں اور اس طرح کی کچھ اور چیزوں سے متعلق ہوتا تھا۔ کچھ سیاست سے ہوتا تھا۔ اور وہاں کے ماحول میں اردو کے لئے کام کرنے کا وہ میدان نہیں تھا جو کہ برسوں کی محنت کے بعد انھوں نے حیدرآباد میں ہموار کر لیا تھا۔ اسی لئے وہ رنجیدہ سے رہتے تھے اور مجھ سے بار بار کہتے تھے کہ میں خواہ مخواہ کشمیر آگیا۔ میرا دل چاہتا ہے کہ میں یہاں کے کام کو چھوڑ کر حیدرآباد واپس چلا جاؤں۔ لوگ کشمیر اور سری نگر میں جا کر خوش ہوتے ہیں وہاں رہنا چاہتے ہیں لیکن ڈاکٹر زور کو حیدرآباد سے کچھ ایسی محبت تھی کہ وہ سری نگر سے حیدرآباد کو زیادہ چاہتے تھے۔ انھوں نے پانچ سال کی خدمت

ادہ کر لیا تھا اس خاطر انھیں وہیں رہنا پڑا۔ میں سمجھتا ہوں کہ ان کی اتنی جلدی موت ہونے میں ایک یہ وجہ تھی کہ ان کا دل ں خوش نہیں تھا۔

حیدر آباد میں اگر وہ جتنے مصروف رہتے تھے اور جتنا اردو کا کام کرتے تھے اتنا وہ وہاں نہیں کر سکتے تھے۔ وہاں تو کام اس ڈھب کے ہوتے تھے کہ جن کا اردو کی علمی و تحقیقی خدمت سے بہت کم تعلق ہوتا تھا۔ ان کی اردو کے ادب کی مصروفیات ر آباد ہی میں مرکوز تھیں۔ ان کے یہاں سے چلے جانے سے یہ سب سرگرمیاں کچھ ٹھنڈی پڑ گئیں۔ اور اُدھر بھی سرگرمی پیدا نے کے کچھ خاص امکانات نہیں تھے۔

میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا کہ وہ کس طرح اپنے ادارہ "ایوان اردو" میں ہندوستان کی ممتاز ہستیوں کو مدعو کرتے اور اپنے ادارہ اور ایوان کے نہ صرف ایک ایک شعبے کو کس جوش و خروش اور شوق سے خود ساتھ رہ کر دکھایا کرتے تھے۔ س طرح سے ہر چیز کی تفصیل بیان کرتے تھے اس سے یہ معلوم ہوتا تھا کہ انھیں اپنے ادارہ اور ایوان اردو کی ہر چیز سے محبت اور گہری دلچسپی ہے۔ ہم سمجھتے ہیں کہ سارے ہندوستان میں ہی نہیں شاید پاکستان میں بھی ایسا نایاب ذخیرہ ں ہوگا جیسا انھوں نے اپنے ادارہ اور ایوان اردو میں جمع کیا تھا۔

نہ جانے ان کے کیا کیا خواب تھے اور ان چیزوں کو دیکھ کر وہ کچھ خواب کی دنیا میں پہنچ جاتے تھے۔ پچھلے سال انھوں نے ایوان اردو میں اس زمانے کے کشمیر یونیورسٹی کے وائس چانسلر جناب سردار پانیکر کو دعوت دی تھی۔ انھوں نے بڑے ق سے اپنے ادارہ اور ایوان اردو کے تمام شعبوں اور اشیاء کو دکھلایا۔ دکھلانے کے بعد جب وہ چائے پر بیٹھے تو مسکرا کر نے لگے کہ ڈاکٹر زور صاحب! مجھے سچ مچ بڑی حیرانی ہوتی ہے کہ آپ حیدر آباد چھوڑ کر کیسے سری نگر چلے گئے۔ آپ کی تمام پیاں سب یہیں جمع ہیں آپ چاہے جسم سے یہاں رہیں لیکن آپ کا دل تو یہیں ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ آپ نے حیدر آباد ڑ کر اپنے ساتھ بہت ناانصافی کی ہے۔ اگر میں آپ کی جگہ ہوتا تو حیدر آباد چھوڑ کر کبھی نہ جاتا۔" ڈاکٹر زور اردو کی دنیا ہی نہیں حیدر آباد کی ایک ممتاز ہستی تھے۔ وہ ان لوگوں میں سے تھے جنھیں حیدر آباد اور اس کی سرزمین سے بہت گہرا لگاؤ تھا۔ ہو جاتے تو تقسیم کے بعد پاکستان چلے جاتے۔ وہ اردو کے اتنے بڑے اسکالر تھے کہ پاکستان میں ان کی بڑی عزت ہوتی جبکہ بہت سے اپنے ملک کو چھوڑ کر پاکستان چلے گئے۔ ان کے دماغ میں کبھی یہ خیال تک نہ آیا کہ وہ حیدر آباد چھوڑ کر کہیں اور چلے جائیں۔ انھوں اپنے ایوان اردو میں ملا وجہی کے ان اشعار کو دیوار پر کتبے کی صورت میں لگا رکھا ہے ؎

دکن سا نہیں ٹھار سنسار میں　　پنج فاضلاں کا ہے اس ٹھار میں
دکن ہے نگینہ انگوٹھی ہے جگ　　انگوٹھی کو حرمت نگینہ ہے لگ
دکن ملک کو دھن عجب ساج ہے　　کہ سب ملک سر ہور دکن تاج ہے
دکن ملک بھوتچ خاصہ اہے　　تلنگانہ اس کا خلاصہ اہے

کسی کو بھی اپنا ادارہ اور ایوان اردو دکھاتے تھے اسے یہ شعر بار بار پڑھ کر سناتے تھے۔ وہ ان اشعار کو اس طرح پڑھتے تھے کہ ہے یہ اشعار انھوں نے خود لکھے ہوں۔ ان اشعار کو وہ اس طرح سناتے تھے کہ دکن کے لئے ان کی محبت اور لگاؤ صاف ظاہر ہوتا ان کو یہاں کے لوگوں سے محبت تھی۔ حیدر آباد کی تہذیب اور تمدن سے محبت تھی۔ حیدر آباد کی روایات سے محبت تھی اور

ان کو اس بات کی خواہش تھی کہ دنیا میں حیدرآباد کا بڑا نام ہو۔ وہ حیدرآباد میں اردو کی کوئی ایسی خدمت کر جائیں جس کا فا سے ہی نہیں تمام دنیا سے قائم ہو جائے۔

میں نے ان میں ہندو مسلمان یا اس طرح کے بھید بھاؤ کی کوئی بات نہیں دیکھی۔ وہ ہم سے ہمیشہ اس طرح ملا کرتے گھر کے ہی ایک فرد ہوں۔ ان میں اردو ہندی کے جھگڑے کی بھی کوئی بات نہ تھی۔ وہ سب کے ساتھ مل جل کر کام کرنا چاہتے نے اپنے ادارہ میں بھی اس کا خیال رکھا اور وہاں بھی انھوں نے کچھ اس طرح کا فرق کبھی نہیں رکھا۔ جس وقت وہ یو شعبہ کے کچھ روز کے لئے صدر رہے تھے کچھ لوگوں نے ہندی کے لئے کچھ ایسا کام کرنے کی کوشش کی جس سے ہندی اور ارد پیدا ہونے کا امکان تھا لیکن انھوں نے اس کو دبا دیا اور ہندی کو اردو کے شعبہ میں ایسے ہی جاری رکھا جیسے وہ پہلے کی دنیا میں کسی طرح کے فرق اور امتیاز کے قائل نہیں تھے۔ وہ مل جل کر کام کرنا چاہتے تھے اور اپنی زندگی کے آخر اسی پالیسی پر چلتے رہے۔ میں نے جب ان سے ہندی کے ریسرچ انسٹی ٹیوٹ کا رکن بننے کے لئے کہا اور ان سے گزار کے لئے وہ ۱۰۱ روپے کا عطیہ عنایت فرمائیں تو انھوں نے بخوشی فوراً ہی ۱۰۱ روپے کا چک دے دیا۔ ہم انھیں اس ڈائرکٹرس میں رکھنا چاہتے تھے اور ہمیں امید تھی کہ ہم ان کے ساتھ مل کر دکنی ہندی اور اردو کا بہت سا کام کر سکیں گے۔ میں کرتا تھا کہ آپ اپنے سب رس کو ہندی میں بھی نکالئے۔ چاہے زبان آپ وہی رکھئے جو آپ سب رس میں رکھتے ہیں لیکن اسکو رسم الخط میں بھی چھاپنا شروع کر دیجئے۔ اس سے آپ بدلے ہوئے حالات میں اردو زبان اور اس کے ادب کی بڑی خدمت ان لوگوں تک بھی اردو ادب کو پہنچا سکیں گے جو اردو کے رسم الخط سے واقف نہیں ہیں لیکن اردو ادب سے دلچسپی ر سب باتیں ادھوری ہی رہ گئیں کسے معلوم تھا وہ اتنی جلدی دنیا کو چھوڑ کر چلے جائیں گے۔

مجھے ڈاکٹر زور کی اکثر یاد آتی ہے۔ میں ان کے ساتھ جب بھی بیٹھتا تھا مجھے اس بات کا احساس ہوتا تھا کہ ان میں ایک ق تھی۔ وہ دل کے صاف تھے۔ کئی دفعہ بیٹھے بیٹھے اپنی زندگی کی ایسی باتیں بھی کہہ جاتے تھے جسے کسی دوسرے کو کہنے میں تامل ان کے دل کی صفائی، صاف گوئی کا پتہ چلتا ہے۔ وہ طبیعت کے سادے تھے لیکن چال چلن اور رہن سہن میں نواب جاتے تھے، اپنے ٹھاٹھ سے رہتے تھے۔ ان میں ایسی آن بان تھی کہ وہ بڑے سے بڑے آدمی کے پاس نہیں جاتے تھے۔ میں کہ وہاں کا چیف سکریٹری ان سے ملنے ان کے گھر پر آتا تھا۔ ان کی یہ آن بان ایسی تھی کہ جس کے لئے وہ کسی کے ساتھ تیار نہیں تھے۔ اس زندگی میں ڈاکٹر زور کے بہت سے دوستوں نے ان کے بارے میں بہت کچھ غلط سمجھا لیکن وہ کسی ڈاکٹر زور پیار و محبت کے آدمی تھے۔ ان میں محبت اور مروت تھی۔ وہ حیدرآباد کے اس کلچر کا نمونہ تھے جس کو حیدر میں بنایا تھا۔ آج حیدرآباد بدلتا جا رہا ہے اور آنکھیں ڈاکٹر زور جیسی ہستیوں کی تلاش کرتی ہیں اور جب وہ دکھا وہ آنسوؤں سے بھر جاتی ہیں۔ کاش! ڈاکٹر زور ابھی اور زندہ رہتے۔ ان کے انتقال سے صرف اردو ادب ہندوستان کی تمام زبانوں کو دھکا لگا ہے۔ یہ ایسا دھکا ہے کہ اس کی تلافی ہونا ناممکن ہے۔

احمد جلیس

حسب قاعدہ

چادر گھاٹ کالج میں داخلہ لئے مجھے چند ہی دن ہوئے تھے۔ معلوم ہوا ہمارے پرنسپل ڈاکٹر زور بھی ہمیں اردو ادب کا ایک پیریڈ پڑھائیں گے۔

ہم سب مسرور تھے کہ ہم اتنے بڑے عالم سے استفادہ کریں گے لیکن مجھے رہ رہ کر یہ احساس ہو رہا تھا کہ ان کے سامنے ہماری قابلیتوں کا بھرم کھلے گا تو نہ جانے وہ کیا رائے قائم کریں گے ؟

بات ابھی یہیں تک تھی کہ ایک دن پوری کلاس کو زور صاحب نے اپنے کمرے میں طلب کیا۔ اسکول چھوڑ کر نئے نئے کالج میں آئے ہی تھے ہی ایسے عالم و فاضل پرنسپل سے سابقہ پڑا۔ سب پر ہی گھبراہٹ طاری تھی کہ خدا جانے کس وقت منہ سے کیا اول فول نکل جائے۔ بہرحال ہم سب بہایت مودب بن کر کمرے میں داخل ہوئے۔

زور صاحب ایک ہی کپڑے کی سلی ہوئی ٹوپی شیروانی پہنے "آنکھیں بند کئے" کرسی سے سر لگائے بیٹھے تھے۔ ہماری آہٹ سن کر سی قدر آنکھیں نیم وا کیں اور پھر بولے :

ـــ آئیے آئیے ـــ اندر آئیے ـــ آپ لوگاں میرے سے ڈرتے کیوں ہیں ؟ اور پھر انھوں نے آنکھیں بند کرلیں۔ ہم خاموشی سے سامنے پڑی کرسیوں پر بیٹھ گئے۔

میں نے دل میں سوچا ـــ یا اللہ یہ کیسے زور صاحب نکلے جو نہ تو آنکھیں کھولنے پر تیار ہیں اور نہ جن کی گفتگو سے ان کی لسانیت کا اندازہ ہوتا ہے۔ اتنے میں کالج کا چپراسی آئیلو داخل ہوا جس سے زور صاحب بے تکلف تلنگی میں بات چیت کرنے لگے۔

تب میں نے محسوس کیا کہ یہ دراصل ان کی دکن پرستی اور دکن کی روایتی لسانی رواداری بول رہی تھی۔

ڈاکٹر زور ہمیں پروفیسر وحید الدین سلیم کے تنقیدی اور تحقیقی مضامین کا مجموعہ " افاداتِ سلیم " پڑھاتے تھے اور ہفتہ میں دو دن مضمون نگاری ہوتی۔

ابتدائی چند پیریڈ صرف پروفیسر سلیم کی شخصیت اور ان کے علمی کارناموں کے تذکرہ میں گزرے اور ان تذکروں کے ساتھ ساتھ وہ ہمیں ڈاکٹر عبدالحق اور سید سجاد مرحوم وغیرہ کے واقعات بھی سنایا کرتے۔ جامعہ عثمانیہ کے پرانے علمی اور ادبی ماحول کی عظیم الشان روایتیں سناتے سناتے اور اپنے استادوں کا ذکر کرتے وقت ان کی خلائی آنکھوں میں ایک مخصوص چمک پیدا ہو جاتی اور وہ یوں خلاء میں گھورنے لگتے گویا پورا نقشہ ان کی آنکھوں میں گھوم رہا ہے۔ کلاس میں ہمیشہ کتاب مجھ سے پڑھواتے اور آنکھیں بند کئے غور سے سنتے رہتے۔ تھوڑی تھوڑی دیر بعد اشارہ سے مجھے روک کر متن کی وضاحت کرتے جاتے۔

غرض تنقید جیسا خشک مضمون انھوں نے ہمیں ایسے دلچسپ انداز میں پڑھایا کہ احساس تک نہ ہوا کہ کتاب کب ختم ہو گئی؟

ذاتی طور پر مجھے یہ فائدہ ہوا کہ روز عبارت پڑھتے پڑھتے مختلف الفاظ کے صحیح تلفظ اور ان کے ماخذات معلوم ہوتے گئے۔ الفاظ کے مخارج پر مجھے ایک دلچسپ واقعہ یاد آیا۔ ایک مرتبہ زور صاحب کی کلاس میں کسی لڑکے نے "قہقہے" کو "خہخہے" پڑھا۔ اس پر ڈاکٹر صاحب چونکے اور بار بار اس لڑکے سے وہی لفظ دہرایا اور لطف لیتے رہے۔ جب میں انھیں دیکھ کر مسکرایا تو فرمایا۔ "ہمارے حیدر آبادی لوگ کھٹا اور مرچ زیادہ کھاتے ہیں اس لئے ق کی صاف آواز ان کے حلق سے نکلتی ہی نہیں۔

میں نے عرض کیا۔ صاحب میں بھی تو خالص حیدر آبادی ہوں — اور پھر یہاں بہت سے لوگ قینچی کو خینچی تو کہیں گے لیکن خمیر کو قمیر — یعنی خ اور ق کا تلفظ تو ممکن ہے لیکن غلط جگہ پر۔

مجھے خوب یاد ہے میری اس مثال پر زور صاحب دیر تک ہنستے رہے۔ زور صاحب کے مقامی معاصرین اور بعض دیگر افراد ہمیشہ ان کی شخصیت پر ادب کے مختلف میدانوں میں جانب داری کا لیبل لگانے کی کوشش کرتے رہے لیکن اپنی ذاتی گفتگو اور عملی میدان میں میں نے انھیں نہ صرف غیر جانب دار بلکہ ہر ایک کا ہمدرد پایا۔

زور صاحب ایک پیدائشی استاد تھے۔ ان کی شخصیت اور کردار میں ایسا جاہ و حشم اور رعب تھا کہ انھیں دیکھتے ہی احترام اور عقیدت سے خود بخود نگاہیں نیچی ہو جاتی تھیں۔ جہاں ان کی شخصیت میں صوفی منش والد کی تربیت کا تقدس شامل تھا وہیں ان کی اپنی علمیت کا وقار بھی ٹپکا پڑتا تھا۔ وہ ان یادگار زمانہ استادوں میں سے تھے جو طالب علموں کو پورے خلوص سے صرف اپنا علم ہی نہیں بخشتے بلکہ اپنی شخصیت، کردار اور اخلاق کے گہرے نقوش بھی ان کے دلوں پر چھوڑ جاتے ہیں۔ ان کی اپنی ساری زندگی ایک طالب علم کی مثالی زندگی تھی۔

کالج کا واسطہ ختم ہو کر خواہ کتنی ہی مدت کیوں نہ ہو جائے اپنے محبوب شاگردوں پر ان کی عنایتیں کبھی ختم نہ ہوتیں۔ ہفتہ میں دو دن ہم سب ڈاکٹر صاحب کے دئے ہوئے موضوع پر مضمون لکھ کر کلاس میں سناتے۔ نوجوانوں کی تحریروں پر ان کا عام تبصرہ یہ ہوتا کہ ہمارے نوجوان ادیب الفاظ کے انتخاب اور استعمال میں سخت بے احتیاطی برتتے ہیں۔ پامال الفاظ کے استعمال اور ایک ہی لفظ کی بار بار تکرار سے انھیں چڑھ تھی۔ ایک بار میں نے کہیں لکھ دیا تھا۔ "یہ پریس بہت اچھی تھی"۔ اس پر زور صاحب نے فرمایا۔ پریس مونث نہیں مذکر لکھئے۔" میں نے اطمینان کے لئے پوچھا کہ صاحب۔ انگریزی الفاظ کی تذکیر و تانیث کے لئے بھی اردو میں کوئی ضابطہ ہے —؟

اس پر زور صاحب نے بتایا تھا کہ اس کے لئے کوئی قواعدی اصول تو نہیں لیکن رسمی اصول یہ ہے کہ غیر ملکی لفظ کے معنی کی جو جنس ہماری زبان میں ہوگی وہی برقرار رکھی جائے گی۔

جیسے پریس کو اردو میں مطبع کہتے ہیں جو مذکر ہے۔ لہٰذا پریس بھی مذکر کہا جائے گا۔

زور صاحب نے ایک معمولی سے فقرے پر توجہ دے کر ایسے دلنشیں انداز میں یہ کام کی باتیں سمجھائیں کہ میں پھر کبھی انھیں نہیں بھول سکا۔ ان کا پیریڈ جب ختم ہوتا اور ہم ان کے کمرے سے نکلتے تو واقعی دل کو ڈھارس سی ہوتی کہ ہم بہت کچھ سیکھ کر نکلے ہیں۔

ڈاکٹر زور کی ذہانت خداداد تھی۔ پڑھاتے وقت کبھی ان کے سامنے کوئی کتاب نہ ہوتی۔ وہ صرف سنتے رہتے اور مضمون سے متعلق بے شمار تبصرے اور معلومات سناتے رہتے۔

۱۹۵۵ء میں چادرگھاٹ کالج کے رسالہ "فکر نو" کے لئے انھوں نے ایک مضمون دینے کا وعدہ کیا اور شرط یہ رکھی کہ میں لکھتا جاؤں اور وہ بولتے جائیں گے۔ ابھی انھوں نے چند سطریں لکھوائی ہوں گی کہ چپراسی دفتری کاغذات اور فائلیں لے آیا۔ زور صاحب دستخط کرنے سے قبل فائلوں پر بھی نظر ڈالتے جاتے اور مضمون بھی لکھواتے رہے۔ اسی طرح درمیان میں طلبا اور ان کے دیگر دوست احباب ملتے رہے جس سے مضمون کا تسلسل کئی کئی بار ٹوٹا لیکن زور صاحب اطمینان سے اسی طرح لکھواتے رہے۔ حوالے اور سنین انھیں ایسے ازبر تھے کہ کسی کتاب کی مدد کے بغیر انھوں نے تاریخی مثنوی "قصہ طالب و موہنی" پر ایک جامع مضمون لکھوا دیا۔

وہ طلباء کی صلاحیتوں کا اندازہ خوب لگا لیتے تھے۔ یوم قلی قطب شاہ کے جشن کے انتظامات کے لئے کئی طلباء زور صاحب کے سامنے اپنی خدمات پیش کرتے اور وہ ان کی صلاحیتوں کے مطابق فوری ان میں کام تقسیم کر دیتے۔ یوم قلی قطب شاہ کی تیاریوں میں طلباء سے لے کر وزرا تک سب مصروف ہوتے اور سب کا باہمی رابطہ ہوتے۔ زور صاحب! یوم قلی قطب شاہ کی تیاریوں کے سلسلے میں ان کے سب سے بڑے معاون نواب زین یار جنگ مرحوم تھے۔

نواب صاحب کی وفات پر ایوان اردو میں ایک تعزیتی جلسہ منعقد ہو رہا تھا۔ زور صاحب نے اعلان کیا کہ سب سے پہلے میں نواب صاحب مرحوم کے بارے میں اپنے خیالات ظاہر کروں۔ اس فوری اعلان سے مجھ پر اچھی خاصی گھبراہٹ طاری ہو گئی۔ لیکن میں نے اپنے آپ کو سنبھالا تاکہ زور صاحب نے جس توقع کے باعث مجھے حکم دیا ہے وہ پوری ہو سکے۔ جلسہ کے اختتام پر حسب معمول انھوں نے نہایت شفقت سے پیٹھ تھپتھپائی لیکن اس دن وہ نواب زین یار جنگ کی ان اچانک جدائی سے بے حد افسردہ تھے۔ زور صاحب نے ایک گہری سانس لے کر ابا سے کہا ـــ

ـــ "حیرت صاحب! میں قدرت کو غیر منصف تو نہیں کہتا لیکن کم از کم اسے ہر انسان کو اتنی مہلت تو دینی چاہئے کہ وہ اپنے بکھرے ہوئے ادھورے کاموں کی تکمیل اپنے ہاتھوں سے کر سکے"۔ پھر ذرا توقف سے بولے ـــ "مولانا عجب بات ہے کہ ہمارے خاندان کے بیشتر بزرگوں نے ۶۵ برس ہی کی عمر پائی۔ یوں تو مشیت ایزدی کے نظام میں کسی کو دخل نہیں لیکن مجھے بھی کچھ ایسا ہی یقین ہے کہ اس حساب سے میرے بھی اب یہاں چھ سات برس ہی باقی رہ گئے ہیں جس میں مجھے بہت کچھ کرنا ہے"۔ ابا نے بڑی تسلی دی اور کہا ـــ "ماشاء اللہ آپ کے قویٰ بہت اچھے ہیں اور آپ ان مذموم عادتوں کے شکار بھی نہیں جو ہمارے اکثر ادیبوں اور شاعروں کو لے ڈوبتی ہیں"۔ اس پر خوش دلی سے قہقہہ لگا کر پان منہ میں رکھا اور بولے:

ـــ "خدا آپ کی زبان مبارک کرے بہت سے حضرات میری صحت پر رشک کرتے ہیں اور واقعی یہ شروع سے میری پرہیزگاری کا نتیجہ ہے"۔

حاضرین میں سے کسی کے حاشیۂ خیال میں بھی نہ تھا کہ آنے والے سال ہی زور صاحب ساتھ چھوڑ جائیں گے۔ اپنے بچوں اور شاگردوں کے مستقبل کی انھیں ایک سی فکر تھی۔ کشمیر سے ابا کے نام جو بھی خط آتا اس میں میری مصروفیات کے بارے میں اور خاص دلچسپی کا اظہار ہوتا۔ ۱۹۶۱ء میں جب میں "مجلہ عثمانیہ" کا ایڈیٹر منتخب ہوا تو رسالہ لے کر زور صاحب کی خدمت میں پہنچا۔ ایوان اردو میں اس وقت سردار پانیکر مدعو تھے اور زور صاحب ان کے ساتھ بے حد مصروف تھے۔ میں نے سوچا کسی فرصت کے وقت مل لوں گا لیکن انھوں نے رسالہ میرے ہاتھ میں دیکھ لیا اور قریب آ کر بڑی گرمجوشی سے

گلے لگا کر کہا ۔ عجیب آدمی ہو تم بھی اتنے دن بعد مجلہ لائے اور وہ بھی شاید واپس لے جانے کا ارادہ تھا جو مجھے بتایا نہیں ۔ میں سخت شرمندہ ہوا اور سوچنے لگا کہ یہ کیسی عظیم شفقت ہے جس نے زبان کے ایک ادنی ترین طالب علم کو مسلم الثبوت محقق کی نظروں میں قابل التفات بنایا ہے ــ ؟

دوسرے سال جب میں دوبارہ مجلہ عثمانیہ کا ایڈیٹر منتخب ہوا تو انھیں بڑی بے چینی سے رسالہ کا انتظار تھا لیکن قدرت کو یہی منظور تھا کہ رسالہ کی طباعت کے آخری مرحلوں پر اس میں زور صاحب کی تعزیت بھی شامل کی جائے ۔ زور صاحب کے انتقال کے ہفتہ بھر بعد ہی مجلہ ان کے غم میں سوگوار اور اشکبار نکلا ۔ لیکن اس کا اصل قدرداں اب بہت دور جا چکا تھا ــ !

زور صاحب ایک ہمدرد اور شفیق پرنسپل تھے ۔ طلباء ان کے پاس جو بھی درخواستیں لے جاتے وہ ان پر اکثر "حسب قاعدہ" لکھ دیا کرتے ۔ طلباء کی ایسی درخواستیں عموماً تعلیمی وظیفوں اور مالی امداد سے متعلق ہوتیں اور زور صاحب اپنے ہاتھوں کسی کی درخواست رد نہیں کرتے تھے' وہ چاہتے تھے دفتر میں ان طلباء کے ساتھ حتی الامکان انصاف ہو۔ اسی لئے "حسب قاعدہ" لکھ کر وہ خود بھی مطمئن ہو جاتے اور طلباء بھی مایوس نہ ہوتے ۔

زور صاحب کا "حسب قاعدہ" چادر گھاٹ کالج میں آج تک مقبول ہے ۔

لیکن میں حیران ہوں کہ اصولوں کی پابند ایسی عظیم شخصیت جو عمر بھر "حسب قاعدہ" کی پابند رہی اس کے ساتھ قدرت نے اچانک ایسی بے قاعدگی کیونکر برتی ــ ؟ ۔

وہ ایک فرد نہیں ایک ادارہ ایک انجمن اور نظام تھے ۔ انھوں نے اپنی زندگی میں طالب علمی کی زندگی سے لے کر آخری دم تک ادب و ثقافت کی جو پرخلوص خدمت کی اور جس مستحکم بنیاد پر اپنے اداروں کی بنیادیں رکھیں وہ دوسروں کے لئے شمع ہدایت ہونا چاہئے ۔

میرے ان کے تعلقات ایک ربع صدی سے زیادہ تھے اور اکثر وہ اندھیری آ کر غریب خانہ کو مطلع انوار بنا دیتے تھے ۔

اب ان کے اداروں کے ذمہ دار اصحاب کا یہ فرض ہے کہ وہ اس شمع کو جسے مرحوم نے اپنے خون جگر سے روشن کیا تھا تاباں و درخشاں رکھیں ۔

نجیب اشرف ندوی

کنور مہندر سنگھ بیدی سحرؔ

ڈاکٹر زورؔ سے چار ملاقاتیں

ڈاکٹر محی الدین قادری زورؔ سے میری پہلی ملاقات نہایت غیرشاعرانہ ماحول میں ہوئی۔ ۱۹۶۱ئہ کے مارچ میں کثرتِ اولاد کی روک تھام کے سلسلے میں حیدرآباد دکن میں ایک کانفرنس ہوئی۔ میں بھی پنجاب کی جانب سے اُس میں شریک ہوا۔ جناب بھیم سین سچر اُن دنوں آندھرا پردیش کے گورنر تھے اور مجھے اُنھیں کے ہاں ٹھہرنے کا شرف حاصل ہوا۔ دہلی میں ڈاکٹر زورؔ کی قابلیت۔ ملنساری اور مہمان نوازی کے چرچے ہوتے رہتے تھے۔ میرے عزیز دوست جگن ناتھ آزادؔ نے بھی اُن کی بہت تعریف کی تھی چنانچہ اُن سے ملنے کی خواہش قدرتی ہی نہیں بلکہ لازمی بات تھی۔ پہلی ہی فرصت میں میں نے اپنے بزرگ قبلہ حیرتؔ بدایونی سے اشتیاقِ ملاقات کا اظہار کیا۔ چنانچہ حیرتؔ صاحب مجھے اپنے ساتھ ایوانِ اُردو لے گئے۔ ڈاکٹر زورؔ کا دولت کدہ بھی بغل میں ہی تھا۔ میرے ذہن نے جو غائبانہ تصویر ڈاکٹر زورؔ کی کھینچ رکھی تھی وہ اس سے بالکل مختلف نکلے۔ میں تو یہ سمجھا تھا کہ اتنی شہرت اور علم کے مالک مولانا نما ریش دار بزرگ ہوں گے لیکن اُن کا شفاف چہرہ اور خندہ پیشانی کو دیکھ کر یوں محسوس ہوا جیسے کسی باوقار سُلجھے ہوئے رند سے ملاقات ہو رہی ہے۔ مزید ملاقاتوں اور صحبتوں نے ثابت کیا کہ وہ باوقار بھی تھے سُلجھے ہوئے بھی تھے اور ان اوصاف کے علاوہ اور بہت سی خوبیوں کے حامل تھے لیکن رند نہ تھے۔ البتہ رندوں سے نفرت بھی نہیں کرتے تھے۔ جوشؔ ملیح آبادی سے اُن کی گہری دوستی اس امر کا ناقابلِ تردید ثبوت تھی۔

پہلی ہی ملاقات میں وہ مجھ سے اس طرح گھل مل گئے جیسے پُرانے دوست ہوں۔ اِدھر اُدھر کی چند رسمی باتوں کے بعد مجھے ایوانِ اُردو کے مختلف شعبوں میں لے گئے اور ایک ایک نادر تصنیف اور نسخے کی تاریخ بتائی۔ ایوانِ اُردو کو اُس کی موجودہ سرفرازی تک پہنچانے کے لیے کتنی محنت ڈاکٹر زورؔ نے کی ہوگی اِس کا اندازہ وہی لوگ کر سکتے ہیں جنھیں اس زبان سے محبت ہے۔ میں کبھی اُن نسخوں اور تصاویر کی طرف دیکھتا تھا اور کبھی ڈاکٹر زورؔ کے چہرے کی سمت۔ ایسا محسوس ہوتا تھا کہ جیسے کوئی بزرگ اپنے مہمانوں سے اپنی اولاد کا تعارف کرا رہا ہو اور تعارف کراتے کراتے نہایت بے تکلفی اور صاف گوئی سے ہر ایک کے معائب و محاسن کا ذکر بھی کر رہا ہو۔ ڈاکٹر زورؔ کا شفاف چہرہ بجا فخر کے ساتھ دمک رہا تھا اور اُن کی نورانی پیشانی اور مطمئن نگاہیں یہ تسلیم کرنے پر مجبور کر رہی تھیں کہ اُنھوں نے اُردو کی خاموش مگر ٹھوس خدمت کی ہے۔

میرا قیام حیدرآباد میں چار روز کا تھا اور ہر روز ڈاکٹر زورؔ سے ملاقات ہوتی رہی۔ اُنھوں نے از راہِ مہمان نوازی ایک مخصوص نشست کا انتظام بھی میرے اعزاز میں کیا جہاں مجھے حیدرآباد کے شعرا اور ادب نواز حضرات سے ملنے کا موقعہ ملا۔ اس موقع پر جو تقریر ڈاکٹر زورؔ نے مجھ سے متعلق کی اُسے میں کبھی فراموش نہیں کر سکتا۔ مَیں کیا ہُوں میں جانتا ہوں لیکن اُنھوں نے

اس حد تک بڑھ چڑھ کر مجھے نوازا کہ مجھ میں شدت سے احساس کمتری پیدا ہوا اور کسی حد تک ندامت بھی ہوئی کہ اُردو کے ایک بڑ محسن نے مجھ پر محض اس لیے کرم فرمایا کہ مجھے اُردو سے محبت ہے حالانکہ میں اس کی کوئی خدمت نہیں کر سکا۔ ان چار ایام میں ادبی مو کے باوجود ڈاکٹر زورؔ نے سیر و سیاحت میں بھی میری رہنمائی کی۔ قبلہ حیرت بدایونی بھی ساتھ رہے۔ حیدر آباد کے مختلف مقامات کا موقع ملا۔ اُن کی روایات اور تواریخ سے ڈاکٹر زورؔ بخوبی واقف تھے جس سے سیر و سیاحت کے لطف میں اضافہ ہوا۔ قبلہ حیرت اور ڈاکٹر زورؔ مرحوم بہت بے تکلف دوست تھے۔ اِن کے آپس میں طنزیہ و مزاحیہ جملے اور فقرہ بازی سے صحبت زعفرا ہو جاتی تھی۔ یوں معلوم ہوتا تھا جیسے پھول برس رہے ہوں۔ ڈاکٹر زورؔ کے مذاق میں پارسائیت تھی لیکن قبلہ حیرت تو با بات میں پیرِ مغاں کے بھی کان کترتے تھے۔ ضمناً یہ بھی عرض کر دوں کہ قبلہ حیرت بدایونی پہلے ایسے پارسا ہیں جو رند کی صحبت سے لطف اندوز ہوتے ہیں لیکن خود پینے سے کوسوں بھاگتے ہیں۔

کانفرنس کے ختم ہونے پر بادلِ ناخواستہ واپس لوٹنا پڑا۔ قبلہ حیرت اور ڈاکٹر زورؔ ہوائی اڈہ تک پہنچانے آئے او دوبارہ حیدر آباد حاضر ہونے کا وعدہ حاصل کیا۔ میں نے گزارش کی کہ چونکہ مجھے فرائضِ منصبی کسی طویل غیر حاضری کی اجاز نہیں دیتے اس لیے ایک برس میں ایک بار جب وہ حکم کر دیں گے حاضر ہو جایا کروں گا کسے معلوم تھا کہ یہ ہماری پہلی اور آخ ملاقات تھی۔

واپس سنگرور لوٹ کر میں نے ڈاکٹر زورؔ کی خدمت میں ایک طویل عریضہ بھیجا جس میں اُنھیں ہدیۂ تشکر پیش کرنے کے سنگرور تشریف لانے کی دعوت بھی دی۔ اُنھوں نے بشرطِ فرصت تشریف لانے کا وعدہ فرمایا۔

یہ نامہ و پیام کا سلسلہ کافی عرصہ تک جاری رہا۔ ڈاکٹر زورؔ کبھی کبھی مجھ سے اپنے ذاتی معاملات کے بارے میں بھی مشو طلب فرمایا کرتے تھے۔ چنانچہ سرکار کشمیر میں ملازمت حاصل کرنے سے پہلے دیگر بہی خواہوں کے علاوہ مجھ سے بھی رائے طلب میں نے کشمیر چلے جانے کے حق میں مشورہ دیا۔ میں محسوس کرتا تھا اور میں اس احساس میں غالباً ہزاروں لاکھوں کے جذبات کی کر رہا تھا کہ ایسے ذی علم و محقق زبان داں کی ضرورت مُلک کے گوشے گوشے کو ہے اور اگر وہ کشمیر پہنچ کر اُردو زبان کی فلاح و کے لیے کچھ کر سکیں تو سارے مُلک پر احسان ہوگا۔

ڈاکٹر زورؔ انکساری اور عجز کا مجسمہ تھے اور نام و نمود کی خواہش سے کوسوں دُور رہتے تھے۔ میں نے ایک بار اُن سے دریا کیا کہ آپ شعر کیوں نہیں کہتے۔ فرمانے لگے کہ وہ شعر اس لیے نہیں کہتے کہ وہ اپنے اشعار کو معیار سے کم سمجھتے ہیں۔ اگر وہ اشعار تو بہت اچھے ہونے چاہیں لیکن چونکہ اُنھیں اپنے اشعار میں خامیاں نظر آتی ہیں اس لیے شعر کہنا چھوڑ دیا ہے۔ اِس کے بر میں ایسی مثالیں بھی پیش کرتا ہوں جہاں بعض حضرات نے اپنی اچھی بُری شاعری لوگوں پر محض اِس بنا پر نازل کرنے کی کو کی ہے کہ دُنیا اُنھیں اُردو کا خدمت گزار تصور کرتی ہے۔ ڈاکٹر زورؔ یہ فرمایا کرتے تھے کہ زبان کی خدمت شاعری کے علاوہ طریقوں سے بھی ہو سکتی ہے چنانچہ ایوانِ اُردو اُن کے اس دعوے کی جیتی جاگتی دلیل ہے۔

اُن کی وفات سے چند روز پہلے مجھے سری نگر جانے کا اتفاق ہوا۔ میں نے جاتے ہی اپنے ایک دوست سے اُن کے دولت کا پتہ لگانے کی درخواست کی۔ کچھ دیر کے بعد میرے دوست واپس آئے اور فرمانے لگے کہ ڈاکٹر زورؔ ابھی ابھی حیدر آباد جا کے لیے ہوائی اڈہ کی سمت روانہ ہو گئے اور جاتے ہوئے یہ فرما گئے ہیں کہ کنور بھائی سے کہہ دیجیے گا کہ واپسی پر ملاقات ہو گی نہیں کیوں لیکن میرے دل نے مجبور کیا کہ ڈاکٹر زور سے مل لو پھر خدا معلوم کیا ہو جائے چنانچہ میں فوراً ہی موٹر لے کر ہوائی اڈ

لیکن وائے قسمت کہ میرے پہنچنے سے دو تین منٹ پہلے ہوائی جہاز پرواز کرچکا تھا۔ میں مایوس ہوکر واپس لوٹا اور ہوٹل میں پہنچتے ہی انھیں ایک خط لکھا۔ خدا کو کچھ اور ہی منظور تھا۔ مجھے سری نگر سے قبل از وقت لوٹنا پڑا۔ دو تین دن کے بعد ہی ڈاکٹر زور کی وفات کی منحوس خبر سنی اور دل تمام کر رہ گیا۔

ڈاکٹر زور کی یاد اُن کے ہزاروں لاکھوں مداحوں کی طرح میرے دل میں بھی ہر وقت تازہ رہے گی۔ اُن کی نیک سرشت ان کی محنت۔ قابلیت۔ تحقیق اور مشقت اردو سے دلچسپی رکھنے والوں کے لئے مشعل راہ کا کام دیگی اور جب تک اردو زندہ ہے ڈاکٹر زور بھی زندہ رہیں گے۔

آخر میں میں اُس نظم کے چند اشعار ضرور درج کروں گا جو میں نے حیدر آباد دکن اور اہل حیدر آباد سے متاثر ہوکر ڈاکٹر زور کی خدمت میں الوداعی ہدیہ کے طور پر پیش کی تھی :

جہاں ہر کلی اک مہکتا چمن ہے
جہاں فرد اپنی جگہ انجمن ہے
جہاں شوخیاں ہیں ادائے بھبن ہے
جہاں سادگی میں بھی اک بانکپن ہے
جہاں شعریت ہے جہاں قدر فن ہے
جہاں علم و فن کے لئے اک لگن ہے
جہاں کی زمیں رشک چرخ کہن ہے
جہاں ذرے ذرے میں مشک ختن ہے
جہاں زور و حیرت کا بھی اب وطن ہے
جہاں انجمن واقعی انجمن ہے
جو سچ پوچھئے ہو سحر تو وہ خطہ
دکن ہے دکن ہے دکن ہے دکن ہے

کاش کہ میں اپنے جذبات کو الفاظ کا جامہ پہنا سکتا۔ انسان کی زندگی میں چند ایسے مقام بھی آتے ہیں جہاں دل روتا ہے آنکھیں ساتھ نہیں دیتیں جہاں جذبات کا بے پناہ ہجوم ذہن کے تنگ راستے سے الفاظ بن کر نکل نہیں سکتا جہاں صبر اور صرف صبر کے سوا اور کوئی معاون و مددگار نہیں ہوتا۔ یقیناً یہ بھی ایک ایسا ہی مقام ہے۔ خدا کرے کہ ہم مرحوم و مغفور کے نقش قدم پر چل سکیں۔

میر یٰسین علی خاں

چند یادیں ــ چند آہیں

زور صاحب کو حیدرآباد میں کون نہیں جانتا تھا، اسی طرح میں بھی جانتا تھا لیکن ۱۹۴۶ء کے اواخر میں پہلی مرتبہ ان سے ملنا ہوا اور وہ بھی اس طرح کہ اس وقت میں نیاز فتحپوری صاحب کی فرمایش پر داغ مرحوم کی اٹھارہ سالہ حیدرآبادی زندگی پر مضمون لکھ رہا تھا۔ اس سلسلہ میں مجھے داغ سے متعلق غیر مطبوعہ مواد کی تلاش تھی۔ اسی جستجو میں سب سے پہلے مرزا داغ مرحوم کے پاس وہ سارا قلمی مواد لے کر پہنچا جو خاندانی ورثہ کے طور پر مجھ تک پہنچا تھا۔ اور وہ ساری باتیں بھی ان کے آگے کہیں جو رفیقانِ داغ اور ان کے معاصرین سے سنی تھیں۔ اور قدیم تذکروں۔ رسالوں اور دکنی تاریخوں سے برسوں میں جمع کیا ہوا مواد بھی پیش کیا۔ مرزا صاحب نے قلمی مواد کو سرسری طور پر شروع سے آخر تک دیکھ ڈالا اور مجھ سے مخاطب ہو کر فرمایا یہ باتیں جو تم کو یاد ہیں من وعن قلم برداشتہ لکھ ڈالو اور فی الحال یہ سارا مواد جو تم لائے ہو میرے پاس چھوڑ جاؤ۔ میں ترتیب دے لوں گا اور ہفتہ عشرہ بعد جب تم اپنا نوشتہ مجھے دے دو گے تو تمہارے حوالے سے ایسا مضمون لکھ ڈالوں گا کہ یادگار رہے گا۔ میں تو یہ سوچ کر مرزا صاحب کی خدمت میں حاضر ہوا تھا کہ یہ دلی والے ہیں۔ ڈپٹی نذیر احمد اور داغ کی آنکھیں دیکھی ہیں۔ بہت کچھ ان سے حاصل کر کے خوش خوش گھر لوٹوں گا۔ مگر وہاں معاملہ ہی برعکس نکلا۔ اس وقت ایک حقیقت میرے کام آئی۔ میں نے عرض کیا داغ سے متعلق اس مواد کا ذکر ڈاکٹر غلام یزدانی صاحب سے کر چکا ہوں اور وہ بھی اسے ایک نظر دیکھنا چاہتے ہیں۔ ان کے ملاحظہ کے بعد آپ کو دے دوں گا۔ مرزا صاحب یہ سن کر خاموش ہو گئے اور میں وہاں سے چلا آیا۔ دوسرے دن بعد اس ملاقات کا ذکر میں نے ڈاکٹر غلام یزدانی صاحب سے کیا۔ یہ سنتے ہی ایک چمک سی ان کی آنکھوں میں پیدا ہوئی اور مسکرا کر فرمایا۔ تم وہاں کیوں گئے۔ مجھ سے پوچھ لیا ہوتا۔ اب تم خود یہ کام کرو۔ اور جو کچھ مجھے معلوم ہے وہ میں بتا دوں گا۔ دو تین دن تک میرے اوراق پریشاں دیکھ کر مجھے بتا دیا کہ ان سرخیوں کے تحت اس مواد کو پھیلا لو اور جلد از جلد مضمون لکھ ڈالو۔ دس پندرہ دنوں میں میرا مضمون تیار ہو گیا۔ ڈاکٹر یزدانی صاحب نے اسے دیکھ لینے کے بعد فرمایا اب ایک کام اور کرو۔ ڈاکٹر زور صاحب کے کتب خانے میں قلمی اور مطبوعہ دکنی کتابیں موجود ہیں۔ ان کتابوں میں داغ صاحب کی موافقت اور مخالفت میں لکھا ہوا بہت کچھ ملیگا۔ اس کی سیر ضروری ہے۔ اور یہ بھی کہا کہ زور صاحب سے ضرور ملو۔ ان کا مطالعہ وسیع ہے اور دکنی ادب کے وہ رسیا ہیں بہت کچھ خود بتا سکیں گے۔ یہ سن کر زور صاحب سے ملنے کا اشتیاق میرے دل میں پیدا ہوا اور تعطیل کے دن شام کے چار بجے ادارۂ ادبیات اُردو پہنچا۔ مولوی جمال الدین صاحب مہتمم ادارہ سے ملاقات ہوئی۔ میں نے اپنا کام بتا کر ڈاکٹر زور صاحب سے ملنے کی خواہش کی۔ جمال الدین صاحب نے بتایا کہ ڈاکٹر زور ابھی باہر سے آئے ہیں اور شاید آرام لے رہے ہوں گے۔ میں نے کہا میرا کارڈ بھیج دیجئے اور ان سے

یا اس وقت اگر تکلیف ہوتی ہو تو وقت مقرر فرما دیا جائے میں حاضر ہو جاؤں گا۔ تھوڑی دیر بعد ایک ملازم دوڑتا ہوا
مجھ سے کہنے لگا صاحب نے آپ کو بلایا ہے۔ میں رہائشی بنگلہ کی طرف دس بیس قدم چل کر پہنچا تو کیا دیکھتا ہوں کہ
زور صاحب چھوٹے سے ورانڈے میں بت کی طرح خاموش کھڑے ہوئے مجھے دیکھ رہے ہیں۔ میں جب قریب پہنچا اور
ٹ (خالص) حیدرآبادی سلام بجالایا تو خندہ پیشانی سے میری طرف بڑھتے ہوئے مصافحہ کے لئے ہاتھ آگے بڑھا دیا۔ اور
نگ روم میں لیجا کر اپنے پاس بٹھا لیا۔ مختصر سے تعارف کے بعد مجھ سے پوچھنے لگے فرمائیے کیسے آنا ہوا۔ اور آپ کے ہاتھ
کاپی کیسی ہے۔ میں نے سب کچھ بتا دیا۔ اور مجھے کچھ ایسا محسوس ہونے لگا کہ داغ کا نام سنکر زور صاحب کچھ ٹھنڈے پڑگئے
نے وہ کاپی جلدی سے ان کے ہاتھ میں دے دی۔ یک گونہ بے دلی کے ساتھ کاپی کے اوراق الٹ الٹ کر دیکھتے رہے اور
طرف مخاطب ہو کر کہنے لگے آپ نے یہ مضمون داغ پر کیوں لکھا ہے۔ میں نے کہا داغ کی اٹھارہ سالہ حیدرآبادی زندگی پر
کسی نے سیر حاصل مضمون نہیں لکھا ہے۔ کہنے لگے۔ تو پھر آپ کیسے لکھ سکیں گے۔ میں نے کہا اس مضمون کا بیشتر مواد
دستاویزی ہے جو مجھے اپنے خاندانی ورثہ میں ملا ہے۔ اور اب میں چاہتا ہوں کہ آپ کے پاس سے بھی مجھے کارآمد مواد
ے تو اسے بھی شامل کرلوں۔ اور یہ کام آپ کی رہبری میں ہو۔ میرا یہ کہنا تھا کہ زور صاحب کے چہرے پر بشاشت سی
میرا سارا شجرۂ خاندان گنا دیا۔ اور کہنے لگے آپ سمجھتے ہوں گے میں بھول گیا ہوں۔ مجھے خوب یاد ہے آپ ان ہی
نے ہیں تاجن کا ذکر داغ کے سلسلے میں نواب عزیز یار جنگ بہادر بار بار کیا کرتے تھے۔ اور آپ ہی وہی ہیں تا جب
مارہروی صاحب کے متعدد خطوط کی بنا پر نواب عزیز یار جنگ مرحوم نے آپ سے داغ کے غیر مطبوعہ خطوط اور ایسی ہی دوسری
مانگیں تو آپ نے صاف انکار کر دیا تھا۔ یہ کہہ کر ڈاکٹر صاحب اٹھ کھڑے ہوئے۔ یہ سمجھ کر کہ اب ڈاکٹر صاحب رخصت
ہیں میں نے کہا اچھا اب اجازت دیجئے پھر کسی وقت حاضر ہو جاؤں گا۔ زور کا قہقہہ لگا کر ہنسے اور کہا رفتن باجازت
اندر چلے گئے۔ اور دو چار منٹ ہی گزرے ہوں گے کہ خود پاندان ہاتھ میں سنبھالے ہوئے شیروانی اتار کر برآمد ہوئے۔ پان
لے مجھے دیا پھر خود کھایا۔ اور باتوں کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ اتنے میں چائے بسکٹ کچھ موز اور سیب آگئے۔ اور چائے نوشی
ساتھ باتیں ہوتی رہیں اور باتوں باتوں میں مجھے ٹٹولتے بھی رہے کہ یہ کس پایہ کا دکنی ہے اور اپنے وطن کی قدیم معاشرت
اور زندہ روایات سے اسے کتنی محبت ہے۔ جب ان کو یقین سا ہو گیا کہ یہ ٹھیٹ دکنی ہے تو کہنے لگے آپ حیدرآبادی
ں اور ادیبوں اور دکنی ادبی ماحول پر کیوں نہیں لکھتے۔ جن کا آپ پر حق ہے۔ میں نے کہا ڈاکٹر صاحب وہی تو لکھ رہا
میرے اس مضمون میں داغ کی اٹھارہ سالہ زندگی اور اس وقت کے حیدرآبادی ماحول کی ایسی تصویریں نظر آئیں گی جو کسی
ں نہیں ہیں۔ میرے اس جملے پر چونک سے گئے اور پوچھنے لگے میری یا اس ادارے کی کون کون سی کتابیں دیکھی ہیں۔ میں نے
کتابوں کے نام گنائے اور مرقع سخن کا بھی ذکر کیا اور یہ بھی کہا کہ اور بھی بہت سے مشہور شاعر اور ادیب ہیں جو آپ کی
سے اوجھل ہو رہے ہیں۔ چہرہ سرخ ہو گیا مگر بڑی ملائمت سے فرمانے لگے وہ کون ہیں۔ میں نے کہا مثلاً تفضل نادان
ر۔ نواز۔ اور عورتوں میں امتیاز۔ سکندر وغیرہ ایسے بیسیوں ہیں جنھیں کوئی جانتا بھی نہیں۔ تھوڑی دیر تک
سے میرا منہ تکتے رہے پھر کہا ان کا ذکر کن کتابوں میں ہے۔ میں نے بتایا بعض کا کلام اور قلمی تالیفات میرے پاس
امتیاز کی مثنوی اور سکندر کی تصنیفات بھی میرے پاس ہیں۔ اور بعض مطبوعہ تصانیف بھی ہیں ڈاکٹر صاحب کو

شاید اس وقت میری باتوں کا یقین نہ ہوا اور خاموش ہوگئے۔ میں چلنے لگا تو گیٹ تک میرے ساتھ آئے اور فرمایا کل شا
پانچ بجے آجائیے آپ کے مطلب کی کتابیں نکلوا کر رکھوں گا۔ میرے مضمون کی کاپی میرے ہاتھ سے لے لی اور کہا میں کل تک
اسے بھی پڑھ ڈالوں گا۔ میں سنا کرتا تھا کہ ڈاکٹر صاحب کسی قدر گرم مزاج۔ کم آمیز اور زود رنج انسان ہیں مگر میں نے
پہلی ہی ملاقات میں ان کو متوازن المزاج۔ ہنس مکھ۔ درد آشنا اور صاف گو انسان پایا۔ اس کے بعد کی دو چار ملاقاتوں
کے بعد تو مجھے ایسا محسوس ہونے لگا کہ مجھ جیسے بے بضاعت آدمی کی ان جیسے بلند قد انسان سے جنم جنم کی شناسائی
دوسرے دن میں بروقت ان کے پاس پہنچا تو کہنے لگے میں نے آپ کا سارا مضمون پڑھ لیا ہے۔ اس کی نیاز صاحب
قدر کر سکتے ہیں۔ اب آپ داغ کی زندگی کے کسی ایک پہلو پر اس میں سے کچھ لکھ کر بھیج دیجئے اور باقی خود اپنے لئے اٹھا رکھئے
ویسا ہی کیا۔ اس کے بعد ڈاکٹر صاحب نے میرے لئے یہ سزائے بامشقت تجویز فرمائی کہ میں ناصر الدولہ سے لے کر محبوب علی
کے دور تک کے حیدرآبادی شاعروں، مشاعروں، ادیبوں، ادبی محفلوں اور علمی کارناموں وغیرہ سے متعلق ایک کتاب
لکھ دوں اور اپنے دادا کا دیوان بھی شائع کر دوں۔ ڈیڑھ دو سال تک بڑی محنت سے اس قسم کا چیدہ چیدہ مواد جمع کرتا
اور ڈاکٹر صاحب کو وقتاً فوقتاً دکھاتا بھی رہا اور اس کی اشاعت کی غرض سے آج سے کئی برس پہلے ڈاکٹر صاحب نے را
رائے جانکی پرشاد صاحب کے ایما سے ادارہ کی کمیٹی سے سات آٹھ سو روپے بھی منظور کروا لئے تھے۔ مگر میری عدیم الفر
مجھے ڈاکٹر صاحب کی زندگی میں ان کے پیش لفظ کے ساتھ ایک ایسی کتاب کے منظر عام پر لانے سے قاصر ہی رکھا جس کا
عمر بھر افسوس ہی رہے گا۔

خصوصاً ۱۹۵۴ء سے ڈاکٹر صاحب کی روز افزوں شفقتوں نے مجھے اس قدر رام کر لیا تھا کہ ہفتہ میں تین چار د
حاضری لازمی ہوگئی تھی۔ ڈاکٹر صاحب نے میری ملاقات کا وقت رات کے ۸ ½ بجے مقرر کر رکھا تھا جب کہ وہ ادارے کے
اور دوسری مصروفیتوں سے فارغ ہو کر اپنے لکھنے پڑھنے کے کمرے میں تخت پر گاؤ تکیے سے لگے چار زانو بیٹھے ہوئے تازہ وارد
کتابوں پر نوٹ لکھا کرتے تھے یا باہر سے آئے ہوئے خطوط کے جواب اپنے قلم سے لکھتے تھے یا خود اپنے زیر اشاعت مضامین
دوسروں کی شائع ہونے والی کتابوں کے مسودے یا پروف دیکھا کرتے تھے۔ یا پھر اپنے ادارے یا اردو کی ترویج اور توسیع کے
اہل ملک کی تجاویز اور حکومتوں کی دادرسی کے عملی پہلوؤں پر غور کیا کرتے تھے۔ کبھی کبھی اپنے خواجہ تاشوں کے رویہ اور ب
پر لطف تنقیدیں بھی کیا کرتے تھے۔ بعض دفعہ ان ہی باتوں میں رات کے ۱۰ ½ بج جاتے اور میں کہتا ڈاکٹر صاحب بہت
ہوچکی آپ کو آرام کرنا چاہئے تو فرماتے آرام بے کاروں کے لئے ہے۔ انسان کی عمر تھوڑی ہے اور کام بہت کرنا چاہئے
ہنس کر فرماتے آپ بہت بیکار آدمی ہیں۔ کچھ نہیں کرتے۔ اپنے کاموں کی وجہ سے اگر میں زیادہ دن تک غائب رہتا تو
۶ بجے یا رات کے ۸ کے بعد ٹہلتے ہوئے میرے پاس آجاتے (چونکہ میں قریب ہی رہتا تھا) اور سب سے پہلا جملہ یہ ہوتا کہ
آپ سے بہت خفا ہوں۔ اور کبھی ایسا ہوتا کہ ٹیلیفون پر کہتے میں بہت خفا ہوں۔ میں اپنے عذرات پیش کرنا چاہتا
یہ کہہ کر ٹیلیفون رکھ دیتے کہ جب تک آپ خود آکر سبب نہیں بتائیں گے میں نہیں مانوں گا۔ ڈاکٹر صاحب کی نوازشوں
مجھے اس قدر جسارت عطا کر دی تھی کہ میں بعض دفعہ ان کے درپردہ سخت سے سخت مخالفین کے ساتھ چند اصولی باتوں پر
کرنے کا ادبی زبان سے مشورہ دیا کرتا اور بعض دفعہ یہ ثابت کرنے کی کوشش کرتا کہ جو باتیں مفسدوں نے آپ تک پہنچائی ہیں وہ

لا میں۔ پہلے تو بگڑتے اور جب دل کی بھڑاس نکل جاتی تو لمبا سانس لے کر کہتے ٹھیک ہے۔ یہ لوگ خود شرمندہ ہو جائیں گے۔
بجۂ بعض تحریریں جو کسی ناواجبی تنقید کے جواب میں پریس کو جا رہی ہوتیں یا ایسے جوابی خط جو سخت انداز میں لکھے جا چکے ہوتے
ن میں مناسب ترمیم کر دی جاتی یا وہ جزہی اڑا دئے جاتے جو ناگوار ہوں۔ جو کچھ میں نے اس وقت عرض کیا ہے اُس سے
نی خود نمائی منظور نہیں ہے بلکہ ڈاکٹر صاحب کے اُس سیرتی پہلو پر نظر پڑتی ہے کہ وہ پُرخلوص اور بےغرض مشوروں کی کتنی قدر
کرتے تھے۔ ورنہ کہاں میں اور کہاں ڈاکٹر زور۔ چہ نسبت خاک را بہ عالم پاک۔ اب میں زور صاحب کی دلکش اور بلندپایہ
نفیت کے تعلق سے ایسی چند باتیں لکھنا چاہتا ہوں جو دس پانچ برس قربت میں خود میں نے دیکھی ہیں اور ان کا تجزیہ بھی
پنے طور پر کیا ہے:۔

دوست احباب:۔ زور صاحب کے شناساؤں اور احباب کا حلقہ ان کے دل کی طرح وسیع تھا۔ اس میں عالم۔ فلسفی۔ شاعر۔ مورخ۔ ادیب۔ طالب علم۔ صوفی۔ پنڈت۔ مہنت۔ مولوی اور رند
لٹر۔ حکیم۔ عمائدین سلطنت۔ منسٹر۔ سیاسی لیڈر۔ صحافی۔ انجنیر۔ آرٹسٹ۔ پروفیسر۔ منجم۔ فوٹو گرافر۔ تاجر۔ امیر و
ریب۔ مفلس و فقیر سب شامل تھے۔ اور ہر ایک سے ان کی دوستی یا ملاقات اُس کی یا اپنی شان اور منشا کے مطابق
اکر تی تھی۔ دوسروں کی اغراض چاہے کچھ ہوں مگر انکی اپنی غرض ایک ہی تھی یعنی اُردو۔ اردو کا تحفظ۔ اردو کی ترقی۔
دو کا ملک بھر کی زبانوں سے سمجھوتا اور بھائی چارہ۔ قومی یک جہتی اور ملک کی ہمہ گیر ترقی میں اردو کی نمایاں کارگزاریاں
یوں۔ مورخوں اور شاعروں کی حوصلہ افزائی اور اپنے ادارے کے توسط سے دکھنی لٹریچر کی تاریخی اور ادبی حیثیت کا
یا۔ جس میں انھوں نے تلنگی کو بھی شامل کر لیا تھا۔

ڈاکٹر صاحب کے کام:۔ ڈاکٹر صاحب نے سب سے پہلا کام یہ کیا کہ دکنی ادب کو عوام اور خواص دونوں کے مذاق کو ملحوظ رکھتے ہوئے زمانے کی ضرورتوں کے مطابق ڈھالا اور اس کی عزت بھی قائم رکھی
۔ ایسے ادارے کی نہ صرف بنیا د ڈالی بلکہ خون پسینا ایک کرکے اس کو پروان چڑھایا۔ اور ایک ایسا ایوان بنایا جس میں صدیوں
وریں کھڑکی جھانک رہی ہیں۔ قدیم اسناد۔ فرامین اور مخطوطات کو گمنامی کے تہہ خانوں سے نکال کر بام عروج پر لا بٹھایا۔
ان اردو کی با مقصد نقاشی۔ بے زبان کتبوں کی اثر انگیز گفتگو ہیں۔ متقدمین اور متاخرین کی دلکش تصویریں الغرض ایوان کی
نے میں زور صاحب کے خون جگر کے وافر آب و رنگ کی موج در موج جھلک موجود ہے۔ ایک دن میں نے پوچھا ڈاکٹر صاحب یہ ڈوم
۔ نے کیوں بنوایا اس کی کیا ضرورت تھی۔ بعض لوگ اسے مقبرہ کہنے لگے ہیں۔ پہلی مرتبہ میں نے ڈاکٹر صاحب کی آنکھوں میں آنسو
نے پھر ہنسی آگئی۔ پان کی ایک گلوری منہ میں دبائی اور فرمانے لگے اس میں بھی ایک مصلحت ہے۔ شاید آج سے سو برس
یا اس سے پہلے ہی یہ ادارے بُھولے بسرے عجائب خانے بن جائیں گے۔ اگر یہ ڈوم (گنبد) قائم رہا تو متجسس نگاہیں
اس پر پڑیں گی اور لوگ اسے کوئی مندر۔ مسجد یا مقبرہ سمجھ کر دیکھنے آئیں گے۔ اور ان ہی میں ایسے لوگ بھی نکل آئیں گے جو
انمول خزانوں سے استفادہ کریں گے اور اس طرح دکن کی تاریخ پھر زندہ ہوگی۔ اور ہندوستان کا نام روشن ہوگا۔

ڈاکٹر صاحب کے سوچ بچار اور کام کرنے کا طریقہ:۔ ان کا ذہنی وجدان بالکلیہ عقلی تھا۔ تاریخی اور ادبی مطالعہ میں ڈاکٹر صاحب کا طریقہ عام روش سے جداگانہ تھا۔

وہ تاریخی واقعات سے صرف زمین کا کام لیتے تھے۔ اور عمارت کے لئے تذکرہ۔ سوانح عمری۔ رقعات۔ اسنادات۔ محاضرات کشکول۔ قدیم کتابوں کے مقدموں۔ شخصی تفصیلی۔ قصوں۔ کہانیوں۔ کتبوں اور ملکی اور غیر ملکی ماخذات سے واقعات کو روشن کرنے والی حقیقتوں کا کھوج لگاتے تھے۔ جاگیری وثیقوں اور پرانے احکام کے وسیع ذخیروں پر بھی ان کی نظر تھی۔ اس طر تاریخ اور افسانوں کو سمو کر ڈاکٹر صاحب نے ایک نیا اسلوب پیدا کیا تھا۔ اُن کے اس فن اور تاریخی مطالعہ کے انداز نظر سے عوا کی اکثریت نے بڑے ذوق و شوق سے استفادہ کیا۔ وہ اپنی پسند کا کام کرنے میں کبھی تھکتے نہیں تھے اور نہ پریشانی اور الجھ محسوس کرتے تھے۔ ان کا ذہن بڑی تیزی سے کام کرتا تھا اور جس وقت جس چیز کو یاد کرنا چاہتے یاد آجاتی۔ بڑی سے بڑی ک دنوں میں تیار کر لیتے اور کام شروع کرنے سے پہلے اس کے تمام پہلو ان کے پیش نظر ہوتے۔ معمولی جزئیات پر بھی ان کی نظر ہو یہاں تک کہ جن سے کام لینا ہے ان کے نام بھی نوعیت وار ان کے ذہن نشین ہوتے۔ اور بجٹ بھی فراخ دلی سے خود ہی بنا کرتے تھے۔ بہت کم اس میں کاٹ کسر کی نوبت آتی۔ وہ انسانی زندگی میں ہمیشہ رجائی پہلوؤں کو دیکھتے اور پست ہمتی کو بُرا جانتے سمجھا یہ تھی کہ تادم آخر ان کے ولولوں کے چراغ روشن اور ان کے امنگوں کی شمعیں فروزاں ہی رہیں۔ ان کی معلومات برسوں کے مط کی جانچ کمائی تھی۔ اب تو یہ عالم ہو گیا تھا کہ جس فن کی کتاب ہاتھ میں لیتے اس فن کی بے شمار کتابوں اور مصنفوں کے حالات بیا کر ڈالتے۔ جب کسی اصول یا پالیسی کو اختیار کر لیتے تو پھر انھیں کوئی چیز اپنے عزم سے نہیں ہٹا سکتی تھی اور جتنی مخالفت بڑھتی اتنا ان کا عزم مضبوط ہوتا جاتا تھا۔ وہ مخالفین کے مضامین کو اس طرح پڑھا کرتے تھے جیسے کوئی عامل بھوت اتارنے کے لئے عمل پڑھ رہا اس کے باوجود وہ دوسروں کے ادبی اور علمی نظریات کو بڑی ہمدردی اور غور سے دیکھا کرتے تھے۔ اور انھیں اگر کوئی ایسا عنصر جاتا جو ان کے کام کا ہوتا تو اس کی تلاش اور جستجو میں لگ جاتے۔ اگر ان کو یہ معلوم ہو جاتا کہ ان کی رائے صحیح نہیں ہے تو اس اصرار بھی نہیں کرتے تھے۔ ایسے ہی ایک موقع پر مجھ سے فرمانے لگے اگر کسی کی کوئی صحت مند خوبی پسند آجائے تو اُسے اپنی ذات پر جذب کر لینا چاہئے۔ لو یوں سمجھنا چاہئے کہ لطافت سے لطافت پیدا ہوتی ہے اور کثافت گریز کر جاتی ہے۔

ان کے لکھنے کا طریقہ عجیب تھا۔ مواد جمع کرتے رہتے اور جب ان کی دانست میں وہ پورا ہو جاتا تو پان کی خود ساختہ گلو منہ میں آئی۔ پیشانی پر کبھی بل پڑے اور کبھی تبسم کھیلا اور لکھنا شروع کر دیا۔ بعض وقت یہ بھی دیکھا گیا کہ قلم کی روانی اور وقت کے مابین جنگ شروع ہو گئی۔ ادھر ٹیلیفون گونج رہا ہے۔ ادھر ارباب ادارہ کاغذوں پر دستخط لے رہے ہیں۔ بیچ بیچ میں پہلوا (ملازم خاص) اپنی دن بھر کی داستان سنا رہے ہیں۔ سب کی سن رہے ہیں اور سب کے جواب دئے جا رہے ہیں مگر اپنے مرکز خیال پر قائم ہیں۔ اور ہمیشہ یہی دیکھا گیا کہ ایک بار بھی وقت نے قلم پر فتح نہیں پائی۔ کام پورا ہو گیا اور معمولی سی تصحیح کے بعد پریس کو بھیج دیا گیا۔ ڈاکٹر صاحب کا کردار بلند تھا۔ بے باکی اور صاف گوئی ان کا شعار تھا۔ خوش باشانہ زندگی بسر کرتے تھے۔ او امیرانہ ٹھاٹ باٹ سے خود رہتے اور اپنے متعلقین کو رکھا کرتے تھے۔ عہدہ بھی معقول تھا۔ تنخواہ بڑی تھی۔ گھوڑا دار۔ موٹر۔ نوکر چاکر سبھی کچھ تھے مگر طبیعت میں غرور نہ تھا۔ بعض لوگ اپنی نااہلی یا بار بار کی خطاؤں پر ان کے بے پناہ غصے کا شکار ہو جایا کرتے تھے مگر تھوڑی دیر بعد ہی ان کی نگاہوں کی کشش اور حیات آفریں مسکراہٹ ان کے دلوں کے داغ دھو ڈالتی تھی۔ ڈاکٹر صاحب نے اپنی زندگی کا بیشتر حصہ ریاستی ماحول میں گزارا مگر کبھی عیش و عشرت میں نہیں پڑے اور نہ ریاستی ماحول کے مذموم اثرات سے اپنا دامن تر ہونے دیا۔ بلکہ اُن پر اس ماحول کا ردعمل ہوا۔ اسی لئے انھیں ایسی باتوں سے ہمیشہ نفرت ہی رہی جو زوال اور انحطاط کی طرف

ایا کرتی ہیں۔ ریاستی ماحول چاپلوسی اور زمانہ سازی سکھاتا ہے مگر وہ اس سے بھی متنفر رہے۔ اس کے برخلاف وہ ہمیشہ روشن خیالی
ئیدارانہ نظام کے خلاف ابھرتی ہوئی تحریکوں کا خیر مقدم کرتے رہے۔ وہ عمر بھر انسان کی عظمت کے قائل رہے۔ انسانوں کے
میلانات اور نفسا نفسی دیکھ کر مغموم ہو جاتے تھے اور بعض دفعہ سخت سے سخت الفاظ میں تنقید سے بھی دریغ نہ کرتے تھے
، کو خدا نے ہر بات کے بیان کرنے کا ایک ایسا سلیقہ دیا تھا کہ کسی موقع پر بھی وہ تہذیب کے دائرے سے باہر نہیں نکلتے تھے
صاحب علم مجلس کے لحاظ سے منفرد شخص تھے۔ اور ان کی وفات کے بعد ہم ایک پر نہ ہونے والا خلا سا محسوس کرنے پر مجبور
۔ وہ بڑے خلوص۔ محنت اور شفقت سے تشنہ کامانِ علم و فضل کی تشفی کا سامان بہم پہنچایا کرتے تھے۔ وہ ہر طالب علم کا
ل خندہ پیشانی اور شگفتہ خاطری سے کرتے تھے۔ حوصلہ افزائی ان کی خصوصیت تھی۔ جس میں ذرا بھی استعداد دیکھتے
ے لئے سراپا شفقت بن جاتے تھے۔ کم استعدادوں کے کام کو اپنے نہیں بلکہ اُن کے مقام سے دیکھا کرتے تھے۔ لطائف و
ف اُن کے کشکول میں ہمیشہ بھرے رہتے تھے۔ ہر درجہ کے انسان کو اس کی پسند کی باتوں سے محظوظ کیا کرتے تھے۔
ے جو تعلق ہو گیا۔ حاضر و غائب یکساں تھا۔ جو وضع بزرگی زندگی بھر نبا ہا گئے۔ بات کرتے وقت تمہید میں وقت ضائع
رتے تھے۔ اپنے خیالات مختصر الفاظ میں بیان کر دیا کرتے تھے۔ ہر اس شخص سے وقت بے وقت ملنے کے لئے تیار ہو جایا
ے جو اردو کا نام لے کر ان کے پاس آئے مگر وہ کسی کی اکڑفوں یا جھوٹی نمائش کو برداشت نہیں کر سکتے تھے۔ اس ضمن میں
یک دلچسپ واقعہ یاد آیا۔ کوئی شام کے چھ بجے کا وقت تھا۔ ڈاکٹر زور صاحب چار پانچ بے تکلف ملنے والوں کے
ر پاتے ہوئے اپنے پڑھنے لکھنے کے کمرے میں بیٹھے ہوئے تھے۔ ملازم نے ایک کارڈ لا کر دیا۔ ڈاکٹر صاحب نے ان کو
ل روم میں بٹھانے کو کہا اور ہم سب کی طرف مخاطب ہو کر کہنے لگے بھئی ایک نئی آفت آ گئی ہے۔ پاکستان کے کوئی
چ اسکالر آئے ہیں۔ یہ کہتے ہوئے اٹھے اور اندر جا کر شیروانی پہن کر باہر آئے اور مجھے بھی اپنے ساتھ ڈرائنگ روم میں
لئے۔ ڈاکٹر صاحب ان سے بڑی خندہ پیشانی سے ملے۔ خود صوفے پر بیٹھ گئے اور ان کو سامنے والی گدے دار کرسی پر بٹھا دیا۔
ماحب نے جو بالکل نوجوان تھے اور بہت ہی قیمتی سوٹ پہنے ہوئے تھے اور ان کے لباس سے انگریزی عطر کی لپٹیں
رہی تھیں۔ پاؤں پر پاؤں ڈال کر بیٹھ اور سر لمبی کرسی کے پچھلے حصہ پر ٹکاتے ہوئے پہلا سوال ڈاکٹر صاحب سے یہ کیا کہ
و میرا خط مل گیا ہو گیا۔ میں نے کراچی سے لکھا تھا۔ ڈاکٹر صاحب نے نہایت ہی بے رخی سے جواب دیا کہ مجھے تو کوئی خط نہیں ملا۔
ہ کام کیا ہے۔ اب میں ڈاکٹر صاحب کے چہرے کو تک رہا تھا کہ سرخ ہو رہا ہے۔ اور برس پڑیں گے۔ مگر بڑے صبر و تحمل سے سنتے
اُن صاحب نے تبلایا کہ میں کراچی کی فلاں نو ساختہ انجمن کا معتمد ہوں اور ہم نے ایک کتب خانہ کھولا ہے اس کے لئے
ے ادارہ کی مطبوعہ کتابوں کی ضرورت ہے۔ ڈاکٹر صاحب نے منہ بنا کر پوچھا۔ یہی کام ہے یا کوئی اور بات بھی ہے! انھوں
میں یہ کتابیں آج ہی چاہتا ہوں۔ ڈاکٹر صاحب اٹھ کھڑے ہوئے اور ملازم کو آواز دے کر کہنے لگے آپ کو دفتر میں لیجاؤ
ری کتابوں کی فہرست دیدو۔ اور اُن سے مخاطب ہو کر فرمایا کہ جو بھی کتابیں آپ کو پسند آئیں گی اُس کی قیمت دفتر والے
بتا دیں گے۔ اُن صاحب نے کہا کہ میں تو مفت چاہتا تھا کیونکہ یہ ہمارا اردو کا ادارہ ہے اور یہ ہے اور وہ ہے۔
صاحب نے کہا ایسے چھوٹے موٹے ادارے میرے ملک ہی میں بہت سارے ہیں اگر میں ان سب کو مفت کتابیں دیتا
، تو مجھے اپنا ادارہ بند کر دینا پڑے۔ اور رخصتی مصافحہ کے لئے ہاتھ بڑھا دیا۔ وہاں سے واپس ہو کر سیدھے

اندر چلے گئے اور پھر اپنی محفل میں آ بیٹھے۔ اور غصہ سے کہنے لگے۔ کمبخت اپنے آپ کو ریسرچ اسکالر کہتا ہے اور اس میں علم کی بو
نہیں ہے۔ اسے یہ بھی خبر نہیں ہے کہ میں کس سے ملنے آیا ہوں۔ وہ اپنے استادوں سے بھی اسی طرح ملتا ہوگا۔ لوگوں نے ٹھنڈ
کرنا چاہا تو کہا دیکھئے عرصہ دراز تک میں بھی طالب علم رہا ہوں۔ ملکوں ملکوں پھرا ہوں مگر ایسے طالب علم نہیں دیکھے۔ بات
آئی گئی ہوگئی اور وہ صاحب فہرست لئے بغیر ہی روانہ ہوگئے۔ اس کے برخلاف یہ بھی میں نے دیکھا ہے کہ ایک دن ایک
بہت بڑے آدمی ادارہ دیکھنے کے لئے آئے۔ ایسے موقعوں پر ڈاکٹر صاحب ایک چھوٹی سی دعوت دے کر اپنے جاننے والوں اور ا
کے بہی خواہوں کو ضرور بلا لیا کرتے تھے۔ اور مہمان خصوصی سے اس قدر دانہ انداز میں ان کا تعارف کراتے تھے کہ جیسے ان
ہر ایک فرد ایوان اردو کا ایک قوی ہیکل ستون ہے۔

ادارے کی محبت :— ڈاکٹر صاحب کو ادارے کے ذرہ ذرہ سے والہانہ محبت تھی۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ جب
ایوان کی چھتیں بن چکی تھیں اور کہیں کہیں سے ٹپکنے لگی تھیں تو ڈاکٹر صاحب قطابی اور ...
لے کر اپنے ملازموں اور مزدوروں کے ساتھ علی الصباح خود بھی کام میں شامل ہوجایا کرتے تھے۔ اور ادارے کی رقم کی پائی پائی کا
کیا کرتے تھے۔ اور ادارہ کے لئے سامان کی فراہمی اور کتابوں کی خریدی میں وہ بنیوں کو بھی مات کردیا کرتے تھے۔ تب ہی تو ہم
ہیں کہ نسبتاً کمتر سرمایہ میں ایک بڑی سے بڑی چیز ہمارے سامنے کھڑی ہوئی ہے۔ ایوان اردو کا گوشہ گوشہ ڈاکٹر صاحب کی چش
نگراں کا منت پذیر ہے اور اس کے ذرے ذرے میں ڈاکٹر صاحب مرحوم کے دل کی دھڑکنیں پوشیدہ ہیں جو نسلاً بعد نسل
عاشقان اردو کے خون کو گرماتی رہیں گی۔ جس طرح علی گڑھ یونیورسٹی کا سرسید کے بغیر۔ تاریخ شعرائے اردو کا محمد حسین آزاد کے
انقلابی شاعری کا حالی اور اقبال کے بغیر اور تحفظ اردو کا تصور مولوی عبدالحق کو علٰحدہ کرکے نہیں کیا جاسکتا اسی طرح د
ادبیات اور ادارۂ ادبیات اردو کی خدمات کا تصور زور صاحب کے بغیر ممکن ہی نہیں ہے۔ مجھے ان ہی کے ایک ش
اس نوشتے کو ختم کرنے دیجئے۔

موت سے بھی مریں گے نہیں زور ہم
زندگی میں جو کچھ کام کر جائیں گے

محمد یوسف ٹینگ
(سری نگر)

ڈاکٹر زور کشمیر میں

اپنی نسل کے دوسرے نوجوانوں کی طرح میرے لئے بھی زور صاحب کے نام میں ایک اساطیری کشش تھی۔ اُن کی کتابیں پڑھ پڑھ کر ہمارا شعور جوان ہوا اور اُن کی شہرت کے ڈنکے سے ہمارے کان اُس وقت گونج اُٹھے، جب کہ بقولِ غالبؔ :ـ

مجموعۂ خیال ابھی فرد فرد تھا

گو "تعمیر" کے زمانۂ ادارت میں زور صاحب سے خط و کتابت کے مراسم قائم ہو چکے تھے لیکن پہلی مرتبہ جب میں نے سُنا کہ وہ شہر میں جموں و کشمیر یونیورسٹی کے صدر شعبۂ اُردو کی حیثیت سے آگئے ہیں تو مجھے یقین ہی نہیں آیا۔ (LEGEND) کے غلافوں سے نیچے آ کر اب یہ شخصیت ہمارے درمیان موجود تھی۔ ان ہی دنوں سرینگر کے ریڈیو سٹیشن پر گیا تو وہاں سٹوڈیو میں خواجہ غلام السیدین اور پروفیسر محمد مجیب کے ساتھ ایک اور وجیہہ شخص کو مصروف گفتگو دیکھا۔ میں برآمدے میں ٹہل رہا تھا کہ یہ تینوں صاحبان باہر آگئے۔ زور صاحب چلتے میں مجھ پر ایک نظر ڈال کر آگے بڑھ گئے۔ بات آئی گئی ہو گئی۔ لیکن چند دنوں کے بعد زور صاحب "شیرازہ" کے دفتر پر تشریف لائے۔ ابھی میں اپنا تعارف کرنے ہی والا تھا کہ وہ بڑے تپاک سے بڑھے اور کہنے لگے "بھئی آپ سے ریڈیو سٹیشن پر ملاقات ہو چکی ہے۔" میں بھونچکا رہ گیا۔ اور جب میں نے اپنا نام بتایا تو بولے کہ وہ گذشتہ کئی دنوں سے میری تلاش میں تھے۔ اس کے بعد نہایت شفقت سے باتیں کرتے رہے اور کچھ ہی دنوں میں میں نے اپنے آپ کو اُن کا حلقہ بگوش پالیا۔ جب بھی اُن کے یہاں جانے کا خیال آتا طبیعت شگفتہ ہو جاتی۔ اپنی اُن دنوں کی حالت کا ماجرا یاد کر کے اقبالؔ کا یہ شعر بھی یاد آجاتا ہے :ـ

بہ عشوہ ہائے جوانانِ ماہ سیما چیست
در آ بہ حلقۂ پیرے کہ دلبری داند

زور صاحب کی محفلیں بڑی لطیف اور پاکیزہ ہوتی تھیں۔ لیکن اُس "بوریت" اور خشک مزاجی سے کوسوں دور جو کسی معمر محقق کی مجلسوں سے متوقع ہوتی ہیں۔ ان کے یہاں محور تو بہر حال علم و ادب ہی رہتے تھے۔ لیکن ذاتیاتِ مزاح اور ہلکے پھلکے موضوع بھی ساتھ ساتھ جاری رہتے۔ خود اُن کا قہقہہ "چیزے دگر" والا رنگ رکھتا تھا۔ جب وہ باواز بلند اپنا قہقہہ لگاتے تو گویا ماحول پر ہنسی طاری ہو جاتی۔ گویا اُن کی شخصیت کے سارے بند کھل جاتے اور اُنکی ملنساری کا دھارا ٹھاٹھیں مارتا ہوا باہر آجاتا۔ جس کسی نے اُن کا یہ قہقہہ سُنا ہے وہ اسکی گونج کو کبھی نہیں بھلا سکتا۔

زور صاحب کشمیر اُردو کے پروفیسر کی حیثیت سے آگئے تھے۔ لیکن وہ بہت جلد اس خول کو توڑ کر باہر آگئے۔ یہاں بہت سی ادبی شخصیتوں کو آتے دیکھا ہے۔ لیکن زور صاحب جس انداز سے آئے اور پھر جس سُرعت سے چھ اُس کا رنگ ہی دوسرا تھا۔ اُن کی اس کامیابی اور ہمہ گیری کا یہ کارنامہ بڑا غیر معمولی معلوم ہوتا ہے۔ لیکن آ زور صاحب سے ایک مرتبہ ملنا تھا۔ آپ خود سمجھ جاتے کہ وہ اس کام کو کس قدر آسان اور کس قدر دل نشیں بنا تھے۔ اُن کی علمی استعداد سے کسے انکار ہے۔ لیکن اُن کی اِنسانیت اُن کی شخصیت کے سبھی پہلوؤں پر بھاری اُن کی قامت کے ماہر زبان اور عالم کے پاس جاکر استعجاب (AWE) کی کیفیت پیدا ہونا لازمی تھی۔ یہ تاثر وقتی ہوتا تھا۔ اُن کے ہونٹوں کی جنبش میں آنا ہوتا تھا کہ تناؤ اور تصنع کا یہ عالم گویا شفقت، خلوص مُروت کی شیرینیوں میں تحلیل ہوجاتا تھا۔ اُن سے کم درجے کے آدمی مرعوب کرنے کو اپنا کارنامہ سمجھتے ہیں۔ وہ کی اِس فضا کو ختم کرکے برابر کے درجے پر ذہنی مفاہمت کے حصول کے لئے کوشاں رہتے تھے۔ اُن کے پاس مرتبے اور کی درجہ بندیاں نہیں تھیں۔ وہ با مرتبہ لوگوں سے ضرور احترام سے ملتے تھے۔ لیکن اُن کی محفل میں باریابی اور انداز ہی بہر حال جستجوئے علم اور ذوقِ ادب کو ہی حاصل تھی۔ زور صاحب کو صرف یہ یقین دلانے کی ضرورت ہوتی کہ فلاں شخص تحقیق کا رسیا ہے۔ ادب کا متوالا ہے یا علم کا شوق رکھتا ہے۔ وہ اُس پر فریفتہ ہوجاتے۔ اس کی برماریاں کرکے اُسے کام کرنے کی ترغیب دیتے اور اُسے سچ مچ چاہنے لگتے۔ یہ جملے لکھنا بڑا معمولی کام معلوم ہے۔ لیکن عملی زندگی میں ایسے شفیق اور بے ریا بزرگوں کی کتنی کمی ہے۔ وہ ہم سب پر عیاں ہے۔ اسی لئے زور صاحب ذکر کرتے ہوئے لہجے میں جذبات اُبھر آتے ہیں، آنکھوں میں آنسو تیرنے لگتے ہیں اور گلا رُندھ جاتا ہے۔

زور صاحب جہاں رہے خلوت کی تاریکیوں کے بدلے جلوت کی روشنیاں جلاتے رہے۔ حیدر آباد میں تلاش جستجو کا ایک شہر آرزو تعمیر کرکے وہ کشمیر آئے۔ وہ مجھ سے بارہا کہتے آئے کہ صرف شعبۂ اُردو کی صدارت ہی وطن چھوڑنے پر قادر نہیں ہوسکتی تھی۔ اُن کا خیال تھا کہ کشمیر میں رہ کر اُردو کی زیادہ بہتر طریقے سے خدمت دی جاسکتی ہے۔ اپنی آمد کے چند ہی دنوں کے اندر اندر اپنی اس مہم کا آغاز کردیا۔ جو بھی شناسا اُن کے پا چلا جاتا وہ اپنی آرزو اُس کے سامنے رکھتے تھے۔ منصوبے پیش کرتے تھے اور یہاں کے ادیبوں سے تعاون کی ا کرتے تھے۔ آپ سے کیا چوری، ہم کشمیری بڑے تساہل پسند واقع ہوئے ہیں۔ یہ نہیں کہ ہمیں علم و ادب اور خاص اپنی تمدنی میراث سے دلچسپی نہیں . . . . ایسا کہنا غلط بیانی ہوگی۔ مگر ہماری کچھ ایسی خواہش رہتی ہے کہ "غو کابل سے ہی آئے اور تحقیق کے خارزار سے ہمارے اسلاف کے کارناموں کے پھول چن کر ہماری مشام جاں معطر کرد ہمارے بزرگ کلہن پنڈت کی "راج ترنگنی" کو سر آرل سٹائین (AURELSTEIN) نے بازیافت کیا سر جارج گریرسن آئے اُنھوں نے کشمیری زبان کی لغت مرتب کی اور ہماری صوفی شاعرہ للہ دید کی عظمت دنیا کو روشناس کرادیا۔ اپنے سب سے بڑے کشمیری شاعر مہجور کو اُس وقت تک ہم یوں ہی ٹال رہے تھے۔ جب تا بلراج ساہنی کا مضمون پڑھ کر رابندر ناتھ ٹیگور نے اُس کے کلام کی داد دی اور ہم جھوم گئے۔ آج بھی غنی پر ا غیر ریاستی ادیب کام کر رہا ہے اور ہم اُس کے نتائج افکار کی راہ دیکھ رہے ہیں۔ اسی پس منظر میں زور صا

توسنِ تحقیق پر تازیانۂ جستجو لگا رہے تھے۔ اُن کے سامنے ہم ایک مسکین گھوڑے کی طرح کان ہلا کر خاموش رہتے تھے۔
ہاں سے چلے آئے اور معاملہ ختم۔ زور صاحب کچھ عرصے تک یہ حال دیکھتے رہے۔ ابتدا میں کچھ مایوس بھی
لیکن بقول شاعر: ؎

یہ گھاتیں جانتے تھے آزمودہ کار تھے حمزہ[۴]

دہی کمر ہمت باندھ کر میدان میں آگئے۔ الگ الگ شاعروں۔ افسانہ نگاروں اور ادیبوں سے ملتے رہے
تخلیقات دیکھتے رہے۔ اُنھیں شائع کرانے کا انتظام کرتے رہے اور اُن پر لکھتے رہے۔ اسی دوران اُنھوں
رے مشہور شاعر رسا جاودانی (جو اردو کے علاوہ کشمیری کے بھی مقبول و معروف سخن گو ہیں) پر قلم اٹھایا
میں بیرونِ کشمیر متعارف کرنے کی کوشش کی۔ اس پر بعض دوستوں کو تاؤ آگیا۔ آخر زور صاحب کو کیا
ے رسا پر لکھنے کا؟ لکھنا ہی تھا تو پھر رسا پر ہی کیوں لکھا! یہ باتیں زبانی ہی نہیں ہوئیں بلکہ زور صاحب کو
ی طور پر اس "تشدد پسندی" سے آگاہ کیا گیا۔ لیکن اُن کے پائے ثبات میں لغزش آئی نہ ماتھے پر بل پڑا۔
جب ایک مرتبہ یہ ذکر اُن سے کیا تو جواباً یہ شعر پڑھا: ؎

اُن کا جو کام ہے وہ اہلِ سیاست جانیں
اپنا پیغام محبت ہے جہاں تک پہنچے

ین سے وہ خفا نہیں ہوئے بلکہ اُن کے دوست بن گئے۔ اسی بہانے اُن سے راہ و رسم بڑھائی اور اُنھیں عمل کی ترغیب
ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ اُن کے اس پُر وقار سلیقے سے حیرت ہوتی تھی۔ اُن میں "پھول کی اس پتی" کی نرمی تھی،
اکاٹ بعض اوقات ہیروں کا جگر چیر دیتی ہے۔

ور صاحب بدستور عمل کا راستہ اپناتے رہے، جیسے کوئی عابدِ شب زندہ دار کسی کی داد سے بے نیاز ہو کر اپنی ریاضت
ل رہتا ہے۔ اُن کے قدم زیادہ مثبت راستوں پر گامزن ہونے لگے۔ کشمیر میں کیا اُردو کیا کشمیری الگ بھگ
دیبوں کو اچھے ناشرین دستیاب نہیں ہوتے۔ زور صاحب اس مشکل کا حل لے کر سامنے آگئے اور ادارہ
ت اردو حیدرآباد کی خدمات پیش کر دیں۔ چنانچہ دیکھتے ہی دیکھتے وہاں سے حامدی کاشمیری کا ایک ناول،
ام محمد کا مجموعۂ کلام "حرفِ شیریں" اور محمود حسین کا افسانوی مجموعہ "نیل کنول مسکائے" شائع ہو کر آگئے۔
ن کے منصوبوں کی شروعات تھیں۔ ان پر بہار اب آتا تھی۔ لیکن شاید اجل اس بہار کی نیرنگ سامانی کا جلوہ
کی تاب نہیں رکھتی تھی۔

ور صاحب نے اپنے کو اُردو کے ساتھ کھلے بندوں (IDENTIFY) کر دیا تھا۔ کسی مکر و ریا حیل و حجت
اس کمتری کے بغیر وہ اُردو کے عاشقِ زار تھے اور اس میدان میں ان کا یہ حال تھا: ؎

خیریتِ جاں، راحتِ تن، صحتِ داماں
سب بھول گئیں مصلحتیں اہلِ ہوس کی

اسی رویے کا اظہار اُن کی بے باک گفتگو میں ہر وقت ہوتا رہتا تھا۔ اُردو کی وکالت وہ اس انداز سے

کرتے تھے۔ کچھ جبینوں پر شکن پڑ جاتے، کچھ چہروں پر برہمی کے آثار پیدا ہو جاتے۔ لیکن وہ اپنے اصولوں میں مداہنت اور مفاہمت کو دخل اندازی کا موقع دینے کے روادار نہ تھے۔ اُن کے مسلک سے اختلاف کرنا آسان تھا۔ لیکن اُن کی سپردگی اور سرشاری کی داد نہ دینا ناممکن تھا۔ اعتقاد و یقین کے اس بھرپور مظاہرے پر خواہ مخواہ پیار آجاتا تھا۔ اُن کے لئے ایک عشق کی حیثیت اختیار کر گئی تھی اور اس بارے میں اُن کے جذبات سے ازمنۂ وسطیٰ کے کٹر عقیدے کی یاد آجاتی تھی۔ لیکن اُن کا ایثار۔ سرمستی اور جنون احترام اور عقیدت کے جذبات بیدار کرتے تھے۔ کشمیر میں سب مرحلے آئے۔ لیکن اُن کا عزم راسخ ہر چیز پر غالب رہا۔

زور صاحب کی موت ایک المناک سانحہ تو ہے ہی۔ لیکن اس کی شدت اُس وقت اور زیادہ ہو جاتی جب ذہن میں رکھی جائے کہ یہ کس قدر اچانک اور کس غیر متوقع انداز سے وقوع پذیر ہوا۔ زور صاحب عمر کی پانچویں دہائی سے گزر رہے تھے۔ لیکن اُن کا تن و توش دیکھ کر جوانوں کو رشک آجاتا تھا۔ اُن کے چہرے کی بشاشت دوسروں کے ولولہ اور جوش کے جذبات کو برانگیختہ کرتی تھی۔ جب جوان قوت اور حرکت کے اس مجسمے کو دن رات گہری باقاعدگی کے ساتھ مصروف عمل دیکھتے تو اُن کے اندر بھی کام کا عزم بیدار ہو جاتا۔ وہ اپنی قوتوں کے عروج پر تھے، ایک روز ریڈیو سے اُن کی موت کی خبر آئی۔ سرینگر میں ہم لوگوں کو جنھوں نے ایک ہی روز قبل انھیں دیکھا جس قدر حیرانی ہوئی اس کا اندازہ مشکل ہے۔ ایک رات کی پہنائی میں مدوجزر کا یہ پورا چکر ختم ہو چکا تھا۔ جب تلسی باغ میں اُن کی قیام گاہ پر پہنچے تو وہاں غالب کے اس مصرعے کی مجسم تصویر بنی ہوئی تھی: ؎

شعلۂ عشق سیاہ پوش ہوا میرے بعد

ادیبوں اور دانشوروں کے علاوہ مقامی معززین، تاجر، طلبا اور زندگی کے دوسرے شعبوں سے تعلق رکھنے والے سبھی اشکبار تھے۔ اُن کے کمرے میں جب ہم آخری دیدار کے لئے پہنچے اور چادر اُن کے منہ سے سرکائی تو جلال کا وہی عالم آیا۔ گویا ایک شیر دم لینے کے لئے لیٹ گیا ہو۔ یقین نہیں آرہا تھا کہ اس پُرشکوہ جسد میں اب جان نہیں ہے۔ جب اُن کا جنازہ خانیار شریف کی طرف روانہ ہوا تو اس کے عقب میں گاڑیوں کا ایک لمبا جلوس رواں تھا۔ خانیار میں نماز جنازہ کی ادائیگی کے بعد دکن کا یہ ہیرا کشمیر کی سرزمین کو سونپ دیا گیا ہے۔ جس وقت اُن کا تن خاکی سپرد زمین کیا جا رہا ہے۔ اس وقت قبر کے سرہانے کشمیر کے وزیر اعظم بخشی غلام محمد۔ وزیر تعلیم غلام محمد صادق یونیورسٹی کے وائس چانسلر کے۔ ایم پانیکر کے ساتھ ہزاروں لوگوں کی آنکھیں آنسوؤں سے پُر تھیں۔ اُردو اور زور صاحب کے باہمی ربط کا خیال کر کے میرے ذہن میں یہ شعر گونج رہا تھا: ؎

شبے مجنوں بہ لیلیٰ گفت کہ اے معشوقِ بے ہمتا
ترا عاشق شود پیدا ولے مجنوں نخواہد شد!

وقار خلیل

ڈاکٹر زور کی شخصیت

سوانحی لحاظ سے یوں کہا جا سکتا ہے کہ ڈاکٹر زور نے ایسے زمانے میں آنکھ کھولی جبکہ سرسید کے رفقائے کار گیسوئے اردو کی مشاطگی میں منہمک تھے۔ اس میں شک نہیں کہ حالی اور شبلی کا آخری زمانہ ڈاکٹر زور کی طالب علمی کا آغاز ہوگا لیکن اردو کے ان مشاہیر محسنوں سے وہ لوگ ضرور متاثر ہوئے جن کو شروع ہی سے اردو سے لگن تھی، ان مربیوں کے جذبۂ خدمت اور ایثار نے اس دور کے کتنے ہی نوجوانوں میں اُمنگ، جوش اور اردو کی خدمت کا ولولہ پیدا کیا ہوگا۔ ڈاکٹر زور کا شمار اُن ہی چند نوجوانوں میں ہوتا ہے جنھوں نے طالب علمی کے زمانے ہی سے اردو کی خدمت اور اس کی ترویج و فروغ کا بیڑا اُٹھایا تھا۔

ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور ۲۵ دسمبر ۱۹۰۵ء کو اردو بنیاد شہر فرخندہ آثار حیدرآباد میں پیدا ہوئے، آپ کے والد ماجد حضرت ابوالبرکات حافظ سید غلام محمد شاہ قادری زعم ایک عابد شب زندہ دار، زاہد مرتاض اور صاحب باطن بزرگ تھے۔ ڈاکٹر زور نے ابتدائی تعلیم دارالعلوم میں پائی، ۱۹۲۷ء میں اعزاز کے ساتھ جامعہ عثمانیہ سے بی۔ اے اور ایم۔ اے کے امتحانوں میں کامیابی حاصل کی۔ حکومت حیدرآباد نے اعلیٰ تعلیم کے لئے یورپ بھجوایا، جہاں آپ نے "آریائی زبانوں کی تقابلی لسانیات" پر تحقیقاتی مقالہ لکھا اور پی۔ ایچ۔ ڈی کی ڈگری ۱۹۲۹ء میں حاصل کی۔ لسانیات کے مطالعہ کے سلسلے میں صوتیات سے بھی دلچسپی پیدا ہوئی اور پیرس کے "صوتیاتی تحقیقاتی ادارہ" میں صوتیات پر دو سال تک تحقیقاتی کام انجام دیا اور ڈپلوما حاصل کیا۔ اس دوران انگلستان اور پیرس کے کتب خانوں سے دکنیات کے بارے میں کئی نوٹس بھی لئے، جن سے بعد کو آپ نے دکنیات پر اپنے گراں قدر کاموں کی بنیاد رکھی۔ انگلستان سے واپسی پر ڈاکٹر زور جامعۂ عثمانیہ میں اردو کے پروفیسر مقرر ہوئے اور ۱۹۴۸ء تک صدر شعبۂ اردو کے عہدۂ جلیلہ پر فائز رہے۔ پھر چادر گھاٹ کالج کی پرنسپلی سے وظیفۂ حسن خدمت پایا اور جموں و کشمیر یونیورسٹی کے صدر شعبۂ اردو و فارسی، ڈین فیکلٹی آف آرٹس اینڈ اورینٹل لینگویجز مقرر ہوئے، قریب سولہ مہینے کشمیر میں رہے، اور ۲۴، ۲۵ ستمبر ۱۹۶۲ء کی رات میں وہیں حرکت قلب بند ہو جانے کے سبب رحلت فرما گئے اور خانیار شریف کے احاطے میں سپرد خاک کر دئے گئے۔ بقول بہادر شاہ ظفر ؎

کتنا ہے بد نصیب ظفر دفن کے لئے ۔۔۔ دو گز زمین بھی نہ ملی کوئے یار میں

یہ تھی ڈاکٹر زور مغفور کی سرکاری زندگی کی سرسری جھلک، جب کبھی ڈاکٹر زور کی شخصیت کے بارے میں سوچتا ہوں تو علامہ شبلی نعمانی کی شخصیت سامنے آجاتی ہے، کام کرنے کا وہی جوش اور ولولہ، دوسروں سے کام لینے کا وہی قرینہ

اور بلکہ زور تحریر اور طرز تقریر کا وہ انداز کہ پڑھنے یا سننے والا ان کی بات مان جائے۔ شبلی نے بھی بید
رفتاری سے لکھا، ڈاکٹر زور نے بھی بہت لکھا اور برق رفتاری سے لکھا، مرنے سے دو دن پہلے تک بھی وہ لکھ
نے "دارالمصنفین" کی بنیاد رکھی جس کی خدمات ناقابلِ فراموش ہیں اور ڈاکٹر زور نے بھی "ادارۂ ادبیاتِ ارد
آزاد اور نیل ریسرچ انسٹی ٹیوٹ" جیسے ٹھوس علمی و ادبی اور تحقیقاتی اداروں کی نیو رکھی اور قلیل مدت میں
"ادارۂ ادبیات اردو" نے وہ بیش بہا اور ٹھوس خدمات انجام دی ہیں کہ ادبی تاریخ میں ہمیشہ جاوداں
علی گڈھ اور سرسید ایک تصویر کے دو رخ ہیں، اسی طرح ادارۂ ادبیات اردو اور ڈاکٹر زور بھی
رہے ہیں اور جب تک ادارہ، ایوانِ اردو اور اس کی کتابیں اور رسالہ "سب رس" باقی ہے، ڈاکٹر
کی حیثیت سے یاد کئے جاتے رہیں گے۔ بقول ڈاکٹر سیدہ جعفر "ایوانِ اردو" ڈاکٹر زور کے لئے سنگ و خ
خوب صورت عمارت ہی نہیں تھی، بلکہ ان کے خوابوں کی تعبیر، ان کے تخئیل کا رنگ محل، ان کی مشغولیت ا
جادو نگری اور ان کا شہرِ آرزو تھا۔" منشی تلوک چند محروم نے کیا خوب لکھا ہے ؎

بنا کر زور نے "ایوانِ اردو" بڑھا دی ملک بھر میں شانِ اردو

۱۹۳۱ء میں ڈاکٹر زور نے ادارہ کی بنیاد رکھی تھی، اور دیکھتے دیکھتے اپنے حسنِ عمل، بے لوث
شناسی کے مقناطیسی جوہر کے سبب دنیائے ادب میں اس ادارہ کو کیفیت و کمیت کے لحاظ سے علم و اد
مینار بنا دیا، جس سے آنے والی نسلیں صدیوں استفادہ کرتی رہیں گی اور ہر ہر مرحلہ پر ڈاکٹر زور چراغ عا
صورت جگمگاتے ملیں گے۔ نامساعد حالات میں ادارہ کے تحقیقاتی کاموں کو جاری رکھنا اور سرمایہ
فراہم کرنا، "ایوانِ اردو" کی تعمیر اور اس میں محفوظ شدہ سرمایہ، یہ سب ڈاکٹر صاحب مغفور کی انتھک س
و سوچ اور دیوانہ پن کی حد تک اردو سے شیفتگی پر دال ہیں اور بلاخوفِ تردید یہ کہا جا سکتا ہے کہ
میں سرسید کے بعد ڈاکٹر زور ہی واحد عملی انسان تھے۔

ادب اور زندگی کے کئی شعبوں میں مولوی عبدالحق اور ڈاکٹر زور یکساں خصوصیات کے حامل رہے ہیں
لینے اور کام کرنے، انجمن اور ادارہ کے قیام و ترقی وغیرہ جیسے کئی موڑ پر اس صدی کے یہ دو مجاہد ہند
راستہ دکھاتے رہیں گے۔ جو لوگ بے لوث کام کرتے ہیں، وہ اپنا مقام خود پیدا کر لیتے ہیں۔ ڈاکٹر زور
ہمیشہ وسیع اور عمیق رہے، اس لئے کہ تعلقات کی بنیاد کبھی بھی ذاتی غرض و غائت نہ رہی اور یہی وجہ
نظروں میں ہمیشہ ان کی قدر و منزلت رہی۔ اردو کے لئے انھوں نے بڑے بڑے امراء کو ہموار کیا، اپنے
دوسروں کو مرعوب بھی کیا اور متاثر بھی مگر خود کبھی کسی سے بھی مرعوب نہ ہوئے، خواہ وہ کوئی وزیر اعظم ہی
سب سے ایک ہی انداز میں پیش آتے۔ ان کی بے لوث خدمت ہی ان کی مقبولیت کی ضامن بنی۔
میں ایک طرف نواب سالار جنگ بہادر اور پرنس مکرم جاہ بہادر ایسے امیروں کو اپنا ہم خیال بنایا تو د
مرکزی و ریاستی حکومتوں کے وزیروں کے علاوہ مغرب زدہ ذہنیتوں کے عہدہ داروں کو بھی اردو کی خ
کمربستہ ہونے پر مجبور کیا۔

ڈاکٹر زور میں غیر معمولی جراُت، بے خوفی اور استقامت پائی جاتی تھی، سخت محنت اُن کا ایمان تھا۔ جس کسی کام کو اپنے تخب کر لیتے اُس میں وہ نہایت انہماک اور توجہ کے ساتھ مشغول ہو جاتے اور بعض دفعہ حد سے زیادہ کام کر جاتے۔ اِسی تقل مزاجی اور کام سے اُن کی غیر معمولی دلچسپی اور والہانہ شغفت ہی نے در اصل اُن کی شخصیت میں مقناطیسیت رجاذبیت پیدا کر دی تھی۔ جن لوگوں نے اُن کے ساتھ جفا کی تھی اُن کا ذکر وہ بے دردی کے انداز میں کبھی نہیں کرتے تھے اس سے اُن کی رفعتِ نظری اور بلند اخلاقی کا پتہ چلتا ہے۔ اِس اجمال کی تفصیل کے لئے ورق کے ورق درکار وں گے۔

سونے سے دھول ہٹا کر اُس کو چمکانا تو اچھا ہے۔ لیکن جو کسی بھی دھات کو سونا بنا دے تو اس کے کیا کہنے۔ ڈاکٹر ور نے اکثر ادیبوں اور شاعروں کو گمنامی کی تاریکی سے نکالا اور جادۂ نور پر رواں دواں کر دیا۔ جن فنکاروں ے ساتھ انصاف کیا، شاعروں کی قدر و منزلت کی اور اُنھیں تاج اور خلعت پہنائے، ادیبوں کو ان کا حق دلایا ہیں ہوئی نفش اصحاب کو خلوت سے جلوت میں لانے کی سعی کی۔ بھولی بسری باتوں کو صدیوں کی زندگی بخش دی توں گولکنڈہ کی خاک چھانی۔ مٹی کے ڈھیروں سے گولکنڈے کے ہیروں کو کھوج نکالا۔ قطب شاہی لیل و بار کے نقشے کھینچے، دکنی سلطنتوں کی مٹتی ہوئی نشانیوں کے مرقعے پیش کئے، دکن کے گوشے گوشے سے صدیوں کے فتہ بخت ادیبوں، شاعروں اور باکمالوں کے پتے ڈھونڈ نکالے، اُن کی یادگاریں قائم کیں، کتبے کندہ کرائے، ریخیں لکھوائیں، یوم منائے، کلام مرتب کرائے اور زیورِ طباعت سے آراستہ کر کے اردو ادب کی عمر میں چار سو سال اضافہ کر دیا اور اس طرح نہ صرف اردو کی بلکہ حیدر آباد کی نامکمل ادبی و تہذیبی تاریخ کو ڈاکٹر زور نے مکمل کر دیا دبستانِ دکن کے قرارِ واقعی آخری معلم تھے۔ دکنیات کے معاملے میں ان کا کوئی حریف نہیں۔ دکنی تہذیب رزبان و ادب کے وہ نہ صرف بہت بڑے رسیا اور قدر شناس تھے بلکہ خود جیتی جاگتی تاریخ بھی تھے۔ اُن کے ل و دماغ، کردار و گفتار، شخصیت اور لب و لہجہ پر دکن کی گہری چھاپ تھی۔ قطب شاہوں کی تہذیب اور ن زبان پر اُنھیں اتنا ہی فخر تھا جتنا دہلی والوں کو اردوئے معلیٰ پر ہو سکتا ہے۔ ڈاکٹر زور کی تصانیف کے ر حصے دکن کی قدیم یادگاروں، دکن کی قدیم زبانوں، حیدر آبادی ثقافت اور حیدر آبادی روایتوں اور حکومتوں کے عروج و زوال کے تذکروں سے معمور ہیں۔ یہ سب دکن کے ذرّہ ذرّہ سے اُن کی والہانہ و عاشقانہ ق کا بین ثبوت ہیں۔ وہ صحیح معنوں میں قطب شاہی یک جہتی کے علم بردار ادب اور ثقافت کا اس صدی میں رمینار" تھے۔ غرض وہ ہمہ گیر شخصیت کے مالک تھے اور ادب کے کسی بھی موضوع پر عالمانہ طریقے پر اظہار بال کیا کرتے تھے۔

ڈاکٹر زور کو شہرت ملی، ناموری ملی، عزت ملی اور دولت بھی ملی، لیکن جو کچھ اُنھیں ملا اس سے کسی کی حق تلفی ہ ہوئی۔ پہاڑ کی چوٹی پر چڑھنے کے لیے اُنھوں نے کسی کو ڈھکیلا نہیں، کسی کے آگے کنواں نہیں کھودا، بلکہ اُنھوں دوسروں سے الگ اپنے لئے ایک راہ منتخب کی، بڑے سنگلاخ، کٹھن اور کھردرے راستے پر رواں دواں رہے، و کامراں، فرحاں و شاداں اور یہ صحیح ہے کہ دوسروں سے بہت پہلے وہ چوٹی پر پہنچے۔ اُنھوں نے قلم یا عمل سے

کبھی کسی کی راہ میں روڑے نہیں اٹکائے اور یہ بات اُن کی عظمت کی شاہد ہے ۔ وہ کشادہ قلب، نورانی فراست کے حامل اور وسیع النظر شخص تھے اور صحیح معنوں میں ایک موحد تھے ۔ جن کا کیش ترک رسوم تھا ۔ شخصیت بارُعب متین اور پُر وقار تھی ۔ اعلیٰ سماجی پوزیشن اور سیاسی اقتدار رکھنے والے لوگ بھی اُن سے برابری کی سطح پر ملتے اور اُن کا احترام کرتے تھے ۔ ڈاکٹر زور بڑے محنتی، مخلص، صاحب نظر اور جوہر شناس تھے ۔ دُنیا میں اپنی دُھن کے پکّے ایسے دیوانے کم ہی پیدا ہوئے ۔ جب بھی اور جہاں کہیں بھی ایسے جیالوں نے جنم لیا، اُن کے حیرت انگیز کارناموں سے تہذیب و تمدن کو سرفرازی نصیب ہوی ۔ ڈاکٹر زور کا شمار بھی ایسے ہی دیوانوں میں ہوتا ہے ۔ وہ باغ و بہار طبیعت کے مالک اور مجلسی آدمی تھے ۔ ذرا کی ذرا میں بادل کی طرح گرجتے اور برسنے لگ جاتے اور جب غصہ ہوا ہو جاتا تو بیٹھے قہقہوں کی پھلجھڑیاں چھوڑتے ۔ اُن کی زندگی جلالی بھی تھی اور جمالی بھی، صاف دل آدمی جو ٹھہرے غصہ آیا تو دل کا غبار مُنہ سے نکال دیا اور پھر ایسے ہو گئے جیسے کہ کچھ ہوا ہی نہیں ۔ بڑے ہی مرنجان مرنج اور ملنسار تھے ۔ جس طرح شیر اپنا شکار نہیں چھوڑتا، ڈاکٹر صاحب اپنے شاگردوں یا مقربوں کو قطرے سے گہر بننے تک چین نہیں لیتے تھے اور ان کی طبیعت کے بارے میں اقبال کا یہ شعر پوری طرح صادق آتا ہے کہ ؎

جس سے جگرِ لالہ میں ٹھنڈک ہو وہ شبنم　　دریاؤں کے دل جس سے دہل جائیں وہ طوفاں

قدامت پسند اور ترقی پسند ہر دو طبقوں کے نزدیک ڈاکٹر زور اُن کی جماعت کے رکن رکین سمجھے جاتے رہے ظاہر کا یہ تضاد اُن کے ہمہ گیر ہونے کا ثبوت ہے ۔ نقاد، محقق، ماہر لسانیات و صوتیات، مورخ، مخطوطات کے ماہر افسانہ نگار اور شاعر کی حیثیت سے ڈاکٹر صاحب بلند مرتبے کے حامل تھے، وہ بڑے ادیب ہی نہیں ادیب گر بھی تھے حیدرآباد کی نئی نسل میں ادب کا ذوق، تحقیق و تنقید کی لگن اور خود اعتمادی کا جذبہ پیدا کرنے میں اُن کا بڑا حصہ رہا ہے جس کے سبب جدید حیدرآباد کی ادبی تاریخ میں اُن کا نام سرِفہرست رہے گا ۔ طالب علمی کے زمانے میں آپنے فن تنقید پر اردو میں پہلی کتاب "روحِ تنقید" لکھی جس کا شمار اردو کی گنی چنی اہم اور وقیع کتابوں میں ہوتا ہے ۔

ڈاکٹر زور کی طبیعت میں بلا کی جلد بازی بھی تھی، وہ چاہتے تھے کہ ہر کام فوراً ہو جائے، یہ جذبہ اُن کی تحریروں میں بھی کارفرما رہا ۔ اردو ادب کی ہر صنف میں انھوں نے طبع آزمائی کی ۔ اُن کی تصنیفیں کوئی کہاں تک یاد رکھے ۔ ستر اَسّی کے قریب کتابیں اُن کی یادگار ہیں ۔ وہ اتنا لکھ چکے ہیں کہ سب تحریروں کو یاد رکھنا بھی تو مشکل ہے بعض اہل قلم حضرات کو دیکھا ہے کہ جب اُن سے مضمون لکھنے کی فرمائش کی جائے تو وہ طرح طرح کے عذر پیش کرتے ہیں، وقت کی تنگی، مصروفیات کی زیادتی اور موڈ نہ ہونے کی شکایت ۔ لیکن ڈاکٹر زور میں ہم نے یہ بات دیکھی ہے کہ باوجود مختلف النوع مصروفیات کے جب وہ کاغذ قلم سنبھالتے تو پھر کچھ لکھ کر ہی سانس لیتے ۔ جس طرح وہ بات کرتے تھے اُسی طرح لکھتے بھی تھے، اُن کی تقریر کا انداز بھی وہی ہوتا جو تحریر کا ۔ انھوں نے اظہارِ خیال میں کبھی تکلف اور تامل سے کام نہیں لیا ۔ دل میں جو آتا وہ کہہ گزرتے اور لکھ بھی دیتے، کوئی لاگ لپیٹ اُن کے پاس نہیں، صاف دلی اور صاف گوئی اُن کا شعار جو رہا ۔ منفرد اور دلکش اسلوبِ تحریر کے مالک اور اردو کے ممتاز انشا پردازوں میں ان کا شمار ہوتا ہے ۔ اُن کے مکاتیب میں تو صاف گوئی اور صاف دلی کی خصوصیات زیادہ نظر آتی ہیں ۔

اُردو زبان کی طرح ادارہ کے اس چاہنے والے میں بھی ایک خصوصیت تھی اور وہ یہ کہ ہر قسم کی چیز کو اپنانے کی اُن میں بھرپور صلاحیت تھی۔ برصغیر ہند و پاک کا ممتاز نقاد، محقق اور ادیب، لندن یونیورسٹی کا پی، ایچ، ڈی، جامعۂ عثمانیہ اور جامعۂ کشمیر کا پروفیسر اپنے والد کے عرس یا ادارہ کے چھوٹے بڑے کاموں کے وقت رخصت لے کر بذات خود سینہ سپر ہوجاتا تھا۔ ہم نے دیکھا ہے کہ راتوں کی نیند حرام کرلی ہے اور رپورٹ لکھی جارہی ہے، یوم محمد قلی قطب شاہ کے انتظامات کے سلسلے میں صلاح و مشورہ کیا جارہا ہے، پروف دیکھے جارہے ہیں، ٹیلی فون پر پریس کو نیوز لکھائی جارہی ہے، ادارے کی کردی اور آزاد ریسرچ انسٹی ٹیوٹ کے حسابات دیکھے جارہے ہیں، ٹائپسٹ کو ہدایتیں کی جارہی ہیں اور مسودہ لکھوایا جارہا ہے۔ رقعوں کی طباعت سے لے کر تقسیم اور پتوں کی تفہیم تک کرائی جارہی ہے۔ وقت کی پابندی ڈاکٹر زور کی طبیعت کا جزو بن گئی تھی، وہ نہ صرف ہر کام خود بروقت انجام دیتے بلکہ دوسروں سے بھی بروقت تکمیل کراتے۔ کھانے پینے، آرام کرنے اور دیگر علمی و ادبی مصروفیات میں بھی وہ وقت کی پابندی کو بطور خاص ملحوظ رکھتے تھے اور مجال نہیں کہ معمولات میں سرمو فرق آجائے، اگر اتفاقاً کسی غیر معمولی وجہ سے ایسا ہوتا تو انھیں بڑی بے چینی رہتی۔ وہ لگاتار اور انتھک محنت کرنے کے عادی تھے۔ ہم نے دیکھا ہے کہ اکثر صبح چھ بجے سے ساڑھے بارہ بجے دوپہر تک وہ مسلسل کام کرتے، ٹھیک ایک بجے کھانے کی میز پر ہوتے۔ دس یا پانچ منٹ میں فارغ ہوجاتے اور پھر گھنٹہ ڈیڑھ گھنٹہ قیلولہ کرتے۔ تخت پر کروٹیں بدلتے اور دوپہر کی ڈاک دیکھا کرتے۔ ساتھ کا ساتھ تجویزیں ہوتیں، رسائل کی ورق گردانی کی جاتی۔ پھر تین، سوا تین بجے سے ادارے کے کاموں میں لگ جاتے اور چائے کے دور چلتے۔ ملنے والوں کا تانتا بندھ جاتا۔ احباب، ضرورت مند، نوکریوں کے متلاشی اور سفارشوں کے خواہاں، غرض سبھی موجود ہوتے اور ڈاکٹر صاحب ہر ایک سے خوش اخلاقی اور خندہ پیشانی سے پیش آتے۔ لوگوں کے کام کرنے کے بعد ہم نے دیکھا ہے کہ فرط مسرت سے اُن کی پیشانی جگمگاتی تھی اور وہ بیحد خوش ہوتے تھے۔

حکومت ہند کی مرکزی ساہتیہ اکادمی اور سرکاری رسالہ "آجکل" دہلی کے وہ سرگرم رکن تھے اور اکثر ادیب و شاعر اپنے علمی و ادبی کاموں کی تکمیل کے بارے میں یا پھر مضامین و کلام کی اشاعت کے سلسلے میں آتے اور صبح سے شام تک آتے رہتے اور ڈاکٹر صاحب اپنے "تخت" پر تشریف فرما ہنستے، مسکراتے، چائے پیتے، پلاتے سفارشی خطوط لکھتے رہتے اور خود ہی ادارہ کی طرف سے مجاریہ کروادیتے اور اس طرح اردو زبان کی قدمے، سخنے خدمت کرتے۔ غرض وزراء اور امراء کی صحبت میں بیٹھنے والا، علمی جلسوں اور ادبی محفلوں اور کانفرنسوں کی صدارتیں کرنے والا بعض وقت کالج کے چپراسی آئیلو یا ادارے کے چوکیدار نذیر الدین اور ٹپہ رساں محی الدین پہلوان اور انسٹی ٹیوٹ کے حمید خاں سے ادھر اُدھر کے قصے سننے میں منہمک نظر آتا ہے۔ جس شخص نے آخر وقت تک پی۔ ایچ۔ ڈی کے طالب علموں کی رہنمائی کی ہو اور جو ہر سال ایم۔ اے اور بی۔ اے کا مختلف جامعات کا ممتحن مقرر کیا جاتا رہا ہو، اس کو ہم نے چار چھ آنے درجن والے کیلوں (موز) اور دو تین آنے سو والے پان سے متعلق ملازم سے پوچھ گچھ کرتے ہوئے بھی دیکھا ہے۔ اس ہمہ جہتی توجہ، دلچسپی اور انہماک سے ہم ڈاکٹر زور کی پہلو دار شخصیت کے اُس گوشے کو پاتے ہیں جس کے لاشعور میں ہر ہر قدم پر غور و فکر کی برنائیاں اور رعنائیاں جھلکتی نظر آتی تھیں۔

بقول ڈاکٹر حفیظ قتیل "ڈاکٹر زور بڑے خوش وضع، خوش پوش، لانبی لانبی زلفیں شانوں پر چھا
پیشانی اقبال مندی کی نشانی، پان کی گلوری سے رخسارہ بھرا ہوا، چکلی چکلی پٹیوں کے کپڑے کی شیروانی، پا
سلیم شاہی، وضع قطع جس قدر شاعرانہ، بات کرنے کا انداز اُسی قدر غیر شاعرانہ، پان اس طرح چباتے
سختی سے مقابلہ کر رہے ہیں۔ ڈاکٹر زور کی خوش پوشی اور خوش وضعی پر چال ایسی جیسے غصّے سے بے قابو
گتھم گتھا ہونے کو چلے ہیں۔ اس چال پر شیروانی تو خیر بیٹھ جاتی لیکن جب کبھی سوٹ پر کرم فرمائی ہوتی تو ا
عزت پناہ بنتی"۔ کہاں تک ڈاکٹر صاحب کی باتیں یاد کی جائیں۔ غرض وہ اردو ادب، اُردو تہذیب ا
باغ و بہار اور زوردار شخصیت تھے اور ایسی عہد آفریں شخصیتیں صدیوں بعد جنم لیتی ہیں اور مرنے پر بھی
باقی رہیں۔

مولوی عبدالحق (بابائے اردو) نے اپنی گراں قدر کتاب "چند ہم عصر" میں حالی کی سیرت کا خاکہ کھینچ
کہ "مرحوم ہماری قدیم تہذیب کا بے مثل نمونہ تھے، شرافت اور نیک نفسی اُن پر ختم تھی۔ چہرے سے شرا
اور شفقت ٹپکتی تھی اور دل کو ان کی طرف کشش ہوتی تھی، اُن کے پاس بیٹھنے سے یہ معلوم ہوتا تھا کہ کو
اثر کر رہی ہے"۔ حالی کی سیرت کے یہی خد و خال ہم ڈاکٹر زور کی شخصیت میں بھی دیکھتے ہیں، روشن روشن، ر
ڈاکٹر زور صاحب کی اچانک وفات کا غم ابھی میرے قلب و دماغ میں تازہ ہے۔ یہ وہ گھاؤ ہے ج
ہو۔ میرے لئے موزوں الفاظ میں یہ بتلانا ممکن نہیں کہ میری نگاہ میں اُن کی بہ حیثیت امیر کارواں قافلۂ ا
انسان کتنی قدر و منزلت ہے۔ یہ جو کچھ میں نے ڈاکٹر زور کی ہمالیائی شخصیت کے بارے میں لکھا ہے، بڑی بڑی
ہے۔ مجھ ایسے کم سواد اور بے بضاعت کا مضمون چھوٹا منہ بڑی بات کے مصداق ہوگا ؎

شہید جنتِ ارضی تری تُربت پہ رحمت ہو
تجھے روئے گا صدیوں حیدرآباد دکن ساقی

(بشکریہ آندھرا پردیش)

سید رفیع الدین قادری

بابا کی زندگی کے آخری تین دن

مصورِ فطرت خواجہ حسن نظامی نے سچ کہا تھا کہ ماہ ستمبر ہمیشہ ستمگر ہی بن کر آیا ہے۔ غور کیجیے تو تمام بڑے بڑے دردناک واقعات اسی ماہ میں رونما پذیر ہوئے ہیں۔ ۲۳ ستمبر ۱۹۶۲ء کی صبح ہم لوگ ناشتہ ہی کر رہے تھے کہ نوکر نے آکر بڑے بھائی سے کہا کہ "صاحب کہہ رہے ہیں کہ آپ ناشتہ سے فارغ ہو کر جلد تیار ہو جائیے۔ باہر جانا ہے"۔ ناشتہ سے فارغ ہو کر ہم اور رضی استاد کے پاس پڑھنے چلے گئے۔ استاد صاحب نے کہا کہ میں ڈاکٹر صاحب سے ملنا چاہتا ہوں۔ ہم نے آکر بابا سے کہا وہ موٹر میں سوار ہو رہے تھے۔ کہا کہ اب تو میں جا رہا ہوں پھر کل ملیں گے اور موٹر چلی گئی۔ سنا تھا کہ چیف سکریٹری صاحب کا مزاج کچھ ناساز ہے پہلے ان کے یہاں گئے۔ وہ بستر پر تھے' بابا کے آنے کی اطلاع پاتے ہی بلا لئے۔ وہاں سے چشتی صاحب ڈپٹی رجسٹرار کشمیر یونیورسٹی کے گھر گئے۔ سب گھر والوں سے ملے۔ اس کے بعد زیدی صاحب کے یہاں گئے۔ وہ نہ تھے ان کی بیگم صاحبہ سے مل کر عثمانی صاحب کے پاس گئے یہ بھی بابا کے قدردان تھے۔ ایک دفعہ انھوں نے بھائی صاحب سے کہا تھا کہ اب ڈاکٹر صاحب کو حیدرآباد چلے جانا چاہیے۔ ملتے ہی بابا نے یہ سوال کیا کہ "آپ نے مجھے واپس چلے جانے کو کہا؟ کس لئے"؟ تو انھوں نے کہا کہ "ہاں اس خیال سے کہا تھا کہ آپ کا صرفہ یہاں بہت ہو رہا ہے' وہاں بچوں کا اور یہاں آپ کا صرفہ بہت ہے۔ پھر آمد و رفت کے اخراجات اتنے زیادہ ہوتے ہیں۔ مجھے اس کا احساس ہے اس لئے کہا تھا"۔ پھر ان کی لڑکیوں کی شادی کا ذکر آیا۔ بابا نے پوچھا کہ کوئی کام مجھے بھی بتلائیے تو کہا کہ آپ سے تو بہت کام لینا ہے۔ بابا نے کہا کہ میں حاضر ہوں۔ اس کے بعد وائس چانسلر سردار کے ایم پانیکر کے یہاں گئے۔ یہ بابا کی بڑی عزت کرتے تھے۔ ہمیشہ ہر ایک سے کہتے تھے کہ میں نے ان کو نواب صاحب کا خطاب دیا ہے۔ خاص انداز کے آدمی ہیں حیدرآبادی شیروانی اور [illegible] ٹوپی۔ ہمیشہ پان کا بٹوہ ساتھ رہتا ہے۔ مخصوص انداز میں تھوڑی دیر سے کھاتے ہیں۔ اسی بٹوے سے بابا انھیں چکنی الائچی دیتے تھے یہ بڑے شوق سے کھایا کرتے تھے بعض وقت خود مانگ لیتے تھے۔ بڑی دیر تک باتیں ہوتی رہیں اور کہا کہ یونیورسٹی کی طرف سے آپ کو روس بھجوانے کی کارروائی کر رہا ہوں۔ اسی جگہ میں خیال تھا کہ حیدر صدیقی صاحب چیف آرکیٹکٹ کے پاس بھی جائیں وہ بھی ادھر ہی رہتے ہیں مگر پانیکر صاحب کے یہاں ہی کافی دیر ہو گئی تو کوئی ڈیڑھ بجے گھر آ گئے۔ کھانا کھایا اور سو گئے۔ تین بجے اٹھے چائے پی اور اپنے کام میں مصروف ہو گئے۔ دو تین دن سے مسلسل بارش ہو رہی تھی۔ پانی خطرے کے نشان کے قریب آ رہا تھا۔ ہر طرف بڑی پریشانی تھی کہ کہیں سیلاب نہ آ جائے۔ اگر ایک آدھ روز اور بارش ہو جاتی تو بہت ممکن تھا کہ سیلاب

آ ہی جاتا۔ خدا نے فضل کیا، بارش تھی۔ شام میں بابا نے والدہ سے کہا کہ چلئے بیگم صاحب جا کر پانی دیکھیں گے کتنا آ
ہم لوگوں سے بھی کہا کہ تیار ہو جاؤ۔ ہم سب کو لے کر پہلے فلڈ چانل دیکھی جو ہماری کالونی کے پیچھے ہی واقع ہے جو
خالی پڑی رہتی تھی۔ اب اس میں پونے حصہ پانی تھا۔ اس کے بعد اس بنڈ پر گئے جہاں سے جہلم بہتا ہے۔
بڑھ گیا تھا کہ تمام ہاؤس بوٹس اوپر آ گئے تھے۔ بابا نے کہا کہ یہ بھی عجیب منظر دیکھنے میں آیا۔ سب جز
زیر آب تھے۔ وہیں ایک جزیرے میں بابا کا چپراسی پیر علی بھی رہتا تھا۔ وہ اس روز صبح نہیں آیا تھا بابا ک
کہ لازمی اس کا جزیرہ بھی پانی کی زد میں آ گیا ہوگا۔ وہاں پہنچے دیکھا کہ اس کے مکان کی پہلی منزل پانی میں
اس پل پر سے جو اس کے گھر کی طرف جاتا تھا کئی فٹ پانی بہہ رہا تھا۔ تھوڑی دیر کھڑے ہو کر دیکھا کئے کہا کہ
نکلنے کے لئے بھی راستہ نہیں کیا گھر چھوڑ دیا ہوگا۔ پھر کچھ اوپر کی منزل میں اندر حرکت معلوم ہوئی تو آواز د
آواز سن کر نکل آیا۔ اس سے خیریت پوچھی۔ ایک دو روز پہلے پیر علی کے لڑکے کا ایک حادثہ میں ہاتھ ٹوٹ
اس کی خیریت پوچھی اور کہا کہ تم تو نکل نہیں سکتے کسی چیز کی ضرورت ہو تو منگوا کر بھجوا تا ہوں۔ اس نے کہا
کل ہی جو ساتھ لایا تھا چل رہا ہے آپ فکر نہ کریں پھر اس سے کہا کہ تم جاؤ سردی ہو جائے گی۔ کچھ دیر بنڈ ر
واپس ہوئے۔ راستے میں ڈاکٹر نذیر کا کلینک پڑتا تھا کہا کہ میں ان سے بھی ملوں۔ اتر کر ان سے باتیں کیں۔ اس
رضوی صاحب لائبریرین کے پاس پہنچے تھوڑی دیر ٹھہرے ان کی بیوی نے چائے کے لئے کہا تو منع کر دیا کہ اب ج
کھانا کھانا ہے تکلیف نہ کیجئے۔ راستے میں عبدالعزیز بٹ کا مکان پڑتا تھا کہا کہ سنا ہوں کہ وہ رجسٹرار ہو گئے
مبارکباد دے لیں گے۔ پہلے وہ ایس پی کالج کے پرنسپل تھے مگر وہ اس وقت موجود نہ تھے۔ وہاں سے ذکی الدین
انجینئرنگ کالج کے پاس گئے کہ کئی روز سے ان کے ہاں سے کوئی نہیں آیا۔ بچے تو آیا کرتے تھے نہ معلوم کیسے ہیں۔
دیر ان کے یہاں ٹھہر کر گھر آ گئے۔ ۸ بجے اپنے وقت پر کھانا کھایا۔ پھر چھوٹے بھائی رضی کو حسب معمول پڑھایا۔ ا
اپنے لکھنے پڑھنے کے کام میں مشغول ہو گئے۔ ۱۰½ بجے بستر پر سونے کے لئے لیٹ گئے۔ ہمیشہ اپنے اوقات کے پا
اس پر برابر عمل پیرا رہے۔ کوئی ایک بجے کے قریب کراہنے کی آوازیں آ رہی تھیں۔ ہم نے یہ سمجھا کہ شاید خوا
رہے ہیں۔ آنکھ کھول کر جو دیکھا تو بابا کے کمرے کی روشنی کھلی نظر آئی۔ اٹھا اور جا کر دیکھا تو والدہ اور بڑ
کھڑے ہوئے تھے۔ بابا کہہ رہے تھے کہ معدے کی خرابی معلوم ہوتی ہے مجھے ذرا ریڈ مکسچر پلا دیجئے۔ دوا پینے
کہ سینے میں جو دباؤ معلوم ہو رہا تھا اک دم کم ہو گیا۔ اب لیٹتا ہوں لیٹے اور پھر اٹھ بیٹھے کہ نہیں یہ کچھ ا
بائیں ہاتھ میں بھی ایک نئی بات پیدا ہو گئی ہے کہ ٹھیک نہیں رہا ہے۔ دوسرے ہاتھ سے سہارا دینا پڑ رہا۔
کی تکلیف مسلسل رہی۔ بڑے بھائی نے کہا کہ ہم ڈاکٹر کے پاس جاتے ہیں۔ انہیں منع کر دیا کہ یہ ہر ایک کی
وقت ہے کچھ دیر اور انتظار کریں۔ لیکن تکلیف تھی کہ کم ہونے کا نام نہیں لیتی تھی یہ دیکھ کر والدہ نے چپکے
بھائی کو ڈاکٹر کے لئے بھجوا دیا۔ وہ کافی دور رہتے تھے۔ آنے میں وقت لگ گیا اور یہ خالی ہی آ گئے۔
ڈاکٹر نائیڈو جو یہاں ہیلتھ آفیسر بن کے آئے ہیں ان کے ہاں گئے۔ بابا نے کہا اب رہنے بھی دو اتنی
کون اٹھے گا۔ سردی بڑھی ہوئی ہے اور بادل گھرے ہوئے ہیں۔ پندرہ بیس منٹ کی کوشش کے بعد

دیکھی اور کہا کہ قلب پر حملہ ہوا ہے اور کسی دوسرے ڈاکٹر کو بلا لینا چاہئے۔ والدہ نے کہا کہ ڈاکٹر مرزا کے لئے موٹر گئی
ہ نہ ملے تو خود نائیڈو صاحب یا زوہ ڈاکٹر کول کے یہاں گئے۔ دروازے پر آوازیں دیں بل بجائی مگر بے سود۔ بڑے
پھر مرزا صاحب کے پاس گئے۔ ادھر تکلیف بڑھ رہی تھی۔ والدہ نے کہا کہ اب جاکر کول صاحب کو جگا کر دیکھو۔
ور چھوٹے بھائی ادھر گئے بمشکل سے وہ جاگے آئے اور دیکھا اس وقت تک تو کھانسی بھی شروع ہو گئی تھی پوچھا کہ
نسی کب سے ہے۔ ان کے یہاں بھی کچھ موجود نہ تھا کہا کہ کسی اور کو بلانا چاہئے۔ والدہ نے کہا کہ موٹر گئی ہے انھوں
ا کو لینے کے لئے کہا کیونکہ اس وقت تکلیف کی شدت سے اٹھتے بیٹھتے گزار رہے تھے۔ تھوڑی دیر ٹھیر کر کہا کہ میں
ن کرتا ہوں' یہ نیچے اترے ہی تھے کہ بڑے بھائی ڈاکٹر مرزا اور ڈاکٹر نذیر کو لے آئے۔ بلڈ پریشر دیکھا گیا انجکشن
ے گئے۔ ایک گھنٹہ ڈاکٹرز ٹھیرے رہے تکلیف میں کچھ کمی نہیں ہوئی۔ مارفیا کے انجکشن کے بعد ایک قے ہوئی۔
انسی اور تکلیف برابر رہی۔ ڈاکٹر کول نے آکسیجن لانے کے لئے چٹھی لکھ کر دی بڑے بھائی فوراً جاکر لائے۔
ن دینی شروع کی گئی۔ اس کے ایک گھنٹہ بعد ذرا آرام ہوا۔ کھانسی کم ہوئی۔ مارفیا اور خواب آور گولی نے
ر کیا اور پونے سات بجے نیند آگئی۔ ڈاکٹروں کا خیال تھا کہ نیند آجائے تو اچھا ہے۔ پورے دو گھنٹے سوتے
۔ اس اثناء میں ڈاکٹر کول آگئے اور یہ معلوم کرکے کہ سو رہے ہیں اپنی ڈیوٹی پر چلے گئے۔ کہہ گئے کہ گیارہ
ے اندر ایک اور انجکشن دلوا دینا۔ بابا اٹھے اور وقت پوچھا تو والدہ نے بتلایا کہ نو بج رہے ہیں۔ کہا کہ
ہت دیر سو گیا۔ اس وقت تک تو میرے کتنے کام ہو جاتے اب طبیعت صاف ہے اٹھ کر منہ ہاتھ دھولوں۔
اثر باقی تھا تھوڑی دیر میں پھر سو گئے۔ پونے گیارہ بجے ڈاکٹر نذیر آئے اور انجکشن دیا گیا۔ ڈاکٹر نائیڈو
گئے تھے ان سے باتیں کیں اپنے مزاج کا حال پوچھا کہ یہ اچانک کیسے ہوا۔ ڈاکٹر نے کہا کہ ایسا ہی ہوتا ہے۔ پہلی
ے کوئی فکر کی بات نہیں۔ اب تو آپ کی طبیعت بہتر ہے آرام کیجئے۔ وہ بھی چلے گئے۔
روز کی طرح پیر علی آئے بابا کے ساتھ کالج جانے کے لئے۔ یہ حالت دیکھ کر حیران رہ گئے کہ کل شام آئے اچھے تھے۔ وہ
ہتی سیکل پر چلے گئے۔ وہاں سب بابا کے منتظر تھے۔ یہ خبر پاتے ہی وانڈ صاحب نے چیف سکریٹری صاحب کو فون کیا۔
کہا۔ انھوں نے فوراً ڈاکٹر حفیظ اللہ کو بھجوایا۔ ڈاکٹر نے آکر معائنہ کیا۔ اس وقت بائیں ہاتھ کی انگلیاں اور ناخن
تھے بابا ہوشیار ہو گئے' پوچھا کہ آپ کا اسم گرامی' ڈاکٹر نے نام کہا۔ پھر کہا کہ آپ کو کیسے خبر ہوئی کس نے بھیجا۔ انھوں
ا کہ چیف سکریٹری صاحب نے فون کیا کہ آپ کو دیکھوں۔ وہ چلے گئے تو والدہ سے کہا کہ ان کا نام یاد رکھئے یا
ے۔ اس اثناء میں یہ خبر تمام سرینگر میں پھیل گئی۔ ڈپارٹمنٹ سب اٹھ آیا۔ ادھر ڈاکٹروں کی دوڑ دھوپ
ی اور تین چار ڈاکٹرز ڈاکٹر علی جان۔ ڈاکٹر مورتی۔ ڈاکٹر حفیظ اللہ آگئے۔ پورا معائنہ کیا۔ بابا نے اپنی
ن کہی اب ڈاکٹر کول اور نائیڈو بھی آچکے تھے۔ ہر ایک نے باری باری دیکھا پھر نیچے چلے گئے' سب نے بیٹھ کر
کیا۔ دوائیں لکھیں۔ ڈاکٹر اوتار سنگھ کو یہیں چھوڑا۔ ان کے ساتھ رات کے لئے دو نرسز کا انتظام کیا۔
وگرام لیا گیا۔ جتنے ہارٹ اسپشلسٹ تھے سب جمع ہو گئے۔ ڈاکٹرز کے نیچے جانے کے بعد والدہ سے کہا کہ میرے ہاتھ
گئے ہیں ڈاکٹرز کچھ آپس میں اشارے کر رہے تھے۔ انھوں نے جواب دیا کہ اب تو کم ہے۔ ڈاکٹر کہتے ہیں کہ

آکسیجن سے ایسا ہوتا ہے۔ ان کا خیال اس طرف سے ہٹانے کی خاطر کہہ دیا۔ وہ خود کتنی پریشان تھیں۔ صفی بھائی بھی وہیں تھے ان سے کہا کہ کون کون آئے ہیں ان کے نام لکھتے جاؤ۔ ایک کاغذ قلم باہر رکھوا دو کہ لوگ اپنے نام اس پر لکھ دیں۔ والدہ نے کہا کہ باتیں نہ کیجئے ہرج ہوتا ہے تو کہا کہ خیر میں بات نہیں کرتا آپ لوگ کم از کم یہاں بیٹھ کر باتیں کیجئے میں سنتا ہوں ہم سب کو تو ڈاکٹروں نے اوپر جانے سے منع کر دیا تھا۔ صرف وہاں والدہ تھیں یا باری باری سے ہم میں سے کوئی جاتا۔ شام سے حالت گرنے لگی۔ بڑے بھائی تو صبح سے مسلسل ڈاکٹروں کو لانے لے جانے اور دوائیں لانے کی چکروں میں رہے آتے بابا کے پاس ٹھہرتے اور پھر چلے جاتے۔ ہم سبھوں نے صبح ناشتہ تو جوں توں کر لیا تھا۔ دوپہر کو کوئی کھانے ہی نہ پایا۔ بھائی صاحب کی حالت تو یہ ہو گئی تھی فکر و پریشانی میں موٹر چلانا بھی دشوار ہو گیا۔ اچھا ہوا کہ سردار بلدیو سنگھ صاحب جو گزشتہ سال ہمارے ہمسایہ تھے ان کا لڑکا آ گیا تھا انھوں نے موٹر ان سے چلوائی۔ گلوکوز اور دوائیں متعدد لائیں لیکن مرض بڑھتا گیا جوں جوں دوا کی۔

لوگ سب جمع تھے چیف سکریٹری صاحب مع اپنی بیگم صاحبہ ۴ بجے سے آ کر بیٹھے رہے۔ پانی کر صاحب بھی مزاج پرسی کے لئے آئے سب ڈاکٹروں کو طلب کیا گیا۔ وہ پھر ایک بار آ کر دیکھ گئے۔ پتہ نہیں ان سے کیا کہا۔ والدہ سے وہ کہہ رہے تھے کہ انسان کے بس میں تدبیر کرنا ہے باقی خدا کے ہاتھ ہے۔ آپ دعا کیجئے۔ اور کہا کہ ابھی میں نیچے بیٹھتا ہوں ڈاکٹر اوتار سنگھ اوپر آئے اور ایک گولی والدہ صاحبہ کو دی کہ اس کو سفوف بنا کر گلوکوز میں ملا کر رکھئے ۸ بجے دینا ہے۔ اور خود کچھ انجکشن دے کر چلے گئے۔ اس کے بعد پونے آٹھ بجے ڈاکٹر صاحب آئے اور کہا کہ وہ دوا دے دینا چاہئے۔ بابا اس وقت سو رہے تھے ڈاکٹر نے کہا کہ انھیں آواز دیجئے۔ صفی بھائی نے بابا کہہ کر پکارا پھر دوسری آواز میں ایسا معلوم ہوا کہ ہوشیار ہو رہے ہیں۔ تیسری آواز پر آنکھیں کھول لیں۔ ڈاکٹر نے کہا کہ دوا پی لیجئے منہ کھولا دو تین چمچے پینے کے بعد کہا کہ بس اب نہیں پی جاتی۔ ڈاکٹر نے کہا کہ چھوڑ دو بہت کڑوی ہے۔ ہم سب بھائی اور والدہ وہیں تھے ڈاکٹر نے بائیں کروٹ لٹا دی اور نیچے چلے گئے۔ کمرے میں لائٹ کم رکھی گئی تھی۔ والدہ وہیں بیٹھی ہوئی تھیں۔ ۸½ بجے کے قریب تنفس میں کچھ فرق آیا۔ یہ گھبرا گئیں سمجھا کہ آکسیجن کا ٹیوب نکل گیا ہے۔ بڑی روشنی کھولی۔ ڈاکٹر کو بلایا قریب سے دیکھا تو سسکیاں لے رہے تھے اور کہتی ہیں کہ سر تکیے سے ڈھل رہا تھا۔ فوراً دو تین ڈاکٹرز آ گئے۔ اوتار سنگھ نے سرینج میں انجکشن لیا۔ ان کو سیدھا کیا۔ انجکشن دینے بھی نہ پائے تھے کہ ایک ہچکی نے ہمیشہ کے لئے انھیں خاموش کر دیا۔ اس وقت ہم سب وہیں موجود تھے۔ کبھی ایسا دیکھا نہ تھا۔ آنکھوں میں اندھیرا چھا گیا پاؤں تلے سے زمین نکل گئی۔

الٹی ہو گئیں سب تدبیریں کچھ نہ دوا نے کام کیا   دیکھا اس بیماریٔ دل نے آخر کام تمام کیا

ابھی کچھ لوگ تھے کچھ جا چکے تھے کہ یہ خبر بجلی کی طرح پھیل گئی۔ لوگ آنے لگے۔ گھر ایک ماتم کدہ بن گیا تھا۔ ریاست کے وزیر اعظم بخشی غلام محمد صاحب اسی وقت پہنچ گئے۔ ہم لوگوں کو روتا دیکھ کر سمجھانے لگے۔ کہا کہ صبر کرو۔ جب حضرت محمد مصطفےٰ صلعم سے موت نہ ٹل سکی تو ہم جیسے انسانوں کا کیا ہے۔ ہر ایک کو مرنا ہے۔ کسی کو آگے کسی کو پیچھے آج وہ کل ہماری باری ہے۔ پھر بڑے بھائی کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر کہا کہ تم کو ہمت سے کام لینا چاہئے اب یہ بار تم پر پڑا ہے۔" معلوم ہوا کہ جناب بخشی صاحب کسی ڈنر پر تھے۔ خبر پاتے ہی ادھر آ گئے۔ چیف سکریٹری صاحب مع بیگم صاحبہ پھر واپس آئے وہ اس وقت آئے تھے کہ

ٹ فون بج رہا تھا اٹھایا تو یہ خبر ملی۔ بڑا رنج کر رہے تھے کہتے تھے کہ اتنی تھوڑی مدت کے لئے ملے تھے تو بہتر ہوتا کہ ان سے ملاقات
نا یہ ہمارے دلوں پر بڑا داغ دے گئے۔ تمام وزراء۔ عہدہ دار۔ ڈاکٹرز وغیرہ سب آ گئے۔ رات بھر لوگ گھر پر جمع رہے
والی عورتیں تھیں سب آ گئیں۔ اکثر یہی کہتی تھیں کہ کل شام ہی تو ملنے آئے تھے۔ ہر ایک رنجیدہ۔ سب ہی رو رہے تھے۔
بخشی صاحب نے والدہ سے دریافت کروایا کہ اب کیا کیا جائے۔ جیسا کہینگی اس پر عمل کیا جائے گا۔ والدہ صاحبہ نے
حیدرآباد لے جائیں گے۔ بخشی صاحب نے فون طلب فرمایا۔ لوگوں نے کہا کہ فون نہیں ہے۔ تعجب سے پوچھا کہ
یا ہے؟ زور صاحب کے پاس فون تک نہ تھا۔" پھر افسوسناک لہجہ میں کہا کہ عجب درویش صفت انسان تھے کہ
ے کہا تک نہیں افسوس ہم نے ان کی قدر نہ کی۔" ہوائی جہاز کے لئے فون کیا گیا۔ حیدرآباد کے چیف منسٹر سنجیوا ریڈی
یا۔ معلوم ہوا کہ وہ کہیں باہر دورے پہ گئے ہوئے ہیں۔ سراج الدین احمد (ماموں صاحب) کو ٹرنک کال کیا گیا
۔ ان کی بھی یہی رائے ہوئی کہ لے آئیں۔ رات بھر اسی میں گزری۔ مگر کوئی تدبیر کارگر نہ ہوئی۔ مسلسل کئی روز کی
راستے خراب کر رکھے تھے۔ مطلع ابر آلود ہونے کے باعث ہوائی سروس بند تھی۔ اس وقت ہم سب کیلئے بڑی ہی
اوقت تھا۔ ممکنہ کوشش جاری تھی۔ لیکن کوئی صورت نہ بنی کہ یہاں سے لے جایا جاتا۔ یہ بھی اتفاقیت ایسی ہی
رو ٹیلیفون کے لائینز تک خراب ہو چکے تھے۔ رات بھر کی کوشش بیکار ثابت ہوئیں آخر کار یہی تصفیہ کرنا پڑا کہ
ے ہو۔ آل انڈیا ریڈیو کو اطلاع کر دی گئی۔ صبح کے نیوز میں یہ خبر بھی سارے ہندوستان اور پاکستان تک پہنچ
ا لوگ ابھی بتا پہنچنے شروع ہوئے۔ دفاتر۔ یونیورسٹی۔ ایس پی کالج۔ امر سنگھ کالج۔ میڈیکل کالج اور دیگر ادارے
گئے۔ یونیورسٹی اور کالجوں کے اساتذہ اور طلبا رہائش گاہ پر آ گئے تھے۔
شی صاحب چیف سکریٹری صاحب کابینہ کے وزراء۔ وائس چانسلر کے یم پانی کر اور دوسرے عہدہ داران
دوست احباب بھی جمع ہو گئے۔ محلہ سولنا کے تمام لوگ آ گئے اور غسل کا تمام سامان اپنے ساتھ لائے اور جاتے
ے ہمسایہ تھے مسلمان تھے ہمارا فرض ہے کہ اس کام کو انجام دیں ہم اپنے قبرستان میں جگہ دیں گے۔ جب دیکھا
حب اور ان کے تمام لوگ انتظام میں ہیں تو خاموش ہو گئے۔ بارش برابر جاری تھی۔ غسل تک یہ سلسلہ جاری رہا
جانے کا وقت آیا تو بارش ختم ہو گئی۔ میت ٹرک میں رکھی گئی۔ ہم سب بھائی اور کئی لوگ اس میں سوار ہو گئے
گئے یہ تھی اس کے پیچھے بخشی صاحب کی پھر چیف سکریٹری صاحب، وائس چانسلر اور دیگر وزراء کی موٹریں ان کے
ے دوست احباب کی موٹریں تھیں۔ لوگوں کی کثیر تعداد کے پیش نظر بسوں کا انتظام کیا گیا تھا۔ جلوس بہت
حساب موٹریں، بسیں، تانگے اور سائیکلیں تھیں۔ راستے میں لوگ شریک ہوتے رہے۔ چونکہ مکان سے خانیار شریف
وقت لگا۔ اسی مسجد میں نماز پڑھائی گئی سب ہی شریک تھے۔ خانیار شریف حضرت غوث اعظم پیر دستگیر کا
برک جگہ مانی جاتی ہے اور چونکہ بابا قادری تھے اس لئے اس مناسبت سے یہ جگہ تجویز کی گئی اور وہیں سپرد خاک
ے وقت لوگ مٹی دیکھ کر کہہ رہے تھے کہ "بڑی صاف ستھری ہے معلوم ہوتا ہے کہ یہ بڑی نیک ہستی تھی،
نا کی بارش کے باوجود اتنی خشک مٹی نکلی۔" ہم سب گھر آتے ہی پھر بارش شروع ہو گئی اور دو تین دن تک
ی رہی لوگوں کی آمد کا سلسلہ جاری رہا۔ مہاراجہ کرن سنگھ کے بھائی سے ان کے ساتھ صاحب

تعزیتی پیام لائے۔ بیگم صاحبہ بخشی صاحب بھی والدہ کے یہاں تعزیت کے لئے تشریف لائیں اور اسی روز زیارت کی حاضری ان کی طرف سے آئی۔ گھر والوں کے سوا جتنے لوگ جمع تھے سبھوں نے کھایا۔ اس غریب الوطنی میں غیروں نے وہ ساتھ دیا کہ ہمیشہ یاد رہے گا۔

حاضریوں کا سلسلہ دنوں جاری رہا۔ ہر ایک نے باری باری باوجود والدہ کے منع کرنے کے بھجوائی۔ اور ان مہرباں احباب نے ہم لوگوں کی دلجوئی میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی۔ والدہ کا خیال کرتے ہوئے اپنا گھر بار چھوڑ کر کئی راتیں ہمارے یہاں گزاریں۔ اس سلسلے میں بیگم ڈاکٹر ذکی الدین احمد، بیگم چشتی اور بیگم رضوی قابل ذکر ہیں۔ دن گزرتے دیر نہیں لگتی۔ تیسرا دن یوں آگیا فاتحہ سوم بعد عصر مقرر تھی۔ زنانہ اور مردانے میں لوگ جمع ہونے لگے۔ کئی قرآن ختم ہوئے۔ حافظ قرآن بھی مقرر تھے۔ یہاں کے رواج کے مطابق حلوہ روٹی اور قہوہ سے سب کی خاطر کی گئی اور غربا میں تقسیم کیا گیا۔ مزار پر پھول چڑھائے گئے۔ فاتحہ پڑھی گئی۔ ہنوز بارش کا سلسلہ جاری تھا مگر صرف اتنی دیر تھمی کہ ہم لوگ فاتحہ کے لئے نکلے اور گھر لوٹ آئے ہی تھے کہ موسلا دھار شروع ہوگئی۔ ہماری آنکھوں سے آنسوؤں کا سیلاب رواں تھا اور آسمان بھی ہم پر ستم ڈھاکر ہمارا شریک غم بنا تھا۔

ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور کو مرحوم لکھتے ہوئے قلم تھرتھراتا ہے مگر اس حقیقت پر پردہ ڈالنے کی ضرورت ہی کیا ہے کہ وہ اپنے بلند اخلاق اور ہنس مکھ چہرے کے ساتھ ہم میں نہیں رہے، ہم اس ہنس مکھ چہرے کو ڈھونڈیں گے اور نہیں پائیں گے ایسے بلند اخلاق کو ہماری آنکھیں تلاش کریں گی اور وہ نظر نہیں آئے گا۔ لیکن اس حقیقت سے کوئی انکار نہیں کرسکتا کہ جب تک ان کی تحریریں موجود ہیں وہ زندہ رہیں گے۔

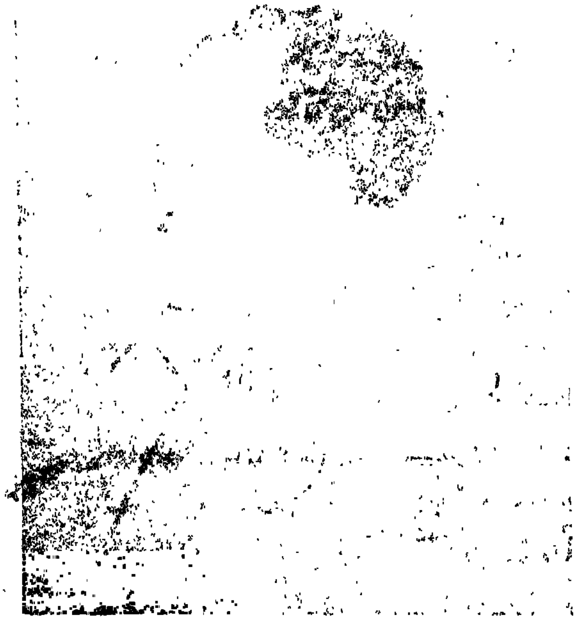
(ہفتہ وار "الفاروق" کامٹی۔ ہینڈلوم نمبر۔ ۵۔ اپریل ۶۲ء)

ڈاکٹر زور

کا

فن





پروفیسر عبدالمجید صدیقی

تاریخ دکن میں ڈاکٹر زور کا حصہ

۲۴ ستمبر ۱۹۶۲ء کی رات کو حضرت زورؔ کا انتقال ہوا۔ زورؔ صاحب کی موت علمی دنیا کا بڑا حادثہ ہے۔ ایک عربی کہاوت ہے "موت العالِم موت العالَم" عالم کی موت تنہا اس کی موت نہیں ہوتی بلکہ ایک دنیا کی موت ہوتی ہے۔ ڈاکٹر زور کی موت بھی اردو دنیا کا ایسا نقصانِ عظیم ہے کہ شاید اس کی آئندہ تلافی نہ ہو سکے۔ ان کی موت پر ہند و پاکستان کا ہر اردو بولنے والا رو دیا۔ اور ہر اردو ادارے نے آنسو بہائے۔ اور اب تک بہا رہے ہیں۔ مرحوم میں ایسی قوتِ محرکہ تھی کہ وہ برسوں کا کام ہفتوں میں کرتے تھے۔ جس زمانے میں وہ اپنی اعلیٰ تعلیم کے لئے جامعہ عثمانیہ میں داخل ہوئے اردو کی خدمت کو اپنا وظیفۂ حیات بنایا اور مرتے دم تک یہ وظیفہ دہراتے رہے۔ یہ کس کو معلوم تھا کہ وہ آج ہم میں نہ ہوں گے اور اردو دنیا ان کا سوگ منائے گی۔ ہم سب کی تمنا تھی کہ وہ آئندہ دس سال تک اردو کی خدمت کرتے رہیں گے اور واقعی وہ چند سال اور زندہ رہ جاتے تو اردو کہاں سے کہاں پہنچ جاتی۔

اردو کے علاوہ ڈاکٹر زورؔ کا بہت بڑا کارنامہ تاریخِ دکن کا احیا بھی ہے۔ مرحوم اچھے پائے کے مورخ بھی تھے۔ حقیقت یہ ہے کہ ہر زبان اس کے ملک کے تاریخ و تمدن کا آئینہ ہوتی ہے۔ جو زبان بھی ہمارے مطالعہ میں آئے اس میں زبان کے بولنے والوں کی تاریخ و تمدن چھپا رہتا ہے جوں جوں تمدن بڑھتا ہے زبان بھی نکھرتی ہے اور اس میں لطافت پیدا ہوتی ہے لسانیات کا مطالعہ کرنے والے پہلے قوموں کی تاریخ اور ثقافت کی چھان بین کرتے ہیں اور اسی چھان بین سے انھیں زبان کی صحیح بنیاد اور اس کی ارتقائی منزلیں معلوم ہو سکتی ہیں۔ ڈاکٹر زور تو اردو کے عالم لیکن جب وہ اردو کا مطالعہ کرنے بیٹھتے تو انھیں اس کے پیچھے تاریخ و تمدن کے بڑے دفینے نظر آتے یہ دفینے ہی تو زبان کے بڑے محرک ہیں۔ تمدن کے ارتقاء سے ہی زبان آگے بڑھتی ہے اس لئے زورؔ مرحوم نے اردو کی سرپرستی کے ساتھ تاریخ کے مطالعہ پر بھی اپنی خاص توجہ مبذول کی کیونکہ تاریخ کے بغیر زبان کی چھان بین نہیں ہو سکتی۔

اب اردو کو دیکھو تو وہ کئی ارتقائی منزلوں کے ساتھ ہمارے سامنے آتی ہے اس کے اصلی جنم بھوم سے متعلق اب تک کوئی کچی پکی بات نہیں کہی گئی۔ شاید اہلِ دکن دکھنی زبان کو اردو کی ماں قرار دیں۔ خواہ یہ دعویٰ صحیح ہو یا نہ ہو لیکن اس حقیقت کو کون انکار کر سکتا ہے کہ اہلِ دکن نے اپنے مخصوص انداز میں اردو کی بیش بہا خدمت انجام دی اور بڑا سرمایہ چھوڑا۔ دکن میں جس قدر اردو یا دکھنی کا سرمایہ ملتا ہے ویسا شاید ہندستان کے دوسرے خطوں کو نصیب نہ ہو۔ دکھنی ادب دکن کا بہت بڑا سرمایۂ حیات ہے جس میں عوام کے علاوہ خود سلاطین کا بھی شایانِ شان حصہ رہا ہے۔ سچی بات یہ ہے کہ گولکنڈے اور بیجاپور کے تاجداروں نے دکھنی زبان کی جس قدر سرپرستی کی اور اس درخت کی جس قدر آبیاری کی وہ بیان سے باہر ہے۔ انھیں تاجداروں کا دیکھا دیکھی ملک کے شاعروں نے بھی اس زبان میں طبع آزمائی شروع کی اور دکھنی کو اپنی شاعری سے مالا مال کر دیا۔ ڈاکٹر زور نے عام اردو کے ساتھ دکھنی زبان کو اجاگر کرنے میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی۔ دکھنی زبان کی کتابیں جو گولکنڈہ اور بیجاپور کے شاعروں نے تصنیف کی تھیں ان کو مرتب کر کے شائع کیا۔ اس بات کو نہیں بھولنا

چاہیئے کہ ڈاکٹر زور نے سب سے پہلے اس میدان میں قدم رکھا تھا۔ اور کلیات محمد قلی شائع کیا۔ کلیات محمد قلی کی تدوین اور اس کی اش کوئی چھوٹا کام نہیں ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ کلیات دکھنی زبان کا شاہکار ہے۔ اس میں شاعر نے آندھرا پردیش کی سیاست و معاشرت تصویر کھینچی ہے۔ اس کلیات کو آندھرا پردیش کی زندگی کا مرقع کہنا چاہیئے۔ ڈاکٹر زور کی رہبری کا نتیجہ یہ ہوا کہ بے شمار اہل قلم اس میدان اتر آئے اور دیکھتے دیکھتے کئی دواوین اور مثنویاں منظر عام پر آگئیں اور اس کے طفیل میں دکن کی تاریخ اور ثقافت بھی بے نقا اگر یہ کلام منظر عام پر نہ آتا تو نہ صرف دکھنی ادب چھپا رہتا بلکہ تاریخ دکن بھی آنکھوں سے اوجھل رہتی۔ قوموں کی زندگی تاریخ ہی سے ہے تاریخ نہ ہو تو قومیت کہاں اجاگر ہوسکتی ہے۔

اب ہماری سمجھ میں آتا ہے کہ کیوں ڈاکٹر زور نے دکھنی شاعری کو اپنے مطالعہ کا مرکز توجہ بنایا تھا۔ اور اپنے غیر سے اس شاعری کو اجاگر کیا۔ اور غالباً مرحوم نے اسی شاعری کے حقائق سمجھنے کے لیئے تاریخ دکن کے مطالعہ کو بھی اپنا فرض اولین سچی بات یہ ہے کہ بغیر تاریخی پس منظر کے دکنی شاعری تو کیا دنیا کی کوئی شاعری سمجھ میں نہیں آئے گی۔ ہر ادب اپنی قوم کو ایک زنا دیتا ہے۔ اور اس سے نہ صرف اس زمانہ کے سیاسی وسماجی رجحانات معلوم ہوتے ہیں بلکہ ایک فلسفۂ حیات بھی سامنے آتا ہے۔ فلسفہ تاریخ کی روشنی کے بغیر سمجھ میں نہیں آسکتا۔ قوموں کی زندگی میں صدہا سیاسی وسماجی تلاطم آتے ہیں اور انھیں تلاطم سے قومی زندگی کرا اور اس کے سامنے ایک مقصد حیات متعین ہوتا ہے۔ اور یہ تمام تصورات بالآخر ادب کے ہر گوشے سے ظاہر ہوتے ہیں۔ ادب اسل زندگی کا آئینہ ہوتا ہے۔ دوسرے طریقے سے دیکھا جائے تو ادب ایک تاریخ بھی ہے۔ اسی وجہ سے ڈاکٹر زور مرحوم نے اپنے د بڑا حصہ تاریخ دکن کے مطالعہ کے لئے وقف کر دیا تھا۔ اور اپنے تاریخی شغف سے تاریخ دکن میں زندگی پیدا کردی۔

اب یہ دیکھنے کے لئے کہ مرحوم نے تاریخ دکن میں کس طرح روح پھونکی تھی ان کے چند کارناموں کو روشنی میں لانا ضرور تاریخ کے بڑے ماخذوں میں کتابوں کے علاوہ قدیم تاریخی آثار، مندر، مساجد، مقبرے، آلات و اسلحہ اور ظروف جیسی بہتیری چ ہیں۔ صرف تاریخ کی کتابیں لکھنے سے یہ مضمون پیدا نہیں ہوتا۔ اور پورا پس منظر سامنے نہیں آتا۔ بلکہ صحیح ثقافت تعمیری آثار اور ظ اسلحہ سے روشنی میں آتی ہے اسی وجہ سے ڈاکٹر زور مرحوم نے تاریخ کے تمام گوشوں پر نظر ڈالی اور ہر گوشے کی چھان بین کی۔ تاریخ میں مرحوم کی دو کتابیں "حیات محمد قلی" اور "حیات میر محمد مومن" پایہ کی کتابیں ہیں جو بڑی جستجو اور کاوش سے لکھی گئیں۔ ؟ مرحوم نے ان کتابوں کا مواد جمع کیا ہے اس کی تعریف نہیں ہوسکتی۔ ان کتابوں کے پڑھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ مرحوم صرف عالم لسانیات ہی نہ تھے بلکہ مورخ بھی تھے۔ یہ دو کتابیں اصل میں دو بڑی شخصیتوں کے سوانح حیات ہیں۔ غور سے دیکھا جائے تو ان میں ایک صدی کی تاریخ سموئی ہوئی ہے۔ مرحوم نے میر محمد مومن کو اپنی تاریخ نگاری کے لئے اس وجہ سے منتخب کیا تھا کہ یہ دونوں بادشاہ اور وزیر گولکنڈے کی باعظمت شخصیتیں تھیں دونوں دکن کے بڑے تاریخ ساز اور ثقافت کے معمار تھے۔ ان دونوں نے اپنی ثقافتی خدمات سے گولکنڈے کی سلطنت میں چار ان سوانح سے گولکنڈے کی تاریخ کا ایک بہت بڑا حصہ محفوظ ہوگیا۔

تاریخ نگاری کے علاوہ ڈاکٹر زور مرحوم نے دکن کے آثار قدیمہ کی بھی چھان بین کی۔ مسجدوں، مندروں، اور مقبروں کو اپنی آنکھو دیکھا کیونکہ یہ آثار تاریخ اور ثقافت کے بڑے ماخذ ہیں۔ جب کبھی موقع ملتا وہ خود ان تاریخی مقامات کی تلاش میں نکل جاتے اور دوسروں کو دکھلاتے تھے۔ دکن میں ماضی کے بے شمار آثار بکھرے پڑے ہیں اور بہتیرے ایسے ہیں جو اب مٹ رہے ہیں۔ از یاد رفتہ ہیں۔ مرحوم نے بعض آثار کی خود نشاندہی کی عوام کو بتایا۔ بعض مقبرے جو بے نام و نشان ہوگئے تھے ان کا پتہ چلایا بعض مقبروں

نصب کئے۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ دکن کی بہترین شخصیتیں جو از یاد رفتہ ہوگئیں تھیں وہ مرحوم کی نشان دہی اور کتبات کے تنصیب کی بدولت زندہ ہوگئیں۔ اور لوگ ان کو جاننے لگے۔ یہ آئندہ نسلوں کے لئے چراغ ہدایت کا کام دے رہی ہیں۔

تاریخی میوزیم بھی مرحوم زور کے تاریخی شغف کا آئینہ دار ہے۔ یوں تو "ایوان اردو" کی پوری عمارت مرحوم کی اہم یادگار اور حیدرآباد کی بڑی ذہنی پیداوار ہے۔ لیکن اس کا بصیرت افروز شعبۂ تاریخی میوزیم ہے جس میں صدیوں کے آثار جمع ہیں۔ ان آثار میں سکوں، فرمانوں، کتبوں اور تحریروں کے علاوہ قدیم نقاشی کے نمونے ظروف، اسلحہ اور فرنیچر کا بیش بہا ذخیرہ شامل ہے۔ اس کو دیکھنے سے دکن کی صدیوں کی تاریخ آنکھوں کے سامنے آجاتی ہے۔ دنیا میں میوزیم کئی طرح کے پائے جاتے ہیں۔ بعض میوزیم صرف نقاشی کے نمونے پیش کرتے ہیں۔ اور بعضے صرف اسلحہ اور ظروف سے پُر ہیں لیکن "ایوانِ اردو" کا میوزیم دکن کی ہمہ جہتی زندگی کا بہترین مخزن ہے جو لوگ تاریخ نہیں پڑھتے ان کے لئے میوزیم تو ایک زندہ تاریخ کا کام دیتا ہے لیکن تاریخ پڑھنے والوں کے لئے بھی اس میں معلومات کا بڑا ذخیرہ موجود ہے۔ دکنی تمدن کے جو پہلو اس میوزیم سے واضح ہوتے ہیں وہ سب لکھی ہوئی تاریخوں سے معلوم نہیں ہوتے۔ اور تمدن کا صحیح تصور ذہن میں مرتسم نہیں ہوتا بلکہ اس کے لئے میوزیم کا معائنہ ضروری ہوتا ہے کیونکہ اس سے قومی زندگی کے اکثر پردے کھل جاتے ہیں۔ مرحوم ڈاکٹر زور نے اس میوزیم کو سنوارنے میں بڑی تگ و دو کاوش کی اور اس میں ہزاروں روپیوں کا سامان جمع کر دیا۔ جس کو مرحوم کی بہت بڑی یادگار سمجھنا چاہیئے جو کبھی بھولی نہیں جائے گی۔

بہ شکریہ بشیر الدین مری انگر

۱۳۲۲ھ صبح ۵ بجے نام رکھا گیا سید غلام محی الدین عرف چاند پاشاہ۔ میرے خاندان میں دستور ہے کہ اپنے بزرگوں کے نام رکھے جاتے ہیں۔ غلام محی الدین نامی میرے خاندان میں کوئی نہیں ہوئے۔ یہ نام رکھنے کا قصہ اس طرح ہے کہ جب میری لڑکی صدر النساء کا انتقال ہوا تو چونکہ میرا پہلا صدمہ تھا مجھے بہت رنج ہوا۔ تعزیت کے لئے حضرت مولانا محدث محمد عبدالوہاب نقشبندی جو میرے استاد اور پیر طریقت تھے، تشریف لائے اور تسلی آمیز گفتگو کے بعد فرمایا کہ تم کو اولاد بہت ہوگی۔ صبر کرو۔ "الصبر مفتاح الفرج" پھر فرمایا کہ تمہارے حمل میں حمل ہوگا۔ میں نے عرض کیا کہ چھٹا مہینہ ہے۔ ارشاد ہوا کہ انشاء اللہ اب کی دفعہ فرزند نرینہ ہوگا۔ اس کا نام حضرت محبوب سبحانی عبدالقادر جیلانی قدس سرہٗ کے نام پر رکھنا۔ عمر دراز ہوگی اور یہ تجربے کی بات ہے۔

جب یہ لڑکا پیدا ہوا اور حضرت تشریف لائے تو میں نے اس نومولود کو آپ کی آغوش میں دیا۔ حضرت نے پیار کیا اور دیر تک دعا دیتے رہے۔ اور سید غلام محی الدین نام تجویز فرمایا۔ حضرت محدث نے اس لڑکے کو بار ہا دیکھ کر فرمایا کہ یہ لڑکا صاحب اقبال ہوگا۔ اس کی پیشانی پر علائم پائے جاتے ہیں۔ چونکہ اس کے لئے حضرت ممدوح نے اور میں نے بھی سفر حضر میں خاص طور پر دعائیں مانگی ہیں، اس لئے مجھے امید ہے کہ یہ ضرور صاحب اقبال اور نامور لوگوں میں سے ہوگا اور مدارج ترقی طے کرے گا۔

(ڈاکٹر زور کے والد حضرت زعم کے ایک غیر مطبوعہ روزنامچے سے)

نصیر الدین ہاشمی

میرے عزیز دوست ڈاکٹر زور مرحوم

آج سے پچاس سال پہلے ایک حیدرآبادی علم دوست صاحب علم یعنی مولوی مظفر بیگ صاحب مرحوم نے امداد باہمی کے اصول پر ایک ادارہ قائم کیا تھا۔ اس کا نام "مکتبہ ابراہیمیہ" تھا۔ اس ادارہ میں اردو کی اچھی اچھی اور معیاری کتابیں فروخت ہوتی تھیں اور ایک علمی ادبی رسالہ "مکتبہ" کے نام سے ماہوار شایع ہوا کرتا تھا۔ اس زمانہ میں جامعہ عثمانیہ کو قائم ہوئے دو تین سال ہو چکے تھے۔ چند فرزندان جامعہ کو مکتبہ ابراہیمیہ اور رسالہ مکتبہ سے دلچسپی تھی۔ ان کے مضامین رسالہ مکتبہ میں شایع ہوتے تھے۔ ان ہی فرزندان جامعہ میں ایک نوجوان علم دوست اردو کے پرستار، طبقہ مشائخین سے تعلق رکھنے والے ہونہار فرزند جامعہ بھی شامل تھے جو کسی قدر پست قد، گورا رنگ، اچھی صورت و شکل کے اور جن کی چھوٹی سی سیاہ ڈاڑھی بھی تھی جو گورے رنگ پر خوب زیب دیتی تھی یہ تھے سید محی الدین قادری زور۔

رسالہ مکتبہ میں میرے مضامین بھی شایع ہوتے تھے اس لئے میں بھی کبھی کبھی ادارہ مکتبہ ابراہیمیہ جاتا تھا۔ رسالہ مکتبہ اور مکتبہ ابراہیمیہ کی وجہ سے ہم دونوں واقف ہو گئے تھے اور دوستی کا ہاتھ لا چکے تھے۔ زور صاحب کی پہلی کتاب روح تنقید شایع ہو چکی تھی۔ زور صاحب ۱۹۲۲ء میں جامعہ عثمانیہ سے ایم اے ہونے پر حکومت کے وظیفہ پر مزید تعلیم کے لئے انگلستان روانہ کئے گئے اور مجھے بھی اپنی کتاب دکن میں اردو کے صلہ میں حکومت نے یورپ جانے کے لئے امداد منظور فرمائی۔ میں ستمبر ۱۹۲۵ء میں لندن پہونچا۔ اکتوبر کے پہلے ہفتہ میں جب برٹش میوزیم میں پہونچا تو اس کے احاطہ میں دور سے ایک نوجوان کلین شو، دیدہ زیب سوٹ زیب تن کئے اسمارٹ چہرہ والے نظر آئے قیاس ہوا غالباً سید محی الدین قادری زور ہوں گے۔ چنانچہ قریب آکر گلے ملے۔ زور صاحب میرے انگلستان آنے کی خبر بہت پہلے سن چکے تھے اور ڈاکٹر بیلی پروفیسر اسد کا پیغام دیا کہ وہ مجھ سے ملنے کے خواہشمند ہیں۔ شہر لندن میں زور صاحب ایک سمت میں قیام کرتے تھے اور دوسری سمت میں میں رہا کرتا تھا مگر جب وہ برٹش میوزیم یا انڈیا آفس لائبریری آتے یا میں اسکول آف اورینٹل اسٹڈیز جاتا تو موصوف سے ملاقات ہوتی تھی کبھی وہ میری قیام گاہ پر آتے اور میں کبھی ان کی قیام گاہ پر بھی جایا کرتا جہاں اسی مکان میں پروفیسر سید محمد علی خاں اور ان کے بھائی سید یٰسین علی خاں صاحب رہا کرتے تھے۔ غرض ہماری دوستی میں ترقی ہوتی گئی اور اتحاد میں خلوص آ گیا۔

لندن سے واپسی کے بعد ڈاکٹر زور صاحب جامعہ عثمانیہ کے شعبہ اردو میں اولاً مددگار پروفیسر اور پھر ترقی کر کے پروفیسر ہو گئے۔ اس کے بعد وہ دارالعلوم اور پھر چادرگھاٹ کالج کے پرنسپل ہوئے بالآخر وہ سال میں وظیفہ پر سبکدوش ہوئے اور کچھ عرصہ بعد وہ کشمیر چلے گئے جہاں صدر شعبہ کے علاوہ ڈین آف فیکلٹی بھی بنائے گئے۔ یہ ہے ڈاکٹر زور صاحب کی اعلیٰ تعلیم اور ملازمت کی مختصر ترین داستان اس ملازمت کے دوران میں زور صاحب کو کیا کیا دشواریاں پیش آئیں کیسے کیسے مرحلے درپیش ہوئے۔ کن کن مشکلات کا سامنا ہوا اس کی صراحت یہاں غیر ضروری ہے۔ اور اس کا کوئی موقع بھی نہیں ہے۔

انگلستان سے واپسی اور ملازمت کے بعد حیدرآباد کے ایک صاحب علم اعلیٰ عہدہ دار یعنی نواب رفعت یار جنگ کی دختر سے زور صاحب کی

ی ہوگئی اور زور صاحب کچھ عرصہ کے بعد پرانے شہر کے اپنے والد کے مکان سے اپنے نئے مکان خیریت آباد منتقل ہوگئے۔ صاحب اولاد ہوئے۔ لڑکیوں کی شادی کی ڈاکٹر زور صاحب کے دوستوں کا دائرہ نہایت وسیع تھا۔ اُمرا، جاگیردار۔ پروفیسر انجنیر۔ ڈاکٹر، تجار۔ شاعر۔ ادیب ن وہ ہر فن کے اشخاص سے متعارف تھے اور اچھے دوست ثابت ہوئے تھے۔ حیدرآباد آتے ہی زور صاحب اپنے علمی ادبی تاریخی خدمات کارناموں کے باعث مشہور ہوگئے۔ اور ان کے مخالف اور بعض منافق دوست حسد سے جلنے لگے۔ زور صاحب کے علمی خدمات کو چند اقسام تقسیم کیا جاسکتا ہے۔

(۱) اردو کی تعلیم دینا (۲) کتابیں تالیف کرنا (۳) ادارہ ادبیات اردو قائم کرنا اور اس کو ترقی دینا۔ (۴) ادارہ میں کتابیں اور ودات کا جمع کرنا (۵) یوم سلطان محمد قلی کی آغاز کرنا (۶) آزاد انسٹی ٹیوٹ کا قائم کرنا (۷) اپنے شاگردوں وغیرہ سے کتابیں لکھوانا (۸) علمی اداروں شرکت (۹) شاعری۔

(الف) زور صاحب انگلستان سے واپسی کے بعد جامعہ عثمانیہ کے شعبہ اردو میں ماموہ ہوئے اور بی اے۔ ایم اے کے طلباء اور طالبات کو دو نظم اور نثر کی تعلیم دیتے تھے پھر جب دارالعلوم اور چادر گھاٹ کالج میں پرنسپل ہوگئے تو وہاں بھی روزآنہ ایک دو گھنٹے تعلیم دیا کرتے تھے۔ پ کی تعلیم سے طلبا خوش تھے زور صاحب کا یہ معمول تھا کہ نصاب تعلیم کو اس کے مقررہ مدت میں ختم کردیا جائے۔ جب جامعہ عثمانیہ میں پی ایچ ڈی لئے ریسرچ ہونے لگا تو ایسے طلبا اور طالبات بھی آپ کے طریقہ تعلیم۔ طریقہ ہدایت۔ رہبری ریسرچ سے خوش رہا کرتے۔ زور صاحب اپنی یہی ذمہ داری کو پوری طرح محسوس کرتے تھے اور اس کے لحاظ سے درسی کتب مقررہ وقت میں ختم کرتے اور اس کے متعلق دیگر کتابوں سے ستفادہ کرانے اور معلومات کے وسیع کرنے کے لئے ہمیشہ شاگردوں کو ہدایت دیتے وہ اچھے رہبر اور رہنما ثابت ہوتے تھے۔ موصوف کے بہوں شاگرد آج اردو کے اچھے اسکالر اور اچھے ادیبوں میں شمار ہوتے ہیں۔ جس سے واضح ہوسکتا ہے کہ زور صاحب کس طرح تعلیم دیا کرتے علمی ترقی کرنے کے گُر بتاتے، ریسرچ کا طریقہ ذہن نشین کراتے تھے وہ اچھے اور قابل پروفیسر ذہین رہبر اور ہمدرد پرنسپل رہے۔

(۲) زور صاحب کی تصانیف اور تالیفات کو مختلف فنون میں تقسیم کیا جاسکتا ہے یعنی

۱۔ تنقید۔ ۲۔ لسانیات۔ ۳۔ تاریخ ادب۔ ۴۔ تاریخ و سوانح عمری۔ ۵۔ افسانہ۔ ۶۔ وضاحتی فہرست ہائے کتب۔ ۷۔ مجامع۔

تنقید: روح تنقید۔ تین شاعر۔ روح غالب ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ تنقیدی مقالات۔

۲۔ لسانیات: ہندستانی لسانیات۔ اردو کے اسالیب بیان۔

۳۔ تاریخ ادب: اردو شہ پارے۔ عہد عثمانی میں اردو کی ترقی۔ داستان ادب حیدرآباد۔ محمود غزنوی کی بزم ادب۔ دکنی ادب کی تاریخ

۴۔ تاریخ و سوانح: حیات سلطان محمد قلی قطب۔ میر محمد مومن۔ فرخندہ بنیاد۔ سرگذشت غالب۔ سرگذشت حاتم۔

۵۔ مختصر افسانے گولکنڈہ کے ہیرے۔ سیر گولکنڈہ۔ طلسم تقدیر و فسانہ تازیانہ۔

۶۔ کتب خانہ ادبیات کی قلمی کتابوں کی پانچ فہرستیں۔

۷۔ مجامع یعنی انتخابات دواوین اور مکتوبات۔

مرقع سخن حصہ اول و دوم۔ تذکرۂ گلزار ابراہیم۔ متاع سخن۔ کیف سخن۔ رمز سخن۔ معانی سخن۔ بادۂ سخن۔ مکتوبات شاد عظیم آبادی۔ شاد و اقبال۔ کلیات قلی قطب شاہ۔

ڈاکٹر زور صاحب کی تمام کتابوں پر تنقیدی نظر ڈالی جائے تو مضمون طویل سے طویل تر ہوجائے گا۔ یہ کام اس کا ہوگا جو

پی ایچ ڈی کے لئے ڈاکٹر زور اور ان کے کارنامے کو اپنا عنوان قرار دے۔

میں یہاں مختصر طور پر ڈاکٹر صاحب کے چند شاہکاروں پر کچھ تبصرہ کروں گا۔ میرے خیال میں یہ کتابیں حسب ذیل ہیں۔

(۱) سلطان محمد قلی قطب شاہ (۲) میر محمد مومن (۳) تذکرہ اردو مخطوطات (۴) روح تنقید (۵) داستان ادب

(۱) حیات سلطان محمد قلی قطب شاہ۔ یہ کتاب رائل سائز کے (۲۹۶) صفحات پر حاوی ہے۔ اس میں قطب شاہ پانچویں بادشاہ سلطان محمد قلی کے حالات زندگی کے علاوہ اس کے کلام پر تبصرہ ہے۔ حالات زندگی میں اس وقت معاشرت پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ یہ کتاب ایک بادشاہ کی سوانح عمری ہے مگر ایسی سوانح عمری ہے کہ جس میں سلا حالات پیدائش، تعلیم و تربیت۔ آغاز شباب۔ شباب کی بدمستیاں۔ رندی اور مستی۔ جوانی و رعنائی۔ مذہبی پابندی فتوحات جنگ و جدل، تدبر و سیاست۔ بیرونی تعلقات کے ساتھ ساتھ اس زمانے کے رسم و رواج پر سیر حاصل بحث کی گ بعد سلطان کے کلام پر تنقیدی نظر ڈالی ہے۔

اس کتاب سے واضح ہوتا ہے کہ ڈاکٹر زور صاحب صرف ایک ادیب اور نقاد نہیں بلکہ بلند پایہ مورخ ب تھا بھی انھوں نے واقعات کی تحقیق اور جانچ میں پوری کد و کاوش کو کام میں لایا ہے اور تاریخی موشگافی کر کے بڑی چھا واقعات لکھے ہیں۔ تمدن اور معاشرت پر جو روشنی ڈالی ہے اس سے قطب شاہی دور کی تصویر سامنے آجاتی ہے۔ ج سے انھوں نے واقعات کی عکاسی کی ہے وہ ایک بہترین ماہر فن کی حیثیت رکھتی ہے چونکہ سلطان اردو کا سب سے شاعر تھا اس حیثیت سے اس کے کلام پر جو تنقیدی نظر ڈالی ہے وہ ہر آئینہ قابل ستائش ہے۔ انھوں نے سلطا خوبیاں اجاگر کی ہیں اس کے ہر قسم کے کلام پر تنقید کر کے یہ واضح کیا ہے کہ سلطان اپنے عہد کا زبردست اور قادر ا اور اس کا کلام درحقیقت کلام الملوک ملک الکلام کہلانے کا مستحق ہے۔

(۲) "میر محمد مومن" علامہ میر محمد مومن قطب شاہی عہد کے پیشوائے سلطنت اور وزیر اعظم ہونے کے ع عالم اور مصلح بھی تھے جن کا مقبرہ "دائرہ میر مومن" آج تک حیدر آباد کا مشہور مدفن ہے۔

ڈاکٹر زور صاحب کی یہ کتاب متوسط سائز کے (۲۱۱) صفحات پر مشتمل ہے۔ اس کے دس باب ہیں۔ ان خاندانی حالات۔ تعلیم و تربیت۔ ایران میں عروج اور پھر دکن میں آنے اور یہاں آکر ترقی کرنے۔ اقتدار حاصل ک امامیہ کی ترویج۔ فن تعمیر کی مہارت اور حیدرآباد کو تعمیر کرنا اور دوسرے تعمیری کارنامے۔ ان کی جاگیرات۔ وز ت ان کے کارنامے۔ علمی حیثیت سے ان کی یادگاریں۔ تصنیف و تالیف میں ان کا مرتبہ وغیرہ امور کو تفصیل سے بیان

علامہ میر محمد مومن کے حالات لکھنے کے لئے زور صاحب نے جو تلاش اور تجسس کی ہے وہ ان کے بہترین مورخ بہت بڑے سوانح نگار ہونے کو ثابت کرتا ہے۔ معلوم یہ ہوتا ہے کہ ڈاکٹر زور صاحب نے ادبیات پر ریسرچ کر کے ڈگر مورخ انھوں نے اپنا لوہا منوایا ہے۔ میر مومن کے حالات جو منتشر اور پراگندہ تھے ان کو جمع کرنے کے لئے نہ صرف مت مدد لی ہے بلکہ ان کے آثار قدیمہ اور فن تعمیر پر روشنی ڈالنے کے لئے انھوں نے کئی قصبات اور دیہات کا دورہ کر کے حالا بیسیوں کتابوں کو پڑھا ہے اس طرح ایک ضخیم سوانح عمری اردو میں پیش کر کے اس کے خزانے میں بیش بہا نگینے کا اضا

(۳) "روح تنقید" یہ کتاب ڈاکٹر زور صاحب کے زمانہ تعلیم کی یادگار ہے اور اس قدر مقبول ہوئی ہے

مرتبہ شایع ہو چکی ہے کئی یونیورسٹیوں کے نصاب میں شامل ہے۔ یہ کتاب اردو زبان میں فنِ تنقید کی نہ صرف پہلی کتاب ہے بلکہ کتاب آخریں بھی ہے۔ اس کے بعد ہی تنقید پر عام طور سے لوگوں کا رجحان ہوگیا اور بہت زیادہ کتابیں اور مضامین اس فن کے متعلق شایع ہونے لگے۔

"روحِ تنقید" دو حصوں پر مشتمل ہے۔ پہلے حصے میں تنقید کی تعریف۔ ادب کی تعریف۔ ادب کی پیدایش۔ ادب کی تقسیم۔ ادب کا مقصد۔ تنقید نگار کے فرائض۔ تنقید نگار کی نگہداشت اور اصولِ تنقید کو بیان کیا گیا ہے اور دوسرے حصے میں ارتقائے تنقید سے بحث کی گئی ہے۔ اس میں ازمنۂ قدیم یونان اور روما ازمنۂ متوسط عصرِ اصلاح۔ عصرِ بیداری اور انقلابِ فرانس اور انگلستان میں ارتقائے تنقید۔ اٹھارھویں صدی کے بعد تنقید کی ترقی۔ اور مشہور نقاد (کولرج ورڈ سورتھ میتھیو آرنلڈ) کا تذکرہ ہے۔ آخر پر مروجہ تنقید اور چند تنقیدی کارنامے پیش کئے گئے ہیں۔ یہ آخری باب اسی خصوصیت سے معلومات کا گنجینہ ہے۔

اس صراحت سے ظاہر ہے کہ "روحِ تنقید" درحقیقت اسم بامسمّٰی ہے۔

(۴) "داستانِ ادبِ حیدرآباد" اگرچہ داستان میں جھوٹ سچ صدق وکذب سب کچھ ہو سکتا ہے لیکن حیدرآباد کے ادب کی داستان حقیقت بردار اور صداقت کی آئینہ دار ہے اس میں قطب شاہی دور کے علامہ ابنِ خاتون سے لے کر آصفیہ دور کے جامعۂ عثمانیہ کی تاسیس تک ادب کا جائزہ لیا گیا ہے بہ الفاظ دیگر ۱۰۰۰ھ سے آغاز ہو کر ۱۳۰۰ھ پر اختتام کیا ہے۔ دس باب میں یہ کتاب تقسیم ہے اور بڑی دلچسپ دلکش شگفتہ انداز میں حیدرآباد کی ادبی تاریخ کو اجاگر کیا گیا ہے۔

اس داستان میں ادبِ حیدرآباد کا اگرچہ صرف جائزہ لیا گیا ہے ادب کے ارتقاء کی تاریخ یا ادبی نمونوں کو پیش کرنا اس کتاب کا مقصد نہیں ہے لیکن جو کچھ واضح کیا گیا ہے وہ تاریخِ ادبِ اردو میں زندگیِ جاوید کا مستحق ہے۔

(۵) "تذکرۂ اردو مخطوطات" ادارۂ ادبیاتِ اردو میں کئی ہزار عربی، فارسی اور اردو مخطوطات محفوظ ہیں۔ ڈاکٹر زورؔ صاحب نے ان مخطوطات کی تفصیلی فہرست لکھنے کا ارادہ کیا ہے۔ برٹش میوزیم اور انڈیا آفس لندن کے عربی، فارسی اور اردو مخطوطات کی فہرستیں جو ڈاکٹر ایتھے ریو اور بلوم ہارٹ نے لکھی ہیں دنیائے ادب میں خاص اہمیت رکھتی ہیں اور اپنی بیش قیمت معلومات آفرین اندراجات کے لحاظ سے ممتاز ہیں۔ ڈاکٹر زورؔ صاحب نے بھی اسی نہج پر ادارۂ ادبیاتِ اردو کے مخطوطات کو اہلِ علم سے روشناس کرنے کا تہیہ کیا اور پانچ جلدیں شائع کر دیں اس میں کوئی شک وشبہ نہیں کہ یہ کتاب معلومات آفریں ہے۔ مخطوطات، ان کے مصنفین اور مؤلفین کے متعلق اچھے معلومات اور بیش بہا مسالہ پیش کرتی ہے۔ پانچ جلدوں میں (۱۱۵۰) مخطوطات کا تذکرہ کیا گیا ہے۔

(۳) زورؔ صاحب کا تیسرا اہم تم بالشان کارنامہ "ادارۂ ادبیاتِ اردو" کو قائم کرنا اور اس کو ترقی دینا اور اس کو میوزیم کی صورت دینے کے لئے ایک خوبصورت عمارت تعمیر کرانا ہے۔

زورؔ صاحب نے اپنے چند دوستوں کو فراہم کر کے ان کے تعاون سے ۱۹۳۲ء میں ادارۂ ادبیاتِ اردو قائم کیا تھا۔ اردو زبان اور اردو ادب کی خدمت کے لئے اس ادارہ کو ترقی دینے کے لئے اپنے قابل اور لائق شاگردوں کو ترغیب دے کر کتابیں اور مقالے لکھواتے اور اس کو ادارہ کی جانب سے شایع کراتے تھے۔ چنانچہ اس وقت تک ادارہ کی تین سو کے قریب مطبوعات منظرِ عام پر آگئی ہیں اور چند کتابیں زیرِ اشاعت ہیں۔ ادارہ کی جانب سے رسالہ "سب رس" شایع کرنے لگے۔ "ادارۂ ادبیاتِ اردو" نے جو ترقی کی ہے اس کی صراحت کے لئے ایک مستقل مضمون کی ضرورت ہے۔ اس مختصر مضمون میں ادارہ کی ترقی اور حیدرآباد وہندوستان میں اس ادارہ نے جو مقام حاصل کیا ہے اس کی وضاحت دشوار ہے۔ بہر حال ادارۂ ادبیاتِ اردو قائم کر کے اس کو ترقی دینا ڈاکٹر صاحب کا

ایسا درخشاں کارنامہ ہے جو فراموش نہیں ہو سکتا۔

(۴) زور صاحب نے ادارہ کے لیے ایک کتب خانہ قائم کیا اور اس میں قلمی اور مطبوعہ عربی۔ فارسی۔ اردو۔ ہندی کتابیں جمع کرتے گئے چنانچہ اس وقت تک تقریباً پانچ ہزار قلمی اور پچیس ہزار مطبوعہ کتابیں ادارہ کے کتب خانہ میں جمع ہوئی ہیں۔ قلمی کتابوں کی پانچ فہرستیں خود ڈاکٹر صاحب نے مرتب کر دی اور مطبوعہ کتابوں کی تین فہرستیں اکبر الدین صاحب صدیقی نے مرتب کی ہیں۔ کتب خانہ میں کتابوں کے علاوہ قدیم اخبارات اور رسایل بھی جمع کئے۔ کتابوں کا ایک حصہ خریدا تو ایک بڑا حصہ لوگوں سے تحفتہً بھی حاصل کر کے ادارہ کے کتب خانہ کو نوادرات سے پُر کر دیا۔

ادارہ کے نوادرات کی فہرستیں مرتب کرائیں۔ نوادرات میں مشاہیر کے خطوط، فرامین۔ رقعے۔ تصاویر۔ ہتھیار غرض علمی اور تاریخی چیزوں وغیرہ سے ادارہ کو سجا کر ایک چھوٹا سا اچھا میوزیم بنا دیا جو کام کرنے والوں اور شائقین کے لئے مفید میوزیم اور بیش بہا گنجینہ بنا ہوا ہے۔

(۵) پولیس ایکشن کے بعد جاگیرداریت ختم ہو گئی تاریخی چیزوں سے لوگوں کی دلچسپی کم ہو گئی تھی حیدرآباد کے قدیم تمدن اور کلچر کو جاننے والے معدوم ہونے لگے۔ دکنی مخلوط تہذیب اور مشترک کلچر مٹنے لگا۔ اس کے احیاء کے لیے ڈاکٹر صاحب نے یوم سلطان محمد قلی منانے کی بنا ڈالی اور آج کئی سال سے یوم محمد قلی منایا جا رہا ہے۔ یوم محمد قلی کے موقع پر مقالوں اور نظموں کے علاوہ کتابوں کے شائع کرنے کا بھی انتظام کیا گیا ہے۔ یوم قلی کے دو روز کے تقاریب ہوتے ہیں دوسرے دن تلنگی زبان میں قطب شاہ کے متعلق مقالے نائے جاتے ہیں۔ غرض یوم محمد قلی ماہ جنوری کی گیارہ کو مقبرہ سلطان محمد قلی اور پھر اس کا سلسلہ ادارہ وغیرہ میں ہوا کرتا ہے یوم قلی کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا اس سے حیدرآباد کے کلچر اور ادب کو مدد ملتی ہے اور علم دوست اصحاب کو معلوم ہوتا ہے کہ سلطان محمد قلی نے اپنے قلمرو کی کیسی بیش بہا خدمت انجام دی تھی۔

(۶) ادارہ ادبیات اردو کے ساتھ گذشتہ کئی سال سے مولانا ابوالکلام آزاد انسٹی ٹیوٹ بھی قائم کیا گیا اور اس کے ضابطہ کے لحاظ سے ادارہ ادبیات اردو کا سکریٹری ہی آزاد انسٹی ٹیوٹ کا سکریٹری ہوتا ہے۔ آزاد انسٹی ٹیوٹ سے قابل اسکالروں کو ماہوار معقول وظایف دیئے جاتے ہیں اور ان کے مرتبہ مقالوں کو شایع کیا جاتا ہے۔ صرف چند سال کے عرصہ میں اس ادارہ نے جو ترقی کی ہے وہ نظر انداز نہیں کی جا سکتی۔ کئی اچھے اچھے مقالے مرتب اور شایع ہوئے اور کئی مقالے مرتب ہو چکے۔ ان کی اشاعت ہونے والی ہے۔ اس ادارہ کا ایک مستقل علیحدہ کتب خانہ ہے جس میں ریسرچ کرنے والوں کے لئے خاص خاص کتابیں فراہم کی گئی ہیں۔

(۷) زور صاحب کے کارناموں میں ایک درخشاں کارنامہ یہ ہے کہ موصوف نے اپنے ہوشیار شاگردوں کو علم کا شایق بنایا۔ شاگردوں کی ہمت افزائی کرتے ہوئے تالیف و تصنیف کا شوق دلایا۔ ایسے کئی اصحاب ہیں جن کی کتابیں محض زور صاحب کی ہمت افزائی کرنے اور توجہ دلانے سے عالم وجود میں آئی ہیں۔ مثلاً مخدوم محی الدین کی کتاب ٹیگور اور اس کی شاعری۔ میر حسن کی کتاب 'مغربی تصانیف کے اردو تراجم'۔ جہاں بانو بیگم کی 'محمد حسین آزاد'۔ رشید قریشی کی 'من کی دنیا'۔ لطیف النساء بیگم کی 'من کی بنا'۔ سکینہ بیگم کی کتاب 'نذر دکن' اور 'مقالات طیبہ'۔ جہاں بانو نعیم النساء وغیرہ کی کتاب 'نذر ولی'۔

(۸) زور صاحب حیدرآباد اور ہندوستان کے کئی علمی اور ادبی اداروں کے رکن تھے۔ مثلاً انجمن ترقی اردو، آندھرا ساہتیہ اکیڈیمی۔ آل انڈیا ساہتیہ اکیڈیمی۔ رسالہ آج کل۔ وغیرہ اس کے علاوہ کئی یونیورسٹی کے ممتحن وغیرہ کی حیثیت سے ان سے کام لیا جاتا تھا۔ اور ان کی معلومات سے استفادہ کیا جاتا تھا۔ کئی یونیورسٹیوں کے پروفیسر کا انتخاب ڈاکٹر زور صاحب کی رائے سے کیا گیا ہے۔

ڈرزور صاحب نے جب ادبی میدان میں قدم رکھا تھا اس وقت انھوں نے شاعری کے لئے اپنا تخلص زورؔ رکھا تھا۔ چنانچہ مرقع سخن
ے کلام غزلیات اور نظمیں شامل ہیں اس کے بعد جب ڈاکٹر صاحب ادارہ کے کاموں میں مصروف ہوگئے اور پرنسپلی کی گراں بار
مہ ہوگئی تو انھوں نے شاعری کی جانب توجہ کم کر دی تھی۔ جب وظیفہ ہوگیا اور کشمیر جنت نظیر میں قیام ہوا تو شاعری
پھر پرلطف جذبہ ابھر آیا۔ اور وہ غزل کے میدان میں اپنی جولانی طبع کے جوہر پیش کرنے لگے۔ ان کا کلام اپنے
وازی۔ جذبات کی گہرائی۔ اسلوب کی جدت و رنگینی شگفتگی لطف زبان روانی و سادگی غرض ہر لحاظ سے قابل داد
ستائش ہے۔ ان کو شاعری کے لحاظ سے شعرا کی پہلی صف میں جگہ نہ دیجائے تو دوسری صف میں وہ ضرور جگہ

ذشتہ میں ڈاکٹر سید محی الدین قادری زورؔ کا مختصر تعارف اور ان کے کارناموں کا ایک جائزہ لیا گیا ہے۔ اس سے
لومات ہو سکتے ہیں۔ جو ڈاکٹر صاحب پر ریسرچ کرنے کے خواہشمند ہوں ان کو ریسرچ کے لئے جن جن موضوعات
ضرورت ہو ایک خاکہ ان کو مل جائے گا۔
صاحب اپنے کردار کے لحاظ سے ایک اچھے انسان تھے۔ انسان میں بعض کمزوریاں بھی ہوتی ہیں مگر اس کے کردار کی
یوں پر غالب آجاتی اور پردہ پوش ہوجاتی ہے اور وہ انسان اپنے نیک کردار کے باعث عوام کے احترام کا باعث
اکہنا چاہیے کہ ع

خدا بخشے بہت سی خوبیاں تھیں مرنے والے میں

یہ اردو والوں کا اجتماعی اور دکن والوں کا خصوصی نقصان ہے۔ وہ تمام زندگی اردو زبان
ا ترویج و اشاعت کا کام انجام دیتے رہے۔ ادارۂ ادبیات اردو کے وہ بانی و معمار تھے۔ وہ
خود بھی کام کرتے تھے اور اپنے اردگرد کام کرنے والوں کا ایک گروہ پیدا کر لیا تھا۔ دکن کی زبان
دکن کے ادب دکن کی تاریخ و تہذیب کو انھوں نے از سر نو زندہ کیا۔ سرزمین دکن سے انھیں عشق
تھا لیکن مشیت کو یہ منظور نہ تھا کہ جس نے عمر بھر اس سرزمین کی خدمت کی وہ اسی سرزمین میں دفن
ہو۔

ڈاکٹر مسعود حسین خاں

سید حرمت الاکرام

ڈاکٹر زور کی شخصی اور ادبی زندگی

گذشتہ ربع صدی کے دوران زبان و ادب کے قدیم مراکز دہلی اور لکھنؤ کے علاوہ پنجاب اور حیدرآباد نے اردو کی ارتقائی جدوجہد آگے بڑھانے، اہلِ فن کی شخصیتوں کو پروان چڑھانے، ان کی تحقیقی سرگرمیوں کو تیز تر کرنے نیز اردو کتب و رسائل کی اشاعتی مہم کو نئی توانائیاں [illegible] میں جو امتیازی کردار ادا کیا ہے، اسے ہماری ادبی تاریخ اپنے صفحات کا بیش قیمت سرمایہ متصور کرنے پر مجبور ہے۔ پنجاب ہندوستان کی [illegible] کا ایک صوبہ تھا جو حصولِ آزادی کے بعد ہندوستان اور پاکستان کے درمیان تقسیم ہو گیا۔ لیکن حیدرآباد ایک خودمختار ریاست کی حیثیت رکھتا جہاں پنجاب کے مقابلے میں اردو کی ترقی و ترویج و اشاعت کی سہولتیں از روئے آئین میسر تھیں۔ حیدرآباد ہی وہ سرزمین ہے جہاں عثمانیہ نے اردو کو ذریعۂ تعلیم مقرر کرنے کا پہلا کامیاب تجربہ کیا۔ اس موقع پر مجھے اردو سے متعلق پنجاب اور حیدرآباد کی خدمات کا موازنہ مقصود نہیں۔ غیر ضروری تفصیل سے قطع نظر یہ کہنا ہے کہ اسی حیدرآباد کی نرم و گرم آغوش نے ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور کو جنم دیا جس کے گرد اردو حیدرآبادی تاریخ کا ایک اہم تر دور رقصاں ملتا ہے اور یہ حیدرآبادی تاریخ اپنی معنوی کیفیات کے تحت اردو دنیا کی پوری تاریخ کو متاثر کرتی

ڈاکٹر زور نے ۲۰ رمضان ۱۳۲۶ھ کو حافظ غلام قادری کے گھرانے میں آنکھیں کھولیں جن کے نسبی سلسلے کی کڑیاں دکن کے مشہور ولی سید شاہ علی سانگڑے سلطان مشکل آسان کی ذاتِ والا صفات سے ربط رکھتی ہیں۔ قدیم دستور کے تحت ڈاکٹر زور نے اول اول میں عربی و فارسی کے تعلیمی مراحل طے کرنے کے بعد سٹی کالج میں داخلہ لیا، پھر ۱۹۲۵ء میں بی اے اور ۱۹۲۷ء میں ایم اے (اردو و فارسی) کی حاصل کی۔ اس کے بعد سرکاری وظیفہ پر انگلستان گئے اور آریائی زبانوں کا تقابلی مطالعہ نیز اردو کا تحقیقی کام کر کے تین سال کے بجائے دو ہی سال پی۔ ایچ۔ ڈی کی ڈگری لے لی اور اسی نقطہ سے ہونہار بروا کے چکنے چکنے پات اپنی بہار کے شاداب مستقبل کی جھلکیاں دکھانے لگے۔ ان کا [illegible] اس قدر پُر مغز تھا کہ ڈاکٹر گراہم بیلی صدر شعبۂ اردو لندن یونیورسٹی نے خود بھی اس کی کافی تعریف کی جسے ایک خصوصی قدر افزائی قرار دیا۔ ڈاکٹر زور نے اسکول آف اورینٹل اسٹڈیز اور یونیورسٹی کالج لندن میں بھی صوتیات کی تعلیم حاصل کی، پھر ہند آریائی لسانیات اور [illegible] پہلوی اور جیسی زبانوں کے متعلق "سوربون یونیورسٹی" پیرس میں درس لئے نیز پیرس ہی سے انگریزی زبان میں ایک کتاب HINDUSTANI PHONETICS شائع کی جو اس موضوع پر اولین کتاب تصور کی جاتی ہے۔ انھوں نے "ہندوستانی کی گجراتی شاخ" کے موضوع پر بھی ایک اور پُر مغز مقالہ پروفیسر ڈاکٹر جے. بلوک کی نگرانی میں قلمبند کیا جسے علمی اور ادبی حلقوں نے کافی پسند کیا۔

ہندوستان واپس آنے پر ڈاکٹر زور کو عثمانیہ یونیورسٹی (حیدرآباد) نے اردو کے پروفیسر کا عہدہ پیش کیا اور جب انجمن ترقی اردو کا دہلی منتقل کیا گیا اور خود ڈاکٹر مولوی عبدالحق بھی دہلی چلے گئے تو ان کی جگہ یونیورسٹی نے ڈاکٹر زور کو شعبۂ اردو کے صدر کے عہدہ پر فائز کیا۔ عہدہ [illegible] دارالعلوم کالج اور پھر چادر گھاٹ کالج کے پرنسپل مقرر ہوئے اور چونکہ ان کی روشنیٔ طبع کے سبھی قائل تھے لہٰذا یہاں علیحدہ ہونے کے بعد بخشی غلام محمد (وزیر اعظم کشمیر) کی ذاتی خواہش پر کشمیر یونیورسٹی کے شعبۂ اردو کے صدر کا عہدہ قبول کیا جو ان کی [illegible]

دل آخر ثابت ہوا۔

اپنی جنم بھومی سے ہر شخص کو ایک فطری لگاؤ ہوتا ہے جس میں کسی نمائشی عنصر کی کارفرمائی ہو ہی نہیں سکتی لیکن ڈاکٹر زور کو حیدرآباد سے کس قدر محبت تھی، اس کا اندازہ ممکن نہیں جس کا اساسی سبب وہ ناقابلِ فراموش کارنامے بھی ہو سکتے ہیں جو حیدرآباد کی سرزمین اور ڈاکٹر زور کی شخصیت کے باہمی ربط و تعلق کو اٹوٹ بناتے ہیں۔ چنانچہ سری نگر میں دوسرے قلب کے دورے پڑنے کے بعد ان کی زبان پر حیدرآباد کا ورد تھا اور ان کے امکان میں ہوتا تو غالباً وہ اڑ کر اپنے وطن پہنچ جاتے لیکن ان کی یہ آخری خواہش شرمندۂ تکمیل نہ ہو سکی اور وہ ۲۴ر ستمبر ۱۹۶۲ء کو دیارِ غیر میں انتقال کر گئے۔

ڈاکٹر زور نے ۶۰ سال کی عمر پائی جسے کسی اعتبار سے طویل نہیں کہا جا سکتا لیکن اس قلیل مدت کو انھوں نے اپنی قوتِ کار کا معنوی پھیلاؤ دے کر بے کنار و بے پایاں بنا دیا۔ دکنی زبان اور اس کے مخطوطات پر ان کا کام عدیم المثال ہے۔ انھوں نے اردو کے پہلے صاحبِ دیوان شاعر محمد قلی قطب شاہ کا دیوان مرتب کیا جو بجائے خود ایک کارِ نمایاں ہے۔ نیز ان کا یوم منانے کی بنا ڈالی۔ ڈاکٹر زور کی مصروفیات کا حلقہ بڑی وسعت رکھتا تھا۔ وہ حکومتِ ہند کی کئی اہم کمیٹیوں میں شامل تھے۔ ساہتیہ اکیڈیمی کے شعبۂ اردو کے مشیر تھے۔ ان کی شمولیت رسالہ 'آجکل' دہلی کی مجلسِ ادارت میں بھی تھی اور وہ مختلف یونیورسٹیوں کے ممتحن بھی تھے۔

حصولِ تعلیم کے دوران بھی ان کی ذہانت قابلِ رشک حد تک بے نظیر تھی جو بعض اوقات ان کے شناساؤں کے لئے استعجاب کا باعث ہوا کرتی تھی۔ اپنے مقصد سے انتہائی پرخلوص لگاؤ نیز اس کو تکمیل کی منزل تک پہنچانے کے لئے شدید جفاکشی کا جذبہ ان کے فطری اوصاف کا اہم ترین جز تھا۔ ان کی بالغ نظری اور جوہر شناسی نے بھی ان کی مقبولیت و شہرت کو چار چاند لگائے۔ ان کی یادداشت غضب کی تھی اور انھیں قدیم دکنی شعرا بالخصوص محمد قلی قطب شاہ کے صدہا اشعار ازبر تھے لیکن یہ غالباً اس قدر اہم بات نہیں کیونکہ اشعار کو محفوظ رکھنے میں بہتوں کے ذہن کمال صلاحیت کے مالک ہوتے ہیں مگر ان کی یہ خصوصیت بڑی انوکھی ہے کہ ان کی یادداشت کے خزینے میں نثری مضامین کے کئی کئی پیراگراف محفوظ تھے جنھیں وہ تقریباً اسی روانی کے ساتھ دہرا سکتے تھے جتنی روانی و بے ساختگی سے شعر سنائے جاتے ہیں۔

ڈاکٹر زور کی کامرانی و سرخروئی کا ایک خاص پہلو یہ بھی تھا کہ ان کو فطرت نے زبردست تنظیمی صلاحیت ودیعت کی تھی جس نے ان کی شخصیت کو زیادہ قیمتی اور کارآمد بنا دیا۔ انھوں نے اپنی زندگی کے کسی دور میں سیاست سے لگاؤ نہیں رکھا اور اس کے ساتھ ہی "ادارۂ ادبیاتِ اردو" کو بھی سیاسی حدود سے دور رکھا جس سے ان کی ہردلعزیزی کو مزید تقویت ملی۔

یورپ سے واپس آنے کے بعد ڈاکٹر زور نے کشمیر کی انتہائی مختصر زندگی کے علاوہ تقریباً اپنی پوری زندگی حیدرآباد میں گزاری اور اپنی ذات کو ایک عظیم ادارے کی شکل دیکر کمال کی تیز رفتار سے کام کرتے رہے۔ جس سے ان کی بے جگری کے ساتھ اردو زبان و ادب سے ان کے مجنونانہ عشق پر کافی روشنی پڑتی ہے۔ وہ آرام سے بیٹھنا جانتے ہی نہیں تھے، چنانچہ انھیں حرکت و عمل کا پیامبر اور پیکر دونوں کہا جا سکتا ہے۔ انھوں نے خود کام کیا نیز اپنے گرد کام کرنے والوں کا ایک ایسا حلقہ بنایا جو نہ صرف ان کی تجاویز کو بروئے کار لانے میں مددگار ثابت ہوا بلکہ خود بھی [illegible] مخلصانہ جذبات لیکر مصروفِ کار رہا۔ یہ اور بات ہے کہ ان کے بعد کام کرنے والوں کی پوری کی پوری جمعیت ان کی اہل جانشینی میں کامیاب نہ ہو سکی جس کی ایک بڑی نمایاں اور ٹھوس وجہ یہ ہے کہ ڈاکٹر زور محض ایک کارکن نہیں تھے بلکہ ان کے پیکر میں ایک جانباز مجاہد کی روح انگڑائیاں لے رہی تھی۔ وہ روح جس نے سرسید کو تاحیات پارہ کی مانند متحرک و بے قرار رکھا۔ ڈاکٹر زور نے اپنی طالب علمی کے دور سے تصنیف و تالیف کے جس سلسلے کا آغاز کیا تھا وہ تکمیلِ تعلیم کے بعد ایک بیکراں سمندر، ایک اتھاہ جنون بن کر ان کی زندگی پر چھا گیا۔ معاشی اعتبار سے وہ زندگی

کے مختلف ادوار میں ایک پروفیسر، ایک پرنسپل، اور یونیورسٹی کے شعبۂ اردو کے صدر کی صورت میں طالبانِ علم کو فیض پہنچاتے رہے لیکن قابلِ
اپنی منصبی مصروفیات کے متوازی مضامین اور کتابیں لکھنے، دکنی ادب پر تحقیق کرتے، مخطوطات حاصل کر کے انھیں ترتیب دینے،
اور کتابیں لکھوانے "ادارۂ ادبیات اردو" کی بنا ڈالنے اور "سب رس" کو فروغ دے کر ایک ادبی و علمی جریدہ کے سانچے میں
مشکلات کا مقابلہ کر کے "ایوانِ اردو" کا سنگِ بنیاد رکھنے اور اس کی تعمیر کو پایۂ تکمیل تک پہنچانے کے جو کارنامے انجام دیئے ا
تسلیم کرنا اور کہنا پڑتا ہے کہ زور نے اردو کے لئے صرف شاعرانہ الفاظ میں نہیں بلکہ حقیقی معنوں میں اپنا لہو دیا۔

ڈاکٹر زور ارضِ دکن کے پرستار تھے لیکن اسے علاقائی عصبیت نہیں کہا جا سکتا۔ انھوں نے جو کام کیا وہ انھیں کے ہاتھ
کیونکہ انھوں نے اسی ماحول میں پرورش پائی تھی لہٰذا شمالی ہند کا کوئی شخص، بالخصوص مخطوطات کے کام کو اتنی آسانی اور خوبی سے انجام
تھا جتنی آسانی اور خوبی سے ڈاکٹر زور نے انجام دیا اور ہو سکتا ہے کہ انھیں اس کا احساس خود بھی رہا ہو۔ اس احساس میں کتنی
اندازہ ان کارناموں سے کیا جا سکتا ہے جن کا تعلق مختلف ذریعوں اور مختلف شکلوں سے دکن کی ادبی، علمی اور تاریخی حیثیت کو اجاگر
اس کی روایتی و تہذیبی عظمت کو جو ماہ و سال کے غبار میں چہرہ پوش تھی روشنی میں لانے سے ہے۔ ان کی دلی خواہش تھی کہ دکن کے تہ
کے فن پاروں کو شہرت و ناموری کی روشن ترین فضا میں پہنچا دیں جس کی تکمیل کے لئے وہ تن من دھن سے تاحیات کوشاں رہے۔
کے لئے انھوں نے سیکڑوں میل کا سفر کیا نیز سفر میں بے شمار زحمتوں اور سختیوں سے دوچار ہوئے جو زیادہ سے زیادہ روح فر
تھیں لیکن چونکہ ڈاکٹر زور کے دل میں ایک سچے اور کھرے محقق کی لگن کا طوفانی خروش موجزن تھا لہٰذا وہ کبھی حوصلہ نہیں ہا
راہ میں ہر دکھ اور پریشانی کا استقبال کرتے ہوئے بیدر، گلبرگہ، اورنگ آباد، بیجاپور اور حیدرآباد کے صدہا دشوار گذار مقامات تک
صلہ میں ان گنت قلمی نوادر حاصل کئے۔ ڈاکٹر زور کو شاعروں اور ادیبوں کی بے نام و نشان قبروں کی جستجو کا بھی سودا تھا۔ چنانچہ انھ
قبروں کا سراغ لگایا اور ان کو لوحِ مزار سے مزین کیا۔ ڈاکٹر زور کو زمانۂ طالب علمی ہی سے مخطوطات کے مطالعہ کا زبردست شو
شام کو نہایت پابندی کے ساتھ حیدرآباد کی کسی نہ کسی لائبریری میں پہنچا دیتا جہاں وہ گھنٹوں مخطوطات کے مطالعہ میں مصروف
تھی کہ پرانے مخطوطات کو وہ اتنی روانی سے پڑھا کرتے تھے جیسے کوئی چھپی ہوئی صاف ستھری کتاب پڑھ رہے ہوں۔

"ایوانِ اردو" ڈاکٹر زور کی نظر میں کیا تھا، اس کا اندازہ ذیل کے ایک واقعہ سے کیا جا سکتا ہے جس کا ذکر ڈاکٹر سیدہ جعفر
"ڈاکٹر زور مرحوم" میں کیا ہے۔

> "ایک رات یکایک طوفانی بارش شروع ہو گئی، زور صاحب چونک کر اٹھ بیٹھے۔
> سب سے پہلے انھیں "ایوانِ اردو" کے دارالمطالعہ کا خیال آیا (اس میں جالی
> لگی ہوئی ہے اور یہاں میزوں پر ہند و پاکستان کے تمام معیاری رسالے مطالعے
> کے لئے رکھے جاتے ہیں۔ اکثر زور سے ہوا چلے یا بارش زیادہ ہو تو پانی اندر بھی
> آجاتا ہے) اس خیال سے زور صاحب بے چین ہو گئے کہ کہیں تمام رسالے
> بھیگ کر خراب نہ ہو جائیں۔ انھوں نے اپنے کمرہ کا سوئچ آن کیا لیکن بتی
> نادرد تھی کیونکہ فیوز جل گیا تھا۔ بدقت تمام مکان کے کسی گوشے سے قندیل نکالی
> اسے روشن کیا اور بھیگتے ہوئے "ایوانِ اردو" پہنچے۔ چوکیدار کو بیدار کیا

دونوں نے مل کر تمام رسالے محفوظ مقام پر پہنچا دیے اور انھیں خبر بھی نہ ہوئی کہ اس
مشقت میں رات کا کتنا حصہ گزر گیا ہے۔"

یہ سب کچھ غالباً اس لیے تھا کہ انھوں نے "ایوانِ اردو" کی حسین آغوش میں اپنی زندگی کے اہم کارناموں کی ایک گراں بہا متاع محفوظ کر دی ہے۔ حیدرآباد کی ریاست اپنی تمام روایات کے ساتھ ہم آغوشِ فنا ہو گئی، قصرِ سلطانی کے منارے سرنگوں ہو گئے اور ساتھ ہی وہ مراعات بھی ختم ہو گئیں جو کسی دور میں اردو کو حیدرآباد کی حدود میں حاصل تھیں لیکن ڈاکٹر زور کی یہ یادگار جسے " ایوانِ اردو" کہا جاتا ہے اپنی تمام عظمتوں اور افادیتوں کے ساتھ زندہ و تابندہ ہے۔ سوچنے کا مقام ہے کہ ایوانِ شاہی کے مقابلے میں اردو کا یہ ایوان کتنا پائیدار، مستحکم اور پائندہ ہے۔ ایک کی بنا سیم و زر پر تھی اور دوسرے کی بنیادوں میں ایک سرفروش مجاہد کا لہو صرف ہوا تھا جس کے نقوش ہمیشہ لازوال ہوتے ہیں۔ نظامِ حیدرآباد کی شوکت و جلالت ان کی حیات ہی میں ذہنوں سے محو ہو گئی لیکن ڈاکٹر زور مر کر بھی اپنے عظیم کارناموں کے جلو میں زندہ ہیں۔

ڈاکٹر زور ایک محقق کی حیثیت سے بڑی انفرادی وقعت و عظمت رکھتے ہیں۔ خصوصاً اس لیے کہ انھوں نے کسی کمرہ میں بیٹھ کر دادِ تحقیق نہیں دی بلکہ اس کے لیے دربدر کی خاک چھانی۔ انھیں ہر شئے سے زیادہ وہ مقصد محبوب تھا جس کے شعلے ان کی شریانوں میں ابتدا ہی سے رقصاں و جولاں تھے اور اس مقصد کی تکمیل گھر کی چار دیواری میں رہ کر ہو ہی نہیں سکتی تھی۔ ڈاکٹر زور بلا شبہ اپنے دور کے کوہکن تھے اور ان کی شیریں اردو تھی۔ وہ تا عمر مشکلات و موانع کی خسروی کا مقابلہ کرتے رہے۔ اور عملِ پیہم کے تیشے سے بے ستون کو کاٹ کر جوئے شیر لانے میں مصروف رہے نیز یہ ان کی خوش نصیبی تھی کہ انھیں اپنے تیشے کا ہدف نہیں بننا پڑا بلکہ وہ جوئے شیر لانے میں کامیاب و سرخرو رہے۔ ان کی علمی زندگی جسے بظاہر محض اردو کی خدمت تک محدود کہا جائے گا۔ اپنے دامن میں بیکراں وسعت رکھتی تھی، چنانچہ حیرت ہوتی ہے کہ انھوں نے بیک وقت اتنے تمام کاموں کو جن کا سلسلہ بیحد طویل، مشقت طلب اور صبر آزما تھا اپنی تنہا ذات میں کیسے سمیٹ رکھا تھا؟

یہ بات کسی سے چھپی ہوئی نہیں ہے کہ ڈاکٹر زور نے کتنے شاعروں اور ادیبوں کو گمنامی و خمول کی تاریک وادیوں سے ابھار کر ادب کی روشن، وسیع اور گنجان دنیا میں پہنچا دیا جہاں ان شاعروں اور ادیبوں نے خود بھی عزت و ناموری کی دولت حاصل کی اور شعر و ادب کو بھی اپنے ثمرات سے مالا مال کیا۔ گوشہ نشینی کی زندگی بعض معنوں میں اس خرد شِ عمل سے محروم ہوتی ہے جو شہرت کی زندگی کا خاصہ ہے۔ اس میں شبہ نہیں کہ اہلِ فن کی فطری و ذاتی صلاحیتیں اپنی جگہ پر بڑی مضبوط اکائی کی شکل رکھتی ہیں۔ لیکن کنجِ عزلت کی محدودیت انھیں جلا پانے، بڑھنے اور پھیلنے کے مواقع نہیں دے پاتی جو ارتقائی عمل کے لیے ناگزیر ہیں اور جن کی اہمیت سے انحراف ممکن نہیں۔ چنانچہ جن اربابِ علم و فن کو ڈاکٹر زور کی مخلصانہ تجسس نے دنیائے ادب سے روشناس کرایا، ان کی علمی، فکری اور فنی صلاحیتوں کو دیگر امور کے علاوہ جذبۂ مسابقت نے بھی زیادہ بیدار، فعال اور کار آمد بنایا ہو گا جو اپنے مقاصد و نتائج کے تحت بڑی قیمتی، وسیع اور عظیم چیز ہے۔ قیامِ کشمیر کے دوران بھی جو تھا مختصر تھا ڈاکٹر زور کے ذوقِ ادب کا یہ پہلو بیدار و متحرک رہا اور کشمیر جیسے دور افتادہ علاقہ میں جو ہندوستان کی اردو دنیا سے بڑی حد تک منقطع ہے وہ برقی لہریں پیدا ہو گئیں جنھوں نے کشمیری ادیبوں اور شاعروں کے ذہنوں میں نئی تڑپ بھر دی اور وہ اس راستے پر چل پڑے جس سے غالباً زور کی رہنمائی کے بغیر محروم رہتے۔

ڈاکٹر زور کی تصنیفات و تالیفات کی طویل تر فہرست میں درج ذیل کتابیں کسی نہ کسی نہج سے نمایاں اہمیت و خصوصیت کی حامل ہیں جن سے زبان و ادب کے بعض گوشوں کو توانائی و تابناکی کے نئے کوندے ملے ہیں؛

اردو شہ پارے، اردو کے اسالیبِ بیان، تنقیدی مقالات، ہندوستانی لسانیات

حیدر عثمانی میں اردو کی ترقی، میر محمد مومن، سیر گولکنڈہ، گولکنڈہ کے ہیرے، بالمقدیر سرگذشت غالب، روح غالب، گارساں دتاسی، مکتوبات شاد عظیم آبادی کا شاد و اقبال، داستان ادب حیدرآباد، فرخندہ بنیاد، تذکرۂ اردو مخطوطات، کلیات سلطان محمد قلی قطب شاہ، گلزار ابراہیم، کیفیت سخن، فیض سخن، فن انشاء پردازی وغیرہم۔

ان میں سے چند کتابوں کے موضوع و مواد کا اجمالی تذکرہ سپرد ذیل ہے جس سے ڈاکٹر زور کی خدمات کے علمی، ادبی نیز تحقیقی مرتبہ کا تعین کیا جاسکتا ہے۔

اردو شہ پارے: اس میں جدید ترین تحقیق کی رو سے نثر و نظم کے ان کارناموں کو موضوع بحث بنایا گیا ہے جو اردو کے آغاز سے ولی اورنگ آبادی تک کے دور کا سرمایہ ہیں۔ علاوہ ازیں متذکرہ ادوار کے شعراء و ادباء کے شہ پاروں کا اہم انتخاب بھی شامل کتاب ہے۔ جو اس کی اہمیت اور دلچسپی میں اضافہ کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس کتاب پر ڈاکٹر زور نے کتنی عرق ریزی اور کاوش کی ہے، اس کے اظہار کے لئے محض اتنا بتا دینا کافی ہے کہ اس میں نثر و نظم کے جو اقتباسات اور انتخابات دیئے گئے ہیں ان کے حصول کے لئے پاکستان اور ہندوستان کے متعدد کتب خانوں کے مخطوطات قلمی نسخوں سے مدد لی گئی ہے، اس کی ضخامت ۲۰۰ صفحات ہے۔

تنقیدی مقالات: اس میں اردو کے مستند نیز قابل قدر ادیبوں کے فن پاروں کا ناقدانہ جائزہ لیا گیا ہے جو فکر و نظر کی بڑی گہرائیوں اور گیرائیوں کا حامل ہے۔ یہ کتاب ادب کے بعض ایسے پہلوؤں کو سامنے لاتی ہے جن کی اہمیت سے انکار ممکن نہیں۔ اس کتاب کے (جو ۲۹۶ صفحات پر پھیلی ہوئی ہے) اب تک تین ایڈیشن شایع ہو چکے ہیں۔

ہندوستانی لسانیات: اردو زبان میں لسانیات کے موضوع پر پہلی کتاب ہے اور ساتھ ہی بڑی جامعیت بھی رکھتی ہے۔ کتاب کے حصۂ اول میں علم لسان کے مقاصد، تاریخ و زبان کی ماہیت نیز تشکیلی و ارتقائی عمل کے بارے اصولی بحث کی گئی ہے۔ اس کے علاوہ دنیا کی مختلف زبانوں کی تقسیم، ان کے مختلف خاندان اور بالخصوص ہندوستان و پاکستان کی زبانوں کو زیر بحث لایا گیا ہے جس سے ڈاکٹر زور کی نکتہ رسی، بالغ نظری نیز ان کے علمی تفوق کا پتہ چلتا ہے۔ حصۂ دوم میں اردو کے آغاز و ارتقاء نیز ادبی بولیوں اور ان کی ہمہ گیر خوبیوں پر جدید ترین تحقیق کے تحت روشنی ڈالتے ہوئے اردو ہندی تنازعہ نیز اردو کے نئے رجحانات و میلانات پر بحث کی گئی ہے اور یہ بھی بتایا

گیا ہے کہ اردو کی ترویج و ترقی کے لئے کن امور کی ضرورت ہے۔ مزید برآں لسانی تجربات کی توضیح دلچسپ اور سلیس پیرائے میں کی گئی ہے۔ کتاب کی ضخامت ۱۶۰ صفحات ہے۔

کلیاتِ سلطان محمد قلی قطب شاہ : یہ ڈاکٹر زور کا بڑا عظیم تاریخی نیز امتول کارنامہ ہے جس کے ذریعہ انھوں نے اردو کے پہلے صاحبِ دیوان شاعر محمد قلی قطب شاہ کو اردو دنیا سے روشناس کرایا اور ان کے کلیات کو جو مخطوطہ کی شکل میں تھا ترتیب و تدوین کی منزل تک لائے۔ کلیات کے ابتدائی ۳۰۰ صفحات میں محمد قلی قطب شاہ کی زندگی اور ان کی ادبی خدمات پر سیر حاصل بحث کی گئی ہے۔ ۱۰۶۸ صفحات پر مشتمل اس کتاب سے ظاہر ہوتا ہے کہ ڈاکٹر زور ایک مورخ اور سوانح نگار کی حیثیت سے بھی اتنا ہی بلند مرتبہ رکھتے تھے جتنا ایک ادیب، نقاد اور محقق کی حیثیت سے۔

میر محمد مومن : اس کتاب میں جو ۲۱۱ صفحات پر مشتمل ہے قطب شاہی عہد کے باوقار وزیر اعظم میر محمد مومن کے حالاتِ زندگی نیز علمی اور تعمیری کارناموں کا تفصیلی جائزہ لیا گیا ہے۔ کتاب کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ اس کے صفحات ڈاکٹر زور کے فن انشاپردازی کا بطور خاص پتہ دیتے ہیں۔ اب تک اس کے تین ایڈیشن چھپ چکے ہیں۔

سرگذشتِ غالب : اس میں مرزا غالب کی زندگی، ان کے ادبی و علمی کارناموں نیز ان کے اعزہ و احباب کا تذکرہ ہے جس سے غالب کی شخصی اور شاعرانہ زندگی کے رنگا رنگ پہلوؤں پر روشنی پڑتی ہے۔ کتاب میں غالب کا خاندانی شجرہ بھی شامل ہے جو اس کی اہمیت میں یک گونہ اضافہ کر دیتا ہے۔

روحِ غالب : یہ کتاب مرزا غالب کے خطوط کے ان اقتباسات پر مشتمل ہے جو ادبی اور تاریخی حیثیت سے کسی نہ کسی اہمیت یا دلچسپی کے حامل ہیں۔ ابتداء میں ڈاکٹر زور کا مبسوط مقدمہ بھی شامل ہے جو اس اعتبار سے کتاب کی اہمیت کو بڑھا دیتا ہے کہ اس میں غالب کی اردو و فارسی تصنیفات، ان کی نوعیت اور زمانۂ تصنیف و اشاعت سے متعلق معلومات و تفصیلات یکجا کر دی گئی ہیں۔

گارساں دتاسی : گارساں دتاسی فرانس کا ایک نامور مستشرق گذرا ہے جسے اردو کا عظیم محسن قرار دیا جاتا ہے۔ اس کتاب میں اس کے علمی و ادبی کارناموں کے علاوہ ان اہم حقائق پر بھی روشنی ڈالی گئی ہے جن کا تعلق اردو کی تائید و تبلیغ سے متعلق اس کی پر زور جد و جہد سے ہے۔

مکتوبات شاد عظیم آبادی: یہ اردو کے قادر الکلام شاعر شاد عظیم آبادی کے غیر مطبوعہ مکتوبات پر مشتمل ہے جو اس لحاظ سے بڑی تاریخی اہمیت کے حامل ہیں کہ ان سے سر سید اور حالی کی تحریکات کے مخصوص گوشوں کا سراغ ملتا ہے جنھیں تاریخ کے صفحات زیادہ وضاحت کے ساتھ پیش نہیں کر سکے ہیں۔ ظاہر ہے کہ ایسے مواقع پر دورِ متعلقہ کے ادبی کارنامے نیز اس موضوع کے خطوط بڑے کارآمد اور معلومات افزا ثابت ہوتے ہیں۔

شاد و اقبال: یہ ان مکتوبات پر مشتمل ہے جو علامہ اقبال اور مہاراجہ سر کشن پرشاد شاد نے قریباً تیس سال کے دوران ایک دوسرے کو تحریر کئے اور جو دیگر امور سے قطع نظر اس اعتبار سے انتہائی اہم ہیں کہ ان سے علامہ اقبال اور مہاراجہ شاد کی شخصی زندگی کے ان پہلوؤں کی نقاب کشائی ہوئی ہے جو کسی اور ذریعہ سے روشنی میں نہیں آ سکتے تھے۔ کتاب میں ڈاکٹر زور کا ایک مبسوط مقدمہ بھی شامل ہے۔

داستان ادب حیدرآباد اور فرخندہ بنیاد: ان دونوں کتابوں کا تعلق حیدرآباد کی علمی سرگرمیوں سے ہے جن کا ذکر ڈاکٹر زور نے مبسوط طور پر کیا ہے

تذکرۂ مخطوطات اردو: ڈاکٹر زور نے "ادارۂ ادبیات اردو" کو اردو فارسی اور عربی کے قریباً پانچ ہزار مخطوطات جمع کئے جو ان کی ذاتی سعی و جستجو کا نتیجہ ہیں۔ انھوں نے ان بکھرے ہوئے مخطوطات کو نہ صرف مختلف مقامات سے حاصل کیا جس کا ذکر آ چکا ہے بلکہ انھیں سنہ وار ترتیب بھی دیا۔

اس ہفت خواں کے پیچ و خم سے گزرنے کے بعد ڈاکٹر زور کی مہم پسند طبیعت نے انھیں مخطوطات کے تذکرے رقم کرنے پر ابھارا جن میں مخطوطات کی انتہائی مفصل تشریح و توجیہہ پیش کی گئی ہے۔ مخطوطات کی مانند یہ کام بھی بڑا پھیلاؤ رکھتا ہے لہذا انھوں نے اس تذکرہ کی پہلی جلد جو ۲۰۰ مخطوطات کے تذکرہ پر مشتمل ہے ۱۹۴۵ء میں شایع کی۔ دوسری جلد جس میں ۲۰۰ مخطوطات کا ذکر ہے اس کے چھ سال بعد ۱۹۵۱ء میں منظر پر آئی۔ تیسری جلد جو دو سو قلمی کتابوں کے تذکرہ کی حامل ہے۔ ۱۹۵۷ء میں اشاعت پذیر ہوئی، چوتھی جلد صرف ایک سال بعد ۱۹۵۸ء میں پایۂ تکمیل کو پہنچ کر شائع ہو گئی جس میں ۲۰۰ مخطوطات کا تذکرہ ہے۔ ۱۹۵۹ء میں پانچویں جلد کی اشاعت عمل میں آ گئی جو ۲۰۰ کمیاب اور نادر مخطوطات کے تذکرہ کی حامل ہے اور یہ کہتے ہوئے جی لرزتا ہے کہ وہ چھٹی جلد کی ترتیب و تکمیل میں مصروف تھے کہ ان کا قلم ہمیشہ کے لئے خاموش ہو گیا۔

ڈاکٹر زور کی شخصیت ذہنی، فکری نیز عملی اعتبار سے بیک وقت متنوع صلاحیتوں سے معمور ہونے کے دوش بدوش بڑی ہمہ جہتی اور ہمہ گیری کی مالک تھی جس کی مثالیں نایاب نہیں تو کمیاب یقیناً ہیں۔

یہ مبالغہ نہیں حقیقت ہے کہ ان کی دوسری تصنیفات و تالیفات سے قطع نظر اگر حیدرآباد اور بقیہ ماندہ پورے ہندوستان کے مخطوطات ایک دوسرے کے مقابلے میں رکھ دیئے جائیں تو اس میں حیدرآباد سبقت لے جائے گا جس کا سہرا ڈاکٹر زور کی ذات کے سر ہے۔ ان کی سیمابی فطرت کسی مخصوص منزل پر رکنا اور توقف کرنا جانتی ہی نہیں تھی، وہ ہمیشہ نئے دور سراور نئے در و جگر کے متلاشی

یہ انھوں نے اردو زبان کے خزینہ میں چند مزید اضافہ اس شکل میں کئے کہ ہماری زبان میں جتنے اسلحہ جات کے نام پائے جاتے ہیں ان کی مرتب کی نیز اس کے لئے ایک میوزیم کا قیام عمل میں لایا ۔ اسی طرح اردو میں سواریوں کے جس قدر نام ملتے ہیں، انھیں یکجا کیا، اتنا ہی ان تمام سواریوں کی تصاویر مہیا کر کے ایک مرقع تیار کیا۔ ہندوستانی مسلمانوں میں مذہب سے تجاہل و تغافل کا زہر بڑی سرعت کے ساتھ رہا ہے جس کے ردِعمل نے ان میں اتنی بے حسی پیدا کر دی ہے کہ وہ اپنے جیش بہا ترکہ اور اثاثے سے بھی بیگانہ ہوتے جا رہے ہیں.
کی نگاہ اس پہلو پر بھی گئی اور انھوں نے دوراندیشی کے تحت بزرگانِ دین کے متعدد شجروں کو گمنامی سے نکال کر ایک میوزیم آغوش میں پہنچا دیا۔ انھوں نے ارضِ دکن کی سربلندی و سرخروئی کے لئے بہت کچھ کرنے کے بعد ایک نمایاں کارنامہ یہ انجام دیا کہ ادبیات اردو میں شعبۂ تاریخ کی بنا ڈالی اور بالالتزام قطب شاہی یادگاروں کو امتدادِ زمانہ سے محفوظ رکھنے کا کام بڑے انجام دیا، اس کے ساتھ ہی انھوں نے قطب شاہی تاریخوں کی طباعت کا بھی پروگرام بنایا تاکہ جس حد تک اور جس طرح ممکن ہو علیم روزیات، حال و آئندہ کو ماضی کا آئینہ دکھاتی رہیں۔ ان کے اس قسم کے کاموں کا سلسلہ یہیں ختم نہیں ہوتا بلکہ انھوں نے جا بجا کے کتبوں کے چربے لئے قدیم سکے جمع کئے نیز مشہور خطاطوں کے لکھے ہوئے قطعات اور طغرے حاصل کئے۔ ہو سکتا ہے کہ یہ کام ظاہر یہ معمولی نوعیت رکھتے ہوں لیکن تاریخ کے نزدیک بڑے گراں مایہ اور قابلِ قدر ہیں۔ ڈاکٹر زور نے "آزاد اورینٹل انسٹی ٹیوٹ" کا یں لا کر ایک اور بڑا کام کیا، جہاں نہایت تندہی، مستعدی اور سرگرمی کے ساتھ ماہرین علم و فن کی ایک جمعیت تحقیقی کاموں میں منہمک ہے۔ مائیکرو فلم کیمرہ اور پروجیکٹر خریدا جا چکا ہے تاکہ ہر کام جدید ترین معیار اور انداز کے مطابق انجام پائے۔ نیز متعلقہ افراد زیادہ انی توجہ اور آسانی کے ساتھ دادِ تحقیق دے سکیں۔
ڈاکٹر زور ایک انسان کی حیثیت سے بھی کم اونچا مرتبہ نہ رکھتے تھے لیکن وہ بہرحال انسان تھے جس سے سہو و خطا کا ارتکاب ناممکن وہ کبھی کسی کے لئے عمداً گزند یا نقصان پہنچانے کا باعث نہیں ہوئے جو بڑی خوبی کی بات ہے۔ احباب و اعزہ ہوں یا کوئی اور ڈاکٹر سب کے لئے یکساں نفع رساں رہی، اس میں کوئی امتیاز نہیں پایا جاتا تھا جس سے ان کی وسیع النظری اور فراخدلی کا اظہار .. وہ نہ صرف ایک اصول پسند، خوش خلق اور باحمیت آدمی تھے بلکہ مشرقی وضع و تہذیب کے ان وقیع نقوش کے بھی امانت دار تھے جن کی روز بروز معدوم ہوتی جا رہی ہے نیز ان کا دل عالی ظرفی، شرافت اور مروت کا گنجینہ تھا۔
ظاہر ہے کہ وہ ایک صوفی گھرانے کے چشم و چراغ تھے۔ لہٰذا ذہنی و علمی لحاظ سے ان کا مذہبی اختلافات سے الگ اور بالاتر ہونا کسی طرح بجز نہیں کیونکہ یہ خصوصیات ان کا ترکہ تھیں اور غالباً یہی وجہ ہے کہ قومی یکجہتی نیز جذباتی ہم آہنگی کے نظریات و خیالات ان میں ہوتے تھے اور چونکہ ڈاکٹر زور کی دنیا محض تخیل و تصور تک محدود نہیں تھی لہٰذا اپنے کردار کے اس پہلو کا ثبوت بھی انھوں نے عملاً یوم محمد قلی قطب شاہ شکل میں پیش کیا نیز اس کے ذریعہ ہندوؤں اور مسلمانوں کو ایک دوسرے کے قریب آنے، ملنے جلنے اور باہمی اخوت و محبت کے لے پھلنے پھولنے کی داغ بیل ڈالی۔ ان کی دلی تمنا تھی کہ ہندوستان کی فضاؤں میں سانس لینے والے تمام انسان امتیاز و افتراق سے بلند ہو کر اس طرزِ حیات کو اپنائیں جو نہ صرف انسانی بھائی چارگی کا آئینہ دار و علمبردار ہو بلکہ اس سے ملک و قوم کی خوشی و خوشحالی اور نیز خوش آئند مستقبل کی جڑیں زیادہ گہری، شاداب اور مضبوط ہوں۔ وہ ہر نوع کی مذہبی تقریبات میں بخوشی شرکت کرتے اور کی شخصی وجاہت و متانت بڑی کشش انگیز تھی جس میں ان کا ادیبانہ و عالمانہ وقار بھی شامل تھا۔ لہٰذا ان طبقوں اور حلقوں کے افراد بھی جو پسندی و جذبۂ برتری کا شکار ہوتے ہیں، ان سے مساویانہ طور پر ملنے میں فخر و مسرت محسوس کرتے نیز ادب و احترام کے لوازم کو ملحوظ نظر رکھتے۔

چنانچہ یہ امر قابل لحاظ ہے کہ موجودہ سیاسی حالات میں جبکہ مختلف مذہبی، سماجی اور ثقافتی دھاروں کو باہم دگر پیوستہ و یکجا کرنے کی تحریک تیزی سے آگے بڑھ رہی ہے، ڈاکٹر زور کی ہمہ گیر اور ہر دل عزیز شخصیت ان کی کشادہ دلی کے جلو میں بڑی سود مند ثابت ہوتی نیز ان کی ذات سے اس عظیم مقصد کو تقویت کے ساتھ وسعت و گیرائی بھی ملتی لیکن گلچین اجل کے جاہلانہ شبخون کو کیا کہئے:

پھول وہ توڑا کہ گلشن بھر کی ویرانی ہوئی

ڈاکٹر زور نے مخطوطات کی فراہمی کے علاوہ ایک ادیب، ایک محقق، ایک نقاد نیز ایک مورخ و سوانح نگار کے روپ میں اردو زبان و ادب کو جو گنج گراں مایہ عطا کیا ہے اس کی قیمت کا تعین نہیں کیا جا سکتا۔ خصوصاً مولوی عبدالحق کے پاکستان جانے کے بعد ڈاکٹر زور کا وجود سایۂ رحمت سے کم نہ تھا جس سے ہندوستان کی اردو دنیا کو بڑی تقویت ملی اور ان کی رہبری میں اردو نے ارتقا کے کئی کئی مرحلے طے کئے۔ ہم ہر عظیم شخصیت کی مفارقت پر رسماً و عادتاً یہ کہہ دینے کے عادی ہیں کہ ہمارے درمیان سے اٹھنے والے شاعر یا ادیب نے جو خلا پیدا کیا ہے وہ پر نہیں ہو سکتا اور اس کی موت سے جو نقصان پہنچا ہے اس کی تلافی ممکن نہیں، لیکن ڈاکٹر زور کی جدائی پر یہ فقرے ایک جان گداز اور جگر خراش حقیقت بن کر دلوں میں اترے جا رہے ہیں اور ہم اس موقع پر محض اس خیال سے تسلی پا سکتے ہیں کہ ڈاکٹر زور کے ابدی کارناموں کی جگمگاتی مشعل آئندہ کئی نسلوں کو راہ دکھاتی اور منزل کا سراغ دیتی رہے گی۔

اردو زبان کے مشہور خدمت گذار اور نامور صاحب قلم ڈاکٹر سید محی الدین زور قادری کی وفات دنیائے اردو کا بڑا سانحہ ہے انھوں نے علمی اور عملی دونوں حیثیتوں سے اردو زبان و ادب کی بڑی خدمت کی، وہ دکن کے مولوی عبدالحق اور دکنیات کے خصوصیت کے ساتھ بڑے ماہر تھے۔ قدیم دکنی اردو کی بہت سی نادر کتابیں انھوں نے شائع کی۔ ان کا سب سے بڑا کارنامہ "ادارۂ ادبیات اردو حیدرآباد" ہے۔ اس ادارے نے اردو زبان و ادب کی جو گوناگوں خدمات انجام دیں، اس کی مثال اردو کے اس کی عمر کے اداروں میں نہیں مل سکتی۔ اس کی حیثیت دکن میں وہی ہے جو شمال ہند میں انجمن ترقی اردو ہند کی ہے۔ اور آج آندھرا پردیش میں اردو کا وجود اور اس کا وقار اسی ادارے کے دم سے قائم ہے۔ ڈاکٹر زور کی مستقل تصانیف اور ان کی مرتب اور شائع کردہ کتابوں کی تعداد ایک درجن سے زیادہ ہوگی۔ وہ حیدرآباد کے ایک خانوادۂ مشائخ سے تعلق رکھتے تھے، اسی نسبت سے اپنے نام کے ساتھ قادری لکھتے تھے، اور اس سلسلے کو انھوں نے قائم بھی رکھا تھا۔

چنانچہ ان کے بڑے صاحبزادے ان کی خاندانی خانقاہ کے سجادہ نشین ہیں مگر ان کی علمی و ادبی شہرت نے ان کی اس حیثیت کو اتنا چھپا دیا تھا کہ اس کا علم بھی بہتوں کو نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ ان کی مغفرت فرمائے۔

"معارف"

اعظم گڈھ۔ اکتوبر ۱۹۶۲ء

ڈاکٹر موہن سنگھ دیوانہ

دکنی اردو ادب کا ایک محقق مورخ

ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور کو میں نہ جاننے کے برابر جانتا ہوں۔ ان ملا ہوں، مگر ہیں اپریل سنہ ۵۴ء میں ایک جلسۂ عام میں گیر ہوئے۔ ایک شب کو ایک تماشاگاہ میں مصافحہ ہوا اور ایک پوسٹ کارڈ انھوں نے کسی استفسار کے جواب میں مجھے تحریر فرمایا ؎

اک نگاہ ناز بس ہے دلبری کے واسطے

وہ قادری ہیں۔ فقیر ربّی ہے۔ صوفی کو صوفی کی پہچان فطرتاً میسر ہے۔

اگر میں کسی ادبی ادارے میں منسلک ہوتا تو ڈاکٹر موصوف کو محقق اعظم کا خطاب پیش کرتا اس لئے کہ ان میں وہ تمام خوبیاں ہیں جو تحقیق۔ تدلیل۔ تنقید کے کار اہم کے لئے ناگزیر ہیں۔ جیسے (۱) کھوج پڑتال کا فطری جذبہ (۲) مواد کی ڈھونڈھ لنے کی فطری اہلیت (۳) وسیع و عمیق مطالعہ اور اساتذہ کی صحبت (۴) موضوع سے ہمدردی و موافقت (۵) فسکر کی عادت (۶) شک اور ایمان سے سمویا سلیقہ (۷) تنوع اور تعمق کی لگن۔ (۸) تحلیل و تنسیق کا گُر (۹) بے تعصبی (۱۰) حوصلہ، صبر، خوداعتمادی، انکسار (۱۱) ٹھیک ٹھیک منطقی جچی تلی نپی مختصر بات کہنے کی کاوش اور تاکید و تکرار مذر (۱۲) حقیقت کا عشق اور داد گستری کا جنون (۱۳) مقابلہ اور موازنہ اور تکمیل جامعیت کا شوق (۱۴) فکری زبانی توازن اور ماضی حال مستقبل پر بیک وقت نظر (۱۸) سلیس طرز تحریر (۱۶) تعمیری تصور اور تخلیقی و تجدیدی (۱۷) اپنی زبان پر قدرت اور غیر زبانوں سے آشنائی (۱۸) روحانی فیوض و برکات جو گوشت پوست حرف و صرف ماں و زماں حسن و قبح سے بہت پرے کی خبر رکھتے ہیں۔

آپ ثبوت چاہتے ہیں شہادت لیجئے۔ مختصر ہی سہی۔ کیا کروں تقسیم نے ذاتی کتب خانہ غارت کر دیا۔ زور صاحب سے جملہ مطبوعات مانگے۔ شرم آتی ہے۔ اس پر ستم ہائے پیری کا اضافہ۔ ٹالتا چلا آ رہا ہوں۔ مگر کب تک قبل اس کے کہ زندگی جازت چاہوں ذکر بتاں ضروری سمجھتا ہوں ؎

پیری میں بھی ہے لب پہ مرے ذکر بتوں کا — احیائے جوانی کا ہو شاید یہی باعث (دیوانہ)

ا پڑتال کا فطری جذبہ:- زیادہ تو جانتا نہیں ہاں زور کی داستانِ ادب حیدرآباد سے اتنا پتہ چلتا ہے کہ ان کے پرنانا تھے محمد محسن محسنؔ مشہور شاعر اور ادیب قصبہ بودھن ضلع نظام آباد کے رہنے والے خرالدین خاں شمس الامراء کے توسل محسنؔ نے نواب کی فرمائش پر ۱۲۶۹ھ میں "گلدستۂ محسنی" فارسی نثر میں لکھی۔ اس کے میں ایک باب میں مصطفیٰ آباد بودھن کی تاریخ ہے اور باقی میں شہر حیدرآباد سے متعلق بہت سی تاریخی اور سماجی معلومات یں۔ اور یہ نہ بھولئے کہ کتاب کا موضوع ہے انشا و اخلاق، یقیناً حسن اخلاق، انشا پردازی میں مہارت، تاریخ دانی لو

تاریخ جوئی۔ ماحول پروری اور ماحول سنائی زور صاحب کو ورثہ میں ملیں۔ یعنی ان کی فطرت کا جزو ہیں۔ زور صاحب کے دادا تھے سید شاہ عنایت اللہ حسینی جن کے سوانح حیات امیر حمزہ قندھاری نے قلمبند کئے

مواد کی ڈھونڈھ بھال کی فطری اہلیت :۔ برٹش میوزیم اور ادارۂ ادبیات اردو، جامعہ حیدرآباد اور ذاتی میں کتنی فارسی، اردو کتابیں ہیں جن کی دریافت اور جن کا مطالعہ زور صاحب کا مرہون منت ہے، یہ زور صاحب خود ہی بتا سکتے ہیں۔ میں توشہ پارے سے داستان ادب تک کی تحریر کو دیکھ کر قائل ہو چکا ہوں کہ زور صاحب سراغ رساں نہیں نہایت کامیاب۔ فقیر دیسی ہندی زبانوں کے بہیتہ نقاد کی بیشتر تحریروں سے خوب واقف ہے۔ . . . نقل کی نقل ان کا شیوہ ہے۔ پھر وہی مصنف، اور وہی عبارت کام میں لاتے ہیں جو ان کے مفید مطلب ہوں اور ان کے نظریات کی تائید کرتی ہوں۔ اصل تک پہنچنے کی نہ ضرورت نہ ہمت۔ اختلاف رکھنے والوں کو نظر انداز کرتے ہیں۔ مغربیوں کے چبائے ہوئے نوالوں پر پلے ہوئے۔ دیس کے اصلی محققوں کو خاطر نہیں لاتے۔ اور دیس کے محرروں میں امتیاز یوں کرتے ہیں کہ یہ موافق ہے یہ منافق۔ درآں حالیکہ تحقیق کا تقاضا ہے کہ جملہ حوالے بہم کئے جائیں اور کسی مطبوع یا مخطوطہ کا حوالہ اسے خود دیکھے بغیر نہ دیا جائے۔ ڈھونڈھ بھال کے تجربہ کی بنا پر کہتا ہوں کہ اکثر ایک فطری سوچ سراغ دیتی ہے کہ فلاں مصنف و کتاب میں ضرور مطلوبہ معلومات ملیں گی۔ گوشے میں مواد ضرور میرا منتظر ہوگا۔ فلاں تحریک یا مضمون یا شعبہ کا میرے موضوع سے تعلق ضرور ہونا چاہئے۔ وہ سراغ رسانی کی فطری اہلیت کبھی کبھی ایک فقرہ۔ مصرع۔ لفظ۔ صرفی۔ نحوی استعمال سے وقیع نتائج اخذ کرتی ہے۔ یوں کہیئے کہ محقق پیدا ہوتے ہیں۔ تعلیم و تربیت سے بنائے نہیں جا سکتے۔ معمولی چون وچرا کی بات نہیں۔ بات کی تہوں تک جانے، بیخ و اساس تک پہنچنے۔ تعمیر و ترقی کے اسباب۔ اطوار۔ سامانوں کی تصویر کھینچنے کی بات ہوتی ہے۔ تحقیق کا کاروبار ایک شغف ایک مستی، ایک لگاتار تجسس کی کیفیت چاہتا ہے۔

وسیع و عمیق مطالعہ اور کاملین کی صحبت :۔ علوم و فنون ان گنت ہیں۔ تاریخ ادبیات حیدرآباد میں جس احاطہ کیا ہے جس سے مطالعہ کی وسعت اور عمق ظاہر ہے۔ کاملین کی صحبت یورپ میں بھی رہی اور خود حیدرآباد میں بھی۔ عربی، فارسی، دکھنی، دہلوی۔ انگریزی ادب کیا کم ہے۔ مطالعہ اور بے صحبت لوگ جب جائزے لینے بیٹھتے ہیں تو زعم و تعصب کا شکار بنے حذق و غلو کے گناہ بے لذت کئے جاتے ہیں۔ ان سے جامع و مانع کیفیتوں کی آس کہاں۔ اچھچھورے پن اور ادھورے پن کے تاسف انگیز غم افروز نمونے ہوتی ہیں ان کی کچی اور ناقص عبارتیں۔

موضوع سے ہمدردی اور موافقت :۔ اللہ، وہ لوگ بھی ہیں جنھیں خدا اور الہام و القا سے انکار ہے کرشمہ کرام اور رموز تصوف پر لکھنے کا شوق چرایا ہے۔ ایک مصرع موزوں نہیں کر سکتے۔ نثر میں موسیقیت کی ہستی سے بے خبر مگر شعر منظوم و شعر منثور کے نقاد بنے بیٹھے ہیں۔ سلیقے سے بات نہیں مگر افسانہ طرازوں کے حال پر منمانی چٹپٹی چسپیاں کرنے کی دھن ہے۔ ادب کے لغوی اور ارتقائی معنوں سے ناآشنا، ادب کے تو لچے ادب سے تادیب و تہذیب کا کام لینے والوں کی بلندیاں ناپ رہے ہیں۔ سید محی الدین

دل میں جو درد ہے اسلام اور انسانیت کے لئے اور رسم و تحریر سے جو وفاق وہ جوبن کی طرح پھٹا پڑتا ہے۔ حیدرآباد سے حیدرآبادی بھی مکمل واقفیت رکھتا ہے اور تاریخی دریافتوں سے گزری اقدار سے ایک وحدت پرست نظام پرور تاریخ داں ہی سید صاحب ایسا۔ میر ناصر علی خاں۔ پیارے لال آشوب۔ ذکاء اللہ خاں۔ عبدالرؤف عشرت۔ نذیر احمد رتن ناتھ سرشار۔ ناصر نذیر فراق۔ یہ لوگ دلی اور لکھنؤ کے چپہ چپہ پر جان دیتے تھے۔ ان کے دل میں وہاں کی زبان وہاں کی خوراک، پوشاک۔ وہاں کے رسم و رواج وہاں کی خامیاں اور کمزوریاں علتیں اور عادتیں۔ سب مطبوع اور منظور تھیں۔ وہ ان شہروں اور ان کے ساکنین کی مکمل تصویریں اپنے دماغوں میں محفوظ لئے پھرتے تھے اور چاہتے تھے کہ الفاظ میں نہیں ہمیشہ کے لئے مصئون و محفوظ کرتے جائیں۔ زور صاحب میں حیدرآباد کے لئے وہی درد ہے اور حیدرآباد کے لئے ہی نہیں کہ فقط ادیب انھیں عزیز ہیں یا صرف روسا اور حکام سے تعلق اور غرض ہے، وہ حیدرآباد کے عوام سے حیدرآباد کی گلی کوچوں سے حیدرآباد کی عمارات اور سڑکوں سے بھی محبت رکھتے ہیں۔ شہر حیدرآباد یا زبان دکنی اشارے اور نمونے ہیں۔ جس چیز پر جس شخص پر، جس تحریک پر جس انداز اور طرز پر، جس نظریہ پر جس زاویے سے لکھا ہے درد و وفاق سے لکھا ہے اور موضوعات کے تنوع کا یہ حال ہے کہ ادھر حیدرآباد کی عمارت اور تعمیر کنندگان کا تذکرہ ہے تو ادھر سلطان محمود غزنوی کی بزم ادب کا چرچا۔ کبھی لسانیات پر بحث، کبھی صوتیات پر۔ ابھی محمد قلی قطب شاہ کی حیات پر چرچے ہیں۔ ابھی غالب کی روح سے ہم پرواز ہیں۔ قصہ کوتاہ یہ کہ کسی مضمون کے ساتھ جبھی انصاف کیا جا سکتا ہے کہ محاورہ کی زبان میں ڈوب کر لکھا جائے۔ زور اس کو خوب سمجھتے اور برتتے ہیں۔

ہ سے م تک فکر عارٹی کی عادت۔ شک اور ایمان سے گویا سلیقے۔ تنوع اور تعمق کی لگن تحلیل و تنقیق کا گر۔ ان خصائص کے حامل چند فقرے چن چن کر پیش کرتا ہوں۔ رمز شناس قارئین کے لئے یہی کافی ہیں۔ آخر نہ آپ عدالت ہیں نہ میں وکیل۔ جو بات اچھی لگی اسے دہرا رہا ہوں۔ آپ غالباً پہلے ہی سے دیکھ اور جانچ چکے ہوں گے۔ دیکھنا یہ ہے کہ یہ فقرے ایک خشک سی داستان علوم و فنون میں نمودار ہوئے ہیں جیسے اندھیری رات میں روشن رو اور روشن ضمیر پریاں۔ ادب کا احاطہ زور صاحب کے لئے محدود نہیں۔ اس کی آغوش میں تمام علوم و فنون کے بارے میں لکھی ادبی محاسن کی حامل تحریریں لے لی گئی ہیں۔ خیر سنیئے۔

”سینکڑوں ادیب باہر سے آکر اس میں کچھ اس طرح رس بس گئے کہ اپنوں اور بیگانوں میں کوئی فرق باقی نہ رہا۔“

”جدید سیاسی نظریوں نے ہر جگہ ہر چیز کی قدر و قیمت کو متاثر کیا ہے جو پہلو پہلے تاریکی میں تھے اب اجاگر ہوتے جا رہے ہیں اور جو روشن تھے ان پر گھٹاٹوپ اندھیرا چھانے لگا ہے۔“

”اسی طرح آج کے شاعروں اور ادیبوں کی اردو بھی کل کو متروک ہو سکتی ہے اور زمانے کے حالات اور اہل ملک کی ضروریات کے تحت ہر زندہ زبان کی طرح اس میں بھی رد و بدل ہو گا۔ اگر کوئی اس کے شہر بدر ہونے کے خواب دیکھ رہے ہیں تو اس سے ہر طبقہ و ملت کے صاحب بصیرت حیدرآبادیوں کو بڑا تعجب ہو گا۔“

”یہ ظاہر ہے کہ ہر انقلاب کے پیچھے خواہ وہ کتنا ہی تعمیری کیوں نہ ہو تخریبی قوتوں کو ابھرنے اور سرسبز ہونے کا موقع مل جاتا ہے۔ لیکن جونہی غیر عبوری دور ختم ہوتا ہے۔ سیاسی بصیرت اور بھلے برے کی تمیز پیدا ہونے لگتی ہے۔“

"اردو والوں کی ہراسانی بجا ہے، مگر محض ہراسانی اور پریشانی سے نقصان ہوتا ہے۔ ان کو یہ سمجھ لینا چاہئے کہ ان کی زبان کی فطرت میں ایسی لچک ہے کہ وہ کبھی مٹ نہیں سکتی۔"

"حیدرآباد کی ایک ایک اینٹ اردو کے خمیر سے گھڑی ہوئی ہے۔"

"راقم الحروف کی ساری زندگی اُردو زبان و ادب کی خدمت میں بسر ہوئی ہے، اور بطورِ خاص حیدرآباد کے ادیبوں اور شاعروں کے حالات اور کارناموں کی تلاش و تحقیق میں بڑی جستجو کی ہے۔"

"عہدِ رفتہ کے اربابِ کمال کے نام کو اس طرح ضائع جانا نہ صرف کمال کی ناقدری ہے بلکہ آئندہ نسلوں کے لئے کمال کے دروازے بند کر دینے کے مترادف ہوگا۔"

"بعض دفعہ نقشِ قدم ہی رہبری اور رہنمائی کا کام کر جاتے ہیں۔"

"شاعروں اور ادیبوں کے حالات کی ترتیب اور اُن کے رشحاتِ قلم کی نسبت رائے قائم کرنے میں حتی الامکان تحقیق و تلاش اور احتیاط سے کام لیا گیا ہے۔"

"ابن نشاطی ایک ایسا صاحبِ کمال تھا جس نے شاعروں اور ادیبوں کو درباری اور سرکاری قدر دانی سے بے نیاز ہو کر شعر و سخن میں مصروف رہنے کا راستہ سمجھایا۔"

"چونکہ اورنگ زیب اور ان کے کارندوں کی سیاست کے ڈر سے وہ اپنے جذبات و خیالات کو صاف صاف ظاہر نہیں کر سکتے تھے اس لئے مرثیہ گوئی کو اپنا شعار بنا لیا اور اپنے غمزدہ دلوں کی بھڑاس حضرت امام حسینؑ اور شہدائے کربلا کے مرثیے لکھ لکھ کر نکال لی۔"

"کسی چیز کے بگڑنے اور اُجڑنے میں جتنا کم وقت صرف ہوتا ہے اس کے بننے اور سنورنے میں اتنی ہی زیادہ مدت درکار ہوتی ہے۔"

"اورنگ آباد اُس وقت ہر طرح سے عروجِ کمال کو پہنچ چکا تھا لیکن زمانے نے اس کے زوال کے بھی اسباب (اُسی وقت) پیدا کر دئے۔"

"صرف اورنگ آباد ایک ایسا شہر تھا جہاں مغل اربابِ اقتدار کے طویل قیام اور مغلیہ فوجوں کا مرکز ہونے کے باعث زبان میں تھوڑا بہت فرق ہوا تھا۔"

"ضرورت تھی کہ کوئی شخص اس تیار ماحول سے فائدہ اُٹھاتا۔"

"عام طور پر شاعروں اور ادیبوں کی وجہ سے ممدوحوں کی یاد محفوظ ہو جاتی ہے لیکن یہاں معاملہ اُلٹا ہے۔"

"شاہ تجلی کے یہ دونوں مجموعے نہ صرف اس عہد کے شعراء کے تذکرے ہیں بلکہ معاشرت اور حالات و واقعات، سیاسیات کے انسائکلوپیڈیا ہیں۔"

"واصل اور مائل دونوں داغ ہی کی مخالفت اور مقابلے کی کوشش میں خود اعلیٰ پایہ کے شاعر اور اساتذۂ سخن بن گئے۔"

بے تعصبی اور بے غلوئی:— صوفیہ کے سلسلے سے متعلق نیک بخت کبھی تعصب کا مریض نہیں ہو سکتا، اور غلو سے ہر لحظ دامن بچاتا ہے۔ زور صاحب نے سینکڑوں ادیبوں کے بارے میں لکھا ہے مگر کیا مجال کہ

کسی کو بھی اپنے گئے مناسب اور واجب اور موزوں الفاظ سے ایک لفظ بھی کم یا بیش پیش کیا ہو۔ شاعر، ناشاعر، متشاعر، نیم شاعر میں برابر فرق روا رکھا اور ظاہر کیا ہے۔ کسی ادیب نے ادب سے زیادہ تاریخ یا روایت کی خدمت کی ہے تو اسے اس کا حق پہنچایا ہے۔ کسی سے نفرت نہیں دکھائی۔ اسے نظر انداز نہیں کیا۔ غزل گوؤں کو مثنوی نویسوں پر ترجیح نہیں دی۔ ریختی لکھنے والوں کو برگزیدہ نہیں، نہ ان سے نفرت جتائی ہے۔ اگر کسی نے قصیدے لکھنے کے بجائے تاریخ کو نظم کر دیا ہے تو اسے بھی دادِ سخن دی ہے۔ شعرا پر لیبل نہیں لگائے۔ درجہ اوّل، درجہ دوم، درجہ سوم شعرا نہ ہوئے گویا عرق عشبہ کی بوتلیں ہیں یا توت کے شربت۔ اچھے شاعر اور بڑے شاعر کہہ کر بہت کچھ کہہ دیا ہے۔ اگر کسی کے کمال کا تقاضا تھا کہ وضاحت کی جائے تو واضح بھی کر دیا ہے۔ گلاب چند ہمدم کے بارے میں کہتے ہیں "اپنے کلام میں تشبیہیں اور استعارے بڑی خوبی سے استعمال کرتے تھے۔ ان کا ہر شعر نازک خیالی میں فرد تھا۔"

چندو لال شاداں کے بارے میں۔ "اصل دیوانی کا کام چندو لال ہی انجام دیتے رہے، اور اپنی وفات سے ایک سال قبل تک شاہانہ تزک و احتشام کے ساتھ اہلِ حیدرآباد کے قلوب پر حکومت کی۔" ہمہ گیر نقد و نظر کی بہترین مثال۔ "ساتھ ہی آصف سابع نے اپنے طبعی رجحان کے مطابق مذہبی اصلاح کی کوشش کی اور قدیم رسم و رواج کی خرافات کو دور کرنے کی طرف بھی توجہ کی جس کی وجہ سے اس شہر کی بہت سی دلچسپیاں ختم ہو گئیں اور ایسے مواقع تفریح کم ہو گئے جن میں اس ملک کے باشندے بلا امتیاز مذہب و ملت مل جل کر حصہ لیتے تھے۔ شاعروں اور ادیبوں پر بھی اس تبدیلی کا اثر پڑنا ضروری تھا۔" زور جانتے ہیں کہ حکومت قلوب پر ہی کی جانی بھی چاہیے۔

پھر لکھتے ہیں۔ "ارسطو جاہ سوچ سمجھ کر دیتے تھے لیکن چندو لال آنکھ بند کر کے دینے والے انسان تھے۔"
ایسے ہی شخص اخلاق میں میرے مولیٰ کی تقلید کرنے والے ہوا کرتے ہیں ؎

میرے مولیٰ کو کافی ایک سجدہ دور سے وہ بھی — درِ انساں پہ سو سو بار دستک دینی پڑتی ہے
مانگنے سے تو مرادیں بت بھی کرتے ہیں عطا — تو خدا ہے اے مرے مولیٰ مجھے دے بے طلب (دیوانہ)

عام نقادوں کا وطیرہ یہ ہے کہ ممدوح کے لئے جملہ اسمائے صفت استعمال کئے بغیر پانی نہیں پیتے اور اگر ان کے ممدوح ایک سے زیادہ ہیں تو سب کے لئے جملہ کلماتِ تعریف بہم کر دیں گے۔ سب ہی بلاغت، فصاحت، سلاست، روانی وغیرہ وغیرہ کا خزینہ ہیں۔ کسی اردو یا ہندی یا پنجابی یا بنگالی تاریخ ادب کو اٹھا کر دیکھ لو۔ کسی سالگرہ نمبر کے ورق الٹو۔ جو تعریفیں آپ کی ہیں وہی اقبال کی۔ وہی عمر۔ بکر۔ زید کی۔ مقررہ کلمات ہیں۔ انہیں کو ممدوح کی نذر گزران دیا جاتا ہے۔ مگر زور صاحب سے کوئی دو شاعر ایک سے تعریفی کلمات نہیں وصول کر سکے۔ آخر انفرادیت بھی کوئی شے ہے۔

حوصلہ۔ صبر۔ خود اعتمادی اور انکسار۔

جس قدر خدمت زور صاحب نے حوصلے، صبر اور خود اعتمادی کے ساتھ اپنی محبوب زبان پر ایمان رکھتے ہوئے کی ہے اس کے تناسب سے آپ کو ہزارواں حصہ بھی داد نہیں ملی۔ دوسرے لوگ چند مضامین غلط سلط مانگے تانگے کے زیورات سے مرصع تیار کر کے نقاد بن گئے ہیں۔ کسی سلسلۂ ادارہ میں نتھی ہو جائیے، جتنی تعریف چاہیے کرائیے، برادری والوں سے اور پھر پروفیسروں کے لئے نامور ادیب ہونا یعنی داخلِ نصاب مشہور ہونا اور اعلیٰ درجہ کا نقاد باتفاق رائے قرار پانا تو بالکل سہل ہے اور

یقینی ایسے ہی جیسے ریڈیو کے ملازموں کے لئے عمدہ ادیب تسلیم کیا جانا۔ جی تو چاہتا ہے کہ نام گناؤں کہ فلاں فلاں ۱۹۲۶ء میں کیا تھے اور اب پروفیسری کی بدولت کیا ہو گئے مگر باز رہنا ہی اچھا ہے ؎

بنا، سلم وارثی پھرے ہے اترا
وگرنہ خاصے میں حضرت کی آبرو کیا ہے

انکسار تو ان لوگوں کو چھو تک نہیں گیا اور ناز و غرور زیب نہیں دیتا کہ نہ حسن صوری ہے نہ حسن معنوی و باطنی و سیرتی۔ کبر و ناز حسینوں کو زیب دیتا ہے۔ ان کو جنھوں نے ریاض مسلسل سے یا جبرۂ و عطائے خداوندی سے اچھی طبیعت، اچھے مذاق کے ساتھ ساتھ اکتساب سے علوم و فنون میں تبحر حاصل کر لیا ہوا ہے، غرور زیب دیتا تھا۔ غرور بجا تھا۔ شوکت میرٹھی کو یا میر ناصر علی دہلوی کو۔ فقیر ایک مرتبہ محض دیدار کی غرض سے دولت کدے پر حاضر ہوا۔ کہلا بھیجا کہ ہم نہیں مل سکتے۔ آپ سے مل کر ہماری زبان کے بگڑنے کا اندیشہ ہے۔ جب فقیر نے فقیرانہ اصرار کیا تو راضی ہو گئے۔ اس ہیچمدان کے ہمراہ مجی شمبھو ناتھ جو پڑھے ہوئے تو تھے دہلوی تھے۔ پہلے ان سے مخاطب ہوئے آپ کب سے دلی میں رہتے ہیں، کے پشت سے۔ کون سے محلے میں اور کیا کام کرتے ہیں۔ جب معلوم ہوا کہ تین پشت سے پڑے ہیں۔ کھتری ہیں۔ قلم راں ہیں۔ شاہ بولا کے بڑ کے پاس والے محلے نائی واڑہ میں رہتے ہیں تب کہیں جا کر میر صاحب کی دل جمعی ہوئی۔ اور اس پر مزہ یہ کہ جب دل جمعی ہوئی تو فقیر کی اردو دانی کے بارے میں تو ایسی دل جمعی ہوئی کہ میرے دوسرے رسالوں میں چھپے ہوئے مضامین بھی "صلائے عام" میں طبع فرمائے، جیسے نواب محبت خاں کی مثنوی کی تعریف اور اردو شاعری میں انسانیت، حالانکہ وہ شاذ و نادر ہی کسی اور کو اس قابل سمجھتے تھے کہ اس کا غیر مطبوعہ مضمون بھی برائے اشاعت قبول فرمائیں۔ یہ لوگ تھے جنھیں ناز و کبر جائز و روا تھا۔ کیونکہ وہ پرلے درجے کے منکسر بھی تھے۔ انھیں اپنے پر بھی اعتماد تھا اور دوسروں پر بھی۔ جنھیں وہ اپنی بصارت اور بصیرت سے قابل داد و قدر انتخاب کر چکے ہوتے۔

اس عبارت عقیدت کے طول اور اس کے بے مزہ ہو جانے کے ڈر سے اسے تشنہ ہی رہنے دینے کا ارادہ کر لیا ہے۔ مجھے جو کچھ کہنا تھا وہ دو الفاظ میں کہہ دیا۔ محقق اعظم اور میرا کہنا کیا معنی کہ فقیر کی دعا ہے۔ سید صاحب نے ہمیں اس قدر ادبی ارمغاں عنایت فرمائے۔ طبیعت محظوظ ہوئی۔ عوام سے ایک فقیر دعا دینے لگا۔ نمائندہ حیثیت میں قصہ بس اتنا ہی ہے۔

۱۸۔ فیوض و برکات کے بارے میں البتہ وہ ایک گفتنی باتیں ہیں۔ کوئی شخص قادری یا سہروردی یا نقشبندی یا شطاری یونہی نہیں ہوتا۔ ہوتا ہے تو اس سلسلہ کی روحانیت کے خزانے اس کے دل میں منتقل ہونے شروع ہو جاتے ہیں۔ اس کا اہتمام غیبی رہتا ہے۔ عبدالقادر سروری صاحب سے ملا، زور صاحب سے ملا، میر ولی الدین صاحب سے ملا، حسرت موہانی سے، ثاقب کانپوری سے مل چکا تھا۔ کوئی مانے یا نہ مانے فقیر کا ایمان ہے کہ سادات کی کرامت خصوصی ہے اور حلقہ گوشی صوفیہ کا کردار خصوصی۔ ادب[1] زندگی کی طرح معرفت کی گود میں پل کر حسین تر۔ مفید تر۔ صادق تر اور لطیف تر ہو جاتا ہے۔ شاہ میراں جی اور چندا اور کشن پرشاد شاد اور فیض ایسے لوگوں کے بارے میں لکھنے کے لئے سید محی الدین قادری زور ایسا ہی صوفی

---

[1] زور صاحب فیض کے بارے میں لکھتے ہیں "تصنیف و تالیف اور علم و فضل ان کے فیوض باطنی اور کشف و کرامات کے مقابلے میں کوئی اہمیت نہیں رکھتے" حالانکہ اوپر کہہ چکے ہیں کہ فیض ایک اعلیٰ پایہ اور ترقی پسند شاعر تھے۔ یہ قادری ہی لکھ سکتے ہیں۔

چاہئے تھا سو مل گیا۔ شاد کے متعلق زور صاحب لکھتے ہیں :۔

" اپنے نانا چندو لال کی طرح سب لوگوں کی مدد کرنے اور ان کو آسنا دینے کے بعد ہی خوش ہوتے تھے کہ خود کے پاس کچھ نہ رہے " ایک مصرع کسی کا یاد آیا ؎

گھر تو اسی لئے ہے کہ لوٹا کرے کوئی

حیدرآباد کے ادب اور ادیب کے متعلق لکھا جائے تو واجب ہی ہے لازم ہی ہے کہ خاتمہ تبرکاً کسی ولی حیدرآباد کے کلام پر ہے۔ میں غفران مکان محبوب سلیمان آصف کے تین اشعار دیتا ہوں جن کا انتخاب زور صاحب کے حسن ذوق کا ممنون ہے ؎

جب اس کے کام کا نہ مرے کام کا ہے دل
پھر کس مرض کی بار خدایا دوا ہے دل

کچھ وسعت زمین و فلک کی نہیں بساط
گر حوصلہ ہو دل میں تو سب سے بڑا ہے دل

آصف کا امتحاں تو کیا منصفی بھی کر
یہ ہر کسی کا حوصلہ ہر ایک کا ہے دل

مضمون لکھا گیا۔ فوراً بعد سید مراد علی طالع صاحب کی لکھی "حضرت مشکل آسان ثانی رحمۃ اللہ علیہ" کتاب ملی نیز ت النساء بیگم کا نعتیہ کلام" ذکر و فکر" مجھے مرحمت ہوا۔ وہ جو ایک شک سا گمان سا میرے دل میں کھٹکتا تھا دُور ہو گیا۔ اہوا کہ مجھ سے اپنی تعریف اردو کانسٹنس یری ہی نہیں کرا رہا تھا ایک خوش نصیب باپ۔ شاد بخت شوہر اور سعادتمند ہی نہیں خراج تحسین وصول کر رہا تھا بلکہ ایک صوفی ابن صوفی ابن صوفی ابن ..... کا تذکرہ میری ثواب اندوزی رن بن رہا تھا۔ گویا میں جیبان حبیب خدا کی ثنا میں بے اختیار جٹا ہوا تھا۔ بارے دل جمعی ہوئی۔

ڈاکٹر زور کے والد تھے قطب وقت حضرت مولانا حافظ قاری ابوالبرکات سید شاہ غلام محمد زعم قادری الرفاعی الچشتی ن آسان ثانی۔ قندھار شریف کے مشہور ولی اللہ پڑدادا تھے۔ سید علی سانگڑے سلطان مشکل آسان۔ اور دادا مولوی سید شاہ عنایت اللہ حسینی رفاعی المعروف بہ صاحب عالم۔ زور صاحب کے صاحبزادے ہیں الحاج سید شاہ تقی الدین ام دہ نشیں حضرت مشکل آسان ثانی اور زور صاحب کی بیگم تہنیت النساء تہنیت کا ننھیال علماء فرنگی محل سے ہے۔

آپ ہی بتائیے کہ اتنی دولتیں اور عظمتیں جس فرد میں جمع ہوں وہ خیال و عمل سے خدمت اسلام اور خدمت ادب کے ان پر ستارہ بن کر کیوں نہ چمکے۔ تعجب ہوتا ہے کہ تاریخ ادب حیدرآباد میں زور صاحب نے تہنیت النساء کا ذکر نہ کرکے ہ بے انصافی کیوں کی۔ اس کمی کو فقیر پورا کئے بغیر نہ رہ سکے گا۔

بہترین اولیٰ ترین، پاکیزہ ترین، مفید ترین ادب کی سرحدیں روحانیت کی حدوں سے ملحق ہو جایا کرتی ہیں۔ معرفت کا نا ہکار ہے منفرد کو عالمگیر کر دینا اور عالمگیر کو منفرد بنانا وہی ادب کا کارنامہ ہے۔ سبحان اللہ جزاک اللہ کس رفعت پر پلر تہنیت نے یہ شعر کہا ہوگا ؎

کربلا ہی کے تصور سے یہ آتا ہے خیال
دہر کی ساری بلاؤں سے لپٹ کر رولیں

اور اسی نعتیہ غزل کے دو اور اشعار ؎

وقتِ رخصت دلِ مضطر کی تمنا تھی یہی — آپ کے در کے گداؤں سے لپٹ کر رولیں
حشر میں ان کے سبب وہ متوجہ ہوں گے — کیوں نہ ہم اپنی خطاؤں سے لپٹ کر رولیں

کربلا کے عدیم النظیر سانحہ پر یہ بے مثل شعر کہنے والی خاتون بے شک رفعتِ اسلام ہے۔ نعت محبت کے بغیر نہیں ہو سکتی اور محبت تغزل کی جان و ایمان ہے۔ دیکھئے کیا پیارا اور پاکیزہ شعر ہوا ہے ؎

بن جاتی ہے خود ان کی محبت ہی سہارا — جب پیش نظر کوئی سہارے نہیں ہوتے

مگر اس میں بھی ایک افشا کرنے کے قابل راز ہے ؎

ہے ہم کو یقیں تہنیت اس طرح نہ لکھتے
کچھ ان کی طرف سے جو اشارے نہیں ہوتے

دیوانہ ؎

زیست کے ہر دوراہے پر کوئی — چشم و دل کو اشارے کرتا ہے

کل پرسوں صحبتِ فقرا میں بحث چلی کہ اختیار اچھا ہے یا جبر۔ اس ہیچمدان نے عرض کیا۔ مجھ بندۂ ظلوم و جہول کو اگر قدرت ملے بھی تو میں جبار کے قدموں میں رکھ دوں۔ میرے لئے مجبوری ہی میں افادیت ہے۔ مجھے اپنے اوپر بھروسہ ہی نہیں تہنیت نے فقیر سے ہزار درجہ بہتر انداز میں پہلے ہی کہہ رکھا ہے ؎

خوشی سے سونپ دیتے ہیں سب اپنا اختیار ان کو — گرفتارِ محبت ورنہ کب مجبور ہوتے ہیں

قسم خدا کی اس مرکب اور اس غزل نے تنقید کو حلال ہی تو کر دیا ؎

وسعتِ کشمکشِ زیست پہ چھا جاتے ہیں — وہ ہیں خوش بخت مدینہ میں جو آجاتے ہیں

ادب دربارِ رسولؐ میں پہنچ کر بخشا گیا یعنی کامران و کامگار ہوا ؎

سفر کی دقتوں کے تھے جو چرچے
حقیقت میں وہ افسانے سے نکلے

اللہ کس قدر عالمگیر اطلاق ہے اس شعر کا۔ وہاں پہنچے تو سفر، مسافر، دنیا سب کو افسانہ محض پایا۔ نہ دنیا نہ ابن آدم۔ نہ شیطان۔ نہ فرشتے۔ ایک واحد لاشریک تھا۔ اور ہے۔ وہاں پھر دوسرے کی موت ہے۔ اور ابدی زندگی بھی۔ یعنی تفسیر ہے لا الٰہ الا اللہ کی۔ سرمد یاد آیا اور مولانا ابوالکلام کا مضمون سرمد پر ؎

جان دی رازِ حق افشا نہ کیا
ہائے سرمد سے راز دار کہاں

(منقول از ساقی۔ کراچی۔ اکتوبر)

گیان چند

اُردو لسانیات کے ابوالآباء ڈاکٹر زور

ڈاکٹر زور نقاد۔ ماہر لسانیات۔ محقق۔ مورخ۔ سوانح نگار۔ مرتب۔ مدیر۔ سبھی کچھ تھے اور ان کے علاوہ بھی کچھ تھے۔ ان کی جولانیاں محض صفحۂ قرطاس تک محدود نہ تھیں وہ میدان عمل کے بھی شہسوار تھے۔ ان کی ذات شیوہ ایک ادارہ تھی جس نے بہت سے ادارے بنائے۔

ایک بار میں نے بھوپال کے اسٹیشن پر ڈاکٹر زور سے پوچھا کہ آپ کو پی۔ ایچ۔ ڈی کس کتاب پر ملی تھی۔ انھوں نے دیا ہندوستانی صوتیات پر ...... ہندوستانی لسانیات اور اردو شہ پارے چونکہ ڈاکٹر زور کو ایچ۔ ڈی کی ڈگری ۱۹۲۹ء میں مل چکی تھی اور یہ کتابیں اس کے بعد مرتب ہوئیں۔ اس سے ظاہر ہے کہ ان کا تحقیق ان کتابوں کے نقوش اول کا مرقع ہوگا۔

میں اکثر کہا کرتا ہوں کہ لسانیات کے باب میں اردو ہندی سے ۲۵ سال پیچھے ہے یعنی آزادی کے بعد اردو کی لسانیات میں جو متاع فخر دکھائی دیتی ہے وہ ہندی میں کم از کم ۲۵ سال پہلے وجود میں آچکی تھی۔ لیکن زور نے صوتیات پر جس وقت کام کیا اس وقت تک ہندی کے موجودہ علما میں سے کسی نے لسانیات پر ایک لفظ بھی نہ لکھا تھا۔ بابو شیام سندر داس کی بھاشا وگیان ۲۸ء تک ہندی لسانیات کی کل کائنات تھی۔ زور لسانیات کی دنیا میں بڑی گھن گرج سے آئے۔ وہ نہ صرف اردو میں بلکہ ہندوستان کی جملہ زبانوں میں ان کے قافلہ سالاروں میں سے ہیں لیکن افسوس صد افسوس انھوں نے اپنے شوق کو جاری نہ رکھا۔ ۱۹۲۹ء میں لندن سے پی۔ ایچ۔ ڈی کرنے کے بعد وہ ڈی لٹ کے لئے پیرس پہنچے اور پروفیسر جیولز بلاک کی رہنمائی میں گجراتی اور ہندوستانی پر مقالہ لکھنا شروع کیا لیکن اسے پورا نہ کیا۔ اگر مرحوم لسانیات سے دلچسپی لیتے رہتے تو ملک کے ماہرین لسانیات میں شمار کئے جاتے۔ لسانیات کے سلسلے میں ان کی تصانیف حسب ذیل ہیں :۔

۱۔ ہندوستانی صوتیات — ۱۱۶ صفحات کا یہ انگریزی کتابچہ ۱۹۳۰ء میں پیرس سے شائع ہوا

۲۔ ہندوستانی لسانیات۔ ۱۹۳۲ء۔

ان کے علاوہ دو مضامین میری نظر سے گزرے ' اردو اور پنجابی '۔ یہ مضمون نقوش لاہور میں پہلی بار غالباً ۱۹۵۱ء میں شائع ہوا۔ دوبارہ یہی نقوش کے ادب عالیہ نمبر بابتہ اپریل ۱۹۶۱ء میں شامل کیا گیا۔ ۲ ' اردو کی ابتدا '

اردو کی ابتدا۔ مشمولہ اردو کے متعلق لسانیات صفحہ ۱۵۔

یہ مضمون دلی یونیورسٹی کے رسالے اردوئے معلّٰی کے لسانیات نمبر جلد سوم شمارہ ۴ - ۵ بابتہ سنہ ۱۹۶۲ء میں
ان کی کتاب ہندوستانی لسانیات اور ان کے اردو مضامین سے قائمیں اردو متعارف ہیں۔ ا
اردو کی ابتدا سے متعلق جو نظریہ پیش کیا ہے اس سے اختلاف بھی کیا گیا ہے لیکن لسانیات میں ان کا ا
ہندوستانی فونیٹکس ہے۔ افسوس یہ ہے کہ اس کا اردو میں ترجمہ نہیں کیا گیا جس کی وجہ سے اردو
سے بھی روشناس نہیں حالانکہ ڈاکٹر زور کو لسانیات کی تاریخ میں کوئی مقام دیا جائے گا تو اسی کتاب
ڈاکٹر زور کی لسانیاتی تحقیقات پر تیس سال سے زیادہ کا عرصہ گزر چکا ہے۔ اس دوران میں لـ
بالخصوص صوتیات کا علم زمین سے آسمان تک پہنچ گیا ہے۔ آج ہمیں ڈاکٹر زور کی تحریروں میں سقـ
لیکن سنہ ۱۹۳۰ء میں یہی باتیں چونکا دینے والی تھیں۔ ذیل میں ان کے کارناموں کا ایک سرسری
کیا جاتا ہے :—

ہندستانی فونیٹکس (انگریزی میں)۔ اردو دنیا ڈاکٹر زور کو تاریخی و تقابلی لسانیات کے
سے جانتی ہے لیکن ان کا زیادہ اہم کام صوتیات کے ضمن میں ہے۔ لندن اور پیرس کی تجربہ گاہ
زور نے آوازوں کا جو تجزیہ کیا "ہندوستانی صوتیات" اسی کا نتیجہ ہے۔ اس میں علم زبان کے وہ موتی بھـ
بھی اس کی سیر کی جائے کوئی نہ کوئی گوہر غلطاں ہاتھ آ ہی جاتا ہے۔۔

تمہیدی باب میں فاضل مصنف نے اردو کے آغاز کے بارے میں اپنا مشہور نظریہ پیش کیا
صدی سے قبل صوبۂ سرحد سے الہ آباد تک ایک زبان بولی جاتی تھی۔ بارھویں صدی کے بعد ز
شروع ہوا۔ پنجاب میں پنجابی بن گئی یوپی میں کھڑی بولی۔ اردو نہ پنجابی سے مشتق ہے نہ کھڑی بو
دونوں کے مشترک ماخذ سے تشکیل پائی ہے۔ میں اس نظریے کے بارے میں کچھ نہیں کہنا چاہتـ
مسعود حسین خاں اور ڈاکٹر شوکت سبزواری اسے اچھی طرح پرکھ چکے ہیں۔ اس باب کے دوسرے حـ
نے شمالی اور دکنی اردو کے اختلافات بڑی وضاحت اور تفصیل سے پیش کئے ہـ
کسی نے دکن کی خصوصیات کے بارے میں شاید ہی لکھا ہو۔ زور صاحب نے داتا نے راز کی جامعیـ
بیان کیا ہے۔ انھوں نے پہلے صوتیاتی اختلافات کی شرح کی ہے بعد میں صرف و نحو کی۔ یہ سب ڈ
مشاہدے اور غور و فکر کا نتیجہ ہے آئندہ اس موضوع پر لکھنے والوں کے لئے ان کی یہ تحریر مشعل راہ ہے
دوسرے اور تیسرے باب میں اردو کی اصوات میں ایک ایک کو لے کر اس کا تجزیہ کیا ہے ا
۹ مصوتے اور ۲ جڑواں مصوتے DIPTHONG قرار دئے ہیں جن سے اتفاق کرنا مشکل ہے
نے تھ۔ لھ۔ رھ۔ ڑھ۔ وھ۔ زھ کو بھی شامل کیا ہے حالانکہ ان سے پہلے یا ان کے بعد کـ
عالم نے اس کی تائید نہیں کی۔ لیکن جب کو اردو مصمتوں میں جگہ دے کر انھوں نے حقیقت نگرـ
ان اختلافات سے قطع نظر اصوات کا تجزیہ قابل داد ہے یعنی پہلے ایک آواز کا طریق تلفظ د
ماحولوں میں اس میں جو تبدیلیاں ہوتی ہیں ان کی شرح کی ہے۔ مزید وضاحت کے لئے ہر آواز

PALATOGRAM دیا ہے۔ (پلیٹوگرام تالو کے اس نقشے کو کہتے ہیں جس سے یہ واضح ہو سکے کہ کسی خاص آواز کو ادا کرتے وقت زبان تالو کے کس کس حصے کو چھوتی ہے) اس کے علاوہ بعض آوازوں کے نازک اختلافات کو کائموگراف KYMO سے بنی ہوئی لکیر کے ذریعہ ظاہر کیا گیا ہے۔ اردو کی ایک ایک آواز کو لے کر اس کا تجزیہ پیش کرنا ڈاکٹر زور کا ایسا کارنامہ ہے جس کی نظیر تا حال اردو اور ہندی کی کسی کتاب میں نہیں ملتی۔ گو لوک بہاری دھل کی ہندی کتاب 'دھونی وگیان' میں انگریزی آوازوں کا اسی طرح تجزیہ کیا گیا ہے ہندی آوازوں کا نہیں۔ اس میں پلیٹوگرام دئے ہیں لیکن کائموگراف کے چارٹ نہیں دئے۔

مصوتوں کے تجزیے میں ڈاکٹر زور نے کس باریک بینی اور عمق نظر کا ثبوت دیا ہے وہ چند مثالوں سے واضح ہوگا۔

۱۔ لفظ کے آخری ب کے بعد ہم عموماً ایک نہایت خفیف مصوتہ بھی بولتے ہیں۔ ثبوت میں دو الفاظ 'تب' اور 'داصب' کا کائموگرافی خط درج کیا ہے جس میں ب کے بعد ایک خفیف مصوتہ صاف دکھائی دیتا ہے۔

۲۔ لفظ کا ابتدائی ت درمیانی یا آخری ت کی نسبت زیادہ وضاحت سے ادا ہوتا ہے۔

۳۔ درمیانی تھ اور دھ میں ابتدائی تھ اور دھ کی نسبت تنفیس یعنی ھ کاریت کم ہوتی ہے۔

۴۔ درمیانی ٹ ابتدائی ٹ سے زیادہ شدت سے ادا ہوتا ہے۔

۵۔ لفظ کے درمیان ٹھ کے بعد کوئی غیر ہمتی اسپوٹ آواز آئے تو ٹھ ٹ کی آواز دیتا ہے۔ مثلاً بیٹھتا اور کٹھ پتلی میں۔

۶۔ لفظ کا آخری چ نہایت خفیف ہوتا ہے۔

مندرجہ بالا بیانات مشتے نمونہ از خروارے ہیں۔ یہ باد ہوا دعوے نہیں ان سب کو پلیٹوگرام یا کائموگراف کے نقشوں سے ثابت کیا گیا ہے۔

آوازوں کے تجزیے کے بعد ڈاکٹر زور نے مفرد و مرکب الفاظ کی ان آوازوں کی تفصیل کی ہے جو متعاقب آواز کے اثر سے کسی حد تک بدل جاتی ہیں۔ مثلاً 'چپ بیٹھو' میں پ کی آواز ب سے مشابہ ہو جاتی ہے 'کتنے دن' میں ت کی آواز د جیسی۔ 'پیچ دار' میں چ کی آواز ج کی مانند اور 'بات چیت' میں ت کی آواز چ سے مماثل ہو جاتی ہے۔ اصولوں اور مثالوں کی کثرت ان کے شاہدے کی وسعت اور ہمہ گیری کی غماز ہے۔

چوتھے باب میں بل اور سر لہر سے بحث کی ہے۔ ان موضوعات پر لکھتے ہوئے آج بھی قلم کو لرزش ہوتی ہے۔ ڈاکٹر زور نے اردو زبان میں بل اور سر لہر کی تعیین جس وقت کی اس وقت تک کسی ماہر لسان نے اردو یا ہندی کے اس پہلو پر ایک مضمون بھی نہ لکھا تھا۔ اپنے زمانے کے لحاظ سے ڈاکٹر زور کے اصول غنیمت ہیں۔ انھوں نے دو رکنی و سہ رکنی الفاظ کے بل کو بڑی حد تک صحیح طور پر گرفت کر لیا چنانچہ ان سے ۲۴ سال بعد لکھتے ہوئے ڈاکٹر مسعود حسین خاں[ع]

ع مقدمہ تاریخ زبان اردو۔

ان اصولوں کی تائید و تصدیق کی۔ زور صاحب کے اصولوں سے کہیں کہیں اختلاف کیا جا سکتا ہے، ان میں ترقی کی بھی گنجائش ہے جیسا کہ راقم الحروف نے اپنے ایک مضمون میں کیا لیکن ۲۸-۱۹۲۷ء کا زمانہ دیکھتے ہوئے ڈاکٹر زور کے اجتہاد اور اپج کا اعتراف کرنا پڑتا ہے۔ اس باب کے دوسرے جز و میں اردو کلام کی سُر لہر کی تشریح کی ہے۔ اس موضوع پر ابھی تک دوسرا کام سامنے نہیں آیا۔

غرض یہ مختصر کتابچہ کوزے میں دریا سمادینے کی اچھی مثال ہے۔ اس میں محض اصول و نکات ہیں حشویات اطناب کا نام نہیں۔ آج اردو صوتیات کے کسی بھی مسئلہ پر لکھنا ہو ہندوستانی فونیٹکس کی ورق گردانی ناگزیر ہے۔ جویائے علم کے لئے یہ رسالہ ؎

زفرق تا بہ قدم ہر کجا کہ می نگرم کرشمہ دامن دل می کشد کہ جا ایں جاست

کی مثال ہے۔

"ہندوستانی لسانیات" میں ڈاکٹر زور نے ان موضوعات پر لکھا جو نہ صرف اس زمانے میں بلکہ اس کے بہت بعد تک اردو میں نئے تھے۔ مثلاً زبانوں کی صوتی تبدیلی اور اس کے اسباب دنیا کی زبانوں کے خاندان۔ ہند آریا گروہ بندی وغیرہ۔ صوتی تبدیلی کا بیان آج کی معلومات کے اعتبار سے تشنہ ہے لیکن ہند آریائی کی تفصیلات آج بھی صحیح ہیں۔ اس کتاب کے حصہ دوم میں ہندستانی کے آغاز اور ارتقا سے بحث کی ہے جس کا مرکزی حصہ ان کے اپنے نظریہ کی تشریح ہے۔ اسے سب سے پہلے اپنی انگریزی کتاب میں پیش کر چکے ہیں۔

اس حصے کا ایک عالمانہ باب "ادبی بولیاں۔ گجراتی۔ دکنی۔ شمالی" ہے۔ اس میں ڈاکٹر زور کے ڈی لٹ کے نامکمل کام کی ایک جھلک دکھائی دیتی ہے۔ آج کے لکھنے والوں میں کم لوگوں کو معلوم ہو گا کہ دکنی اور گجری مختلف بولیاں ہیں۔ انھیں ایک سمجھ لیا جاتا ہے لیکن زور صاحب نے دونوں بولیوں کے چار اختلافات پیش کئے اور اس طرح گجری کو دکنی سے ممیز کیا۔ اگر کام کو جاری رکھتے تو اس بولی کا مکمل نقشہ سامنے آجاتا۔ دکنی اور گجری میں فرق کرنے کے بعد ڈاکٹر زور نے دکنی اور شمالی کے اختلافات کا مجمل بیان کیا ہے۔ یہ وہی ہیں جو انگریزی رسالے میں تفصیل سے درج کئے جا چکے ہیں۔

اپنے دو مضامین میں ڈاکٹر زور نے کوئی نئی بات نہیں پیش کی۔ اردو سے متعلق اپنے نظریے کا اعادہ کیا ہے ۱۹۲۵ء اردو اور ہندی کی تاریخی تحقیق بہت آگے بڑھی ہے لیکن زور صاحب کو اپنے نظریے کی صحت پر یہاں تک اعتماد ہے کہ وہ نئی تحقیقات کی روشنی میں ترمیم کے لئے آمادہ نہیں۔

مندرجہ بالا سطور میں ڈاکٹر زور کی لسانیاتی خدمات کا صحیح اور منصفانہ جائزہ لینے کی کوشش کی گئی ہے نہ عقیدت کے جوش میں ہیرو پرستی کی گئی ہے نہ ۱۹۶۳ء کی عینک سے دیکھ کر خواہ مخواہ خردہ گیری کی گئی ہے۔ اس جائزے سے روشن ہوتا ہے کہ ڈاکٹر زور کی طبیعت تاریخی لسانیات سے زیادہ تجزیاتی لسانیات بالخصوص صوتیات سے مناسبت رکھتی تھی وہ ہمارے ابتدائی علمائے صوتیات میں سے تھے۔ اگر وہ لسانیات سے قطع تعلق نہ کر لیتے بلکہ خود بھی پڑھتے لکھتے اور دوسروں کو بھی لکھنے پر مائل کرتے تو اردو زبان اس صنف میں اتنی پچھڑی نہ ہو کر ہندوستان کی دوسری زبانوں کے دوش بدوش ہوتی۔

غلام رسول

لسانیاتی ادب میں ڈاکٹر زور کا حصہ

لسانیات سے مراد وہ علم ہے، جس میں تاریخی اور تقابلی مطالعے کے ذریعے کسی زبان کے آغاز، ساخت، فطرت، ارتقا، حیات اور موت سے بحث کی جاتی ہے۔

لسانیات کے اہم شعبے حسبِ ذیل ہیں:۔

۱۔ کلامیات (SYNTAX) ۲۔ تشکیلیات (MORPHOLOGY) ۳۔ صوتیات (PHONETICS)

۴۔ معنیات (SEMANTICS)

بعض ماہرین لسانیات اس کی پانچ شاخیں قرار دیتے ہیں:۔ (۱) کلامیات (۲) تشکیلیات (۳) لفظیات WORDOLOGY (۴) صوتیات (۵) معنیات۔

ہم اپنے مافی الضمیر کو ایک دوسرے پر زبان کے ذریعے ظاہر کرتے ہیں۔ اظہار خیال میں عموماً جملوں سے کام لینا پڑتا ہے، اس لیے جملہ یا کلام کو لسانیات میں بڑی اہمیت حاصل ہے، پس لسانیات کے جس شعبے میں اس سے بحث کی جاتی ہے، وہ کلامیات کہلاتا ہے۔ اس کے مطالعے کی دو شکلیں ہوتی ہیں۔ ایک تاریخی کلامیات، دوسری تقابلی کلامیات۔ تاریخی کلامیات میں کسی زبان کے آغاز سے لے کر موجودہ زمانے تک اس کے جملوں کی ساخت کے اصولوں کو بیان کیا جاتا ہے اور تقابلی کلامیات میں کسی دو زبانوں کے جملوں کی ساخت مذکور ہوتی ہے، چونکہ تبادلۂ خیالات میں لفظوں کا استعمال ہوتا ہے اور لفظوں ہی سے مل کر جملہ یا کلام بنتا ہے، اس لیے کلام کے بعد ہی الفاظ اہم سمجھے جاتے ہیں۔ جس علم میں لفظوں کے مادے، لاحقے سابقے اور ان پر حروفِ مغیرہ کے اثرات وغیرہ کا حال بیان کیا جاتا ہے، اس کو تشکیلیات کہتے ہیں۔ تشکیل یا کلمے کا دارومدار لفظ پر ہے۔ لفظوں پر ساخت اور تاریخ کے لحاظ سے غور اور ان کا تقابلی مطالعہ کیا جاسکتا ہے۔ جس علم میں کسی زبان اور شخص وغیرہ کے مجموعۂ الفاظ پر غور اور مقابلہ ہوتا ہے، اسے لفظیات کہتے ہیں۔ آوازوں کی ملاوٹ سے الفاظ بنتے ہیں، لہٰذا لفظوں کے بعد ہی آواز کا درجہ اہم قرار پاتا ہے، چونکہ انسان کے اعضائے نطق یعنی لب، دہن، حلق، حنجرہ، خیشوم اور پھیپھڑے وغیرہ ہی کے ذریعے آواز پیدا ہوتی ہے، اس لیے آواز کی لہر اور اس سے بننے جانے والی چیزوں کا مطالعہ جس علم سے ہوتا ہے، وہ صوتیات کہلاتا ہے۔ اس سے آواز کا تغیر، اس کا پھیلاؤ، اس کے وجوہ اور اس کی سمتوں کا حال معلوم ہوتا ہے۔ صوتیات کے مطالعے کی بھی دو شکلیں ہوتی ہیں۔ ایک تقابلی ہے، جس میں ایک خاندان کی زبانوں کو لیکر صوتی ارتقا پر غور کرکے اس سے اصول متعین کئے جاتے ہیں۔ دوسری تاریخی ہے، جس میں ایک زبان پر تاریخی نظر سے پتا چلایا جاتا ہے کہ اس میں کس آواز کے ذریعے کب اور کیونکر تغیر پیدا ہوا؟ زبان کے مطالعے میں، جس علم سے لفظوں کے معنوں میں تغیرات اور ان کے وجوہ کا حال

ظاہر ہوتا ہے، اس کو معنیات کہتے ہیں۔

اردو میں لسانیاتی ادب

اردو میں شمس العلما محمد حسین آزاد نے لسانیات کا ڈول ڈالا اور سب سے پہلے آپ نے ۱۸۸۶ء میں سخندان فارس، لکھی اور ۱۹۰۷ء میں لاہور کے مشہور ناشر منشی گلاب سنگھ اینڈ سنز نے اس کو شائع کیا۔ اس کتاب میں لسانیات کے صرف ایک شعبہ 'لفظیات' پر روشنی پڑتی ہے۔ اس وقت علم زبان بالکل ابتدائی حالت میں تھا۔ ہمارے مشرقی علما اکثر اس سے نابلد تھے۔ ان میں فقط مولانا ہی منفرد تھے، جو اپنے فطری لگاؤ اور سنسکرت فارسی زبانوں کی معلومات و مہارت کی بنا پر الفاظ حروف اور حرکات کی حد تک یعنی الفاظ کی پیدائش، ان کا باہمی تعلق، معنوں میں تغیر و تبدل، زبان کا اصل خاندان، فارسی اور سنسکرت متحد الاصل الفاظ میں بعض اصولوں کے مطابق رد و بدل، حروف کی اشکال، اُن کے تلفظ اور لب و لہجہ کا اختلاف اور ان کی حرکات کا حال کتاب مذکور میں بیان کیا ہے۔

عام طور پر لسانیات ایک جدید علم ہے، جو انیسویں صدی میں پیدا ہوا اور یورپ سے نکل کر ایشیا میں پھیلا۔ اس کے علما نے بہت سی زبانیں سیکھ کر اپنی محنت اور کوشش سے لسانیات کو علم کے ساتھ فن کے درجے تک پہنچا دیا ہے۔

'سخندان فارس' کے بعد قابل ذکر کتاب پنجاب میں اردو ہے، جس کو پروفیسر محمود شیرانی نے ۱۹۳۰ء میں تصنیف کیا۔ اس میں اردو زبان کی قدامت پر مختلف پہلوؤں سے روشنی ڈالی ہے اور تاریخ اور الفاظ کے تقابلی مطالعے کے ذریعے ثابت کیا ہے کہ اردو زبان کا مولد سرزمین پنجاب ہے نہ کہ دکن، اردو، پنجابی سے ماخوذ ہے۔ اس میں ایک مقدمہ ہے جس میں اردو زبان کی وجہ تسمیہ ریختہ اور اس کی قسمیں، دہلوی، گوجری، دکنی، ہندستانی اور ہندی و ہندوی کی وضاحت ہے۔ اس کے علاوہ دوسری سرخیوں میں اردو کا آغاز، پنجاب، پنجابی اور اردو، قدیم اردو پر پنجاب کا اثر اور پنجاب میں اردو پر سیر حاصل بحث کی گئی ہے۔

سرگذشت الفاظ

یہ کتاب مولانا آزاد کے شاگرد احمد دین نے ۱۹۲۳ء میں لکھی ہے، جس کو موصوف نے پادری ٹرینچ کی کتاب 'مطالعۂ الفاظ' کے اساس پر انگریزی، فرانسیسی اور لاطینی الفاظ کی بجائے اردو، ہندی، فارسی اور عربی الفاظ کو منتخب کر کے اس طرح لسانیات کے ایک شعبہ وتشکیلیات یا لفظیات میں ایک اور کتاب کا اضافہ کیا ہے۔ یہ کتاب اپنی نوعیت کے لحاظ سے اردو میں پہلی کتاب ہے۔ جو افتتاحیہ کو ملا کر سات ابواب پر مشتمل ہے۔ اس میں زبان سے متعلق الفاظ کا مطالعہ مختلف نوعیت، نازک خیالی، اخلاقیات، تاریخ، نئے الفاظ، مترادفات اور تعلیمیات کے نقطۂ نظر سے ہوتا ہے اور اس میں مذکور بالا اقسام کا وافر ذخیرہ فراہم کر کے ہر ایک کی وجہ تسمیہ، تاریخ اور تشریح بیان کی گئی ہے۔ مطالعہ کرنے والوں کے لیے معلومات اور دلچسپی کا سامان بھی موجود ہے۔

آریائی زبانیں

یہ کتاب پروفیسر سدیشور ورما استاد سنسکرت اور لسانیات نے لکھی ہے، اس میں ایک تمہید اور تین سرخیاں ہیں۔ تمہید میں ہندوی زبان (اردو ہندی کا ماخذ و ارتقا) ہندوی اور مسلمان، اردو کا آغاز، ہندی و اردو نثر کا آغاز، عہد حاضر کی معیاری ہندوی (ہندی، اردو، ہندستانی) پہلی سرخی آریائی زبانیں ہے، جس میں آریائی زبانوں کا ماخذ و ارتقا، قدیم آریائی زبان کی تشکیل کیا تھی؟ ہند آریائی اور ایرانی کی باہمی مشابہت، قدیم ہند آریائی اور قدیم ایرانی میں اختلافات، دوسری سرخی ہند آریائی زبانیں ہیں، جس میں ہند آریائی کی خصوصیتیں، ہند آریائی کا ارتقا، عہد حاضر کی ہند آریائی کی گروہ بندی اور تیسری سرخی ایرانی زبانیں ہے، جس میں ایرانی زبان کی خصوصیتیں، ایرانی زبان کا ارتقا، اوستا اور قدیم فارسی کا مقابلہ، قدیم فارسی اور سنسکرت کی باہمی مشابہت، وسطی فارسی یا پہلوی، وسطی فارسی کی بولیاں، عہد حاضر کی ایرانی زبانوں کی گروہ بندی اور آریائی زبان کا ارتقا شامل ہیں۔ اس کتاب میں آریائی زبانوں کے

ہئیت، ہند آریائی اور ایرانی زبانوں اور ان کی خصوصیات کا ذکر وضاحت کے ساتھ کیا گیا ہے۔ یہ اپنے موضوع پر مفید کتاب ہے۔

ہندستانی لسانیات کا خاکہ

یہ اصل میں ماہر ہندوستانی لسانیات جان بیمز کی انگریزی کتاب (AN OUT LINE OF INDIAN PHILOLOGY) کا اردو ترجمہ ہے جس کو پروفیسر سید احتشام حسین نے پہلی مرتبہ ۱۹۴۸ء میں مختصر حواشی کے اضافے کے ساتھ عام فہم اور دلچسپ پیرایہ میں لکھ کر شائع کیا ہے۔ اس کا دوسرا ایڈیشن ۱۹۵۱ء میں ضروری رد و بدل اور مزید معلومات کے ساتھ طبع ہوا۔ اس کتاب میں چھ ابواب اور ایک ضمیمہ ہے، جس میں زبانوں کی گروہ بندی، ہندستانی زبانوں کی تقسیم، ارتقائے لسان کے مدارج، زبانوں کی خاندانی خصوصیتیں، بولیاں، نئی بولیوں کے مطالعہ اور قلم بند کرنے کے متعلق ہدایات درج ہیں اور ضمیمے میں ہندستان کی لسانی تقسیم کا خاکہ دیا گیا ہے۔ یہ کتاب ہندوستانی زبانوں سے متعلق معلومات آفریں ہے۔

مقدمہ تاریخ زبان اردو

یہ پروفیسر مسعود حسین صدر شعبۂ اردو جامعہ عثمانیہ کے ڈاکٹریٹ کا مقالہ ہے اس میں چار ابواب ہیں۔ پہلا باب۔ ہندوستان کی آریائی زبانوں کی مختصر تاریخ (۱) آریوں کا وطن اور داخلۂ ہندوستان (۲) آریائی زبان کا عہد قدیم ـــــ پہلی پراکرت، ویدی زبان (۳) آریائی زبان کا دور وسطی ـــــ دوسری پراکرت (۴) آریائی زبان کا تیسرا دور ـــــ اپ بھرنش. دوسرا باب۔ ہندوستان کی موجودہ آریائی زبانیں ـــــ (۱) تقسیم و گروہ بندی (۲) ہر زبان کے مختصر حالات (۳) مغربی ہندی اور اس کی بولیاں۔ تیسرا باب۔ شمالی ہند میں اردو (ہندوستانی) کا عہد بہ عہد ارتقا (الف) راجپوتوں کے عہد سے ابتدائی سلاطین دہلی کے عہد تک (ب) سلاطین دہلی کے عہد سے اورنگ زیب کے عہد تک۔ چوتھا باب (۱) تقابلی مطالعہ ـــــ پنجابی، برج بھاشا، ہریانی اور دکنی (الف) اردو برج بھاشا سے نہیں نکلی (آزاد کے لسانیاتی نظریہ کی تنقید) (ب) پنجابی، اردو اور دکنی (پروفیسر شیرانی کے لسانیاتی نظریہ کی تنقید) (ج) دکنی صرف و نحو کی بعض خصوصیات کی توجیہ نواح دہلی کی بولیوں سے داخل ہیں۔ اس کتاب میں زبان کی تاریخ اور لسانیاتی نظریوں پر تنقید ہے۔ آزاد اور شیرانی کے نظریہ زبان کا ابطال کیا گیا ہے۔ اور مصنف نے ثابت کیا ہے کہ اردو کا ماخذ ہریانی ہے نہ کہ پنجابی۔

زبان اور علم زبان

یہ کتاب پروفیسر عبدالقادر سروری نے علمائے لسانیات کے لکچروں سے استفادہ کر کے اردو زبان میں مرتب کی ہے، جو لسانیاتی نظر سے خالص علمی کتاب ہے۔ یہ کتاب ایک دیباچہ اور (۱۰) ابواب پر مشتمل ہے، جس میں زبان اور اس کی ماہئیت، زبان کا آغاز، علم زبان، زبان کا ارتقا، علم زبان کی شاخیں، صوتیات، صوتی تبدیلی، صوت تجزیہ تشکیلیات، معنیات، تاریخی طریقہ، مماثلت اور دوسرے عوامل، زبانوں کی تقسیم، دنیا کی زبانیں، ہندوستان کی زبانیں، علم زبان کی تاریخ اور اس کا آغاز اور ارتقا پر علمی طور پر بحث شامل ہیں۔ اردو زبان میں اپنے موضوع کے لحاظ سے ہندوستانی لسانیات کے بعد یہ دوسری کتاب ہے، جس میں بعض جدید ابواب کا اضافہ کیا گیا ہے۔

اب جب کہ ہماری جامعات میں شعبۂ اردو میں عام لسانیات کو بھی علیحدہ مضمون کے طور پر نصاب میں داخل کیا گیا ہے، تو ایسی حالت میں اس کتاب سے ضرور فائدہ پہنچ سکتا ہے، لیکن یہ اپنے غیر دلچسپ انداز بیان کی وجہ سے طلبا اور اساتذہ میں مقبول نہ ہو سکی۔

اردو زبان کا ارتقا

یہ کتاب ڈاکٹر شوکت سبزواری نے لکھی ہے، جس میں تمہیدی حصہ تین بابوں پر اور تحقیقی حصہ پانچ بابوں پر مشتمل ہے۔ تمہیدی حصے میں زبانوں کے خاندان اور ان کے نظریے، ہند و پاکستان کی قدیم

وجدید زبانیں، ہندوپاک کی زبانوں کے رشتے اور اردو زبان کا ماخذ اور تحقیقی حصے میں صوتی تبدیلیاں، اخذو اشتقاق، ا
دوہ افعال و مشتقات کو تفصیل سے بیان کیا گیا ہے اور مصنف نے ثابت کیا ہے کہ اردو کا ماخذ پالی ہے۔

اردو زبان کے ماخذ کے بارے میں اب تک چار نظریے پیدا ہو گئے، جن سے اس کے صحیح مبدے کی نسب
ہو سکتا، اس لئے ڈاکٹر زور مرحوم کا مشورہ تھا کہ ان چاروں نظریوں کو پیش نظر رکھ کر ایک ایسی جامع تنقیدی کتا
اردو کا اصل مبدا دریافت ہو اور وہ قولِ فیصل کا حکم رکھے۔

ڈاکٹر زور کا لسانیاتی کارنامہ

یہ بات مشہور ہے کہ دکن کی سرزمین ہیروں کی زمین ہے، چنانچہ
اپنی آب و تاب کی بدولت ساری دنیا میں ہندوستان کا نام روشن
نے ڈاکٹر زور جیسا ہیرا بہت پیدا کیا، جو اپنی علمی، ثقافتی، ادبی اور تحقیقی خدمات کے سبب سارے برصغیر یعنی ہندوپاک
میدان ہائے علم کے اس مجاہد کے مذکورۂ بالا کارناموں کے قطع نظر صرف لسانیات میں اس نے جو خدمات ادا کی ہے
ہیں۔ ڈاکٹر زور ۱۹۲۲ء میں اعلیٰ تعلیم کے لئے لندن گئے اور ۱۹۲۳ء میں باقاعدہ لندن یونیورسٹی کے سکول آ
آریائی زبانوں کی لسانیاتی تعلیم پروفیسر آر ایل ٹرنر سے اور صوتیات کی تعلیم پروفیسر اے لائیڈ جیمس سے حاصل
انگریزی صوتیات ڈینیل جونس، مس ای لیاس اور ای، آرم سٹرانگ پروفیسروں سے سیکھی۔ ۱۹۳۰ء میں تجرباتی ص
لے انسٹی ٹیوٹ دی فونیٹک میں انجام دیا۔ اسی زمانے میں ہند آریائی لسانیات اور خاص کر پہلوی اور جپسی زبانوں
پیرس کے ادارہ صوتیات میں لیا۔ گجراتی زبان پر ایک مقالہ پروفیسر جے بلوک کی نگرانی میں لکھا۔ لسانیاتی تعلیم کے حص
وطن لوٹے اور جامعہ عثمانیہ میں پروفیسر ہوئے۔ موصوف کی لسانیاتی خدمات کا اپنے اہل علم میں بڑا شہرہ ہے چنانچہ آپ
لکھیں، جو ارباب علم زبان کے نزدیک مستند سمجھی جاتی ہیں۔ اِن کا ذکر نیچے کیا جاتا ہے۔

(۱) ہندوستانی صوتیات۔ یہ کتاب (انگریزی) میں ہے۔ اس کی تیاری بزمانۂ قیام لندن ۱۹۲۲ء سے شر
میں بمقام پیرس اس کی تکمیل و اشاعت عمل میں آئی۔ یہ دکنی صوتیات پر اپنی نوعیت کی پہلی کتاب ہے۔ یہ کتاب
دکنی صوتیات کی رہنمائی حاصل ہوتی ہے۔ اکثر انگریزی اور ہندی کے مصنفین اس سے حوالہ اور استناد پیش کرتے ہی
ڈاکٹر جیوفس بلوک پروفیسر ہند آریائی لسانیات اور ناظم ادارہ تحقیقات عالیہ پیرس کا تعارف اور خود مصنف کا دیبا
چار فصلیں ہیں۔ پہلی میں تمہید (ا) تاریخی ارتقا (ب) شمالی اور جنوبی روپوں میں اختلافات۔ دوسری میں آوازیں
مصوتے اور مرکب مصوتے (DIPHTHONGS) (ب) غنہ دار حروف یا حروف انفیہ۔ تیسری
یا مصمتے (ب) ایقاع اور چوتھی میں آوازوں کی خصوصیتیں (ا) زور (STRESS) (ب) ایقاع سر لہجے (
تمہید میں ارتقائی تاریخ کے ضمن میں اردو کی ابتدا سے متعلق تین نظریے پیش کئے گئے ہیں۔ پہلا اردو دکن میں پیدا
آغاز سندھ میں ہوا۔ تیسرا، اردو پنجابی سے نکلی۔ پہلے دو نظریوں پر تبصرہ کر کے ان کو ناقابل لحاظ ٹھیرا
غور اور ترمیم طلب قرار دیا۔ اور بیان کیا کہ اردو کی بنیاد مسلمانوں کی فتح دہلی سے بہت پہلے پڑ چکی تھی ا
روپوں کے اختلافات کے بارے میں بتلایا گیا کہ ہندوستانی کا ارتقا پنجاب سے شروع ہوا اور اس کی تکمیل
ہوئی۔ سیاسی اسباب کی بنا پر تین شاخوں میں منقسم ہو کر صدیوں تک اپنے ارتقائی منازل طے کرتی رہی آ

منی سلطنت کا قیام ہوا تو دکن شمال سے بالکل الگ ہوگیا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ہندستانی کے دو روپ ہوگئے ایک شمالی اور دوسرا جنوبی
ہندستانی پر فارسی کے اثرات مرتسم ہو گئے اور دکھنی پر دراوڑی عناصر کا اضافہ ہوا۔ اس طرح ان دونوں میں جو اختلافات پیدا ہوگئے
تفصیل سے بیان کیا گیا ہے۔ مصوتے، مرکب مصوتے اور حروف انفیہ کے باب میں مصوتے کا ایک چارٹ دیا گیا ہے۔ اس کے علاوہ
ؤں اور مرکب مصوتوں کا ایک تفصیلی نقشہ بھی ہے، جن میں اردو اعرابوں کی علامتوں کے ساتھ بین قومی علامتیں، لاتینی املا کیا
اور معانی درج ہیں۔ بعد میں مصوتوں اور مرکب مصوتوں کی آوازوں کی تشریح مثالوں اور اشکال سے کی گئی ہے۔ حروف انفیہ
وئی عمل کو مثالوں کے ذریعے اور صوتی گردونے سے ظاہر کیا گیا ہے۔ مصمتے اور ایقاع۔ اس میں اردو مصمتے کا نقشہ مخارج کے لحاظ
دیا گیا ہے اور مصمتوں کی آوازوں کو مثالوں اور اشکال کے ذریعے ظاہر کیا گیا اور صوتی گردوتوں سے بھی آوازوں کے نتیجوں کو واضح
گیا ہے۔ لسانیاتی اصطلاح میں ایقاع سے مراد ایک صوتیہ (دن) کو دوسرے صوتیے کی لے میں ادا کرنا ہے۔ ایقاع سے متعلق چند اصول مقرر ہیں
ل: مکان کے لحاظ سے زبانوں اور ان کے لفظوں کے تلفظ میں صوتی تبدیلی واقع ہوتی ہے۔ اس کو زبان کا فطری ارتقا کہتے ہیں۔ اسی کے
ت تحت اردو دکنی میں صوتی تبدیلی پیدا ہوئی ہے۔ چنانچہ لفظ "ٹاٹ" جس کے شروع میں اور درمیاں میں "ٹ" آیا ہے وہ دکنی میں
ٹ ہوجاتا ہے۔ گویا ابتدائی حروف بدل گیا ہے۔ اسی طرح اکبر کا "ک" اور اخبار کا "خ"، ترتیب وار "گ" اور "غ" کے قریب قریب دکنی
بولا جاتا ہے۔ آوازوں کی خصوصیات (الف) زور (ب) ایقاع: دوران گفتگو میں جب کبھی کوئی لفظ یا اس کا رکن اہم سمجھا
جاتا ہے، تو اس پر خاص زور دے کر کہا جاتا ہے۔ اس کو انگریزی میں (STRESS) کہتے ہیں (الف) میں زور کا عمل دو رکنی اور
رکنی اور زیادہ سے رکنی لفظوں کے ساتھ کب کرنا چاہیئے۔ ان کو مثالوں کے ذریعے بیان کیا گیا ہے۔ (ب) میں صوتیوں کے تلفظ اور
لیں جو اتار چڑھاؤ ہوتا ہے۔ ان کی مثالوں کو توضیحی اشکال سے ظاہر کیا گیا ہے۔

(۲) ہندستانی لسانیات۔ یہ کتاب اردو میں اپنے موضوع کی پہلی کتاب ہے، جو کالج کے طلبا کو جدید علم یعنی لسانیات سے واقف
لئے اور اردو کی خدمت کی خاطر لکھی گئی ہے۔ اس میں دیباچہ از ڈاکٹر عبدالستار صدیقی اور تمہید از خود کے علاوہ حصہ اول میں
) لسانیات۔ مقاصد، فوائد اور تاریخ (۲) زبان ــــ ماہیت، آغاز اور تشکیل (۳) فطری ارتقا ــــ صوتی تغیر و تبدل، ادغامی اثر
مادی تشکیل۔ عوام کا حصہ، عالموں کا اثر اور وضع اصطلاحات (۵) دنیا کی زبانیں ــــ طریقۂ تقسیم، مختلف خاندان، ہند
یورپی اور ہند ایرانی (۶) ہند آریائی ارتقا ــــ ہند آریائی ادوار، آریاؤں کا ورود، گریرسن کا نظریہ (۷) جدید
ہند آریائی زبانیں۔ شمالی مغربی، جنوب مغربی، وسطی، مشرقی اور جنوبی (۸) ہند کی غیر آریائی زبانیں۔ دردستانی، اوستکی،
منڈا، کول، دراوڑی۔ حصہ دوم میں (۱) ہندوستانی کا آغاز۔ مواد، مختلف نظریے اور جدید تحقیقات (۲) ہندستانی
کا ارتقا ــــ مرکزی تفریق، اختلافات کے اسباب (۳) ادبی بولیاں ــــ گجراتی، دکنی، شمالی (۴) ہندستانی کی ہمہ گیری۔ فتح دکن
ظہر، لکھنؤ کی خدمات (۵) عہد حاضر ــــ اردو، ہندی کا جھگڑا، اسباب، تاریخ اور اردو کی ضرورتیں۔ حصہ سوم میں (۱)
دستان کی زبانیں (۲) اردو زبان کا پھیلاؤ۔ دو نقشے درج ہیں۔

ہمارے علما اردو زبان کے آغاز، ارتقا اور ساخت سے بالکل ناواقف ہیں۔ اس کا تعلق لسانیات سے ہے یا کلاسیکی علم سے بے بہرہ
ہونے کے باعث اب تک اردو زبان کا صحیح ماخذ تحقیق نہ ہوسکا۔ لہذا اس مفید اور کارآمد علم کے حصول کے لئے ارباب اردو، تعلیم یافتہ
طبقہ کو ترغیب و تشویق دلائیں اور لسانیات کے ماہرین سے اردو زبان میں عام فہم اور دلچسپ کتابیں لکھوا کر شائع کریں تاکہ اردو والے

اُن سے مستفید ہو سکیں۔

آج کل تعلیم یافتہ اس علم کی طرف مائل ہو رہے ہیں۔ نیز یونیورسٹی کی اعلیٰ تعلیم کے نصاب میں اس مضمون کی سبب لوگوں میں اس کی اہمیت بڑھ گئی ہے۔ حکومت بھی مختلف زبانوں کے طلبا توں میں لسانیات کو مقبول بنانے کے لیے میقاتی کورسوں کے ذریعے اس کا پرچار کر رہی ہے۔ چنانچہ اب کی دفعہ حیدرآباد میں مرکزی یونیورسٹی کی جانب سے جامعہ عثمانیہ کے اندر گرمائی سکول آف لینگوسٹک قائم کیا گیا۔ جس میں حیدرآباد کے علاوہ ہندستان کے طلبا نیز بڑی تعداد میں شریک ہو کر اس سے استفادہ کریں گے۔

ہندستانی لسانیات ایک مختصر اور مفید کتاب ہے، جس میں اہم لسانی مسائل کو سلیس اور دلچسپ پیرائے میں آج سے تیس بتیس سال پہلے اردو زبان میں اس موضوع پر کوئی کتاب موجود نہ تھی، اس وقت یہی کتاب پیاروں کا کام دے رہی تھی۔ اب جب کہ اس علم کی اشاعت و ترویج سے اس کا دائرہ وسیع ہو گیا ہے۔ ایسی صورت میں اس مختصر آج کے لسانیات جاننے والوں کی سیری نہیں ہو سکتی۔ لہٰذا اس فن میں ایک جامع کتاب کی ضرورت ہے۔ ہمارے لسانیات کی طرف خاص توجہ کرکے جس کی شدید ضرورت محسوس کی جا رہی ہے۔ ملک کے حالات اور اردو کی ضرورت کے لحاظ جدید کتابوں کی طباعت و اشاعت کا اہتمام کریں تو ہماری زبان کی بڑی خدمت ہوگی۔

ایک عرصے تک عربی فارسی کے علماء اس مغالطے میں مبتلا تھے کہ کسی زبان کے الفاظ اور ان کے لغات کے مباحث علم اللسان ہیں، حالانکہ یہ علم زبان کی دو مختلف شقیں ہیں، جو الگ الگ لفظیات یا تشکیلیات اور معنیات کہلاتے ہیں حضرات کو آج سے بتیس سال پہلے محض ہندستانی لسانیات کی بدولت اس کا صحیح علم ہوا اور یہی کتاب نئے علم کی غرض اس کتاب کی اشاعت سے علم ... ان کی نسبت پہلے ہی سے علمائے مشرق میں جو غلط فہمی موجود تھی، وہ دور زبان میں ایک نئے علم کا اضافہ ہوا۔ اسی بنا پر ڈاکٹر زور پہلا محسن اردو ہے، جس نے لسانیات جیسے جدید علم سے گیا۔ اور اپنے یورپ کی حاصل کردہ لسانیات اور اس کے تجربات کو کتابی شکل میں پیش کرکے کم مایہ زبانِ اردو کو مالا مال یہ ایسا شان دار کارنامہ ہے، جو تاریخ اردو ادب میں یادگار رہے گا۔

ڈاکٹر زور کی موت دنیائے اردو ادب کے لئے ایک بہت بڑا سانحہ ہے۔ مدتوں اس نقصانِ عظیم کی تلافی انھوں نے اپنی زندگی میں اردو کے استحکام و بقا کے لئے اتنے کام کئے ہیں کہ ان کا نام امٹ ہو گیا ہے۔ ڈاکٹر زور کی بے وقت وفات ہوتا ہے کہ قصر اردو کا ایک زبردست ستون گر گیا۔ مرحوم نے اردو زبان کی ترقی و بقا کے لئے جو کارنامے انجام دیئے ہیں ان کی وجہ سے ان محسنوں کی فہرست میں کیا جائے گا۔ حیدرآباد دکن میں ایوانِ اردو کی شاندار عمارت اور ایک زبردست کتب خانہ کا یادگاریں ہیں۔ مرحوم رفاعی خاندان سے تعلق رکھتے تھے اور طلباء میں اور پبلک میں اور حکام میں یکساں طور پر ہر دل عزیز تنابوں کے مصنف تھے۔ اپنی سرگرمیوں کی وجہ سے وہ اکیلے ایک ادارے کی حیثیت رکھتے تھے۔ ان کا انتقال سری نگر میں جہاں صدر کی حیثیت سے کام کر رہے تھے، حرکتِ قلب بند ہونے سے ہوا۔ خدا انھیں اپنی آغوشِ رحمت میں جگہ دے۔

(ماہنامہ کتابی دنیا کراچی۔ اکتوبر

ڈاکٹر خلیق انجم

زور ـ ایک ماہر لسانیات

دکن کو بجا طور پر یہ فخر حاصل ہے کہ اردو نظم و نثر دونوں کی باقاعدہ ابتدا اس کی سرزمین سے ہوئی۔ یہ بھی عجیب اتفاق ہے کہ اردو کا سب سے پہلا ماہر لسانیات بھی خاک دکن سے اٹھا۔ زور صاحب کی تحقیق سے قبل اردو کے آغاز و ارتقا کے بارے میں عجیب عجیب مضحکہ خیز خیالات تھے۔ بعض لوگوں کا خیال تھا کہ اردو نے فارسی کی کوکھ سے جنم لیا ہے۔ مولانا محمد حسین آزاد نے بڑے وثوق کے ساتھ آب حیات میں لکھا تھا کہ اتنی بات ہر شخص جانتا ہے کہ ہماری زبان برج بھاشا سے نکلی۔ اور برج بھاشا خالص ہندوستانی زبان ہے۔ لیکن وہ ایسی زبان نہیں کہ دنیا کے پردے پر ہندوستان کے ساتھ ہی آئی ہو۔ اس کی عمر آٹھ سو برس سے زیادہ نہیں ہے۔ اس سے زیادہ عجیب خیالات کا اظہار ایک صاحب نظر ادیب اور دیدہ ور نقاد مولانا سلیمان ندوی نے ان الفاظ میں کیا تھا۔ " یہ مخلوط زبان سندھ، گجرات، اودھ، دکن، پنجاب اور بنگال ہر جگہ کی صوبہ وار زبانوں سے مل کر ہر صوبہ میں الگ الگ پیدا ہوئی "[1]

ہندوستانی پر بعض یورپین ماہرین لسانیات نے بھی کام کیا ہے مگر ان میں سے کسی کی توجہ ہندوستانی اور پنجابی کے باہمی تعلق پر نہیں گئی۔ یہ شرف ایک ہندوستانی ہی کی قسمت میں لکھا تھا۔ ڈاکٹر زور نے " ہندوستانی لسانیات" پر ایک مقالہ لکھا جس میں یہ ثابت کیا کہ جس زمانے میں اردو پنجاب میں پیدا ہوئی اس وقت پنجاب اور دوآبہ گنگ و جمن کی زبان میں بہت کم فرق پایا جاتا ہے۔ برج بھاشا، کھڑی بولی اور جدید پنجابی زبانیں بعد کو عالم وجود میں آئیں۔ شوکت سبزواری صاحب نے " اردو زبان کا ارتقا" میں لکھا ہے کہ مولانا شیرانی مرحوم (حافظ محمود شیرانی مولف " پنجاب میں اردو") کا اردو داں طبقہ کو شکر گزار ہونا چاہیے کہ انہوں نے غالباً اردو میں سب سے پہلے اردو کے چہرے سے نقاب اٹھا کر اس کے خط و خال کا گہرا حکیمانہ مطالعہ کیا۔ اور پنجابی، سریانی، برج بھاشا سے اس کا مقابلہ کر کے اردو داں طبقہ کو تقابلی لسانیات کی ہلکی سی جھلک دکھائی۔ زور صاحب مرحوم ۱۹۲۷ء میں لندن یونیورسٹی میں ہندوستانی لسانیات پر مقالہ لکھ رہے تھے تو تقریباً انھیں نتائج پر پہنچے تھے۔ شیرانی صاحب کی کتاب پہلی بار ۱۹۲۸ء میں شائع ہوئی ہے۔ یہ دونوں تقریباً ایک ہی قسم کے نتائج پر پہنچے تھے۔ زور صاحب کے الفاظ میں فرق صرف اتنا تھا کہ میں نے یہ واضح کیا کہ جس زمانے میں اردو پنجاب میں بنی اس وقت پنجاب اور دوآبہ گنگ و جمن کی زبان میں بہت کم فرق پایا جاتا

---

[1] مولانا مرحوم نے جب " نقوش سلیمانی" میں اردو کے آغاز کے بارے میں ان خیالات کا اظہار کیا، تو حافظ محمود شیرانی کی " پنجاب میں اردو" اور زور صاحب کی " ہندوستانی لسانیات" شائع ہو چکی تھیں۔

تھا۔[1] اس مختصر سی بحث سے میں صرف یہ ثابت کرنا چاہتا ہوں کہ زور صاحب اور شیرانی صاحب ایک دوسرے سے ہزاروں میل دور اور ایک دوسرے کی تحقیق سے بالکل بے خبر تقریباً ایک ہی نتیجے پر پہنچے تھے۔ اس لئے اس تحقیق کا سہرا ان دونوں کے سر بندھنا چاہیے۔

زور صاحب کی "ہندوستانی لسانیات" اردو لسانیات پر پہلی کتاب ہے۔ جو کسی ہندوستانی نے لکھی۔ اور جس میں لسانیات کے جدید ترین اصولوں کی روشنی میں اردو زبان کا جائزہ لیا گیا۔ اس کتاب کے سلسلے میں زور صاحب تین سال تک لندن اور پیرس کی درس گاہوں میں مصروف رہے۔ یہ اُن کی خوش نصیبی تھی کہ انھیں بین الاقوامی شہرت رکھنے والے ماہرینِ لسانیات کی سرپرستی نصیب ہوی۔ اسکول آف اورئنٹیل اسٹڈیز لندن کے پروفیسر آر۔ ال۔ ٹرنر اور ہندوستانی زبان کے ماہر ڈاکٹر گراہم بیلی نے زور صاحب کی بہت مدد کی۔ اور بہت قیمتی مشورے دئیے۔ سوربون یونیورسٹی پیرس کے مدموزیل دیان اور کالج دے فرانس کے پروفیسر شرامک نے تجرباتی صوتیات میں ان کی رہنمائی کی۔ ڈاکٹر جیولز بلاک کی رہنمائی میں زور صاحب نے اردو کی گجراتی شکل پر ڈی لٹ کے لئے کام کرنا شروع کیا تھا۔ مگر وہ مکمل نہیں ہوسکا۔

ہندوستانی لسانیات میں زور صاحب نے علم لسانیات کے مقاصد و فوائد اور اس کی تاریخ پر روشنی ڈال کر یہ بتایا ہے زبان کی ماہیت کیا ہے۔ کسی زبان کا آغاز کس طرح ہوتا ہے۔ اور کن کن ارتقائی منزلوں سے گزرتی ہے۔ الفاظ کی ساخت اور تشکیل کس طرح ہوتی ہے۔ زبان سے متعلق عام معلومات فراہم کرنے کے بعد زور صاحب نے دنیا کی زبانیں اور ان کے مختلف خاندان بیان کئے ہیں اور پھر ہند ایرانی خاندان اور اس کی مختلف زبانوں پر روشنی ڈالی ہے۔ یہاں تک کتاب کا پہلا حصہ ہے۔ دوسرے حصے میں انھوں نے ہندوستانی کے آغاز سے متعلق مختلف نظریات پیش کرکے یہ ثابت کیا ہے کہ اردو اس زبان پر مبنی ہے جو پنجاب میں بارھویں صدی عیسوی میں بولی جاتی تھی۔ مگر اس سے تو یہ ثابت نہیں ہوتا کہ وہ اس زبان پر مبنی نہیں ہے جو اس وقت دہلی کے اطراف اور دوآبہ گنگ و جمن میں بولی جاتی تھی۔ کیونکہ ہند آریائی دور کے آغاز کے وقت پنجاب اور دہلی کے نواح کی زبانوں میں بہت کم فرق تھا۔ اُن کے اس وقت کے اختلافات ظاہر کرنے والی بہت کم خصوصیتوں کا اس وقت تک پتا چلا ہے۔ یہ واقعہ دراصل بارھویں صدی عیسوی کے بعد کا ہے کہ موجودہ زبانوں نے ان اختلافات کی پرورش شروع کی جو آج انھیں ایک دوسرے سے جدا ظاہر کرتے ہیں۔[2] اس کتاب

---

[1] اردو کے معلی۔ لسانیات نمبر صفحہ ۵۰۹۔

[2] ڈاکٹر مسعود حسین خاں نے مقدمہ تاریخ زبان اردو میں یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ اردو کی بنیاد "ہریانی" پر ہے۔ اُن کے دلائل قابل قبول نہیں ہیں۔ اور بقول زور صاحب:

"اس کتاب میں مسعود صاحب سے ایک اہم فروگزاشت یہ ہوی کہ انھوں نے موجودہ پنجابی اور موجودہ ہریانی کا مقابلہ قدیم دکنی سے کرکے نتائج اخذ کئے ہیں حالانکہ دکنی اردو نے جس وقت پنجاب میں نشو و نما حاصل کیا اس وقت ہریانی اور کھڑی تو کجا خود برج بھاشا بھی ایک جداگانہ زبان کی حیثیت سے عالم وجود میں نہیں آئی تھی۔" (اردوئے معلی لسانیات نمبر صفحہ ۷۹)

آخری باب میں زور صاحب نے اردو اور ہندی کے تنازع کا لسانی جائزہ لیا ہے۔ اور یہ خیال پیش کیا ہے کہ اردو اور ہندی کے جھگڑے کی تمام تر ذمہ داریاں انگریزوں پر ہیں۔ جنہوں نے فورٹ ولیم کالج میں ہندو منشیوں کو سمجھایا کہ فارسی رسم خط بدیسی ہے اس کا سرزمین ہندوستان سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ اور ان منشیوں سے ہندو مسلمانوں کی عام مشترکہ زبان کو ہندی رسم خط میں لکھوانا شروع کیا۔ انگریزوں کی ان ناپاک کوششوں نے بہت جلد مذہبی رنگ اختیار کیا۔ مسلمان ہندوستانی کو فارسی رسم خط میں لکھتے اور اس میں عربی فارسی کے الفاظ اور ترکیبوں کا زیادہ سے زیادہ استعمال کرتے۔ اس کے برعکس ہندو دیوناگری رسم خط میں لکھتے اور سنسکرت کے الفاظ کا استعمال ہوتا۔

اس سلسلے میں زور صاحب کی دوسری کتاب "ہندوستانی صوتیات" ہے۔ یہ انگریزی میں لکھی گئی ہے۔ اور ہندوستانی لسانیات سے دو سال قبل پیرس سے شائع ہوئی ہے۔ اس کتاب میں اس زبان کا صوتیاتی جائزہ لیا گیا ہے۔ جو بقول مصنف حیدرآباد دکن کے پڑھے لکھے لوگ بولتے ہیں۔ اردو زبان پر یہ سب سے پہلی کتاب ہے جس میں جدید تحقیق اور سائنٹفک ٹیکنک کے مطابق اردو کے مصوتوں اور مصمتوں کا جائزہ لیا گیا ہے۔ ایک ماہر لسانیات ڈاکٹر جیول بلاک نے اس کتاب کا تعارف لکھا ہے۔ وہ زور صاحب کی لسانی خدمات کا اعتراف ان الفاظ میں کرتے ہیں:—

"ابھی تک ایسی کتابوں کی تعداد بہت کم ہے۔ جن میں ہندوستانی زبانوں کا صوتیاتی جائزہ لیا گیا ہو۔ اُن کی تعداد کو بڑھانے کے لئے ڈاکٹر قادری (زور صاحب مرحوم) کو ایک غیر مطبوعہ کتاب کا حوالہ دینا پڑا۔ ہندوستان کی زبانوں میں "ہندوستانی" کا تمام دنیا میں مطالعہ ہوتا رہا ہے۔ خاص طور پر یہ بات عجیب ہے کہ اس زبان کا بھی کوئی اس قسم کا جائزہ لیا گیا۔ اکثر و بیشتر تلفظ کے مسائل پر بڑی قابلیت کے ساتھ اشارے کئے گئے ہیں۔ لیکن اس موضوع پر مجموعی حیثیت سے کام نہیں کیا گیا اور یہی وہ کام ہے جس کی لسانیات کے مطالعہ اور عملی مقاصد کے لئے ضرورت ہے۔ یہ امر قابل تحسین ہے کہ اس سلسلے میں سب سے پہلا قدم ایک ہندوستانی اسکالر نے اٹھایا ہے۔"

(انگریزی سے ترجمہ)

زور صاحب نے علم لسانیات کو جہاں تک پہنچایا تھا افسوس ہے کہ اُس میں بہت کم اضافہ ہو سکا ہے۔ ہندی میں لسانیات پر بہت کام ہو رہا ہے، مگر اردو والے اس طرف بہت کم توجہ دے رہے ہیں۔

رشید الدین

ڈاکٹر زور کے تین لافانی کام

میر نے کہا ہے ؎

مت سہل ہمیں جانو پھرتا ہے فلک برسوں — تب خاک کے پردے سے انسان نکلتے ہیں

ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور مرحوم بھی ایک ایسے ہی انسان تھے ان کی ذات پر ان کا ملک وقوم اور زبا بجا طور پر فخر کر سکتے ہیں۔ دنیا میں ہر روز کئی آدمی پیدا ہوتے ہیں اور کئی مرتے ہیں۔ مگر ان میں بہت ہی کم ایسے جن کی پیدائش کے ساتھ ہی کسی قوم یا خطے کی قسمت چمک اٹھتی ہے یا جن کی کمی ان کے مرنے کے بعد بھی بری طرح ہے۔ ایسے لوگ اپنے پیچھے آنے والی نسلوں کے لئے ایک گنج گراں مایہ چھوڑ جاتے ہیں۔ ڈاکٹر زور نے بھی ہمارے اور ہمار نسلوں کے لئے اردو زبان وادب میں ایسا ہی گراں قدر سرمایہ چھوڑا ہے۔ وہ عام انسانوں کی طرح زمین پر بوجھ بن اپنا اور اپنے متعلقین کا پیٹ بھرنا' تن ڈھانکنا اور چار پیسے جمع کرنا ہی ان کا مقصد زندگی نہ رہا۔ بلکہ اپنی ز کی خدمت اور اپنی تہذیب وتمدن کی ترقی ان کا شعار تھا۔ انھوں نے اپنے سے پہلے کے ہم زبان وہم ادب لوگا حاصل کیا اس میں بہت کچھ اضافہ کیا اور آنے والی نسلوں کو یہ ورثہ سونپ کر چپ چاپ اور اچانک وادیِ کہ نیند سو گئے۔ اور اب تو اس بات کو بھی ایک سال کا عرصہ ہو گیا ہے۔

اردو زبان وادب کی ساری تاریخ میں ہمیں مولوی عبدالحق (بابائے اردو) کے بعد ڈاکٹر زور ہی ایسے ا آتے ہیں جنھوں نے تن من دھن سے اردو کی خدمت کی۔ مولوی عبدالحق کی طرح انھیں بھی اردو سے ایک عشق یہاں ڈاکٹر زور کی اہمیت کچھ اس لئے بھی بڑھ جاتی ہے یا ہمارے نزدیک زیادہ قابل تحسین ہو جاتی ہے کہ وہ پہ تھے جنھوں نے زبان وادب کی ان گتھیوں کو سلجھایا ہے ورنہ عام طور پر اس زمانے میں یو۔ پی کے لوگ ہی اہل ز علم وادب و مستند اور دکنی اجڈ و گنوار سمجھے جاتے تھے جنھیں علم وادب اور زبان وتہذیب سے کوئی علاقہ میں پروفیسر عبدالقادر سروری۔ سید محمد۔ نصیر الدین ہاشمی اور تمکین کاظمی مرحوم جیسے دکن کے لوگوں نے بھی زبان تحقیق وتنقید کا کام کیا مگر اس سلسلے میں پہل کا سہرا ڈاکٹر زور مرحوم ہی کے سر ہے۔ ڈاکٹر زور سے میری عقیدت یہ بھی ہے کہ وہ میری ہی آبائی سرزمین مرہٹواڑہ سے تعلق رکھتے تھے۔

ڈاکٹر زور کی شخصیت بڑی پہلودار اور ہمہ رنگی تھی یہی وجہ ہے کہ وہ بیک وقت افسانہ نگار بھی تھے اور شاع تھے اور نقاد بھی۔ ماہر لسانیات بھی تھے اور ماہر تعلیم بھی۔ کوئی چالیس سال تک وہ زبان وادب کی خدمت کر

ملے قریب ہی ان کی مستقل تصنیفات بھی تھیں۔ چیدہ چیدہ مضامین کا تو کوئی حساب ہی نہیں ہے میں سمجھتا ہوں خود مرحوم بھی اپنی زندگی ان کی صحیح تعداد سے واقف نہ ہوں گے۔ اس کاغذی اور نظری کاموں کے علاوہ ڈاکٹر صاحب نے اپنی زندگی میں اردو کے لئے عملی پر بھی بہت کام کیا ہے۔ اس طرح ان کے نظری اور عملی ہر دو کاموں کی ایک طویل فہرست ہے۔ یقیناً اُن کے یہ سارے کام بے حد ت کے حامل اور قابل قدر ہیں۔ مگر میرے خیال میں ان کے مندرجہ ذیل تین کام تو ایسے ہیں جو لافانی ہیں اور اردو زبان و ادب تا ابد یاد رکھے جائیں گے۔ زمانے کی ترقی اور بدلتی ہوئی قدریں ان پر کبھی اثر انداز نہ ہو سکیں گی: —

(۱) کلیات قلی قطب شاہ (۲) ہندستانی لسانیات (۳) ادارۂ ادبیات اردو

گولکنڈہ کے پانچویں بادشاہ محمد قلی قطب شاہ کے کلیات کی تدوین جو قدیم دکنی زبان میں ہے، ڈاکٹر زور کا ایک زبردست نامہ ہے۔ کسی گمنام شاعر کے کلیات کو مرتب کرنا ایسا کوئی معرکے کا کام بھی نہیں کہا جا سکتا مگر اس کی اہمیت کی اصل وجہ یہ ہے کہ اس اردو ادب (اور خصوصاً شاعری) کی عمر میں ایک قابل لحاظ مدت کا اضافہ ہو گیا۔ ورنہ اس سے قبل ولی کو ہی اُردو کا پہلا شاعر جاتا تھا۔ اور پھر فاضل مرتب نے صرف اس کے سارے بکھرے ہوئے اور چیدہ چیدہ کلام کو یکجا ہی نہیں کیا (مگر اپنی جگہ یہ بھی اہم کام ہے) بلکہ اس کے ساتھ (۳۲۵) صفحات کا ایک طویل، بسیط اور پُر مغز مقدمہ بھی لکھا جس میں قلی قطب شاہ کے ات زندگی اور معاشرتی حالات بیان کرنے کے علاوہ یہ ثابت کیا گیا ہے کہ قلی قطب شاہ اُردو کا پہلا شاعر ہے اور دکنی اردو کی ہی قدیم شکل ہے۔ یہ ڈاکٹر زور مرحوم کا ایک ایسا کارنامہ ہے جو ہمیشہ اہل ذوق حضرات سے داد وصول کرتا رہے گا اور آنے والی ں کا کوئی سخت سے سخت نقاد بھی اس کی اہمیت سے انکار نہ کر سکے گا۔

ایک ہزار سے بھی زیادہ صفحات کی یہ ضخیم اور عظیم کتاب قلی قطب شاہ کی (۲۲۰) نظموں (۳۱۲) غزلوں اور کچھ قصائد عیات اور مثنویات وغیرہ پر مشتمل ہے۔ اس کام کے لئے انھیں کتنی زحمت نہ اٹھانی پڑی ہوگی اور کس کس کتب خانہ اور علم گاہ اف نہ کرنے پڑے ہوں گے۔ اس چیز سے کچھ وہی لوگ واقف ہو سکتے ہیں جنھوں نے کبھی اس کوچہ کی خاک چھانی ہو۔ مگر ڈاکٹر بنے اس کے لئے جو بھی محنت و مشقت برداشت کی اس کا صلہ انھیں مل چکا ہے اور یہ کتاب اردو کی ایک غیر معمولی اور ٹ کتاب تسلیم کی جا چکی ہے۔ ڈاکٹر زور نے دکنی زبان پر اور بھی کام کیا ہے اور بہت سے قدیم شاعروں اور ادیبوں کی چیزیں ان کے مرتب اور شائع کی ہیں مگر انھیں وہ مقام اور شہرت نہ مل سکی جو کلیات قلی قطب شاہ کے حصہ میں آئی ہے۔ اس لئے ان کے تعلق سے کئے گئے سارے کام میں میری نظر اس کتاب پر پڑی اور میرا خیال ہے مستقبل میں جب ہماری یہ نسل نہ ہوگی کی طور پر ڈاکٹر زور سے کوئی واقف نہ ہوگا اس وقت بھی یہ کتاب اتنی ہی اہمیت کی حامل ہوگی جتنی آج ہے۔ بلکہ قدامت کی اہمیت اور بھی بڑھ جائے گی اور وہ اردو کی کلاسیکی کتابوں میں شمار ہوگی۔

کلیات قلی قطب شاہ کی تدوین کے بعد ڈاکٹر زور کا دوسرا اہم کارنامہ "ہندوستانی لسانیات" ہے۔ یہ کتاب اردو میں یات کے موضوع پر لکھی گئی پہلی کتاب ہے اور آج بھی اردو میں اس موضوع پر ہمیں کوئی ایسی کتاب نہیں ملتی جسے ہم اس کے مقابل رکھ سکیں۔ اس کتاب کا بیشتر مواد ڈاکٹر زور نے لندن میں اپنے قیام کے دوران جمع کیا تھا۔ ان میں فطری طور پر نیات سے دلچسپی تھی اور وہ عثمانیہ یونیورسٹی میں ایم۔ اے کے دوران ہی اس پر کام کرنا چاہتے تھے، مگر یہ ممکن نہ ہو سکا۔ اتفاق سے جب وہ پی۔ ایچ۔ ڈی کے لئے گئے تو وہاں انھیں ڈاکٹر گراہم بیلی، پروفیسر ڈانیل جونس اور پروفیسر ٹرنر جیسے ماہر لسانیات کے

ہندوستان میں بھی رہ چکے تھے اور اردو سے اچھی طرح واقف ہونے کے علاوہ ہندوستانی لسانیات کے بھی ماہر
کے لکچروں سے ڈاکٹر زور مرحوم کی معلومات میں بے حد اضافہ ہوا اور ان کا وہ شوق جو ایک زمانہ سے ناساعد
سے دبا ہوا تھا پھر جاگ گیا۔ چنانچہ پی۔ ایچ۔ ڈی کے لئے اپنے مقالے کی تیاری کے ساتھ ساتھ (پی۔ ایچ۔ ڈی کے
کا موضوع "اردو کا آغاز اور ارتقاء" تھا) انھوں نے اس پر بھی کام کیا اور ایک قابل لحاظ مواد اکٹھا کرنے
بھی ہو گئے۔

یہ کتاب دو حصوں پر مشتمل ہے۔ ہندوستانی لسانیات کے موضوع پر دراصل قلم اٹھانے سے پہلے ڈاکٹر زور
تین چار ابواب لسانیات کے عام مطالعہ کے لئے مختص کئے ہیں۔ ان میں انھوں نے لسانیات سے پڑھنے وا
تعارف کروایا ہے اور زبان اور علم زبان سے بحث کی ہے۔ اس کے بعد انھوں نے اصل موضوع کی طرف
ہندوستان میں جتنی زبانیں بولی جاتی ہیں ان کا تجزیہ کیا ہے اور انھیں مختلف گروہوں میں بانٹا ہے
وضاحت کے ساتھ بیان کرنے کے لئے انھوں نے مختلف جدول بھی کتاب میں دئے ہیں۔ اردو کی ابت
پر بھی انھوں نے اس کتاب میں بحث کی ہے۔ عام طور پر اس باب میں ہمارے ماہران لسانیات اور ماہران ا
اختلافات پائے جاتے ہیں۔ زور صاحب نے اس سلسلے میں حافظ محمود شیرانی (پروفیسر پنجاب یونیورسٹی) کے
ہوئے اردو کی ابتداء کا سہرا مسلمانوں کے دہلی فتح کرنے سے بھی قبل سرزمین پنجاب کے سر باندھا ہے۔ غرض ا
بہت کچھ ہے، یہاں اس مختصر سے مضمون میں اس کی تفصیل میں جانا نہیں چاہتا جو مقام کلیات قلی قطب ش
زور صاحب کو ایک محقق کے طور پر ملا ہے وہی مقام اس کتاب کی وجہ سے انھیں اردو میں ایک ماہر لسانیات کے ط
ہے۔ لسانیات اور صوتیات کے موضوع پر ڈاکٹر صاحب کی بعض اور تصنیفات اور مضامین بھی ہیں مگر میر
اس کتاب کے لکھنے کے بعد وہ اس موضوع پر کچھ نہ بھی لکھتے تو ان کی حیثیت میں فرق آنے والا نہیں تھا۔
کی طرح "ہندوستانی لسانیات" بھی ہمیشہ اہمیت او عزت کی نگاہ سے دیکھی جائے گی اور زور صاحب

ان دو نظری اور تصنیفاتی کاموں کے علاوہ اردو کے لئے زور صاحب نے ایک بہت اہم عملی کام بھی کیا۔
"ادارۂ ادبیات اردو" کا قیام۔ یہ ادارہ ۱۹۳۱ء میں قائم ہوا۔ اس کام میں زور صاحب کے چند
تعاون شامل رہا مگر حق بات تو یہ ہے کہ اس کام میں مرکزی حیثیت زور صاحب کو ہی حاصل تھی اور آخر
زور صاحب اور ادارۂ ادبیات اردو بعد میں چل کر لازم و ملزوم ہو گئے۔ اور نئی نسل کے لوگوں کو تو یہ
ہو گئی تھی کہ یہ زور صاحب کا ذاتی ادارہ ہے اور وہ تن تنہا اس کے کرتا دھرتا اور مالک ہیں۔ حالانکہ ای
بعد کو جب اس ادارہ کی اپنی عالیشان عمارت "ایوان اردو" تعمیر ہوئی تو حیدرآباد میں عام طور پر اسے
ایوان اردو کہا جانے لگا۔ جس طرح مولوی عبدالحق مرحوم کے نام کے ساتھ ہی انجمن ترقی اردو کا خیال آجاتا ہے با لک
زور مرحوم کا نام بھی ذہن میں آتے ہی فوراً خیال ادارہ ادبیات اردو کی طرف چلا جاتا ہے۔ اس ادارہ کے ق
زبان و ادب کا اچھا ذوق پیدا کرنا نوجوانوں میں لکھنے اور پڑھنے کی عادت ڈالنا، عوام میں اردو زبان کا
تاریخ و تمدن اور دکنی کلچر و آثار کی حفاظت کرنا اور ایک اچھا سا کتب خانہ قائم کرنا تھا۔ ادارہ کے یہ سار

ہ پورے ہوئے اور وہ بڑی کامیابی کے ساتھ کام کر رہا ہے۔ مندرجہ بالا مقاصد کو سامنے رکھ کر ادارہ کو کئی شعبہ جات میں
کر دیا گیا اور ہر شعبہ میں اس سے متعلقہ قابل اشخاص کی ایک کمیٹی بنادی گئی۔ چنانچہ شعبہ زبان۔ شعبہ تالیف و ترجمہ۔
تنقید۔ شعبہ تاریخ دکن۔ شعبہ شعراء و مصنفین دکن۔ شعبہ سائنس۔ شعبہ کتب خانہ اور شعبہ انسائیکلوپیڈیا اس کی
ں ہیں۔ یہاں سے اب تک کئی کتابیں شائع کی گئیں۔ ایک ادبی رسالہ "سب رس" جاری کیا گیا جو ۱۹۳۸ء سے لیکر آج تک
پابندی سے نکل رہا ہے اور جس کا "زور نمبر" اس وقت آپ کے ہاتھوں میں ہے۔ بچوں کے ادب کے فروغ کیلئے "سب رس"
وں کا ایڈیشن بھی نکالا تا گر وہ بہت دن ہوئے بند کر دیا گیا ہے۔ ادارہ کے تحت ہر سال اردو زبان کے امتحانات منعقد
جاتے ہیں جس کا سلسلہ آج تک پابندی اور کامیابی کے ساتھ جاری ہے۔ "ایوان اردو" میں ادارہ کے تحت ایک میوزیم
ہے جہاں دکنی کلچر اور اردو زبان کے تمام آثار محفوظ کر دئے گئے ہیں۔ ایک دارالمطالعہ ہے جہاں ہندو پاکستان کے تمام
رات اور رسائل آتے ہیں۔ آج ادارہ کا سب سے اہم شعبہ کتب خانہ ہے جس کے ذکر کے بغیر میرے خیال میں ادارہ کا ذکر نامکمل
ہیگا۔ یہ کتب خانہ ایوان اردو کی اوپر کی منزل میں ہے۔ درجنوں بڑی بڑی الماریوں میں کتابیں ہی کتابیں بھری
ہیں۔ جدھر نظر دوڑائیے آپ کو کتابوں کے علاوہ اور کچھ نظر نہیں آتا۔ پھر ایسا نہیں ہے کہ صرف قدیم کتابوں کا
ذخیرہ ہے یا پھر تمام جدید کتابیں ہیں نہیں بلکہ یہ کتب خانہ ان دونوں قسم کی کتابوں سے مساوی لبریز ہے، یہاں
ف قدیم اور جدید مطبوعہ کتب ہی ہیں بلکہ اردو مخطوطات کی بھی ایک وافر تعداد موجود ہے۔ یہی وجہ ہے کہ سارے
وستان سے اردو کے ریسرچ اسکالرس اس کتب خانہ سے استفادہ کے لئے حیدرآباد آتے ہیں یہاں ایسے ریسرچ اسکالرس
کے لئے ایک مہمان خانہ بھی تعمیر کیا گیا ہے جہاں وہ قیام کر کے اپنا ادبی اور تحقیقی کام کر سکتے ہیں۔ اس کتبخانہ میں
رسالوں اور اخباروں کی بھی فائلیں موجود ہیں چنانچہ "اودھ پنچ" کی فائل کتب خانہ میں میری نظر سے گزری۔ اور بھی دہلی
لکھنؤ و حیدرآباد کے تمام قدیم اخبارات و رسائل یہاں محفوظ ہیں جنھیں مجلد کر کے رکھا گیا ہے۔ میں جب بھی اس کتبخانہ میں
ہوں بس کھو سا جاتا ہوں۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا پڑھا جائے اور کیا نہ پڑھا جائے۔ اس اثناء میں میز کے ساتھ کھڑے
ہے اور قدیم اخباروں اور رسالوں وغیرہ کی ورق گردانی کرتے کرتے کافی وقت گزر جاتا ہے اور آخر لائبریرین صاحب خود
ہے ہیں "جناب آپ یوں کب تک کھڑے رہیں گے بیٹھ کر پڑھئے نا"۔ غرض ادارہ ادبیات اردو کا یہ کتب خانہ بڑی نادر چیز ہے۔
زور صاحب نے ادارۂ ادبیات اردو کو اتنی مستحکم بنیادوں پر قائم کیا تھا اور اس کا انتظام اتنے منظم طریقہ پر چلاتے تھے
کہ جبکہ وہ اس دنیا میں نہیں رہے اسوقت بھی ادارہ اسی طرح کام کر رہا ہے جس طرح ان کے زمانے میں کرتا تھا۔ ہر چیز ویسی ہی ہے
کام ویسا ہی ہو رہا ہے۔ کچھ بگڑا نہیں کچھ رکا نہیں کچھ تھما نہیں۔ آج بھی جب میں "ایوان اردو" جاتا ہوں تو مجھے ڈاکٹر زور کی عظمت و
ت بے پناہ یاد آجاتی ہے۔ واقعی بڑے لوگ ایسے ہوتے ہیں جو مر کر بھی نہیں مرتے۔ وہ ہم میں نہیں ہوتے مگر ان کا کام برابر ان کی
دلاتا رہتا ہے اور ان کی کمی کو محسوس نہیں ہونے دیتا۔ ڈاکٹر زور ہی کا ایک شعر ہے ؎

موت سے بھی مر نہ سکیں گے ہیں زور ہم　　　زندگی میں جو کچھ کام کر جائیں گے

بھی ڈاکٹر زور کے یہ تین کام ایسے ہیں جنھوں نے انھیں جاوداں بنا دیا ہے اور وہ مر کر بھی نہیں مرے۔

پروفیسر انور علی انور

ڈاکٹر زور کا تنقیدی شعور

ڈاکٹر محی الدین قادری زور اردو کے ایک ممتاز ادبی نقاد اور لسانیات کے عظیم محقق کی حیثیت سے
ایک جانی پہچانی مشہور و معروف شخصیت تھے جن کے علمی و ادبی کارناموں پر بجا طور پر فخر کیا جا سکتا ہے۔
زبان و ادب کی جو بیش بہا اور گراں مایہ خدمات سر انجام دی ہیں انھیں اردو ادب کی تاریخ میں کبھی
جا سکتا۔ اُن کے ادبی کارنامے اس قدر عظیم الشان ہیں کہ اب اُنکی ہستی محض ایک فرد کی حیثیت نہیں ر
بن چکی ہے۔ ان کی ادبی و لسانی خدمات کو دو مختلف شعبوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ ایک حصہ ان
کام سے تعلق رکھتا ہے۔ اور دوسرا حصہ شعر و ادب کی تنقید سے۔ اور ان دونوں حیثیتوں میں اُن
قابل قدر اور وقیع ہیں۔ لسانی تحقیق کے سلسلے میں زور صاحب کی تصنیفات "اردو شہ پارے" اور "
اس موضوع پر "حرفِ آخر" کی حیثیت رکھتی ہیں۔ اس کے علاوہ زور صاحب نے کئی ایک شعرا کی زندگی او
تحقیقی نوعیت کا کام کیا ہے۔ مختلف علمی اور لسانی موضوعات پر گراں قدر مقالے ترتیب دیے ہیں۔ غرض
میدان میں اُن کی خدمات بڑی قابل قدر اور مستحق ستائش ہیں جنھیں ادبی تاریخ کا کوئی مرتب نظر انداز نہیں

تحقیق کے علاوہ زور صاحب نے تنقید کے میدان میں بھی اپنی عظمت و برتری کا ثبوت بہم پہنچایا ہ
ادب کے سب سے پہلے قابل ذکر نقاد ہیں جنھوں نے جدید تنقیدی اصولیات و مبادیات سے قارئین ارد
اور تنقید کے موضوع پر بلند پایہ علمی کتابیں لکھی ہیں جن میں علم الانتقاد خاص ایک فن کی حیثیت میں پیش
کے اہم ترین مسایل کی توضیح و تشریح کی گئی ہے۔

نظری تنقید کے علاوہ زور صاحب نے عملی تنقید کے میدان میں بھی جولانیاں دکھائی ہیں۔ اور تنقی
اردو شعرا و ادبا کی نگارشات کے حسن و قبح پر بحث کی ہے۔ اُن کی قدر و اہمیت متعین کی ہے۔
موجودگی میں گیسوئے اردو کو سلجھانے اور آراستہ کرنے میں زور صاحب کا جو کارنامہ ہے اُس کی افاد
انکار نہیں کر سکتا۔

تنقید ادب کے سلسلے میں زور صاحب کا بلند ترین کارنامہ یہ ہے کہ انھوں نے سب سے پہلے اس موضو
کے ساتھ اظہار خیال کیا ہے اور اس فن کے مخصوص مسائل سے اردو داں طبقے کو متعارف کیا ہے۔ عام طور
حالی کو اردو شعر و ادب کا اولین نقاد قرار دیا جاتا ہے۔ اور اُن کے مقدمۂ شعر و شاعری کو اسی نوع کی ا
حالی اردو تنقید کی تاریخ میں "امام اور مجدد" کہلانے کے مستحق ہیں۔ لیکن اس بات کو تسلیم کرنا پڑتا ہے ک

تنقید سے نا آشنا تھے اور اس کے لوازمات و مقتضیات کا شعور نہ رکھتے تھے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ فن تنقید نگاری خالصتاً مغربی اثرات کی پیداوار ہے۔ ہمارے قدیم ادبی سرمایے میں اس کی موجودگی کا کوئی ثبوت نہیں ملتا۔ حالی مغربی تعلیمات سے مستفید نہیں ہوئے تھے۔ اس وجہ سے فن تنقید نگاری کے مخصوص احوال و کوائف کی بھی انھیں خبر نہ تھی۔ اردو زبان میں تنقید کے موضوع پر ٹھوس علمی نوعیت کا کام کرنے کے لئے کوئی ایسا شخص موزوں ہو سکتا تھا جو ایک طرف تو اپنی زبان کی مخصوص روایات اور اس کے ذہن و مزاج کی کیفیات کو اچھی طرح جانتا ہو۔ اور دوسری طرف جدید مغربی علوم کے سرچشموں سے بھی اپنی پیاس بجھا چکا ہو۔ زور صاحب کی ذات میں یہ دونوں خوبیاں جمع تھیں۔ وہ محض مشرقی علوم ہی کے فارغ التحصیل نہ تھے۔ مغربی ادب و فن کی روایات میں بھی گہری نظر رکھتے تھے۔ چنانچہ انھوں نے اپنی فطری ذہانت اور اکتسابی صلاحیت سے کام لے کر اردو زبان میں سب سے پہلے تنقید کے موضوع پر قلم اٹھانے کی جسارت کی۔ اور اس فن کے بارے میں علمی اور معیاری کتابیں تصنیف کیں جو آج تک تنقیدی ادب میں لاثانی اور بے مثال سمجھی جاتی ہیں۔

زور صاحب کی تنقیدی نگارشات دو طرح کی ہیں۔ ایک قسم تو ان متفرق تحریروں اور مقالوں پر مشتمل ہے جو انھوں نے متعدد قدیم معروف اور غیر معروف شعرا کے کلام کو دنیائے ادب سے روشناس کرانے کے لئے سپرد قلم کئے۔ اس قسم کی تحریریں زور صاحب کی عالمانہ بصیرت اور ناقدانہ دقیق النظری کا بین ثبوت ہیں اور اردو ادب کا قیمتی اور لازوال سرمایہ ہیں۔ جن کی افادیت ہر لحاظ سے مسلّم ہے۔ شعرا کے فکر و فن پر اظہار خیال کے دوران میں زور صاحب نے بیسیوں کام کے بڑے مفید اور نادر نکات بیان فرمائے ہیں اور بڑی خیال افروز باتیں درج کی ہیں۔ ایسے مقالات ہندو پاکستان کے بیشتر علمی و ادبی رسائل کے صفحات پر بکھرے پڑے ہیں اور مکمل طور پر کتابی صورت میں ان کی اشاعت وقت کی ایک اہم ضرورت ہے۔

متفرق نگارشات کے علاوہ اردو تنقید نگاری کی تاریخ میں زور صاحب کا سب سے بڑا کارنامہ ان کی وہ مشہور اور لاجواب ادبی تصنیفات ہیں جو ہندو پاکستان کے علمی حلقوں سے خراج تحسین وصول کر چکی ہیں۔ اور جنھیں اردو کے تنقیدی ادب میں کلاسیک کا رتبہ حاصل ہے۔ ان کی تصنیفات میں مندرجہ ذیل تین کتابیں خصوصی اہمیت رکھتی ہیں:—

۱۔ روح تنقید ۲۔ تنقیدی مقالات ۳۔ اردو کے اسالیب بیان

یہ ہر سہ کتب فن تنقید نگاری کے بہترین معیار کو پیش کرتی ہیں۔ اول الذکر کتاب میں فن تنقید کے اصولیات و مبادیات سے بحث کی گئی ہے۔ اور تنقید کے اہم ترین مسائل پر زور صاحب نے اپنے نقطۂ نظر کو واضح کیا ہے۔ تنقید کے موضوع پر زور صاحب کی یہ سب سے پہلی کاوش ہے۔ اور غالباً نظریاتی تنقید کے مسائل کے بارے میں اردو کی اولین تصانیف میں سے ہے۔ یہ کتاب لکھ کر زور صاحب نے گویا کہ اردو ادب میں علم الانتقاد کی بنیاد رکھی ہے اور خود ہی اس بنیاد پر ایک عظیم عمارت تعمیر کرنے کی سعئ بلیغ فرمائی ہے۔

اصولیات تنقید کے علاوہ زور صاحب نے تنقید نگاری کے عملی پہلوؤں پر بھی توجہ صرف کی اور تنقیدی مقالات اور اردو کے اسالیب بیان جیسی مفید اور معلومات افزا کتابیں لکھیں۔ "تنقیدی مقالات" میں فاضل مصنف نے جدید تنقیدی اصولوں کی رو سے اردو کے مشاہیر فن کی نگارشات کو جانچا اور پرکھا ہے اور ان کے محاسن و معائب اجاگر کئے ہیں۔ یہ کتاب عملی تنقید نگاری کا ایک کامیاب تجربہ پیش کرتی ہے اور اردو ادب کے بیشتر عظیم فن کاروں کی ادبی تخلیقات کی

صحیح قدر و اہمیت کو واضح کرتی ہے۔

اردو کے اسالیب بیان' ایک منفرد تنقیدی تصنیف ہے جس کے مطالعہ سے زور صاحب کے ادبی شعور اور ژرف نگاہی کا اندازہ ہوتا ہے۔ اس کتاب کے مطالعہ سے یہ بات روز روشن کی طرح عیاں ہوجاتی ہے کہ زور صاحب کے ایک عظیم محقق اور مبصر تھے جو اردو زبان کے ذہن و مزاج کو اچھی طرح جانتے اور پہچانتے تھے۔ اور ادبی اسالیب بیان کا گہرا شعور رکھتے تھے۔ اس کتاب میں زور صاحب نے اردو کے قدیم و جدید اساتذہ فن کے طرز و اسلوب پر رائے اور اُن کی انفرادی خصوصیات بیان کی ہیں۔ اردو نثر نویسی کے ارتقاء پر بھی روشنی ڈالی ہے۔

زور صاحب کے تنقیدی شعور کا مفصل طور پر جائزہ لینا ایک مختصر مقالے میں ممکن نہیں ہے اور نہ ہی ان کی تنقید کو پوری وضاحت سے بیان کیا جا سکتا ہے۔ مختصراً اُن کی تنقیدی تحریروں کے چند ایک محاسن درج کئے جا چکے ہیں۔

جیسا کہ پیشتر ازیں بیان کیا جا چکا ہے۔ اُن کے تنقیدی شعور کا سب سے نمایاں پہلو اُن کی وسیع علمیت بصیرت ہے۔ اُن کی نگاہیں مشرق و مغرب کے علوم کا احاطہ کئے ہوئے تھیں اور اُن کا ذہن دنیا بھر کے علوم فیض سے معمور ہو چکا تھا۔ روح تنقید میں زور صاحب نے کثرت سے مشرق و مغرب کے ائمہ فن کی آرا و نقل کی اقوال دہرائے ہیں۔ اس سے اُن کی وسعت مطالعہ کا ثبوت ملتا ہے۔ ایک اچھے نقاد کے لئے نظر کی و ادراک کی گہرائی بنیادی اوصاف ہیں۔ اور یہ چیزیں کثرت مطالعہ کے بغیر نصیب نہیں ہوتیں۔ زور صاحب تنقیدوں میں یہ اوصاف نمایاں طور پر جھلکتے ہیں۔ اور ان کی فنی مہارت اور مشاقی کی دلیل مہیا کرتے ہیں۔

زور صاحب کے تنقیدی رجحان کا ایک اور پہلو یہ ہے کہ وہ محض مشاہیر و ائمہ فن کے اقوال نقل ہی نہ خود اپنی بصیرت اور فن شناسی سے مفید اور موزوں نتائج اخذ کرتے ہیں۔ اور بحث کو کسی نہ کسی قطعی فیصلے ہیں۔ اس سے ان کی تنقیدی تحریروں میں الجھاؤ کا عیب واقع نہیں ہوتا۔ یہ بات زور صاحب کو عصر حاضر نقادوں سے ممتاز کرتی ہے۔ آج کل کے کئی ایک نقادوں کی تحریریں بہت زیادہ الجھی ہوتی ہیں اور انھیں پڑھ نتیجے تک نہیں پہنچتا۔ اکثر لوگ اسی عیب کی وجہ سے تنقیدی تحریروں کو پڑھتے ہوئے بیزاری محسوس کرتے۔ برعکس زور صاحب کی تنقیدیں ادبی لحاظ سے دلچسپ اور افادی اعتبار سے سود مند اور نفع بخش ہوتی ہیں کی معلومات میں اضافے کا باعث ہوتی ہیں۔

زور صاحب کی تنقید نگاری کا ایک اور نمایاں وصف یہ ہے کہ وہ ہر مسئلے اور موضوع پر پوری ش ساتھ بحث کرتے ہیں۔ اور زیر نظر موضوع کے کسی گوشے کو نظر انداز نہیں کرتے اُن کی تنقیدیں اپنی جامعیت کے لحاظ سے بڑی قابل قدر اور مستحق تحسین ہیں۔ وہ اپنے موضوع کے متفرق اور متضاد پہلوؤں کا ذکر کرتے یا بحث کے دوران میں کسی خاص جگہ پر ایک قطعی اور واضح نقطۂ نگاہ درج کر دیتے ہیں جس سے قاری پہلوؤں کی الجھنوں سے بچ جاتا ہے اور ایک قطعی نتیجے تک بآسانی پہنچ سکتا ہے۔ مثلاً "روح تنقید" میں کے موضوع پر متعدد مشاہیر کے نظریات و عقائد پیش کر کے ساری بحث کا ملخص ان الفاظ میں درج کیا ہے

"غرضیکہ فنِ تنقید اُس فن کو کہتے ہیں جس میں دوسروں کے حرکات و افعال پر انصاف کے ساتھ فیصلے صادر کیے جاتے ہیں۔ صحیح و غلط اچھے اور بُرے اور حق و باطل کے درمیان فرق کرنے' دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی الگ کر دکھانے' وقتیہ معتقدات اور ذاتیات ملیامیٹ کرنے۔ نیز صحیح مذاق پیدا کرنے کی کوشش کو تنقید کہتے ہیں۔"

ملاحظہ کیجئے کتنی عمدگی اور مہارت سے ایک الجھی ہوئی بحث کو چند الفاظ میں سلجھا کر دکھایا ہے۔

تحریر و نگارش کی یہی پاکیزگی اور صفائی زور صاحب کا امتیازی وصف ہے۔ جو اُن کی تمام تنقیدی تحریروں میں جھلک رہا ہے کمال ایک کہنہ مشق استاد اور ماہر فن ہی کو حاصل ہو سکتا ہے۔

یہ رتبۂ بلند ملا جس کو مل گیا — ہر مدعی کے واسطے دار و رسن کہاں

زور صاحب نے اپنی تنقیدی تحریروں میں ایک اور چیز کو بھی خاص طور پر ملحوظ رکھا ہے وہ ادبی و شعری نظریات کو بیان کرتے ہوئے اُن کی صحت و صداقت کی دلیل کے طور پر ممتاز مشاہیر کی ادبی و فنی تخلیقات میں سے موزوں اور برمحل حوالے پیش کرتے ہیں۔ اس طرح اُن کے نقطۂ نظر کو سمجھنے اور اُس کی درستی اور صحت پر یقین کرنے میں سہولت پیدا ہوتی ہے۔ یہ بات گہرے ادبی شعور اور مسلسل محنت و کاوش کے بغیر حاصل نہیں ہوتی۔ آجکل کی ادبی تحریروں میں یہ خوبی بہت حد تک مفقود ہے زور صاحب بالعموم اپنی تنقیدوں میں حوالے اردو شعرا و ادبا کی نگارشات ہی سے اخذ کیے ہیں جس سے اُن کی ذاتی تحقیق اور کاوش کا پتہ چلتا ہے۔

زور صاحب کو اپنے نقطۂ نظر کی وضاحت کے لئے تمثیل پیش کرنے کا بھی خصوصی ملکہ حاصل تھا۔ جہاں کہیں ضرورت محسوس ہوئی ہے انھوں نے کسی نہ کسی عمدہ تمثیل کے ذریعہ اپنے زاویہ نظر کی توجیہ کر دی ہے۔ مثلاً ادب اور فنونِ لطیفہ کا فرق بیان کرتے ہوئے اس طرح رقم طراز ہوئے ہیں۔

"دنیا میں مختلف طبقے پیدا کئے گئے ہیں۔ جن میں سے ہر ایک اپنی جداگانہ قابلیت سے متصف ہے اور ایک کی قابلیت دوسرے کے لئے کارآمد۔ کسان اپنی محنت سے ہمارے جسم کی پرورش کرتا ہے۔ اور معمار اپنے فن کے ذریعہ سے شدائد موسم سے بچاتا ہے۔ اسی طرح ایک بانسری بجانے والے کا شتکار کسان اور معمار سے کچھ کم فائدہ مند نہیں۔ اگر کسان درزی اور نان بائی کی مصنوعات ہماری جسمانی خواہشات اور نفسانی توقعات کو پورا کرتی ہیں تو فنونِ لطیفہ ہماری روحانیت اور ذوق کو بڑھاتے اور زندہ رکھتے ہیں۔ عیسیٰ نفسی دکھاتے ہیں۔"

زور صاحب نے عملی تنقیدوں میں بھی بسا اوقات تمثیلی پیرائے سے کام لیا ہے اور بڑی نکتہ آفرینیاں دکھائی ہیں حالی اور آزاد کی تنقید نگاری کا موازنہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

"جس قدر آزاد کی شخصیت اُن کی تحریروں میں چھلکی پڑتی ہے۔ اتنی ہی حالی کی طبیعت چھپی رہتی ہے۔ وہ کبھی ظاہر ہونا نہیں چاہتے۔ وہ تنقید نگاری کے وقت ایک ایسا حاکم بن جاتے ہیں۔ جو قانون اور شرع و فقہ کی سخت پابندی کرتے ہوئے نہایت امن و اطمینان اور بُردباری کے ساتھ فیصلے صادر کرتا ہے۔ آزاد اپنی تنقید نگاری کے ذریعہ سے حاکم اور منصف نہیں بنتے بلکہ ایک ہمدرد اور مخلص خاندانی وکیل وہ اپنے مؤکل کی کامیابی کے لئے جان توڑ کوشش ضرور کرتے ہیں لیکن مخالف کی مخالفت بھی نہیں کرتے۔ ان کی فیاضی

طبیعت گوارا نہیں کرتی کہ کسی ایک کی طرف فیصلہ کیا جائے۔ وہ دونوں فریقین کو خوش رکھنا چاہتے ہیں نظری تنقید کے علاوہ زور صاحب نے عملی تنقید نگاری میں بھی اسی شرح و تفصیل اور دقت نظر سے کام جو اُن کی مخصوص روش ہے۔ وہ سطحی نظر سے کسی فن پارے پر نظر نہیں ڈالتے بلکہ تنقید کے مسلمہ اصولوں کی روشن اُسے اچھی طرح جانچتے اور پرکھتے ہیں۔ اور اچھے اور بُرے دونوں پہلوؤں پر نظر رکھتے ہیں۔ مصنف کی شخصیہ اُس کے ماحول کو بھی نظر انداز نہیں کرتے۔ جن شعراء و مصنفین پر انھوں نے انتقادی نظر دوڑائی ہے اُن کے ہر لحاظ سے پورا پورا انصاف کیا ہے اور اُن کے صحیح رتبہ و مقام کا تعین فرمایا ہے۔ انھوں نے فن تنقید نگا چند ایک اصول وضع کئے ہیں جن کی پابندی کا ادب کے ہر نقاد کو مکلف ٹھہرایا ہے۔ یہی بات یہ ہے کہ ا پر جس سختی کے ساتھ زور صاحب نے خود عمل پیرا ہو کر دکھایا ہے وہ انہی کی ذات کا حصہ ہے۔ اصول حسب ہیں :-

۱۔ کتاب ظاہری شکل کے لحاظ سے جس صنف ادب سے تعلق رکھتی ہے وہ اس کی تمام خصوصیات پر حاوی ہے یا نہیں ہے۔ اس کا اندازہ لگائیں۔

۲۔ کتاب معانی و مطالب کے لحاظ سے اپنے موضوع کی تمام خوبیوں سے متصف ہے یا نہیں۔

۳۔ کسی ادبی کارنامے کی زبان اور اسلوب بیان کی نگہداشت بھی نہایت ضروری ہے۔

۴۔ تنقید کا چوتھا اصول یہ ہے کہ مصنف کی ذات اس کے ماحول اور اس کی تصنیفات کے ماخذوں کا گہ مطالعہ کیا جائے۔

زور صاحب کی مذکورہ فنی خصوصیات اور اُن کے تنقیدی شعور کے نمایاں پہلوؤں کو نگاہ میں رکھتے ہ فیصلہ کرنا مشکل نہیں ہے کہ اُن کی تنقید نگاری اردو ادب میں ایک اعلیٰ ترین معیار پیش کرتی ہے۔ ا مخصوص صنف ادب میں بلند ترین رتبہ و مقام کی مستحق ہے۔ اُن کا ادبی و تنقیدی شعور بڑا پاکیزہ صا متوازن ہے۔ اور صحیح طور پر آئندہ تنقید نگاری کے رجحانات کی نشان دہی کرتا ہے۔

انوار ظہوری (راول پنڈی)

ڈاکٹر زور کی عظمت

"ہر عہد کی رُوح العصر ہوتی ہے۔ جس کو المانی Zeitgeist کہتے ہیں وہ روح القدس کی طرح حسب ضرورت زمانہ سازی کو تعلیم دیتی ہے"۔[1] یہ قول عصر حاضر میں ڈاکٹر زور پر حرف بہ حرف پورا اُترتا ہے۔ میرا ایقان ہے کہ ہر دَور میں جس طرح منجانب اللہ اصفیا و اولیا رُوحانی اقدار کے تحفظ کی خاطر منصۂ شہود پر آتے ہیں بعینہٖ بعض ارباب کمال بھی علاّم الغیوب کی طرف سے علم و فضل کے الوند و ہمالہ بنا کر پیدا کر دیئے جاتے ہیں کہ ان کے سینوں میں علم کا سمندر موّاج رہے اور دنیا اپنی پیاس بجھائے۔

بہت ممکن ہے آج اکثر اہلِ علم صاف دِلی کے ساتھ زورؔ کی عظمت کے اعتراف میں ہچکچائیں کہ یہ روگ ہماری مُردہ پرست قوم کے رگ و ریشہ میں سمیت بکھیر چکا ہے۔ لیکن جب ایک صدی بعد اُردو ادب میں نئے تنقیدی رجحانات کا جائزہ کلاسک (classic) کی حیثیت سے لیا جائے گا اور ڈاکٹر زور کی محققانہ کد و کاوش کا حقیقت پسندانہ تجزیہ کیا جائے گا تو یقیناً انھیں وہی عظمت و برتری حاصل ہوگی جو آج ولیؔ میرؔ نظیرؔ اور غالبؔ کو اُردو شاعری میں یا سیّد احمد خاں، شبلیؔ، آزادؔ اور نذیر احمد کو اُردو نثر میں نصیب ہو چکی ہے۔

اس وقت شاید کوئی "عبدالرحمٰن ثانی" یہ لکھنے پر مجبور ہو جائے کہ ہندوستان کے الہامی سرمایہ میں زورؔ کی تنقیدی تحریریں بھی شامل ہیں۔ بادی النظر میں آج آپ کو یہ بات عجیب سی معلوم ہوگی کہ تنقیدی تحریروں کا الہام سے واسطہ ہی کیا ہے۔ لیکن آپ اُردو ادب کی جدید تنقیدی تحریروں کا تسلسل و تواتر سے درجہ بہ درجہ مطالعہ کریں تو یہ بات بے جھجک خود بھی کہہ سکیں گے کہ زورؔ اور دیگر نقادوں میں ایک عظیم حدِ فاصل قایم ہے۔

محمد حسین آزادؔ اور حاؔلی اُردو زبان میں صفِ اوّل کے نقاد ہیں۔ بے شُبہ دونوں کی تحریریں اس رہگذار میں نشانِ منزل کی حیثیت رکھتی ہیں۔ ان کی بلندی کا راز اسی میں ہے کہ انھوں نے ایک نئے راستے کی جانب واضح نشاندہی کر دی ہے۔ عبدالرحمٰن بجنوری زندہ رہتے تو قوی امکان تھا کہ عمر بھر کے مطالعے کا نچوڑ پیش کر دیتے اور کوئی معیاری تصنیف سامنے آتی۔ غالبؔ، سیّد احمد خاں، شبلی نعمانی، نذیر احمد اور مشتاق احمد خاں وغیرہ بھی ہم عصر نئی نسل پر براہِ راست اثر انداز ہوئے ہیں۔ اسی عہد سے ہر مکتبۂ فکر میں عظیم شخصیتیں معرضِ وجود میں آئیں۔ عبدالحلیم شررؔ، پنڈت برجموہن دتاتریہ کیفیؔ، منشی پریم چند، وحید الدین سلیم، عبدالماجد دریابادی، ابوالکلام آزاد، نیاز فتحپوری، سلمان منصورپوری، عبدالسلام ندوی، سلیمان ندوی، مشرقی، رشید احمد صدیقی اور مناظر احسن گیلانی کے احسانات سے اُردو نثر کبھی سبکدوش نہیں ہو سکتی۔ ان سب کے ساتھ نثر نگاروں کا ایک جمِ غفیر نظر آتا ہے اور ان میں ایک بھی ایسا نہیں جس کی انفرادی

---

[1] محاسنِ کلام غالب ص۱۲ ۔ ڈاکٹر عبدالرحمٰن بجنوری ۔

کوششوں کو آئندہ کا مورخ نظرانداز کرسکے۔ اُردو نثر کے عناصر خمسہ نے تو ایک علمی راستہ دکھا دیا تھا۔ ان کے بعد آنے و
کو نثر بنا کر دکھایا۔ احسان دونوں کا ہے اور دونوں ہی قابلِ احترام ہیں۔

ڈاکٹر عبدالحق اور خواجہ حسن نظامی بلاشبہ وہ شخصیتیں ہیں جنھوں نے اُردو زبان میں سادہ و سلیس اور شستہ
کا آغاز کیا اور "آسان اُردو" کی بنیاد رکھی۔ ان دونوں نے سب سے پہلے اُردو نثر میں عربی اور فارسی زبانوں کے ثقیل
الفاظ کا استعمال کم کردیا۔ اور مقفیٰ و مسجع عبارتوں کے باقی ماندہ اثرات کو ایک سرے سے کلیتاً ختم کردیا۔ اس طرح ذ
ڈھونڈنے کی زحمت سے بچا کر عبارت کے اصل مفہوم و معنویت کی طرف مبذول کردیا۔ یہ کہنا برحق ہے کہ دراصل انھ
اُردو زبان کو اس کا اصلی جامہ پہنایا اور انھیں دونوں سے موجودہ نسلوں نے شستہ و رواں اُردو لکھنے کا سلیقہ

ڈاکٹر عبدالحق اور خواجہ حسن نظامی کا اُردو نثر نگاری میں جو مقام ہے وہی مقام اور وہی رتبہ اُردو کے جد
میں ڈاکٹر زور کو بھی حاصل ہے۔ ڈاکٹر زور آزاد اور حالی کی طرح صرف نشانِ منزل نہیں بلکہ رہبرِ کامل ہیں۔ وہ
پہ پہنچے اور دوسروں کو بھی تا بہ منزل قدم بہ قدم ساتھ لے گئے۔

حصولِ علم کی تگ و دو لاریب اس عہد میں ہر زمانے سے زیادہ ہے۔ جیسے جیسے علم کی روشنی پھیلتی بڑھ
چھوتی چلی جاتی ہے۔ نت نئے اربابِ علم و فن، اہلِ قلم اور اصحابِ کمال و ہنر سامنے آرہے ہیں۔ آج کتنے
جولانیٔ طبع کا رُخ زندگی بھر کے لیے تحقیق و تنقید کے میدانوں کی طرف موڑ چکے ہیں۔ لیکن عظمت و برتری کا سہرا ان
جاتا ہے جنھیں کسی افادی ضمن میں اوّلیت کا شرف حاصل ہوتا ہے۔ نظیر اکبرآبادی کی آج اُردو شاعری میں وہی
شکسپیر کی انگریزی ادب میں۔ بلکہ میں تو یہ کہوں گا کہ شکسپیر انگریزی شاعری کا نظیر اکبرآبادی ہے۔

کوئی تذکرہ نگار حالی کے بعد کے عہد میں عظمت اللہ خاں، تصدق حسین خالد، ن۔ م۔ راشد اور میرا
جدید اُردو نظم کی تاریخ شروع نہیں کرسکتا۔ ان کی انفرادی خصوصیات اور شعری افادیت پر علٰحدہ علٰحدہ بحث
لیکن اس امر میں کوئی شبہ نہیں کہ یہ چاروں جدید اُردو شاعری کا نقطۂ آغاز ہیں۔ انھوں نے شعرائے جدید
جوش کی ڈگر سے ہٹ کر ایک نیا راستہ دکھایا ہے۔ اور یہ وہ شرف و امتیاز ہے جو ان سے کوئی نہیں چھین سکتا۔

بعینہٖ ڈاکٹر زور نے اُردو نثر کو ایک نیا اسلوب دیا۔ ڈاکٹر زور کی عبارت اُردو کے تنقیدی سرمایہ میں
ہے۔ ان کے ہاں وہی دل و دماغ کو براہِ راست متاثر کرنے والی بے پناہ صلاحیت نثر پاروں میں رچی بسی نظر آ
اشعار میں نشتری جھلکیاں دکھاتی ہے۔ یہ ڈاکٹر زور کی وہ نمایاں ترین خصوصیت ہے جو بیشتر صورتوں میں انھیں
سے ممتاز کرتی ہے۔ نئی نسل کے ناقدوں میں یہ خوبی یا تو یکسر موجود نہیں یا اس معیار و سطح کی نہیں جو ان کی تحریروں
وہ بہ استثنائے چند بے شمار نقادوں کی طرح گنجلک عبارت نہیں لکھتے دور ازکار تشبیہات بعید از فہم استعا
محاکات کے سہارے قلم نہیں اُٹھاتے۔ جس طرح ان کا ذہن صاف ستھرا تھا تحریریں بھی صاف ستھری ہیں۔ وہ
انتھک محنت کے عادی رہے ہیں۔ آغاز کار کے بعد مسلسل یکسوئی کے ساتھ اسے تکمیل تک پہنچانا ان کی فطرت میں
کی فطرت کے یہی نقوش اور ان کی جبلت کا یہی خصوصی رنگ ان کی عبارت میں بھی صاف صاف جھلکتا ہے۔ انھیں
قیمت کا جتنا شدید احساس تھا اتنا ہی شدید احساس الفاظ کی قدر و قیمت کا بھی تھا۔ انھوں نے کبھی اپنی تحر
نہیں دی۔ وہ مفہوم کو بہ تمام و کمال پیش کرنے کے لیے مناسب ترین الفاظ موزوں ترین مقام پر استعمال کرنے کے

ن رکھتے تھے۔ یہ ڈاکٹر زور کا اتنا عظیم وصف ہے جو ان کے سوا کسی اور ناقد و محقق یا کسی بھی صاحب طرز نثر نگار کے پاس اس تکمیلی شان میں ہیں آتا۔ اور خوبی یہ ہے کہ اس کے باوجود ان کی عبارت نہ خشک ہوتی ہے نہ سپاٹ۔ تنقید پڑھئے، نتائج تحقیق کا مطالعہ کیجئے لیکن تھ ساتھ عبارت کا لطف بھی لیتے جائیے۔ بلکہ خود عبارت پڑھنے والے کے ذہن کو اپنے ساتھ ساتھ لیے پوری بے تکلفی کے ساتھ آگے ہے۔ انھیں معنوی پس منظر کے ساتھ الفاظ کے انتخاب و استعمال کی بھرپور قدرت حاصل ہے۔ ان کی عبارت میں ہر لفظ اپنے صحیح فہوم و معنیٰ کے ساتھ استعمال ہوتا ہے۔

بڑے سے بڑے شاعر کو بسا اوقات اظہارِ خیال کے لیے فنی محاسن کی پابندی کی رعایت سے یا موزوں کلامی کی شرط کے باعث ذفات اور زائد یا صفاتی الفاظ کا لامحالہ سہارا لینا پڑتا ہے۔ درآنحالیکہ شعرا کو غرضِ مطلب اور اظہارِ مدعا کے لیے یہ امر مجبوری، گنے لفاظ سے ہی کام لینا ہوتا ہے۔ بحیثیت نثر نگار وہ شعرا کی طرح پابند نہیں، لیکن اپنی تحریروں میں شعرا سے بھی زیادہ محتاط نظر آتے ۔ ان کے ہاں صفات کا استعمال برمحل و باموقع ہوتا ہے۔ بعض موجودہ تنقیدوں میں افسانوی طرز پر جو کشمکش (Suspense) ناپید اکردی جاتی ہے، ان کی تنقیدی تحریریں اس عیب سے قطعاً پاک ہیں۔ وہ اعترافِ کمال میں جھجکتے نہیں لیکن تعریف و یف کرتے وقت حقیقت اور سچائی کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑتے۔ ان کے ہاں سکوتِ سخن شناس کا دور دور تک سُراغ نہیں وہ نہ اعترافِ کمال میں مبالغے سے کام لیتے ہیں نہ عیوب کی نشان دہی میں غلو کرتے ہیں۔ ان کے ہاں افراط و تفریط بالکل نہیں ریر میں غیر متوازن اور غیر معتدل اندازِ بیان دکھائی نہیں دیتا ان کی عبارت میں وہ ہنگامہ آرائی نہیں جو بیشتر نثر نگاروں کا خاصہ ہے۔ یہی سبب ہے کہ جہاں وہ کسی کے خصوصی اوصاف کی تعریف میں زبانِ قلم کھولتے ہیں، وہیں اگر ہوں تو اُس کے معائب کا بے تکلف اظہار کر جاتے ہیں۔ اور کوئی لاگ لپیٹ نہیں رکھتے۔ لیکن تمام کوشش حقایق کو منظرِ عام پر لانے کے لیے رہی ہے محض تحسین بے جا یا تنقیص ناروا کے لیے نہیں!

ڈاکٹر زور کی تمام تقاریظ یا مقدمات کا مطالعہ کرجائیے وہ ڈاکٹر عبدالحق کی طرح "مقدمہ باز" نہیں کہلائے جاسکتے۔ ان کی ام تقاریظ پورے مقدمات اور سارے دیباچے اپنی اپنی جگہ مستقل تنقیدات کی حیثیت رکھتے ہیں جس میں وہ حقیقتاً اصل تصنیف تالیف کی حقیقی رُوح پیش کردیتے ہیں۔ ان کی عبارت نہایت جامع ہوتی ہے اور یہی معلوم ہوتا ہے کہ جامع ترین الفاظ میں اصل تاب کی تلخیص کردی گئی ہے۔ صاحبِ کتاب کا پیش کردہ کوئی نمایاں پہلو ایسا نہیں رہ جاتا جس کی طرف واضح نشان دہی نہ کردی گئی ہو۔ یہ ان کی دقتِ نظر اور علمی کدوکاوش کی روشن دلیل ہے۔ جب وہ کسی کتاب کا مقدمہ لکھتے ہیں تو مقدمہ لکھنے کا پورا پورا ق بھی ادا کرتے ہیں۔ انھوں نے بعض عادی یا پیشہ ور مقدمہ نگاروں کی طرح کسی تصنیف یا تالیف پر چند سطریں لکھ کر بات ختم نہیں ردی۔ جب وہ کسی خالقِ ادب کی صلاحیتوں کو پرکھ لیتے تو پھر اُس کی تخلیق پر بھرپور اور ایمان دارانہ تنقید سے کماحقہٗ عہدہ برآ ہوتے۔ ہر قاری کو صاف نظر آجاتا ہے کہ انھوں نے اوّل تا آخر پوری کتاب کا حرف حرف بہ نظرِ غور دیکھا ہے۔ اور پھر اپنی رائے کا اظہار کیا ہے۔ ان کی رائے نہایت مکمل جامع اور جچی تُلی ہوتی ہے۔ نہ ان کے مضامین اتنے پھیلے ہوئے ہوتے ہیں کہ مرکزی خیال کا سمیٹنا دوبھر ہو جا ور نہ ان میں تسلسل و ربط کا فقدان ہوتا ہے۔ وہ کسی داستان گو یا ناول نویس کی طرح بات میں بات نہیں پیدا کرتے جب ایک بات تمام و کمال کہہ چکتے ہیں تو دوسری بات کا آغاز کرتے ہیں۔ جب دوسری بات کو اتمام تک پہنچا دیتے ہیں تو پھر تیسری بات کی طرف توجہ کرتے ہیں۔ یہی خوبی ان کی محنت و کاوش سے بھرپور عملی زندگی میں بھی دکھائی دیتی ہے۔ جس کام کا آغاز کیا اسے یکسوئی سے اتمام تک پہنچایا۔ وہ بہ یک وقت بیسیوں کام شروع کرکے ناتمام چھوڑنے کے عادی نہیں تھے۔ ان کے عمل ان کی تحریر اور ان کی زندگی تبعِل

ہیں گھڑی کی سوئیوں کی طرح یکساں انقلابی رفتار نظر آتی ہے ایسی رفتار جو بروقت بھی ہے، وقت نما بھی ہے۔ وہ ان شخصیت
ہیں جو تاریخ ساز ہوا کرتی ہیں اور زمانہ جن کے پیچھے چلتا ہے۔

خواجہ حسن نظامی اور ڈاکٹر مولوی عبد الحق نے اُردو زبان کو عمومی طور پر آسان بنایا۔ ڈاکٹر زورؔ نے خالصتاً علمی تنقید
نثر کی زبان کو آسان ترین بنا دیا۔ ڈاکٹر زورؔ سے پہلے خالصتاً علمی و تنقیدی زبان کو آسان ترین لب و لہجہ اور انداز بیا
پیش کرنے والا کوئی صاحبِ قلم نظر نہیں آتا۔ ڈاکٹر زور کی تنقیدی زبان جس قدر آسان ہے اسی قدر اس کی تقلید مشک
وہ مقام ہے جہاں زبان و الفاظ پر ان کی مضبوط گرفت اور اظہار و ابلاغ پر ان کی بے پناہ قدرت کا اظہار ہوتا ہے
کے بعد اس عہد میں صرف میجر آفتاب حسن ہی وہ شخصیت ہیں جن کے اسلوبِ تحریر میں کم و بیش یہی تمام اوصاف پائے
الگ بات ہے کہ ان کی فکری جولانگاہ مختلف ہے۔ بالخصوص سائنسی موضوعات پر اُردو میں ان سے زیادہ آسا
نے آج تک نہیں لکھی۔

حالیؔ نے انگریزی زبان سے استفادہ ضرور کیا لیکن انھیں مغربی علوم پر وہ قدرت حاصل نہیں تھی جو اُن کے
کو حاصل ہوئی۔ ڈاکٹر محمد اقبال، ڈاکٹر عبد الرحمٰن بجنوری، سید محمود، شاہ سلیمان، راس مسعود، آفتاب احمد خا
عبد الستار صدیقی، محمد علی جوہر، ڈاکٹر ضیاء الدین اور علامہ مشرقی نے مغربی علوم و السنہ پر نہ صرف اہلِ زبان کی طرح
حاصل کیا اور ان سے آگے بڑھ گئے بلکہ اپنے معاصرین اور نئی نسلوں کے لیے فقید المثال شخصیتوں کے رُوپ میں سامنے آ
ان شخصیتوں نے ہماری ایک پوری نسل کو متاثر کیا ہے۔

حالیؔ کے تنقیدی شعور نے ماضی کی مروّجہ اقدار کے خلاف سب سے پہلے آواز اُٹھائی اور یہ شرف انھیں کو حا
بعد آنے والوں کے تنقیدی شعور کو نئی منزل کی راہوں پر لا ڈالا۔ ڈاکٹر زورؔ کے ذہن و فکر کو مشرق و مغرب کی شعوری
اقدار کا حسین امتزاج کہا جا سکتا ہے۔ وہ ناقلِ محض تھے نہ اندھی تقلید کے قائل۔ انھوں نے مشرق کی بہترین ا
سے کبھی جانے نہ دیا۔ وہ مغربی ممالک میں مغربی علوم سے بہرہ مند ہونے کے باوجود زندگی بھر مشرقی رہے اور تہذیب م
خصائص ہمیشہ اپنائے رہے۔ نہ انھوں نے مغرب کی تقلید کی نہ وہ بیشتر مغربی تعلیم یافتہ اہلِ علم کی طرح کسی ا
کے باعث مغرب زدہ رہے۔ مغربی اقوام نے صدیوں تک مسلمانوں کے عہدِ اقتدار میں ان کے تہذیبی اثر و نفوذ کے باعث
ترین اوصاف کو اپنا لیا تھا وہیں وہ مسلمانوں کے عہدِ زوال کے رنگ میں بھی پوری طرح رنگے جا چکے تھے۔ ڈاکٹر
کو بڑی شدت سے محسوس کیا اور ان کی تقلیدِ محض سے اپنا دامن پاک رکھا۔ انھوں نے مغربی ممالک میں جا
تو برِ صغیر کی صوتیات پر، ہندوستانی لسانیات پر، اپنی زبان اور اس کے قدیم شہ پاروں پر جنھیں انقلا
ہواؤں نے غیر منقسم ہندوستان سے اڑا کر مغرب کے دامن میں ڈال دیا تھا۔ انھوں نے جدید مغربی اسلوب
کے بہترین اوصاف کے امتزاج کے ساتھ پیش کیا ہے۔ یہ کام ایسا ہی شخص انجام دے سکتا تھا جسے بہ یک وقت م
علوم پر دستگاہ بھی حاصل ہو اور جدید صحت مند تنقیدی شعور بھی رکھتا ہو۔ دونوں اوصاف ان میں قدرت
تھے۔ یہی وجہ ہے کہ اس ضمن میں اوّلیت کا سہرا انھیں کے سر باندھا گیا۔ ع

یہ رتبۂ بلند ملا جس کو، مل گیا

اگر زورؔ نہ ہوتے تو آج اُردوئے قدیم کہاں ہوتی۔ اُردو کے نقطۂ آغاز کا علم کیسے ہوتا۔ انھوں نے اُردو

ں اوران کی اُردو نظم ونثر سے متعارف کرایا جن کی ابتدائی کوششوں کی بنیاد پر آج اُردو زبان میں ادب وفن اور علم وہنر کی عظیم عمارت ہے۔

کہنے کو بہت آسان سی بات ہے لیکن عصرِ ولی تک اُردو کی عہد بہ عہد نظم ونثر پیش کرنے میں انھیں تلاش وتحقیق کی منزلیں طے کرتے ہوئے ی جانکاہی، جانفشانی، اور عرق ریزی کے مراحل سے گزرنا پڑا ہوگا، اسے وہی لوگ بہتر سمجھ سکتے ہیں جو تحقیق وتلاش کے لق ودق ، میں اپنی زندگیاں گزار چکے ہیں۔

یہ ناممکن ہے کہ آج زبان کا مورخ یا کوئی محقق اُردو کے قدیم نثر نگاروں یا شاعروں کا ذکر کرے اور ڈاکٹر زورؔ کی خدمات کو نظر انداز ۔ڈاکٹر زورؔ نے ایسا راستہ دکھایا ہے جس پر چل کر نہ جانے کون کون کب تک تحقیق کے جواہر بکھیرتا رہے گا۔

الٰہ آباد یونیورسٹی کے پروفیسر، محمد نعیم الرحمٰن کلیاتِ بحریؔ کے دیباچہ میں لکھتے ہیں "لاکلام کہ سمندر کی گہرائیوں سے سیپیاں اور موتی نام ہے۔ مگر لاریب کہ ان موتیوں کو پرکھنا اور ان کی قدر وقیمت کو پہچان کر قدر دانوں کے دامن، گریباں اور کلاہ تک پہنچا دینا بڑا کام ہے"[۵] اور یہ بڑا کام ڈاکٹر زورؔ نے کیا ہے۔ یہ فقرہ ان کی سعی وکاوش پر حرف بہ حرف منطبق ہوتا ہے۔

حافظ محمود شیرانی "پنجاب میں اُردو" لکھ کر اُردو زبان کے محققین پر قابلِ رشک احسان کر گئے ہیں۔ ان کی آواز پر لبیک سب سے ٹر زورؔ نے کہا اور تحقیقی جواہر پاروں کا ڈھیر لگا دیا۔ اپنے ساتھ بیسیوں کو اسی میدان میں گھسیٹ لائے۔

یہ کتنی بڑی صدق مقالی ہے ؏

ہر کسے را بہرِ کارے ساختند

اگر ڈاکٹر زورؔ پیدا نہ ہوتے تو آج اُردو کہاں ہوتی۔

اربوں انسان پیدا ہوئے کروڑوں انسان پیدا ہوتے ہیں اور مر جاتے ہیں لیکن ان میں ایسے کتنے ہوتے ہیں جو شخصیت یدا ہوتے ہیں یا انھیں شخصیت قرار دیا جا سکتا ہے ـــــ ان شخصیات میں بھی انھیں انگلیوں پر گنا جا سکتا ہے جو ادارہ یدا ہوتے ہیں۔ بذاتِ خود ادارہ بن کر زندہ رہتے ہیں اور جب مر جاتے ہیں تو ادارہ مر جاتا ہے۔ لیکن ڈاکٹر زورؔ ان معدودے چند ں میں سے ہیں جو خود بھی ادارہ بنی رہتی ہیں۔ اور اپنے بعد زندہ رہنے کے لیے ادارے چھوڑ جاتی ہیں۔

ڈاکٹر عبدالحق اور ڈاکٹر زورؔ ریل کی پٹریوں کی طرح اُردو کی دو ایسی متوازی شخصیتیں ہیں جن کی عمل کوشش اور فکر ونظر کی یں جدید ادبیات اُردو کا پورا قافلہ رواں دواں ہے۔ ڈاکٹر عبدالحق کو اللہ نے پارس بنا کر بھیجا تھا جو ان سے چھو گیا وہ سونا لیکن ڈاکٹر زورؔ کو ڈاکٹر عبدالحق سے زیادہ جانکاہی، عرق ریزی اور محنت کرنی پڑی۔ یہ تقدیر کی بات ہے کہ وہ پارس بن کر یں ہوئے۔ انھیں کیمیا گر بنایا گیا تھا اس لیے انھوں نے سطحِ مرتفع دکن کی سنگلاخ زمینوں سے کار آمد ذہنوں کو چن چن کر ، گھس کر سونا بنایا اور اپنی کیمیا گری کے جوہر دکھائے۔

مغربی تہذیب نے جہاں اپنے پیالوں میں بھر بھر کے زہر آمیز شراب دی ہے وہیں مغربی تعلیم نے ذہنوں کو علم وفن کے بعض نئے کی طرف متوجہ بھی کیا ہے۔ نئی نسلوں کے ہر فرد نے کورانہ تقلید کو شیوہ نہیں بنایا۔ برطانوی تسلط نے ہر مکتبۂ فکر کو شعوری متاثر کرنے کے لیے جال پھیلا دیئے تھے۔ تمام علوم وفنون میں وہ طرح طرح سے اپنی فوقیت وبرتری کا سکہ بٹھانے پر اُدھار کھائے ۔ مغرب کو علم کی ہر شاخ کا مصدر ومنبع ظاہر کرنا ان کا ایمان تھا۔ انھیں کوششوں کا نتیجہ تھا کہ انگریزی شعر وادب کا دھارا برِ صغیر

---

[۵] حفیظ سید ۔ ۔ صفحات ۳۰۲ (کلیات بحری)

کی طرف موڑ دیا گیا۔ اس ریلے میں یقیناً بہت سے ارباب کمال بہہ گئے۔

لیکن اس وقت بھی ایسے افراد اور بالخصوص ایسے نوجوان کم نہیں تھے جنھیں اللہ نے عزتِ نفس، خود داری او
سے مالا مال کر دیا تھا۔ ڈاکٹر زور موخرالذکر افراد کی صفِ اوّل میں شامل ہیں۔

ڈاکٹر زور نے اپنے معاصرین اور مابعد آنے والی نسلوں کی ذہنیتوں کو بیشتر دیگر اہلِ علم کی طرح مرعوب ہونے سے بچ
طور پر سب کو اپنے ساتھ ساتھ مشرقی، ہندوستانی، اور اُردو ادبیات وکلام اور علوم و فنون کی تلاش و تحقیق پر لگا دیا
نئی تعلیم سے آراستہ تھا اسلاف کی عظمت و بزرگی اور علمیت و فضیلت کی طرف ہمہ تن متوجہ بھی ہوا اور قائل بھی ہوا تا
میں صرف شدہ ایک ایک لمحے کی قیمت وصول ہوئی اور معلوم ہوا کہ ہمارے بزرگ اپنے بعد آنے والی نسلوں کے لیے کتنا عظ
کیسی شاندار زبان چھوڑ گئے ہیں ـــ وہ زبان جو آج دُنیا کی تیسری بڑی زبان ہے۔ اگر ڈاکٹر زور اور ان کی ایما پر تلاش
والوں کی تمام کتب جمع کر لی جائیں تو بیسیوں نہیں سیکڑوں کتابیں سامنے آجائیں گی۔ افسانے اور ناول نہیں۔ ٹھوس
تحقیقی تصانیف و تالیفات! اگر ان تمام شخصیات کو سلسلہ وار گن لیا جائے جو ان کی، ان کے رفقا، ہمنوا معاصرین اور
وکاوش سے منظرِ عام پر آئی ہیں تو فہرست سیکڑوں نہیں ہزاروں ناموں تک جا پہنچے گی۔ کسی کو شک ہے تو گن لے اور
لطف یہ ہے کہ یہ سلسلہ ختم نہیں ہوا ابھی جاری ہے۔ آج بھی جواں ہمت محققین کی سعی و کاوش کسی نہ کسی گم شدہ کڑ
نکالتی ہے اور کوئی نہ کوئی گم نام شخصیت منظرِ عام پر آجاتی ہے۔ یہ ان کی لگن تھی جو بہت سوں کو انھیں کے رنگ میں رَ
انھوں نے طلبہ، طالبات یا ریسرچ اسکالرز کو (تحقیقی مقالات) تھی سیس کبھی بھی Dictate نہیں کرائے ا
طریقہ سکھایا جی بھر کے مشقت کرائی اور محنت کا عادی بنایا تاکہ صرف حصولِ اسناد کا مقصد ہی ان کے پیشِ نظر نہ رہ
اپنی آئندہ زندگی میں بھی ایک عظیم محقق اور انشا پرداز ثابت ہوں۔ آج ان کی اس لگن کے نتائج دُنیا کے سامنے ہیں۔ جا
طیلسانین میں وہ کون ہے جس پر ڈاکٹر زور کی نظر اٹھی ہو اور اُس کی ایک نہ ایک عظیم تحقیق، شاندار تصنیف یا قابلِ قدر
پر نہ آئی ہو۔ ان کے رفقائے کار کو دیکھ لیجیے ان میں کون ایسا ہے جو آج صاحبِ کتاب نہیں۔ دکن میں تجارت پیشہ ا
کے علاوہ دارالترجمہ، دائرۃ المعارف، انجمن ترقی اُردو اور ادارۂ ادبیات اُردو نے عہدِ عثمانی میں جتنی کتابیں شائع کی
مثال برِ صغیر کی تاریخ میں پہلے کبھی نہیں ملتی۔ نہ حصولِ آزادی کے بعد کہیں تاحال اس کی نظیر دکھائی دی۔

ڈاکٹر زور نے صرف شاگردوں کی تعداد نہیں بڑھائی۔ ان کی عظمت کا راز اس میں ہے کہ علم کا صحیح ذوق عام کیا
محقق، مصنف، نقاد اور انشا پرداز پیدا کئے۔ صرف "سب رس" کی ربع صدی کی خدمات پر نظر ڈالی جائے اور اس
مشاہدہ کیا جائے تو معلوم ہو جائے گا کہ تحقیقی مقالات اور تنقیدی تحریرات کی تعداد کتنی ہے اور معیار کیسا ہے۔

اس میں کوئی شبہ نہیں کہ بڑے بڑے عالم فاضل پیدا ہوئے اور آج بھی موجود ہیں۔ لیکن ان کا علم دُنیا کے لیے
پر علم نافع نہیں۔ طالبِ علموں کی مقررہ تعداد کو پڑھایا اور گھر بیٹھ گئے۔ لیکن ڈاکٹر زور کا علم طالب علموں کو استاد بنا
ان کے علم سے ان کے ہم عصروں نے بھی بعد و قرب کی تمیز کے بغیر استفادہ کیا روشنی حاصل کی اور کندن بن گئے۔ وہ ایس
جس کا تتبع آدمی کو ہیرا بنا دیتا ہے۔

ڈاکٹر زور کی عظمت کے صحیح خدوخال پہچاننے کے لیے یہ ضروری ہے کہ ان کے ماحول، ان کے عہد کی فضا، دکن کے
دکن اور بیرونِ دکن کی سر برآوردہ نامی گرامی شخصیتوں اور ان کے متقدمین پر بھی گہری نظر ڈالی جائے۔

ڈاکٹر زورؔ نے جس عہد میں جنم لیا وہ تاریخِ دکن کا عہدِ عروج تھا۔

دکن برِ صغیر کے صاحبانِ کمال وفن، اربابِ علم وہنر اور اصحابِ فضیلت کا مرجع تھا۔ دکن ہمیشہ اربابِ کمال کا قدرداں رہا ہے۔ ...ی مقناطیسیت نے گوشہ گوشہ سے جذب وکشش کے زیرِ اثر کامل واکمل شخصیات کو جمع کر لیا تھا۔ اب تو یہ بساط ہی اُلٹ گئی۔ ...ن میں سے اکثر بوریہ بستر سمیٹ کر جا چکے۔ جو رہ گئے وہ رختِ سفر باندھ رہے ہیں۔

یہاں ہند اور بیرونِ ہند کی لاتعداد شخصیتیں حیدرآباد میں جمع ہو گئی تھیں۔ آدمی وہیں جاتا ہے جہاں اسے قدرشناس اور ...راافزائی کا ماحول ملتا ہے۔ دکن کے ہر در و دیوار سے اندلس وترکی، عراق وشام، عرب ومصر، سمرقند وبخارا اور بغداد وغرناطہ کا ...یم اسلامی جاہ وجلال ٹپکتا تھا۔ جن آنکھوں نے یہ رنگ دیکھے ہیں وہ گواہی دیں گی کہ یہی جاہ وجلال سیکڑوں ہزاروں میل دور ...ی وطن چھوڑ کر دکن پہنچنے کے لیے دلوں کو سینوں کے اندر بے چین کر دیا کرتا تھا۔ ان مقامات کی لاتعداد شخصیتوں کو اس گنہگار نے ...ی نوعمری میں کہیں اور نہیں خود اپنے گھر[1] پر دیکھا ہے۔ والدِ مرحوم علامہ سید ظہور الحق[2] اپنے محلے کی مشہور شخصیت بابا میاں، مولوی ...بد اللطیف[3] مولانا فضل اللہ[4] علامہ ابراہیم رشید[5] مولانا مناظر احسن گیلانی[6] ڈاکٹر عثمان خاں[7] اور اپنے بڑے بہنوی حکیم انصاری ...ے مکانات پر آتے جاتے یا قیام کرتے دیکھا ہے۔

یہاں ایک امر کی وضاحت ضروری ہے کہ حیدرآباد میں دو طرح کے مسلمان رہتے بستے رہے ہیں۔ ایک تو وہ جو صدیوں سے یہاں ...تے بستے آئے ہیں دوسرے سالار جنگ اوّل کے عہد میں بیرون حیدرآباد سے آنے والے جن کو چھ ماہ قیام، یا کسی مقامی مقتدر ...خصیت کی سفارش پر "ملکی صداقت نامہ" دے دیا جاتا تھا۔ جس کے بعد وہ ریاست میں سرکاری ملازمت کے اہل قرار پا جاتے۔ ...صورت ہر ملک میں موجود ہے۔ ڈومی سائیل سرٹیفکٹ کے بغیر کسی بھی ملک میں نہ سرکاری ملازمت مل سکتی ہے نہ مستقل قیام کی ...جازت! "ملکی صداقت نامہ" ایک سرکاری کاغذی کارروائی تھی جس کا تعلق عوام سے نہ تھا۔ یو پی کے بعض ناعاقبت اندیش ...حاب اس شرط پر نہایت چراغ پا رہے ہیں۔ اس مسئلے کو بنیاد بنا کر ڈاکٹر زورؔ کی مخالفت پر بھی کمربستہ رہے ہیں۔ جبکہ ڈاکٹر زورؔ ...ایسے محکمے سے تعلق رکھتے تھے جو ملکی صداقت نامے اجرا کرتا نہ اس قانون کا نفاذ ان کی وجہ سے ہوا یہ قانون سالہا سال سے نافذ ...تا اور قریب قریب دُنیا کے ہر مہذب ملک میں نافذ ہے۔

دکن کی تہذیب اور اقدارِ تمدن میں شان وشوکت اپنی تمام رعنائیوں کے ساتھ جلوہ گر تھی۔ دکن کے باشندے نہایت اطمینان[؟] فراغت، آرام وراحت اور سکون وعشرت کی زندگی بسر کر رہے تھے۔ حصولِ معاش کے ذرائع کفالت کے لیے کافی تھے۔ یہی وجہ ...ہے کہ تاریخِ اقوامِ عالم گزشتہ دو سو برس میں عمومی توکل وغنا کی وہ مثال کہیں اور نہیں پیش کر سکتی جو باشندگانِ دکن کے طبائع ...ں رچ بس گیا تھا۔ اسی ماحول میں تعلیم یافتہ حیدرآبادیوں کے اذہان کو تربیت نصیب ہوئی۔ گھر گھر علم وفضل کے چرچے تھے۔ ...یک دریائے ناپیدا کنار تھا جو دماغوں کو سیراب کر رہا تھا۔

دکن کی فارغ البالی نے دُنیا کو دکن کے اربابِ فضل وکمال سے تقریباً لاعلم ہی رکھا۔ یہ ایسا پہلو ہے جس کی نشاندہی کے ...بغیر ڈاکٹر زورؔ کی عظمت کا اعتراف صحیح خطوط پر نہیں کیا جا سکتا۔ برِ صغیر کی تقسیم سے پہلے باہر کی تمام عظیم شخصیتوں سے اہلِ دکن ...واقف تھے۔ لیکن دُنیا دکن کے صرف ایک نام "نظامِ دکن" کو جانتی تھی۔ اور یہ نظامِ دکن کے علم وفن سے فطری لگاؤ کا نتیجہ ہے کہ

---

[1] واقع محلہ عثمان شاہی بلدہ [2] صدر مجلس دائرۃ المعارف [3] سابق صدر شعبۂ دینیات (عثمانیہ یونیورسٹی وعلی گڑھ) [4] سابق صدر شعبۂ دینیات (جامعہ عثمانیہ) ...خطیب مکہ مسجد [5] سابق صدر شعبۂ دینیات (جامعہ عثمانیہ) [6] رکن دارالترجمہ [7] انڈسٹرالاعظم اعظم مونزروس۔

دنیا نے دائرۃ المعارف، جامعہ عثمانیہ اور دارالترجمہ کے آئینہ میں دکن کے ارباب فضل وکمال کی صورتیں بھی دیکھیں۔

مہاراجہ کشن پرشاد، بلبل ہند سروجنی نائیڈو، قائد ملت نواب بہادر خاں، اور امجد حسین امجد حیدرآبادی یہی چار نام ایسے ہیں جو بیسویں صدی میں دکن سے باہر عمومی طور پر سب سے پہلے متعارف ہوئے اور شہرت پائی۔ بعد ازاں ڈاکٹر رضی الدین صدیقی، ڈاکٹر حمید اللہ، ڈاکٹر زور اور سیدہ اختر حیدرآبادی کے ناموں سے دنیا آشنا ہوئی۔ پنجاب اور بمبئی کی صحافت اور پنجاب و دہلی کے رسائل و جرائد نے عام حیدرآبادی نوجوانوں کے علمی و ادبی کارناموں سے وسطی و شمالی ہند کے اردو داں طبقہ کو واقف کرانے کا بیڑہ اٹھایا اس ضمن میں ہمایوں، جہانگیر، عالمگیر، خیام، ادبی دنیا، زمیندار، اور انقلاب کی خدمات سے کون انکار کرسکتا ہے۔ مولانا ظفر علی خاں کے عہد میں دکن کا پڑھا لکھا کون ایسا شخص تھا جو زمیندار کا خریدار نہ ہو، سیاسی موضوعات پر مضامین یا زبان و عبارت کی وجہ سے کیا ہندو کیا مسلمان سبھی اسے پڑھتے۔ کون سی پڑھی لکھی عورت ایسی تھی جو عصمت، سہیلی، زمانہ اور سہیلی کا مطالعہ نہ کرتی ہو، کس نے الہلال و البلاغ کا مطالعہ نہیں کیا۔ کا مریڈ کس کا منظور نظر نہیں تھا۔ راقم الحروف سے ایک مرتبہ مولانا رازق الخیری نے کہا تھا "حیدرآباد سے باہر کی صحافت اور جرائد و رسائل کی زندگی حیدرآباد کے تعلیم یافتہ طبقہ کی وجہ سے تھی۔ صرف حیدرآباد میں عصمت کے سات ہزار سے زائد خریدار تھے۔ آج پاک و ہند کی دونوں مملکتوں میں وہ کون سا ماہ نامہ ایسا ہے جو خالصتاً ٹھوس علمی و ادبی معیارات کا حامل ہے اور اسے دونوں مملکتوں میں بحیثیت مجموعی اتنے خریدار حاصل ہیں۔" مولانا کے اس ارشاد سے حیدرآباد کی عمومی زندگی میں علم و ادب کی قدردانی کی ایک ہلکی سی جھلک سامنے آجاتی ہے۔

ڈاکٹر زور نے جب ہوش سنبھالا حیدرآباد لاتعداد بھاری بھرکم شخصیتوں کی آوازوں سے گونج رہا تھا۔ مہاراجہ سرکشن پرشاد شاد اور ڈاکٹر مولوی عبدالحق دکن میں علمی و ادبی سرگرمیوں کی روح رواں بنے ہوئے تھے۔ سید علی حیدر نظم طباطبائی، مولانا وحید الدین سلیم، مولوی عنایت اللہ، علامہ سید ظہور الحق، مولوی سید ابراہیم، حکیم آشفتہ، حکیم مقصود جنگ، اختر یار جنگ، ڈاکٹر سید سجاد، فصاحت جنگ جلیل مانک پوری، حسرت موہانی، ڈاکٹر عبدالستار صدیقی، مولانا عبدالقدیر صدیقی حسرت، ایسے فقید المثال ماحول میں بھی وہ اوائل عمر میں ہی اپنی ذہانت، علمی استعداد، خداداد قابلیت اور تحقیقی شوق و شغف کی وجہ سے سب کی آنکھوں کا تارا بن گئے۔ ادبیات اردو میں ایک مستقل باعزت مقام پیدا کیا۔ بلاشبہ وہ اردو زبان میں علمی تحقیق کے میدان میں دکن کی ناک تھے۔

دکن کی تاریخ زبان و ادب میں ڈاکٹر زور کی شخصیت کے ساتھ نئے دور کا آغاز ہوا۔

حیدرآباد میں پڑھے لکھے صاحب حیثیت لوگ بھی زیادہ آمد و رفت نہیں رکھتے تھے۔ شاذ و نادر ضرورتاً سفر کی نوبت آتی، بعض قدیم گھرانے سفر پر جانا اپنی توہین سمجھتے تھے۔ یا سرکاری ملازمت میں بہ سلسلۂ تبادلہ مستقر سے باہر جاتے جس کی نوبت عموماً سالہا سال بعد آتی۔ یا ان کا سب سے طویل سفر فریضۂ حج کی ادائیگی یا کاشی کی رسومات کے موقع پر ہوتا۔ عام حیدرآبادی گھرانوں میں کوئی فرد ایک ضلع سے اگر دوسرے ضلع کا بھی رخ کرتا تو اس کے سفر کو بڑی اہمیت دی جاتی۔ طرح طرح کے اہتمام ہوتے۔ خاندان کے تمام افراد رخصت کرنے اسٹیشن پر موجود ہوتے۔ امام ضامن باندھے جاتے۔ آنکھوں میں آنسو ہوتے رقت طاری ہوتی اور گلے مل کر خدا حافظ کہا جاتا۔ اس ماحول میں تحقیق کی لگن ایک شخص کو شہر شہر لیے پھرتی ہے۔ جہاں چند میل کا سفر مسئلہ بن جاتا وہاں کا رہنے والا مغربی ممالک میں کتب خانوں میں دیدہ ریزی کرتا پھرتا ہے —— اور وہ شخص —— ڈاکٹر زور ہیں۔

ڈاکٹر زور نے تحقیقی کام شروع کیا اور اپنے ساتھ بہت سے نوجوانوں کو لیے آگے بڑھے تو شہرت نے کم عمری میں ہی قدم چومے جو قدر و منزلت انھیں جوانی میں حاصل ہوگئی وہ مختلف میدانوں میں پوری پوری زندگیاں گزار دینے کے باوجود بہت سوں کو

ب نہ ہوئی۔ یہی بات بعض تنگ دل شخصیتوں کے لیے سببِ ملال بن گئی۔ سُنتے ہیں کہ ان میں جغادری بزرگ بھی تھے جو کیچڑ
نے کی سعی کرتے رہے۔ کہاں ڈاکٹر زورؔ ایک نوجوان جس نے ابھی ابھی طالب علمانہ زندگی ختم کر کے میدانِ عمل میں قدم
تھا۔ اور کہاں بعض وہ شخصیتیں جو حکومت کے اعلیٰ ترین عہدوں پر متمکن تھیں۔ جن کی مستقل بااثر آواز تھی جن کا طنطنہ
ن کا تمام ریاست میں رعب و دبدبہ تھا۔ جن کے ہاتھوں میں زمامِ اقتدار تھی جو براہِ راست نظامِ دکن کے دربار میں رسائی
تھے۔ ڈاکٹر زورؔ ایک متوسط گھرانے سے تعلق رکھتے تھے انھیں عمر رسیدہ بااقتدار شخصیتوں کے مقابل ٹھہرانا ان کے
صریحاً زیادتی ہے ایک وقتی فتنہ تھا جو ختم ہوگیا۔ بلکہ یہ کہنا زیادہ مناسب ہوگا کہ ڈاکٹر زورؔ نے اس فتنہ کو بڑھنے ہی نہ
دریسی و تعلیم کی مصروفیتوں کے ساتھ ساتھ ادارۂ ادبیاتِ اُردو کی بنیاد ڈالی، سب رس کا اجرا کیا اور امتحاناتِ اُردو
سلہ شروع کیا جس کی وجہ سے ریاست بھر میں بطورِ ہم اُردو کی توسیع و اشاعت عمل میں آئی۔ اس ادارہ نے حیرت انگیز
ن کے ساتھ ترقی کی تدریجی منازل طے کیں۔ آج ہندوستان میں اُردو زبان و ادب کی خدمات انجام دینے والا یہی سب
ادارہ ہے۔

ڈاکٹر زورؔ کی شرافتِ نفس نے انھیں بدترین مخالفین و اعدا کے ساتھ بھی جنگ کرنے سے باز رکھا۔ وہ تو ایک ایک
عرف میں لڑنے والے آدمی تھے۔ زندگی بھر اٹھارہ گھنٹے روزانہ کام کرتے رہے وہ اگر فساد و جنگ میں پڑ جاتے تو آج ہندوستان
دو کا پُرسانِ حال کوئی نہ ہوتا۔ انھوں نے عمر بھر جنگ کر کر کے اور لڑ لڑ کے حقوق نہیں مانگے۔ محبت سے تسخیرِ قلوب کی نعمت
کی ہے۔ وہ دلوں کو جیتنا جانتے تھے اور اس فن کے ماہر تھے۔ یہ رویہ ان کی فراست و ذہانت کا ناقابلِ تردید ثبوت ہے
انسان تھے، باعمل آدمی تھے۔ ان کے اطراف ہڑبونگ مچانے والے کبھی جمع نہیں ہوئے۔ ایسے ہی آدمیوں کو وہ گلے لگاتے
ہیں کی حوصلہ افزائی کرتے رہے جن میں باعمل انسان بننے کی صلاحیتیں دیکھیں۔ ڈاکٹر زورؔ نے تو کسی ایسے شخص کی مخا
یا کی جس میں عملی صلاحیتوں کا فقدان دیکھا۔

ادارۂ ادبیاتِ اُردو بلاشبہ آج ہندوستان میں اُردو کا سب سے بڑا ادارہ ہے لیکن اسے بڑا ادارہ بننے کے لیے کن
مراحل سے گزرنا پڑا ہے کیسی کیسی مخالفتوں کا سامنا کرنا پڑا ہے کوئی ادارہ کی تاریخ مرتب کرنے والے کے دل سے پوچھے
کٹر زورؔ کا دل یہ داستان سُناتا لیکن اب وہ کہاں!

حیدرآباد دکن میں "سب رس" اور "ہندوستانی ادب" صرف دو ماہنامے ایسے ہیں جو سالِ آغاز کے بعد سے آج تک تواتر
تو شائع ہو رہے ہیں۔ ان کے اجرا کو ربع صدی کا عرصہ گزر چکا ہے۔ لگن دل میں نہ ہو تو یہ بات پیدا نہیں ہوتی۔

انگریزی زبان میں "ہندوستانی صوتیات" اپنے موضوع پر ڈاکٹر زورؔ کی پہلی مبسوط کتاب ہے۔ "روحِ تنقید" کو مثالی
و مقبولیت حاصل ہوئی۔ یہ کتاب اُردو زبان میں نظریاتی تنقید کے موضوع پر بنیادی سرمایہ کی حیثیت رکھتی ہے۔
مقالات میں صحیح عملی تنقید کے نادر نمونے پیش کئے ہیں۔ جن میں اُردو کی چند مشہور قدیم شخصیات سے بحث کی
ن کے رسالوں جریدوں اور مجلوں میں بکھری ہوئی تمام تحریروں کو جمع کیا جائے تو بہت سا قیمتی مواد فراہم
تا ہے۔ نئی پرانی کتنی ہی شخصیتوں پر ان کے قلم سے بھرپور تنقیدیں نکل چکی ہیں۔ اس مواد کی فراہمی "زور نمبر"
ساعت کے بعد ادارۂ ادبیاتِ اُردو کا دوسرا اہم فریضہ ہے۔

ہندوستانی لسانیات ۱۹۳۲ء میں شائع ہوئی۔ جس میں اُردو کی صرف دو کتابوں کے حوالے ملتے ہیں۔ چار

مقامات پر "پنجاب میں اُردو" کے ایک مقام پر آبِ حیات کا۔ اس "مواد" کو دیکھا جاسکتا ہے یہی وہ کل مواد ہے جو اُر گیا۔ ڈاکٹر زورؔ لسانیات کے موضوع کو اُردو زبان میں روشناس کرانے والی پہلی شخصیت ہیں۔ ڈاکٹر عبدالستار صدی لسانیات" کے دیباچے میں لسانیات کے موضوع کی اجمالی توضیح کرتے ہوئے اس امر کا اعتراف کرتے ہیں کہ

> "اُردو میں اب تک کوئی کتاب اس مضمون پر نہیں۔ مسرت کا مقام ہے کہ ڈاکٹر سید محی الدین قادری زورؔ نے اس جانب پہلا قدم اُٹھایا ہے اور 'ہندوستانی لسانیات' کے نام سے یہ مختصر مگر جامع اور نہایت مفید کتاب لکھی ہے۔ جس میں اہم لسانیاتی مسائل اور خاص طور پر ہندوستان کی زبانوں کی تقسیم اور ان کے باہمی تعلقات سے سلیس زبان اور دل نشین پیرائے میں بحث کی ہے۔ اس وقت ایسی ہی مختصر اور جامع کتاب کی ضرورت بھی تھی"۔

آج لسانیات کا موضوع قریب قریب ہر یونیورسٹی کے ایم۔ اے (اُردو) کے نصاب میں شامل ہے۔ ان کی اس اہم دنیا معترف ہے —— کتنی ہی جامعات کے نصاب میں ڈاکٹر زور کی تصانیف شریک ہیں۔ کتنے ہی ایم۔ اے اور پی۔ ایچ۔ ڈی منظور ہونے والے تحقیقی مقالات ڈاکٹر زور کی تصانیف، تالیفات یا تحقیقی مواد سے استفادہ کے بعد سپردِ قلم کئے گئے ہیں۔

ڈاکٹر زورؔ کی علمی و ادبی اور تحقیقی و تنقیدی خدمات نے اتنی شہرت حاصل کر لی ہے کہ آج بہت سے پڑھے لکھے آدمی بحیثیت افسانہ نگار و شاعر نہیں جانتے۔ ڈاکٹر زورؔ نے غزلیں بھی کہی ہیں بعض رومان پسندانہ نظمیں بھی کہی ہیں افسانے اور طویل افسانہ بھی۔ ڈاکٹر زورؔ کے افسانوں میں تاریخی رومانی اور اصلاحی رنگ نمایاں ہے خصوصاً قدیم شہر حیدر آباد" کی رانی بھاگ متی کی پوری داستانِ حیات کو نہایت خوش اسلوبی و چابک دستی کے ساتھ افسانوی جامہ پہنادیا ہے شغف نے ڈاکٹر زورؔ کو افسانہ نگاری اور شاعری کی جانب زیادہ عرصے تک متوجہ نہ رہنے دیا۔ اگر وہ اتنی ہی محنت و جا طرف اتنی ہی سنجیدگی سے مبذول کردیتے جتنی انھوں نے تحقیقاتی کاموں کی طرف کی ہے تو خدا جانے اُردو افسانہ آج کہ ہوتا اور جدید اردو شاعری کا رنگ کیا ہوتا۔ پھر بھی یہ اعزاز ان کے لیے کم نہیں کہ "طلسم تقدیر" اور "تازیانہ" لکھ کر وہ اُر ادب میں بھی طویل مختصر افسانے کے بانی ہیں۔ ان کی شاعری بذاتِ خود ایک علیحدہ موضوع ہے۔ ان کی شاعری نے بھی کہ بہت کم کہا لیکن بہتوں سے اچھا کہا۔ یہاں بھی وہ بے جا روایت پرستی، معاملہ بندی اور گھسے پٹے موضوعات سے رہے۔ انھوں نے زیادہ شعر نہیں کہے لیکن جتنے شعر کہے ہیں جدید اُردو شاعری میں انھیں کسی طرح بھی نظر انداز نہیں کیا ضرور ہے کہ شاعری انھوں نے ایامِ شباب میں کی لیکن پھر بھی ان کی طبیعت کی پاکیزگی ان سے زیادہ رنگین شعر نہ کہا بھی انھوں نے اپنی انفرادیت کو قائم رکھا ہے۔

ڈاکٹر زورؔ کے ایک اور وصف کی طرف بھی توجہ دلانا مناسب معلوم ہوتا ہے۔ میں پاکستانی ہوں اور مجھے خوشی میں ہندوستان کے دو "پدم بھوشن" بھی موجود ہیں۔ غالباً ڈاکٹر زور کو "پدم بھوشن" کا خطاب اسی لیے نہیں دیا گیا ملیح آبادی اور نیاز فتحپوری کی طرح خطاب یافتہ ہو کر پاکستان چلے نہ آئیں۔ پاکستان مسلمانوں کے مطالبہ کی روشنی میں اور برِ صغیر کی تقسیم یا سقوطِ حیدر آباد کے بعد جو ترکِ وطن کا فیصلہ کر چکے تھے ان کا اقدام اس فیصلہ پر مبنی تھا کہ اغیر

کوئی علاقہ نہیں رہ گیا۔ یہاں ذکر عوام کا نہیں، خواص کا ہے۔ چودھری خلیق الزماں، جوش ملیح آبادی اور نیاز فتحپوری، تین ایسی
ہستیاں ہیں جن کے ترک وطن سے ہندوستان کے مسلمانوں کے جذبات کو بڑی شدید ٹھیس پہنچی۔ نیاز اور جوش جب ہندوستان میں
اس وقت بھی یہاں کسی کے دل میں ان کی قدر و منزلت کم نہ تھی۔ ڈاکٹر زور بھی پاکستان آسکتے تھے اور ہم پاکستانی ان کی بھی
تا پذیرائی کرتے ـــــ لیکن مجھے یقین ہے کہ اگر ڈاکٹر زور پاکستان میں رہایش اختیار کر لیتے تو حیدرآباد میں علمی و ادبی حلقے
یشہ کے لیے اُجڑ جاتے اُردو کا چمن ویران ہو جاتا اور کوئی آبیاری کرنے والا بھی نہ رہ جاتا۔ ڈاکٹر عبدالحق کے پاکستان
انے سے ہندوستان میں اُردو کی بنیادیں متزلزل ہو چکی تھیں وہ ہندوستان میں رہ جاتے تو وہاں اُردو کو بہت بڑا سہارا
جاتا۔ ان کے ہندوستان چھوڑ دینے سے اُردو کو زبردست نقصان پہنچا۔ اس کے برخلاف پاکستان میں اُردو کی نمایاں خدمات
لیے وہ ذرائع میسر نہ آئے جو انھیں حیدرآباد میں اور حیدرآباد سے دلّی چلے آنے کے بعد بھی ریاستِ حیدرآباد سے حاصل رہے۔
۔ ایسے حالات میں ڈاکٹر زور واحد آدمی تھے جن کی شبانہ روز کوششوں نے دردمندوں کے دل میں از سرِ نو اُردو کی محبت
بیج بوئے۔ وہ ہندوستان میں اس کے لیے ایک مستقل فضا پیدا کی۔ یہ مرحوم کا وہ احسان ہے جس سے تاحینِ حیات کوئی
دو دوست سبکدوش نہیں ہو سکتا۔

ڈاکٹر مولوی عبدالحق مرحوم سے میرے خاندان کے مراسم کوئی نصف صدی سے زائد عرصہ تک رہے ہیں۔ پاکستان میں بھی
بائے اُردو سے تیرہ چودہ برس تک نیاز حاصل رہا۔ وہ عمر کی جس منزل میں تھے اور اس کے باوجود جیسی محنت کے عادی تھے
ن کی جھلک آج کے پُرجوش نوجوانوں میں بھی نظر نہیں آتی۔ میری طرح جن لوگوں نے انھیں قریب سے دیکھا ہے وہ جانتے ہیں کہ
ن کی آواز میں گونج کیوں باقی نہ رہی تھی۔ اور کن حالات کے تحت وہ "پاکستان میں اُردو کا المیہ" لکھنے پر مجبور ہوئے۔ یوں تو
ندوستان میں بھی اُردو کے بہت سے خدمت گزار ہیں جن کی فرداً فرداً خدمات ناقابلِ فراموش ہیں۔ لیکن ڈاکٹر زور کی ہمہ گیر
ساعیِ جمیلہ کو دیکھتے ہوئے کہا جا سکتا ہے کہ وہ ہندوستان میں تنہا بذاتِ خود اس عہد کے "عناصرِ خمسہ" ہیں۔ یا بہ دیگر الفاظ
وح العصر!

بہ یک وقت پڑھنا پڑھانا، لکھنا لکھانا، کئی اداروں کا انتظام سنبھالنا، علم و ادب کے مختلف شعبہ جات میں نئی راہیں نکالنا،
سائل، جرائد اور مجلات جاری کرنا، ایوانِ اُردو بنوانا، پرنسپل صدر شعبہ اور معتمد اعزازی کے فرائض بجا لانا، تحقیق و تنقید
لگے رہنا، تحقیق و تنقید میں لگائے رکھنا، شب و روز کام کرنا اور کام کرنا سکھانا، مخالفین کو دوست بنانا اور ان سے کام لینا،
م کا آدمی بنانا، اُردو زبان و ادب کی بے شمار گمنام شخصیتوں کو منظرِ عام پر لانا۔ بزرگوں کی عزت کرنا احباب کو ہمنوا بنانا اور چھوٹوں کا
حوصلہ بڑھانا۔ ہندوستان میں اُردو کا حق منوانا اور اُسے مقام دلوانا، صلح کل کو شعار بنانا اور ان ساری مصروفیات کے
لاوہ کبھی کبھی شعر کہہ لینا ـــــ کیا یہ تمام حقیقتیں ڈاکٹر زور کی عظمت کا ثبوت نہیں۔!

محمد اسحٰق ایوبی

ڈاکٹر زور اور مخطوطات کے تذکرے

اگر "ادارۂ ادبیات اردو" علم ادب اور تحقیق کا میخانہ ہے تو قبلہ ڈاکٹر زور کی حیثیت "پیر مغاں" درحقیقت ان کی ہمہ گیر شخصیت ایک "جینئس" تھی جو تنقید و تحقیق' افسانہ و ناول اور شعر و شاعری کے میدان ز جولانیٔ طبع کا مظاہرہ کرتی تھی۔ انھوں نے دورِ جوانی میں بزرگوں کی عقل و فہم' ذہانت و فطانت اور مردم شنا دکھائے اور بڑھاپے میں جوانوں کے سے جوش و ولولے' سرگرمی و کارگزاری اور تگ و دو کی بدولت شاندا انجام دیے۔ علم و عمل کی جولانگاہ میں ان کی کامیابیاں اپنے اندر تقلید' مثال اور سبق کے اہم پہلو رکھتی ہ دراصل بیش بہا خزانے ہیں جن سے موجودہ اور آنے والی نسلیں حسب استطاعت و مقدرت استفادہ کر سکیں

یوں تو ڈاکٹر زور نے علم و ادب کے شعبے میں ان گنت نمایاں کام انجام دیے ہیں۔ تاہم ادارۂ ادبیا قیام ان کی زندگی کا سب سے بڑا کارنامہ قرار دیا جا سکتا ہے۔ یہ ادارہ ان کے ایثار و قربانی' خلوص و بے کی جیتی جاگتی نشانی بھی ہے۔ اگرچہ ادارہ ۱۹۳۱ء میں وجود میں آ چکا تھا لیکن اس کے کتب خانے کی داغ بیل ۱۹۳۳ء میں پڑی۔ یہاں پانچ ہزار سے زائد مخطوطات اور تقریباً پچیس ہزار مطبوعات محفوظ ہیں۔ ان میں قلمی نسخے اور مطبوعہ کتابیں اردو ہی میں ہیں لیکن عربی' فارسی' ہندی' سندھی' پنجابی اور دیگر ہندوستانی ز نادر و نایاب تصنیفات و تالیفات بھی بھاری تعداد میں موجود ہیں۔ مخطوطات اور مطبوعات اکثر و بیشتر عطیے موصول ہوئے تھے اور یہ سلسلہ اب تک جاری ہے۔ مخطوطات کی توضیحی فہرستوں کی پانچ جلدیں اور مطبوعہ کتب' رسا کی تین جلدیں منظر عام پر آ چکی ہیں۔ قلمی کتابوں' بیاضوں اور رسالوں کے پانچوں تذکرے ڈاکٹر زور کی کاوشوں کا مطبوعات کی فہرستوں کی تدوین پروفیسر اکبر الدین صدیقی کی عرق ریزی کی مرہون منت ہے۔

فی الحال ہم یہاں صرف مخطوطات کے تذکروں سے بحث کریں گے۔ محض تحقیق و تدقیق کا کام اتنا صبر آزما' جان لیوا نہیں ہے' جتنی کہ مخطوطات کی فہرستوں کی تدوین' تالیف اور ترتیب کی دردسری سے متعدد قلمی کتابو تصنیف' سالِ کتابت اور نام کاتب نہیں ہوتا۔ بہت سے قلمی نسخے ناقص ہیں اور کئی مطبوعات مشکوک۔ علا ادیبوں' شاعروں اور دیگر مصنفین کے نام' حالات زندگی اور کارناموں کا علم کسی کو نہیں۔ ان تمام مشکلات پر بڑی جگر کاوی' عرق ریزی اور چھان بین کرنی پڑتی ہے۔ یہ کام جتنا خشک' غیر دلچسپ اور کٹھن ہے وہ اصل م اہمیت' افادیت اور قدر و قیمت کا حامل بھی ہے۔

ڈاکٹر زور نے قدیم دکھنی ادبیات' شعر و شاعری اور علوم و فنون کے دفینے ڈھونڈ ڈھونڈ کر نکالے اور اپ

کوششوں سے اردو زبان و ادب کو نئے نئے خزانوں سے مالا مال کر دیا ہے۔ تاہم ادارے کے مخطوطات میں جنوبی ہند اور شمالی ہند دونوں علاقوں کی کتابیں شامل ہیں۔

اب تک ادارۂ ادبیات اردو نے مخطوطات کے تذکروں کی پانچ جلدیں شائع کی ہیں جو ڈاکٹر زور کے جوشِ عمل شغفِ علم اور زورِ قلم کی منہ بولتی تصویریں ہیں۔

ایں سعادت بزورِ بازو نیست

ہم ذیل میں ان تذکروں کی امتیازی خصوصیات کا سرسری جائزہ لیں گے تاکہ جو قارئین ان غیر فانی کارناموں سے کماحقہ واقف نہیں ہیں وہ ان کے بارے میں تھوڑی بہت آگاہی حاصل کر سکیں:۔

ادارۂ ادبیات اردو کے مخطوطات کے تذکرہ کی پہلی جلد ۱۹۴۳ء میں چھپی تھی۔ اس جلد میں ۲۷۵ مخطوطات کا تفصیلی ذکر ہے۔ ان میں ۷۵ کتابیں ایسی ہیں جو قطعی نادر ہیں یعنی وہ کسی اور کتب خانے میں موجود نہیں ہیں۔ تقریباً ۵ مخطوطے ایسے ہیں جنھیں مصنفین نے اپنے ہاتھ سے لکھا ہے یا ان پر ان کے دستخط پائے جاتے ہیں۔ ان میں سے تقریباً نصف قلمی نسخے ایسے ہیں جو اب تک زیورِ طبع سے آراستہ نہیں ہوئے ہیں۔ مخطوطات صرف جنوبی ہندوستان کی تصنیفات و تالیفات پر مشتمل نہیں بلکہ لاہور، دلی، آگرہ، لکھنؤ، رام پور، بریلی، قنوج اور کلکتہ جیسے دور دراز مقامات کے معروف و غیر معروف اردو شاعروں اور ادیبوں کی کاوشیں بھی ان میں شامل ہیں۔ ان میں سے بعض کتابوں کو یہ شرف حاصل ہے کہ وہ فرمانرواؤں مثلاً محمد قلی قطب شاہ، والیٔ گولکنڈہ، علی عادل شاہ والیٔ بیجاپور، عبداللہ قطب شاہ، والیٔ گولکنڈہ، واجد علی شاہ والیٔ لکھنؤ اور نواب یوسف علی خاں والیٔ رام پور کے رشحاتِ قلم کا نتیجہ ہیں۔

اس جلد میں ۱۴۲۰ء سے ۱۹۵۰ء کے درمیانی دور یعنی لگ بھگ پانچ سو سال کی کتابوں کا حال قلم بند کیا گیا ہے۔

جلد اول میں ذیل کی فہرستیں بھی شامل ہیں:۔

۱۔ مخطوطات کی فہرست بہ لحاظ زمانہ تصنیف۔

۲۔ قلمی کتابوں کے عطیہ دہندگان کی فہرست۔

۳۔ اشخاص، کتب اور مقامات کے ناموں کا اشاریہ۔

دوسری جلد ۱۹۵۱ء میں طبع ہوئی۔ اس جلد میں اردو اور فارسی کی ایسی ۴۴ کتابیں بھی شامل ہیں جن کے مصنف و مولف ہندو ہیں۔ اس کے علاوہ ہندو کاتبوں کے ۲۳ قلمی نسخے، ہندوؤں کی فرمائش پر لکھی ہوئی ۱۰ کتابیں۔ سنسکرت اور قدیم ہندی تصنیفات کے ۴ ترجمے اور ہندو اربابِ علم کی ملک یا ان کے زیرِ مطالعہ رہنے والی ۵ کتب بھی شامل ہیں۔ جن مصنفین کے چار یا چار سے زائد مخطوطوں کا ذکر جلد دوم میں ہے ان کی تعداد ۹ ہے۔

دوسری جلد میں ۸۴ عربی نسخوں، ۲۵۰ فارسی کتابوں، ۲۰۱ اردو مخطوطوں اور ۵ ہندی قلمی کتب کا جائزہ لیا گیا ہے۔ اس طرح کل ۵۴۰ مخطوطے اس میں شامل ہیں۔ اصل میں ادارے نے ابتدا میں زیادہ تر اردو مخطوطات کو جمع اور محفوظ کرنے کا بیڑا اٹھایا تھا۔ لیکن اس سلسلے میں بعض عربی و فارسی وغیرہ کی قلمی کتابیں بھی ہاتھ لگ گئیں جو تحقیقی و تقابلی کام کرنے والوں کے لئے نہایت ضروری تھیں۔

اس جلد میں فہرست مخطوطات بہ لحاظ موضوع اور اشاریہ شامل ہیں۔

تیسری جلد جون ۱۹۵۰ء میں شائع ہوئی تھی۔ اس میں ۵۰۰ کے قریب قلمی کتابوں کا ذکر ہے۔ اس کی اشاعت سے اردو ادب و شاعری کے بارے میں بعض نئی معلومات حاصل ہوئی ہیں جن کا اجمال نیچے درج ہے :—

جلد سوم میں متعدد ایسے شاعروں کے مجموعوں کی تفصیلات دی گئی ہیں جن کے کلام تو کجا خود ان کے ناموں سے اردو دنیا اس سے پہلے واقف نہ تھی۔ بعض شاعروں کے تخلص تو تذکروں میں ملتے تھے لیکن ان کے کلام کے بارے میں اردو دنیا ناواقف تھی۔ چنانچہ ان کا کلام ادارے میں محفوظ ہو گیا ہے۔ ان کا ذکر بھی تیسری جلد میں شائع کیا گیا ہے۔ چند مشہور اساتذۂ سخن کی نئی کتابوں کے قلمی نسخوں کا حال اس جلد میں درج ہے۔ قدیم اردو نثر کی ایسی کتابوں کا تذکرہ بھی اس جلد میں ملے گا جن کے باعث اردو نثر کی تاریخ میں اضافہ ہوا ہے۔ جلد سوم میں آٹھ کتابیں شامل ہیں جن کے نسخے ہندوستان کے اور کسی کتب خانے میں اب تک نہیں ملے ہیں۔ تاہم وہ صرف یورپ کے کتب خانوں میں موجود ہیں۔ تیسری جلد میں کچھ نادر تذکرے شامل ہیں۔ ساتھ ہی ساتھ اس میں مشاہیر کی کتابیں ہیں جن پر دوسرے شاعروں یا ادیبوں نے اپنے قلم سے تنقیدی اور تحقیقی حاشیے لکھے ہیں۔ بعض مخطوطات ہماری علمی و ثقافتی تاریخ پر روشنی ڈالتے ہیں۔ ان کا ذکر بھی اسی جلد میں ملے گا۔ اس کے علاوہ جلد اول میں جن قلمی نسخوں کا ذکر ہوا تھا ان میں سے بعض کے بارے میں نئی معلومات بھی تیسری جلد میں دی گئی ہیں۔

چوتھی جلد ۱۹۵۸ء میں چھپی تھی۔ اس میں صرف دو سو قلمی نسخوں کی تفصیل درج کی گئی ہے۔ اس جلد کی خصوصیت یہ ہے کہ اس میں چاروں جلدوں کی اجمالی فہرست دے دی گئی ہے۔ علاوہ بریں جلد چہارم میں فہرست معطیین، فہرست مخطوطات بہ لحاظ موضوع اور اشاریہ بھی شامل ہیں۔

پانچویں جلد ۱۹۵۹ء میں زیور طبع سے آراستہ ہوئی اور اس میں ۲۵۰ مخطوطات سے بحث کی گئی ہے۔ پانچ جلدوں میں مجموعی طور پر ۱۱۵۰ مخطوطوں کے بارے میں تفصیلات منظر عام پر آ گئی ہیں۔

اس میں بھی ذیل کی فہرستیں دی گئی ہیں :—

۱۔ کتابوں کے عطیہ دہندگان کے نام ۲۔ پانچوں جلدوں کی اجمالی فہرست

۳۔ پانچویں جلد کی فہرست بہ لحاظ موضوع ۴۔ اشاریہ

تعجب ہوتا ہے کہ قبلہ ڈاکٹر زور جیسا مجلسی، ملنسار اور ہمدرد و خلائق شخص ادبی تصانیف اور روزمرہ کی گوناگوں مصروفیات کے ساتھ ساتھ قلمی کتابوں کی پانچ فہرستیں مدون کرنے کا وقت کیونکر نکال سکتا تھا۔ اصل میں وہ راتوں دیر گئے یہ مخطوطات کو چھانٹتے، الگ کرتے اور ان کا مطالعہ فرماتے۔ پھر ان کی تصنیف کے دور، اسلوب بیان اور طرز کتابت کی بنیاد پر نوٹ لکھتے جو اپنی جگہ جامع اور مکمل ہوتے۔ بعض اسکالر تو ڈاکٹر زور کے توضیحی نوٹوں ہی کو حرف آخر سمجھتے ہیں خاص طور پر انھیں اردو کے دکھنی دور کی انتھارٹی مانا جاتا ہے۔ راقم الحروف نے اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے کہ وہ مخطوطوں کی چھان بین اور کھنگالنے کا کام کس طرح انجام دیتے تھے۔ سینکڑوں سال پرانی کتابوں کی گرد خطرناک جراثیم اور ناگوار بو کسی بھی شخص کو ان سے متنفر کر سکتی تھی۔ لیکن ڈاکٹر موصوف ان "ہیناروں"

یت کو اچھی طرح جانتے تھے۔ یہ زیادہ تر ان ہی کی کوششوں کا نتیجہ ہے کہ اردو ادب میں جنوبی ہند کی ناقابل فراموش خدمات تراف سبھوں کو کرنا پڑا۔

"ادارۂ ادبیات اردو" میں اب بھی چار ہزار سے زائد ایسے مخطوطات موجود ہیں جن کی وضاحتی فہرست مرتب اور شائع ہے۔ مزید برآں یہ بھی معلوم ہوا ہے کہ جلد اول نایاب ہے۔ توقع ہے کہ ارباب ادارہ.... یہ کام جلد سے جلد انجام دینگے ردو زبان و ادب کے پرستار اُن سے کما حقہ فیض یاب ہو سکیں۔ باقی ماندہ مخطوطات کی توضیحی فہرستوں کی ترتیب، تدوین و ت کا کام نہ صرف ڈاکٹر زور کی یادگار گردانا جائے گا بلکہ وہ ادارے کے بنیادی کاموں میں سے ایک اہم کام ہے در حقیقت ایک مہم ہے جسے تحریک کے طور پر کسی کمیٹی کی تشکیل کے ذریعے آگے بڑھایا جا سکتا ہے۔

ہزاروں سال نرگس اپنی بے نوری پہ روتی ہے
بڑی مشکل سے ہوتا ہے چمن میں دیدہ ور پیدا

▲ کتنی دکھ بھری خبر ہے کہ ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور بھی ہم سے ہمیشہ کے لیے بچھڑ گئے۔ ڈاکٹر صاحب ایک فرد نہیں ایک انجمن تھے۔ ایسے شخص صدیوں کے بعد پیدا ہوا کرتے ہیں۔ اردو والوں کی یہ بدقسمتی ہے کہ ایسے میر کارواں ان کی محفل سے اٹھتے جاتے ہیں۔ وہ دکن میں ایوان اردو کا سب سے روشن مینار تھے جو آج سرنگوں ہے۔ وہ ہمیشہ اردو کی بقا اور ترقی کے لیے کوشاں رہے ڈاکٹر صاحب سب رس کے مدیر اعلیٰ اور ادارۂ ادبیات اردو کے روح رواں تھے۔ ساہتیہ اکیڈیمی کے شعبۂ اردو کے مشیر اور ماہنامہ آجکل کی مجلس ادارت میں سرفہرست تھے۔ ڈاکٹر صاحب نے بے شمار علمی، ادبی، شعری اور تحقیقاتی کتابیں پیش کیں، جو اردو ادب میں ایک قیمتی اضافہ ہیں۔

ڈاکٹر صاحب علم و ادب کے علاوہ اصول پرست، بلند اخلاق، خلوص اور شرافت کے علمبردار حرکت عمل کے پیکر اور مشرقی وضع قطع اور تہذیب کا اعلیٰ نمونہ تھے۔ آج کل وہ کشمیر یونیورسٹی کے شعبۂ اردو کے صدر تھے جب کہ ۲۴ ستمبر کو حرکت قلب بند ہو جانے سے ان کی موت واقع ہوئی اور یہ آفتاب دکن ہمیشہ کے لیے کشمیر کی پہاڑیوں میں غروب ہو گیا۔

(دو ماہی نگارش امرتسر، شمارہ ۱۱، ۱۲۔ ۱۹۶۲ء)

حکیم یوسف حسین خان

زورؔ مرحوم کی شاعری

(ایک سرسری تبصرہ)

دوسرے ممالک میں شاعر بچہ یہ ہوا کرتا ہے ہندوستان میں کسی کا شاعر نہ ہونا تعجب کی بات ہے اس لحاظ سے اور لحاظ سے بھی کہ زور مرحوم حضرت زعمؔ کے فرزند تھے۔ ہم زور کو موروثی شاعر کہہ سکتے ہیں۔ موروثی شاعر ضروری نہیں کہ شعر زور مرحوم نے نہ صرف جوانی میں بلکہ اواخر عمر میں بھی شعر کہے جس سے ہم یہ نتیجہ اخذ کرسکتے ہیں کہ ان کی طبیعت بھی شعر گوئی کی طرف مائل تھی لیکن موروثی اور فطری شاعر ہونے سے بچ کر بھی میں سمجھتا ہوں کہ انھوں نے اس معاملہ اکتساب بھی کیا اور باقاعدہ اس فن کو سیکھا۔ ان میں احساس اور شعریت پہلے ہی سے موجود تھی، ماحول بھی مشق سخن راس ملا۔ کثرت مطالعہ اور بکثرت ملنے جلنے نے انھیں تجربہ گہرائی اور وسعت نظری بھی بخشی۔ ان تمام لوازم کی مو میں ان کا ایک ہی اثر ہوسکتا تھا کہ زور کو یہ حالات ایک ایسا شاعر بنائیں جس کا نام بقائے دوام کی فہرست میں درج ہوجائے۔ ہونا بھی ایسا ہی تھا مگر اس کیمیاگری میں صرف ایک آنچ کی کسر رہ گئی۔ زور مرحوم نے مشق سخن میں نہیں کی۔ ان کی شاعری فرصت کا مشغلہ بنی رہی اور اس طرح سید محی الدین قادری زورؔ شاعری کی حیثیت سے تو آنے سے رہ گئے۔ لیکن ابنائے زمانہ نے اس کی تلافی اس طرح سے کردی کہ ان کے تخلص کو ایوان شاعری کے ستونوں پر کر تو کردیا لیکن اتنا شاعر کی حیثیت سے نہیں جتنا کہ شاعر گر کی حیثیت سے اور ایک ایسے سخن پرور اور سخن شناس کے جو اگرچہ اچھے شعر خود بھی کہہ سکتا تھا مگر ترجیح اس کو دیتا تھا کہ اس معاملہ میں ساکن پانیوں میں کنکر پھینک کر خود جائے اور لطف اندوز ہوتا رہے کہ بڑی چھوٹی ہر طرح کی لہریں اٹھ رہی ہیں اور کنارے چھو رہی ہیں۔ ان کی سخن فہم دوسروں کا کلام نکھر جایا کرتا تھا چنانچہ شعر و ادب کی محفل میں اس قسم کے انسان کو شعراء سے الگ یا شعار سے متعلق نہیں کیا جاتا۔ زور بھی شاعر کم روح رواں زیادہ تھے۔

مگر زور کی یہ کم شاعری بھی ایسی کم کم تو نہ تھی کہ اس کو بالکل ہی نظر انداز کردیا جائے۔ بعض شعرا پرگو ہوا کرتے ہیں جب ان کے کلام کو پورا پڑھ لیا جائے تو پتہ چلتا ہے کہ تمام دیوان میں گنتی کے چند ہی شعر ہیں جن کی بناء پر شاذ و نادر حیثیت شعری تسلیم ہوئی ہو۔ ایسے بھی شاعر گزرے ہیں جن کا صرف ایک شعر زندہ ہے۔ زور مرحوم کا دوسرے لحاظ سے ذہنوں میں جو مرتبہ اور مقام بن چکا ہے اگر ہم اُسے الگ بھی کردیں تو ان کے کلام کا بیشتر حصہ ایسا ملیگا جو اس قدر قا ہے کہ دنیائے شعر میں ان کو نمایاں اور ممتاز جگہ دی جاسکے۔ یہ اور بات ہے کہ عرصۂ شعر گوئی کی مناسبت سے مرحو کم عمر ثابت ہوں اور ان کی اس کم عمری کو دیکھتے ہوئے یہ کہا جائے کہ بزرگوں سے پہلے انھیں سماعت کرلو!

مرحوم کی شاعری دو واضح ادوار میں تقسیم کی جاسکتی ہے ایک دور عثمانیہ جب کہ وہ جامعہ عثمانیہ میں زیر تعلیم تھے۔ اور دوسرا دور ری جب کہ وہ جامعہ کشمیر میں اردو اور فارسی کے معلم اولی تھے۔ ان دونوں ادوار کے بیچ میں ان کی شاعری کا تیسرا یعنی نی دور سرے سے مفقود ہی ہے۔ یہی دور وہ دور ہوا کرتا ہے جس کو دیکھ کر دنیا یہ فیصلہ کیا کرتی ہے کہ شعراء کی صف میں ناعر کو کونسا مقام دیا جانا چاہئے اور اس ترتیب میں اس کی حقیقی جگہ کونسی ہے۔

ہوا یہ کہ زور پر جب یہ دور آنا چاہئے تھا اس وقت وہ عارضی طور پر شاعری ترک کر چکے تھے اور انھوں نے ایک دوسرا ب العین تلاش کر لیا تھا جو ان کے فطری لگاؤ سے بہت مناسبت رکھتا تھا۔ اس میں وہ اتنا منہمک ہو چکے تھے کہ شعر گوئی افطری چیز بھی فراموش ہو کر رہ گئی۔ اس سے ہمیں یہ بھی اندازہ ہوتا ہے کہ اظہار ذات کا یہ وسیلہ یعنی شاعری خود شاعر کی نایں بھی بنیادی نہیں ثانوی درجہ رکھتی تھی؛ اس سے بہتر اور عمدہ وسیلہ جونہی ان کے ہاتھ آیا کمتر وسیلہ کو انھوں نے ترک میں ادب کے مختلف اصناف کا تقابل نہیں کر رہا ہوں نہ میرا مطلب یہ ہے کہ شعری ادب درجہ میں کم ہے اور نثری یا تاریخی ادب زیادہ ہوا کرتا ہے۔ میرے پیش نظر اس وقت صرف شاعر کی شخصیت اور شخصیت کے اظہار کہ وہ پہلے ذ اپنی زندگی میں ہر ادیب یا شاعر تسکین ذات کے لئے اختیار کیا کرتا ہے اور جس کا اظہار بہرکیف روکا نہیں جاسکتا زم ہوا کرتا ہے۔ اس معاملہ میں زور صاحب نے بھی اولیں حیثیت ابتداء میں شاعری ہی کو دی۔ عمر کے درمیانی حصہ میں ری ادب کے ذریعہ اظہار شخصیت کرتے رہے۔ اس کے بعد دوبارہ ان پر ایک دور ایسا آیا جب انھوں نے متروک اور رفتہ ذریعہ (اُن کے لحاظ سے!) ایک دفعہ پھر استعمال کرنے کے لئے چُنا۔

میں اس نقطۂ نظر کی اور زیادہ وضاحت کردوں۔ اظہار ذات شعور سے بھی پہلے ہوتا ہے (جیسے بچہ کا مچلنا جب بتانا چاہتا ہے کہ میں بھی ایک اکائی ہوں اور مجھے بھی حرکت اور ہاتھ پاؤں مارنے کا اتنا ہی اختیار ملا ہے جتنا کہ سرپرست کو) لیکن حقیقی اظہار ذات شعور کے بعد ہی ہوا کرتا ہے اور پھر یہ ہماری زندگی کا جزو لاینفک بن کر ہمارے اکا محرک اصلی بن جایا کرتا ہے۔ اب ہم اپنی اپنی قدروں کے مطابق اس کی تسکین کے لئے کوئی نہ کوئی وسیلہ چن لیا کرتے ہیں ںکے مطابق زندگی گزارنے لگتے ہیں۔ قائد اسی طرح بنتے ہیں۔ آدمی مقتدی اسی طور پر ہو جایا کرتا ہے۔ ویر چکر اور پرائز حاصل کرنے کا بھی محرک یہی جذبہ ہے۔ دار پر بھی اسی کی بدولت آدمی چڑھ جایا کرتا ہے۔ وہ انسان جو خود کو عمر بے لنگر کشتی سمجھا کرتا ہے وہ بھی اسی لئے ہوتا ہے کہ یا تو اظہار ذات کا پتوار ہاتھوں سے کہیں چھوٹ چکا ہوتا ہے اور یا ری کی عمر میں لایقینی کو اتنا قبول کر چکا ہوتا ہے کہ جب اظہار ذات کا ذریعہ انتخاب کرنے کی نوبت آتی ہے تو کوئی یا معین ذریعہ مستقل طور پر گرفت ہی نہیں کرنے پاتا۔

اس پس منظر کے ساتھ اگر ہم زور مرحوم کے کلام کو دیکھیں جو ابھی میں نے بتایا ہے تو ہمیں اندازہ ہو جائے گا کہ ان کی ملکے دونوں دور بیشتر اور اغلباً عبوری نوعیت کے تھے۔ پہلا دور جو جامعہ کی طالب علمی کے زمانہ کا ہے اس وقت وہ یم ختم کر رہے تھے اور اپنے لئے کسی مستقبل کی فکر میں تھے۔ ممکن ہے کہ آئندہ کا مسلک اور اس کی تکمیل کے سارے امکانا نا بلی چکے ہوں اور ممکن ہے کچھ ابھی ادھورے ہوں لیکن ان کو عملی جامہ ابھی انھوں نے نہیں پہنایا تھا۔ ایسے مرحلہ پر ن کا ذہن کتنی کشمکش اور اضطراب میں مبتلا نہیں ہوا کرتا اس کو روکے رکھنا بھی بیحد اہم ہوا کرتا ہے چنانچہ زور پر بھی اسی

کا وقت آیا تھا اور یہ وہ وقت تھا جب انھوں نے شعر گوئی میں پناہ لی پھر جیسے جیسے ان کے قدموں کے نیچے وہ پگڈنڈی آتی گئی جیسے جیسے یہ احساس تقویت پاتا گیا کہ یہی جادہ ہے جو اُن کو اُن کی معینہ منزل تک لے جائے گا ویسے ویسے ان کی توانیاں ذہنی اُپج دوسرے نقطوں پر مرکوز ہوتی چلی گئی۔ راہ ناہموار تھی اسے آسان بنانا تھا اور یہ کام تمام تر توجہ کو ایک ہی نقطہ پر رکھنے کا متقاضی تھا۔ زور بھی شاعری سے بے نیاز ہونے لگے یہاں سے اس درمیانی دور کا خلا شروع ہوا جسے اگر پُر کرتے تو زور مرحوم بڑے شاعر کہلاتے اور جسے خالی رکھا گیا تو وہ دکن کے ناخدائے اردو ہو گئے۔ بہرحال انھوں نے ایک خانہ اور ایک کو بالکل ہی خالی کر دیا اور پھر وہ وقت بھی آیا کہ دوسروں کو اکثر سرپرستی کر کے چھپوا کر شہرت دلا کر انھیں اپنے جذبے یعنی شعر گوئی کی تسکین کرنی پڑی مگر اس عرصہ میں خود انھوں نے ایک مصرعہ بھی نہیں کہا۔

ان کی شاعری کا دوسرا دور ان کے انتقال سے عین پہلے کا ہے۔ یہ اس زمانے سے تعلق رکھتا ہے جبکہ انھیں ترک وطن اور دوسرے ہی ایک گوشہ عافیت میں جا کر رہائش اختیار کرنی پڑی۔ اس وقت تک لوگ بھول بھی چکے تھے کہ زور صاحب کہتے ہیں۔ ایک اخبار نویس سے کسی نے پوچھا تھا کہ دکن کے کسی ایسے مشہور شاعر کا نام لو جس کا تخلص ہو مگر شعر نہ کہتا ہو اس نے برجستہ جواب دیا تھا "زور" یہ واقعہ بھی تھا۔ یہ تین حروف روایتاً ان کے نام کے ساتھ زمانہ طالب علمی سے چلے آئے تھے پہنچنے سے پہلے تک عملاً ان کا تخلص کوئی جواز نہ تھا۔ اس زمانہ کی حد تک ان کو صرف محی الدین قادری سمجھا جاتا تو بھی ٹھیک یکایک ایک معجزہ ظہور میں آیا۔ کشمیر سے ان کا تازہ کلام سنائی دینے لگا!

ان کے قریبی احباب کے متعلق تو میں کچھ نہیں کہتا باقی دنیا کو یہ یاد بھی نہ تھا کہ مرحوم شاعر بھی ہیں۔ ان کی دو ایک جیسے ہی چھپیں تعریف اور توصیف سے زیادہ ان پر حیرت اور تعجب کا اظہار کیا گیا' اس ضمن میں تذکرے اور تبصرے راقم بھی انھیں لوگوں میں سے ایک تھا جو کوئی رائے قائم نہ کر سکے' میں ان کا مداح ضرور تھا مگر جو زور میرے ذہن میں تھا زور سے بالکل مختلف تھا جو کشمیر سے مجھے چونکا رہا تھا اور کافی دنوں تک میں یہ تصفیہ نہ کر سکا کہ ہر دو کو ایک دوسرے مطابق کیا جائے۔ اس تعلق سے جو فیصلے صادر ہوئے وہ اب میں غور کرتا ہوں تو بڑی حد تک سطحی تھے مگر بات ہی ایسی تھی کہ تصفیہ کہرا ہوتا تو کیسے ہوتا عام خیال یہ تھا کہ ضرور یہ کشمیر کی کارفرمائی ہے۔ کشمیر اور رومان ہمارے ذہنوں میں مترادف چلے آئے ہیں۔ زور صاحب کا نیا جوہر دیکھ کر بہت کم لوگوں نے زحمت کی کہ اصلی سبب دریافت کریں۔ جنت نظیر کو زور کی اس تبدیلی کی اصلی وجہ گردانا شروع کر دیا حالانکہ وہ کافی سیاحت کر چکے تھے' یورپ دیکھا تھا ایک سے اور کیف پرور مقام پر ہو آئے تھے۔ کشمیر ان کے لئے نہ اجنبی تھا نہ غیر معمولی' نہ ان کے لئے کشمیر کوئی 'الف لیلہ' کا ملک تھا حقیقت یہ تھی روح کی گہرائیوں میں سوئی ہوئی کو تیا دبی ایسی چونک جائے کہ فکر کے چشمے پھوٹ پڑیں' معانی کا ایک سیلاب آجائے' ایک دو نہیں مسلسل دس پندرہ غزلیں پے در پے اس زمانہ میں زور صاحب نے کہہ ڈالیں۔ یہی سمجھا کہ یہ غزلیں کشمیر نے زور سے کہلوائی ہیں۔ شاید ہی کسی نے اس کا خیال کیا ہو کہ زور اتنے خیالی گھوڑے دوڑانے میں سے نہیں تھے جتنے کہ عملی آدمی تھے۔ عملی آدمی کے خیال کی جمیز پھولوں کے رنگ یا آبشاروں کی گنگناہٹ کا ظاہر جزو نہیں ہوا کرتی ہے ان کی پہنائیوں میں پوشیدہ ہوا کرتی ہے۔

زور کے اس دوسرے دور کی شاعری کو شروع کرانے میں ممکن ہے کہ نظاروں کو تھوڑا بہت دخل ضرور رہا؛

نام کو بہ نظر غائر دیکھنے کے بعد پتہ چلتا ہے کہ حسن کشمیر یا خنکی شالامار یا اس خطہ کی زعفران زار یت زور کی اس بے ساختہ تبدیلی کے تمام تر ذمہ دار تو ہرگز ہرگز نہیں تھے ۔ اس دبی ہوئی چنگاری کو شعلہ جس نے بنایا وہ تو وہی جس ذہنی تھا وہی ایک کیفیت اسیری تھی جس نے اس دور کشمیر سے پہلے اور بہت پہلے جوانی کے دنوں میں بھی اس وقت جب کہ وہ محض ایک طالب علم ہی تھے زور سے شعر کہلوائے تھے اور ان کو با تخلص شاعر بنا دیا تھا ۔ وہ کشمیر پہنچے کیوں ؟ حیدرآباد چھوٹا تو یہاں ان کو کس کس محبوب کو خیرباد نہ کہنا پڑا ؟ کشمیر پہنچتے ہی کیا مستقبل درخشاں ’خوابناک اور تہوار تھا ؟ ان سوالوں کا جواب جب لیجئے تو دور مرحوم کے اس دوسرے دور کی شاعری کا حقیقی محرک آپ خود سمجھ جائیں گے ۔ اصل میں ایک بار پھر زور ذہنی کش مکش میں پھنس گئے تھے ‘ ایک بار پھر مستقبل دھندلا گیا تھا ‘ ایک بار پھر وہ دوراہے پر کھڑے کر دئے گئے تھے ۔ دوراہے پر فیصلے ضروری ہوا کرتے ہیں فیصلوں کا چھا ہونا اور صحیح ہونا ضروری ہوا کرتا ہے ‘ افراتفری کو دور کرنے کی اہمیت ہوا کرتی ہے ‘ اسباب کو یکجا کرنا پڑتا ہے ‘ توانائیوں کو سمیٹ کر اور ارادہ کو مضبوط کر کے ٹھیک وقت پر استعمال کرنے کی سعی تامہ فراہم کی جاتی ہے ۔ یہ کٹھن وقت در عبور و مرور کا یہ غیر یقینی وقفہ آخر کیونکر گزارا جائے ‘ یہ تھی وہ مہیب حقیقت جو دیو کی طرح ان کے سامنے کھڑی تھی اور جس سے ان کو نمٹنا تھا ۔ زور نے پھر دوبارہ وہی کیا جو پہلے بھی ایک مرتبہ کر چکے تھے ۔ انھوں نے شاعری کا رنگین آنچل اپنی نظروں کے آگے پھیلا لیا ۔ کوئی آخری تصفیہ پر پہنچنے تک شطرنج سے دل بہلاتا ہے ‘ کوئی کرکٹ کا میچ دیکھنے چلا جاتا ہے ‘ زور نے غزلیں کہہ ڈالیں !

اگر مرحوم کی اس دور کی شعر گوئی محض ایک رومان انگیز فضا کا شاخسانہ ہوتی یا اس کی محرک صرف جذباتیت ہوتی تو سیاحت فرانس کے زمانہ میں بھی ایک آدھ غزل تو صادر ہوتی تھی ‘ لندن میں ٹیمز کے کنارے کچھ نہ کچھ وہ فرما ہی دیتے تھے پھر اس اثر کے تحت کہے ہوئے اشعار میں بھی تو اسی رنگ کو چھلکنا چاہئے تھا ۔ ان میں رومانی مٹھاس ہونی چاہئے تھی ۔ اس قسم کا شعر ان کو نہیں کہنا چاہئے تھا ؎

ہنوز ایسے بھی انسان روزگار میں ہیں   کبھی سحر کے کبھی شب کے انتظار میں ہیں

نہ ان کو یہ کہنا چاہئے تھا ؎

ہم اپنی گرمی سوز دروں سے چیخ اٹھے

شاداب وادیوں اور حسین و دلفریب ماحول میں انسان چیخا نہیں کرتا ‘ لہکا کرتا ہے ‘ گایا کرتا ہے ۔ چیخ کا قافیہ بھی ایسی حالت میں انسان کے ذہن میں نہیں آتا اور یہاں یہ کیفیت تھی کہ زور ایک بار نہیں کئی بار چیخ چیخ اٹھے ہیں ۔

کشمیر نے ہو سکتا ہے کہ زور سے یہ شعر کہلوایا ؎

یہ ہجوم گل و لالہ یہ رنگ و بو ‘ جوش موج و خروش لب آب جو
مرے ہاتھوں ایسے سنورتے گئے نازش ارض و فخر سماء بن گئے

لیکن اسی غزل کا مطلع بھی ذرا ملاحظہ فرما لیجئے اس میں جنت کی کارفرمائی تو آپ کو نہیں ملے گی ۔ ہاں جہنم کی حدت اور جھلسے ہوئے احساس کی چراند آپ کو ضرور آ جائے گی اور یہ اسی ادھر والے شعر کی غزل کا مطلع ہے ۔ ہجوم گل و لالہ بعد میں سنورے ہیں ‘ قلم اٹھتے ہی نہ رنگ بنا نہ آب جو سے نغمہ نکلا ‘ پہلے تو انقلاب کی آنی ذہن میں اتری اور اس کے بعد بگڑتے بگڑتے

ایک قابل احترام ہستی کو بھی بگاڑ گئی فرماتے ہیں ؎

انقلاب زمانہ ہے شاید یہی دیکھئے دیکھتے کیا سے کیا بن گئے
ہم جو بن بن کے بگڑے تو بندے بنے وہ بگڑتے بگڑتے خدا بن گئے

زور مرحوم کے قیام کشمیر کے دوران میں کہے ہوئے حسب ذیل اشعار بھی مجھے ایسے شخص کے اشعار معلوم نہیں ہوتے جو دنیا کی سیاحت کر چکنے کے باوجود صرف کشمیر کی خوبصورتی سے متاثر ہو کر شعر و سخن کی روایاتی رومانی فضا میں ہو اور جس نے بے مقصد طریقہ پر محض حسن و عشق اور وصل و ہجوری کے گیت تخلیق کر ڈالے ہوں ؎

حرص و ہوس کو گرمئ بازار چاہیئے — خستہ دلوں کو درد کے ماروں کا شوق ہے
انسانیت کے رستے ہوئے زخم چھوڑ کر — دانشوروں کو چاند ستاروں کا شوق ہے

مرحوم نے دور عثمانیہ میں جو شعر کہے ان میں ان کی طبیعت کا رجحان زیادہ تر داخلی ہے۔ کہنے کا طریقہ بھی بڑا روایاتی ہے۔ ایک ذہین ہونہار اور ابھرتا ہوا شاعر جس پر مومن اور غالب کا رنگ ابھی پوری طرح چڑھا بھی نہ ہو ویسے ہی شعر کہہ سکتا ہے کالج کی زندگی کے زمانہ میں زور نے بھی اسی طرح کے شعر کہے۔ ان دنوں کی ۵ نظمیں اور ۳ غزلیں ہم تک پہنچی ہیں۔ ان سے اندازہ ہوتا ہے کہ زور کے تخیل میں اس وقت شب مہتاب، شب وصال محبوب، نگہہ ناز، دیدۂ گریاں وغیرہ قسم کی اصطلاحات موجود تھیں اور ان اصطلاحات کو وہ ان ہی کے معنوں میں استعمال بھی کیا کرتے تھے۔ طالب علمی کے اس دور میں زور کے کلام میں نہ تو ہمیں زیادہ بلندیاں ملتی ہیں اور نہ بہت اتھاہ گہرائیاں۔ کہتے وقت وہ ڈوبے ہوئے ہیں۔ البتہ کہے ہوئے اشعار کا جو طرز ہے وہ یہ ضرور کہتا ہے کہ زبان میں روانی اور سلاست دونوں ہیں اور خیال کا رخ ذہنی رومانیت سے استوار ہے۔ ان اشعار کو پڑھ کر ہم یہ اندازہ بھی بآسانی کرسکتے ہیں کہ ذوق سخن ہم نے مانا مگر اور کچھ پختگی پیدا ہوگئی تو یہی ذوق پھر اس سطح پر نہ رہے گا اس سے بہت اونچا ہو جائے گا۔ آثار ایک طرح حوصلہ افزا تھے اس وقت کے شعروں میں ایک طرح کا ولولہ بھی ہے جو ان کے اس کلام کو عمومیت سے ممتاز کرتا ہوا دکھائی دیتا ہے لیکن اس دور کے کلام کی سب سے بڑی خصوصیت اس کا اسلوب ہے۔ اس اسلوب سے صریحاً یہ وضاحت ہو جاتی ہے کہ ابھی تو بفضلہٖ ابتدا ہے، مشق جاری رہی تو سخنوری منجھ کر یقیناً چمک دے اٹھیگی اور آئندہ کبھی ضرور اس میں ایسی انفرادیت نمایاں ہو جائے گی جو منفرد کہی جا سکے اور ایک علامت فارقہ بن جائے۔ زور نے شعر کہنا چھوڑ دیا نہ چھوڑتے وضع خود تراشں جاتے اور وہ ان کے کلام کی انفرادیت ہو کر ان کو شعراء میں بھی الگ شناخت کرانے کا ذریعہ بنتی۔

اس دور کی نظموں سے ایک تعلق خاطر کی غمازی بھی ہوتی ہے۔ نظموں سے خصوصاً اس وابستگی کا پتہ چلتا ہے جو ان کو اپنی مادر علمی (جامعہ) سے پیدا ہو چکی تھی۔ "جامعہ عثمانیہ اور نونہالان دکن" والی نظم کسی طرح بھی رسمی نہیں کہلا سکتی۔ اس میں احساس جھلکتا ہی نہیں چھلکتا بھی ہے۔ اسی طرح "رہبر منزل کی جدائی" بھی دوسری نظموں سے جداسی معلوم ہوتی ہے۔ ان دونوں نظموں میں ایک ایسا تاثر ملتا ہے جو اس زمانہ کے لحاظ سے اور ان کی اس وقت کی عمر کے مدنظر قطعاً حیرت انگیز ہے۔ جذبات کا یہ دھارا بعد میں جا کر نثر گوئی میں تبدیل ہو گیا۔ تغزل اور موسیقیت "جہلم کی رقاصہ" اور "گولکنڈہ کے ہیرے" بن گئے۔ یونیورسٹی سے محبت اور دکن کی وطنیت سے والہانہ انس نے "سب رس" "نذر قلی قطب

"تذکرہ مخطوطات" کی شکل اختیار کرلی۔ زور کو یہ سب وسعتیں اگر نہ ملتیں یا وہ کسی اور سبب کی بنا پر محض شاعری ہی تے رہتے
ہوتے تو یہ ماننا پڑتا ہے کہ مادر وطن کی کوئی منقبت یا جامعہ کے متعلق کوئی مثنوی علم و دانش ضرور وجود میں آجاتی۔ آج
ایران اردو پر فخر کرتے ہیں اس صورت میں ہم ان کی کہی ہوئی منقبت یا مثنوی کو دکن کے نمائندہ شاعر کا شہ کار کہا کرتے اور
دنیا کے سامنے پیش کیا کرتے!

زور کے دور طالب علمی کے چند شہ پارے سن لیجئے پھر ہم آگے بڑھیں گے اور ان کے دوسرے دور کی شاعری کا اجمالاً [جائزہ] لینے کی کوشش کریں گے۔ وہ شعر یہ ہیں ؎

وہ بزم غیر وہ جھوٹے فسانے — انھیں یاد آئے گی میری وفا کیا؟
گنا کرتے ہو راتوں کو جو تارے — یہ آخر زور تم کو ہو گیا کیا؟

دل ہوس ہائے مجازی میں ہے چشم حسّاد — خوف ہے راز حقیقت کہیں افشا کر دے
عاشقی میں ہے مواخات کا رشتہ قائم — شمع ہر روز نہ کیوں خون کا دعویٰ کر دے

دل جب سے ہوا ہے خوگر غم، آزار میں لذت پاتا ہوں
گلبانگ مسرت دور رہے میں اس سے بہت گھبراتا ہوں
ہر روز ہزاروں زخم نئے اس زخمۂ دل پر کھاتا ہوں
افتاد سے ہوں مجبور مگر، کب چاہ سے میں باز آتا ہوں

اس کے ہر ذرہ کو رشک آفتاب اب دیکھئے
عظمت ملک دکن کو بے نقاب اب دیکھئے
ہو چکا منت کشی کا سدباب اب دیکھئے
دیکھئے ہاں دیکھئے، یہ انقلاب اب دیکھئے
داغ ہائے منت اغیار دھوتے جائیں گے
نونہالان دکن شاداب ہوتے جائیں گے

اوپر کا بند ان کی نظم "نونہالان دکن" کا آخری بند ہے۔ حب الوطنی کے باب میں تو مختصراً میں پہلے ہی عرض کرچکا ہوں
[بات] اس نظم سے ایک اور حقیقت بھی ہم پر عیاں ہوتی ہے۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ جامعہ کے زمانہ میں زور کی افتاد طبیع
غزل کے مقابلہ میں نظم گوئی کے لئے زیادہ موزوں رہی ہوگی۔ ان کی دوسری نظموں میں بھی غزلوں کے مقابلہ میں ہی [برجستہ] پن
[میں] پایا جاتا ہے اور غالباً اسی صنف سخن کے لئے ان کی طبیعت میں آمد بھی زیادہ ہی تھی۔ ہاں ذرا یہ تعجب کا مقام ہے کہ

دوسرے دور میں (ایام قیام کشمیر میں) انھوں نے جس قدر طبع آزمائی کی اُس کا بیشتر حصہ غزلوں پر مشتمل ہے۔ جو اسی دور کی کہی ہوئی ہیں اُن کو پڑھا جائے تو معاملہ برعکس نظر آتا ہے یعنی اب کی بار غزلوں میں آمد زیا نظموں میں مقابلتہً کم ہے ممکن ہے کہ اس کا سبب یہ ہو کہ نظم کو تسلسل اور کسی قدر طوالت درکار ہوا کرتی ہے ا کی دوسری جا ہما ہمی میں اتنا منہمک ہو چکے تھے کہ تسلسل اور طوالت کو برقراری دینا ان کی مصروفیات کی بنا پر قابل عمل نہیں رہا تھا۔ غزل تو ایک ایک مصرعہ کر کے کہی جا سکتی تھی، دو شعروں میں وقفہ بھی ہو سکتا تھا۔ دو ش بھی لکھے جا سکتے تھے۔ دوسرے کاموں سے جو لمحات بھی بچیں ان میں انسان کی فرصت کے لحاظ سے غزل کے اج ہیں نظم البتہ اس برتاؤ کی اجازت نہیں دیتی، اس کی یکسانیت کو شروع سے آخر تک تمام تر توجہ چاہیے زیادہ درکار ہوا کرتا ہے اس لئے دوسرے دور میں اس شاعر نے اغلباً غزل ہی کو فوقیت دی ہوگی۔ نظمیں ا لکھیں پھر بھی اس معاملہ میں ایک عجیب تضاد جو مجھے ملتا ہے وہ یہ ہے کہ غزلوں کا نہج کچھ کچھ نہیں بلکہ بہت ہے۔ ان میں حقائق نگاری ہے، مسایل ہیں، مسائل کے ساتھ شاعر کے برتاؤ میں معروضیت ہے چنانچہ اس کے زور کو بنیادی طور پر نظم کا شاعر ہی سمجھتا ہوں۔ مجبوری نے ان کو جو کچھ بنا دیا وہ تو مجبوری تھی لیکن ظاہری نوع حال پر کیوں اثر انداز ہونے دیا جائے۔

مرحوم کے پہلے دور کا کلام اگر غم جاناں تھا تو دوسرے دور کا کلام قطعی یقینی اور حتمی طور پر غم دوراں اور صرف اس دور کی ۱۵ غزلیں اور ایک غیر مقفیٰ نظم جو فارسی میں ہے حیات مابعد کے دامن میں آئی ہیں۔ پندرہ غز بڑا سرمایہ نہیں کہ اُن کو بہت زیادہ اہمیت دی جائے۔ نہ پندرہ غزلوں پر اکتفا کر کے ان کو بقائے دوام کی چاہیے۔ ۱۵ غزلیں اتنا بڑا عدد بھی نہیں جن کی بنا پر کسی شاعر کے حسن و قبح کا تصفیہ کیا جا سکے، اتنا سا مواد ناکافی لیکن یہ یاد رکھنا چاہیے کہ ٹوٹتے ہوئے تارے کی چنگاریاں تو بیشک نہیں گنی جاتیں لیکن یہ ہماری یاد پر نقش کہ ان اجزائے پریشاں نے روشنی کتنی دی تھی۔ زور مرحوم کی ان آخری پندرہ غزلوں میں تقریباً ۸۸ اشعار غیر مبالغہ تصور ہوگا کہ یہ ۸۸ اشعار "اشعار نہیں ہیں، دیوان ہیں۔ البتہ کسی تردید کے خوف کے بغیر اتنا ضرو اور ایسا کہنا غلط تو نہ ہوگا کہ ان ۸۸ شعروں میں سے بیشتر شعر ایسے ہیں جو فرداً فرداً اگر جانچے جائیں تو ا ایک ایک غزل کا درجہ رکھتا ہے۔ ان کی آخر عمر کے یہ جواہر پارے تعداد کے لحاظ سے گنتی کے ہیں لیکن (عقبا مطالب اور تاثر کے لحاظ سے اس قدر وزنی اور وقیع ہیں کہ سمجھ میں نہیں آتا کہ یہ اس قدر بیش بہا کیسے ہو گئے، پڑتا ہے کہ اللہ کی دین، جسے مل گئی، مل گئی۔

ان پندرہ غزلوں پر کسی خاص مدرسۂ فکر یا کسی مخصوص ادارۂ خیال کی چھاپ نہیں ہے۔ ان میں اس قدر نہیں ہے کہ ایک الگ اور منتخب مکتب وجود میں آیا ہو۔ مجھے تو ایسا معلوم ہوا کہ مرحوم بے ارادہ طور پر سیاحت ہوئے اور جب واپس آئے تو ہر سرزمین کا کوئی نہ کوئی نادر تحفہ لے کر آئے۔ یہ اُن کا محبوب مشغلہ نہ تھا اس وقت کوئی خاص معیار ان کے مدنظر تھا اور نہ جب وہ گھر لوٹے تو کسی خاص ترتیب سے انھوں نے نوادرا البتہ سلیم قسم کا ودیعت ہوا تھا اس لئے جو کچھ لائے تھے اور جس طرح بھی سجایا وہ جگمگا اٹھا۔ اس کلام میں

دوسرے سے الگ ملیں گے۔ کسی میں میرؔ کی جھلک ملے گی، کسی میں دردؔ کا شائبہ، کہیں غالبؔ طنز فرما رہے ہوں گے، کہیں اقبالؔ سوچ میں ڈوبے ہوئے پائے جائیں گے۔ ان شعروں میں دکنی ادب دکنی ترقی پذیر زبان اور دکنی شعراء کا انداز بھی موجود ہے نی اور لکھنؤ کی اردو کی آمیزش بھی۔ حد یہ ہے کہ آج کل کے دو بڑے مکاتیب سخن یعنی خالص متغزلین اور جدید ڈھنگ کے مسائل شاعری کرنے والے گروہوں میں سے ہر دو گروہوں کے رنگ کی بھی کامیاب نمائندگی ملے گی۔ ابتدائی دور کی شاعری بے ساختہ پن تھا زور مرحوم کے آخری دور کی شاعری میں وہ نہ صرف برقرار رہا ہے بلکہ پہلے سے زیادہ ہی نکھر گیا ہے۔ تیکھا اور دھار دار ہو گیا ہے۔ اب زور جو کچھ کہنا چاہتے ہیں وہ تشکیک یا دور رس استعارہ نہیں بلکہ ایسی تشبیہات حقیقی مطلب کو مزید نمایاں کرنے اور قابل قبول بنانے کے لئے استعمال کی جایا کرتی ہیں۔ جوشیلے پن نے سنجیدگی اور بردباری بار کرلی ہے لیکن جہاں پہلے شباب کے لہجے میں جھجک تھی اور جہاں پہلے اس کے دل میں ڈر تھا کہ نہ جانے سننے والے کیا سمجھیں۔ وہاں بزرگی کی زبان میں صاف گوئی اور لہجہ میں اتنا تیقن آگیا ہے کہ اُسے یہ اطمینان حاصل ہے کہ کوئی غلط فہمی ہی نہیں ہو سکتی بُرا بھی کوئی نہ مانے گا۔ کیونکہ ترشا ہوا ہیرا نکلا ہے اور ہیرے سے اگر خراش لگ جائے تو کونسی بات ہوئی!

اس زمانہ کے کلام کی ایک نمایاں خصوصیت یہ بھی ہے کہ زورؔ بنیادی طور پر محب وطن تھے، وہ محب وطن ہی رہے۔ انھوں فاقیت پر چھا جانے کی کوشش نہیں کی۔ زندگی کے جو اثرات اُن پر اُن کے وطن پر یا اُن کے ماحول پر مرتب ہوئے اپنے کہے ہوئے ہیں انھوں نے صرف ان ہی مسائل کو سمویا۔ اس ضمن میں اُن کے ابتدائی کلام اور ان کے آخری کلام میں مقابلتہً جو فرق پڑ گیا وہ اتنا تھا کہ اُن کی فکر کا مرکز داخلیت سے ہٹ کر اب ماوراء ذات ہو گیا۔ اب انھوں نے اپنی ذات سے بچ کر اس اصطلاح بھی سوچنا شروع کر دیا کہ وہ جزو ہیں کل نہیں۔ کل میں دوسرے بنی نوع بھی شریک ہیں۔ یہ شرکا ان کے اپنے ہم قوم ن افراد بھی تھے جن کے احساسات کو انھوں نے اپنے ادھر منطبق کر کے شعروں کی شکل دینی شروع کر دی۔ زور کے دور جوانی میں ی یا معاشی طور پر کچھ زیادہ پریشانیوں کا وجود نہ تھا۔ افکار واجبی واجبی سے تھے۔ آخری دور میں ان پریشانیوں نے ت اور ہمہ گیری اختیار کرلی تھی۔ تقریباً ساری کی ساری دنیا اب اس کی زد میں آچکی تھی۔ زور کی فکر نے اس کا ادراک ور جب اس کا ساز چھیڑا تو اس کا خاص خیال رکھا کہ نغمہ ہندی بجا رہے، لے حجازی نہ ہونے پائے! اس طرح سے انکی نئی غم جاناں سے ہٹ گئی۔ نمود اور خود نمائی سے بھی بچ گئی۔ غم دوراں تو کھلانے لگی لیکن یہ غم اپنوں کا غم رہا مدو تو ڈ کر "ہمسایہ کی شادی میں عبداللہ دیوانہ" کا مصداق نہ ہونے پایا۔ اس کو بھی میں شاعر کی عظمت ہی کی ایک نا سمجھتا ہوں کہ انھوں نے اپنے آپ کو محدود رکھا اور پابندیوں کو شکست نہ ہونے دیا! زور کا افق شخصی نہیں عمومی ہوتے کا اپنا افق معلوم ہوتا ہے اور اپنی دسترس سے کبھی دور ہوتا دکھائی نہیں دیتا۔ نہ یہ افق ساری دنیا کے درد کی طرح بے لگام بے ارادہ ہی آپ کو زور کے ہاں ملے گا۔

مرحوم کے دونوں ادوار کے کلام میں ایک اور بھی بیّن فرق پایا جاتا ہے۔ یہ فرق کچھ اس طرح کا ہے جیسا میرؔ اور سوداؔ کی توں میں تھا۔ میرؔ کی ٹک روتے روتے آنکھ لگ گئی تو انھوں نے بڑی سعادت مندی اور بیحد دھیمے لہجہ میں کہا کہ ساذرا آہستہ۔ ابھی تو سویا ہوں۔ سوداؔ کی بالیں پہ شور مچا تو جھٹ خدام ادب آن موجود ہوئے اور للکار کر کہنے لگے

نگاہ رُوبرو! ادب برقرار خبردار حضور کی ابھی آنکھ لگی ہے' ہاں! عہد جوانی کا زورؔ جب تلنگانہ کی رم جھم سے دوچار طبیعت میں جولانی کی لہریں پیدا ہوئیں تو گنگنا اُٹھا ؎

موسم وہی فضا وہی کیف رنگ بھی ہی   اے کاش مل سکے نگہ یار بھی وہی

لیکن یہی زورؔ جب زندگی کے سرد و گرم دیکھ چکا' انقلابات سے گزر چکا' تلخی حیات پی پی کر کام و دہن آزما چکا' یہی تجربہ سمیٹ چکا' حقیقت کو پہنچ چکا تو اس کے باوجود کہ وہ کشمیر میں ٹھیرا ہوا تھا جہاں کی بوندا باندی کسی طور پر بھی کی بارش سے کمتر نہیں یہی زورؔ جب وہ زینہ طے کر چکا جو شاعر کو بلند مقام پر پہنچاتا ہے تو اسی زورؔ کی زبان اسی منظر اب یوں کہتی ہے ؎

پینے والے مے و مینا پہ نظر رکھتے ہیں   چشم ساقی کی طرف کیوں نگراں ہیں ہم لوگ

یہ دونوں اشعار پڑھئے اور خود اندازہ فرما لیجئے کہ زورؔ کتنا بدل چکے تھے۔ جامعہ عثمانیہ کے زورؔ اور جامعہ کشمیر کے زورؔ دوسرے سے کس قدر مختلف ہیں کہ دونوں ایک نہیں معلوم ہوتے وہ الگ الگ افراد نظر آتے ہیں۔ دونوں میں بعد ہے۔ ایک نے نگہ یار مانگی تھی دوسرا چشم ساقی جیسی چہیتی شے سے بھی بے نیاز ہو چکا ہے بلکہ دوسروں کو بھی تلقین ہے کہ اس کا بھروسہ نہ کریں وہ طوطا چشمی پر اتر آ سکتی ہے۔ حیدرآباد اور کشمیر میں جو فصل ہے' جوانی اور بڑھاپے درمیان جو عرصہ ہے' پختگی اور ناپختگی کے بیچ میں جو طول طویل اور پُر پیچ راستہ ہے' حقیقتاً وہی ایک معیار ہوتا دو شاعروں میں یا ایک شاعر کے دو ادوار میں مابہ الامتیاز ترقی یا تنزل کی طرف سامع کی رہنمائی کیا کرتا ہے۔ اس فاصلہ طے کرنے کے بعد زورؔ پستی کی طرف نہیں گئے۔ بلندی پر اپنا نشیمن بنایا۔ بلندی کوئی ادنیٰ نہ تھی' عقاب کی پسندیدہ عقاب کی پرواز بلند ہوتی ہے' انتخاب کرتی ہے تو ہمالیہ سرو دریا ایورسٹ سے کم انتخاب نہیں کرتی۔ یہ اعتراف کرنا کہ زورؔ نے ترک سخن کر دیا تھا اور ان کی شاعری میں فصل آ گیا تھا تو یہ حال ہوا جو اوپر بیان کیا گیا ہے لیکن اگر مشق جاری اور وہ صرف اسی صنف پر اپنی تمام تر توجہ کو مرکوز رکھتے تو بلاشبہ دوسرے آسمانوں کی خبر بھی لاتے اور نئے نئے افلاک دریافت کرتے۔

ان کے مندرجہ ذیل شعر بھی میرے ادعا کو درست ثابت کریں گے ؎

جو خار کبھی تھے تنگ چمن ہیں آج وہی نسرین و سمن
کیا جانئے کس جا لالہ و گل پابند نزاکت بیٹھے ہیں
میدان قیامت جیت لیا دیوانوں نے آگے بڑھ کر
ہاں سر بہ گریباں فرزانے با فہم و فراست بیٹھے ہیں

غور فرمائیے کہ احساس کتنا شدید اور نظر کتنی گہری ہو چکی ہے' نثر کے مصلح اور معمار تو وہ تھے ہی' شعر و سخن کے باب میں بھی سنبھال رہے تھے اور قدم بڑھا کر تیز رفتاری سے راہبروں کی صف میں شامل ہوتے جا رہے تھے۔

ایک اور غزل ملاحظہ ہو: ؎

حیرت سے دیکھتا ہوں کہ یہ گلبدن ہیں کون
کھلتا نہیں ہے ان میں سر انجمن ہیں کون
قدریں بدل چکی ہیں یہ معلوم ہی نہیں
شیریں سخن ہیں کون دریدہ دہن ہیں کون
سیکھی ہے رہبروں نے اسیروں سے رہ زنی
ارباب انبساط غریب الوطن ہیں کون

غزل کے آخری دو شعر تو حیدر آباد کی جانی پہچانی اور مشہور خاص و عام قومیت اور یک جہتی اور برسوں کی بنی بنائی کے شیرازہ کے بکھر جانے کا صحیح معنوں میں ماتم ہیں۔ یہ اشعار زندہ رہیں گے اور میں سمجھتا ہوں کہ ان کے یہ آنسو جذب ہوئے نہیں ہو سکیں گے' منجمد ہو کر سنگ مرمر سے ترشی ہوئی کسی یادگار کی طرح یہ دونوں اشعار بھی قائم رہیں گے ان کے دل ہی کی آواز نہیں، سینکڑوں دیگر محبان وطن کے دل کی بھی آواز ہیں۔ ایک دنیا اس معاملہ میں انکی ہے، ہاں جس جرأت اور جس نزاکت سے انھوں نے اس جذبہ کی ترجمانی کی ہے اس جرأت اور نزاکت سے ادا کرنے والا شاید ہی کوئی دوسرا ہمیں ملے۔ غالب نے جب دلی کا نوحہ کہا تھا تو اس کے بعد کوئی دوسرا ویسا ماتم کہہ سکا ؟

وہ دونوں اشعار یہ ہیں ؎

شیرازۂ بہار گل تر بکھر گیا — اب کس کو کیا بتائیں کہ زیب چمن ہیں کون
کشمیر میں کوئی تو کراچی میں ہے کوئی — اے زور کس سے پوچھئے اہل دکن ہیں کون

کس سے پوچھئے کی بلاغت اور اس میں جو نشتر چھپا ہوا ہے اس کی اذیت میں نہیں سمجھا سکتا لیکن آپ خود محسوس کر چکے ہوں گے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے اپنے وجود سے مایوس ہو کر کوئی دیوانہ فرزانہ اپنے ہی جسم کو کچوکے دے رہا ہے اور خود ہی پوچھے کہ اس درد کی لذت بیان کر!

اس چھوٹے سے مضمون میں زور مرحوم کے آخری کلام کا اور زیادہ تجزیہ کرنا اور اس کے محاسن کو ایک ایک کر کے گنانا ... ۔ یہ تفصیل کبھی بعد میں ہوگی اور اس کے لئے مجھ سے زیادہ موزوں اصحاب شاید یہ کارنامہ انجام دیں۔ ان کا پورا کلام بھی ... ہوگا اور اس کے مطالعہ اور ریسرچ سے جو نتائج اخذ کئے جائیں گے وہ زیادہ مفصل اور محیط ہوں گے لیکن میں جو کچھ عرض کر چکا ... ہے یہ حقیقت صاف ظاہر ہو جاتی ہے کہ زور محی الدین قادری ہونے کی وجہ سے ہم اپنے زمانہ کے ایک اہم ناخدائے سخن سے ... ہے۔ اگر وہ صرف زور ہی رہتے تو آج اساتذہ کی فہرست میں ایک اور نام کا اضافہ ملتا۔ سرزمین دکن سے جو چوٹی کے شاعر ... ان میں معدودے چند ہی پیدا ہو سکے ہیں اور شاعر ہونے کی حیثیت سے مجھے بیشک اس کا قلق ہے لیکن ادب کا ایک ادنیٰ ... گزار ہونے کے ناطے سے ظاہر ہے اس قسم کے تاسف کا قطعاً نہ تو کوئی موقع ہے اور نہ جواز۔ زور شاعر ہی رہتے تو سوال یہ ہے کہ وہ کام جو وہ کر گئے اس کام کو کون انجام دیتا اور یہ میں خوب جانتا ہوں کہ کوئی اور یہ کام کر سکتا یا نہ کر سکتا، میں تو کم سے کم نہ کر سکتا تھا!!!

محمد اکبر الدین صدیقی

ادارہ اور ایوانِ اردو

آج سے ۴۵ سال پہلے حیدرآباد میں ادبی کتابوں کی اشاعت کے لئے کوئی ناشر نہ تھا اور ادیب "خود کوز خود گل کوزہ" کے مصداق تھے۔ اب تک بھی حیدرآباد کو ایسا کوئی ناشر نصیب نہ ہوا جو ادیبوں کی کتابوں کو م یہی' بلا معاوضہ ہی چھاپ لے۔ چنانچہ جب ڈاکٹر زور صاحب نے اپنی کتابیں "روحِ تنقید" اور اس کے بعد" اور فسانہ "متازیانہ" چھاپنے کا ارادہ کیا تو انھیں کوئی ناشر نہ ملا اور انھوں نے خود ہی ساری ذمہ داری البتہ یہ بات ضرور ہے کہ مطبع ابراہیمیہ اور مکتبۂ ابراہیمیہ کا قیام عمل میں آچکا تھا جہاں مصنفین اپنی کتابیں چ مکتبہ میں فروخت کے لئے رکھ سکتے تھے۔

چنانچہ ۱۹۲۷ء میں ڈاکٹر صاحب نے "تنقیدی مقالات" نامی کتاب شائع کی۔ اس کے بعد ہی وہ ا یورپ گئے۔ انھیں تین سال قیام کرنا تھا اور لسانیات پر تحقیقات کرنا تھا۔ دو سال میں انھوں نے یورپ مخطوطات کے متعلق کام کیا اور تعطیلات ۱۹۲۹ء میں حیدرآباد آگئے۔ یہاں "اردو شہ پارے" جیسی شا تین ماہ کے اندر مرتب کرکے شائع کی اور پھر لندن واپس ہوگئے۔

جب سال بھر کے بعد ڈگری لے کر آئے تو جامعہ عثمانیہ میں اردو ریڈر مقرر ہوئے اور ملک کے ہونہار او کے علمی و ادبی ذوق کو ابھارا۔ اس میں ان کے دوست احباب بھی تھے اور شاگرد بھی۔ دوست احباب کو علمی انجمن کی بنا ڈالی جس میں ہفتہ وار جلسے ہوتے اور ہر جلسہ میں مضامین پڑھے جاتے اور ان پر تنقید بر نوجوانوں میں میر حسن خاں (میر نواز جنگ) ڈاکٹر طاہر علی خاں مسلم۔ ڈاکٹر رضی الدین صدیقی۔ ڈاکٹر میر ولی ڈاکٹر یاورت علی خاں۔ میر یسین علی خاں (انجینیر) پروفیسر محمد علی خاں' پروفیسر سید محمد۔ عبدالر عبدالرزاق راشد اور عمر یافعی شریک تھے۔ ان سب حضرات کا تعلق بالکلیہ حیدرآباد سے تھا یا یہ کہ دکنی تھے۔ ریاست حیدرآباد کے ہر اہم عہدہ پر شمالی ہند کے لوگ چھائے ہوئے تھے اور انھیں قطعی گوارا اس قسم کی سرگرمیوں میں حصہ لیں۔ انھیں بڑا خوف یہ تھا کہ اگر یہ آگے بڑھیں تو پھر ہماری کمزوریاں گرف گی اور جو مقام آج حاصل ہے وہ باقی نہ رہے گا۔ یہ حضرات مقتدر' حضور رس اور بے تاج کے بادشاہ سرا مصاحبین تھے۔ اسی لئے ان لوگوں نے حیدرآبادیوں کو کبھی آگے بڑھنے کا موقع نہ دیا اور اگر کسی نے من اور اثر اور دباؤ زیادہ پڑا تو تیس تا ساٹھ کی اہلکاری دے کر اس کو بندۂ بے دام بنالیا۔ یہ تو عبدالرحمٰن عثمانیہ کا کارنامہ تھا کہ انھوں نے حیدرآباد کے ذہین طلبا کو یورپ بھیجا اور واپسی پر جامعہ عثمانیہ ہی میں۔

ں لے کر واپس آنے والوں کو بھی کسی محکمہ میں اچھی جگہ نہ مل سکتی تھی۔ جب انجمن کے اراکین کی سرگرمیاں ان عہدہ داروں
ں تک پہنچیں تو انھوں نے دور اندیشی سے کام لیا اور انگریزوں کی چال چل کر سر اکبر حیدری کے سامنے ان نوجوانو
یت کی کہ یہ حضرات انجمن بنا کر ریاست کے مفاد کے خلاف کام کر رہے ہیں۔ اگر ابھی سے اس کا انسداد نہ ہو تو
سے اونچا ہو جائے گا۔ اور پھر کچھ بنائے نہ بن سکے گا۔ سر اکبر جیسا مدبر ان کے چکر میں آگیا اور اس نے پورے
ے حضرات کو فرداً فرداً چائے پر بلایا اور تنبیہ کی کہ ایسی حرکت کی تو ملازمت سے نکال دیئے جاؤ گے۔ پھر
کا نہ ہوگا۔ سر اکبر کو بعض نوجوانوں نے بہت کچھ سمجھایا کہ ہم وہاں مضامین پڑھتے ہیں، شعر کہتے ہیں، علمی
ی کرتے ہیں، اس کو سیاست سے کوئی تعلق نہیں۔ لیکن حضرات باراں دیدہ کے مقابلہ میں ان کا اعتبار کون
انچہ یہ انجمن برخاست ہوگئی اور ان نوجوانوں میں بعض نے ہمت ہار دی اور بعض نے کمریں کس لیں اور
لیا کہ ؎

ہرچہ بادا باد ما کشتی در آب انداختیم

چنانچہ ڈاکٹر زور صاحب نے اپنے چند ساتھیوں یعنی پروفیسر عبد المجید صدیقی۔ عبد القادر صدیقی۔ عبد القادر
ی اور نصیر الدین ہاشمی کے تعاون سے ۱۹۳۱ء میں علی الاعلان ادارہ ادبیات اردو قائم کیا۔ اس کے حسب ذیل
و مقاصد تھے:—

(۱) اردو زبان اور ادب کی توسیع و اشاعت اور حفاظت۔
(۲) سرزمین دکن میں اردو زبان اور ادب کا صحیح مذاق پیدا کرنا۔
(۳) ملک کے نوجوانوں میں انشاپردازی اور شاعری کا ذوق پیدا کرنا اور تصنیف و تالیف میں رہبری اور مدد کرنا۔
(۴) عوام میں اردو کی تعلیم اور مطالعے کا شوق پیدا کرنا اور اس کے لئے ضروری وسائل اختیار کرنا۔
(۵) اردو کو مختلف علوم و فنون سے روشناس کرنا۔
(۶) تاریخ دکن کی خدمت اور ملک کے تاریخی ادب و آثار کی حفاظت۔
(۷) ایک ایسا مکمل کتب خانہ قائم کرنا جس میں اردو کی بالعموم اور خاص طور پر دکن کی تمام تحریریں اور آثار محفوظ ہو سکیں اور جس کا ایک حصہ خواتین کے لئے وقف رہے۔

اس طرح ڈاکٹر صاحب نے ایک انجمن کو جو محدود وسایل اور گنجایش میں کام کر رہی تھی، ٹوٹتے ہوئے دیکھا۔ لیکن
انہیں زیادہ بلند عزم اور حوصلے کے ساتھ ادارہ قائم کیا اور اس کی بارہ (۱۲) شاخیں بنائیں۔ انھوں نے
بت وسیع القلبی سے کام لے کر اپنے دوست احباب کے علاوہ اردو سے دلچسپی اور خدمت کا جذبہ رکھنے والے بزرگوں
ں اور لڑکوں کو بھی اپنے اطراف جمع کر لیا۔

ارکان ادارہ نے پانچ چھ سال تک نہایت خاموشی سے علمی اور ادبی خدمات انجام دیں۔ ہر شعبہ نے اس عرصے میں
کچھ کام کر کے دکھایا اور پندرہ کتابیں شائع کیں۔ اس وقت لوگوں کی آنکھیں کھلیں کہ ڈاکٹر صاحب یا ان کے
استعمال نہیں کر رہے ہیں بلکہ محض اردو کی خاطر گراں قدر خدمات انجام دے رہے ہیں تو حسد کرنے والوں نے حسد بھی

کیا اور کچھ روشن خیال مخالفین دوست بھی بن گئے۔

ادارے کی جانب سے سب سے پہلے میر حسن اور مخدوم محی الدین کا ڈرامہ "ہوش کے ناخن" شائع ہوا۔ ا
اور ان کے معاونین کی بے نفسی، بے لوثی اور ایثار کا ثبوت ملتا ہے۔ کہ انھوں نے اپنی یا اپنے ساتھیوں
چھاپی بلکہ اپنے شاگردوں کی کتاب پیش کی۔ یہ کتاب عبدالرحمن خاں پرنسپل کلیہ جامعہ عثمانیہ کے نام معنو
کی موت پر ڈاکٹر صاحب نے اپنی موت سے چند دن قبل لکھا تھا:—

"وہ جامعہ کے ایسے مزدور ثابت ہوئے جس کو عمارت کی تکمیل کے
بعد ہی برخاست کر دیا جاتا ہے ....."

یہ ایک حقیر سا نذرانۂ عقیدت تھا اپنے اُستادِ مشفق کی بارگاہ میں ادارے کی سب سے پہلی کتاب اس کے
شاگردوں نے لکھی اور بانیوں کے استاد کے نام معنون ہوی۔ اس کے دو اسباب تھے۔ ایک تو یہ کہ وہ یہ بتا
چاہتے تھے کہ انھوں نے ادارہ محض اردو کی خدمت کے لئے قائم کیا ہے اور دوسرے یہ کہ اپنے شاگردوں او
نوجوانوں میں کام کا حوصلہ اور جذبہ پیدا ہو اور اُن کا یہ احساس کمتری بالکل مٹ جاوے کہ دکنی کچھ نہیں
احساس کمتری کو حیدرآبادیوں کے دلوں سے نکالنے میں ڈاکٹر صاحب نے بہت بڑی خدمت انجام دی۔ ا
نہ صرف یہ کہ نوجوانوں کو کام کے لئے اُبھارا بلکہ ان سے کام لے کر ان کو زندگی کے عملی میدانوں میں کام کر
یہ ڈاکٹر صاحب ہی کا فیض ہے کہ آج حیدرآباد میں بہت سے لکھنے والے پیدا ہوگئے اور شعراء منظر عام پر
صاحب نے اس کتاب کا دیباچہ لکھتے ہوئے یہ خیال ظاہر کیا ہے کہ:—

"اس سلسلے کی اشاعت و طباعت مرہونِ منت ہے بعض احباب کے مالی ایثار کی جنھوں نے
ازراہ علم دوستی اس کے لئے ایک ایک سو روپے کا عطیہ عنایت کیا اور اس سلسلے کی بنیاد ڈالی
جو ممکن ہے کہ آج حقیر نظر آئے لیکن اس حقیقت سے کون انکار کر سکتا ہے کہ تمام کام ابتدا
بڑے نہیں ہوتے اور نہ نظر آتے ہیں۔"

اس طرح ادارے کے اشاعتی پروگرام کا آغاز ہوا۔ اور تمام شعبے اپنا اپنا مفوضہ کام انجام دینے
شعبۂ زبان تھا جس میں اردو کے مشہور اہل قلم اور ادیب اور صحافی قاضی عبدالغفار سابق مدیر "پیام"
حیدرآباد۔ ڈاکٹر یوسف حسین خاں کے علاوہ ڈاکٹر جعفر حسن، پروفیسر سید محمد، پنڈت ونشی دھر جی و
پروفیسر سہروردی، پروفیسر ضیاء الدین انصاری، ڈاکٹر راحت اللہ خاں اور ڈاکٹر زور صاحب شریک
نے ایسے الفاظ کی فہرست مرتب کی جن کی تذکیر و تانیث میں اختلاف تھا۔ اس کی ایک قسط "سب رس"
میں شائع کی گئی۔ سرکاری کاروبار میں جو الفاظ استعمال ہوتے تھے اُن پر تنقیدی نظر ڈالی گئی۔ دکنی
اور پہیلیوں کو جمع کرنے کی کوشش کی گئی۔ اصلاحی مضامین کا سلسلہ شروع کیا گیا۔ جس میں دکن کی مروجہ
تنقید کی گئی۔ یہ سلسلہ بہت مقبول ہوا۔ اور ہندوستان کے اکثر رسالوں میں اس پر مضامین شائع ہوئے
کے مختلف پہلوؤں پر غور کرنے اور روشنی ڈالنے کے اسباب فراہم کئے گئے۔

ادارے کی کارگزاریوں سے واقف کرانے اور نوجوانوں کے مضامین شائع کر کے ان کے حوصلوں کو بلند کرنے کے لئے جب ایک رسالے کی ضرورت شدت سے محسوس ہوئی تو جنوری ۱۹۳۸ء سے "سب رس" کا اجرا عمل میں آیا۔ اس کے بعد اس کے ضمیمے "بچوں کا سب رس" اور "سب رس معلومات" بھی جاری ہوئے۔ "سب رس" ابھی تک علم و ادب کی خدمت انجام دے رہا ہے۔ البتہ "بچوں کا سب رس" اور معلومات بند کر دیے گئے۔

ایک شعبہ تنقید کا تھا جس کا مقصد یہ تھا کہ اردو تنقید نگاری کے معیار کو بلند کیا جائے۔ "سب رس" میں تبصرے کے لئے وصول ہونے والی کتابوں پر بے لاگ تبصرے کئے۔ انگریزی تنقید کے اصولوں سے واقف کرایا اور ادارے کے ترجمان "سب رس" کے ذریعہ گراں قدر خدمت انجام دی۔

چوتھا شعبہ تالیف و ترجمہ تھا۔ اس کا مقصد یہ تھا کہ دیگر زبانوں کے ادب عالیہ کو اردو میں منتقل کیا جائے۔ ایسی علمی و فنی کتابوں کے ترجمہ کی ضرورت پر زور دیا جو ہمارے اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے والے طلبا کے لئے مفید ہوں۔ غیر زبانوں کی ایسی کتابوں کا انتخاب کیا گیا جو قابل ترجمہ سمجھی گئیں۔

پانچواں شعبہ تاریخ دکن کا تھا۔ یہ دیکھا جا رہا تھا کہ اردو میں تاریخ ہند کی اکثر کتابیں صرف انگریزی سے ترجمہ یا تالیف ہو رہی ہیں اور اس میں دکن کا ذکر نہ ہونے کے برابر ہے۔ تاریخی ادب کی تخلیق کے لئے تحقیقی صلاحیت اور وسعت نظر کی ضرورت ہے تاکہ نئی نسل حقیقت سے واقف ہو سکے۔ اس شعبے کو ابھی تک بھی پروفیسر عبدالمجید صدیقی جیسے ماہر مؤرخ کی رہنمائی حاصل ہے اور ملک کے مشہور مؤرخین نواب عنایت جنگ بہادر، نواب علی یاور جنگ بہادر، نواب منصب جنگ اور علی اصغر بلگرامی کا تعاون حاصل رہا ہے۔ اس شعبے نے کارہائے نمایاں انجام دئے۔ "تاریخ گولکنڈہ"۔ "مقدمۂ تاریخ دکن"۔ میر محمد مومن۔ فرخندہ بنیاد اور داستان ادب حیدرآباد جیسی وسیع اور گراں قدر کتابوں کی اشاعت کے علاوہ دکن کی کئی مشہور ہستیوں کے حالات شائع کئے۔ قطب شاہی دور کی تاریخی عمارات کے تحفظ کے لئے حکومت کو توجہ دلائی اور کتبوں کے چربے لے کر ادارے میں محفوظ کئے۔

ادارے کا ایک شعبہ شعرا و مصنفین دکن ہے۔ دکن نے کئی ادیب اور شعرا پیدا کئے لیکن ان کے کارنامے گوشۂ گمنامی میں پڑے ہوئے تھے۔ اس شعبہ نے ان کی تصانیف کو جمع کیا اور انھیں منظر عام پر لانے کی کوشش کی۔ شعرا کے دواوین کے انتخابات شائع کئے۔ دکن کے شعرا کے تذکروں کی تین جلدیں شائع کیں اور اس طرح انھیں زمانے کی دست برد سے بچا لیا۔ اکثر شعرا کے مزاروں کا پتہ لگایا اور ان پر اپنی جانب سے کتبے نصب کئے۔

ایک شعبہ سائنس کا ہے۔ جس کے ذمے یہ کام ہے کہ وہ عوام کے لئے علمی ادب عام فہم انداز میں پیش کرے۔ اس شعبے نے بھی کئی کتابیں مرتب اور شائع کیں۔ مثلاً سائنس کے کرشمے۔ آب دوز اور سرنگ۔ پانی کی کہانی۔ زہریلے پودے۔ چیونٹی۔ پودوں کی کہانی۔ طبیعاتی کائنات اور ہمارے پھول وغیرہ۔ یہ کتابیں غیر معمولی طور پر مقبول ہوئیں۔ یعنی بعض کے تین تین چار چار ایڈیشن شائع ہوئے اور ملک کے مؤقر جرائد اور صاحب بصیرت اصحاب نے بہت سراہا۔

علم و ادب کا ذوق رکھنے والی خواتین کو ایک مرکز پر جمع کرنے، انھیں مشورے دینے اور ان کے ادبی کام کو آگے بڑھانے کے لئے خواتین کا شعبہ قائم کیا۔ ان کی کئی مطبوعات منظر عام پر آئیں۔ خصوصاً تحقیقاتی مضامین کے

مجموعے "نذرولی" نے غیر معمولی مقبولیت حاصل کی۔ اس شعبے کی ایک خصوصیت یہ بھی تھی کہ اس کے سارے کاروبا
ہی انجام دیتی تھیں۔

نسوانی ادب کے ساتھ ساتھ بچوں کے ادب کی طرف توجہ دینے کے لئے ایک شعبہ اطفال قائم کیا گیا اور بچوں
کتابیں لکھوا کر شائع کیں۔

اسی طرح طلبا کے مفاد کے لئے ایک شعبہ طلباء قائم کیا گیا تاکہ طلبا کو ابتدا ہی سے ادبی ذوق سے آشنا کرایا
انھیں تقریر و تحریر کی عادت ہو۔ اس کے لئے ادارے کے ترجمان "سب رس" کا ایک ضمیمہ "بچوں کا سب رس"
کیا جو عرصۂ دراز تک جاری رہا اور اس نے کافی مقبولیت حاصل کی۔

کتب خانہ کا شعبہ نہایت اہم ہے۔ اس میں ارکان ادارہ کی مساعی سے قلمی کتابیں، شاہی فرامین،
دستاویز، قدیم مطبوعات، ادیبوں کے خطوط اور بیشتر ایسی مفید تحریریں جمع کی جانے لگیں جن کی اہمیت
محققین بخوبی واقف ہیں۔ چنانچہ آج یہ کتب خانہ حیدرآباد کا گراں قدر سرمایہ ہے۔ اتنی متنوع دستاویزیں
کسی اور کتب خانہ میں نہیں۔ مخطوطات نہ صرف جمع کئے گئے بلکہ ڈاکٹر زور صاحب نے ان کی وضاحتی فہرست
جلدوں میں شائع کرکے کتب خانے کی افادیت کو عام کر دیا اور کتب خانے میں جمع شدہ مطبوعات کی بھی تین فہر
شائع کر دیں جس میں تقریباً پندرہ ہزار کتابوں کا ذکر آگیا ہے۔ ریسرچ کرنے والوں اور اخبارات کے مدیروں او
کے لئے یہ بات بھی دلچسپی اور خوشی کا باعث ہوگی کہ "سب رس" کے تبادلے میں جو رسائل اور اخبارات آتے ہ
سال بھر کے شماروں کی ایک جلد بنا کر کتب خانے میں محفوظ کر دیا جاتا ہے۔ اس طرح آج حیدرآباد میں رسائل ک
جتنا ادارے میں ہے اتنا کہیں نہیں۔

ایک شعبہ اردو امتحانات کا ہے۔ ادارے نے اردو کی توسیع اور اشاعت کے سلسلے میں باشندوں میں علم کا ذوق پیدا ک
کے لئے 'اردو دانی' اردو زبان دانی' اردو عالم اور اردو فاضل کے امتحانات رائج کئے۔ ان امتحانوں نے اتنی
حاصل کی کہ حیدرآباد کے اضلاع میں اور حیدرآباد سے باہر بھی اس کے کم و بیش اسّی مراکز مقرر ہوئے اور امید
کی تعداد سینکڑوں تک پہنچ گئی۔ یہ امتحانات اب تک بھی جاری ہیں۔

آخری شعبۂ اردو انسائیکلو پیڈیا کا قائم ہوا اس کی ترتیب کے لئے نہ صرف حیدرآباد بلکہ ہندوستان
اہل علم کا تعاون حاصل کیا گیا۔ حرف الف ممدودہ سے کام کا آغاز ہوا۔ بطور نمونہ اس کے سولہ صفحے چھاپ کر
کئے گئے اور پھر کام کا آغاز ہونے کے بعد صرف ۔۔ صفحے چھپ چکے تھے۔ علمائے ہندوستان سے رائیں طلب کی
یہ رائیں اتنی اچھی اور حوصلہ افزا ہیں کہ شاید ہی کسی اور کتاب کو ملی ہوں! لیکن مالی دشواریوں نے کام کو آگے
سے باز رکھا۔ ادارہ اب تک بھی اپنے اراکین کے عطایات کا مرہون منت تھا۔ حکومت کی کوئی مدد نہ تھی۔
اتنا بڑا کام انجام پانا آسان نہ تھا۔ یہی سبب تھا کہ اس کام سے دست کشی اختیار کر لی گئی۔

ادارے کی اتنی شاخیں قائم ہوئیں۔ لیکن اس کی ہر شاخ کی عنان ڈاکٹر زور صاحب کے ہاتھوں میں تھی۔
کہ وہ ہر شاخ کے معتمد تھے۔ ہر شاخ کے روح رواں تھے۔ ہر تحریک میں جان ڈالنے والے تھے۔ ان ہی کے اشا

شائقوں کے کاروبار آگے بڑھتے رہے اور ادارہ دن بدن ترقی کرتا گیا۔

ادارے نے ۱۹۴۴ء میں نہایت اعلیٰ پیمانے پر ایک شاندار کل ہند اردو کانگریس منعقد کی۔ ملک کے صاحبانِ ذوق نے بھی دل کھول کر تعاون کیا۔ باہر سے آنے والے نمایندوں کے لئے بشیر باغ پیلس حاصل کیا۔ جہاں اردو کے میران کاروان یعنے سرشیخ عبدالقادر، پنڈت برج موہن دتاتریہ کیفی، پروفیسر رشید احمد صدیقی اور افضل العلما ڈاکٹر محمد عبدالحق مقیم رہے۔ تین دن تک کانفرنس کے اجلاس ہوتے رہے۔ ٹائپ، رسم الخط، اشاعت کتب، زبان وغیرہ ہر مسئلہ پر سیر حاصل بحثیں ہوئیں اور اس کانگرس کی روشنی میں ادارے نے اپنے کاموں کو آگے بڑھایا۔ اس طرح یہ کانگرس بہت کامیاب رہی۔

اب تک ادارہ اپنے پیروں پر کھڑا تھا۔ حکومت کی کوئی امداد نہ تھی۔ کتابوں کی فروخت اور "سب رس" ہی اس کی آمدنی کا ذریعہ تھے۔ یا پھر کچھ امتحانات سے مل جاتا تھا۔ ادارے کا دفتر ڈاکٹر صاحب کا ڈرائنگ روم تھا۔ کام بڑھتا گیا۔ دفتر بھی پھیلتا گیا۔ اس لئے ڈاکٹر صاحب نے اپنے دولت کدہ سے متصل ایک مکان بنایا جس میں پانچ کمرے اور ایک ہال تھا اور ادارے کو اس میں منتقل کر دیا۔

ادارے کا معائنہ اب تک کئی بڑی بڑی شخصیتیں کر چکی تھیں اور تعریف بھی خوب ہوئی تھی۔ گویا ادارہ بھی ایک شعر ہو جس پر داد دی جا رہی ہو۔ جب جناب غلام محمد صدرالمہام فینانس (بعد کو گورنر جنرل پاکستان) نے ادارے کا معائنہ کیا تو فرمایا:۔

"زور صاحب جی چاہتا ہے کہ آپ کو خزانہ عامرہ لے چلوں اور کہوں کہ جتنا روپیہ لے جا سکتے ہو لے جاؤ"

اس کے بعد ہی انھوں نے ادارے کے لئے کافی رقم منظور کی جس کا سلسلہ کمی و بیشی کے ساتھ اب تک جاری ہے۔ حکومت آندھرا پردیش نے بھی جس نے ہندوستان میں اردو کے تعلق سے وسیع القلبی اور بالغ نظری سے کام لیا ہے ادارے کو گرانٹ دے رہی ہے۔ اس امداد کے بعد سے ادارے کے کام کی رفتار بہت تیز ہو گئی اور حوصلے بڑھ گئے اکثر حلقوں سے یہ مطالبہ کیا جانے لگا کہ ادارے کی ایک اپنی عمارت کسی مرکزی مقام پر ہو۔ جہاں لوگوں کے لئے آمد و رفت کی سہولت ہو۔ اس بنا پر حکومت کے سامنے یہ عرضداشت رکھی گئی جس نے یک مشت رقم دینے کی بجائے سالانہ کچھ رقم عمارت کے نام سے دینے کا وعدہ کر لیا۔ کافی عرصہ گزرنے کے باوجود بھی موزوں جگہ نہ ملی۔ ہر شخص نے ادارے کی اس اہم ضرورت کو محسوس کیا۔ چنانچہ جب ۱۹۴۶ء میں حضرت خواجہ حسن نظامی دہلوی ادارہ پر تشریف لائے تو یہاں کے کاروبار کو دیکھ کر اتنے متاثر ہوئے کہ اس کا نام ہی "ایوانِ اردو" رکھا اور اپنی اس خواہش کا اظہار کیا کہ ادارے کی نئی عمارت جو انشاء اللہ جلد بنے گی اس کا نام "ایوانِ اردو" رکھا جائے۔

حیدرآباد کی لسانی بنیاد پر تقسیم سے پہلے محترمہ بیگم صاحبہ ڈاکٹر زور صاحب نے ایک قطعۂ اراضی ادارے کی عمارت کی تعمیر کے لئے عطیہ دیا۔ جب زمین ملی تو رقم جو حکومت کے پاس جمع تھی حاصل کر لی گئی۔ جناب فیاض الدین صاحب نظامی چیف آرکیٹکٹ نے ایک ایسا حسین نقشہ تیار کیا جس میں دنیا کے تمام طرز ہائے تعمیر نمو ہوئے۔ قطب شاہی۔ مغل، عادل شاہی۔ رومن۔ الحمرا اور غرناطہ کے نقوش سب ہی اس میں شریک کئے

عمارت کی تعمیر شروع ہوی اور قدم قدم پر مالی رکاوٹیں پیش آئیں۔ اس لئے کہ حکومت کی عطا کردہ تھوڑی سی رقم اس کی
عمارت کی بنیاد سے کچھ دُور اوپر آنے کے بعد ختم ہو گئی لیکن ڈاکٹر زور صاحب اور اُن کے رفقا نے ہمت نہیں ہار
عمارت کا نقشہ بجنسہٖ رہنے دیا اور حصول رقم کی کوشش کرتے رہے۔ مرکزی حکومت نے بھی گراں قدر عطیہ دیا۔
کشمیر نے بھی زبان اور ادب کی خدمت کی خاطر عطیہ دیا۔ حکومت آندھرا پردیش نے بھی اس میں حصہ لیا۔ اسٹیٹ
سالار جنگ بہادر، سنگاریٹی کالریز، نظام شوگر فیکٹری اور ڈاکٹر رگھو نندن راج سکسینہ کے علاوہ اور علم دوست او
نواز اصحاب نے اپنے عطایا ... سے عمارت کی تکمیل میں تعاون کیا۔ اور اردو کی اپنی ذاتی عمارت "ایوان اردو"
سے منصۂ شہود پر جلوہ گر ہوی، جہاں ادارے کے پورے اثاثہ کو نہایت سلیقہ سے سجایا گیا۔ قدیم اشیاء عجائب
کی زینت بنیں۔ تاریخی عمارتوں کے کتبوں کے چربے اس کے حُسن میں اضافے کا باعث ہوئے۔ ہندوستان کے تمام
ادیبوں اور شعرا کی تصویریں اس کے لئے باعث زینت ہوئیں۔ اس کا کتب خانہ اس قدر اہتمام سے مرتب
خواہش مند کو دُومنٹ میں کتاب مل سکتی ہے۔ اُردو ادب میں جن ہتھیاروں کے نام ملتے ہیں ان میں سے ا
بیشتر اس کے میوزیم میں موجود ہیں۔ طومار کی شکل میں شجرے ہیں جن میں ایک تو ڈیڑھ فٹ چوڑا اور بہتر (۲
لانبا ہے۔ نظام علی خاں آصف جاہ ثانی کے دَور کا شہر حیدر آباد کا ایک نقشہ ہے جو ۱۰ × ۱۰ فٹ کا ہے جس
برٹش میوزیم نے حاصل کی ہے۔ ریسرچ کرنے والوں کے لئے رہائشی کمرے موجود ہیں۔ جب یہ عمارت ان تمام
نادر، کمیاب اور حسین و جمیل ذخیروں سے آراستہ ہو گئی تو اس کا افتتاح اُردو کے بہی خواہ اور شیدائی
کشمیر جناب بخشی غلام محمد صاحب وزیر اعظم ریاست جموں و کشمیر کے ہاتھوں عمل میں آیا اور آج یہ ایوان ار
علم کی پیاس بجھا رہا ہے۔

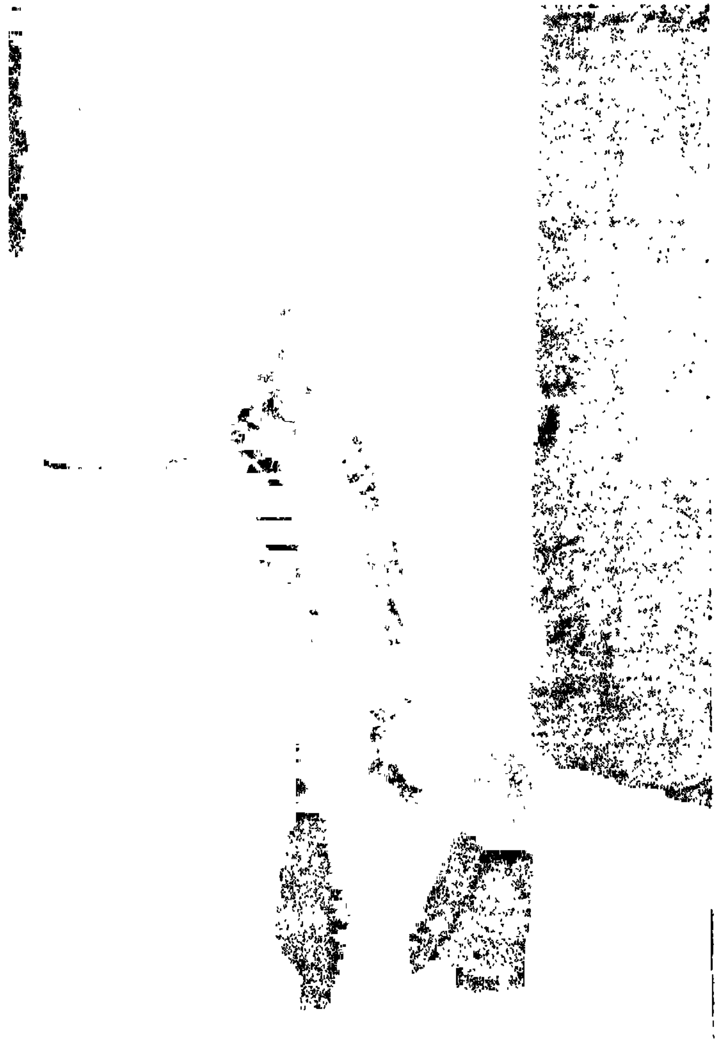
حکایت بود بے پایاں بہ خاموشی ادا کردم

بہ شکریہ "شیرازہ" سری نگر کشمیر

ڈاکٹر زور

کو

ظوم خراج عقیدت



[illegible]

[illegible]

تلوک چند محروم

رُباعیات

ــــ(بر وفات حسرت آیات ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور)ــــ

ے موت، بڑا غضب یہ ڈھایا تو نے
یکا بھی ہے؟ کیا سماں دکھایا تو نے
شمیر تا دکن ہے ماتم کس کا
ہوں زور کو دنیا سے اٹھایا تو نے

رکون سرافراز سوئے گور گیا
تم کا ابرا وجِ عرش تک شور گیا
سوس، صد افسوس، ہزاراں افسوس
م ہستی سے ناگہاں زور گیا

اپنا اک مہربانِ مخلص تھا زور
تھا پیکرِ دل نشیں شرافت کا زور
اے کاش اسے کوئی نہ مرنے دیتا
تقدیر پہ چلتا ہے کسی کا کیا زور

سب اہلِ وطن، وطن میں روتے ہیں تجھے
شہر و دشت و دمن میں روتے ہیں تجھے
تو گلشنِ کشمیر بو ہو کے اڑا
احباب ترے دکن میں روتے ہیں تجھے

کشمیر کو جاتے ہیں سیاحت کے لیے
یا رفعِ مرض، حصولِ صحت کے لیے
اے زور یہ کیا کہ لے گئی تجھ کو قضا
کشمیر میں آہ، مرگِ غربت کے لیے

سلیمان خطیب

رستہ بتانے والا رستے میں کھوگیا جی!

دکن مِنے سُنے ہے اک حشر ہوگیا جی
(میں)
اک آس کا گھروندا پانی میں بھوگیا جی
(بہہ)
رستہ بتانے والا رستے میں کھوگیا جی
کیا وقت پو ہمن کے کی بخت سو گیا جی
(پر) (ہمارے) (کیوں)
ماٹی پڑے وہمن یو ماٹی میں دل گیا ہے
(مٹی پڑے ہم پر)
جیون تھا پھول اس کا پھولاں میں مل گیا ہے
(زندگی) (پھولوں)

تجھ یاد کی مشعل سوں جلتاچ تن اچھیس گا
(سے) (جلتا ہی) (رہے گا)
انکھیاں میں غم ہمارے دریا منیں اچھیں گا
(آنکھیں) (مانند) (رہے گا)
دکنی کا اک دوانا کوہ کن گزر گیا جی
(دیوانہ)
کی بعد ان نمط کا سشیریں سخن اچھیں گا
(کیوں) (اس طرح)
دکنی کوں جھونپڑے سوں "ایواں" میں لا بٹھایا
(کو) (سے)
اپنچ واسطے توں گز بھر جگا نہ پایا
(تو) (جگہ)

پڑتے ہیں آنکھیاں سوں موتی کے سار موتی
(سے) (مانند)
ماٹی منے ملے ہے کی آب دار موتی؟
(کیوں)
ہر اک سخن پو تیرے صدقے ہزار موتی
(پر)
لیاتا تھا کاڑ دل کے دریا کے بھار موتی
(لاتا) (نکال) (باہر)
دکھن کی کھان میں توں لعل یہ
(معدن)
تجھ کوں نظر لگی ہے چند رید
دکن کے دیش میانے ماتم ہے واویلا ہے
(درمیاں)
دکن کا زور جا کو بے زور ہوگیا ہے
لہو سوں خطیب اپنے یو مرثیہ لکھیا ہے
"تجھ شعر کا آواز اسب جگ منے ہوا ہے"
ہر بیت تیز بھالا جا دل منے ا
پھٹا کوں کلیجہ ٹکڑے انجھو بہ
(جگر) (آنسو)
کشمیر کی پون توں جَو بی ادھر گزرنا
(صبا) (جب جی)
شبنم کے موتیاں سوں سبزے کی گود بھرنا
اتّا سخن اپڑنا یوں نا کدال بسرنا
(اتنا) (لینا) (نہ) (کبھی) (بھولنا)
پھولاں سوں پاس لے کو تربت کے پھیرے کرنا
جَو لگ ہیں چاند سورج دکنی
(جب)
ہر کام کی جبیں پو اس کا چ
(اس کا ہی)

بہ بیگم ثریا سلیم

زورِ دکن

مغموم و دل گرفتہ ثریا کی بات سن
اے روحِ زور! باغِ عقیدت کے پھول چن

جاں دادۂ عمل سے محبت کسے نہیں
اے روحِ زور! تجھ سے عقیدت کسے نہیں

فکرِ حسیں پہ نور کی چادر تنی ہوئی
گویا نکھر گئی ہے تجلی چھنی ہوئی

تجھ سے ہے علم و فن کا ستارہ عروج پر
فخرِ دکن! سلام ہمارا قبول کر

موجود ہے جو کام، جو پیغام زندہ ہے
اردو ادب میں زور ترا نام زندہ ہے

تیرا قلم جو روحِ روانِ سطور ہے
ایک ایک لفظ میں رخِ معنیٰ کا نور ہے

تونے ولی کے دیس میں، فرزندِ جامعہ!
اے مردِ بے مثال! خردمندِ جامعہ

ذروں میں آفتاب کے انوار بھر دیے
فنکار جو خواب تھے بیدار کر دیے

ہر سمت حسنِ کارگزاری کی دھوم ہے
گویا دکن میں بادِ بہاری کی دھوم ہے

تونے دئے سنوار جو گیسو زبان کے
تیور ہوئے کڑے مری اردو زبان کے

ہر محفلِ دکن میں چراغاں تجھی سے ہے
ایوانِ فکر و فن میں چراغاں تجھی سے ہے

داعی ہے انقلابِ شعور و نظر کا تو
خضرِ خجستہ پا ہے دیارِ ہنر کا تو

نوکِ قلم سے سینۂ تاریخ چیر کر
جن کی نہیں نظیر نکالے ہیں وہ گہر

تیرے قلم سے تیرے وطن کا وقار ہے
تیری حیات خود سببِ افتخار ہے

ہر لفظ نور پاش تری ہر کتاب میں
ہیجان سا بپا ہے دلِ آفتاب میں

قدرت خدا نے دی تھی جو تنظیم کار کی
پھوٹی کرن کرن سے تجلی بہار کی

اردو میں زور، جوشِ روانی تجھی سے ہے
روئے دکن پہ آبِ جوانی تجھی سے ہے

نورِ نگاہِ علم، جگر گوشۂ دکن
ہے تیرے کارِ فکر پہ نازاں دلِ وطن

اردو پہ تونے رنگ چڑھایا شباب کا
ہے کیا جواب! زندگیٔ لاجواب کا

تو سو گیا تو قسمتِ کشمیر سو گئی
ہندوستاں میں علم کی تقدیر سو گئی

روحی علی اصغر

فخرِ تہذیبِ دکن

آسماں اردو ادب کا ہوگیا زیر و زبر!
گر رہا ہے عرش سے ایک ایک تارا ٹوٹ کر!

بجھ گئیں شمعیں تو پھر وہ گرمیٔ محفل کہاں
منزلیں اب بھی ہیں لیکن رہبرِ منزل کہاں

دل ابھی بے چین تھے بابائے اردو کے لیے
حفظِ اردو کے لیے رحمت جو تھے وہ بھی گئے

دلِ غزل کا ہوگیا داغِ جگر سے پاش پاش
پھر رباعی نے اٹھائی حضرتِ امجد کی لاش

شاربِ و شاہد کا غم بھولے نہ تھے اہلِ وطن
درد میں ڈوبی ہوئی ہے آج پھر روحِ دکن

کیا خبر تھی انقلابِ حشر ساماں آ ئے
زورؔ سا پُرزور نقادِ سخن اٹھ جائے

جس نے تاریخِ دکن میں روح تازہ پھونک
اس کی ہستی ایک تاریخی حقیقت بن گئی۔

تھی دکن کے ذرے ذرے سے محبت زورؔ
گولکنڈہ کی زمیں سے تھی عقیدت زورؔ

قلعۂ فکر و نظر سیلابِ غم سے بہہ
یادگارِ زورؔ ایک ایوانِ اردو ر

کارنامے اس کے ہیں سرمایۂ نازِ
اس کی عظمت پر کرے گی فخر تہذیبِ

تھا زمانے میں جو تہذیبِ دکن کی یاد
جنتِ کشمیر میں روحیؔ بنا اس کا مزا

شید نذیر

جانِ دکن

اے وادیِ کشمیر ذرا اپنا ستم دیکھ
ہم نے ترے گلزار کو یہ کہہ کے دیا تھا
تیرے لب و رخسار کو یہ کہہ کے دیا تھا
یہ جانِ دکن جانِ زباں گوہرِ فن ہے
کیا بات ہوئی تیری فضاؤں کو ہوا کیا
وہ دل جو سجائے کئی ایوانِ بصیرت
وہ دل جسے ملتی رہی ہر گام پہ شہرت
اے وادیِ کشمیر ذرا اپنا ستم دیکھ
پھولوں کی زمیں لیکے سلام اہلِ دکن کا
مہتاب جبیں لے کے سلام اہلِ دکن کا

گم ہوگیا سینے میں ترے جانِ دکن دیکھ
اور حسن طلب گار کو یہ کہہ کے دیا تھا
اور کاکلِ خمدار کو یہ کہہ کے دیا تھا
تاریخ قطب شاہ کا اک تازہ بدن ہے
دل رک گیا جاں بخش ہواؤں کو ہوا کیا
تھا جس کا مقدر ادب و آرٹ کی خدمت
وہ دل جسے کہہ سکتے ہیں بابِ دور کی عظمت
گم ہوگیا سینے میں ترے جانِ دکن دیکھ
اے نور نقی لے کے سلام اہلِ دکن کا
مدفن کے قریں لے کے سلام اہلِ دکن کا

چادر کئی آہوں کی عقیدت کی اوڑھا دے
آنسو یہ ہمارے ہیں انہیں پھول بنا دے
تربت پہ امانت کی ہماری تو سجا دے

جگن ناتھ آزاد (لندن سے)

ڈاکٹر زور

وطن کی سرزمیں سے آج یہ کیسی خبر آئی کہ رخصت ہو گئے صبر و سکوں، تاب و توانائی
زمانے سے بالآخر اس نے بھی رخت سفر باندھا ادب کے واسطے ہر سانس تھا جس کا مسیحائی

زباں کو زندگی دینے کی خاطر جس نے کی ہر دم
وطن میں چار جانب کوچہ گردی، کوہ پیمائی

ابھی کچھ دن ہی گزرے تھے کہ اک خط میں نے لکھا تھا جواب خط نہ آیا اور مرنے کی خبر آئی
جہاں ہر سوختہ جاں کو حیات تازہ ملتی ہے تعجب ہے وہاں کی بھی فضا تجھ کو نہ راس آئی
دکن ہی پر نہیں ہندوستاں پر کوہِ غم ٹوٹا دکن ہی کی نہیں سارے وطن کی آنکھ بھر آئی
کہوں کیا ہو گئی ہے آج یہ کتنی الم افزا مقدر ہے جو میرا عالم غربت کی تنہائی

قیامت ہے وہ شعلہ کس طرح بجھتا ہے اک پل میں
وہ شعلہ جس کے سورج چاند تارے ہیں تماشائی

مجھے وہ آج دیرینہ مراسم یاد آتے ہیں کہ جو تھائی صدی سے کم نہیں ہے جن کی پہنائی
لڑکپن ہے مرا اس وقت بھی میری نگاہوں میں مسلسل وہ ترے نامے مسلسل یاد فرمائی
نظر آئی تری گفتار میں افلاک کی وسعت ترے افکار میں پنہاں تھی دریاؤں کی گہرائی

وہ تیری یاد سینوں میں ہمیشہ زندہ رکھے گی
زباں کو تو نے بخشی ہے جو دلسوزی و رعنائی

(ریڈیو [illegible])

[پرو]فیسر شیخ فرید

ڈاکٹر زور

ہیں کچھ کہا نہیں جاتا — اور چپ بھی رہا نہیں جاتا
[...]تھا ورد کی حکایت ہے — پھر وہی موت سے شکایت ہے
[...]وہی آہ و گریہ و زاری — پھر وہی محفل عزاداری
[...]ت بدنے دکھائی پھر یہ گھڑی — غم کا سیلاب آنسوؤں کی جھڑی
[...]ے کس کس کو روئینگے ہم لوگ — متاع جان کھوئینگے ہم لوگ

[...]کیف سخن کا دیوانہ — تھا جو اپنا ہوا وہ بیگانہ
[...]اب سپہر علم و ہنر — بحر معنی کا شاہوار گہر
[...]شن انتقاد کا مالی — زینت افزائے مسند حالی
[...]ج تنقید اسیر ماتم ہے — زور سے غمگسار کا غم ہے
[...]ن جام سخن پلائے گا — نازا نشا کے کون اٹھائیگا
[...]ا کو ہے بادۂ سخن کا ہوش — شمع بزم ادب ہوئی خاموش
[...]لکندہ کی سیر" کیا کہئے — ہو گیا حال غیر کیا کہئے

نازش ہند افتخار وطن — ساتھ لیکر گیا بہار چمن
جس کے فضل و ہنر کی تھی توقیر — از دکن تا بہ خطۂ کشمیر
یہ ہجوم ملال کیا کہئے — علم و فن کا یہ حال کیا کہئے
جیسے بے روشنی چراغ کوئی — جیسے بے آب و رنگ باغ کوئی
جیسے اجڑا ہوا سا میخانہ — جیسے ٹوٹا ہوا سا پیمانہ

جیسے بے برگ و بار شاخ چمن — جیسے بیوہ ہو ایک شب کی دلہن
جیسے بجھتا ہوا سا انگارہ — جیسے ٹوٹا ہوا کوئی تارہ
جیسے بے ماہتاب کالی رات — جیسے الجھی ہوئی سی راہ حیات
جیسے محو سکوت بزم سخن — جیسے آتش زدہ کوئی خرمن
گرد آلودہ جیسے روئے یتیم — سست رو جیسے نبض مرد سقیم
جیسے کوئی جہاز بے لنگر — یا کوئی طائر شکستہ پر
جیسے آوارہ کارواں کوئی — جس کا رہبر نہ پاسباں کوئی

میر و غالب کا رازداں نہ رہا
فکر مومن کا ترجماں نہ رہا

علم و فن کا مزاج داں نہ رہا
نہ رہا میر کارواں نہ رہا

معین الدین عارف بیابانی

ڈاکٹر زور کی رحلت پر

اے دکن کی آبروئے زور اے گردوں وقار
کیوں جدائی پر تری ہوگا نہ ہر اک سوگوار

تاجِ اُردوئے دکن کے بیش قیمت کوہ نور
غیر ممکن ہے تری رحلت کا غم ہو دل سے دُور

گلشنِ اردو کو تھا تو ایک پیغامِ بہار
موت پر تیری نہ کیوں چشمِ دکن ہو اشکبار

اپنے خوں سے اسطرح سینچا تھا اردو کا چمن
جس سے ہند و پاک میں اونچا ہوا نامِ دکن

تیری ہر اک سانس سے آتا تھا اردو کا پیام
اس طرح کاٹے تھے تو نے زندگی کے صبح و شام

باغ اردو میں تری ہستی گلِ بے خار تھی
تو تھا سرگرمِ عمل روحِ عمل بیدار تھی

ہے درخشاں آسماں پر جس طرح بدرِ منیر
ہے اسی صورت سے روشن تیرا عہد بے نظیر

حق میں اردو کے ترا فیضان عالمگیر تھا
یعنی تو اردو کی جیتی جاگتی تصویر تھا

تھی تری ہستی یقیناً نازشِ ملکِ دکن
انجمن در انجمن تھا تو چمن اندر چمن

طالبانِ علم پر احساں وہ تو نے کر دیا
گوہرِ علم و ادب سے دامنوں کو بھر دیا

تجھ سے کتنوں کو ملا ہے منزلوں کا راستا
تو نے کتنوں کو ستاروں کی طرح چمکا دیا

کتنے ابنائے وطن کو تو نے بخشا ہے وقار
صفحۂ ہستی پہ واضح تر ہیں تیرے شاہکار

کتنے مایوسوں کو دی تو نے حقیقی زندگی
کس قدر ظلمت کدوں کو کی عطا تابندگی

تربیت کے فیض سے کتنے بنے اہلِ قلم
دیدنی کے قابل ہیں جن کے آج بھی جاہ و حشم

تیری ہر اک کیفیت تھی دل پسند و دل نواز
ہے بجا جتنا بھی ہو اہلِ دکن کو تجھ پہ ناز

عظمتِ اردو کا بے شک تو علمبردار تھا
شر پسندوں کے لئے اک تیغ جوہر دار تھا

دیکھ کر اردو کے حق میں خاص تیری کیفیت
قدرداں تیرے رہے شاہانِ گردوں منزلت

تو نہیں باقی مگر باقی ہے فن کی یادگار
ہیں دلِ تاریخ پر روشن ترے نقش و نگار

قالبِ ایوانِ اردو میں ہے تو اب جلوہ گر
چشمِ بینا کے لئے ہے دعوتِ فکر و نظر

اہلِ اردو کے لئے پیغام ہے زندہ ترا
تو نہیں دنیا میں لیکن نام ہے زندہ ترا

تیرے رشحاتِ قلم زندہ رہیں گے حشر تک
مثلِ مہر و ماہ تابندہ رہیں گے حشر تک

دنگ سب رہ جائیں گے فیضانِ اردو دیکھ کر
کام تیرا دیکھ کر "ایوانِ اردو" دیکھ کر

دہر میں باقی رہے گی جب تلک اردو زباں
زور تیرے کارنامے ہوں گے زیبِ داستاں

دو ہی کوہ نور نکلے تھے دکن کی خاک سے
عظمتیں جن کی ورا ہیں وسعتِ ادراک سے

دور ہوں دونوں وطن سے تھا یہی تقدیر میں
ایک انگلستان میں ہو دوسرا کشمیر میں

بدایونی

اُردو کے قافلہ سالار

ڈاکٹر زور

عقل و دانش جس کے غم پر احتمالی ہوگئی
شکل و صورت اسکی تصویر خیالی ہوگئی

انجمن کی انجمن سب لا و بالی ہوگئی
اک کمالی زور کی محفل زوالی ہوگئی

جنت الفردوس کے پورے دریچے کھل گئے
ہر دعائے مغفرت اُن کی مثالی ہوگئی

آہ کی تانوں میں ہیں ہی ہوئی غمخواریاں
سازِ ہستی ٹوٹتے ہی بزم خالی ہوگئی

جن حدوں پر کانپتا رہتا ہے روحوں کا سکوں
اُن حدوں پر گم تری روشن خیالی ہوگئی

ک روپہلی چاندنی میں وادیٔ کشمیر کی
جو جلالی زندگی تھی وہ جمالی ہوگئی

غم کدوں پر پھیلتا جاتا ہے پھیکا سا غبار
گم ہجوم سوگواری میں خوشحالی ہوگئی

ل کے پورے حاشیے پر وہ نئی ضربیں پڑیں
نبض استقلال میں بے اعتدالی ہوگئی

نزدہ اہل وطن کی مٹ گئیں رنگینیاں
دل کی بستی زندہ ارمانوں سے خالی ہوگئی

لُٹ گیا ہے اور رنجیدہ دلوں کا ارتعاش
ہر رگ عشرت سمٹ کر انفعالی ہوگئی

کس قدر واثق وہ رخشِ زندگی تھا تیز گام
جس سے آسودہ دلوں کی پائمالی ہوگئی

حمید رونق

گوہرِ ارضِ دکن

ایک اک کرکے بجھے جاتے ہیں محفل کے چراغ — داغ اک مٹتا نہیں اک دوسرا ہوتا ہے
چھوٹ کر اخبار ہاتھوں سے لرزتی ہے نگاہ — مختصر مدت میں دیکھے حاشیئے کتنے ر
شارب و شاہد کے صدمے سے ابھی فارغ نہ تھے — ناگہاں آئی خبر یہ "زور صاحب چل بـ
گولکنڈہ کی نئی تاریخ کے ترتیب کار — ہر ورق پر ہیں تری تحقیق کے نقش و نـ
دوپہر کی دھوپ میں اور مضمحل سایوں تلے — مقبرے کتبے کھنڈر چھانے توشہ پارے ڈھـ
کیا خبر تھی جاگتا جیتا کوئی سوجائے گا ۔ گوہر ارض دکن کشمیر میں کھوجائے
بارہا دیکھا ہے یہ احساس جذباتی نہیں — قابلیت کھینچ لے جاتی ہے پر لاتی نہیـ
زعم کے پہلو سے دور اپنے پرستاروں سے دور — خاک پہنچی ہے کہاں دور از نگاہِ ناصـ
یہ حقیقت دوستداروں پہ عیاں ہے بیش و کم — زور کے احساس میں مضمر تھا صدیوں کا
ایک پیکر میں کئی خم تھے خیالوں کے صنم
آج اردو لٹ گئی "ایوانِ اردو" کی قسم

احسان علی عرشی

آہ حضرت زورؔ

ناخدائے اردو

”حیف در چشم زدن صحبت یار آخر شد
روئے گل سیر ندیدیم و بہار آخر شد“

اے دکن کے فخر اے اردو زباں کے غمگسار
اے کہ دانش آفریں تیرا ہر اک انداز تھا
تیرے خال و خد میں تھی اک دل نشیں تابندگی
تیری ہستی تھی رہینِ خدمتِ اہلِ وطن
تو رہا اس دور میں بھی حامل و شمع قدیم
زندگی تیری سہارا تھی غریبوں کیلئے
تیری گردن خم نہ ہو سکتی تھی اہلِ جاہ سے
دستگیرِ اہلِ حاجت تھا ترا حسنِ نیاز
زندگی کے پیچ و خم سے بھی ہوا تیرا گزر
اس قدر محکم تھا تیرے قلب میں حسنِ یقیں
مطلعِ بزمِ ادب پر مہرِ عالم تاب تھا
شمعِ بزمِ شعر کو تو نے فروزاں کر دیا
مرحبا صد مرحبا اے زورؔ تو انسان تھا
یاد رکھے گی تجھے تا حشر بزمِ کُن فکاں

تیرے دم سے تھی شگفتہ باغِ اردو کی بہار
زندگی کو فخر تھا دنیا کو تجھ پہ ناز تھا
مختصر یہ ہے کہ تیری زندگی تھی زندگی
دلنشیں تیری ادائیں جانفزا تیرا چلن
ہر نفس میں تھی بہارِ عہدِ رفتہ کی شمیم
تو پیامِ امن تھا ان بدنصیبوں کیلئے
تیری راہ و رسم یکساں تھی فقیر و شاہ سے
تو گوارا کر نہ سکتا تھا مگر دولت کا ناز
تو نے ان راہوں کو بھی طے کر لیا ہنس بولکر
تیرے قدموں پر جھکی رہتی تھی گردوں کی جبیں
قلزمِ علم و عمل کا گوہرِ نایاب تھا
خاک کے پوشیدہ ذروں کو نمایاں کر دیا
محرمِ رازِ عمل تھا صاحبِ ایمان تھا
یہ نہیں تو اور پھر کیا ہے حیاتِ جاوداں

موت کی گمنام وادی سے گزر سکتا نہیں
جس نے سمجھا زندگی کا راز مر سکتا نہیں

ابو سعد سید اسمٰعیل سید

آخری پیغمبر اُردو

ڈاکٹر زور کی وفاتِ حسرت آیات پر

رُباعیات

ناقابلِ اظہار زبانِ اُردو
ہے زور کے ماتم میں جہانِ اُردو
اے زور ترا نام رہے گا روشن
زندہ رہی جب تک بھی زبانِ اُردو

۲

ہے زیرِ لحد زور زبانِ اُردو
بیتاب ہے غمناک جہانِ اُردو
اک آخری پیغمبرِ اردو نہ رہا
اللہ یہ کیسا ہے زیانِ اُردو

۳

سوئی ہوئی اُردو کو جگانے والے
مرتی ہوئی اُردو کو جِلانے والے
اے زور تمہا زیبا نہ تجھے یوں مرنا
اک عالمِ اُردو کو رُلانے والے

نظم

علم کا تھا ایک بحرِ بیکراں
فطرتِ آدم کا جو تھا رازداں
آخری پیغمبرِ اُردو زباں
چل بسا دنیا سے جو سوئے جناں
جب تلک زندہ رہے اُردو زباں
یاد رکھیں گے جسے پیر و جواں
اہلِ اردو کا تھا میرِ کارواں
جس کے ماتم میں ہے اک سارا جہاں
ڈاکٹر سید محی الدین زور
حسرتا واحسرتا ہے زیرِ گور
تھی زمیں کشمیر کی تقدیر میں
زور ہے زیرِ لحد کشمیر میں
ہو گئی بے نور اردو کی جبیں
زورِ اردو ہو گیا زیرِ زمیں
جسکی رحلت پر اک عالم سوگوار
ذرّہ ذرّہ ہند کا ہے بے قرار
باعثِ صد فخرِ ہندستان تھا
وقت کا اک بیمثال انسان تھا
تا ابد زندہ رہے گا تیرا نام
بانیٔ ایوانِ اردو السّلام
السّلام اے ڈاکٹر زور السّلام
تجھ پہ ہوں لاکھوں سلام عالیمقام

خورشید احمد جامی

ڈاکٹر زور

علم و تحقیق و ثقافت کے شبستانوں میں
تیری عظمت کے خد و خال نکھر آئے ہیں
ذہن تاریخ میں بکھری ہوئی صبحوں کی طرح
جگمگاتے ہوئے کچھ نقش ابھر آئے ہیں

جس کو صدیوں کی روایات حسیں نے پالا!
تو نے اس خواب کو تعبیر کی صورت دی ہے!
لالہ زاروں کی فسوں کار جوانی کے لیے
زندگانی کی شب و روز کی دولت دی ہے

بیکراں وقت کے بڑھتے ہوئے طوفانوں میں
عزم و اخلاق نے ڈھونڈے ہیں جزیرے کتنے
اپنے "ایوان" کے انمول خزانوں کو دیئے
آرزوؤں کے تراشے ہوئے ہیرے کتنے

میں سمجھتا ہوں کہ ہر سوچ کے آئینے میں
مدتوں صرف تری یاد کا چہرہ ہوگا
ضوفشاں قافلۂ فکر و نظر کے آگے
صرف تیرا ہی کوئی نقش کف پا ہوگا!

نرم گیتوں کی ٹپکتی ہوئی شبنم کی طرح
تیری آواز لب ساز پہ تھرائے گی
جب بھی گزرے گا سمن زار ادب سے کوئی
ایک اک پھول سے خوشبوئے وفا آئے گی

تو نے اردو کے لیے خون دیا ہے اپنا
کوئی اس بات سے انکار نہیں کرسکتا
کام زندہ ہے ترا ۔ نام ترا زندہ ہے
تو کسی طرح بھی اے زور نہیں مرسکتا

سعادت نظیر

ایوانِ اردو کا چراغ

اداس ہوگئی کچھ یوں فضائے امکاں آج
کہ جیسے رک گئی پل بھر کو نبضِ دوراں آج

چراغ بجھ گیا ایوانِ بزمِ اردو کا
جہاں تھی نغموں کی اک گونج، ہے سماں ہو کا

دلوں پہ ایسے میں کیا جانے؟ کیا گزرتی ہے؟
کہ ایک آہ سی ہر سانس پر ابھرتی ہے

بنا ہے کون اجل کا نشانہ دنیا میں
کہ بچھ گئی صفِ ماتم چمن میں صحرا میں

یہ کس کے غم میں وطن آج خون روتا ہے
یہ کون وادیٔ غربت میں تھک کے سوتا ہے

یہ وہ ہے جہدِ مسلسل تھی زندگی جس کی
نشانِ جادۂ منزل تھی رہبری جس کی

وہ عندلیب کہ تھا رونقِ بساطِ چمن
وہ عندلیب کہ تھا باعثِ نشاطِ چمن

ہر ایک پھول پہ سو جان سے جو قرباں تھا
وہ عندلیب کہ رنگِ بہارِ بستاں تھا

جو تھا ثقافت و تہذیب کے نشیمن میں
تو خوش نوا تھا وہ، اے زورؔ! کنجِ گلشن میں

عدو کو رشک ہے، احباب کو بڑا غم ہے
یہ تیری موت تری زندگی سے کیا کم ہے؟

تری مثال کہاں؟ تیرا اپنا تھا اک طور
ہوا ہے ختم ترے ساتھ اک سنہرا دور

ترے اشاروں پہ تحقیق جب مچلتی تھی
جواہراتِ زمینِ "دکن" اگلتی تھی

"قلی" کے شہر میں آئی وہ روشنی تجھ سے
کہ "دکنیات" نے پائی شگفتگی تجھ سے

ہے اک بہار سی تخلیق کے چمن میں تری
ہے ایک روح سی تنقید کے بدن میں تری

حدیثِ گل جو نہیں، وہ ترا پیام نہیں
جو دل کی بات نہیں، وہ ترا کلام نہیں

تری مساعیٔ پیہم کی دھوم ہے ہر سو
فضا میں ملتی ہے تیرے خلوص کی خوشبو

برنگِ شمس و قمر تیرا نام باقی ہے
ترا ادب، ترا فن، تیرا کام باقی ہے

مبصرین ترے مرتبے کو جان گئے
نہ مانتے تھے جو کل وہ بھی آج مان گئے

حیات مل گئی تجھ کو کس اہتمام کے ساتھ
کہ ذکر ہوتا ہے "اردو" کا تیرے کام کے ساتھ

باوا کرشن گوپال مغموم

بیادِ ڈاکٹر زورؔ مرحوم و مغفور

کوئی لمحہ نہ تھا بے کار جس کی زندگانی کا
رہا وقفِ اَدَب ہر لحظہ جس آزادؔ[1] ثانی کا

بہت مشکل ہے میدانِ اَدَب میں ہمسری جس کی
مسلّم عالمِ تحقیق میں ہے برتری جس کی

جنونِ علم نے رکھا جسے گرم سفر برسوں
کہاں کا گھر؟ رہی جس کو نہ اپنی بھی خبر برسوں

روشِ حالیؔ کی، شبلیؔ کی لگن، سیدؔ کی سرگرمی
بصد انداز جس کی ایک ہستی میں نمایاں تھی

جلا کر ازسرِ نو شمعِ تہذیبِ دکن جس نے
فزوں کی جو اور بھی کی روشنیٔ علم و فن جس نے

کیا طے تا بہ آخر جادۂ نقد و نظر جس نے
عطا کی آگہی تحقیق نو سے بیشتر جس نے

نمایاں کی "دبستانِ دکن" کی اہمیت جس نے
بٹھا دی دل پہ آثارِ کہن کی اہمیت جس نے

لسانی زندگی میں کاوشیں جس کی مسلّم ہیں
دکن یا تی اَدَب میں کوششیں جس کی مکرّم ہیں

نوازا سرپرستی سے کئی علمی اداروں کو
سہارا تا بہ امکاں جس نے بخشا بے سہاروں کو

جو لکھا نظم میں یا نثر میں۔ اک شاہ پارہ ہے
قلم سے لفظ جو نکلا ہے اک روشن ستارہ ہے

زمینِ نثر میں جس نے شجر ایسے اگائے ہیں
بہاریں جن پہ مرتی ہیں بہاروں پر جو چھائے ہیں

دکن میں جس کی محنت کا ثمر "ایوانِ اردو" ہے
تجلّی زارِ صد فکر و نظر "ایوانِ اردو" ہے

ہمیں اوراقِ "سب رس" دیکھ کر جو یاد آتا ہے
تصوّر جس کے نغموں کی صدا سے جھوم جاتا ہے

بہت یاد آئے گی رہ رہ کے اردو دوستی جس کی
مثالی تھی، مثالی ہی رہے گی زندگی جس کی

دکن سے دور وہ زورؔ آج محوِ استراحت ہے
بہ رنگِ شمعِ روشن خاک اُس کی زیرِ تربت ہے

---

[1] مولانا محمد حسین آزادؔ سے مراد ہے۔ (مغموم)

صلاح الدین نیّر

آخری آنسو

وقت کے آنسو رواں ہیں گردشِ ایام پر
ہے نسیمِ صبح گریاں فصلِ گل کے نام پر
رو رہی ہے چشمِ شبنم پھول کے انجام پر
کیا جہاں بھی نیند آ جائے وہیں سوتے ہیں لوگ
زورؔ! تیرے آخری دیدار کو روتے ہیں لوگ

فیصلہ جیسے ہی موت و زندگی میں ہو گیا
کاروانِ صبح، شب کی گود میں خود سو گیا
چلتے چلتے اک مسافر راستے میں کھو گیا
موت آئی بھی تو کیا فن کار پھر بھی زندہ ہے
زندگی کو چھین کر دستِ اجل شرمندہ ہے

لو، چراغِ فکر و فن کی آج مدّھم ہو گئی
محفلِ شعر و ادب کی آنکھ پُرنم ہو گئی
وہ دلوں میں گونجنے والی صدا کم ہو گئی
بانئ ایوانِ اردو، خادمِ اردو زباں
آج اہلِ بزم تیرے غم میں ہیں ماتم کناں

زندگی آواز ہے، آواز ہی، آواز ہے
فرصتِ عزم و عمل سب سے بڑا اعزاز ہے
موت کیا ہے زندگی کا نقطۂ آغاز ہے
عظمتِ فن کی قسم! جب تک کہ ہے اردو زباں
زر کے حرفوں سے لکھی جائے گی تیری داستاں

فصلِ گل کے واسطے جورِ خزاں رکتا نہیں
برق کی زد میں بھی کارِ آشیاں رکتا نہیں
موت کے طوفان میں بھی کارواں رکتا نہیں
اس کا غم ہے چل بسا ایسا امیرِ کارواں
آخری لمحوں میں جس کے لب پہ تھی اردو زباں

زورؔ، وہ دیوانۂ اردو کہ ہنگامِ سفر
آخری سانسوں میں تھی ایوانِ اردو پر نظر
آخری آنسو گرا اردو زباں کے نام پر
دل یہ کہتا ہے کہ روحِ زورؔ اب بھی ساتھ ہے
پرچمِ اردو نئی نسلو! تمہارے ہاتھ ہے

صائب کوہیری

حیف محی الدین قادری زور کا انتقال

۱۳۸۲ھ

زورؔ تھا جو رونقِ ہر انجمن جاتا رہا
یعنے وہ زورِ سخن فخرِ دکن جاتا رہا

لشکرِ اردو کا والیٔ علم جاتا رہا
یوں تو باقی ہیں قلم زور قلم جاتا رہا

تھا وہ بے لوث اور مخلص اپنے ہر اک کام میں
سرتاپا جوشِ عمل تھا زورؔ تھا خود نام میں

گنبدوں کو اور قلعہ کو اس نے دی تابندگی
اور قطب شاہوں کو بخشی اس نے پھر سے زندگی

اس نے ان تاریک قبروں میں اجالا کر دیا
قصۂ ماضی میں اس نے اک نیا رنگ بھر دیا

گیسوئے اردو دکن میں جب سنور جانے لگے
تب بلاوے بھی اسے کشمیر سے آنے لگے

لوگ جاتے ہیں وہاں سیر و سیاحت کے لیے
وہ گیا بھی تو وہاں اردو کی خدمت کے لیے

ہے مفید آب و ہوا جو تندرستی کے لیے
بن گئی مہلک وہی اک اس کی ہستی کے لیے

اس نے جس دل کے بھروسے کام تھا اتنا کیا
یہ تعجب ہے اسی دل نے اسے دھوکا دیا

آج ہے ایوان اردو اس کے غم میں سوگوار
اس کے احسانات اردو پر ہیں کتنے بے شمار

وقار خلیل

آہ ڈاکٹر زور

ایک پیغام تھا اک نغمۂ سازِ ہستی　　خوش درخشید مگر شعلۂ مستعجل تھا
اے دکن! او وادیٔ کشمیر میں سونے والا　　تیری تاریخِ تمنا کا دھڑکتا دل تھا
حال و ماضی ہی نہیں بلکہ بہ شکلِ اردو　　زور کے ہاتھ میں آئینۂ مستقبل تھا

❖

وہ زورِ دکن کا وہ چمکتا ہوا سورج　　صد حیف کہ کشمیر کی بدلی میں چھپا ہے
تاریخ و تمدن کا جہاں تاب خزانہ　　افسوس! بہت دور کی راہوں میں لٹا ہے

❖

صدیوں کی تراشی ہوئی تہذیب کا پیکر　　وہ سانولا شہزادہ! قطب شہ کے وطن کا
اے بھاگ متی! تیرا شناسا نہیں ہم　　کشمیر کی وادی میں چھپا چاند دکن کا

❖

حیدرآباد ترا چاہنے والا نہ رہا　　اک جہاں تاب اجالا تھا اجالا نہ رہا
تیز رو وقت بھی خود آج یہ کہتا ہے وقار　　زورِ اردو کا ہالہ تھا، ہالہ نہ رہا

❖

ڈاکٹر زور تیری یاد کے پھول!　　سارے ہندوستاں میں مہکیں گے
رند پی پی کے جام اردو کا　　اور بہکیں گے اور بہکیں گے

❖

آسمانِ دکن کے ستارے　　زور کا انتظار کرتے ہیں
آرزوؤں کے نو دمیدہ گلاب　　جان اس پر نثار کرتے ہیں

❖

ایک سازِ حیات کا نغمہ　　سرزمینِ دکن سے چھوٹ گیا
پھول کھلتے تھے جس کے سائے میں　　وہ تناور درخت ٹوٹ گیا

سلیمان اطہر جاوید

ڈاکٹر زورؔ

(یہ نظم ڈاکٹر زورؔ کی زندگی میں لکھی گئی تھی)

قلیؔ کی روح کو عرصہ سے تھا یہی شکوہ
کہ کاروان کو مرے میر کارواں نہ ملا
بھٹک رہے ہیں مسافر ابھی بھی راہوں میں
ہزار حیف کہ منزل کا کچھ نشان نہ ملا

خوش آمدید! کہ رستہ انھیں دکھائے ہو
مسافروں کو صحیح راستے پہ لائے ہو

دکن میں گیسوئے اردو کو مل گیا شانہ!
پھر اک ادا سے مرتب ہوا ہے افسانہ
وہی ہے جام، وہی مے، وہی ہے میخانہ
وہی ہے لیلئے اردو کا رقص فرمانا ——

ہے کون جس نے کہ یہ معجزہ دکھایا ہے
خزاں کا دور تھا رنگِ بہار لایا ہے

کسی کی خاطر ناشاد جب ملول ہوئی
نئی ادا سے کلی بھی مہک کے پھول ہوئی
خلوص و شوق سے نکلی دعا قبول ہوئی
خوشا! کہ رحمتِ رب کرم نزول ہوئی

نئی ادائیں، نیا بانکپن مبارک ہو
تجھے یہ فخر اے ارضِ دکن! مبارک ہو

نئے ہی طور سے گلشن میں جب بہار آئی
ہر اک روش کو، ہر اک شاخ کو نکھار آئی
خوشا! کہ زلفِ عروسِ چمن سنوار آئی
زہے نصیب! کہ پھر غیب سے پکار آئی

قریب منزلِ مقصد ہے، فاصلہ نہ رہا
قلیؔ کی روح کو اب اور کچھ گلہ نہ رہا

اختر رضوانی

رباعیات

آرام کہاں چین کسے آیا ہے
کیا ایسا ہی رحمت کی تری سایا ہے
اک محسنِ اردو کو جدا ہم سے کیا
غفاریہ کیا تو نے ستم ڈھایا ہے

....

اے گوشۂ جنت کے بسانے والے
منہ پھیر کے احباب سے جانے والے
بھولے گا نہ تا حشر زمانہ تجھ کو
کرتے ہیں تجھے یاد زمانے والے

....

دنیا میں ترا نام و نشاں زندہ ہے
ہاں جذبۂ تعظیم زباں زندہ ہے
تصویر نگارش ہے تری حسن تمام
اے زورؔ ترا زورِ بیاں زندہ ہے

....

وحید مرزا

یادِ زورؔ

آراستہ ہے بزمِ مشاہیرِ علم وفن
اک شمع دل فروز مگر ہے بجھی ہوئی
کہتا ہے چپکے چپکے دلِ زار اب بھی
اس انجمن میں آج کسی کی کمی ہوئی
اردو کے کارواں پہ اداسی ہے آج بھی
چلتی ہے نبضِ وقت بھی دم توڑتی ہوئی
کس کس کو روئے لیلیٔ اردو بتائیے
یہ نامرادِ وقت کے ہاتھوں دکھی ہوئی
اردو زباں کے سوگ میں ایوان آج :
ماتم میں زورؔ کے صفِ ماتم بچھی ہوئی
مانا کہ زورؔ رونقِ محفل نہیں ر
لیکن اب اس کی یاد سے پھر روشنی ہوئی
بعدِ ممات اس کو نئی زندگی ملی
اپنے کیے پہ موت پشیمان بھی ہوئی
اک درد آنسوؤں میں سلگتا ہے آج بھی
اک ٹیس دل کے گوشوں کے اندر چھپی ہوئی

ماتمِ زور

اسد احسن جعفری

ساحب علم وفن کا ماتم ہے
شک صدا انجمن کا ماتم ہے

بجھ گیا روشنی کا اک مینار
ایک ظلمت شکن کا ماتم ہے

ریم فکر سوگوار سی ہے
یک عیسائے فن کا ماتم ہے

ایک تنویر ہم سے روٹھ گئی
جگمگاتی کرن کا ماتم ہے

تجھ کو غربت نصیب میر اسلام
مرگِ دور از وطن کا ماتم ہے

نقشِ فریادی

حکیم یوسف حسین خاں

ہم پہ اے یوسف یہ شاید طنز ہے تقدیر کا
جس کو الفت تھی دکن سے ہو رہا کشمیر کا

قصرِ اردو بن گیا قسمت سے اب چھاپہ محل
"ماتمی ہے پیرہن ہر پیکرِ تصویر کا"
رنگ مہجوری بھرو خطِ شفق دھندلا کرو
نقش فریادی ہوا ہے شوخیٔ تحریر کا

قطعہ

شیریں نے نگاہ پھیر لی ہے   نہروں کا بدل گیا بہاؤ
اب زور ادھر نہیں اُدھر ہے   کشمیر سے جوئے شیر لاؤ

میر یٰسین علی خاں

اے وادیٔ کشمیر بتا زورؔ کہاں ہے!

(۱)

ہے یاد کہ دکن سے چلا جب وہ مسافر   سینے سے لگائے ہوئے اردو کے دفاتر
ہم سب نے کہا تھا یہی دل تھام کے آخر   اللہ نگہبان، خدا حافظ و ناصر
اے وادیٔ کشمیر بتا زورؔ کہاں ہیں
کہتے ہیں یہ کچھ لوگ یہاں ہیں نہ وہاں ہیں

(۲)

ہم تو یہی سمجھے تھے بہاروں میں وہ ہوں گے   کشمیر کے صف بستہ نگاروں میں وہ ہوں گے
اک چاند کے مانند ستاروں میں وہ ہوں گے   بیٹھے ہوئے اردو کے اداروں میں وہ ہوں گے
وہ پھول کھلے ہوں گے مسیحا نفسی سے
گلزار رہوں اردو کے چمن جن کی ہنسی سے

(۳)

لیکن یہ خبر آئی کہ خاموش ہوئے زورؔ   دنیا کے بکھیڑوں سے سبکدوش ہوئے زورؔ
منہ موڑ کے ہم سب سے کفن پوش ہوئے زورؔ   اے خاکِ لحد تجھ سے ہم آغوش ہوئے زورؔ
موت آئی مسافر کو غریب الوطنی کی
کشمیر کو سونپی گئی مٹی دکنی کی

(۴)

شاداب تھا جو پھول وہ مرجھا کے گرا ہے   دہقان نے ناپختہ ثمر توڑ لیا ہے
سرسبز تھا جو باغ وہ تاراج ہوا ہے   سرچشمۂ یک جوئے رواں سوکھ گیا ہے
جس شے کا گماں تک نہ تھا وہ بات ہوئی ہے
دن ڈھلنے سے پہلے یہ عجب رات ہوئی ہے

جمیل نقوی

خلوص کا سلام

سن تو ہی محی دیں مایۂ نازشِ دکن
فخرِ گروہ عالماں اعلم دفترِ کہن
اے کہ ترا وجود تھا مرکزِ محفلِ سخن
تیری نوا کے سوز سے کتنے دلوں میں تھی لگن
چشمۂ فیضِ عام تھا تیرا ہر ایک موئے بدن
علم و ادب کے نام پر وقف تھے تیرے جان تن
تیرا دلِ غم آشنا حاملِ جذبۂ وطن
تیری نظر تھی ژرف بیں تیرا قلم تھا بت شکن
تیری نگاہ نکتہ رس کم نگہوں پہ خندہ زن
تیرے عمل کا آئینہ تیرے جنوں کا بانکپن
دہر میں ہر طرف ترا بحرِ کرم تھا موجزن
تیرے کمال کے مقر تھے سبھی شیخ و برہمن
اہلِ وطن کو بخش کر عزتِ نفس کا چلن
آپ ہی اپنی آگ میں جل بجھی شمعِ مؤتمن

خواجۂ شہرِ جستجو مستحق صد احترام
اشرف و کامل ادب ماہر و واقف تمام
کاشفِ رمزِ دکنیاں روحِ سلف سے ہمکلام
دینِ ادب میں مرتبہ جن کا مجددِ امام
تیرے خلوص سے ملا ان کو بلند تر مقام
بزمِ ادب میں گونج اٹھی جب سے تری صلائے عام
تیری سعی سے چھٹ گیا سایۂ داغِ ناتمام
کہنہ ادب کے باب میں تیرا وہ حسن انتظام
یاد ہے تیری مفتخر مند شہرت دوام
تیری روانِ پاک کو میرے خلوص کا سلام

مجیب خیرآبادی

اے زور

اے زورؔ تری گیسوؤں والی ہے پریشاں   وہ سانولی' وہ نازوں کی پالی ہے پریشاں
افشاں ہے نہ سیندور نہ ٹیکہ ہے نہ چندن   پھر آبروئے غالبؔ و حالیؔ ہے پریشاں
ڈھونڈھے گی تری صبح کو ہر رات دکن کی
روئے گی ابد تک تجھے برسات دکن کی
اب منت سلمائے ہنر کون کرے گا   یوں پرورش فکر و نظر کون کرے گا
آرایش گیسوئے ادب ختم ہے تجھ پر   تحقیق کی وادی میں سفر کون کرے گا
پائندہ زمانے میں ترا کام رہے گا
صدیوں سر فہرست ترا نام رہے گا
سب رس کی قسم پیکر شیریں سخنی تھا   دلبند ولیؔ' روح سراجؔ دکنی تھا
کیا کیا نہ لٹائے تھے تری فکر نے موتی   تو گنج گراں مایہ تھا لعل یمنی تھا
جس سمت تری طبع کی یلغار ہوئی ہے
بے آب زمیں روکش گلزار ہوئی ہے
کب کوچۂ جاناں میں طرحدار نہ تھا تو   کب یوسف شہر لب و رخسار نہ تھا تو
تقریر میں کب تیری زباں سے نہ جھڑے پھول   تحریر میں کب صاحب افکار نہ تھا تو
اردو کی لگن تجھ کو سرافراز کرے گی
تاریخ ادب تجھ پہ سدا ناز کرے گی
دل چاک' زباں گنگ' نظر گرم فغاں ہے   اک عالم حیرت ہے یقیں ہے نہ گماں ہے
اے بھاگ نگر ڈھونڈھ کہاں ہے وہ طرحدار   اے لیلی اردو۔ ترا دیوانہ کہاں ہے
کشمیر سے رخصت کا پیام آ گیا اس کو
یا ـــ وادیٔ گلپوش کا غم کھا گیا اس کو

آہ ڈاکٹر زور

ب عارف

قطعۂ تاریخ رحلت

رحلتِ زور سے خدا کی قسم — آج ہر آنکھ ہو گئی پُرنم
بے شبہ تھے زبانِ اردو کے — ڈاکٹر "زور محسن اعظم"
۱۳ ـــ ۸۲

ـــــــــ

اے آسمانِ علم و تمدن کے آفتاب — اے ہر نگاہِ محرمِ ہستی کا انتخاب
تو ہوش کی بہار تھا تو عزم کا شباب — ممکن نہیں ملے ترا تاریخ میں جواب
گلپوش وادیوں میں تری روح کھو گئی
اہلِ وطن کی زندگی بے زور ہو گئی

جس کے غمِ حیات میں بھی تھا خوشی کا رنگ — مردوں میں بھی جو بھرتا تھا اک زندگی کا رنگ
دیکھا ہے اہلِ ہوش نے یوم قلی کا رنگ — ہر کام میں تھا جس کے نئے دلکشی کا رنگ
اہلِ زباں میں اس کی فقط داستاں ہے اب
وہ زور وہ ادیب وہ شاعر کہاں ہے اب

بے انتہا خلوص سے عزمِ جواں کے ساتھ — سوزِ نہاں لئے ہوئے جوشِ عیاں کے ساتھ
رنگِ بہارِ بن کے تھا اس گلستاں کے ساتھ — زندہ ہے تیرا نام بھی اردو زباں کے ساتھ
ہر حیثیت سے ماہرِ ہر علم و فن رہا
تو اعتبارِ عظمت و شانِ دکن رہا

جذبِ وفا کی شدت تاثیر دیکھنا — ہر اک ہے تیرے واسطے دلگیر دیکھنا
اہلِ وطن کی شومیٔ تقدیر دیکھنا — اب بس میں ہے فقط تری تصویر دیکھنا
پیوندِ خاکِ وادیٔ کشمیر ہو گیا
اک کوہِ نور تھا جو نگاہوں سے کھو گیا

ـــــــــ

انوار ظہوری

ادیبِ مشرق

(نذرِ زور)

دکن میں گولکنڈہ کے در و دیوار شاہد ہیں ۔۔۔ تری مانند مردِ باعمل کوئی نہیں دیکھا
نہیں تنہا ظہوری مضطرب، ہیں ماتمی لاکھوں ۔۔۔ ترے ذہنِ رسا کی تھی ہمیشہ معترف دنیا
اِدھر گوداوری اور تنگبھدرا خون روتے ہیں ۔۔۔ دھڑکتا ہے اُدھر سینہ کرشنا اور موسیٰ کا
تری ناوقت رحلت کر گئی مغموم کتنوں کو ۔۔۔ ایلورہ کی زمیں کانپی، اجنتہ کا وطن تڑپا
ابھی امجد کو روئے تھے ابھی شاہد کو روئے تھے ۔۔۔ ہمیں اے زورؔ تیری موت کا ماتم بھی کرنا تھا

ہیں پاک و ہند نالاں، دردمندانِ دکن گریاں ۔۔۔ جو تیری موت نے بخشا نہیں وہ زخم بھرنے کا
درخشاں کر گیا تو نقشِ ہستی لوحِ عالم پر ۔۔۔ کریں کیوں زورؔ ماتم تیرے دنیا سے گزرنے کا
خوشی اس امر کی ہے عمر بھر ثابت قدم رہ کر ۔۔۔ بتایا عصرِ نو میں فرق جینے اور مرنے کا
ہٹا کر ابر کے ٹکڑے جھمکتے آفتابوں سے ۔۔۔ یہ پاسِ فکر و فن سب کو دیا موقع ابھرنے کا
تری سعیِ مسلسل نے تری تحقیق پیہم نے ۔۔۔ سکھایا نوجوانوں کو سلیقہ کام کرنے کا

ملا یہ درس تیری مخلصانہ سعی و کاوش سے ۔۔۔ بدل دیتے ہیں خود مردانِ حُر قوموں کی تقدیریں
زمینِ وقت سے تو نے ابھارا قصرِ ماضی کو ۔۔۔ دکھانا تھیں دکن کے عہدِ زریں کی جو تصویریں
سنائے زندگی بھر عظمتِ رفتہ کے افسانے ۔۔۔ کہ تھیں مقصود ہستیِ حال و مستقبل کی تعمیریں
جھنجھوڑا کتنے ذہنوں کو ترے زندہ عزائم نے ۔۔۔ مکمل درس ہیں تیری نتائج خیز تدبیریں
بڑھائی اور بھی کچھ تو نے رونق شہر اردو کی ۔۔۔ دکن کی مانگ میں افشاں ہیں گویا تیری تحریریں

تجھے بابائے اردو سے زیادہ کام کرنا تھا ۔۔۔ کہ سارے ہند میں اردو کی تھی ناگفتنی حالت
سیاسی مصلحت کیشوں نے قوت آزمائی کی ۔۔۔ مگر ان سے بھی تو منوا گیا اردو کی اہمیت

بجز بی رام کرنا جانتا تھا اپنے اعداء کو — دلوں کو جیتنے کے فن سے واقف تھی حسیں فطرت
ہزاروں صاحبانِ علم تھے حلقہ بگوشوں میں — تجھے قدرت نے بخشی تھی وہ پہلو دار شخصیت
تری تحقیق کے جوہر کھلے جب سامنے آئے — قلی۔ وجہی۔ غواصی۔ شاہ راجو۔ نصرتی۔ دولت [1]

عمل کوشی تری ہر رگ میں رقصاں تھی لہو بن کر — کوئی سیکھے ترے دل سے وفاکیشی کے پیرائے
تری خدمت نے ٹھہرایا تجھے مخدوم اردو کا — جسے بھی اس تعلق سے ہو دعویٰ سامنے آئے
دیا انجام وہ کارِ نمایاں تیس برسوں میں — جو پینسٹھ سال کے عرصے میں عبدالحق نہ کرپائے
توقع تھی کہ تو کچھ اور بھی جوہر دکھائے گا — کسے معلوم تھا منڈلا رہے تھے موت کے سائے
مقدر ہو چکی تھی جنتِ کشمیر دنیا میں — بہشتِ قدس کی آب و ہوا بھی ساز گار آئے

دلوں پر نقش ہیں محفوظ ہیں اذہان میں دونوں — نظر کا بولتا جادو۔ عمل کی سحر انگیزی
طبیعت سادہ، فطرت نیک، خوش اوصاف، پاکیزہ — جو تھا اخلاص نیت میں تو سیرت میں دل آویزی
ترا کردار اک تفسیر تھا آدابِ مشرق کی — مسخر کر سکی تھی کب تجھے تعلیم انگریزی
رہا بے خوف مردانہ صفت ہر آزمائش میں — مسلم ہے ترے شوقِ مسلسل کی بلاخیزی
ہنرمندوں کو لے آئی ہے آخر ایک مرکز پر — طریقِ کار کی خوبی، خیال و فکر کی تیزی

سدا شامل رہے تیرے کمربستہ رفیقوں میں — نصیر الدین۔ شاہد۔ وجد۔ سکینہ۔ نظر۔ اکبر
ہے تیری فکر سے روشن ہے تیرے نور سے تاباں — دیارِ شاد و امجد۔ ارضِ مخدوم و علی اختر
ہوئے منت کشِ احساں ترے اذنِ تجسس کے — قیاسی۔ مہر۔ غدا۔ یار۔ عاجز۔ مہرباں۔ انور [2]
وطن ممتاز ہے تیرا ولی کی فکرِ عالی سے — غزل کی مہرِ اول ثبت ہے اردو کے ماتھے پر
ادیبِ شرق اب قسمت زبانِ میر و غالب کی — درخشاں ہے ترے نوکِ قلم کا فیصلہ بن کر

تری بے لوث خدمت نے تری بیباک جرأت نے — کیا آدابِ ہستی سے شناسا نوجوانوں کو
مرتب تو نے کی تاریخ تہذیب و ثقافت کی — دیا آب و نمک ارضِ دکن کی داستانوں کو
نکالا اُن کو سینہ چیر کر ادوارِ ماضی کا — زمانہ کر چکا تھا دفن جن علمی خزانوں کو

---

[1] دکن کے چند متقدمین اہلِ قلم۔
[2] دکن کے بعض قدیم شعراء۔

جو اندیشہ بد امن تھے غمِ حالات کے باعث — حرارت زندگی کی دے گیا اُن خستہ جانوں کو
تجھے اُردو نے پایا ہند میں یہ خوش نصیبی تھی — ملے ہیں یوں تو خادم اور بھی دیگر زبانوں کو

تری خدمات کے ہیں معترف سب عہد حاضر میں — دکنی کی سرزمیں کا مُفتخر اسلوب سمجھایا
کیا دنیا کو تو نے آشنا ان باکمالوں سے — چھپا بیٹھا تھا جن کو زیرِ دامن وقت کا سایا
بہت گمنام تھے پہنچا کے ان کو بامِ شہرت پر — دکن کے صاحبانِ فکر و فن کا نام چمکایا
کبھی نقد و نظر تجزیۂ افکار کی خاطر — کبھی اربابِ دانش کا مُرقع سامنے لایا
کسی فنکار کی الفاظ میں تصویر دکھلائی — کسی صاحب خرد کی فکر کا انداز بتلایا

نکالے ڈھونڈ کر تو نے چھپے شہکار اُردو کے — کہیں تجھ سا نہیں پایا کمالِ فن کا شیدائی
بہ شکلِ نور پھیلی ملک میں تیری توجہ ہے — ولی کی فکر آرائی، قطبی کی نغمہ پیرائی
نقوشِ پا سے روشن کر گئی ہے رہگذاروں کو — ہے خود رہبر۔ تری منزل بہ منزل جادہ پیمائی
رہی تا زندگی اس طرح مقصد کی لگن دل میں — ہے تیرے بے ریا اخلاص کی دنیا تماشائی
تری مانند پاک و ہند کی آنکھوں نے کب دیکھا — کوئی اُردو کا دیوانہ کوئی اردو کا سودائی

ظہر کامل

تاریخی نظم

ـــــــ ڈاکٹر زور کی وفات پر ـــــــ

ے عاشق لیلائے اردو جب تو نے اچانک پردہ کیا
کتنوں کے دلوں میں گھر تھا ترا اس وقت کہیں معلوم ہوا

ں نام محی الدین تھا مگر اردو کی مسیحائی کی
دم توڑنے والی اردو کا کیا کچھ نہ مداوا تو نے کیا

ی عمر بسر تو نے ساری تاریخ و ادب کی خدمت میں
یہ ایک حقیقت ہے جس پر شاہد ہے دکن کی ساری فضا

س زور کا ماتم ہے برپا ہر سمت جہان اردو میں
کس کس نے کلیجہ چھوڑ دیا اک تیرا فقط دل کیا بیٹھا

ردو کے پرستاروں کیلئے ایوانِ ادارہ اب بھی ہے
رونق تھی مگر ان کی جس سے افسوس وہی باقی نہ رہا

تھوڑے سے تصرف سے تجھ پر یہ مصرعۂ فانی کھلتا ہے
غربت بھی نہ تجھ کو راس آئی اور ہائے وطن بھی چھوٹ گیا

اے پیکر عزم و جہد و عمل اخلاص کی برکت سے تیرے
جب تو نے اٹھایا کوئی قدم منزل نے تجھے خود بڑھ کے لیا

ردار کا تیرے یہ پہلو اربابِ نظر پر روشن ہے
تو زیست کی ہر اک منزل میں محسود رہا حاسد نہ بنا

مظہر نے حقیقت پر مبنی رحلت کی ترے تاریخ کہی
اُردو کے فدائی مونس کو کشمیر نے ہم سے چھین لیا

۱۳۸۲ ہجری

محمد اکبر الدین صدیقی

آہ ڈاکٹر زور

خوب جی بھر کے رو قطب شہ کے وطن
جس نے بخشی تجھے آن اور بانکپن
جس نے دیں تجھکو رعنائیاں اور پھبن
تیری خاطر نہ لائی جبیں پر شکن
جس نے مہکا دیا تیرا سارا چمن
ہوگئی جس سے گلنار ارض دکن
آج پہنے ہوئے ہے وہ اُجلا کفن
حیف ارض دکن! حیف ارض دکن!!

جس سے ایک ایک ذرہ بنا آفتاب
جس نے دی کا کلوں کو نئی پیچ و تاب
جس نے الٹی معانی کے رخ سے نقاب
جس کی کوشش تھی تفسیر لی فتح باب
جس کے چہرہ پہ کھلتے تھے اکثر گلاب
جس پہ سایہ فگن تھا ابھی تک شباب
ایک ہلکورے سے آہ ٹوٹا حباب
حیف ارض دکن! حیف ارض دکن!!

جس کی باتیں ہمیشہ تھی قند انگبیں
زہر ہو کر بھی رہتیں حیات آفریں
تھا وہ گا ہے چناں اور گا ہے چنیں
رہ کے کشمیر میں تھا دلوں کے قریں
اس کے جانے کا مجھ کو نہ آیا یقیں
کیوں نہ بھائی وطن کی اسے سرزمیں
آج تیری انگوٹھی کا اُکھڑا نگیں
حیف ارض دکن! حیف ارض دکن!!

کاشمر! تو نے چھینا ہے گنج گراں
خوب کی میہانی بنا میزباں
اپنے محسن سے اور ایسی گستاخیاں
کتنا یہ سخت ہے ضبط کا امتحاں
اب شکایت کا موقع نہیں اے زباں!
نذر ہے میری یہ سلک اشک رواں
اس کے روضہ پہ رکھ اور ہو نوح[illegible]
حیف ارض دکن! حیف ارض[illegible]

وہ دکن، جس نے اپنوں کو پوچھا نہیں
لعل گدڑی میں تھے اس نے دیکھا نہیں
عقل کے زعم میں جس کو سوجھا نہیں
جس نے اپنے جواہر کو پرکھا نہیں
یونہی دل میں میں نے تو رکھا نہیں
آہ، کہوں راز میں تجھ سے پردا نہیں
گو کہ محروم ارض دکن
میری تقدیر اس کا کفن

اس کے نغموں سے گونجیں مری وادیاں
اس نے اردو کا پرچم اڑایا یہاں
اس کی بانگ درا سے بڑھا کارواں
تھا وہ سعی و عمل کا بڑا رازداں
تو وہ برف میں تھا وہ آتش فشاں
ثبت ہو گی زمانے پہ یہ داستاں
اپنے سینے میں میں نے اسے ر[illegible]
تاکہ تاباں رہیں میرے ا[illegible]

محمد اکبر الدین صدیقی

ڈاکٹر زور کی یاد میں

آج سونی ہے ہر بزم ہر انجمن
اور شمعوں نے پہنا دھوئیں کا کفن
نغمہ خواں بن گئے نوحہ خواں سینہ زن
دھجیاں دھجیاں ہو گیا پیرہن
لٹ گئی کاشمر میں متاعِ دکن
کیا خبر آ گئی ناگہاں دوستو

مرگ امجدؔ میں آنسو ابھی تھے رواں
ایک شاربؔ گیا سرورِ میکشاں
اٹھ گیا ہے پھر شاہدؔ نغمہ خواں
زور کی موت سے پھٹ پڑا آسماں
تیغ منزل پہ آیا نہ تھا کارواں
منتشر ہو گئے رہرواں دوستو

جس نے اردو کی خاطر کمر تھی کسی
جس کی نس نس میں روحِ دکن تھی بسی
نام میں قطب شہ کا تو آئے ہنسی
جس سے چھپتی رہی عمر بھر بے کسی
موت غربت میں آئی ہے اور بے بسی
اس کی میت پہ ہے نوحہ خواں دوستو

ٹکڑے ٹکڑے ہوئے آج جام و سبو
اب گلوں سے بھی چھینے گئے رنگ و بو
سرخ چہروں نے زردی کی لی آبرو
ہیں سیہ پوش اردو کے سب کاخ و کو
اب خرابے میں ہوگی کہاں جستجو
اٹھ گیا حیف پیرِ مغاں دوستو

گر گیا ہے کلس آج "ایوان" کا
داستاں بن گیا خود ہی داستاں سرا
تھا جو لعلِ دکن نورِ عقد ہند کا
ایک عنواں تھا حرفِ غلط تو نہ تھا
روکتا کوئی اے کاش دستِ قضا
موت کیوں ہو گئی کامراں دوستو

پروفیسر ایس ایل بخشی اختر امرتسری

قطعۂ تاریخ

از جہاں رفت زور نیک نہاد
لعن بر تو سپہر ظلم ایجاد
وائے اے ڈاکٹر محی الدین
حسرتا مردِ فاضل و فرجاد
در فراقت چہ خوں می گرید
"حلقۂ ادبیاتِ حیدرآباد"
بہرِ تاریخِ مرگِ بے ہنگام
فکر چوں کرد ایں دلِ ناشاد
ہاتف از غیب گفت اے اختر
فرصتِ وقت را مکُن برباد
پائے بد قطع کردہ باز بگو
"حیف گل شد چراغ حیدرآباد"

۱۸۸۴ شک

۲

ڈاکٹر عزیز تمنائی

میں نے تجھے دیکھا تو نہیں.

میں نے تجھے دیکھا تو نہیں تیری صنّاعی دیکھی۔
شاخِ چمن کے ہر پتّے پر تیری نشانی دیکھی ـ
تیرے ذہن میں جو ابھری تھیں اب زندہ تصویریں ہیں
اردو کے رنگیں خوابوں کی یہ گویا تعبیریں ہیں
ایوانِ اردو کی اک اک اینٹ پہ تیرے بوسے ہیں
اس بستی کے سارے باسی تیرے پالے پوسے ہیں
تیرے دم سے ارضِ دکن نے لاکھوں ہیرے اگلے تھے
کتنے ڈھکے موتی دریا کی تہہ میں تو نے پائے تھے
طوفانوں نے بھونچالوں نے کتنا زور لگایا تھا
تو نے اک اک سدِّ راہ کو پھول سمجھ کے اٹھایا تھا
جن راہوں میں سرگرداں اہلِ قلم کو دیکھا۔
ان مشکل راہوں میں تیرے نقشِ قدم کو دیکھا۔

میں نے تجھے دیکھا تو نہیں تیری ہر صورت دیکھی۔
خاکِ دکن کے ہر ذرّے میں تیری مورت دیکھی۔
وقت کی لوحِ رواں پر تیرے نقشِ قلم تابندہ ہیں
تو نہ رہا لیکن تیرے شہ پارے اب بھی زندہ ہیں
لاکھ زمانہ پہلو بدلے لاکھ جہاں بدلے کروٹ
گونج رہی ہوگی صدیوں کے سینے میں تیری آہٹ

قطعۂ تاریخ وفات ڈاکٹر زور

ان خطیب

(۱)

کیا قیامت ہے ایک ساتھی کا
بیچ رستہ میں ساتھ چھوٹا ہے
زورِ بازو تھے زورؔ اردو کے
آج اردو کا زور ٹوٹا ہے

(۲)

کون دنیا سے اٹھ گیا محسن
کس کے غم میں یہ کھو گئی اردو
زورؔ صاحب کے ایک جانے سے
کتنی کمزور ہو گئی اردو

ش الدین فریدی

کون یہ ماجرائے درد کہے
دل زباں کا الٹ گیا افسوس
کیسا انسان ہو گیا رخصت
زورِ اردو کا گھٹ گیا افسوس

فضل گلبرگوی

ہر وقت گھٹا چھائے گی گھنگھور کہاں
وہ ہمہمہ وہ غلغلہ وہ شور کہاں
ہر بزمِ ادب آج ہے سونی سونی
اردو تری محفل میں ہے اب زورؔ کہاں

۱۹۶۲

محمد عزیز الدین مبشر انصاری

زورؔ کا تارِ زندگی ٹوٹا
سازِ اردو کے غم نواز ہیں اب
اے مبشر کہو سنِ رحلت
"زور جنت میں سرفراز ہیں اب"

۱۳۸۲ھ

ڈاکٹر ثامن علی نیساں

زورؔ کی تاریخِ رحلت کی تھی فکر
چل کے کاغذ پہ یہ خامے نے کہا
ماہِ ستمبر کی تھی چوبیسویں
اور نیساںؔ دن تھا وہ اتوار کا

عیسوی انیس سو باسٹھ تھا سال
زورؔ نے کشمیر میں جب کی قضا

قطعۂ تاریخ وفات

بشیر احمد خاں

زورِ اردو کا وہ مردِ میداں
جس کی تھی اہلِ سخن میں شہرت
نہ رہی اس کو وطن کی سدھ بدھ
راس آیا نہ دیارِ غربت
دیکھ کر حسنِ بہارِ کشمیر
رک گئی دل کی یکایک حرکت
فکر شاعر نے کہا سالِ وفات
باصد اندوہ، ملال و حسرت
حضرت زور بلاشبہ بشیر
ہو گئے ـــــ آج غریقِ رحمت

۱۹ ۶ ۲

قطعۂ تاریخی

ابوالمجاہد محمد احمد اللہ احمد قادری

محی دین قادری زورِ خوشگو
صاحبِ علم و ہنر عاملِ حق
فخرِ تہذیب و تمدن آثار
رونقِ بزمِ سخن قائلِ حق
حامیِ خاص زبانِ اردو
خادمِ ملک و وطن حاملِ حق
درغریب الوطنی کرد قضا
ازہمہ دور شدہ شاملِ حق
سالِ رحلت ہمیں بنویس احمد
ڈاکٹر زور شدہ واصلِ حق

۱۳ ھ ۸۲

ڈاکٹر زور کے خیال میں

انجم آفندی

کتنے صدمے گزر چکے ہیں اب تک
کتنے آنسو بکھر چکے ہیں اب تک
کیا میں یہی گننے کے لئے جیتا ہوں
کتنے احباب مر چکے ہیں اب تک

قطعۂ تعزیت

سید اکرم علی

دل و جاں اپنی اردو پر فدا کی
ابوالحسنات پر رحمت خدا کی
ملا اکرم صلہ حسنِ عمل کا
فنا سے زور نے حاصل بقا کی

تاریخ رحلت ڈاکٹر زور

عظیم الدین محبت

"انتقالِ ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور"

۶۱۹۶۲

ـــــ رباعی ـــــ

جنوں کی آگ پر بے چین پارہ تھا
بلندی پر سے جو چمکے وہ تارہ تھا
تری سعی عمل کا زور کیا کہنا!
تو اپنی ذات سے خود اک ادارہ تھا

تاریخ وفات

عبدالحق برق

از دکن چوں بہ کاشمیر دوید
بخدا حرف ارجعی بشنید
سیدآں قادری زورؔ آور
محی دیں بود وسوئے کعبہ خمید
روح پاکش پرید تا قادر
نفس آخریں چو باز دمید
نالہ ہا زد بلابل کشمیر!
گل وریحاں بہ تربتش بہ چمید
آرمیدہ بہ روضۂ اجداد
آہ محی بہ اصل خویش رسید

۱۳۸۲ھ

تاریخ وفات

الطاف شاہد کراچی

بہ صد جبروت کی خدمت ادب کی
زباں ہے زورؔ کی مدحت میں قاصر
پئے تاریخ سب مانیں گے اس کو
محقق شاعر و فن کار جابر

۱۳۸۲ھ

قطعات تاریخی رحلت زور

ابوالقاسم سید مہدی حسن قادری مہدی

— ۱ —

پردہ کرد از جہان شد پنہاں
منزلے یافت او بباغ جناں
جاں زسر رفت و گشت ایں تاریخ
شد جہاں زیب زورؔ خلد مکاں

۴

۱۳۸۶ – ۴ = ۱۳۸۲ھ

— ۲ —

تھے وہ دریائے علم کی اک نہر
اور مشہور تھے وہ شہر بشہر
یہ ہے تاریخ ان کی رحلت کی
خلد مسکن ہیں زورؔ کامل دہر

۱۳۸۲ھ

— ۳ —

ان کو جتنا سراہئے کم ہے
بزم اردو میں ان کا ماتم ہے
با سر ہائے نکلی یہ تاریخ
رحلتِ زور موجب غم ہے

۵

۱۹۵۷ + ۵ = ۱۹۶۲ء

— ۴ —

دلِ احباب میں اور دیدۂ بینا میں رہتے ہیں
وہ دنیا میں نہیں ہیں منزل عقبیٰ میں رہتے ہیں
جب اترا سر سے بار زندگی تو یہ ہوئی تاریخ
محی الدین زورؔ اب محفل مولا میں رہتے ہیں

۲

۱۳۸۴ – ۲ = ۱۳۸۲ھ

سید احمد اللہ قادری بی اے عثمانیہ

میرِ کارواں

رُخِ حیات سے رُخ آج کس نے پھیرا ہے
فضا اداس ہے مایوسیوں نے گھیرا ہے
یہ کس نے غم کا تاثر یہاں بکھیرا ہے
کہ آج اُردو کے "ایوان" میں اندھیرا ہے

دلوں میں چھائی ہوئی سی جو ظلمتِ غم ہے
کوئی چراغ بجھا ہے کہ روشنی کم ہے

وہ زورِ عہدِ قطب شاہیوں کا متوالا
ادارۂ ادبیات کا وہ رکھوالا
وہ شمع بزمِ ادب وہ تجلیوں والا
دکن کے جادۂ تحقیق کا وہ رکھوالا

اِسی کے ہجر میں ہر آنکھ اشکبار ہے آج
اِسی کے غم میں وطن سارا سوگوار ہے آج

شعور جس کا تھا شامل کئی اداروں میں
تھا عکسِ فکر و نظر جس کا شاہکاروں میں
رہے گا یوم قلی جس کی یادگاروں میں
وہ ہائے کھو گیا کشمیر کی بہاروں میں

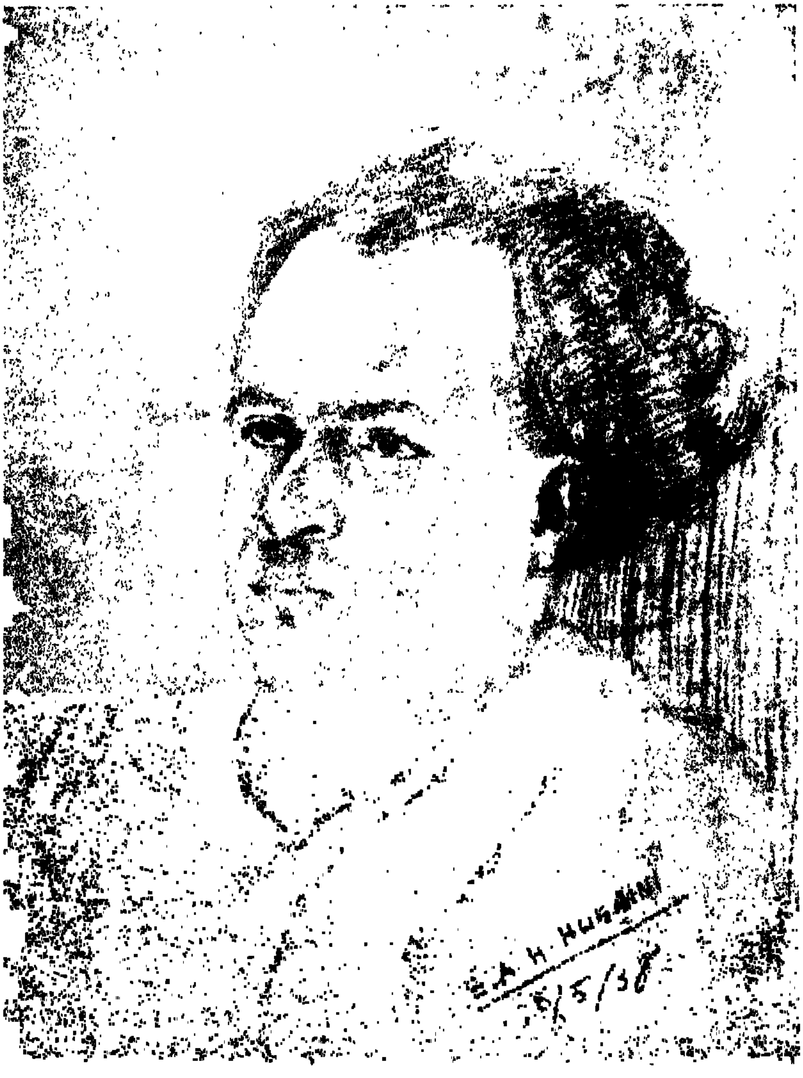
یہ گولکنڈہ کا ہیرا ہے کوہِ
ہمالیہ ہے اگر طورِ برق
شرف یہ وادیٔ کشمیر تجھ کو حاصل
کہ تجھ میں دفن دکن کا وہ مردِ قابل
ادب نواز ہے علم و عمل میں کا
دکن کا نورِ نظر ہے جنوب کا دل

اب اِس کی جہدِ مسلسل کا پوچھ
کہ جان دیکے ملا دی حدِ جنو
رواں دواں تھا ترا قافلہ سوئے منز
ادیب و شاعر و نقاد اس میں تھے
نہ بچ سکا تری نظروں سے جو
عمل کے جوش سے رفتارِ وقت بھی
نقوشِ عہدِ گذشتہ کا پاس
کہ کارواں تو ہے میرِ کارو

ڈاکٹر زور کے

منتخب مضامین

مطبوعہ و غیر مطبوعہ



حِصّہ دُوّم

ڈاکٹر زور

کے

منتخب مضامین۔ خطبات۔ خطوط۔ نظمیں۔ غزلیں

اور

مقالہ نما

黒ノ巻

محمد قلی قطب شاہ

مُحَمّد قلی قطب شاہ گولکنڈے کا پانچواں بادشاہ تھا۔ اس کے دادا سلطان قلی نے بہمنی بادشاہوں کے زوال کے بعد تلنگانہ میں قطب شاہی سلطنت کی بنا ڈالی تھی۔ اور اس کے والد ابراہیم قطب شاہ نے آندھرا دیس میں ایک ایسی سلطنت بنانے میں کامیابی حاصل کی جس میں ہندوؤں اور مسلمانوں کو برابر کی ذمہ داریاں سونپی گئی تھیں۔ اس نے فارسی اور اُردو کے علاوہ تلگو ادب کی بھی سرپرستی کی اور اپنے دربار کو ادب اور کلچر کے لحاظ سے رنگا رنگ بنا دیا۔ اسی ماحول میں محمد قلی قطب شاہ جمعہ کے دن ۴ر اپریل ۱۵۶۶ء کو پیدا ہوا۔ وہ اس خاندان کا سب سے بڑا بادشاہ تھا اور اس کے عہد میں گولکنڈہ دُنیا بھر کے سیاحوں اور تاجروں سے اتنا معمور ہو گیا کہ اس کو گولکنڈے سے باہر نکل کر موسیٰ ندی سے متصل ایک نیا پایۂ تخت بنانا پڑا جو خوش قسمتی سے آج تک اس ملک کا پایہ تخت بنا ہوا ہے اور اس کی خوب صورتی اور رونق میں روز بروز اضافہ ہوتا جا رہا ہے۔

محمد قلی قطب شاہ کی ابتدائی زندگی کے حالات اس خوبی سے اب تک محفوظ ہیں کہ شاید ہی کسی اور بادشاہ کے ایسے حالات صدیوں بعد بھی اس تفصیل سے مل سکیں۔ وہ بچپن سے رنگین مزاج اور شعر و سخن کا دل دادہ تھا اس وقت گولکنڈے میں احمد آباد۔ بُرہان پور۔ احمد نگر اور بیدر کے شاعر اور ادیب جمع تھے اور ایک ایسی فضا پیدا ہو گئی تھی جس سے محمد قلی کا متاثر ہونا ضروری تھا۔ کہا جاتا ہے کہ محمد قلی کی ماں بھاگیہ رتی ایک تلگو بولنے والی عورت تھی جس کی وجہ سے محمد قلی اس زبان میں بھی شعر و سخن لکھا کرتا تھا۔ اس کے دوسرے بھائیوں کے موجود ہوتے ہوئے اس کے تخت نشیں ہونے میں گولکنڈے کے آندھرا سرداروں اور امیروں نے بڑا حصہ لیا کیونکہ وہ محمد قلی میں اس کی ماں کی وجہ سے دلچسپی رکھتے تھے اور اس کے بڑے بھائیوں کے موجود ہوتے ہوئے اس کو تخت نشیں کرنے میں یہ مصلحت بھی تھی کہ وہ تلگو زبان بھی بولتا اور لکھتا تھا۔

ابراہیم قطب شاہ کے انتقال کے وقت محمد قلی صرف پندرہ برس کا تھا۔ چنانچہ وہ چودہ (۱۴) سال سات ماہ اور آٹھ دن کی عمر میں تخت نشیں ہوا۔ اور چونکہ فطرت میں سخاوت اور کشادہ دلی تھی اس لیے بادشاہ ہوتے ہی دل کھول کر انعام و اکرام تقسیم کیا۔ عوام۔ غریبوں۔ اور مسکینوں کو اتنا دیا کہ اس روز سے گولکنڈے کی رعایا فارغ البال اور خوش حال ہو گئی۔ اس کے عدل و انصاف اور شاہانہ جاہ و جلال کا یہ حال تھا کہ باوجود کم عمر ہونے کے اس نے تمام امیروں اور سرداروں کو خواہ وہ کسی مذہب کے ہوں ایک دوسرے سے بڑھنے کا موقع نہ دیا۔ اور اپنی تدبیر و فراست سے سب کو خوش اور وفادار بنائے رکھا۔

اپنی تخت نشینی سے پندرہ سال بعد محمد قلی قطب شاہ نے شہر حیدرآباد کی بنا ڈالی۔ یہ شہر اسی موضع چچلم کی جگہ بنایا گیا جہاں اس کے بچپن کی محبوبہ بھاگ متی رہا کرتی تھی۔ چنانچہ اس شہر کا نام بھی بھاگ نگر رکھا گیا لیکن جب بھاگ متی کو حیدر محل کا خطاب

دیا تو شہر کا نام بدل کر حیدر آباد رکھ دیا جو آج تک چلا آتا ہے۔

حیدر آباد کی تعمیر کے زمانے میں محمد قلی قطب شاہ کے وزیر اعظم اور پیشوائے سلطنت ایک بہت بڑے عالم اور میر محمد مومن تھے۔ ان کا بادشاہ پر بڑا اثر تھا۔ یہ مسلمانوں کے فرقۂ امامیہ کے مجتہد اور مبلغ تھے۔ انھوں نے بادشاہ کو بھی کے اصولوں کا اتنا گرویدہ بنا لیا کہ اس نے پوری سلطنت میں ہر جگہ عاشور خانے بنوائے اور عَلَم اور تازیوں کو رواج د محرم کے زمانے میں ہندو اور مسلمان دونوں ایام عزا میں دلچسپی لینے لگے اور یہ رواج کئی سو سال گزر جانے کے بعد بھی اب میں موجود ہے۔ اور کئی دیہات کے عاشور خانوں کے متولی ہندو چلے آتے ہیں۔

محمد قلی قطب شاہ اُردو کا پہلا صاحبِ دیوان شاعر حیدر آباد جیسے عمدہ شہر کا بانی اور اہلِ بیتِ کرام کا شید کے ساتھ ساتھ موجودہ تمدّن اور تہذیب کا بھی تعمیر کار تھا۔ اس نے دکن کو سماجی اور تمدّنی نقطۂ نظر سے ایک با پہنچانے کی جو کوششیں کیں ان میں مذہبی اور غیر مذہبی عیدوں کو رائج کرنے اور ان کو خاص سلیقے اور اہتمام کے ساتھ کے ڈھنگ بھی شامل ہیں۔ اس نے اپنے عہد میں کسی کو سزائے موت نہیں دی اس کے دستر خوان پر کسی وقت اَ سے کم آدمی نہ ہوتے۔ اور اسی طرح اس کے دربار اور داد محل کے دروازے ہر وقت غریبوں اور امیدواروں کے لیے کھ

محمّد قلی قطب شاہ کے عہد میں کچھ لڑائیاں اور بغاوتیں بھی ہوئیں لیکن اس نے اپنی صلح پسندی کی وجہ سے ان کو بڑھنے اور جنگ کے مقابلے میں ہر وقت صلح اور امن کو ترجیح دی۔ اس نے کئی عیدوں اور تہواروں کو رائج کیا تاکہ اہلِ ملک بھر میں کئی مواقع ایسے حاصل ہو سکیں جن میں وہ دل کھول کر اور مل جُل کر اپنے جذبات کا اظہار کر سکیں۔ اس کے اُردو دیوا چلتا ہے کہ اس نے ایسی کوئی چودہ تقریبیں مقرر کی تھیں جن میں سلطنت کے سب لوگ شوق سے شریک ہوتے تھے۔ اس کو پا کے علاوہ روشنی کا بھی بڑا شوق تھا۔ وہ ہر اس موقع سے فائدہ اُٹھاتا تھا جس میں اس کو جی کھول کر چراغوں اور آتشبا رنگ رلیوں کا اہتمام کرنا پڑے۔

محمد قلی قطب شاہ نے ملک میں مذہبی امن اور شانتی کی فضا پیدا کرنے کے لیے بڑی کامیاب کوششیں کیں۔ اَ علاوہ شاید ہی کوئی بادشاہ ہندوستان میں ایسا گزرا ہو جس نے اپنی رعایا کے جملہ طبقوں کا دل موہ لینے میں محمد قلی سے حاصل کی ہو۔ اس نے اپنے باپ دادا کا ایرانی و تورانی لباس چھوڑ کر ٹھیٹ ہندوستانی لباس وضع قطع اور معاشرت تھی۔ بسنت منانے کی تقریب خاص اہتمام اور شان و شوکت سے جاری کی تھی۔ بسنت کی آمد کے ساتھ وہ پھولوں نہیں اس موسم میں ہر محل اور ہر باغ میں پھولوں کے انبار جمع کر دیئے جاتے تھے اور حوضوں کو رنگوں سے بھر دیا جاتا تھا۔

بسنت کے ساتھ ساتھ مرگ لگنے یا بارش کا موسم شروع ہونے پر بھی محمد قلی بڑے بڑے جشن مناتا تھا۔ میں عوام کی عید تھی۔ چلچلاتی گرمیوں کے بعد جب موسم بدلتا ہے یا بارش شروع ہونے لگتی ہے تو زمین کے ذرّے جان پڑ جاتی ہے۔ اور دکن میں تو بارش کا موسم ہی اصل میں موسمِ بہار ہے۔ محمد قلی نے اس موضوع پر کئی عمدہ نظمیں جن میں اس تہوار کی تفصیلات بڑی خوبی سے بیان کی ہیں۔

محمد قلی قطب شاہ اُردو زبان اور ادب کا بہت بڑا محسن تھا اس نے اس زبان کی ایسے وقت میں سرپرستی کی جب اس کی بہت محتاج تھی۔ اور علم و ادب کے میدان میں ایک چھوٹے بچے کی طرح ابھی ابھی چلنا سیکھا تھا۔ محمد قلی نے اُردو پر وہ احسان کیا ہے جو بعد کے کسی بادشاہ یا شاعر یا ادیب سے نہ ہو سکا۔ اس نے نہ صرف اُردو شاعروں اور فن کا دل

بقیہ سلسلہ صفحہ

بھاگ متی اور بھاگ نگر

پروفیسر ہارون خاں صاحب شروانی نے یوم محمد قلی قطب شاہ کے بعد ایک پمفلٹ شائع کیا ہے جس میں بھاگ متی کی حقیقت کو عجیب افسانوی انداز تحریر اختیار کر کے واقعی ایک افسانہ بنا دینے کی کوشش کی ہے۔ افسوس ہے کہ انکی بزرگی کا احترام کرنے کے باوجود ان کے اس مضمون کی غلطیوں اور صحیح ماخذوں تک ان کی نارسائی اور دکنی روایات اور دکنیوں کے مزاج سے ناواقفیت کے بارے میں کچھ لکھنا پڑا۔ بڑی حیرت کی بات ہے کہ بھاگ متی پر اپنی تحقیقات کے سلسلے میں جہاں انھوں نے بہت سی کتابوں کی چھان بین کی ہے اور سیکڑوں صفحات پڑھ ڈالے ہیں اور متعدد مرحوم و مغفور مصنفوں سے استفادہ کیا ہے دکن کی تاریخ اور اس خاص موضوع کی تلاش و تحقیق پر جن لوگوں نے عہد حاضر میں عمریں صرف کر دیں اور بڑی بڑی مستند کتابیں لکھی ہیں اور جو بفضل خدا ابھی زندہ ہیں ان سے کر تبادلہ خیال کرنے کی ذرا بھی کوشش نہیں کی۔ اگر وہ تاریخ دکن کے مخلص خدمت گزار ہیں اور دیانتداری سے حقیقت کے جویا ہیں تو میں سمجھتا ہوں کہ ان کے لئے یہ طریقہ کار لازمی اور ضروری تھا۔ میں تو کوئی مورخ نہیں ہوں اس لئے مجھ سے نہ سہی لیکن ڈاکٹر غلام یزدانی اور پروفیسر عبدالمجید صدیقی سے تو ان کو ضرور اس بارے میں مشورہ کر لینا چاہئے تھا۔

انھوں نے اپنے مضمون میں واقعہ بھاگ متی کا واحد ماخذ فرشتہ کو قرار دیا اور ان کی نظر میں وہ ناقابل اعتبار ہے۔ وہ خود بھی مورخ ہیں اور شاید ایسی جرأت ان ہی کو زیب دیتی ہے۔ میں فرشتہ پر جھوٹ تراشنے کا الزام نہیں لگا سکتا اور نہ سمجھتا ہوں کہ محمد قلی قطب شاہ کی وہ تحقیر کر سکتا ہے جب کہ وہ اپنی تاریخ میں اس کو رؤف اور حلیم کی خدائی صفات سے یاد کرتا ہے اور خاص طور پر اس کی اور اس کے شہر کی خوبیوں کا رطب اللسان ہے۔

رہی عشق و عاشقی تو فرشتہ بھی اس کو گناہ نہیں سمجھتا۔ محمد قلی قطب شاہ تو اس کو لازمۂ زندگی سمجھتا تھا جیسا کہ اس کی کلیات سے ثابت ہے اور طوائف اور رقاصاؤں سے عشق و عاشقی بادشاہوں سے لے کر شاعروں اور اولیاء اللہ تک نے کی ہے۔ ایک باکمال رقاصہ اور حسین ترین طوائف کو اگر فرشتہ نے فاحشہ لکھا تو لفظ "فاحشہ" کو بار بار دہرا کر شروانی صاحب نے عہد حاضر کے معیار سے بھاگ متی کی وقعت کم کرنے کی کوشش کی ہے۔ حالانکہ فرشتہ کی نظر میں گانا بجانا بھی فحش تھا اور محمد قلی کی خوبیوں میں وہ اس واقعہ کو شمار کرتا ہے کہ اس نے فاحشہ کو شریف اور حلیم بنا دیا۔ تھوڑی دیر کے لئے اگر فرشتہ جھوٹا بلکہ شیطان بھی بن جائے تو ابوالفضل اور فیضی کے بارے میں پروفیسر شروانی نہ معلوم کیا کہیں گے۔ افسوس ہے کہ انھوں نے نہ تو دکن کی تمام تحریریں اور تاریخیں پڑھیں اور آثار دیکھے اور

نہ شمالی ہند کے مورخوں اور ادیبوں کا مطالعہ فرمایا اور بھاگ متی کے وجود کے خلاف اتنا بڑا دعویٰ کر
ابوالفضل نے اکبر نامہ میں اور فیضی نے لطیفۂ فیاضی میں بھاگ نگر اور بھاگ متی کا ذکر خود
زندگی میں فرشتہ سے دس بارہ سال پہلے لکھا ہے۔

۲

فارسی کا مشہور شاعر اور ادیب ملا فیضی شہنشاہ اکبر کے نورتن میں شامل ہونے کے علاوہ اس کا
تھا۔ چنانچہ شہنشاہ نے اس کو دکن روانہ کیا تھا کہ یہاں کے سیاسی اور سماجی حالات معلوم کرکے اپنے
اطلاع دے تاکہ فوج کشی کرکے اس حصۂ ملک کو مغل سلطنت میں شامل کرنے پر غور کیا جائے۔ اس کام
یک دکن خاص کر برہان پور میں رہا اور موقع بہ موقع اپنی عرضداشتوں کے ذریعہ سے یہاں کے حالات
بصیغہ راز واقف کراتا رہا۔ ان عرضداشتوں کا مجموعہ لطیفۂ فیاضی کے نام سے اسی زمانہ میں مرتب
اس کا ایک قلمی نسخہ انڈیا آفس کے کتب خانہ میں محفوظ ہے اور ایک دوسرا قلمی نسخہ خود حیدر آباد کے
میں موجود ہے۔ یہ قلمی کتاب آج سے دو سو اٹھتر (۲۷۸) سال قبل محمد قلی قطب شاہ کے نواسے عبداللہ
محمد مراد نے ۱۰۹۹ھ میں نقل کی ہے۔ اس کے صفحہ ۱۲ پر فیضی لکھتا ہے کہ :۔

" محمد قطب الملک مذہب تشیع دارد و معمورہ ساختہ و عمارات پرداختہ بھاگ نگر بنام
کہ فاحشہ کہنہ و معشوقہ قدیم اوست۔ حالات ولایت دکن چہ از آنچہ در جاگیر ایں سرکس م
است .... اگر دمے چند دیگر مہلت یا شد بحضور اشرف بتفصیل عرضدا
خواہد نمود " وغیرہ

اسی دور میں تاریخ فرشتہ سے بہت پہلے اکبر کے ایک اور رفیق اور فاضل ادیب ابوالفضل نے
اکبر نامہ ایک کتاب مرتب کی تھی جو ایک مشہور و معروف کتاب ہے اور جس کے قلمی و مطبوعہ نسخے عام طور
اکبر نامہ میں بھی ابوالفضل نے شہر بھاگ نگر کا ذکر کیا ہے۔ مثال کے طور پر ریکارڈ آفس حیدر آباد
صفحات ۷۷۴، ۷۷۵ پر " کشائش قلعۂ احمد نگر " کے سلسلہ میں شہر بھاگ نگر کا نام جس طرح درج ہے ا
ذیل ہے :۔

" چوں ہمایوں رایات بخوبی دیار چالش فرمود .... ان نزہت گاہ را
گردانید۔ علی قلی خاں و محمد قلی و کلب علی و شاہ بیگ و دیگر بندگان شقاوت سر
نزدیک بھاگ نگر آویزش نمودند "

اس سے بڑھ کر بھی بھاگ متی اور بھاگ نگر کے وجود کے بارے میں کسی اور سند یا ثبوت کی ضرورت
فیضی دونوں کو پروفیسر شیروانی فرشتہ کی طرح جھوٹا کہنے کی غالباً جرأت نہ کریں گے۔

۳

دکن کی جن تاریخوں میں بھاگ متی کا ذکر نہیں ملتا وہ سلطان محمد قطب شاہ کے عہد کی لکھی ہوئی ہیں جو بہت بڑا زاہد اور متقی بادشاہ گزرا ہے۔ جس نے مکہ مسجد کا سنگ بنیاد رکھا اور جس کی تہجد کی نماز بھی کبھی قضا نہیں ہوئی تھی۔ اس بادشاہ نے اور اس کے استاد حضرت میر مومن نے مسلسل یہ کوشش کی کہ حیات بخشی بیگم ملکۂ سلطنت کی والدہ بھاگ متی حیدر محل کے بارے میں لوگ تذکرہ نہ کیا کریں۔ اس کی ایک وجہ یہ بھی ہوگی کہ فیضی اور فرشتہ نے اس کو فاحشہ لکھ دیا تھا۔ حیدرآباد سے باہر بیجاپور اور احمدنگر میں اس زمانے میں جو تاریخیں لکھی گئیں انکے لکھنے والے بقول پروفیسر شروانی میر مومن یا سلطان محمد کے زیر اثر نہیں تھے۔ لیکن تاریخ کا معمولی طالب علم بھی جانتا ہے کہ وہاں کے دربار اور بادشاہ حیدرآباد سے دوستانہ اور سفارتانہ تعلقات رکھتے تھے۔ ان کے آپس میں شادی بیاہ کے تعلقات قائم تھے۔ ایک جگہ کے وزیر و سفیر، شاعر، ادیب اور مورخ دوسری جگہ آزادی سے آتے جاتے تھے اور ان کو معلوم تھا کہ حیدرآباد میں تاریخ کے اس باب کو مصلحتاً بند کر دیا گیا ہے اور قطب شاہی بادشاہ، مورخ اور شاعر نہیں چاہتے ہیں کہ تاریخ میں ان امور کو درج کریں۔ اس طرح خوشگوار تعلقات قائم رکھنے کے لئے لازمی تھا کہ ایک دوسرے کے جذبات اور احساسات کا خیال رکھا جاتا۔ چنانچہ جوں ہی قطب شاہی دور ختم ہوا حیدرآباد کے مورخوں نے بھی بھاگ متی کا قصہ لکھنا شروع کر دیا۔ ماہ نامہ کے مولف نے اس کی جو تردید کی ہے اس کی وجہ (شروانی صاحب بھی جانتے ہوں گے) یہ تھی کہ آخری قطب شاہی بادشاہ ابوالحسن تاناشاہ کے بھانجے اور متبنیٰ ابو محمد اس کے دوست تھے اور قطب شاہوں نے اس واقعہ کو چھپانے کے لئے کتنے جتن کئے تھے ان سے واقف تھے اسلئے انھوں نے اپنے اسلاف کی سنت کا اعادہ کیا اور اپنے دوست سے لکھوا دیا کہ یہ واقعہ غلط ہے۔

شروانی صاحب یہ بھی جانتے ہیں کہ برہان مآثر کی طباعت کے وقت سید ہاشمی صاحب فرید آبادی نے کئی حصے حذف کر دئے تھے۔ شروانی صاحب کو چاہئے تھا کہ اس کے قلمی نسخے دیکھتے۔ ایک مورخ سے ایسا سہو نہیں ہو سکتا جبکہ وہ صورت حال سے واقف ہو۔

حیدرآباد میں اس واقعہ پر پردہ پوشی کرنے کے لئے قطب شاہی عہد میں اتنے جتن کئے گئے کہ درباری شاعر ملا وجہی سے ایک مثنوی بطور خاص بھاگ متی کی وفات ۱۰۱۷ھ کے بعد لکھوائی گئی جس میں اصل واقعہ کو کچھ اس طرح بدل دیا گیا ہے کہ پروفیسر شروانی اس کے مطالعہ اور اس سے نتیجہ اخذ کرنے میں اب تک غلطاں و پیچاں ہیں۔ آخر ایک اجنبی سیاح ہی تو تھے تو بھاگ نگر کو باغ نگر سمجھ لیا تھا۔ وہ بھلا کیا جانتا تھا کہ دو اسم عام ملا کر اسم خاص نہیں بنایا جاتا۔ نگر یا باغ کے ساتھ جب تک کوئی خاص اسم یا صفت نہ ملائی جائے اسم خاص نہیں بن سکتا۔ مثال کے طور پر احمد نگر، محبوب نگر، ابراہیم باغ، گیان باغ، پرتاب باغ وغیرہ ناموں پر غور کر لیجئے۔

افسوس اس کا ہے کہ شروانی صاحب نے ایک اجنبی کی تحریر کو باغ نگر کی حد تک تو صحیح سمجھ لیا لیکن اس زمانے کے دوسرے اجنبیوں کی تحریریں اور مطبوعہ کتابیں یا تو دیکھی ہی نہیں یا دیکھیں تو اپنے مقصد کے خلاف سمجھ کر ایک ذمہ دار اور دیانت دار مورخ کے فریضے سے انجان بن گئے۔ ہندوستان میں انگریزوں نے جو فیکٹریاں قائم کی تھیں

ان کے کارندوں کی مراسلت کی تفصیلی روئدادیں چھپ چکی ہیں۔ ان کو ولیم فاسٹر نے مرتب کر کے ۱۹۲۱ء میں ۱۶۵۵ء تا ۱۶۶۰ء کے واقعات سے متعلقہ جلد کے صفحہ نمبر ۳ پر لکھا ہے کہ :—

"اس امر کا اظہار ضروری ہے کہ اس کتاب میں جہاں جہاں گولکنڈہ لکھا گیا ہے اس سے قلعہ مراد نہیں بلکہ شہر بھاگ نگر ہے جہاں سے قلعہ (۵) میل کے فاصلہ پر ہے۔"

(ترجمہ از انگریزی)

۴

محمد قلی کی کلیات میں بھاگ متی کا نام کئی جگہ موجود ہے۔ پروفیسر شروانی کی نظر سے نہیں گزرا تو تعجب کیونکہ شاید وہ دکنی زبان اور ادب کو سمجھ نہیں سکے۔ اگر بھاگ متی کا نام کلیات محمد قلی میں موجود نہ بھی ہوتا تو بھی ہوتی۔ ہر معمولی مورخ بھی جانتا ہے کہ جب کسی دربار سے کسی کو خطاب مل جاتا ہے تو پھر اس کا اصلی نام بلکہ اکثر غائب ہی ہو جاتا ہے۔ کتنے لوگ ہیں جو افسر الملک یا مختار الملک کے اصل نام سے واقف ہیں۔ یا ممتاز محل کے اصلی نام کتنے لوگ جانتے ہیں یا تاریخوں اور نظموں میں کوئی ان کو مہر النسا یا ارجمند سے یاد کرتا ہے۔

خطاب یافتہ اشخاص کا ذکر ہمیشہ خطاب ہی سے کیا جاتا ہے نہ کہ اصلی نام سے۔ جب محمد قلی نے خود دیا تو فطری بات ہے کہ وہ زیادہ تر حیدر محل ہی اپنی نظموں میں لکھتا۔ یہ اشارہ تھا اس کی اس خواہش محبوبہ کو اس کے اصلی نام سے کوئی یاد نہ کرے اور صرف خطاب یاد رکھے۔ اسی مصلحت سے تو اس نے اپنے بھاگ نگر سے حیدرآباد بدل دیا تھا۔ مگر اس تمام اہتمام کے باوجود بعض نظموں میں بھاگ متی کا ہے جیسا کہ آئندہ واضح ہوگا۔

کلیات محمد قلی سے یہ بھی ظاہر کہ حیدر محل اس کی خاص محبوبہ تھی اور وہ اس کا بہت دلدادہ تھا۔ ہوتے ہوئے وہ کسی اور کو حیدر محل کا خطاب نہیں دے سکتا۔ اگر کسی اور کا یہ خطاب ہوتا تو پھر ایک محبوبہ منسوب شدہ شہر کا نام حیدرآباد نہ رکھتا بلکہ اس دوسری محبوبہ کے لئے کوئی دوسرا ہی شہر بساتا یا کسی مقام کو اس کے نام سے موسوم کرتا۔

شاہی درباروں اور شاہی محلات کے رسم و رواج سے واقف کار لوگ یہ بھی جانتے ہیں کہ شادی ہونے کے بعد اکثر عورتوں کے نام بدل دیئے جاتے ہیں اور خاص کر ان میں سے کسی کے جب بچہ پیدا ہو جاتا خواتین حرم سے ممتاز ہو جاتی ہے اور خطاب سے سرفراز کی جاتی ہے۔ چنانچہ جب بھاگ متی کے بطن سے حیات بخشی بیگم پیدا ہوئی تو بھاگ متی کو حیدر محل کا خطاب دیا گیا اور اس وقت سے شہر کا نام بھی حیدر گیا۔ اور یہ دونوں نام ساتھ ساتھ عرصہ تک جاری رہے۔ اسی لئے فرشتہ نے اپنی تاریخ میں کہیں حیدر بھاگ نگر لکھا ہے۔

۵

محمد قلی قطب شاہ کی مطبوعہ کلیات کے صفحہ نمبر ۲۶۸ پر ایک نظم موجود ہے جس میں محمد قلی نے بھاگ متی کے اوصاف اظہار نام کے ساتھ بیان کئے ہیں۔ اس میں وہ لکھتا ہے کہ :۔

— اے نازنیں تجھے اُتاولی چالیں زیب دیتی ہیں۔
— تیرے بالوں کے جوڑے پر پھولوں کی مالا ایسی نظر آتی ہے جیسے سیاہ ناگن نے اژدہا کی زبان نے چڑھائی کی ہو۔
— تیرے ہونٹوں پر جو سرخی چڑھی ہوی ہے وہ جواہر سے زیادہ چمک رہی ہے۔
— جب تو بال کھولتی ہے تو دن رات بن جاتا ہے اور جب تو رات میں ہنستی ہے تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اُجالا ہوگیا۔
— نازنینوں میں بھاگ (متی) ہی وہ نازنیں ہے جو اپنے جسم کی قربت سے پیا کو نہال کردیتی ہے۔
— علی کے صدقے میں ہمیشہ یہ نازنیں قطب شاہ کے ہونٹوں سے مئے کا پیالہ پیا کرتی ہے۔

اب اس نظم کے اصل شعر ملاحظہ ہوں ؎

ناری نہے تجھ اُتاولے چالاں
سنپولی اُپر بھونگ سٹیا جام — جھوٹے الکاں میں پھول مالا
رتن تھے ادک دپیں ہونٹاں پر — اوحراں کے اُپر چڑی سولالا
دن رات ہوا جو کھولے دھن کیس — نس میں جو ہنسی پڑیا اجالا
ناریاں میں جو نار بھاگ اچھل — انگ سنگ سوں کرے پیا نہالا
نت پیوے علی کے صدقے خانم — قطبا کے ادھر تھے مئے پیالا

محمد قلی قطب شاہ نے بھاگ متی کے ساتھ شادی میں رسم جلوہ کے وقت گانے کے لئے جو گیت لکھا تھا وہ بھی مطبوعہ کلیات کے صفحہ نمبر ۱۶۱ پر موجود ہے اور اس میں بھی محمد قلی نے واضح طور پر بھاگ متی کا نام لیاہے۔ اس گیت میں وہ لکھتا ہے :۔

— پریم پیاری کا سب مل کر جلوہ گاؤ۔ پریوں نے جلوہ کے لئے اسے چاند اور سورج لگا کر سنوارا ہے۔
— سُہاگ کے پھول بھاگ متی کی پیشانی پر کھلے ہیں۔ سہیلیوں نے اس کی آرتی میں تارے اس پر سے نچھاور کئے۔
— جلوہ دینے کے لئے خوشی خوشی ایک ایسا تخت رچاؤ جس کو چاروں طرف موتیوں سے

سجایا گیا ہو۔

ـــــ سات سہاگنیں تیل چڑھاؤ اور زہرہ کو چاہیے کہ مشاطہ بن کر ہاتھوں پر مہندی کے نقش و نگار بنائے۔

ـــــ دولہا دلہن (محمد قلی اور بھاگ متی) کو شربت پلا کر دونوں کے ہاتھوں میں پان کے بیڑے دو اور دونوں کے دامنوں کو باندھو۔

ـــــ اے خدا محمد قلی قطب شاہ اور اس پری کو اس وقت تک زندہ رکھ جب تک ستارے ہیں ؎

پریم پیاری کا جلوہ گا و سنارے ۔۔۔ اُسے چند سو رسوں پریاں سنگارے
سہاگاں بھاگ پھول متاسک نکلے ہیں ۔۔۔ سہیلیاں آرتی تارے فوارے
رچاؤ تخت جلوہ کا خوشی سوں ۔۔۔ کہ چوندہر چوک موتیاں سوں سنوارے
چڑھاؤ تیل اب ساتوں سہاگاں ۔۔۔ مشاطہ ہو کے زہرہ بہت نگارے
پلا شربت دیو ہاتاں میں بیڑے ۔۔۔ بنداؤ ساریاں موتیاں کنارے

محمد قطب شاہ ہور اس پری کوں
خدایا رکھ جداں لگ ہیں ستارے

عید شب برات کے موقع پر محمد قلی قطب شاہ ہر سال ایک نظم لکھا کرتا تھا۔ چنانچہ اس موضوع میں دس نظمیں شریک ہیں۔

صفحہ نمبر ۱۰ پر ایک نظم درج ہے جس کے آخری دو شعروں میں وہ کہتا ہے :۔

ـــــ چونکہ محبوب کے پھول جیسے جسم کے ساتھ شب برات کی رات میں لٹ پٹ ہونا ہے اس لئے اس کو عروسی خوشبوؤں میں از سرنو مہکایا گیا ہے۔

ـــــ نبی کے صدقے میں قطب شاہ بھاگ (متی) سے مل کر جی بھر کر عیش و صل حاصل کر کیونکہ وہ بن سج کر پھر سے خود کو قطب شاہ کی داسی کہلوا رہی ہے۔

محمد قلی کے شعر یہ ہیں ؎

سجن کے پھول سے تن کوں لٹا پٹ ہوانندوں سوں
عروسانی سو باساں میں اوک مہکائے جی سر تھے
نبی صدقے قطب ہو کے سوں کر سنبھوگ بھاگوں مل
قطب کی داس ہوں سج کر اپس کہوائے بھی سر تھے

بھاگ متی ہی کا خطاب حیدر محل ہونے کا ثبوت اس طرح سے بھی ملتا ہے کہ محمد قلی نے اپنی اردو کلام میں جہاں جہاں حیدر محل کا ذکر کیا ہے اس کو رقاصہ ہی ظاہر کیا ہے۔ مثلاً ایک نظم کلیات کے صفحہ نمبر ۲۵

جس میں محمد قلی حیدر محل کو ایک ایسی رقاصہ ظاہر کرتا ہے جو اس کے سر پر تاج کی طرح سجتی ہے۔ اور جو ہر روز اطمینان سے عشق کے طبل بجاتی ہے وہ کہتا ہے :—

— حیدر محل محبت سے مصری کی ڈلی گھولتی ہے اور ہر روز اطمینان سے عشق کے طبل بجاتی ہے۔

— اس کے سرو جیسے قد پر نورتن کا جلوہ نظر آتا ہے اور عشق و محبت کی رقاصائیں اس کو دیکھ کر شرماتی ہیں۔

— وہ عشق کی چادر اوڑھ کر بہوٹی کی طرح سرخ نظر آتی ہے۔

— نبی کا شکر ادا کر کہ تجھ کو ایک ایسی رقاصہ ملی ہے جو حیدر کی غلامی کے باعث تیرے سر پر بطور تاج کے سجتی ہے۔

اس نظم کے چند شعر یہ ہیں ؎

حیدر محل میاتے نابات گھول ساجے ۔۔۔ دن دن انند سیتے طبلاں مدن کے باجے

اس سرو قد کے اوپر تجلوہ ہے نورتن کا ۔۔۔ عشق کے پاتراں سب اس کاس دیکھ لاجے

چادر عشق کا اوڑھے جوں بیر بہوٹی دیسے ۔۔۔ تیرے عشق کے لاجاں بیچھے ہیں لاجوں بھاجے

صدقے نبی شکر کر تجھ کو ملی ہے پاتر ۔۔۔ حیدر غلامی سیتی تجہ سیس تاج ساجے

ایک اور نظم میں حیدر محل کے گانے اور ناچنے کا ذکر کیا ہے۔ یہ نظم ناقص حالت میں ملی ہے۔ صرف دو شعر (صفحہ نمبر ۲۵۸) مکمل ہیں جن میں محمد قلی کہتا ہے کہ :—

— حیدر محل محبت سے عشق کا جلوہ گائیں اور یزدانی ستار طرح طرح کے رنگ میں بجائیں۔

— جب اپنے ہاتھ میں جلوہ کا گیت گانے کے لئے کنگن پہن رکھا ہے تو بہتر ہے کہ اپنی آنکھوں کی پتلیوں کو بھی کھیل کی پتلیوں کی طرح نچائیں۔

اصل شعر یہ ہیں ؎

حیدر محل میاتے جلوہ عشق کا گاویں ۔۔۔ یزدانی تانت جوں مدرنگاتیں بجاویں

اپ ہاتھ میں بندی ہے جلوہ کے ناد کنگن ۔۔۔ نیناں کی پتلیاں کوں تپلیاں نمن نچاویں

محمد قلی قطب شاہ نے بھاگ متی کو حیدر محل کا خطاب دینے کے بعد اپنے ایک محل کا نام بھی حیدر محل رکھا تھا جس میں بھاگ متی حیدر محل کا قیام تھا۔ یہ محل موجودہ محلہ "مٹی کے شیر" کے پاس واقع تھا اور اس کی قدیم مسجد اب بھی وہاں موجود ہے۔ اس محل میں ہر سال بھاگ متی کی شادی کی سالگرہ دھوم دھام سے منائی جاتی تھی اور محمد قلی قطب شاہ اپنی محبوبہ کو ہر سال نئے سرے سے دلہن بناتا تھا اور اس کے جلوے کی رسم کے لئے ناچنے اور گانے والیوں کو ایک نیا گیت بھی لکھ کر دیتا تھا۔ ایسا ہی ایک گیت کلیات محمد قلی کے صفحہ نمبر ۲۱۰ پر درج ہے جس میں وہ لکھتا ہے :—

— حیدر محل میں ہمیشہ حیدر پیاری (بھاگ متی) کا جلوہ گاؤ اور اس تقریب میں عرش آسمان

اور زمیں پر خوشی کے دمامے بجاؤ۔

ـــ اے ساقی سیم ساق میری اس محفل میں صراحی مئے لاؤ اور پیالے میں شراب ڈال تاکہ مجھے پیالے کی جوت میں میری پیاری کا چہرہ دکھلائیں۔

اس کے رخساروں میں جو سورج کے طبق جیسے ہیں شراب کے نقل رکھو اور پیاری محبت کے ہار پیارے کے گلے میں ڈالو۔

نبی کے صدقے میں قطب شاہ جلوے کے تخت پر بیٹھے ہیں اس لئے حوریں اور پریاں اور سہیلیاں مل کر ان کو آئینہ دکھاؤ۔

محمد قلی کے اصل شعر یہ ہیں ؎

حیدر محل میں دائم حیدر کا جلوہ گاؤ ۔۔۔ عرش آسماں دھرت پر نصرت طبل بجاؤ

لا سیم ساق ساقی مجہ بزم میں صراحی ۔۔۔ پیالے کے جوت میانے سائیں صورت دکھاؤ

سورج طبق سے گالاں میں مے نقل دھرو تم ۔۔۔ پیاری پرت کے ہاراں پیارے کے گل میں باؤ

صدقے نبی قطب شاہ جلوے کے تخت بیٹھے ۔۔۔ حوراں، پریاں، سہیلیاں مل آرسی دکھاؤ

دکن میں جلوے کی رسم میں دولہا دلہن کو تخت یا چوکی پر ایک دوسرے کے مقابل یا برابر بٹھا کر صندل پھول پہناتے ہیں۔ میراثنیں گیت گاتی رہتی ہیں۔ طوائف ناچتی ہیں۔ باہر نوبت اور روشن چوکی بجتی اور دولہن ایک دوسرے کو مصری کے نقل کھلاتے ہیں اور ایک پیالے میں پانی یا شراب بھر کے اس میں دولہا کو دلہن کی اور دلہن کو دولہا کی صورت دکھائی جاتی ہے۔ تمام حاضرین دولہا دلہن پر سے سونے کے اتارتے یعنی صدقہ کرتے ہیں۔ یہ سب امور محمد قلی نے اپنی نظموں میں بیان کئے ہیں اور یہ سب رسوم جاری ہے۔ البتہ اب رفتہ رفتہ ان میں کمی یا تبدیلی ہوتی جا رہی ہے۔

جلوہ کی ایک اور نظم (صفحہ نمبر ۱۶۴) میں بھی بھاگ متی کا نام شروع ہی میں لکھا ہے۔ وہ کہتا ہے

ـــ قسمت والی بھاگ متی کا جلوہ تم سب گاؤ اور اس کے سہاگ کی تعریف کے دمامے بجاؤ۔

اصل شعر ہے ؎

بھاگنی بھاگاں کا جلوہ گاؤ تم ۔۔۔ اس سہاگاں کے سبد بجاؤ تم

یہ بھی واضح رہے کہ لفظ بھاگ قسمت یا حصے کے معنے و مفہوم میں بھی محمد قلی قطب شاہ نے اپنی کلیات میں استعمال کیا ہے۔ مثلاً

حق آپ پیرت کے تئیں دو جگ بنایا ۔۔۔ بڑے بھاگ اس کے جن یہ پنتھ پچھانے

یعنی خدائے تعالیٰ نے (نبی کے ساتھ) اپنی محبت کے ثبوت کے لئے یہ دونوں جگ بنائے ہیں۔ لیکن اس راہ کو پہچاننے والے قسمت والے ہی ہوتے ہیں۔

ایک جگہ لکھتا ہے :ـــ

قطب شاہ بھاگی نوے مندر چلو ص ۱۶۵

ایک اور جگہ لکھتا ہے کہ ' خدا نے تیری قسمت کے ستارے کو شرف بخشا ہے اس لئے تو اپنے روئیں روئیں کی زبان سے شکر ادا کر۔ شعر ہے :ـــ

ہر اک روم کی جیب سوں شکر کر
کہ تجھ بھاگ تارا شرف سوں بنایا

محمد قلی نے اپنی محبوبہ کے لئے بھاگ متی اور حیدر محل دو نوں نام زیادہ تر مخفف کرکے یعنے بھاگ اور حیدر استعمال کئے ہیں ۔ بے تکلفی اور پیار میں ایسا ہی کیا جاتا ہے ۔

مذکورہ بالا جلوہ کی نظم کے علاوہ کئی اور نظموں میں بھی اس نے بھاگ متی کے لئے بھاگ اور حیدر محل کیلئے حیدر لکھا ہے ۔ ایسے اور دو شعر یہ ہیں :ـــ

رتن قطبا کے ہیں نرمول نیں کس شہر میں مول ہیں
لے کر آؤں جو بکھرا ہوے اس کا شہر حیدر میں

" یعنے قطب شاہ کے موتی (شعر) لاقیمت ہیں ، کسی شہر میں ان کے صحیح دام نہیں مل سکتے ۔ اگر حیدر محل کے شہر میں ان کی فروخت کی توقع ہو تو لے آؤں "

بریاں نظر اں تھے اس اسپند آتارو
کہ حیدر نگر ان انند اں بھرا یا

یہ شعر صفحہ نمبر ۳۲۲ پر ایک نظم کے درمیان ہے ۔ اس کا مطلب ہے کہ :ـــ

" نظر بد سے بچانے کے لئے اسپند کے دانے اس پر سے آتار کر جلاؤ کیونکہ حیدر محل کا شہر اس نے عیش و انند سے بھر دیا ہے "

بھاگ متی حیدر محل کے متعلق کلیات محمد قلی میں اتنے واضح اور اتنے زیادہ ثبوتوں کے بعد بھی کوئی کیونکر کہہ سکتا ہے کہ کلیات میں ذکر ہی نہیں ہے ۔

یوں تو محمد قلی نے خود ہی کہہ دیا تھا کہ اگر ہمارے بھید کو نہیں سمجھ سکتے ہو تو پھر ہمارے اور ہماری پیاری بھاگ متی کے درمیان مت آؤ (دیکھو مطبوعہ کلیات صفحہ ۳۱۲) ۔

شاید ایسے ہی لوگوں کے جواب میں محمد قلی نے یہ شعر لکھا تھا :ـــ

ہمارا بھید نیں بوجھتے نکو آؤ ہمارے اور پیا کے درمیانے

ـــــــــ ۶ ـــــــــ

شروانی صاحب کا یہ بیان کہ پرانے پل کی تعمیر کے وقت محمد قلی آٹھ برس کا تھا ' اس غلط فہمی پر مبنی ہے کہ پرانے پل کا مادہ تاریخ " صراط مستقیم " تدخلہ کا محتاج ہے ۔ پروفیسر شروانی کو شاید پورا قطعہ تاریخ نہیں ملا ۔ اس کا ایک اور

مادۂ تاریخ "گذرگہ ما" بھی ہے جس سے ۹۸۶ھ برآمد ہوتا ہے جب کہ محمد قلی کی عمر ۱۴۔۱۵ سال کی تھی
پرانے پل کی تعمیر کے مشہور و معروف مادہ تاریخ کو چھوڑ دیا جس میں لکھا ہے کہ :۔

زتحت او گزر دما و ما بر او گذریم — ازیں سبب شدہ تاریخ او گذرگہ ما
۹۸۶ھ

تلنگانہ کے دیہات میں اب بھی بھاگ متی کے گیت گائے جاتے ہیں۔ حیدرآباد کے ایک تاگل چنتا میں آج بھی بعض لوگ ایسے ہیں جو خود کو بھاگ متی کے اہل قرابت اور خاندانی عز سمجھتے ہیں۔ اس کے بھائی کے نام محصول آبکاری معاف رہنے کے جو فرامین محمد قلی قطب شاہ نے دس سال قبل تک نظامت آبکاری کی امثلہ میں موجود تھے اور غالباً اب بھی ہوں گے۔

بھاگ متی کا گنبد اس وقت بھی نہایت عمدہ حالت میں موجود ہے۔ اس کو خود محمد قلی قطب گنبد کے پہلو میں بنایا تھا جس میں بعد کو اس کے داماد سلطان محمد قطب شاہ نے اپنی دختر کلثوم بیگ پہلو میں) دفن کیا تھا اور اب یہ گنبد کلثوم بیگم کہلاتا ہے اور جمشید قلی قطب شاہ اور محمد گنبدوں کے درمیانی میدان میں محمد قلی کے گنبد کے قریب اسی کے پہلو میں موجود ہے اور اس کا کتبہ لنگر فیض آثار میں محفوظ ہے۔

بھاگ متی کو محمد قلی آخر وقت تک اتنا چاہتا تھا کہ اس کی وفات کے بعد دل گرفتہ ہو کر علیل آخر تک سنبھل نہ سکا۔ اس عرصہ میں وہ باہر نکلنے کے بھی قابل نہ رہا اور جو عمارتیں بن رہی تھیں تڑپتا رہا۔ اس کے ملازمین کرسی پر لٹا کر اس کے آٹھ منزلہ محل کی چھت پر اس کو لے جاتے اور محبوبہ کی یادگار (شہر حیدرآباد) کی عمارتوں کو دیکھ کر خوش ہوتا اور نو تعمیر شدہ عمارتوں کی اسی عالم اضطراب و مجبوری میں اپنی محبوبہ کے بعد دو ڈھائی سال کے اندر ہی وفات پا گیا۔ اس کے بے چینی کے واقعات ایک فارسی مثنوی میں درج ہیں۔

ان سب واقعات اور ان کے ماخذوں تک پہنچنے کی کوشش ضروری تھی ان تاریخی دلیلو کے اظہار کے بعد یقین ہے کوئی بھی بھاگ متی اور بھاگ نگر کے وجود سے انکار نہ کرے گا۔

بہ سلسلہ صفحہ (۲۹۵)

مفید پائیں گے۔ کیونکہ اردو کے اکثر بلند پایہ انشا پردازوں اور شاعروں کے نتائج قلم حاصل کئے جا رہے ہیں۔ اور ذوق کی تشفی کے اسباب مہیا کئے جائیں گے۔ اردو کے علاوہ ہندوستان کی دوسری زبانوں خاص کر ہندی، مر جدید ادبی جواہر پاروں کو بھی سب رس کے ذریعہ سے اردو میں روشناس کیا جائے گا۔

سب رس میں بچوں اور طلبہ کے لئے جو سولہ صفحے وقف کر دئے گئے ہیں ان کو ایک علحدہ دیدہ زیب سرورق کے کیا جا رہا ہے تاکہ جو بچے اور طلبہ سب رس نہ خرید سکیں وہ سالانہ ایک روپیہ چندہ میں ہر ماہ سب رس کے سکیں جو ان کی دلچسپی اور ضروریات کی تکمیل کے لئے خاص اہتمام سے مرتب کیا جائے گا۔

بنام غالبؔ

حضرت محترم تسلیم۔

اگرچہ آپ نے القاب و آداب کی روایات کو ختم کرنے کی کوشش کی تھی اور آپ کی تقلید میں اُردو کے ادیبوں اور شاعروں نے عجیب عجیب القاب و آداب اختراع اور استعمال کیے ہیں مگر میں اپنی عادت اور طبیعت کے مطابق آپ کو روایاتی انداز ہی میں مخاطب کر رہا ہوں۔ ممکن ہے آپ اس طرزِ تخاطب کو پسند نہ فرمائیں۔ مگر آپ تو اپنی عادت اور طبیعت کے خلاف سُننے اور دیکھنے کے عادی ہو چکے تھے اور آپ کے بعد سے اب تک اُردو کے شاعروں اور ادیبوں نے آپ کے بارے میں کیا کیا نہ لکھا اور آپ پر کیسے کیسے بہتان نہ تراشے۔ غالباً یہ سب بھی آپ برداشت کر چکے ہیں۔

کسی نے آپ کے کلام کو الہامی قرار دیا تو کسی نے یورپ کے شعرا سے مقابلہ کر کے خرافات ثابت کیا۔ جہاں آپ کو رشکِ عرفی و فخرِ طالب سمجھا گیا وہیں آپ کو انگریز حکومت کا خوشامدی اور ابن الوقت بھی ثابت کیا گیا۔ آپ نے یوں تو کبھی محقق و مجتہد ہونے کا دعویٰ نہیں کیا تھا لیکن عہدِ حاضر کے محققوں نے آپ کی غلطیوں اور فروگزاشتوں کی تفصیلات بیان کر کے خود کو محقق منوالیا۔ غرض کیا کیا کہا جائے۔ مختصر یہ کہ دنیائے اُردو میں جس کسی کو آسان شہرت اور سستی قدر و منزلت کی ضرورت ہوئی آپ کے نام اور کارناموں کا سہارا لیا۔ اور اس طرح آپ سے متعلق کتابوں اور کتابچوں سے اُردو کے کتب خانے معمور ہو گئے۔

اُردو کی روایات اور اُردو بولنے والی قوم کی عادات کے پیشِ نظر یہ بھی غنیمت ہے۔ اور اس لحاظ سے آپ بڑے خوش قسمت ہیں ورنہ ماضی کے کتنے اعلیٰ درجہ کے ایسے شاعر ہیں جن کو اُردو بولنے والے بالکل ہی بھلا بیٹھے ہیں اور کتنے شاعر اب بھی موجود ہیں جن کی صحیح قدر و منزلت سے یہ قوم واقف ہی نہیں ہے۔ آپ نے سچ ہی تحریر فرمایا تھا کہ ؎

ایں مے از قحطِ خریداری کہن خواہد شدن
شہرتِ شعرم بگیتی بعدِ من خواہد شدن

آپ کا کلام اس قسم کی پیشین گوئیوں سے خالی نہیں ہے اور واقعہ یہ ہے کہ آپ نے اپنے ملک اور اپنی قوم کی صحیح نباضی کی تھی۔ آپ کی تشخیص قدم قدم پر صحیح ثابت ہوئی۔ اور یہی وجہ ہے کہ جیسے جیسے زمانہ گزرتا جا رہا ہے آپ کی عزت و عظمت میں اضافہ ہی ہوتا جا رہا ہے۔

کلامِ غالب میں جہاں اُردو کی عظمت اور ہمہ گیری موجزن ہے اُردو بولنے والوں کے مزاج اور رجحانات بھی پوری طرح جلوہ فرما ہیں۔ آپ نے قدیم ڈگر سے ہٹ کر چلنے کی جو کوشش کی اور اپنے ماحول اور روایات سے جو بغاوت کی وہ ظاہر کرتی ہے کہ آپ نے اُردو

شعروادب کی روایاتی خرابیوں اور شاعروں کی بے اعتدالیوں کا صحیح تجزیہ کیا تھا۔ اور چاہتے تھے کہ ان کو نئے راستے پر لاڈ۔ اگرچہ آپ کی زندگی میں آپ کو خاطر خواہ کامیابی نہیں ہوئی اور لوگوں نے آپ کے اشعار کو اس قسم کا کلام سمجھا کہ

پہلے تو روغن گل بھینس کے انڈے سے نکال
پھر دوا جتنی ہے کل بھینس کے انڈے سے نکال

اور جو لوگ ذرا مہذب اور سنجیدہ تھے انھوں نے آپ کے کلام کے بارے میں یہ رائے دی تھی کہ ــــ

کلام میر سمجھے اور کلام میرزا سمجھے
مگر ان کا کہا یہ آپ سمجھیں یا خدا سمجھے

مگر خوشی کی بات ہے کہ آپ کی وفات کے فوراً بعد ہی آپ کے ایک شاگرد مولانا الطاف حسین حالی نے آپ کے سوانح حیات "یادگار غالب" میں آپ کے کلام کو بڑی خوش اسلوبی سے سمجھانے کی سعی کی مگر وہ بھی آپ کے باغیانہ انداز اور ابنائے زمانہ سے اتنے خائف تھے کہ خود کو صاف صاف آپ کا شاگرد ظاہر کرنا پسند نہ کرتے تھے بلکہ محض معتقد بننے پر اکتفا کیا۔ انھوں نے اعلا

حالی سخن میں شیفتہ سے مستفید ہے
غالب کا معتقد ہے مقلد ہے میر کا

واقعہ یہ ہے کہ وہ اپنی افتاد طبع سے مجبور تھے۔ ان کی طبیعت میں سلامت روی اور سنجیدگی اتنی رچی ہوئی تھی کہ اپنے مقدمہ شاعری میں اُردو کے شاعروں کو قدیم روایات سے بغاوت یا انحراف کی تبلیغ بھی کی تو اس انداز میں کہ معلوم ہوتا ہے کوئی نہیں کہہ رہے ہیں۔ انھوں نے اپنے کلام میں بھی شیفتہ اور میر کی تقلید کرنے کی کوشش کی اور طرز غالب تک پہنچنے کی ہمت نہیں کی۔ شاید وہ آپ کے مشہور شعر کو یوں پڑھتے ہوں گے کہ ؎

طرز غالب میں ریختہ لکھنا ــــ اسد اللہ خاں قیامت ہے

گویا جو بات آپ کو کلام بیدل میں نظر آئی تھی وہی بات حالی کو کلام غالب میں نظر آتی ہوگی۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ آپ کے مقابل خاقانی ہند شیخ ابراہیم ذوق کے سلسلے کے ایک شاگرد علامہ اقبال نے وہ کام کر دکھایا جو خود آپ کے معتقدوں اور شاگرد یعنی حالی اور مجروح سے بھی نہ ہو سکا۔ اقبال نے نہ صرف آپ کے انداز میں شعر لکھے بلکہ آپ کے اس خیال کو بھی صحیح ثابت کیا جو آپ نے ان کے دادا استاد ذوق سے مخاطب ہو کر ان اشعار میں ظاہر کیا تھا۔

فارسی بیں تا بہ بینی نقش ہائے رنگ رنگ
بگذر از مجموعہ اُردو کہ بے رنگ من است
آنچہ در گفتار فخر تست آں ننگ من است

اقبال نے نہ صرف اُردو میں بلکہ فارسی میں بھی آپ کی جودت وجدت کی کامیاب تقلید کی اور یہی وجہ ہے کہ آپ کے ساتھ ان کے کارناموں سے بھی اُردو کے در و دیوار گونج رہے ہیں۔ اور سچ تو یہ ہے کہ عظمت و شہرت و مقبولیت کے میدان میں اگر آج آپ کا کوئی شریک ہے بلکہ آپ ہی کے الفاظ میں شریک غالب ہے تو وہ اقبال ہی ہیں۔

اقبال کے بعد ایک ایسے شاعر نے اُردو دُنیا میں دھوم مچائی جو شاعر شباب و انقلاب سمجھے جاتے رہے، اور نے بزعم خود صنف غزل ہی کو بیخ و بن سے اکھاڑ پھینکنا چاہا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ جوش جذبات اور شور

ہے جوشؔ ملیح آبادی کی نظمیں میرانیسؔ اور لکھنؤ کے دیگر مرثیہ نگاروں کے کلام کی جدید اور ترقی پسند ماڈل بھی جا سکتی
افسوس ہے کہ وہ نہ غزل کو سمجھ سکے اور نہ آپ کی عظمت کے اس راز سے واقف ہو سکے جس کی بنا پر آپ ایک جاودانی شہرت
بن گئے ہیں۔

آپ نے اپنے کلام میں جن جاودانی قدروں کی ترجمانی کی ہے ان کو آپ کے بعد اُردو کے چند اور شاعر مثلاً اصغرؔ۔ فانیؔ۔ جگرؔ
وغیرہ اچھی طرح سمجھ گئے۔ چنانچہ وہ ان کو اسی انداز میں برت رہے ہیں جس طرح آپ نے برتا تھا۔ بلکہ بعض حیثیتوں سے ان
اپنی شیوہ بیانی میں اضافہ بھی کیا ہے۔ اور معلوم نہیں کہ اس امر واقعہ سے واقف ہو کر آپ خوش ہوں گے یا ناراض۔ آپ
کا جوشِ رقابت مشہور ہے اور آپ نے رشک کے ایسے ایسے مضامین باندھے ہیں کہ شاید ہی کوئی اور شاعر اس میدان
کا مقابلہ کر سکے۔

آپ ہی کے تو یہ شعر ہیں کہ ؎

چھوڑا نہ رشک نے کہ ترے گھر کا نام لوں   ہر اک سے پوچھتا ہوں کہ جاؤں کدھر کو میں

اپنی گلی میں مجھ کو نہ کر دفن بعدِ مرگ   میرے پتہ سے خلق کو کیوں تیرا گھر ملے

قہر ہو یا بلا ہو جو کچھ ہو   کاشکے تم مرے لئے ہوتے

قیامت ہے کہ ہووے مدعی کا ہم سفر غالبؔ   وہ کافر جو خدا کو بھی نہ سونپا جائے ہے مجھ سے

بہ سلسلہ صفحہ (۲۸۰)

دبھی اس کا ایسا گرویدہ بن گیا کہ اس زبان میں پچاس ہزار شعر لکھے۔ اس طرح بارہ سال کی عمر کے بعد سے اگر اس کی
سط نکالا جائے تو گویا ہر روز اس نے پانچ شعر لکھے۔

اس کے اُردو کلام کی گوناگونی اور وسعت و ہمہ گیری سے پتہ چلتا ہے کہ کاروبار سلطنت کے بعد اگر محمد قلی کو کسی چیز سے دلچسپی
اُردو شعر و سخن ہی تھا۔ یہ کوئی تعجب کی بات بھی نہ تھی۔ شاعری ہی اس کے عشق و محبت کے جذبات اور عیش و عشرت کے
کی بہترین ترجمانی کر سکتی تھی۔ قدرت نے اس کو فراخ دلی اور فیاضی کے ساتھ اگرچہ سب نعمتیں بخشیں لیکن صحت اور عمر
ے میں اس کو شاید اس لیے محروم رکھا کہ دُنیا کے تمام کمال اور قدرت کے جملہ عطیے ایک ہی شخص کو نہیں دیئے جا سکتے۔ یہی
کہ وہ صرف ۴۹ سال کی عمر میں ہفتے کے دن ۱۱ر جنوری ۱۶۱۲ء کو ڈھائی مہینے کے مسلسل بخار کے بعد دُنیا اور اس کی حسین
رانیوں کو اپنا سوگوار چھوڑ گیا۔ اس کے اپنے بنائے ہوئے عالیشان گنبد میں اس کو دفن کیا گیا۔ اس کی تعمیر میں بھی اس نے
ملم دونوں طرز ہائے تعمیر کی خوبیوں کو ایک جگہ جمع کر دیا تھا۔

پیش لفظ

سب رس کا سب سے پہلا اداریہ

"سب رس" "ادارۂ ادبیات اردو" کا ترجمان ہے جو ہر مہینے اردو زبان اور ادب کی خدمت کے لئے شائع ہوا کرے گا۔ ادارہ نے اب تک سنجیدہ علمی و ادبی کتابیں شائع کرکے اردو کی جو خدمت کی ہے وہ علم دوست اصحاب سے مخفی نہیں ہے۔ لیکن اس خدمت سے خاص خاص اہلِ ذوق ہی مستفید ہو سکتے تھے اس لئے ادارہ ابتدا ہی سے دھیان لگائے ہوئے تھا کہ ایک ایسا رسالہ بھی نکالا جائے جس کی رسائی سب تک ہو اور جس میں سب کی دلچسپی کا خیال رکھا جائے۔

ہمارے بہت سے کام ایسے ہوتے ہیں جن کا اثر یا فائدہ ایک خاص حلقہ یا طبقہ تک ہی پہنچتا ہے۔ اب ایسے کاموں اور تحریکوں کی زیادہ ضرورت ہے جو سب رس بن سکیں اور ایسے ماہنامے اور روزنامے نکالے جائیں جن میں بھانت بھانت کی باتوں اور طرح طرح کی معلومات کا نچوڑ ہو اور جن کو ہر وہ شخص دلچسپی سے پڑھ سکے جو کسی خاص علم و فن کا ماہر نہ ہو اور اپنی فرصت کی گھڑیوں کو خوش گوار طریقہ پر گزارنا چاہتا ہو۔ یہی ایک ذریعہ ہے جس سے اردو زبان کی مقبولیت میں اضافہ ہوگا اور ہماری آواز دور دور تک پہنچ سکے گی۔ یہی طریقہ ہماری بہت سی خامیوں کو دور کرنے کا باعث بھی بنے گا اور ہم میں ایسی خوبیاں پیدا کرے گا جن کا نہ ہونا ہماری ترقی میں رکاوٹیں پیدا کر رہا ہے۔

ہم میں اتحاد و یگانگت کی لہریں نہیں دوڑ سکتیں اور نہ ہمارے خیالات میں یکسانیت یا ہم آہنگی پیدا ہو سکتی ہے جب تک ہم اپنے ملک کے زیادہ سے زیادہ بسنے والوں یا اپنی زبان کے زیادہ سے زیادہ سمجھنے والوں سے مخاطب نہ ہوں اور ان کی ضرورتوں اور رجحانوں کا تحریروں میں خیال نہ رکھیں۔ ہماری زبان کی بہت سی خرابیاں اور اسلوب کے بہت سے تکلف بھی اس طرح دور ہو جائیں گے جن کے لئے اس زمانہ میں اکثر خیر خواہانِ اردو توجہ دلا رہے ہیں۔ ہندوستان کے ایک مشہور قومی رہبر نے بالکل صحیح لکھا ہے کہ: "ہماری زبان کو مہذب ہونے کے ساتھ ساتھ عام فہم ہونا چاہئے۔ اس کی بنیاد اسی وقت مضبوط ہو گی جب لکھنے والے عوام کے لئے لکھیں گے۔ ہر ادیب کو اپنے سے سوال کرنا چاہئے کہ میں کس کے لئے لکھ رہا ہوں۔"

"سب رس" کا سب سے بڑا مقصد یہی ہوگا کہ وہ سب کے لئے ہو۔ وہ سب کے لئے اسی وقت بن سکے گا جب اس کی زبان سلیس اور سادہ ہو گی اور جب اس میں سب طرح کے موضوعوں پر دلچسپ مضمون، نظمیں اور افسانے چھپتے رہیں۔ ادارہ اسی وقت خود کو کامیاب سمجھے گا جب "سب رس" بچوں اور بوڑھوں اور عورتوں اور مردوں سب کے لئے دلچسپی کا باعث بن سکے۔ اسی لئے بچوں اور طلبہ کا حصہ بھی رکھا گیا ہے جس میں نظمیں، کہانیاں اور دلچسپ مضمون ہوں گے جو یا تو بچوں اور بچیوں اور مدرسوں کے طلبہ اور طالبات ہی کے لکھے ہوئے ہوں یا ان کے لئے خاص اہتمام سے لکھوائے جائیں گے۔ اسی طرح حصۂ نسواں علیحدہ تو نہیں کیا گیا اور نہ اس کو جدا کرنے کی ضرورت تھی اگر

دلچسپیوں کا خاص طور پر خیال رکھا جائے گا اور ہر رسالہ کی ترتیب میں صنفِ نازک کا کافی حصہ ہوگا۔
مضامین کے انتخاب میں بھی بڑی وسیع نظری ملحوظ رہے گی۔ افسانوں، نظموں، علمی ادبی اور تنقیدی مضمونوں اور اردو کی مطبوعات پر غیر جانب دارانہ تنقیدوں کے سوا آرٹ اور تصویر (سینما) پر بھی دلچسپ مصور مضمون چھپتے رہیں گے۔ نہ صرف دکن بلکہ تمام اردو دنیا کے اچھے اچھے شاعروں اور انشا پردازوں کی نظمیں اور مضمون حاصل کرنے اور چھاپنے کا التزام کیا گیا ہے۔ اور کوشش کی جا رہی ہے کہ سب رس تمام ہندوستان میں پہنچے اور ہر جگہ شوق سے پڑھا جائے۔ حسن کاری اور اردو ادب سے متعلق تصویریں بھی شامل رہیں گی۔ اور سرورق بھی رنگین اور دیدہ زیب ہوگا جس کے لئے ہندوستان کے مشہور حسن کار خاں بہادر عبدالرحمٰن چغتائی نے اپنی خوشی سے خدمات سے ادارہ کو مستفید کیا ہے چنانچہ موجودہ سرورق انہی کے ایک سہ رنگی نمونۂ حسن کاری کا خاکہ ہے جو آئندہ پوری شان سے جلوہ گر ہوگا۔
ایسی اہم اور ہمہ گیر خصوصیتوں کا رسالہ نکالنے کا خیال ابتدا میں "خیال است و محال است و جنوں" معلوم ہوتا تھا۔ لیکن جب ادارۂ ادبیاتِ اردو کے مدیرِ عمومی نے ادارہ کے ایک قدیم ہمدرد اور بہی خواہ نواب مہدی یار جنگ بہادر صدر المہام تعلیمات و سیاسیات حکومتِ آصفیہ سے اس کا تذکرہ کیا تو انھوں نے بڑی ہمت افزائی کی اور فرمایا کہ ایسا رسالہ ضرور نکالنا چاہیئے۔ چنانچہ ان ہی کے حسبِ ارشاد اجازت کی درخواست دی گئی اور ان کی اور دیگر معتقدِ علم دوست اصحاب کی توجہ اور دلچسپیوں نے آج ہم کو اس قابل بنا دیا کہ سب رس کی اشاعت کے ذریعہ سے اس الزام کو رفع کر سکیں کہ "اعلیٰ حضرت ظلِ سبحانی سلطان العلوم آصف جاہ سابع خلد اللہ ملکہٗ و سلطنتہٗ کی معارف نوازیوں اور علم پروری کے باوجود حیدرآباد صحافت کے میدان میں بہت پیچھے ہے"۔
ممالکِ محروسۂ سرکارِ عالی سے جو اردو رسالے شائع ہوتے ہیں ان میں بیشتر مدرسوں اور کالجوں کے رسائل ہیں جن کا دائرۂ عمل اساتذہ اور طالب علموں یا اعلیٰ تعلیم یافتہ اصحاب تک محدود ہے۔ مجلہ تحقیقاتِ علمیہ، مجلہ عثمانیہ، المُوسیٰ، مجلہ ورنگل، فورس اس جامعہ عثمانیہ کی مختلف درسگاہوں کے ترجمان ہیں۔ دو رسالے مجلہ طیلسانین اور مجلہ نظامیہ۔ دو درسگاہوں (یعنی جامعہ عثمانیہ اور مدرسہ نظامیہ) کے فارغ التحصیلوں کی طرف سے شائع ہوتے ہیں۔ اور اردو انجمن ترقی اردو کا سہ ماہی رسالہ ہے جس میں بلند پایہ محققانہ مقالے اور ادبی مضمون شائع ہوتے رہتے ہیں۔ حیدرآباد کا ایک رسالہ "شہاب" ایسا ہے جو ماہوار ہے اور عام ادبی رسالہ سمجھا جا سکتا ہے اور پابندی کے ساتھ وقت پر شائع ہوتا ہے۔ آج حیدرآباد کو علم و فضل کا مرکز سمجھا جاتا ہے اور جامعہ عثمانیہ کی وجہ سے یہاں اردو کے اہلِ علم میں روز بروز اضافہ ہو رہا ہے لیکن یہ نہایت افسوس کی بات ہے کہ اخبار و رسائل کے مطالعہ کا ذوق ابھی عام نہیں ہوا۔ ہم کوشش کریں گے کہ ہر اردو داں اپنی فرصت کے اوقات میں کچھ دیر ضرور مطالعہ کیا کریں۔ جب تک مطالعہ کا ذوق وسیع نہ ہوگا نہ ہم ایک دوسرے سے واقف ہو سکیں گے نہ ہمارے خیالات میں یکسانیت پیدا ہو سکے گی نہ ہمارا ادب وسعت حاصل کر سکے گا اور نہ ہماری زبان میں ترقی ہوگی۔
رسالہ سب رس ادارۂ ادبیاتِ اردو کی طرف سے نکل رہا ہے اس لئے اس کی نگرانی ادارہ کے معتمد عمومی کے سپرد ہے اور ادارہ کے سرگرم رکن صاحبزادہ میر محمد علی خاں میکش کو اس کی ادارت کے لئے منتخب کیا گیا ہے۔ یہ ایک پرجوش اور اہلِ ذوق نوجوان ہیں ان کی سرگرمیوں اور سلامتی طبع سے توقع ہے کہ سب رس ان کی ادارت میں ہر طرح سے کامیاب ثابت ہوگا۔
پہلے نمبر میں جو مضامین اور نظمیں شائع ہو رہی ہیں وہ صرف چار پانچ ہفتوں کی کوششوں کا نتیجہ ہیں۔ ان کی خصوصیات کے متعلق کچھ لکھنے کی ضرورت نہیں۔ اتنا کہنا ضرور ہے کہ آئندہ ہر مہینہ میں ہمارے پڑھنے والے سب رس کو اپنی توقعات سے زیادہ دلچسپ اور

بقیہ سلسلہ ۲۹۰ پر ملاحظہ ہو

پنڈت ونسی دھرجی

حیدرآباد کے بابائے ہندی

پنڈت ونسی دھرجی کو میں کوئی پچیس سال سے جانتا ہوں۔ وہ اورنگ آباد سے نئے نئے حیدرآباد آئے ہوئے تھے اور عثمانیہ یونیورسٹی میں ہندی پڑھانے کے لیے مامور ہونے والے تھے۔

ان سے پہلے پنڈت ہری ہرشاستری اس خدمت پر مامور تھے اور انھوں نے اپنے علم و فضل اپنے اخلاق اور مرنجان و مرنج پالیسی کی وجہ سے ہندی کے پروفیسر کا ایک ایسا معیار قائم کردیا تھا کہ دوسری زبانوں کے پروفیسروں کے مقابلے میں ہندی کے استاد بہت شائستہ اور نرم اور ملائم معلوم ہوتے تھے۔ وہ نہ صرف اپنے شاگردوں سے بہت محبت کرتے تھے بلکہ اپنے ساتھیوں کے ساتھ بھی ان کے تعلقات بڑے شگفتہ تھے۔

پنڈت ونسی دھرجی نے پنڈت ہری ہرشاستری جی کے بعد ان کی شریفانہ اور مخلصانہ روایات کو نہ صرف باقی رکھا بلکہ ان میں اضافہ کیا۔ ان کے دورِ ملازمت میں ایک زمانہ ایسا بھی آیا جبکہ حیدرآباد میں ہندی زبان تعصب اور مخالفت کی نظر سے دیکھی جاتی تھی لیکن پنڈت ونسی دھر نے اپنے میل ملاپ اور محبت و آشتی سے اس فضا کو دور کرنے کی کوشش کی۔ اور نہ صرف ہندی کے خلاف لوگوں کے جذبات کو دبا دیا بلکہ ہندی کی ضرورت اور اہمیت کو محسوس کرادیا۔ اور اتنے مقبول رہے کہ اردو کا کوئی مشاعرہ ان کی شمولیت اور شرکت کے بغیر نامکمل سمجھا جانے لگا۔

عثمانیہ یونیورسٹی میں ہندی کے شعبے کو ترقی دینے اور دوسری زبانوں کے شعبوں کے ہم پلہ قرار دینے کا سہرا انہی کے سر ہے۔ جس کام کے لیے ابتدائے ملازمت کے وقت وہ تنہا تھے وظیفہ لینے اور جامعہ سے جدا ہونے کے وقت انھوں نے اس کام کے لیے ایک جماعت اپنے پیچھے چھوڑی۔ یہ کام محض ان کی ذاتی مقبولیت اور اردو والوں کے ساتھ میل ملاپ اور شخصی تعلقات کے باعث پورا ہوسکا۔ وہ تعصب اور نفرت کے جذبات سے دور رہتے ہیں اور اگر دوسری باتیں نہ بھی ہوتیں تو صرف یہی ایک خصوصیت ان کے بڑے آدمی ہونے کے لیے کافی تھی۔ مگر فراخ دلی ہمدردی اور مروت کے علاوہ ان میں اور بھی بہت سی خوبیاں ہیں۔

وہ کئی زبانوں کے ماہر ہیں۔ نثر اور نظم دونوں پر یکساں عبور رکھتے ہیں۔ اور اپنی شاعری میں ایسے سلیس اور سادہ الفاظ اور ترکیبیں استعمال کرتے ہیں کہ ان کا کلام اردو اور ہندی دونوں کے بہی خواہوں اور طرف داروں کو پسند آتا ہے۔ اسی خصوصیت کی وجہ سے اردو کے مشاعروں میں ان کو بہت زیادہ داد ملتی ہے اور اردو کے شاعر ان کی سلیس اور سادہ زبان کی تقلید کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ اس طرح پنڈت ونسی دھرجی نے اردو اور ہندی دونوں کی بڑی مفید خدمت انجام دی ہے۔

مجھے جامعہ عثمانیہ کی اکثر علمی کمیٹیوں میں پنڈت جی کے ساتھ مل کر کام کرنے کے مواقع ملے ہیں۔ اور میں نے قریب سے انھیں دیکھا ہے۔

بقیہ سلسلہ صفحہ ۳۰۰ پر ملاحظہ ہو

۱۱؍اکتوبر ۱۹۵۸ء

میرا کشمیر کا سفر

۱۹۵۸ء

مولانا آزاد کی یاد منانے اور ان کی زندگی کے مختلف پہلوؤں پر روشنی ڈالنے کے لیے جب حکومت کشمیر نے ۲۰؍ سے ۲۷؍ مئی
۔ ایک آزاد سیمینار منعقد کرنے کا فیصلہ کیا تو ایک موضوع پر مجھے بھی تقریر کرنے کی دعوت دی۔ مجھے لکھا گیا کہ "ہندوستانی تہذیب
نشاۃ ثانیہ میں مولانا آزاد کی خدمات" پر تقریر کروں۔ چونکہ عنوان میرے لیے نیا تھا اور میرے ذوق سے ہٹا ہوا تھا اس لیے میں پس و پیش
ہی میں رہا۔ یہاں تک کہ سری نگر سے تار پر تار وصول ہونے شروع ہوئے اور مجبور کیا جانے لگا کہ ضرور اس آزاد سیمینار
شرکت کروں۔ آخر کار میں نے رضا مندی ظاہر کر دی اور ریل میں اپنی نشست محفوظ کرانے کی کوشش کی مگر وہ تو کئی روز
ہی حسب قاعدہ دوسروں کے لیے محفوظ ہو چکی تھی۔

ادھر میری بڑی لڑکی بھی کشمیر کی سیر کے لیے بے تاب تھی اور اس کے کالج سے جو پارٹی کشمیر گئی تھی اس میں شریک نہ ہوسکنے
تاسف کا اظہار ایک عمدہ نظم میں کیا تھا۔ یہ نظم بار بار گھر کی محفلوں میں سنائی گئی تھی۔ اور میں نے وعدہ کیا تھا کہ میں خود سا
کشمیر دکھاؤں گا۔ اب اس وعدہ کے ایفا کا موقع تھا۔ اس لیے میں نے ریل کے سفر سے مایوس ہو کر خود اپنی موٹر کار میں جانے
تہیہ کر لیا۔ اور آخر کار ۱۱؍ مئی کو صبح صبح حیدر آباد سے اپنی بیوی اور بچوں کے ساتھ نکلا۔ اور دوپہر میں کچھ دیر شولاپور میں آرام
کے اسی رات پونہ پہنچ گیا۔ پونہ میں دو تین دوستوں کو اطلاع دے دی تھی کہ رات وہیں ٹھہروں گا اتفاق سے ان میں ایک ڈاکٹر
یورے بھی تھے۔ سید ھا انہی کے یہاں پہنچا۔ وہاں میرا انتظار ہو رہا تھا مگر میری حیرت اور رنج کی انتہا نہ رہی جب یہ معلوم ہوا
ڈاکٹر دیورے کا چند ماہ قبل ہی ریل کے ایک حادثے میں انتقال ہو چکا ہے۔ اور ان کی بیوہ اور لڑکے نے ازراہ مسافر نوازی
یام کا انتظام کیا اور میرے انتظار میں ہیں۔ ہمت نہ ہوئی کہ ان مغموم مگر مہمان نواز لوگوں کو چھوڑ کر دوسرے دوستوں کے یہاں چلا جاؤں۔
ات اسی رنج میں گزاری اور اپنی لاعلمی پر بڑا افسوس رہا کہ میں اس حادثے سے واقف نہ ہوسکا اور ان مغموم لوگوں کو زحمت
ٹھانی پڑی۔

۱۲؍ مئی کی صبح میں پونا سے نکل کر ناسک کے راستے سے مالے گاؤں پہنچ کر دوپہر کو آرام لینے کا ارادہ تھا مگر وہاں معلوم ہوا کہ
ہیضہ پھیلا ہوا ہے اور ڈاک بنگلہ میں مسافروں کو قیام کی اجازت نہیں ہے اس لیے مجبوراً سفر جاری رکھنا پڑا۔ اور ۱۳ میل آگے
جاکر ایک غیر آباد اور بے آب و گیاہ بنگلے میں کچھ دیر ٹھیرنا پڑا۔ شدت کی گرمی تھی دوپہر بڑی کرب و بے چینی میں گزری۔ ۵ بجے وہاں
سے نکلے مگر دھوپ اور گرمی کی شدت نے بہت بے تاب رکھا آخر کار دھولیا کے ڈاک بنگلے میں پہنچ کر آرام سے رات گزاری۔
۱۳؍ مئی کی صبح میں ناشتے اور چائے سے فارغ ہو کر پھر نکل کھڑے ہوئے اور گرمی کی شدت برداشت کرتے ہوئے ڈیڑھ بجے

اندور پہنچ گئے۔ راستہ میں موٹر کے ہارن اور سلف نے کچھ ستانا شروع کیا تھا۔ کچھ اس کو درست کرایا اور کچھ آرام لیا منع کیا تھا کہ اندور سے آگے شام کے چھ بجے سفر نہ کریں۔ راستہ خطرناک ہے اور کچھ عرصے سے ڈاکو بھی لوٹ مار کر رہے کی بات ہے کہ اسی راستہ سے رات کے وقت گزرنا پڑا۔ بڑی ہیبت میں راستہ کٹا۔ جس جگہ ٹھہرنا چاہتے تھے وہاں پہلے ہوئے تھے۔ رات کے ۹ بجے شاجاپور کے بنگلے میں پہنچے مگر وہاں کے چوکیدار نے ڈھارس بندھائی کہ گونہ چلے جائیے وہاں لے گا۔ مگر گونہ پہنچنے میں کافی دیر ہوگئی۔ راستے میں بہت سے شکاری جانور چیتل۔ خرگوش۔ بارہ سنگھے اور لومڑیاں کے دو بجے ڈاک بنگلہ پہنچے اور دو گھنٹے آرام لے کر صبح ۴ بجے نکلے اور شیوپوری کے بنگلے میں پہنچ کر ناشتہ کیا اور چائے پیے نکلے آگرہ پہنچنے میں ابھی بیس (۲۰) میل باقی تھے کہ موٹر کا سائلنسر ٹوٹ کر گر پڑا۔ اس کو رسی سے باندھ کر آگرہ پہنچے گیا۔ اور ساڑھے پانچ بجے آگرہ سے دلی کی طرف چل پڑے۔ تھوڑی دور جانے کے بعد آندھی اور گرد و غبار کے طوفان سست کرنی پڑی جس کی وجہ سے دلی ۱۴ مئی کی رات دیر گئے پہنچے۔

ڈاکٹر خواجہ احمد فاروقی اور ان کے گھر کے لوگ ہمارا انتظار کر کے سو چکے تھے۔ انھوں نے ہماری بڑی مہمان آرام پہنچایا۔ دلی میں دو روز ٹھہر کر موٹر کی صفائی کرائی گئی اور سلف بھی درست کرالیا گیا اور ۱۷ مئی کو صبح ۶ بجے شام کے پانچ بجے لدھیانہ پہنچے یہاں کا ڈاک بنگلہ بڑا عالیشان اور آرام دہ ہے۔ باوجود گرمی کے کوئی زحمت نہ جالندھر میں قیام کیا۔ دوسرے دن موٹر کی وہیں سروسنگ کرائی اور ۱۹ مئی کو پٹھان کوٹ ہوتے ہوئے رات دلی سے پٹھان کوٹ تک تمام راستہ بارونق اور آباد ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جنگل میں منگل منایا جا رہا ہے۔

رات جموں میں بسر کی۔ دلی میں سلف اسٹارٹر درست کیا تھا مگر جموں آنے تک وہ پھر خراب ہوگیا۔ صبح کرایا گیا اور اس کام میں اتنی دیر ہوگئی کہ سری نگر جانے والی بسوں کا قافلہ روانہ ہوگیا۔ آخر کار درست ہو کر آیا ہی نکل پڑی۔ تھوڑی دیر کے بعد سرسبز و شاداب پہاڑیاں شروع ہوئیں اور اس اتار چڑھاؤ میں پھر موٹر ہوئی۔ مگر ہم آگے بڑھتے ہی گئے اور رات دیر گئے بانہال کے ڈاک بنگلے میں پہنچے۔ وہاں سب کمرے پہلے ہی سے دو کشمیری نوجوانوں نے اپنی قیام گاہ میں سہارا دیا اور رات اُن کے کمرے میں بڑی تکلیف میں گزری۔ نہایت اتنی سردی میں نے لندن اور پیرس کے بعد پہلی دفعہ محسوس کی۔ بچے بھی کانپ رہے تھے۔ بہر صورت دن کو تھوڑا بہت آرام ہی غنیمت معلوم ہوا۔ صبح بہت جلد اُٹھ کر سری نگر جانے والے قافلہ میں شریک ہونا تھا نے ناشتہ کا عمدہ انتظام کیا تھا اور جلد ہی بیدار کر دیا تھا۔ پھر بھی قافلہ پہلے ہی نکل چکا تھا۔ ہم بھی شل کا راستہ ہی چوکی پر پہنچ گئے۔ جموں سے سری نگر آنے جانے کے لیے یک طرفہ ٹریفک کا انتظام ہے جس کی وجہ سے بڑی سہولت کا ہونا ضروری ہے اور گھاٹیوں اور موڑوں پر موٹروں کا ٹکرا جانا لازمی ہے۔ راستہ بہت تنگ ہے غریب کشمیری مز کی توسیع اور صفائی میں مصروف ہیں مگر آئے دن پتھر لڑھک کر اور مٹی پھسل کر راستہ کو مخدوش بناتی رہتی ہے۔ تا مزدوروں کی آبادی پھیلی ہوئی ہے۔ اور ہر وقت بچے جوان بوڑھے مرد اور عورتیں سب لوگ کام کرتے نظر آتے ہیں۔

یہ راستہ عجیب خطرات کے ساتھ ساتھ عجیب و غریب مناظر سے معمور ہے۔ جن کی نیرنگیاں تحریر یا تقریر میں سری نگر سے بہت پہلے ہی پہاڑی راستہ ختم ہوگیا اور ہم اب وادی کشمیر میں تھے۔ ۲۰ مئی کو دس بجے سری نگر پہنچ اور اپنی قیام گاہ کی بابت دریافت کیا۔ معلوم ہوا کہ ڈیرے میں بھی انتظام ہے اور مہمان گاہ میں بھی۔ ہم نے سرکا

یام پسند نہیں کیا۔ بعد میں معلوم ہوا کہ ڈیرے زیادہ آرام دہ ثابت ہوئے ہیں۔

ہمارے پہنچنے کے کچھ عرصہ بعد آزاد سمینار کے رضاکار آئے اور ہمارے آرام کے بارے میں ہر طرح کا انتظام کیا۔ ان سے پتہ چلا سمینار صبح دس بجے سے شروع ہو چکا ہے اور دوسرے ہی دن میری تقریر ہوگی۔ ٹورسٹ سنٹر میں کسی نے اس تقریب کے وقت اور م کی اطلاع نہیں دی تھی۔ ورنہ میں بھی اس افتتاحی اجلاس میں شریک ہو سکتا تھا۔

ان تمام تقریبات کے روح رواں اُردو کے مشہور شاعر اور ادیب علی جواد زیدی تھے جو سری نگر میں اس وقت حکومت ہند کمہ اطلاعات کے افسر تھے اور اب وزیر اعظم کشمیر کے پرائیویٹ سکریٹری ہیں۔ زیدی صاحب انتہا سے زیادہ مصروف تھے مگر ہمان کی شگفتہ انداز میں خاطر تواضع کر رہے تھے۔ اس زمانہ میں سچ تو یہ ہے سری نگر مہمانوں سے بھرا ہوا تھا۔ انھوں نے ہمارے قیام اور رہنمائی وغیرہ کے لیے ضروری انتظامات کئے۔ شام میں ہم نے نمائش دیکھی جس کا افتتاح غالباً اسی روز ہوا تھا۔ اس نمائش اکثر اسٹال بہت ہی رنگا رنگ تھے اور چہل پہل بھی اچھی خاصی تھی۔

دوسرے روز صبح میں دس بجے آزاد سمینار میں میری ہی تقریر تھی وہاں پہنچا تو ڈاکٹر گوپال ریڈی صاحب بھی ملے معلوم ہوا ہ کسی اور صاحب کی تقریر کی صدارت کے خیال سے آئے تھے۔ اور وہ صاحب ابھی کشمیر نہیں پہنچے تھے۔ علی جواد زیدی صاحب گوپال ریڈی صاحب نے حاضرین سے میرا تعارف جن الفاظ میں فرمایا ان کو سن کر میں بڑا نادم ہوا۔ اور میری تقریر کے بعد ریف وقدر افزائی انتہا پر پہنچا دی گئی۔ ڈاکٹر ریڈی صاحب نے چلتے ہوئے یہ بھی کہا کہ شام میں کشمیر کے چیف جسٹس صاحب یہاں عصرانہ میں آپ کو لے جانے کے لیے آؤں گا۔ منتظر رہئے۔ واپسی میں ان کی بیوی میری قیام گاہ پر میرے ساتھیوں سے آئیں۔ اور ہمارے لیے گلاب کے بہت بڑے بڑے پھول بھی لیتی آئیں۔ جب ڈاکٹر ریڈی صاحب کو معلوم ہوا کہ ہمارے ساتھ گرم بستر نہیں ہیں تو اپنی قیام گاہ پر جا کر اپنے کئی گرم کمبل روانہ کئے۔ اس طرح کئی روز تک کشمیر کی سرد راتوں کا مقابلہ کرنا رے لیے آسان ہو گیا۔

آزاد سمینار کے جلسے چھ دن تک صبح میں ہوتے رہے۔ اور ان میں شرکت کے بعد ہم ہر روز شام میں سری نگر کے اطراف نواں کے مشہور اور دلکش مقامات کی سیر کرتے رہے۔ جھیل ڈل کا نظارہ سب سے زیادہ دلکش معلوم ہوا۔ اس میں جو شکارے چلتے رہتے ہیں ان کی وجہ سے دن میں اور رات میں نہرو پارک اور اطراف واکناف کی روشنی کے باعث عجیب رنگین اور مانی کیفیت محسوس ہوتی ہے۔ ایک روز چشمہ شاہی دیکھا ایک روز شالیمار باغ اور ایک روز نشاط باغ۔ باقی کے اوقات ہر کے بازاروں اور گلیوں کی سیر و سیاحت میں بسر ہوئے۔ چونکہ اپنی موٹر کار ساتھ تھی اس لیے سواری کے انتظار یا انتظام مجبوری نہیں تھی۔ جب جی چاہا نکل پڑتے اور جتنی دیر چاہتے باہر رہتے۔

یوں تو حکومت کشمیر نے مہمانوں کی سیر و سیاحت اور تفریح کے سارے انتظامات اچھے پیمانے پر کر رکھے تھے لیکن ذاتی سواری ام ہی اور ہوتا ہے۔ کشمیر کے عہدہ دار جہاں کہیں ملتے اس بات پر مسرور دکھائی دیتے کہ ہم اپنی موٹر میں آئے ہیں۔ اور ان میں لوگ ہندوستان اور خاص کر حیدرآباد کسی نہ کسی وقت آ چکے ہیں وہ تو بہت تعجب اور حیرت کا اظہار کرتے کہ ہم حیدرآباد سے ری نگر تک موٹر میں آئے ہیں۔ اور بخیر و خوبی پہنچ گئے ہیں۔

ایک روز بخشی غلام محمد صاحب نے تمام مہمانوں کو عصرانہ دیا اس میں صدر ریاست کرن سنگھ جی اور شریمتی وجے لکشمی پنڈت شریک تھیں۔ چائے کے بعد مختلف تقریبات میں حصہ لینے والوں کو تمغے عنایت کئے گئے۔ میری حیرت کی انتہا نہ رہی جب شعرا کے

تحفے دینے کا نمبر آیا تو میرا نام پکارا گیا اور مجھے شاعروں کے سب تحفے دے دیئے گئے تاکہ بعد میں ان کو تقسیم کر دوں۔

اب آزاد سمینار ختم ہو چکا تھا مگر کشمیر کا جشن بہار ابھی جاری تھا اور پہلی جون کو اس کا مشاعرہ ہونے والا تھا میں
سے واپسی کی اجازت مانگی تو انھوں نے فرمایا کہ جشن پہلگام میں آیئے وہاں باتیں ہوں گی غرض پہلگام اور گل مرگ اور دیگر
سیر و سیاحت بھی بہت دلچسپ رہی۔ مگر گل مرگ میں موسم کی خرابی کی وجہ سے بڑی بدمزگی رہی اور بارش میں ہم سب
واپس ہوئے۔ حسرت ہی رہ گئی ٹن مرگ نہ جا سکے جو گل مرگ سے آگے ہے اور برف سے ڈھکا رہتا ہے۔ یوں تو برف سے ڈ
ہماری قیام گاہ ہی سے نظر آتی تھیں اور ان کے نیچے ہر وقت ابر کے ٹکڑے آوارہ گردی کرتے دکھائی دیتے تھے مگر برف پر
میں سے گزرنے کی بچوں کی خواہش پوری نہ ہو سکی۔

پہلی جون کو مشاعرہ کی صدارت کرنے کے بعد رات دیر میں سوئے اور صبح اٹھ کر تیار ہونے میں بھی کافی دیر ہو گئی ا
بجے بارہ بجے کے قریب نکلے اور تمام پہاڑیوں کے چکر کاٹتے اور نشیب و فراز سے گزرتے اور بل کھاتی ہوئی جہلم کا مختلف
نظارہ کرتے رہنے کے بعد اسی رات میں جموں پہنچ گئے۔ اب پھر گرم موسم اور اس کی شدتوں کا مقابلہ کرنا پڑا۔ ۲ جون
۱۲ بجے تک پٹھان کوٹ پہنچے۔ اور رات میں دیر گئے لدھیانہ کے ڈاک بنگلے میں پہنچ کر دم لیا۔ دوسرے روز صبح ۱ بجے
گوپال ریڈی صاحب کے بنگلے میں تھے۔ ان کی بیوی نے ہمارے آرام و آسائش کے لیے کوئی کسر اٹھا نہ رکھی۔

ہم کو معلوم تھا کہ ۷ جون کو مانسون شروع ہو جاتا ہے اس لیے چاہتے تھے کہ جلد سے جلد حیدرآباد واپس ہوں مگر
نے ۵ جون سے پہلے نکلنے کا موقعہ نہ دیا۔

آگرہ اور گوالیار میں واپسی کے وقت اور بھی سخت گرمی سے سابقہ پڑا۔ ۷ جون کو راستہ ہی میں سخت باد
سامنا رہا۔ ہم دھولپور کے ڈاک بنگلہ کی گیٹ میں داخل ہی ہوتے تھے کہ طوفانی بارش شروع ہوئی اور موٹر کے او
اور بچھونا بندھا ہوا تھا اوپر سے نیچے اتارتے تک بہت کچھ بھیگ گیا۔

دوسری رات دھولیا کے ڈاک بنگلے میں گزاری اور تیسری بمبئی میں۔ بمبئی سے ۱۰ جون کو ۸ بجے نکلے اور اسی روز
اپنے گھر میں واپس آ کر دم لیا۔ ایسا معلوم ہوا کہ ع خواب تھا جو کچھ کہ دیکھا جو سنا افسانہ تھا۔

بقیہ سلسلہ (۲۹۶)

میں نے محسوس کیا کہ وہ جتنے نرم ہیں اتنے ہی گرم بھی ہیں۔ لیکن ان کی گرمی میں بھی ایک آن ہوتی ہے اور بہت جلد ان ؟
پر قابض ہو جاتی ہے۔

ادارۂ ادبیاتِ اردو اور ہندی پرچار سبھا کی کمیٹیوں میں بھی میں نے ان کے ساتھ کام کیا ہے اور یہاں میں
شانی اور اصولی آن کو زیادہ جلوہ گر پایا۔ اصول اور راست گوئی کے معاملے میں وہ بڑے بے باک ہیں اور یہ بے با
کے ختم تک باقی رہتی ہے۔ پھر وہ زندہ دل اور یار باش آدمی باقی رہ جاتے ہیں۔ وہ اب حیدرآباد کی اعلیٰ علمی زند
بن گئے ہیں۔ واقعہ یہ ہے کہ اس شہر میں ہندی کے جھنڈے کو بلند و بالا رکھنے اور اس کی جڑوں کو استوار کرنے میں جت
کا حصہ ہے شاید ہی کسی اور کا ہو۔ حیدرآباد کی حد تک اگر ان کو بابائے ہندی کہا جائے تو میرے خیال میں غلط نہ

ڈاکٹر زور

کے

خطبات



[illegible]

خطبۂ صدارت شعبۂ اردو

آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس جبل پور

۱۷ اپریل سنہ ۱۹۴۳ء

معزز حاضرین ـــــ

صدارت شعبۂ تصنیف و تالیف اردو کے فرائض سپرد کر کے ارباب کانفرنس نے مجھ کو جو عزت بخشی ہے اس کا شکریہ ادا کرنا سہل ہے لیکن ان فرائض کی بجا آوری آسان نہیں ہے جو اس سلسلہ میں مجھ پر عاید کی گئی ہیں۔ اس لئے کہ دنیائے اردو کے مسائل گذشتہ ربع صدی میں اتنے پیچیدہ ہوگئے ہیں کہ ان کا سلجھانا روز بروز دشوار ہوتا جا رہا ہے۔ اور ملک کے سیاسی اور اردو بولنے والوں کے ذہنی رجحانات کچھ ایسے ناخوشگوار اور بے ڈھنگے ہوتے جا رہے ہیں کہ ان کو سنوارنے اور سلجھانے کی جتنی کوششیں کی جاتی ہیں اتنی ہی الجھنیں بڑھتی جا رہی ہیں۔ اس کے اسباب یوں تو کئی ہیں لیکن بڑے سبب صرف دو ہیں۔

(۱) اردو بولنے والوں کی غفلت و سہل انگاری۔ (۲) ناخدایان اردو کی خود غرضی و غلط راہبری۔

یہ دونوں اسباب ایک دوسرے سے اتنے وابستہ ہیں کہ ان کو صحیح معنوں میں دو سمجھنا ہی نہ چاہئے۔ یہ اصل میں ایک ہی ہیں۔ کیونکہ جو لوگ اپنی زبان اور ادب سے غفلت برتتے ہیں وہ ہرگز توقع نہیں رکھ سکتے کہ ان میں سے فرض شناس، بے لوث اور مخلص خادم زبان و ادب پیدا ہو سکیں گے۔ اور اگر کوئی خدا کا بندہ خلوص و ایثار اور صحیح نقطۂ نظر لیکر اٹھے گا بھی تو وہ لوگ اس کو پنپنے نہ دیں گے جو محض اپنی عظمت و اقتدار کے نظام و دوام کی خاطر زبان و ادب کے رہنما اور قائدین بیٹھے ہیں۔ اور ان کی غافل قوم کی آنکھیں ان کی سیاست و اقتدار کی جلوہ گری سے چکاچوند ہو جاتی ہیں۔ جب تک احتسابی قوتیں شل رہیں گی صحیح رہنمائی ممکن نہیں اور کوئی تعجب نہیں کہ نیک نیت رہنما بھی رفتہ رفتہ رہزن بن جائیں۔

اس لئے سب سے پہلے اس امر کی ضرورت ہے کہ اردو بولنے والوں میں اپنی زبان اور ادب کی سچی محبت کا احساس پیدا ہو۔ اور وہ اس بات کو محسوس کریں کہ زبان اور ادب کو ان کی انفرادی اور اجتماعی زندگی کے بننے یا بگڑنے سے کتنا گہرا تعلق ہے۔ جب تک یہ احساس پیدا نہ ہوگا نہ زبان ہی ترقی کر سکے گی اور نہ اس کے بولنے والے۔ اور اس احساس کی صحت مند نشوونما دوسری زبانوں سے نفرت پیدا کرنے یا دوسری زبان کے ہمدردوں سے دشمنی مول لینے کی وجہ سے نہیں ہو سکتی۔ یہ ایک تخریبی طریقہ ہے اور اگرچہ تخریبی کام بالعموم جوش و جذبہ کے تحت بہ آسانی کرائے جا سکتے ہیں اور ان کی وجہ سے قیادت اور رہنمائی کا مرتبہ بھی جلد اور آسانی سے حاصل ہو سکتا ہے لیکن نہ ایسی قیادت دیرپا ہوتی ہے اور نہ ایسے کام مفید ثابت ہوتے ہیں۔ اگر آپ کے ہمسائے کے باغ میں درخت اور کیاریاں سرسبز و شاداب ہیں اور آپ کے باغ میں پھلوں اور پھولوں اور شادابی کی

کمی ہے تو یہ کمی اس طرح دور نہیں ہو سکتی کہ آپ اپنے ہمسایے کو گالیاں دیں اور اس کے درختوں اور روشوں پر پتھر پھینکیں بلکہ آپ کا باغ ہمسایے کے چمن سے ہمسری کر سکے گا جبکہ آپ اس کے لئے ویسی ہی مشقت و محنت کریں جیسی کہ وہ اپنے باغ کے لئے کرتا ہے۔ پس اردو سرسبز و شاداب رکھنے کے لئے ہندی یا بنگالی یا پنجابی زبانوں کی مخالفت اور ان کی آبیاری کرنے والوں سے جھگڑا مول لینے کی نہیں ہے۔ ضرورت اس کی ہے کہ ہم بھی ان ہی ذریعوں اور طریقوں کو سمجھیں اور سیکھیں جن سے یہ زبانیں بار آور ہو رہی ہیں۔

یہ اردو کی بدقسمتی ہے کہ ادھر کچھ عرصہ سے اس کے بعض بہی خواہ تعمیری کی بجائے تخریبی اسالیب کار اختیار کر رہے ہیں۔ اردو کی تاریخ میں کبھی یہ طریقہ اختیار نہیں کیا گیا تھا اور اندیشہ ہے کہ اگر ہم اسی ذہنیت کے ساتھ نشو و نما حاصل کرتے رہیں تو ہماری زبان اور اس کی مقبولیت بہت جلد ختم ہو جانے گی جو ہمارے بے تعصب صوفیوں اور زندہ دل شاعروں اور آزاد مشرب ادیبوں کی وجہ سے ہندوستان کے اس کے دور دراز کے علاقوں میں پیدا ہوئی تھی۔ اردو بولنے اور سمجھنے والے کشمیر سے لنکا تک اور بلوچستان سے آسام تک محض اسی لئے آج ہیں کہ ان کے اسلاف نے صلح جویانہ مسلک اختیار کیا اور کبھی کسی مقامی یا دوسری زبان کی مخالفت نہیں کی۔ حالانکہ اس زبان کا ایسا زمانہ بھی گذر چکا ہے کہ اس کے بولنے والے صاحبانِ تخت و تاج تھے اور ہر طرح کا سیاسی و سماجی اقتدار رکھتے تھے۔

عہد حاضر میں جبکہ ہر طرف انفرادی و اجتماعی آزادی کے چرچے ہیں اگر اردو کے مصنفین و مولفین ایک ایسا طریقہ اختیار کرنا چاہیں جو دیرینہ روایات کے خلاف ہے اور جس پر اپنے حاکمانہ اقتدار کے زمانہ میں بھی ارباب اردو نے عمل نہیں کیا تو ہمیں سمجھ لینا چاہیئے کہ اردو کے حق میں مفید نہ ہوگا۔ اور اہل اردو ہندوستان کی تاریخ میں ہمیشہ کے لئے بدنام ہو جائیں گے۔ اگر ہم میں سے بعض ایسے ہیں کہ نام یا اس کے رسم الخط کو پسند نہیں کرتے تو ہم انہیں کیونکر مجبور کر سکتے ہیں کہ وہ اس کو پسند کریں؟ اور اگر ایسے لوگ خود اردو سے برگشتہ ہیں کو بھی اس سے برگشتہ کرانا چاہتے ہیں تو اس کا جواب یہ نہیں ہے کہ ہم اپنے اخباروں یا رسالوں میں چند حقارت آمیز یا مخالفانہ مضامین لکھ کر سمجھ لیں کہ ہم نے اپنی زبان کی بڑی خدمت کی اور مخالفوں کے خلاف اہل اردو میں نفرت پیدا کر کے کوئی خاص کامیابی حاصل کی۔

ایسے وقت میں سچے اور مخلص ہمدردانِ اردو کا اصل کام تو یہ ہے کہ ان لاکھوں اردو بولنے والوں کو صحیح معنوں میں اردو داں بنانے کی کوشش کریں جو ارباب اردو کی غفلت و نادانی اور دوسروں کی دانائی کی بنا پر بہت جلد اردو دنیا سے علیحدہ ہو جائیں گے۔ کیونکہ تقریباً ہر جگہ ایسے لاکھوں غریب اور پریشان حال موجود ہیں جو پڑھنے لکھنے کی دولت سے محروم ہیں اگر اہل اردو چاہتے ہیں کہ ان کی زبان بولنے والے مستقبل قریب میں معتد بہ کمی نہ ہونے پائے تو ان کا اولین فریضہ یہ ہے کہ وہ ہر شہر اور ہر گاؤں میں تعلیم بالغان کی مہم کا آغاز کریں۔ کیونکہ بھی خواہ ان پڑھوں کو ہندی رسم الخط میں پڑھنا لکھنا سکھا کر اپنی تعداد میں اضافہ کر رہے ہیں تو وہ نہ صرف اپنا فرض ادا کر رہے ہیں بلکہ ہندوستان کی ناخواندگی کو دور کرنے کی سعی کر کے اپنے ملک کے سچے محسنوں کی صف میں بھی شامل ہو رہے ہیں۔

تعلیم بالغان کی مہم بجائے خود جو اہمیت رکھتی ہے اس کی نسبت تفصیل میں جانے کی ضرورت نہیں۔ البتہ اتنا ضرور ہمیں یاد رکھنا چاہیئے کہ اس کام سے ہم دو گونہ فوائد حاصل کریں گے۔ پہلا فائدہ تو یہ ہے کہ اس طرح تعلیم کو عام کر کے ہم جہالت کی ان گھنگھور گھٹاؤں کو دور کر سکیں گے جو ہمارے چاروں طرف چھائی ہوئی ہیں۔ اور جن کی تاریکی میں ہمارے کروڑوں بھائی بھلے اور برے اور سچ اور جھوٹ کے مابین امتیاز نہیں کر سکتے اور آسانی سے ایسے غلط بیانات باور کر سکتے ہیں کہ اردو قرآن شریف کی زبان ہے اور اس کو مسلمان حملہ آور اپنی گھوڑوں کے ساتھ باہر سے ہندوستان میں لائے ہیں۔

تعلیم بالغان کا دوسرا فائدہ پہلے فائدہ سے کچھ زیادہ اہم ہے۔ اس لئے کہ ہماری تعلیم کے ساتھ ساتھ خود اردو کی بھی اشاعت ہوتی

ہمیں یہ اچھی طرح سمجھ لینا چاہئے کہ ہماری زبان کی بقا اور اشاعت کے سلسلہ میں فی الوقت تعلیم بالغان کو جو اہمیت حاصل ہے اتنی کسی اور مسئلہ کو حاصل نہیں۔ اَن پڑھ لوگوں کو اس وقت جس زبان میں بھی پڑھنا لکھنا سکھا دیا جائے گا ان کی اولاد بھی وہی زبان اختیار کرے گی۔ خاص کر صوبہ متحدہ اور صوبہ متوسط اور ان کے اطراف و اکناف کے اکثر علاقوں کے باشندے ایسی زبان یا بولیاں بولتے ہیں جو محض رسم الخط سیکھنے کے بعد یا تو اردو بن جاتی ہیں یا ہندی۔ اس لئے سب سے پہلے اور سب سے زیادہ کوشش انہی مقامات پر تعلیم بالغان کے سلسلہ میں ہونی ضروری ہے۔ لیکن افسوس ہے کہ انہی علاقوں میں اردو کی تعلیم بالغان سے غفلت برتی جا رہی ہے اور ہمدردی اردو کے سارے مظاہرے محض نمود و نمائش اور مجلس آرائی کی حد تک آ کر ختم ہو جاتے ہیں۔ جو لوگ اردو کی محبت کے دعویدار ہیں اور اردو کے ساتھ ساتھ اپنی ترقی اور سماجی بہبودی کے بھی خواہش مند ہیں انھیں چاہیئے کہ اپنے اپنے قریوں، محلوں، گلیوں اور بازاروں میں تعلیم بالغان کے مدارس شبینہ کھولیں اور متحدہ طور پر سعی کریں کہ ان کے گاؤں یا محلے یا گلی میں کوئی شخص ایسا نہ رہے کہ جس کو اردو پڑھنا لکھنا نہ آتا ہو۔ اور اگر متحد ہو کر کام کرنا کسی وجہ سے ممکن نہ ہو (جس کا امکان زیادہ ہے) تو ہر شخص انفرادی طور پر کوشش کرے کہ وہ سال بھر میں کم از کم ایک مرد یا عورت کو پڑھا لکھا بنا کر چھوڑے گا۔ اردو کے ہر پڑھے لکھے آدمی کا یہ ایک ایسا مقدس فریضہ ہے جس کی بجا آوری کے بغیر اس کا ضمیر مطمئن نہیں ہو سکتا۔

یہ کام مشکل بھی نہیں ہے اور اس کے لئے نہ کسی انجمن کی ضرورت ہے نہ چندوں کی اور نہ کسی قسم کی ہنگامہ آرائی کی۔ لیکن مشکل یہ ہے کہ ہماری طبیعتیں ایسے ہی کاموں میں لگتی ہیں جن میں انجمن آرائی ہو یا ہنگامہ پروری۔ ہم خاموش اور مخلص کام کے ابھی عادی نہیں ہوئے ہیں اسی لئے جو لوگ خاموشی اور خلوص و ایثار کے ساتھ اپنی زبان کی ترقی اور اشاعت کر رہے ہیں وہ برق رفتاری کے ساتھ ہم سے آگے بڑھتے چلے جا رہے ہیں۔

خوش قسمتی سے ہم میں مولوی محمد سجاد مرزا صاحب جیسے ماہرین تعلیم موجود ہیں جنھوں نے تجربوں اور معلومات کے بعد تعلیم بالغان کی آسان کتابیں اپنی ذاتی نگرانی میں مرتب کرائی ہیں اور جن کی عملی تجربوں کی خاطر ادارۂ ادبیات اردو نے اپنی تعلیم بالغان کی مہم میں استعمال کر کے اندازہ لگایا ہے کہ ہندوستان کے ہر علاقہ میں ان پڑھوں کو بہت جلد پڑھا لکھا بنایا جا سکتا ہے۔ یہ کتابیں نہ صرف حیدرآباد بلکہ میسور اور جوناگڑھ کی ریاستوں اور بمبئی اور مدراس کے صوبوں میں بھی روشناس ہوئیں اور تعلیم بالغان کے لئے مفید و مقبول سمجھی جا رہی ہیں۔ ایک معمولی پڑھا لکھا آدمی بھی ان کے ذریعہ سے کسی اَن پڑھ آدمی کو اردو نوشت و خواند سے واقف کرا سکتا ہے۔ چنانچہ جہاں جہاں ادارۂ ادبیات اردو نے اس نصاب کو روشناس کیا۔ سیکڑوں اَن پڑھ لوگ پڑھے لکھے بن گئے۔ اور ادارے کے اردو امتحانات میں شریک ہو کر کامیابی حاصل کی۔ ادارے کی تعلیم بالغان کی مہم اتنی کامیاب ثابت ہوئی کہ سنہ ۱۹۴۳ء میں ریاست حیدرآباد کے تقریباً دو ہزار ان پڑھوں نے اس کے امتحان اردو دانی میں شریک ہو کر کامیابی حاصل کی۔ اور اس امتحان کے مرکز ریاست حیدرآباد کے باہر بھی مقرر کرنے پڑے چنانچہ گذشتہ سال بمبئی جیسا بڑا شہر بھی ایک مرکز تھا۔

غرض اس تجربہ سے ثابت ہوا کہ اردو میں تعلیم بالغان کا کام بہت آسانی سے انجام پا سکتا ہے اور ہندوستان کے دور دراز علاقوں کے رہنے بسنے والے اگر توجہ کریں تو نہ صرف اپنے علاقہ سے ناخواندگی کی وبا کو دور کر سکتے ہیں بلکہ اہل اردو کی تعداد میں اضافے کا باعث اور اپنی زبان کے استحکام و اشاعت کا موجب بھی بن سکتے ہیں۔

اردو کی تقویت اور استحکام کا ایک دوسرا ذریعہ یہ ہے کہ اہل اردو مطالعہ کی عادت ڈالیں۔ مطالعہ کے گوناگوں فوائد سے یوں تو کسی کو انکار نہ ہوگا۔ لیکن عہد حاضر میں اردو کی بقا اور ترقی کے لئے یہ ایک زود اثر اور مفید تر حربہ ثابت ہو سکتا ہے۔

اگر کوئی غیبی طاقت ہر اردو پڑھے لکھے مرد یا عورت کو اس امر کے التزام پر مجبور کرے کہ وہ روزانہ تھوڑی دیر: دس پانچ منٹ ہی سہی؛

کسی نہ کسی کتاب یا اخبار کا کچھ حصہ پڑھ لیا کرے تو اردو تصنیف و تالیف کی تاریخ میں ایک حیرت انگیز انقلاب پیدا ہو سکتا ہے۔ لیکن ہر شخص سے ایک ایسے التزام کی توقع نہیں کی جا سکتی اس لئے ایک ایسے انقلاب کی امید رکھنا بھی فضول ہے۔ البتہ سمجھ بوجھ رکھنے والے جاہیں تو اس کی کوشش کرنی چاہیئے کہ خود ہی اس امر کا التزام کریں اور اپنے اپنے حلقۂ اثر میں اس ذوق کو پھیلائیں۔ وہ دن اردو ادب کے لئے مبارک دن ہوگا جب اردو بولنے والوں کے ہر محلہ اور ہر گاؤں میں ایک کتب خانہ یا دارالمطالعہ موجود رہے گا۔ لیکن ایک ایسا یوم سعید اس وقت تک نہ آئے گا جب تک کہ اردو بولنے والوں میں اتحاد اور صحیح قسم کا سیاسی شعور پیدا نہ ہوگا اور انکی معاشی پستی دور نہ ہوگی۔ بہت ممکن ہے موجودہ حالات کے تحت ہر گلی میں ایک باضابطہ دارالمطالعہ قائم نہ ہو سکے۔ ایسی حالت میں ایک آسان صورت یہ اختیار کی جا سکتی ہے کہ ہر محلہ یا گلی کے کسی ایک گھر کو منتخب کر کے اس میں دو چار اخبار اور رسالے اور چند کتابیں مطالعہ کے لئے جمع کر لی جائیں اور فرصت کے اوقات میں پڑھے لکھے لوگ وہاں جایا کریں۔ مسجدوں اور معبدوں سے بھی یہ کام بڑی خوبی سے لیا جا سکتا ہے۔

بہر حال جہاں اور جس طرح بن پڑے دارالمطالعے قائم کئے جائیں اور پڑھے لکھے لوگ اپنی زبان کے ادب سے استفادہ کریں۔ اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ جہاں ایک طرف اردو ادب کا ذوق عام ہوگا، دوسری طرف اردو کے اخبار، رسالے اور تصنیفات و تالیفات زیادہ سے زیادہ تعداد میں چھپیں گی اور ان کے مصنفوں، مرتبوں اور ناشروں کی ہمت افزائی اور امداد ہوگی۔ جو اصحاب اردو اخبارات و رسائل کی کم مائیگی اور بے رونقی اور گھٹیا معیار کی شکایت کرتے ہیں وہ کبھی یہ بھی سوچتے ہیں کہ اس کا سبب وہ خود ہیں۔ جب تک اردو کی مطبوعات زیادہ تعداد میں نہ بکیں گی نہ انکے مصنفوں اور ناشروں کو انھیں بہتر بنانے اور چھاپنے کی ہمت ہوگی اور نہ انکی قیمتیں کم ہو سکیں گی۔ طلب اور رسد کا یہ موٹا مسئلہ ہے جس کی وضاحت غیر ضروری ہے۔ کتنے رنج کا مقام ہے کہ جس زبان کے بولنے والوں کی تعداد فخر و مباہات کے ساتھ آٹھ دس کروڑ سے زیادہ بتائی جاتی ہے اس کا کوئی اخبار یا رسالہ پانچ ہزار سے زیادہ تعداد میں نہیں چھپ سکتا۔ اور اس کی کسی مفید سے مفید کتاب کے ہزار دو ہزار سے زیادہ نسخے شائع ہونے نہیں پاتے۔ اہل اردو کے لئے یہ کیسی شرم کی بات ہے کہ اس کے اکثر رسالوں کے مدیر اپنے مضمون نگاروں کو کوئی معاوضہ نہیں دے سکتے۔ معاوضہ دینا تو درکنار اکثر و بیشتر رسائل ایسے ہیں جو کاغذ و طباعت ہی کے اخراجات کو ترستے رہتے ہیں۔ ایسی حالت میں مضامین کے معیار میں اضافہ اور رسائل کی ترتیب و دیدہ زیبی میں ترقی کیونکر ممکن ہے۔ کسی زبان کی پستی اور اہل زبان کی بے دردی کی بدتر مثال شاید ہی کہیں مل سکے۔ ہم کو دوسری ہمسایہ زبانوں اور ان کے بہی خواہوں پر اعتراض کرنے کا حق حاصل ہے جب کہ ہم خود اپنی زبان اور ادب سے غافل ہیں۔ واقعہ یہ ہے کہ ہماری اس بے حسی اور کم شعوری سے جتنا نقصان پہنچ رہا ہے دوسروں کی معاندانہ کوششوں سے کبھی نہیں پہنچ سکتا۔ ایسے ہی مواقع کے لئے شاید کہا گیا تھا کہ از ماست کہ بر ماست۔

ہماری زبان کے ادیب اور شاعر اپنی ذہانت، محنت، اور فنکارانہ کمال میں بڑی سے بڑی اور مہذب ترین زبان کے ادیبوں اور شاعروں سے کسی طرح کم نہیں۔ لیکن جس زبان کے بولنے والے خواہ امیر ہوں کہ غریب، بلکہ غریبوں سے زیادہ امیر قدردانی کے فن سے اور ادبی ذوق سے بے بہرہ ہوں اس میں علم و فن اور شعر و ادب پروان چڑھے تو کیونکر۔ یہی وجہ ہے کہ بعض صاحبان علم اردو کی جگہ انگریزی یا ہندی میں لکھنے کی طرف مائل ہو رہے ہیں۔ جب ہم میں سے اکثروں کی ذہنیت کا یہ عالم ہو کہ ہم انگریزی زبان میں چھپی ہوئی تحریر کو زیادہ قابل قدر اور دلچسپ سمجھتے ہیں تو پھر اردو میں کون لکھے گا۔ یہ ایک میرا ذاتی تجربہ ہے کہ جب کوئی کتاب اردو اور انگریزی دونوں زبانوں میں چھپی تو لوگ اس کے انگریزی نسخے کو زیادہ اہمیت دیتے ہیں۔ اور اردو نسخہ دوسری اردو کتابوں کی طرح برسوں طاق نسیاں میں دھرا رہتا۔ مصنف کو پھر کبھی کوئی کتاب اردو میں چھپوانے کی ہمت نہیں ہوتی۔ غرض جب اپنے شاعروں اور ادیبوں کی خود ہم قدر نہ کریں

ان کی طرف کیوں متوجہ ہوں اور پھر ہم کیوں توقع رکھیں کہ ترکی کے صحیفہ نگار، سیاح یا ایرانی ثقافتی وفد کے ارکان بنگالی کے شاعر ٹیگور کے مقابلہ میں اردو کے شاعر اقبال سے زیادہ واقف ہوں گے۔

اس لئے اردو کے تمام ہمدردوں کو تہیہ کر لینا چاہئے کہ وہ اپنی آمدنی کا کچھ نہ کچھ حصہ اردو کتب و رسائل کی خریدی کے لئے ہر مہینے لازمی طور پر خرچ کریں گے۔ اگر دس کروڑ سے زیادہ انسانوں میں بولی جانے والی زبان میں دس لاکھ آدمی بھی ایسے نہ مل سکیں جو اپنی زبان کی کتابیں اور رسالوں کو پابندی اور شوق سے خریدتے ہوں اور دس بارہ صاحبانِ مقدرت ایسے پیدا نہ ہو سکیں جو اردو تصنیفات و تالیفات پر انعام و اکرام دینے اور اردو کے اربابِ قلم کی شایانِ شان سرپرستی کرنے کا ارادہ نہ کر سکیں تو پھر کثرتِ تعداد پر فخر کرنے اور اپنی زبان کی فضیلت و وسعت جتانے سے کیا فائدہ؟ اہلِ اردو کو اس کا قلق ہرگز نہ ہونا چاہئے کہ کچھ لوگ اردو چھوڑتے جا رہے ہیں۔ اصل غم تو اس کا ہے کہ جو لوگ اردو کو کسی طرح بھی چھوڑ نہیں سکتے وہ اس زبان کا کوئی درد نہیں رکھتے۔ اگر ہم جانے والوں سے جھگڑنے کی جگہ رہنے والوں کو صحیح معنوں میں زندہ اور اردو و ادب کا دلدادہ بنا دیں تو پھر ہم کو نہ انگریزی سے ڈرنے کی ضرورت ہے اور نہ ہندی یا پنجابی سے۔

غرض جس طرح ان پڑھوں کے لئے تعلیمِ بالغان کی مہم کا آغاز ہمارے اولین فرائض میں داخل ہے اسی طرح پڑھے لکھے لوگوں کے لئے دارالمطالعوں کے قیام اور نتیجتاً اردو ادب کی اشاعت کی بھی ایک علیحدہ مہم جاری کرنا ہمارے لئے بے حد ضروری ہے۔ اور یہ دونوں کام ایسے بھی نہیں ہیں جو کسی بڑی تنظیم یا سرمایہ کے بغیر نہ چل سکیں گے۔ ہر بہی خواہِ اردو بحالتِ مجبوری انفرادی طور پر ہی ان کو آسانی سے چلا سکتا ہے۔ اور اگر ان کی خاطر ملک کے مختلف حصوں میں اجتماعی طور پر کام شروع ہو سکے تو اردو زبان کی اس سے بڑھ کر خوش قسمتی عہدِ حاضر میں اور کوئی نہیں ہو سکتی۔

|| اردو تصنیف و تالیف کی ایک نمایاں بدقسمتی جس کی طرف بھی ابھی اشارہ کیا گیا تھا یہ ہے کہ عوام کی بے حسی اور ناقدری کے ساتھ ساتھ بعض خاصانِ ادب میں بھی ایسی خرابیاں نمودار ہو گئی ہیں جو زبان کی ترقی اور ادب کے نشوونما کے لئے سمِ قاتل کا اثر رکھتی ہیں۔ جو مصنفین و مولفین بحسنِ اتفاق سے کسی مرتبہ پر پہنچ گئے ہیں وہ نہیں چاہتے کہ دوسرے بھی اس درجہ تک پہنچنے کے اہل ثابت ہوں۔ جس طرح میں نے آج سے چار سال قبل فروری ۱۹۴۳ء میں جامعہ عثمانیہ کی اردو کانفرنس کے خطبۂ صدارت میں کہا تھا "اب زمانہ بدل رہا ہے اور اس کے ساتھ ساتھ علمی و ادبی ٹھیکے بھی ختم ہوتے جا رہے ہیں۔ ممکن ہے کہ ان ٹھیکے داروں کی ذہنیت کے بدلنے میں ابھی کچھ عرصہ درکار ہو لیکن اردو کے جواں ہمت خدمت گزاروں کو بددل نہ ہونا چاہئے۔ ان کے آگے وسیع میدان ہے۔ وہ اگر چاہیں تو اپنی دنیا آپ پیدا کر سکتے ہیں۔ وہ بوسیدہ مزاروں کے ان سجادہ نشینوں کے ظاہری یا باطنی فیوض کے بغیر ہی اپنی ذاتی کد و کاوش سے اپنے ویرانوں میں چراغاں کر سکتے ہیں۔"

ایک طرف پختہ مشق ادیبوں کی علمی امارت اور سرمایہ داری کی ذہنیت بڑھتی جا رہی ہے۔ اور دوسری طرف عدمِ احتساب اور اہلِ زبان کی کم شعوری کے باعث اردو کا ہر طفلِ مکتب خود کو ایک بڑا ادیب اور شاعر سمجھنے لگا ہے۔ گویا اردو ادب کی دنیا آج ایک ایسی لنکا بنی ہوئی ہے جس میں ہر شخص باون گز کا ہے۔ جس محفل میں نہ بڑوں کو چھوٹوں کا خیال رہے اور نہ چھوٹوں کو بڑوں کا لحاظ تو اس کے بگڑنے اور اجڑنے کا انتظار ہی بیکار ہے۔

ایک اور عیب جس نے اس زبان کی تصنیف و تالیف کے راستہ میں شروع ہی سے کانٹے بو رکھے ہیں صوبہ جاتی تعصب ہے۔ اگرچہ تعصب خواہ وہ کسی قسم کا ہو معیوب ہے لیکن علمی و ادبی فضا میں تو وہ سب سے زیادہ خطرناک ثابت ہوتا ہے۔ پہلے پہل تو صرف دلی اور لکھنؤ والے ہی اس تفاخر میں مست تھے اور دوسرے صوبوں کی اردو کو اردو ہی نہیں ماننا چاہتے تھے۔ لیکن اب تو اکثر اردو بولنے والے علاقوں میں تعصب کا بازار گرم ہے۔ اور ہر جگہ روز بروز جتھا بندی بڑھتی جا رہی ہے۔ چنانچہ بعض صوبوں میں مستقل پیش بندی کی جاتی

ہے کہ خواہ ذوق و انصاف کا خون ہی کیوں نہ ہو لیکن اپنے علاقہ کے شاعر اور ادیب کے مقابلہ میں دوسرے مقام کے صا[حب کمال کو فروغ] نہ حاصل ہونے پائے۔ اس رجحان سے اردو کی ہمہ گیری کو بڑا صدمہ پہنچے گا۔ اور ایک ایسی بھیانک فضا چھا جائے گی جس میں کمال کے جلوے شاید ہی نمودار ہو سکیں۔ جو لوگ دوسروں سے بحث کرتے وقت دعویٰ کرتے ہیں کہ اردو اہلِ ہند کی ایک مشترکہ اپنی اعلیٰ خصوصیات کے باعث ہندوستان کی عام زبان کہلانے کا حق اسی کو حاصل ہے انہیں چاہیئے کہ ذرا اپنے دامن کو درونِ خانہ جھگڑوں کو جلد سے جلد محسوس کر کے صوبہ واری تعصبات کا فراخ دلی کے ساتھ سدِّباب کریں۔

اگر بنظرِ انصاف دیکھا جائے تو زبان و ادب اردو کی تشکیل و ارتقا میں ہندوستان کے اکثر و بیشتر علاقوں نے ایک کو دوسرے پر فوقیت دینا اپنی زبان کی تاریخ سے ناواقفیت کا ثبوت۔ ہم پہنچانا ہے۔ پنجاب کے ہندوؤں اور مسلمانوں کے زمانہ میں اردو کا بیج بویا۔ جب دلی میں ترک غلاموں کی سلطنت قائم ہوئی تو علاقہ برج (یعنی آگرہ۔ گوالیار اور دہلی) کی زبا[ن نے] اسکی آبیاری کی۔ پھر گجرات کی مظفر شاہی اور دکن کی بہمنی اور بعد کو انکی جانشین قطب شاہی و عادل شاہی) سلطنتوں نے پنجاب ا[ور] چمن کے اس پودے کی ایسی اچھی پرداخت کی کہ اس میں پھول اور پھل نکل آئے۔ اور احمد آباد، گولکنڈہ، اور بیجاپور اردو [کے] گہوارے کہلائے۔

عہد اورنگ زیب تک شمالی ہند میں اردو صرف بازاروں اور لشکروں کی عام بول چال کی زبان رہی لیکن اورنگ آباد [کے] شاعر ولی کی کرامت نے شاہجہاں آباد کے شاعروں سے فارسی گوئی ترک کرا کے ان کو اردو کا گرویدہ بنا دیا۔ جب دلی والوں نے [اس] کے لئے استعمال کرنا شروع کیا تو اس نے رفتہ رفتہ ایک ایسی معیاری زبان کی شکل اختیار کر لی کہ بعد کو خود گجرات اور دکن والے [بھی] چھ تک اسی کی تقلید پر مجبور ہو گئے۔ کچھ عرصہ بعد جب شعرائے دہلی اس معیاری زبان کو لیکر مشرقی ہندوستان میں پہنچے تو اودھ، بہار کے صاحبانِ ذوق نے اپنی مقامی زبانوں کی جگہ اسی کو اپنی ادبیانہ قوتوں کے مظاہرے کے لئے استعمال کرنا شروع کیا۔ چنانچہ او[ن] کی سرزمینوں سے اردو کے بڑے بڑے صاحبانِ کمال اٹھے۔ فیض آباد، لکھنؤ، پٹنہ، اور مرشد آباد اردو کے وہ مرکز ہیں جن کے تذ[کرے کے بغیر اردو] کی کوئی تاریخ مکمل نہیں سمجھی جا سکتی۔ خاص کر اردو شاعری کا دامن وہاں کے شعرا نے ایسے گلہائے رنگا رنگ سے بھر دیا جنکی شگفتگی ہمیشہ [برقرار رہے گی۔]

برطانوی راج کے آغاز کے بعد جب ہندوستان کے علوم و فنون نے نشاۃ ثانیہ حاصل کی تو دوبارہ پنجاب اور دکن [نے اردو] کے سنوارنے کے لئے اپنی خدمات پیش کیں۔ چنانچہ پنجاب میں جدید اردو ادب نے جنم لیا اور آزاد اور حالی جیسے باکمالوں کے [ذریعہ] شاعری اور جدید نثر کے سانچوں سے روشناس ہوئے۔ ساتھ ہی حیدرآباد میں پہلے نواب شمس الامراء کی اور بعد کو جامعہ عثما[نیہ کی کوششوں سے] اردو کا خزانہ مغربی علوم و فنون خاص کر سائنس کے مضامین سے مالا مال ہو گیا۔ اُدھر سر سید احمد خاں نے دلی اور پھر علی گڑھ میں ا[صلاح] کا ہم پیٹہ بنانے کا جو بیڑا اٹھایا تھا اس کو ان کے صاحب کمال ساتھیوں نے اس خوبی سے نبھایا کہ اردو واقعی ایک مہذب زبان [بن گئی اور اس کا] شمار دنیا کی ترقی یافتہ زبانوں میں کیا جانے لگا۔

عہد حاضر میں بھی اردو زبان و ادب کی جو اجتماعی اور انفرادی خدمات انجام دی جا رہی ہیں وہ بھی کسی ایک خطۂ ملک [تک محدود نہیں] ہیں۔ یہ اردو کی ہمہ گیری کا ایک نمایاں ثبوت ہے کہ اس کے ارتقا میں ہندوستان کے اکثر و بیشتر صوبوں کے باشندے اب [بھی] سرگرم عمل ہیں۔ اور یہ وہ امتیازی خصوصیت ہے جو ہندوستان کی کسی اور زبان کو خواہ وہ اردو کی حریفِ مقابل ہی کیوں نہ [ہو حاصل نہیں۔]
اردو کی اجتماعی خدمات میں سب سے پہلے جامعہ عثمانیہ اور اس کے دارالترجمہ کا ذکر ضروری ہے یہ جامعہ سلطان الع[لوم]

مانچ کی مسیحانفسی کا ایک ایسا کرشمہ ہے جس نے ہماری زبان کے علم و فضل اور ہمارے فخر و مباہات میں چار چاند لگا دیئے۔ جامعہ عثمانیہ ایک ایسا آفتاب ہے جس کی ضو پاشیوں سے اردو کا ذرہ ذرہ چمک اٹھا۔ آفتاب آمد دلیل آفتاب۔ اس لئے میں اس جامعہ سے متعلق کچھ کہنا تحصیل حاصل سمجھتا ہوں۔

جامعہ عثمانیہ کے بعد انجمن ترقی اُردو ہماری زبان کی وہ واحد انجمن ہے جس کی طرف ہر خطۂ ملک کے اردو والوں کی آنکھیں لگی ہوئی ہیں۔ یہ انجمن نہ صرف اپنی قدامت بلکہ اپنے وسائل کے لحاظ سے بھی اردو کی دوسری انجمنوں اور اداروں پر فضیلت رکھتی ہے۔ اس نے اردو شاعروں کے دواوین اور مختلف فنون کی اصطلاحات اور لغت شائع کر کے اردو کی بڑی خدمت انجام دی ہے۔ یہ ایک حسن اتفاق ہے کہ کل ہند اسلامی تعلیمی کانفرنس کے شعبۂ تصنیف و تالیف اردو کی حیثیت سے اس کا آغاز ہوا۔ اور اس کو علامہ شبلی۔ مولانا حبیب الرحمٰن خاں صدر یار جنگ بہادر شروانی۔ مولوی عزیز مرزا۔ اور مولوی ڈاکٹر عبدالحق جیسے فاضل اور سرگرم عمل معتمد نصیب ہوئے۔ اگرچہ کانفرنس کے اس شعبہ نے بڑھ کر انجمن ترقی اردو کی ایک جداگانہ حیثیت اختیار کر لی لیکن بڑی مسرت کا مقام ہے کہ اس کانفرنس نے اپنے اس شعبہ کو بھی برابر قائم رکھا۔ چنانچہ آج کل مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے شعبۂ اردو کے صدر پروفیسر رشید احمد صدیقی جیسے صاحبِ ذوق اس کے معتمد ہیں۔ اس کے علاوہ پروفیسر صاحب موصوف ہی کی نگرانی میں علی گڈھ کی مشہور و قدیم انجمن اردوئے معلیٰ بھی اب تک سرگرم عمل ہے۔ اور علی گڈھ کی وہ قدیم علمی و ادبی روایات بھی برقرار ہیں جن پر اردو دنیا جتنا فخر کرے کم ہے۔

اردو کی دوسری اجتماعی خدمات میں دارالمصنفین اعظم گڈھ، ہندوستانی اکیڈیمی الہ آباد، ادارۂ ادبیات اردو حیدرآباد اور مجلس مصنفین علی گڑھ قابل ذکر ہیں۔ دار المصنفین علامہ شبلی کی ایک صحیح یادگار ہے اور اس کے کارکن اسی مستحسن روش پر چلنا اپنے لئے باعث افتخار سمجھتے ہیں جو اردو کے اس بڑے ادیب اور مورخ نے اختیار کی تھی۔ شبلی کے جانشینوں کو تاریخ و علوم اسلامی کا اچھا اور پختہ ذوق حاصل ہے لیکن شبلی کا وہ عجیب و غریب طرز بیان ان کو ورثہ میں نہ مل سکا جس کے باعث شبلی نہ صرف ایک اعلیٰ مورخ اور سوانح نگار ہیں بلکہ اردو کے ان چوٹی کے ادیبوں میں شمار کئے جاتے ہیں جنھوں نے اس زبان کو اپنے پرشوکت اور رنگین اسلوب بیان کی وجہ سے ایک ایسی ہمہ گیری بخشی کہ یہ زبان اب ہر خطۂ ملک کے لکھنے والوں کیلئے قابل تقلید بن گئی۔ اس جماعت کے روح رواں مولانا سید سلیمان ندوی نے حال ہی میں حیات شبلی شائع کر کے مولانا حالی کی وہ فضیلت چھین لی جو ان کو حیات جاوید لکھنے کے بعد اردو ادب میں حاصل تھی۔

ہندوستانی اکیڈیمی صوبۂ متحدہ کی حکومت کی اس خواہش کی بنا پر قائم ہوئی تھی کہ ہندی کے ساتھ ساتھ اردو میں بھی تصنیف و تالیف کا کام ہو سکے۔ لیکن کچھ تو حکومتی اور سیاسی الجھنوں کی بنا پر اور کچھ اس وجہ سے کہ اس تنظیم کے پیچھے اردو کے کسی بڑے ادیب اور مخلص رہنما کا ہاتھ نہ تھا یہ اکیڈیمی ارباب اردو کی توقعات کے مطابق کامیاب ثابت نہ ہو سکی اگرچہ حکومت نے اس کے ماہی رسالے کی ادارت یکے بعد دیگرے قابل اصحاب کے سپرد کی اور اس کی مجلس منتظمہ میں بعض لائق لوگوں کو بھی شریک رکھا۔ پھر بھی تصنیف و تالیف کا جو کچھ کام ہوا ہے ایک حد تک قابل قدر ہے اور توقع ہے کہ آئندہ اس سے بہتر کام ہو سکے گا۔

ادارۂ ادبیات اُردو بھی تقریباً اسی زمانہ میں قائم ہوا جس زمانہ میں ہندوستانی اکیڈیمی قائم ہوئی تھی۔ لیکن یہ ایک بالکل خانگی ادارہ ہے اور اس کے بانیوں نے حکومت یا عوام کے آگے مادی امداد کیلئے دست طلب دراز کئے بغیر اپنے کام کا آغاز کر دیا۔ اور کٹھن سے کٹھن منزلوں میں بھی ہمت و استقلال کو ہاتھ سے جانے نہ دیا۔ اسی لئے اس کی جانب سے اہ ناموں کے علاوہ اب تک سو اسو سے زیادہ تاریخی و ادبی کتابیں شائع ہو چکی ہیں اور کچھ عرصے سے وہ ایک مخزن علوم و فنون یعنے اردو انسائیکلوپیڈیا کی ترتیب میں بھی مصروف ہے جس کی پہلی جلد چھپ رہی ہے۔ اس ادارے نے تعلیم بالغان کی جس مہم کا آغاز کیا اس کا ذکر اس سے قبل گذر چکا ہے۔

ادارۂ ادبیات اُردو نے جس چھوٹے پیمانہ پر خلوص اور خاموشی کے ساتھ اپنا کام شروع کیا تھا اسی طرح دو سال قبل علیگڈھ نے اردو کی خدمت کا آغاز کیا ہے۔ اس کے لائق اور مخلص معتمد مولوی الطاف علی صاحب بریلوی بی اے ہیں۔ جو اس مجلس کے ترجمان مجلہ کے مدیر بھی ہیں۔ یہ رسالہ ادب و تاریخ کے ان بلند پایہ مقالوں پر مشتمل ہوتا ہے جو اس مجلس کے جلسوں میں ہر ماہ پڑھے جاتے ہیں۔ چونکہ اور صحیح ذوق کے تحت کام کر رہی ہے اس لیئے یقین ہے کہ اردو ادب کی اجتماعی خدمات کی تاریخ میں اپنے لئے ایک نمایاں جگہ محفوظ دہلی میں بھی ایک اُردو مجلس خواجہ محمد شفیع صاحب کی ذاتی دلچسپی کی بنا پر قائم ہوئی ہے جس کے اجلاس ہر مہینے منعقد ہوتے ہیں جن میں اچھے مضامین اور نظمیں سنائی جاتی ہیں لیکن اس مجلس کی جانب سے کوئی رسالہ شائع نہیں ہوتا۔ گذشتہ دو تین ماہ سے حیدرآباد میں مرزا فرحت اللہ بیگ صاحب نے ایک ایسی ہی مجلس کا افتتاح کیا ہے۔ اگر یہ مجلسیں یوں ہی خوش اسلوبی سے منعقد ہوتی رہیں اور اسی طرح ایک دوسرے سے استفادہ کرتے رہیں تو یقین ہے کہ اردو ادب کا اچھا ذوق پھیل سکے گا اور لوگوں میں اپنی زبان اور ادب کے متعلق دلچسپی پیدا ہو کر وہ غفلت دور ہو سکے گی جس کی خرابیوں کی تفصیل اس سے قبل بیان ہو چکا ہے۔

اجتماعی کوششوں کے سلسلہ میں سب سے آخر میں ترقی پسند مصنفین کی جماعت کا ذکر ضروری ہے۔ اس جماعت کے افراد کی ذہنیت عام طور پر محسوس کی جا رہی ہے۔ وہ دراصل ردِ عمل ہے عام اردو دانوں کے اس جمود و غفلت اور خاص اردو کی اس ذہنیت کا جس کا تفصیلی تذکرہ میں پہلے کر چکا ہوں۔ دنیائے اردو میں گذشتہ ربع صدی کے اندر جو ادبی سکون فضا پیدا ہو گئی تھی اس کا فطری اقتضا یہی تھا کہ ایک ایسی جماعت پیدا ہوتی جو اپنے ادب کے جملہ رجعت پسندانہ خصوصیات اور گوناگوں جکڑبندیوں کے خلاف بغاوت کرتی۔ یہ ایک واقعہ ہے کہ مرض جتنا شدید ہوتا ہے اس کے علاج میں بھی اتنی ہی تلخ و تند دوائیں تجویز کرنی پڑتی ہیں۔ اور شاید اسی خیال سے ترقی پسند ادیبوں نے اپنے لہجے کو ترش اور تیز بنانے کی کوشش کی لیکن ان میں بعض ایسے گم کردہ راہ اور بر خود غلط نوجوان بھی شامل ہیں جو اصل مقصد سے ہٹ کر یا تو اشتراکیت کی تبلیغ شروع کر دی یا فحش گوئی پر اتر آئے۔ یہ دونوں رجحانات اصل میں ہماری موجودہ معاشرت کے نتیجہ ہیں اور ان سے واضح ہوتا ہے کہ اردو بولنے والوں کے ذہن آج کل کس سیاسی اور سماجی بے چینی میں مبتلا ہیں۔ نیز ہمارے نوجوان اخلاقی نقطۂ نظر سے کس پست درجہ تک پہنچ چکے ہیں۔ غرض ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ترقی پسند ادب کی تحریک جاری ہوتے ہی کسی قید خانے سے ہر قسم کے قیدی اپنی اپنی زنجیروں کو توڑ کر باہر نکل آئے ہیں۔ جو بھلے ہیں وہ اس امر کی کوشش میں لگے ہوئے ہیں کہ خیال اور زبان اور ادب اور زندگی کو وہ فائدہ پہنچا سکیں جو ہماری کم فہم سماج کی عاید کردہ جکڑبندیوں کی وجہ سے بحالت موجودہ نہیں پہنچ سکتا۔ اور بعض انھیں ترقی پسندی کی آڑ میں اپنی گندگیوں کو پھیلانے کی آزادی حاصل ہو گئی ہے۔ گویا ایک ایسا میلہ لگا ہوا ہے جس میں اوباشوں کی وجہ سے بدنامی ہو رہی ہے اور شریفوں کا بھیس لیکر اوباش جو چاہتے ہیں کر گزرتے ہیں۔ ان دونوں کے ایک دوسرے سے جدا ہونے میں کچھ عرصہ لگے گا۔ یہ مجمع کچھ دن خوش فعلیاں کر چکے گا اور بُروں کی برائیاں اور بھلوں کی بھلائیاں الگ الگ نظر آنے لگیں گی تو اس تحریک کی قدر ہو گی۔ اور اگر اس کے چلانے والوں نے جرأت و استقلال کے ساتھ اعلیٰ کردار کا بھی مظاہرہ کیا تو امید ہے کہ موجودہ افراتفری کا سدباب ہوگا اور صحیح معنوں میں ترقی پسند ثابت ہوگی اور اس سے اردو ادب کو فائدہ پہنچے گا ورنہ یقین ہے کہ تاریخ ادب اردو میں اس کو ایک ہنگامہ سے بڑھ کر اہمیت حاصل نہ ہو سکے گی۔

ان چند اجتماعی تحریکوں کے علاوہ ہندوستان کے مختلف اقطاع میں اور بھی انجمنیں اور جماعتیں اردو تصنیف و تالیف کر رہی ہیں۔ اور ان کے علاوہ بعض اصحاب ایسے بھی ہیں جو اگرچہ تنہا کام کر رہے ہیں لیکن بجائے خود ایک انجمن کی حیثیت رکھتے ہیں۔ ان

خیالات پر تبصرہ کرنے کی نہ اس وقت ضرورت ہے اور نہ فرصت۔ مجھے افسوس ہے کہ میں اپنی بے بساطی اور مصروفیت کے باعث اس وقت بعض ایسے مسائل کی طرف بھی آپ حضرات کی توجہ منعطف نہ کرا سکا جن کی نسبت بعض صاحبانِ ذوق غور و خوض کر رہے ہیں مثلاً رسم الخط میں اصلاح۔ لینیو کی جگہ ٹائپ کا انتخاب۔ اور زبان کی سلاست و سادگی وغیرہ۔ مجھے اندیشہ ہے کہ اب تک جو کچھ سمع خراشی کی گئی ہے وہی ناگوارِ خاطر نہ ہوئی ہو۔ لیکن اتنا یقین ہے کہ یہ صدا بصحرا ثابت نہ ہوگی۔ اور اردو کے مسئلہ کو ہم سب اپنا ذاتی معاملہ سمجھیں گے۔ اور جس طرح ہم اپنے ذاتی کام کو بہر صورت انجام دینے کی کوشش کرتے ہیں اور اس امید میں ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھے نہیں رہتے کہ دوسرے دستِ تعاون دراز کریں گے تو ہم بھی اٹھیں گے، اسی طرح اردو کے کام کے لئے بھی ہم میں سے ہر ایک تن تنہا میدانِ عمل میں نکل آئے گا۔ ہمیں اردو کے لئے ابھی بہت کچھ کرنا ہے۔ اس لئے جس شخص سے جتنا بھی بن پڑے غنیمت ہے۔ اردو ہم سے صرف اتنا ہی چاہتی ہے۔ وہ دنیا کی ان زبانوں میں سے ہے جن میں زندہ رہنے کی سکت ہوتی ہے۔ اور جو تمام مخالفتوں اور مصیبتوں کا خود ہی اپنی اعلیٰ صلاحیتوں کی وجہ سے مقابلہ کر لیتی ہیں۔ اب یہ ہمارا فرض ہے کہ اس کی صلاحیتوں سے زیادہ سے زیادہ فائدہ اٹھائیں اور اپنی زندگی کو شگفتہ، تمدن کو پاکیزہ اور قوم کو مستحکم بنانے میں اپنی زبان کے مقبولِ عام اور ہمہ گیر اوصاف کو بطور حربہ استعمال کریں۔ ہمیں سمجھ لینا چاہئے کہ ہمارے اسلاف کے ورثہ میں ہمیں اردو کی صورت میں ایک ایسی تلوار ملی ہے جس کے جوہر اتنے ہی زیادہ نمایاں ہوں گے جتنا زیادہ ہم اس کو استعمال کریں گے۔ اگر ہم اس کو میان ہی میں پڑی رہنے دیں اور سمجھ لیں کہ یہ خود بخود ہماری تہذیب و تمدن بلکہ ہمارے قومی وجود کی حفاظت کے لئے اٹھے گی تو ہم سے بڑھ کر کم فہم اور غافل کوئی نہیں ہو سکتا۔

بہ سلسلہ صفحہ ۴۲۰

کتبوں کے ساتھ اردو کے دارالمطالعے بھی جگہ جگہ قائم کریں اور باہمی تعاون سے اخبار اور رسالے ان دارالمطالعوں کے لئے جاری کریں۔ یہ اردو والوں کو اپنے ملک کی سرکاری زبان ہندی یا اپنے ہمسایوں کی زبان مرہٹی یا گجراتی یا تلنگی کے سیکھنے میں بھی پس و پیش نہ کرنا چاہیئے جب ہم نے ایک غیر ملکی زبان انگریزی سیکھی تو پھر اپنی ملکی زبان ہندی کے سیکھنے اور اس میں مشق و مزاولت پیدا کرنے میں ہم کسی سے پیچھے نہیں رہ سکتے، بلکہ مجھے تو یقین ہے کہ جب اردو بولنے والے ہندی سیکھ کر اس کے رسم الخط میں لکھنا شروع کر دیں گے تو رفتہ رفتہ اردو کا اسلوب بیان ہندی پر بھی چھا جائے گا اور اس کو پڑھ کر ہندی والے محسوس کریں گے کہ اردو میں جو شائستگی روانی اور لوچ ہے اس سے لطف اندوز ہونے کے لئے خود وہ بھی اردو رسم الخط سیکھیں اور اس طرح مہاتما گاندھی کا وہ منصوبہ پورا ہوگا جس میں انھوں نے ہندوستان کی مشترکہ زبان کا نام ہندوستانی قرار دیا تھا اور اس کو ہندی اور اردو دونوں رسم الخطوں میں رائج ہونے پر زور دیا تھا۔

خطبۂ صدارت

جلسۂ سالانہ بزم ادب عثمانیہ انٹرمیڈیٹ کالج ورنگل منعقدہ فروری ۱۹۴۵ء

آج کے جلسہ کی صدارت کے لئے آپ نے جو مجھے مدعو کیا ہے میں اس کے لئے آپ کا دلی شکریہ ادا کرتا ہوں۔ مجھے یہ دیکھ کر مسرت ہوتی ہے کہ یہ درس گاہ علم و ادب کا جو ذوق پھیلا رہا ہے وہ ایک قدیم تہذیب و تمدن کے مرکز ورنگل کے لئے ہر طرح شایان شان ہے۔

اس درس گاہ سے فارغ ہو کر جو طلبہ حیدر آباد کی عظیم الشان جامعہ عثمانیہ میں شرکت کرتے ہیں ان میں اگرچہ ایک محدود تعداد سے مجھے واقف ہونے کا موقع ملا ہے لیکن میں نے محسوس کیا کہ ان میں سے اکثر و بیشتر اردو کی جماعتوں میں اپنے شائستہ کردار اور ذوق علم و ادب کے باعث اپنے ساتھیوں میں ممتاز رہتے ہیں۔ یہاں سے جو اردو مجلہ شائع ہوتا ہے اس سے بھی ورنگل اور اس کے نواح کے طلبہ کی ذہانت اور قابلیت کے عمدہ ثبوت فراہم ہوتے ہیں۔ حال ہی میں ورنگل نے اس لئے بھی شہرت حاصل کی ہے کہ یہاں کے مشاعرے بہت کامیاب ثابت ہوئے اور ان میں ملک و بیرون ملک کے کثیر شعرانے شرکت کی۔

یہ سب ایسی خصوصیات ہیں جن کی بنا پر میں ورنگل آنے سے انکار نہ کر سکا اور میرا یہاں آنا اس لئے بھی میرے لئے مسرت کا باعث ہے کہ یہاں مولوی امیر علی خاں صاحب جیسے علم دوست اور مستعد صوبہ دار موجود ہیں جن کے خلوص، جوش عمل اور جذبۂ خدمت ملک و مالک نے مجھے عرصہ سے ان کا گرویدہ بنا رکھا ہے۔

آپ خوش قسمت ہیں کہ آپ کے کالج کے پرنسپل جامعہ عثمانیہ کے ایک ایسے قدیم استاد ہیں جن کی شفقتوں کی یاد عثمانیہ کے ابتدائی چند سالوں کے طلبہ کے دل میں اب تک موجزن ہے۔ مولوی رحیم الدین صاحب جیسے باکمال استاد کی نگرانی میں یقین ہے کہ اس درس گاہ کے طلبہ کے ذوق علم اور شائستگی میں روز افزوں ترقی ہوگی۔

ورنگل کے طلبہ شاید اس امر سے بخوبی واقف ہیں کہ ان کے حال اور مستقبل کی طرح ان کا ماضی بھی نہایت شاندار رہ چکا ہے۔ یہ مقام یوں تو آندھرا تہذیب و تمدن کا بہت بڑا مرکز تھا۔ چنانچہ آج کل ثقافت آندھرا کی جو مختصر سی نمائش یہاں منعقد ہو رہی ہے اس سے کچھ اندازہ اس کی عظمت ماضی کا ہو سکتا ہے لیکن عہد قطب شاہی میں بھی اس حصۂ ملک سے بڑے بڑے شاعر اور ادیب پیدا ہوئے جن کی قدر و منزلت گولکنڈے کے سلاطین نے اس اعلیٰ پیمانہ پر کی کہ ان شعرا نے اپنی نظموں اور کتابوں میں قطب شاہی سلاطین کے علمی و ادبی احسانات کا بار بار اعتراف کیا ہے۔

بڑی مسرت کا مقام ہے کہ اعلیٰ حضرت سلطان العلوم آصف جاہ سابع کے عہد میں ورنگل کی قسمت بھی جاگ اٹھی اور تلنگانہ کے ان کوہستانوں میں علم و ادب کی ندیاں پھر سے بہنے لگیں۔ اس کالج کے طلبہ سے اس حصۂ ملک کی بڑی بڑی

امیدیں وابستہ ہیں اور اسی لئے میری نظر میں ورنگل کا مستقبل درخشاں نظر آرہا ہے۔

حضرات! ادب اور زندگی کا چولی دامن کا ساتھ ہے۔ اس لئے آپ کی یہ بزم ادب دراصل ایک گہوارہ ہے جسمیں نشوونما پاکر ہی آپ زندگی کی محفل میں شرکت کے قابل ہوسکتے ہیں۔

وہ ادب ہی کیا جو آپ کو حقیقی زندگی اور زندہ دلی سے روشناس نہ کرے۔ جو لوگ ادب کو محض اوقات فرصت گزارنے کا ایک سستا ذریعہ سمجھتے ہیں اور جو ادیب و شاعر محض خیالی اور فرضی دنیا کے راگ الاپتے رہتے ہیں وہ یا تو زندگی کے مفہوم سے ناآشنا رہتے ہیں یا ذہنی عیاش ہوتے ہیں۔ اس لئے کسی تعلیمی درس گاہ کی بزم ادب صحیح معنوں میں اس ادارے کی زندگی کو جانچنے اور ناپنے کا پیمانہ ہوتی ہے اور اس کی مصروفیات اور خدمات ہی سے پتہ چل سکتا ہے کہ اس درس گاہ میں کتنی بیداری اور قوت حیات موجود ہے۔

وہ بزم ادب ہی کیا جو ادب کے طلبہ اور اساتذہ کے علاوہ اپنی درس گاہ کے دوسرے طلبہ اور اساتذہ کو بھی اپنی مصروفیات میں حصہ لینے کی طرف مائل نہ کردے۔ پس اگر آپ کی بزم ایسا کر رہی ہے تو سمجھ لیجئے کہ وہ کامیابی کے راستے پر گامزن ہے اور ادب کی صحیح قدر و قیمت سے واقف۔

ادب کے دلدادہ جس میدان عمل میں کارگزار ہوتے ہیں وہ زبان ہے اور یہی وجہ ہے کہ ادب میں کمال حاصل کرنے کے لئے زبان پر قبضہ اور قابو حاصل کرنا سب سے پہلے ضروری ہے۔ اس لئے وہی ادیب زیادہ کامگار ہوتا ہے جو زبان کے استعمال سے بخوبی واقف ہوتا ہے اور جو ادیب یا شاعر اس کے حسن و قبح کے اسرار سے آگاہی رکھنے کی کوشش نہیں کرتا ادب کے اعلیٰ مراحل طے کرنے میں اس کو جگہ جگہ بھٹکنا پڑتا ہے۔

چونکہ آپ کی درس گاہ کا ذریعۂ تعلیم اردو ہے اس لئے آپ کو سب سے پہلے اسی میں کامل دستگاہ حاصل کرنی چاہئے اور یہ حسن اتفاق سے ایک ایسی گنگا جمنی زبان ہے جو ہندوستان کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک بولی اور سمجھی جاتی ہے اور جس میں ہر علاقے اور صوبے کے لفظوں کو اپنے میں شامل کرلینے کی بڑی صلاحیت موجود ہے اور یہ کسی خاص صوبے یا شہر کی زبان نہیں ہے اور نہ کسی خاص فرقے یا نسل کے لئے مخصوص ہے بلکہ ہر شخص بلا امتیاز مذہب و ملت و ملک اس کو اپنا بنا لیتا ہے۔ چنانچہ جو اصحاب ادب اردو کی تاریخ سے واقف ہیں وہ جانتے ہیں کہ مختلف اقطاع ہند کے باشندوں کے علاوہ ترکستان، ایران، عربستان، افغانستان، انگلستان اور فرانس کے رہنے والوں نے بھی اس میں نہ صرف شعر و شاعری کی بلکہ علمی کتابیں بھی لکھیں۔ ہندو ادیبوں اور شاعروں کی تعداد تو سیکڑوں نہیں ہزاروں تک پہنچتی ہے۔ لیکن آپ کو تعجب نہ ہوگا جب آپ یہ سنیں گے کہ سیکڑوں کی تعداد میں انگریز اور اینگلو انڈین اہل ذوق نے بھی اس زبان میں شاعری کی ہے۔ چنانچہ ان کا ایک مبسوط تذکرہ ایک سیویلین عہدہ دار رام بابو سکسینہ کلکٹر بلند شہر نے حال ہی میں بزبان انگریزی مرتب کرکے شائع کیا ہے۔ یہ معلوم کرکے بھی آپ کو حیران نہ ہونا چاہئے کہ ہندوؤں، سکھوں اور عیسائیوں کے علاوہ پارسیوں نے بھی اس زبان کو اپنی زبان کے طور پر استعمال کیا۔ چنانچہ ایک اچھے پارسی شاعر کا دیوان حال ہی میں چھپ کر شائع ہو چکا ہے۔

غرض آپ اپنی خوش بختی پر جتنا ناز کریں کم ہے کہ آپ کی بزم کا تعلق ایک ایسی جامعہ سے ہے جس کا ذریعہ تعلیم

اردو جیسی ہمہ گیر زبان ہے۔ لیکن محض اپنی زبان کی عظمت دیرینہ پر فخر کرنا کافی نہیں ہے۔ ضرورت اس
آپ اپنی زبان کو جدید تر ضرورتوں اور نت نئے رجحانات کے مطابق بنانے کی کوشش کریں۔ ایک زمانہ
اردوئے معلیٰ کہلاتی تھی اور اردو کے بعض تنگ نظر دعویدار اپنی برتری کے تحفظ کی خاطر اس کو بعض
بلکہ ان شہروں کے خاص خاص محلوں تک مخصوص قرار دینا چاہتے تھے اور اس رجحان اور اس کی مسلسل تبلیغ کی و
کو ایک حد تک نقصان بھی پہنچتا رہا۔ لیکن اس زبان کی ترقی پسند فطرت نے اس تجدید کو قبول کرنا کبھی گوارا نہ
کی حدبندیوں اور زنجیروں کو توڑ کر دور دراز کے علاقوں میں پہنچتی اور پھیلتی رہی۔

عہد حاضر میں بعض ارباب اردو اپنی زبان کے لئے جو ہر طرح کے خطرے محسوس کر رہے ہیں وہ بھی اسی قسم
تخیلات کی غلامی کا نتیجہ ہیں۔ میری نظر میں اردو اس وقت تک ایک کل ہند مقبولیت حاصل نہ کر سکے گی
ارباب اردو کے دل و دماغ سے بے جا غرور اور اپنی عظمت ماضی کے پراگندہ نقوش محو نہ ہو جائیں گے اور و
کوشش نہ کریں گے کہ ملک کے موجودہ حالات کو پیش نظر رکھ کر اپنی زبان کی تنوع پسند اور تغیر پذیر فطرت
اٹھائیں۔

اردو صحیح معنوں میں ایک ترقی پسند زبان ہے وہ کسی خاص حلقے اور دائرے میں مقید نہیں رہنا چاہتی
اس کا مستقبل بھی انہی لوگوں کے ہاتھوں بہتر بن سکتا ہے جو فرقہ وار اور صوبہ وار تعصبات کو پس پشت
دلی اور وسعت نظر سے اس کے لئے کام کرنا چاہتے ہیں۔

اب وقت نہیں رہا کہ اردو کی تائید میں قدیم انگریز حاکموں اور ہندو ادیبوں اور شاعروں کی
کے اقوال و افعال کی شہادتوں ہی پر اکتفا کیا جائے۔ اب اس امر کی ضرورت ہے کہ ملک کے جدید رجحانا
عوام کی روزمرہ کی زبان اور ذہنی میلان کو پیش نظر رکھ کر ایک عظیم تر اردو کی داغ بیل ڈالی جائے۔

اب اردوئے معلیٰ کا دور گزر گیا۔ گزرا ہوا زمانہ محض یاد باقی رکھنے اور افسوس کرنے سے واپس نہیں
اب عمل کی ضرورت ہے۔ ایسے ترقی پسندانہ عمل کی جو رفتار زمانہ کے قدم بہ قدم ہو اور جس کے لئے ایسے کارپر
جن میں خار دار گھاٹیوں اور دشوار گزار راستوں سے بغیر الجھے اور الجھائے آگے نکل جانے کی صلاحیت ہو۔
آپ کی بزم ادب ایسے باہمت اور چونچال نوجوان پیدا کر سکے اور خدا کرے کہ ان کا نام اس عظیم تر اردو کے
کی پہلی صفوں میں شامل ہو سکے۔

جس طرح کہ میں نے جبل پور میں آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کے شعبہ تصنیف و تالیف کے خطبہ
کہا تھا" اگر آپ کے ہمسائے کے باغ میں درخت اور کیاریاں سرسبز و شاداب ہوں اور آپ کے باغ میں پھلو
اور شادابی کی کمی ہے تو یہ کمی اس طرح دور نہیں ہو سکتی کہ آپ اپنے ہمسائے کو گالیاں دیں اور اس کے درختوں
پر پتھر پھینکیں، بلکہ آپ کا باغ اسی وقت ہمسائے کے چمن سے ہمسری کر سکے گا جب کہ آپ اس کے لئے ویسی ہی
مشقت کریں۔ پس اردو کے چمن کو سرسبز و شاداب رکھنے کے لئے ہندی یا بنگالی یا تلنگی زبانوں کی مخالفت
کرنے والوں سے جھگڑا مول لینے کی ضرورت نہیں ہے۔ ضرورت اس کی ہے کہ ہم بھی انہی ذریعوں اور طریقوں

لیں جن سے ان زبانوں کو بارآور کیا جا رہا ہے۔

میں نے ابتدا میں کہا ہے ادب زبان ہی کے بل بوتے پر پروان چڑھتا ہے۔ اس سلسلے میں یہ بھی ہمیشہ ذہن نشین رہنا چاہئے ادب کے دلدادہ ایک سے زیادہ زبانوں سے واقف ہوں تو ان کی ادبی قابلیتوں کے اجاگر ہونے میں مزید سہولتیں پہنچتی ہیں۔ اس لئے اگر میں آپ کی بزم ادب کے ارکان کو یہ مشورہ دوں اور وہ اس پر عمل کرسکیں تو خود اردو کیلئے مفید ثابت ہوگا کہ جس خطۂ ملک میں وہ آباد ہیں وہاں کی مقامی زبان میں بھی زیادہ سے زیادہ دسترس حاصل کرنے کی کوشش کریں۔

اہل اردو کو یہ ہر وقت یاد رکھنا چاہئے کہ اردو زبان کی تاریخ میں کبھی کوئی واقعہ ایسا نہیں ملتا کہ اردو کے رائج کرنے میں کسی جبر و اقتدار سے کام لیا گیا ہو یا جس علاقے میں وہ رائج ہوئی ہو وہاں کی مقامی زبان کو مٹانے یا گھٹانے کی کوشش کی گئی ہو۔ حالانکہ اس کے بولنے والے ہندوستان کے تقریباً ہر حصے میں عرصے تک صاحبان تخت و تاج رہے اور ہر طرح کا سیاسی و سماجی اقتدار بھی رکھتے تھے۔

مخالفت اور استبداد اردو کے مزاج کے منافی ہے۔ کسی میں گھل مل جانا اور کسی کے الفاظ اور لب و لہجے کو اپنے میں ڈھال لینا زبان کی گھٹی میں شامل ہے اور یہی اس کی وسعت، ہمہ گیری اور مقبولیت کا اصلی راز ہے۔

اگر آپ کی بزم ادب کے ارکان اور ورنگل اور اس کے وسیع صوبے میں رہنے بسنے والے ویسے لوگ جن کی مادری زبان اردو ہے اپنی زبان کے ساتھ ساتھ تلنگی زبان پر بھی عبور حاصل کرلیں گے تو ان کو یقین رکھنا چاہئے کہ وہ اپنی زبان کو نقصان پہنچانے کے بجائے فائدہ ہی پہنچا سکیں گے۔

اس طرح وہ نہ صرف اپنے ہمسایوں کو صحیح طور پر سمجھ سکیں گے اور ان سے قریب تر ہوجائیں گے بلکہ ان کے قدیم و جدید تہذیبی و سماجی رجحانات اور سیاسی تخیلات سے واقف رہ سکیں گے اور دوسرے علاقوں کے اہل اردو کو بھی موقع بہ موقع اس سے آگاہ کرسکیں گے۔

اس امر کا ایک خوش آئند اثر یہ بھی ہوگا کہ آپ کے ہمسائے خود بھی اپنی زبان تلنگی کے علاوہ اردو کے ماہر بننے کی کوشش کریں گے کیونکہ وہ پسند نہ کریں گے کہ اپنے اردو داں ساتھیوں سے کسی طرح پیچھے رہیں۔

یہ ایک ایسا مفید اقدام ہے جس کے لئے اس بزم ادب کو پہل کرنا چاہئے اور اس کی سرپرستی میں یا اس کے ارکان کی انفرادی جد و جہد سے ایسی شبینہ جماعتیں کھلنی چاہئیں جن میں اردو دانوں کو تلنگی اور اردو نہ جاننے والے باشندگان تلنگل کو اردو لکھنا پڑھنا سکھانے کا انتظام کیا جائے۔ یہ کام گرما اور سرما کی چھٹیوں میں اور زیادہ اعلیٰ پیمانے اور سہولت کے ساتھ انجام پاسکتا ہے۔

یہ کوئی مشکل کام نہیں ہے اور اگر آپ نے ہمت سے اس کا بیڑا اٹھایا تو یقین مانئے کہ خود بخود تعلیم بالغان کی سب ایسی مفید مہم بھی شروع ہوجائے گی جس کی وجہ سے ہمارے وطن کو گوناگوں فائدے حاصل ہوں گے۔

اگر آپ اس مہم کا آغاز کرکے اس کو کامیابی سے چلاسکیں تو عام جہالت کی ان گھنگھور گھٹاؤں کو دور کرنے میں اپنے ملک کی مدد کرسکیں گے جو ہمارے وطن پر چاروں طرف چھائی ہوئی ہیں اور جن کی تاریکی میں ہمارے لاکھوں

بقیہ سلسلہ صفحہ ۴۲۳

خطبۂ استقبالیہ

کل ہند ترقی پسند کانفرنس حیدرآباد منعقدہ ۱۴ اکتوبر ۱۹۴۵ء

معزز خواتین و حضرات!

میں بڑی مسرت کے ساتھ آج آپ کے اس اجتماع کا خیر مقدم کرتا ہوں کیونکہ مجھے یقین ہے کہ اس قسم کے میل جول اور تبادلۂ خیال سے اردو زبان اور ادب کو دیرپا فوائد حاصل ہوں گے اور ہماری آپس کی بہت سی غلط فہمیوں اور خامیوں کا ازالہ ہو سکے گا۔ ہماری زبان کی ایک بہت بڑی خوبی آج ہماری سب سے نمایاں خرابی بن گئی ہے۔ ہم سب اس حقیقت حال پر فخر کرتے ہیں کہ ہماری اردو زبان ہندوستان جیسے وسیع ملک کے گوشے گوشے میں پھیلی ہوئی ہے اور اس ملک کے ہر خطے میں۔ خواہ وہاں کی مقامی زبان کوئی ہو۔ اردو ہی ایک ایسا ذریعہ ہے جس سے مختلف مذہبوں اور نسلوں کے لاکھوں انسان ایک دوسرے کے رنج و راحت کو سمجھتے اور اپنی سماجی ضروریات کی سربراہی کر سکتے ہیں۔ لیکن مختلف اقطاع ملک کے اہل اردو کے باہمی اختلافات اور تعصبانہ انتشار کے باعث ہماری زبان کا یہ ہنر ہمارے لئے عیب بنتا جا رہا ہے۔ ہمارے بڑے سے بڑے ادیب اور شاعر وسیع فطری اور روادارانہ ... سے محروم ہیں اور ہماری اکثر و بیشتر انجمنیں اور جماعتیں پست خیالی اور کوتاہ بینی کا شکار بنتی جا رہی ہیں۔ ایک ... دوسری جماعت کے قیام اور ایک فرد دوسرے فرد کے وجود کو گوارا نہیں کر سکتا۔ اسی لئے اہل اردو کی نظر میں ... کانٹے کی طرح کھٹکتی ہے۔ اور ہر شخص دوسرے کو شبہ کی نظر سے دیکھتا ہے۔

سال گزشتہ جب کل ہند اردو کانگریس کا ایک اجلاس ترقی پسند تحریک کے لئے وقف کیا گیا تو میرے ایک فاضل دوست جو اس تحریک کے روح رواں ہیں اور آج کے اس اجتماع میں دوسری بار ہیں ان کا دلی مسرت سے استقبال کر رہا ہوں بہت حیران ہوئے اور ارشاد فرمایا کہ:-

"ہماری نظر میں حیدرآباد تو آخری مقام تھا جہاں یہ تحریک
اثر انداز ہو سکتی تھی۔ لیکن اردو کانگریس کے اس اقدام سے ہم کو
اپنی رائے بدلنی پڑی"

اس وقت تک میرے ان فاضل دوست کو ترقی پسند حیدرآباد کے دیرینہ رجحانات سے شاید واقفیت نہ تھی اور حقیقتہً ان کی نگاہ سے اوجھل تھی کہ یہ سرزمین صدیوں سے اس خصوص میں ممتاز حیثیت رکھتی ہے اور اردو زبان تو خاص طور پر اس ملک کے ترقی پسندانہ رجحانات ہی کا ایک نمایاں ثبوت ہے۔ آج سے چار پانچ سو سال قبل جب کہ فارسی زبان تمام ہندوستان کی سرکاری اور علمی و ادبی زبان سمجھی جاتی تھی حیدرآباد ہی نے جرأت کی اور ملک کے ادیبوں اور شاعروں

یک پردیسی زبان کے طوق غلامی سے آزاد کرایا اور یہاں کے عوام بازاروں اور گھروں میں جس زبان میں گفتگو کیا کرتے تھے اسکو لم و ادب کے لئے استعمال کرنا شروع کیا۔ چنانچہ آپ سب بخوبی واقف ہیں کہ اردو کا ابتدائی ادب جس میں نثر و نظم کی سیکڑوں تابیں شامل ہیں دکن ہی میں لکھا گیا اور ہندوستان کے دوسرے حصوں میں تقریباً دو سو سال بعد ترقی پسندی کی یہ تحریک سرسبز ہوسکی۔ اور وہ بھی محض دکن ہی کے ایک شاعر ولی کے سفر و قیام دہلی اور اس کے دیوان کی تشہیر کے بعد ہی خاطر خواہ ترقی رسکی۔ اسی واقعہ کی طرف میر تقی میر جیسے وضع دار شاعر نے جس کو شاید آپ قدامت پسند بھی کہیں ایک ترقی پسندانہ انداز میں شارہ کیا تھا کہ ؎

قائل نہیں کچھ یوں ہی ہم ریختہ گوئی کے معشوق جو تھا اپنا باشندہ دکن کا تھا

اردو ادب اپنے ابتدائی دو سو سالوں میں زیادہ تر برج بھاشا سے متاثر رہا اور پہلے پہل دکن ہی کے ایک شاعر ولی نے اپنے سفر گجرات و دہلی کے بعد محسوس کیا کہ اس کی ترقی اور مقبولیت کے لئے ضروری ہے کہ اس میں فارسی اور عربی لفاظ کثرت سے استعمال کئے جائیں۔ اس لئے وہ اور اس کے اور نگ آبادی دوستوں اور معتقدوں نے وہ ترقی پسندانہ جحان اختیار کئے جن کو آگے چل کر مرزا مظہر جان جاناں اور شاہ ظہور الدین حاتم نے شاہ جہاں آباد میں رائج کیا اور ردو زبان کی وہ شکل قائم کر دی جو آج تک معیاری اردو کہلاتی ہے۔

اردو زبان کی حد تک حیدرآباد کے ترقی پسندانہ رجحانات کی تاریخ یہیں ختم نہیں ہو جاتی بلکہ اس کا سلسلہ برابر جاری رہا ور اب تک جاری ہے۔ چنانچہ جامعہ عثمانیہ کا قیام تو اس سلسلہ کی ایک ایسی اہم کڑی ہے جو اردو کی تاریخ میں حیدرآباد کی ترقی پسندانہ خدمات کو زندگی جاوید بخشنے کا باعث ثابت ہوگی۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ دوسرے مقامات کی طرح حیدرآباد میں بھی ایسے اصحاب موجود ہیں جو اس تحریک کو مشتبہ ظروں سے دیکھتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ اس کی وجہ سے اردو ادب میں گندگی پھیل رہی ہے اور اس ادب کو پڑھ کر ہمارے وان گمراہ ہوتے جا رہے ہیں ان کا یہ سمجھنا ایک حد تک غلط بھی نہیں ہے جب ہم یہ دیکھتے ہیں کہ اس خوش آیند یک سے فائدہ اٹھا کر بہت سے خام کاروں اور آوارہ مزاج ادیبوں اور شاعروں نے اپنے پست جذبات اور ادہ تر شہوانی الجھنوں کی نمود و نمائش شروع کر دی ہے۔ اس لئے اس امر کی سخت ضرورت ہے جیسا کہ میں نے یوم حالی بھی کہا تھا کہ "انجمن ترقی پسند مصنفین" جلد سے جلد اپنے تحت ایک ایسی احتسابی مجلس قائم کرے جو موقع بموقع ان م نہاد ترقی پسندوں کے افکار نظم و نثر کا جائزہ لیتی رہے اور ان کی نسبت اپنی صریحی رائے کا اظہار دیانت اور جرأت کے ساتھ کرتی جائے۔ اگر اس قسم کا کوئی اقدام جلد نہ کیا جائے گا تو ہر ناقص شاعر اور نا اہل ادیب ترقی پسندی روپ میں اپنی کم علمی، ادبی بے بضاعتی اور اخلاقی نقائص کو چھپاتا رہے گا اور نہ صرف ترقی پسند تحریک کو نقصان نچے گا بلکہ حال اور مستقبل کے اردو ادب پر خامیوں اور گندگیوں کا ایک ایسا رنگ چڑھ جائے گا جس کی ذمہ داری ہ تحریک کے مخلص بانیوں کے سر رہے گی اور جس کے دور کرنے میں مستقبل کے ادیبوں اور شاعروں کو بڑی زحمتیں ٹھانی پڑیں گی۔

ایک ایسی ہی مجلس کی طرف سے صحیح قسم کے ترقی پسند ادب کے کئی مجموعے بھی شائع ہونے چاہئیں جو کرشن چندر کے

جدید مجموعے "نئے زاویے" کے انداز میں مرتب کئے جائیں تو جواں سال شاعروں اور نو مشق ادیبوں کی صحیح
وہ گمراہ ہو کر شہوانی جذبات کی ترجمانی اور عریانی کو ترقی پسندی کا لوازمہ سمجھنے سے باز رہ سکیں گے۔

ترقی پسند ادب کی تحریک کو اس وجہ سے بھی نقصان پہنچ رہا ہے اور شاید آئندہ بھی پہنچے کہ اس
بردار ترقی پسندی اور اشتراکیت کو لازم و ملزوم سمجھنا چاہتے ہیں۔ حالانکہ یہ التزام اتنا ضروری نہیں جتنا
اور اشتراکیت میں ہونا چاہئے۔ انسانوں کی زبوں حالی سے متاثر ہونا اور انسانی حقوق کی پامالیوں
بغاوت بلند کرنا ایک ایسی وسیع الخیالی ہے جس کے مقابلہ میں کسی خاص سیاسی عقیدے کی تبلیغ کرنا ایک
نظری کا ثبوت دینا ہے اور میں سمجھتا ہوں کہ ترقی پسند ادیب اور شاعر اشتراکیت کی علم برداری کی بجا
کی علمبرداری کا دعویٰ کریں تو محض ایک اصطلاح کی تبدیلی سے ان کے بہت سے عیب ہنر نظر آنے لگیں
بہت سے مخالف ان کے ہم نوا بن جائیں گے۔

ایک اور بات جس کی طرف ہماری اس کانفرنس کو خاص طور پر توجہ کرنی چاہئے اور جس کی وجہ سے بہ
کا ازالہ ہو سکے گا، یہ ہے کہ ترقی پسند ادب کو افراط و تفریط سے بچایا جائے۔ اعتدال ہر کامیابی کا لاز
اور یہ خوبی اس وقت تک پیدا نہ ہو گی جب تک کہ ہم اپنی ہر کاوش پر سنجیدگی اور ٹھنڈے دل سے غو
اندیشہ ہے کہ کہیں ترقی پسندی اور جوش و جذبات کی ہنگامہ آرائی مترادف نہ بن جائیں۔ لیکن یہ
اندیشہ دیرپا ثابت نہ ہو گا کیونکہ جیسے جیسے ترقی پسند ادیب اور شاعر پختہ مشق اور سلیم الطبع ہوتے جا
ادب بھی نکھرتا جائے گا۔ سلامتی طبع اور خوش ذوقی بغیر اعتدال کے ممکن نہیں۔ اس لئے جب تک ترقی پ
ہر دلدادہ افراط و تفریط سے بچنے کی کوشش نہ کرے گا وہ اس تحریک کے لئے مضرت رساں ثابت ہوتا رہے
ذاتی اعمال و اقوال دوسروں کو اس مفید تحریک سے بدظن کرانے کا باعث بنتے رہیں گے۔

مجھے یقین ہے کہ حیدرآباد میں ترقی پسند مشاہیر کا یہ اجتماع اردو دنیا کی بہت سی غلط فہمیوں کو
کامیاب ثابت ہو گا اور ترقی پسند ادب کی تاریخ میں یہ کانفرنس ایک نئے اور شاندار دور کی بنیاد ر
توقع کے ساتھ میں آج آپ سب دوستوں کا دلی خلوص کے ساتھ استقبال کرتا ہوں اور حیدرآباد کی
مصنفین اور اس کے سرگرم کارکنوں کو مبارک باد دیتا ہوں کہ ان کے مساعی کے خوش گوار نتائج بر
اور یوم حالی کے بعد اس شاندار اجتماع کے انتظامات میں انھوں نے جس سرگرمی اور جاں کاہی سے حصہ
مقامی ہے کہ اگر آپ کو اجلاس حیدرآباد میں کسی قسم کی زحمت یا ناگواری محسوس ہو تو یقیناً درگزر

خطبۂ صدارت

بزرگو اور دوستو !

(اردو کانفرنس ۔ برہان پور)

اردو زبان اور ادب عہد حاضر میں ایک عبوری دور سے گذر رہے ہیں۔ ایسا ہی ایک دور اس زبان پر آج سے ٹھیک ایک سو سال قبل آیا تھا اور اس وقت بھی اردو بولنے والے اسی طرح منتشر اور پریشان روزگار تھے۔ لیکن خود اس زبان کے خمیر میں زندگی اور پھلنے پھولنے کی ایسی صلاحیت ہے کہ وہ نہ صرف خود اس امتحان سے صحیح و سلامت نکل آئی بلکہ اپنے بولنے والوں کو بھی بہت جلد اس قابل بنا دیا کہ اپنے ملک کی آزادی اور یکجہتی کے لئے وہ اس سرزمین کی دوسری زبانوں کے علمبرداروں کے ساتھ شانہ بہ شانہ صف آرا ہوئے اور سچ تو یہ ہے کہ اردو زبان ہی میں ہندوستان کی آزادی اور بیداری کے لئے دوسری زبانوں سے زیادہ ادب لکھا گیا ہے اور اس اثنا میں ایسے ایسے ادیب اور شاعر پیدا ہوئے ہیں جن کی وجہ سے اردو دنیا کی ترقی یافتہ زبانوں کی صف اول میں داخل ہو گئی۔

اس تجربہ کی بنا پر اردو والوں کو مایوس اور پریشان ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔ اگر اس کی سرکاری و درباری قدر و منزلت باقی نہیں ہے تو کوئی پروا نہیں۔ یہ زبان کسی وقت بھی سرکار کی گود میں نہیں پلی۔ یہ تو بازاروں اور لشکروں، غریبوں اور مزدوروں کی زبان ہے اور انہی میں کچھ اس طرح پھولتی پھلتی رہی ہے کہ امیروں اور سرکاروں کو بھی اس کے حسن و خوبی کا گرویدہ ہونا پڑا۔

اگر اردو زبان کی تاریخ پر غور کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ یہ ایک خود رو پودے کی طرح ہندوستان کی سرزمین سے پیدا ہوئی۔ اس کا بیج کسی حکمران یا کسی سلطنت نے نہیں بویا اور نہ یہ کسی شاہی محل کی روشوں پر لگائی گئی ہے۔

یہ ایک ایسی بیل ہے جو بازاروں اور سڑکوں، خانقاہوں اور فوجی چھاونیوں میں خود بخود اُگی، پھیلی اور ایسے دلآویز پھول کھلائے اور پھل پیش کئے کہ علم و فضل اور دولت و اقتدار کے بڑے بڑے مغرور اور سرکش سرمایہ داروں کے بھی دل موہ لئے اور انھوں نے بڑے فخر و مسرت کے ساتھ اس کو اپنے اپنے قصروں اور باغیچوں میں جگہ دی اور اپنے درباروں اور محل سراؤں کو اس سے سجایا۔

ملتان اور لاہور کے بازاروں اور فوجی چھاونیوں سے یہ پودا دلی اور آگرہ پہنچا اور وہاں کی زمین میں ابھی پوری طرح جمنے بھی نہ پایا تھا کہ محمد تغلق کی فوجوں اور دلی کے عوام کے ساتھ دکن پہنچ گیا اور یہاں کی پہاڑیوں اور سبزہ زاروں میں تو ایسا پھلا پھولا کہ اس پر پہلا ادبی بار جنوبی ہند ہی کے شہروں میں آیا۔ چنانچہ اردو زبان کی ابتدائی نظم و نثر دکن ہی میں لکھی گئی اور دو تین سو سال کے عرصہ میں اس ملک میں بہت بڑا ادبی ذخیرہ جمع ہو گیا جس میں اس عہد کے ہندوستان کے دل کی دھڑکنیں سنی جا سکتی ہیں۔

برہان پور کی سرزمین میں بھی اردو کا پودا ایسا پھیلا کہ شاہ جہاں اور اورنگ زیب کے عہد میں یہاں کے بڑے بڑے

عالم اور شاعر فارسی کے ساتھ ساتھ اس زبان میں بھی لکھنے لگے۔ اور جب اورنگ زیب عالمگیر بادشاہ نے برسوں اورنگ آباد میں قیام کیا تو اورنگ آباد کی علمی و ادبی چہل پہل زیادہ تر برہان پور ہی کے ادیبوں اور شاعروں کی مرہونِ منت رہی۔ یہ واقعہ ہے کہ اگر برہان پوری شاعروں اور صاحبانِ کمال کو اورنگ آباد سے خارج کر دیا جاتا تو وہاں کی محفلیں سونی نظر آنے لگتیں۔

جب اورنگ آباد سے سلطنتِ آصفی کا پایۂ تخت حیدرآباد منتقل ہوا تو دوسروں کے ساتھ برہان پوری شعرا اور ادیب بھی حیدرآباد چلے گئے اور اہلِ کمال کی آمد و رفت کا سلسلہ عرصہ تک جاری رہا۔

——— ۲ ———

ہندوستان کی آزادی کے بعد دستورِ ہند میں اردو کو بھی ملک کی دوسری (۱۴) زبانوں کے ساتھ مقامی زبان تسلیم کیا گیا ہے۔ ہندی کو سرکاری زبان قرار دینے کی وجہ سے بعض علاقوں کے ہندی والے اپنی زبان کی برتری اور خوبیوں کے منوانے میں کچھ اس طرح کا رویہ اختیار کرتے رہے ہیں جس سے اردو کی مخالفت کی بو آتی ہے لیکن اہلِ اردو کو اس سے .... متاثر ہونے یا ڈرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ ہمیں تو اس واقعہ سے خوش ہونا چاہیئے کہ ایک ایسی زبان ہندوستان کی سرکاری زبان قرار دی گئی ہے جو اردو سے زیادہ کوئی اور زبان ہندی کے قریب ہونے کا دعویٰ نہیں کر سکتی۔ بول چال کی حد تک دونوں زبانیں ایک ہیں۔ البتہ اسما و صفات اور نت نئی اصطلاحوں کے باعث ان کے آپس میں دوری پیدا ہوتی جا رہی ہے۔ لیکن یہ مشکل اصطلاحیں بھی کچھ عرصہ میں سہل بن جائیں گی اور جو بہت مشکل ہیں ان کو ہندوستان کے عوام قبول ہی نہیں کریں گے اس طرح وہ اپنی موت آپ ہی مر جائیں گی اور ایک وقت ایسا آئے گا کہ ان دونوں زبانوں کے اربابِ کار ایک دوسرے سے قریب ہونے اور اپنے مسائل کو مشترکہ طور پر حل کرنے کی کوشش کریں گے۔ اور اسی صورت میں ہندی پنپ سکتی ہے۔ ورنہ ہندوستان کی دوسری زبانیں بنگالی و مرہٹی اور جنوب کی تامل و تلگو وغیرہ تو ہندی کو خاطر میں بھی نہیں لاتیں اور عملاً اس کی مخالفت پر کمربستہ ہیں۔

ہم ہندی کے مخالف نہیں ہیں اور نہ ہو سکتے ہیں۔ ہندی کی ترویج خود اردو کی ترویج ہے۔ اور بہت سے اربابِ ہندی بھی سمجھتے ہیں کہ اردو کی ترقی دراصل ہندی کی ترقی ہے۔ چنانچہ حیدرآباد کی ہندی سبھائیں اسی نقطۂ نظر سے اردو والوں کا ہر کام میں ساتھ دے رہی ہیں۔

اردو والوں کے سامنے سب سے اہم مسئلہ اردو رسم خط کا ہے اور اگر مخالف سے مخالف فضا بھی پیدا ہو جائے اور ہندوستان کی جمہوری اقدار سے آخر کار ہماری توقعات پوری نہ بھی ہوں تو یہ مسئلہ ایسا نہیں کہ اردو والے خود اس کو حل نہ کر سکیں۔ لیکن حالات روز بروز بدلتے جا رہے ہیں۔ آپ نے محسوس کیا ہو گا کہ اردو کی مخالفت میں شدت اب کم ہوتی جا رہی ہے۔ دلی میں کل ہند اردو کانفرنس کے انعقاد کے لئے مختلف نقاطِ نظر کے اصحاب مل جل کر کوشش کر رہے ہیں اور ہمارے ہر دل عزیز اور وسیع النظر وزیرِ اعظم پنڈت جواہر لال نہرو بھی اس کو مخاطب کرنے والے ہیں۔ کشمیر اور آندھرا پردیش میں اردو کے لئے تحفظات دیئے جا رہے ہیں۔ یقین ہے کہ یو۔ پی اور بہار کی بھی بہت جلد باری آئے گی اور اسی کے ساتھ دوسرے پردیشوں میں رہنے بسنے والوں کو بھی اپنی زبان کی تعلیمی سہولتیں ملیں گی۔

کل ہند انجمن ترقی اردو اب بیدار ہو چکی ہے اور اردو کے تحفظ و بقا کے لئے صحیح انداز میں سرگرمِ عمل ہے۔ اس کے ہاتھوں کو مضبوط کرنے کی ضرورت ہے۔ اور یقین ہے کہ ہر علاقہ کے اہلِ اردو اس کا ساتھ دیں گے اور ممکنہ تعاونِ عمل کریں گے۔ شمالی ہند میں علی گڑھ، دلی، لکھنؤ اور پٹنہ میں اردو کا کچھ نہ کچھ مفید کام ہو رہا ہے اور کام سے زیادہ وہاں کے اہلِ اردو اپنی زبان کے لئے جد و جہد کے جو صحت مند طریقے اختیار کر رہے ہیں ان سے توقع ہے کہ ملک کی فضا کو کشیدہ کئے بغیر اردو والے اپنے مقاصد میں کامیاب ہو سکیں گے۔

ہند کے بارے میں تو زیادہ نہیں کہہ سکتا البتہ جنوبی ہند میں یعنی بمبئی، حیدرآباد، کرنول، مدراس اور بنگلور میں اردو کے لئے خاموش کام ہو رہا ہے وہ ہمارے حوصلے بڑھانے کے لئے کافی ہے۔ بمبئی کا اردو ریسرچ انسٹی ٹیوٹ ایک معیاری سہ ماہی رسالہ ے شائع کرنے کے علاوہ پروفیسر نجیب اشرف ندوی اور ڈاکٹر ظہیر الدین مدنی کی کاوشوں کے باعث اردو کی اعلیٰ تحقیق کا مرکز اور فلم کمپنیوں کے سلسلہ میں اردو کے بڑے بڑے شاعر اور ادیب بمبئی میں مقیم ہیں جو وقتاً فوقتاً اردو کے لئے سازگار ماحول اسباب اور ذرائع پیدا کرتے رہتے ہیں۔ مدراس میں اے۔ جے اردو سمینار اردو کا ایک شگفتہ مرکز بنا ہوا ہے اور ڈاکٹر عبدالحق اور مولانا عبدالوہاب بخاری بجائے خود ایسے ادارے ہیں جن کا ہر قدم اردو زبان و ادب کی سرگرمی اور ضامن ہے۔

در اور میسور کے نوجوان بھی ابھر رہے ہیں۔ چنانچہ مہاراجہ کالج بنگلور اور مہارانی کالج میسور کے طلبہ و طالبات میں اردو کا پیدا ہو گیا ہے اور وہ اپنے مضامین نظم و نثر میں نمایاں ترقی کر رہے ہیں۔ ابھی ابھی مہاراجہ کالج کے اردو ترجمان مخزن کا پو سلطان شہید سے متعلق شائع ہوا ہے جو ادبی و تحقیقی معیار کے لحاظ سے تشفی بخش ثابت ہوا ہے۔

رآباد میں انجمن ترقی اردو کی شاخ بڑا اچھا کام کر رہی ہے۔ اور یہ غالباً پہلی شاخ ہے جس نے گذشتہ چند سالوں کے اندر ن اردو ہال تعمیر کیا ہے۔ اور ایک اردو کالج بھی چلا رہی ہے۔ اس کے علاوہ ایک ادارۂ ادبیات اردو ہے جو علمی و ادبی کاموں میں مصروف ہے۔ یہ ادارہ سنہ ۱۹۳۱ء میں قائم ہوا تھا۔ اور اس نے کسی سرکاری یا درباری امداد سے مستغنی رہ کر یسے قدردان پیدا کر لئے کہ رفتہ رفتہ ترقی کرتا گیا۔ اس نے گذشتہ ربع صدی میں حیدرآباد کے شعراء و مولفین کی ایسی لی کی ہے اور علم و فضل اور شعر و سخن کی ایسی فضا قائم کر دی ہے کہ یہ ادارہ اب اپنے ایک جداگانہ دبستان ادب پر ناز کر سکتا ہے۔ وعوں پر ۴۵۰ کتابیں چھپوانا، مسلسل بیس سال تک ایک علمی و ادبی رسالہ "سب رس" جاری رکھنا۔ مختلف یونیورسٹیوں کے ریسرچ پچاس روپے ماہانہ کے وظائف دینا۔ ایک وسیع مرکزی دارالمطالعہ چلانا اور تقریباً پچاس شاخیں قائم کرنا جن میں سے نلہ روم اور اردو کی تعلیم کا مرکز ثابت ہوئی ہے۔ تعلیم بالغاں کا انتظام کرنا اور ہزاروں ان پڑھوں کو پڑھا لکھا بنا کر ا میں اضافہ کرنا ایسے کام ہیں جن کے ذریعہ سے اس خطۂ ملک میں ادارے نے اردو کی بڑی خدمت کی ہے۔

— ۳ —

دہ امید افزا واقعات ہیں جن کی بنا پر آسانی سے رائے قائم کی جا سکتی ہے کہ اس ملک میں اردو کا مستقبل تاریک نہیں ہے۔ اسی وقت تاریک ہو سکتا ہے جب خود اردو والے اپنی مدد آپ کرنے کے زرّین اصول کو ترک کر دیں گے اور حکومتی امداد و سرپرستی ریں گے جیسا کہ آج تک کرتے آ رہے ہیں۔ ہم آج کل شاید اس قانونِ قدرت کو بھول گئے ہیں کہ خدا نے بھی ایسی کسی قوم کی حالت نہیں بدلی جس کو خود اپنی حالت بدلنے کا احساس پیدا نہیں ہوا۔ اردو والے اگر محض حکومت کی غفلت یا بے مہری کا رونا یں گے اور خود ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھے رہیں گے تو حکومت بھی ان کی طرف کوئی توجہ نہ کرے گی پہلے خود اپنے اعمال اور کارکردگی کا جائزہ لینا چاہیئے۔ کیا ہم اپنی زبان کی بقا اور استحکام کے لئے وہ کچھ کر رہے ہیں جس کی ہے۔ جہاں تک میں نے غور کیا ہے یہی معلوم ہوتا ہے کہ اس وقت اردو کو خود اپنوں سے حقیقی شکایت ہو سکتی ہے سے نہیں۔

یہ صحیح ہے کہ آج کل اردو والے اقتصادی دشواریوں میں دوسروں سے زیادہ گرفتار ہیں اور ملک کے بٹوارے کے باعث ذہنی انتشار اور سماجی دشواریوں سے بہت زیادہ متاثر ہوئے ہیں لیکن ان پریشانیوں کے باوجود ان کے کھانے پینے اور پہننے اوڑھنے کی ضرورتیں کسی نہ کسی طرح تکمیل کو پہنچ ہی رہی ہیں جہاں وہ اپنی اولاد وغیرہ کی بزرگ داشت اپنے مال و اسباب کی حفاظت اور اپنی جائداد مثلاً مکان، دوکان اور زمین کی نگہداشت اور ترقی کے لئے کچھ نہ کچھ توجہ اور محنت کرتے ہی ہیں تو پھر کوئی وجہ نہیں کہ اپنی زبان کی بقا اور نگہداشت کی طرف بھی متوجہ نہ ہوں۔ حالانکہ یہ بھی ان کا موروثی سرمایہ ہے جس پر ان کی تہذیب و روایات اور عزت و عظمت کا انحصار ہے۔ جب تک اہلِ اردو وقت کی اس اہم ضرورت کو محسوس نہ کریں گے اور اپنی مادری زبان کی خدمت کے لئے کمر بستہ نہ ہو جائیں گے ان کی تہذیب اور روایات خطرے ہی میں رہیں گی۔ اپنی زبان سے محبت شائستہ اور زندہ قوموں کا اولین فریضہ ہوتا ہے۔ اسی کے ذریعہ سے ہم اپنے شاندار ماضی سے وابستہ رہ سکتے ہیں اور ان اسباب سے واقف ہو سکتے ہیں جن کی بنا پر ہمارے آباؤ اجداد معزز و محترم سمجھے جاتے تھے۔

میں نے ابھی اوپر ذکر کیا ہے کہ برہان پور میں اردو کے بڑے بڑے ادیب اور شاعر پیدا ہوئے اور دور دور پہنچ کر عزت اور مقبولیت حاصل کی۔ اگر برہان پور کی جدید نسلیں اپنی اولاد کو اردو رسم خط سے واقف نہ کرا سکیں گی تو وہ کس طرح اپنے شہر کی تاریخ اور اپنے اسلاف کی کامیاب زندگیوں اور ان کے شاندار علمی و ادبی کارناموں اور روایتوں سے واقف رہ سکیں گی۔ میرے حافظہ میں اس شہر کے متعدد ایسے صاحبانِ فضل و کمال مثلاً ہاشم علی شاہ قاسم علی۔ شاہ نور محمد عاصی۔ میر یحییٰ عاشق علی خاں۔ مرزا اقبال بیگ۔ شیخ سلطان الدین شوریدہ۔ میر مہدی متین۔ شاہ ضیا الدین پروانہ۔ شیخ غلام حسین خوبی۔ مرزا عطا ضیا۔ مرزا عاشور بیگ عاشق۔ لالہ دولہ رائے دلبر اور ترمبک ناتھ ذرّہ کے نام اب تک تازہ ہیں۔ جنھوں نے اردو ادب اور شعر و سخن کو سنوارنے میں بڑا حصہ لیا ہے۔ ایسے بیسیوں بزرگ اور ہوں گے اور ہیں مگر مجھے تو ابھی کے نام یاد رہے جنھوں نے اورنگ آباد اور حیدرآباد میں اپنے فضل و کمال کا ڈنکا بجایا تھا اور جن کی قلمی کتابیں اب بھی ادارۂ ادبیات اردو اور کتب خانہ آصفیہ میں محفوظ ہیں۔ جب کبھی اور جہاں کہیں اردو ادب کی تاریخ لکھی جائے گی۔ برہان پور کے صاحبانِ کمال اور خدمت گزاران اردو کو فراموش نہ کیا جا سکے گا۔

اردو رسم الخط اپنی آسانیوں اور خوبیوں کے لئے مشہور ہے اور اگر کوئی ایک دفعہ اس کو سیکھ لے تو عمر بھر بھول نہیں سکتا اس کے برخلاف بعض زبانوں کے رسم الخط ایسے ہوتے ہیں جو بڑی دقت سے ذہن نشین ہوتے ہیں اور مشق و مزاولت جاری نہ رہے تو سیکھنے والا بہت جلد ان کو بھول جاتا ہے۔ ایک ایسی نعمت سے اپنی اولاد کو محروم رکھنا ہمارے لئے ایک ناقابلِ معافی جرم ثابت ہوگا اگر ہمیں اپنی زبان سے محبت ہے تو اس کو سیکھنے اور سکھانے کے اسباب فراہم کرنے ہوں گے۔ جہاں جہاں مدرسوں میں اردو ذریعہ تعلیم نہیں ہے: ہاں کی ہر خانقاہ، ہر درگاہ، ہر دیوان خانہ اور ہر دوکان میں تھوڑے سے معاوضہ پر اردو کے مدرس کام کر سکتے ہیں اور محلہ کے ان پڑھ لوگ اور مدرسوں میں جانے والے بچے صبح یا شام کے اوقات میں اردو کی تعلیم پا سکتے ہیں اور اپنے قومی مشترکہ ورثہ سے فیض یاب ہو سکتے ہیں۔

اسی طرح اردو کے رسالے، اخبار اور کتابیں پڑھنا اور خریدنا ہر پڑھے لکھے آدمی کا فریضہ ہونا چاہئے۔ اپنی کمائی کا کچھ نہ کچھ حصہ کھانے پینے اور پہننے کی اشیاء کے ساتھ ساتھ اس پر بھی خرچ کرنا ضروری ہے۔ جب تک یہ احساس پیدا نہ ہوگا۔ ہماری زبان اور اس کا ادب سر سبز و شاداب نہ ہو سکے گا اور ہم بیداری اور ترقی کی دوڑ میں پیچھے رہ جائیں گے۔ ہم کو چاہئے کہ اردو کے

بقیہ سلسلہ صفحہ (۳۰۹) پر ملاحظہ ہو

خیر مقدمی تقریر یوم محمد قلی قطب شاہ

[گنبد محمد قلی قطب شاہ (قلعہ گولکنڈہ) پر تیسرے یوم محمد قلی قطب شاہ منعقدہ ۱۰ جنوری ۱۹۶۰ء کے موقع پر پڑھی گئی تقریر]

خواتین و حضرات!

آج ہم سب تیسرا یوم محمد قلی قطب شاہ منانے اس پُرفضا چبوترے پر جمع ہیں اور حسنِ اتفاق سے آج ہی ہمارے ملک کی سیاسی تاریخ بھی اپنا ایک ورق الٹ رہی ہے۔ عہدِ محمد قلی قطب شاہ سے آج تک اس تاریخ کے کئی ورق الٹ چکے ہیں جن میں سے بعض سنہرے تھے۔ جو ورق آج الٹ رہا ہے اس کو معلوم نہیں آئندہ کے مورخ کیا کہیں لیکن میں اپنی تھوڑی بہت تاریخ دانی کے بل بوتہ پر کہہ سکتا ہوں کہ حیدرآباد کی تاریخ کا ایک سنہرا ورق تھا۔ مسٹری سنجیوا ریڈی کی چیف منسٹری کے دور میں حیدرآباد اور اہلِ حیدرآباد کو سماجی، اقتصادی اور سیاسی نقطہ نظر سے کیا فائدہ اور کیا نقصان پہنچا اس کی سرگذشت تو میں بیان نہیں کر سکتا۔ مگر اتنا ضرور کہہ سکتا ہوں کہ اس تین سالہ دور میں اس ملک کے مختلف مذہبوں کے ماننے والوں اور مختلف زبانیں بولنے والوں کے باہمی تعلقات بہت خوشگوار رہے اور یہاں کی لسانی اقلیتیں خوف و دہشت میں گرفتار نہیں رہیں جو ہندوستان کے دوسرے پردیشوں کے اردو والوں پر طاری ہے۔ یہاں اردو کو ریاست کی علاقائی زبان قرار دے کر ایک ایسی نظیر قائم کی گئی ہے جس کی آج تک کوئی دوسرا صوبہ تقلید بھی نہ کر سکا۔ اسی طرح ابھی ابھی کچھ روز قبل تاریخ و سائنس کی تلگو اکاڈیمی میں اردو کو بھی شریک کر کے اور آندھرا ساہتیہ اکاڈیمی کی طرف سے تلگو کے ساتھ ساتھ اردو کتابوں کی اشاعت اور اردو کے ادیبوں اور شاعروں کو انعامات دے کر جس فراخ دلی کا ثبوت دیا گیا ہے وہ بھی اپنی آپ نظیر ہے۔

یہ سب باتیں ظاہر کرتی ہیں کہ حیدرآباد کے بانی اور آندھرا کے اس عظیم الشان حکمران سلطان محمد قلی قطب شاہ نے فراخدلانہ روایات کا جو پودا لگایا تھا اس کو آج بھی پھول پھل لگ رہے ہیں۔ اور یہی وجہ ہے کہ اس بادشاہ کی یاد روز بروز تازہ تر ہوتی جا رہی ہے اور اس کے کارناموں کا جتنا گہرا مطالعہ کیا جا رہا ہے اتنا ہی زیادہ اس کے دور کی خوبیاں واضح ہو رہی ہیں۔

بڑی خوشی کی بات ہے کہ تیسرے یوم محمد قلی کے موقع پر اس کی مجلس انتظامی نے نواب زین یار جنگ بہادر کی رہنمائی میں بعض ایسے ٹھوس کام شروع کئے ہیں جن سے اس ملک کے باشندوں کو دیرپا فائدہ حاصل ہو سکتے ہیں۔ تاریخ و آثار گولکنڈہ سے متعلق ایک مفت ترقی کورس شروع کیا گیا جس میں متعدد اعلیٰ تعلیم یافتہ نوجوانوں نے شرکت کی۔ گولکنڈہ کے مشہور مورخ پروفیسر مجید صدیقی اور آثار قدیمہ کے نوجوان ماہر پروفیسر ڈی۔ اے۔ رحمٰن اور میں نے گولکنڈہ کی تاریخ، آثار اور محلات و مقابر پر نہ صرف لکچر دیئے بلکہ قلعہ اور گنبدوں میں فیلڈ ورک بھی کرایا اور آخر میں تحریری امتحان بھی لیا گیا جس میں جو امیدوار کامیاب ہوئے ہیں ان کی سندیں آج تقسیم کی جائیں گی۔

یہ امر موجب اطمینان ہے کہ مختلف پیشوں اور طبقوں سے تعلق رکھنے والے اصحاب نے اس ترجیتی نظام کی تکمیل کے لئے بڑے شوق اور توجہ سے شرکت کی اور سعادت مند شاگردوں کی طرح ہر پہلو سے متعلق نہایت ادب سے سوالات کئے اور ہم سبھوں کو مجبور کر دیا کہ اپنی تحقیق و تلاش و جستجو کے ذخیرے ان کو خوشی خوشی سپرد کر دیں۔ توقع ہے کہ آئندہ سال بھی اس تربیتی کورس میں ایسے ہی مزید اصحاب شرکت کریں گے۔ اور اس طرح چراغ سے چراغ جلتا چلا جائے گا۔

اس سال ہائی اسکولوں اور کالجوں کے طلبہ کے لئے اردو اور تلگو میں تحریری اور تقریری مقابلے بھی منعقد کئے گئے۔ ان میں بھی متعدد طلبہ نے اردو تقریری مقابلوں کی صدارت ہمارے پرجوش میر بلدہ روشن علی خاں صاحب نے اور تلگو کی صدارت آندھرا پردیش ساہتیہ اکیڈیمی کے پرخلوص معتمد راما نجا راؤ صاحب نے کی۔ تحریری مقابلوں کے حکم کے فرائض علامہ علی اصغر بلگرامی۔ پروفیسر مجید صدیقی۔ ڈاکٹر شریف النسا انصاری اور پروفیسر ایم آر کرشنا انجام دیئے۔ جس معیار کی تحریریں اس سلسلہ میں تیار کی گئیں ان سے ظاہر ہوتا ہے کہ ہمارے ملک کے نوجوان خواہ وہ اردو داں ہوں یا تلگو داں اپنے ملک کی تاریخ اور اپنے سابق حکمرانوں کی خصوصیات سے ناواقف نہیں ہیں۔ یہ ایک ایسی علامت ہے جس کی بنا پر اس ملک کا مستقبل اور بھی تابناک نظر آتا ہے۔

ایک اور پائیدار کام یہ بھی شروع کیا گیا ہے کہ قطب شاہی عہد کی تاریخوں کو خواہ وہ کسی زبان میں ہوں چھپوا کر شائع کرنے کے لئے ایک بورڈ بنایا گیا جس نے کام شروع کر دیا ہے اس میں نواب عنایت جنگ بہادر۔ پروفیسر مجید صدیقی اور مولانا علی اصغر بلگرامی جیسے بلند پایہ مورخین اور آغا محمد شیرازی۔ آغا حسین ضابطہ اور پروفیسر ایم آر کرشنا جیسے پرجوش کارگذار شامل ہیں۔ توقع ہے کہ آئندہ سال تک کم از کم دو تاریخیں چھپ جائیں گی۔ پہلے ملا نظام الدین احمد کی تاریخ حدیقۃ السلاطین بالتصویر چھپ رہی ہے اس تاریخ کا ایک حصہ ربع صدی قبل خود علی اصغر بلگرامی صاحب نے اپنے ذاتی صرفہ سے چھپوا دیا تھا۔ مگر وہ بھی اب نایاب ہے۔ ابوالحسن تانا شاہ کی لکھوائی ہوئی تاریخ حدائق السلاطین از علی ابن طیفور بسطامی کو ڈاکٹر شریف النسا بیگم نے نقل کر کے ایڈٹ کرنا شروع کر دیا ہے۔ کتنے افسوس کا مقام ہے کہ گذشتہ دو سالوں کے طویل عرصہ میں ہم نے قطب شاہی عہد کی ایک تاریخ بھی شائع نہیں کی۔ یوم محمد قلی قطب شاہ سے کچھ فائدہ ہوا یا نہ ہو یہی ایک کام ہمیشہ یادگار رہے گا کہ اس یوم کے سلسلے میں کم از کم دو تاریخیں تو چھپ گئیں اور تاریخ ہندوستان کا ایک اور گوشہ جو تاریکی میں تھا روشن ہو گیا۔

آغا حسین ضابطہ کی تحریک پر قطب شاہی بادشاہوں کے پوسٹ کارڈ بھی اس سال چھاپ دیئے گئے ہیں۔ اور اب عادل شاہی، بہمنی، اور آصفجاہی سلاطین اور ان کے آثار کی تصویروں کے کارڈ بھی چھپ رہے ہیں۔ اس سلسلہ میں پری اسلامک دور کی تصویروں کے پوسٹ کارڈ بھی شائع کئے جائیں گے۔ تاریخ اور آثار سے دلچسپی رکھنے والوں کے لئے یہ کارڈ ایک نادر تحفہ کا کام دیں گے اور لوگ اپنے دوست احباب کے دور دور بطور تحفہ عید و سال نو ان تاریخی تصویروں کو بھیج سکیں گے اور سیر و سیاحت کرنے والے ان کو شوق سے بطور سوغات اپنے ساتھ لے جائیں گے۔

سال حال کے یوم محمد قلی قطب شاہ میں ایک اور اضافہ یہ کیا گیا ہے کہ تلگو تقریروں اور نظموں کے لئے ایک مزید اجلاس منعقد ہوگا جو کل شام شری کرشنا دیورایا آندھرا بھاشا نلیم تلگو لائبریری سلطان بازار میں ڈاکٹر بی گوپال ریڈی کی صدارت میں منعقد ہوگا۔ قطب شاہی دور اور محمد قلی کے بارے میں اگرچہ تلگو زبان میں بھی اچھا ادب موجود ہے اور اہل آندھرا قطب شاہی سلسلہ کو بھی اپنے قابل فخر حکمرانوں میں شمار کرتے ہیں مگر ضرورت تھی کہ ہماری ان تقریبات سے بھی ان کو واقف کرایا جائے۔ گذشتہ دو سالوں کے تجربہ سے معلوم ہوا کہ تلگو بولنے والوں خاص کر آندھرا علاقوں سے حیدرآباد منتقل ہونے والوں کی کافی تعداد اس تقریب میں شرکت نہیں کر رہی ہے۔ اس لئے طے کیا گیا کہ ایک

لکو دان اصحاب کے لئے منعقد کیا جائے۔ مقام مسرت ہے کہ اس جلسے کی صدارت ڈاکٹر پی گوپال ریڈی نے قبول فرمائی ہے جو ہر سال
ر قلی قطب شاہ میں شرکت کے لئے دلی سے تشریف لا رہے ہیں۔ اور جو اصل میں اس یوم محمد قلی کے بانیوں میں شامل ہیں۔ یہ توقع
ر وہ بھی اس تقریب کی اہمیت اور افادیت سے تلگو والوں کو بخوبی واقف کرا سکتے تھے۔ میں آپ صاحبین اور خواتین سے استدعا
ہوں کہ کل کے جلسہ میں بھی شرکت فرمانے کی کوشش کریں۔ اس طرح ہم ایک دوسرے کی محفلوں کی رونق میں اضافہ کر سکیں گے۔ اور اہل اردو و
تلگو ایک دوسرے سے قریب تر ہو سکیں گے۔

آج کی تقریب میں آندھرا پردیش کے پختہ کار رہنما اور اس کی اسمبلی کے اسپیکر جناب کالیشور راؤ صاحب نے نمائش کتب و تصاویر کا
افتتاح فرما کر اور اپنے معروف ترین اوقات میں سے بہت زیادہ وقت ہم کو دے کر ہمارے دلوں کو موہ لیا ہے۔ ان کی شخصیت ہم سب کے لئے
نمونے کا کام دیتی ہے۔ انھوں نے حیدرآباد آنے کے بعد اردو سیکھنی شروع کی اور آج اس زبان کو نہ صرف سمجھتے بلکہ بولتے بھی ہیں ہم
اردو والوں کو اس سے سبق لینا چاہیئے۔ ایسی ہی ہاسپیٹل کو دیکھئے کہ بعد سلطان محمد قلی قطب شاہ کے ان اشعار پر یقین کرنا پڑتا ہے جن میں
نے لکھا ہے کہ اس کے بھتیجے محمد قلی اردو اور فارسی کے علاوہ تلگو میں بھی شاعری کیا کرتے تھے۔

میں آخر میں آپ سب حضرات کا شکریہ ادا کرتا ہوں کہ اس اجلاس میں شرکت کرنے کی زحمت گوارا فرمائی اور ان سب دوستوں کا
جنھوں نے اس کے انتظامات میں ہاتھ بٹایا۔ ظاہر ہے کہ ایسے جلسے تعاونِ عمل اور ایثار و اخلاص کے بغیر منعقد نہیں ہو سکتے۔

میں اپنے مہمان خصوصی شری سنجیویا نئے چیف منسٹر کا بھی ان کی تشریف آوری کے لئے شکریہ ادا کرتا ہوں اور ہم سب کی طرف سے
توقع کا اظہار کرتا ہوں کہ ان کا دورِ وزارت بھی آندھرا پردیش کی قدیم ترین روایات کے مطابق اپنی فیض رسانی کے باعث خوش گوار ثابت
ہوگا اور اس ملک کی تاریخ کو مزید شاندار بنانے میں زیادہ حصہ لے گا۔

بقیہ سلسلہ صفحہ ۳۱۴

طن بھلے اور برے، سچ اور جھوٹ کے مابین امتیاز نہیں کر سکتے اور جس کی بنا پر اندیشہ ہے کہ ہماری زبان ہماری
ت اور ہمارے بادشاہ کے متعلق غلط اور گمراہ کن بیانات کو بعض وقت سچ سمجھ لیا جائے۔

ورنگل کی اس درس گاہ کے نونہالوں نے اب تک اپنی اس بزم ادب، اس کے رسالے کے شماروں اور بیان کے
اعروں میں جس شائستگی اور زندگی کے ثبوت فراہم کئے ہیں اس کے پیش نظر مجھے یقین ہے کہ حیدرآباد کے دوسرے
بوں میں ورنگل کا نام بلند کرتے ہیں ان کی آئندہ مساعی بھی بارآور ثابت ہوں گی اور علم و شائستگی کے جس نور
ان کے دل روشن اور ان کی زندگیاں بارونق ہو گئی ہیں وہ نور خود ان کے ذاتی ایثار اور رضا کارانہ خدمات
دور دور تک پھیلتا رہے گا اور اس طرح اطراف و اکناف کے وہ دیہات بھی علم و شائستگی کی روشنی سے محروم
سکیں گے جہاں اب تک جہالت کی تاریکیاں چھائی ہوئی ہیں اور جہاں کے غریب باشندے علم و ادب تو
رنگلا دولت ہے معمولی نوشت و خواند سے بھی محروم ہیں اور منتظر ہیں کہ اس درس گاہ اور اس کی بزم ادب کے
ن یافتہ ان کی طرف جلد سے جلد متوجہ ہوں۔

خیر مقدم صدر جمہوریۂ ہند

(۲۹ر جولائی سنہ ۱۹۶۰ء کو شام کے چار بجے صدر جمہوریۂ ہند ڈاکٹر راجندر پرشاد ایوانِ اردو میں تشریف لائے تو ادارہ کے معتمد اعزازی ڈاکٹر زورؔ صاحب نے ان الفاظ میں خیر مقدم کیا)

ہمارے ہر دلعزیز صدر جمہوریۂ ہند!

آج آپ کے قدوم میمنت لزوم ہمارے اس چھوٹے سے گھر میں آئے ہیں جس کو حضرت خواجہ حسن نظامی مرحوم نے ایوانِ اردو جیسا بڑا نام عطا فرمایا تھا، اس لئے آج ہم اپنی قسمت پر جتنا ناز کریں کم ہے۔ ہم بجا طور پر شاعر کی زبان میں کہہ سکتے ہیں کہ ؎

وہ آئیں گھر میں ہمارے خدا کی قدرت ہے
کبھی ہم ان کو کبھی اپنے گھر کو دیکھتے ہیں

جناب والا نے ملاحظہ فرمایا ہوگا کہ اس ایوان کی تعمیر اردو کے مزاج کے عین مطابق عمل میں آئی ہے۔ جس طرح اردو مختلف زبانوں کے میل جول سے بنی ہے اسی طرح اس ایوان میں بھی مختلف تہذیبوں اور کلچروں کی خصوصیات کا ایک ایسا امتزاج کیا گیا ہے کہ اپنی گونا گونی کے باوجود اس میں ایک خاص کلچرل وحدت خوب صورتی نمایاں ہے۔

جناب والا! اس ایوان اردو میں اردو کے شاعروں اور مصنفوں کی نہ صرف مطبوعہ اور قلمی کتابیں جمع کی گئی ہیں بلکہ اردو بولنے والوں کے اکثر و بیشتر تاریخی آثار، تحریریں، تصویریں، اخبار، خطوط، فرامین، خاندانی شجرے اور اس ہندوستانی پس منظر کو محفوظ کیا گیا ہے جس کے مطالعہ اور تحقیق کے بغیر ہمارے ملک کی کوئی کلچرل تاریخ مکمل نہیں کہی جا سکتی۔ یہ تمام ذخیرہ گذشتہ تیس سال کی جد و جہد اور تلاش و جستجو سے فراہم کیا ہے اور واقعہ یہ ہے کہ اگر اس کو یہاں محفوظ کرنے کی کوشش نہ کی جاتی تو اس کا اکثر و بیشتر حصہ اب تک یا تو تلف ہو جاتا یا ہندوستان سے باہر چلا جاتا۔ ہم خوش ہیں کہ ہم نے ملک کے بہت سے نادر شاہ کاروں کو اپنے ہی ملک میں محفوظ کر لینے میں بڑی حد تک کامیاب ہوئے ہیں اور اس طرح آندھرا پردیش کے اس فرخندہ بنیاد شہر کو جو اپنی تعمیر کے وقت ہی سے اردو کا گہوارہ رہا ہے اپنی اس خصوصیت کے باقی رکھنے میں اس ادارے نے اپنے محدود ذریعوں کے باوجود ایک قابل ذکر خدمت انجام دی ہے۔

اس ادارے نے اب تک نہ صرف ۲۰۰ قدیم و جدید اردو کتابیں شائع کیں بلکہ اردو امتحانات کے ذریعہ سے سنہ ۱۹۴۰ء سے اب تک ہزاروں اَن پڑھوں کو خواندہ بنایا اور ۲۵ ہزار مطبوعہ اور پانچ ہزار سے زیادہ قلمی کتابیں جمع کیں۔ اس کا ترجمان ماہنامہ "سب رس" سنہ ۱۹۳۸ء سے پابندی کے ساتھ شائع ہو رہا ہے۔

۔دو میں ایک انسائیکلو پیڈیا بھی مرتب کر رہا ہے جو دس جلدوں میں مکمل ہو سکے گا۔ کتب خانے کی مطبوعات اور مخطوطات کی ضخیم توضیحی جلدیں بھی ہے اور یہ ایک ایسی خصوصیت ہے جو کسی اور اردو کتب خانے کو اب تک حاصل نہ ہو سکی۔

ادارہ کے شعبۂ تاریخ و آثار و کلچر کا کام رفتہ رفتہ اتنا ترقی کر گیا ہے کہ اس ایوانِ اردو کا ایک بڑا حصہ اس کے لئے مختص کرنا پڑا۔ اس میں جیسا کہ خطہ فرمایا ہے۔ ہم نے زیادہ تر توجہ گولکنڈہ، بیجاپور، بیدر اور اورنگ آباد کے کلچرل شاہکاروں کے لئے وقف کی ہے اس طرح یہ ادارہ بجا طور پر کہ سرزمین دکن کے علم و فضل، آرٹ اور قلم کاری کا ——— جو گنجینۂ گراں بہا اس ایوان میں موجود ہے شاید ہی کسی اور جگہ مل سکے۔

ب والا یہ بھی معلوم کر کے مسرور ہوں گے کہ اسی ایوانِ اردو میں ابوالکلام آزاد اورنٹیل ریسرچ انسٹی ٹیوٹ بھی مصروفِ کار ہے۔ اس انسٹیٹیوٹ کا گذشتہ سال ماہ مئی میں پروفیسر ہمایوں کبیر کے ہاتھوں ہوا تھا اور اب تک یہ کافی ترقی کر چکا ہے۔ چنانچہ سالِ حال تلگو، ہندی، اردو اور فارسی کے مختلف موضوع پر پانچ ریسرچ اسکالر اپنے فاضل ڈائرکٹروں کی نگرانی میں اعلیٰ پایہ کا تحقیقاتی کام کر رہے ہیں۔ اور آئندہ سال سنسکرت، عربی پر کام ہوگا۔ اس انسٹی ٹیوٹ میں تالیف و ترجمہ کا کام بھی کیا جا رہا ہے۔ چنانچہ اب تک مولانا آزاد کی تفسیر سورۂ فاتحہ کا تلگو میں ترجمہ مکمل ہو چکا ہے جس پر تلگو کے ایک ماہر نظرِ ثانی کر رہے ہیں۔ مرحوم دہلی کالج کے مشہور پروفیسر رامچندر کے حالات اور مضامین بھی مرتب کر لئے گئے ہیں۔ اور اس کتاب کا حصہ چھپ بھی چکا ہے۔

پروفیسر ہمایوں کبیر کے مرتب کردہ آزاد میموریل والیوم کے تلگو، ہندی اور اردو ترجموں کا کام بھی ہو رہا ہے جس میں سے ایک ترجمہ تو زیرِ طبع بھی ہے۔ ڈاکٹر زور نے ایک قدیم تاریخی کتاب واقعات مشتاقی اور ڈاکٹر شریف النساء نے قطب شاہی فارسی شاعروں کے تذکرہ حدائق السلاطین کو مرتب کیا ہے اور قدیم تاریخی مخطوطات بھی مرتب کئے جا رہے ہیں۔

انسٹی ٹیوٹ مولانا آزاد کی یادگار کے طور پر ان تمام مشرقی علوم و فنون پر اعلیٰ تحقیقاتی کام کرنے کے لئے قائم کیا گیا ہے جن سے مولانا مرحوم کو دلچسپی تھی۔ اس کی مختلف مجلسوں کی صدارت ڈاکٹر ذاکر حسین، نواب مہدی نواز جنگ اور ڈاکٹر غلام یزدانی جیسے فاضل اصحاب کے سپرد ہے۔ اس انسٹی ٹیوٹ کی اپنی ایک علحدہ عمارت اسی ایوانِ اردو کے متصل بنائی جانے والی ہے جس کے لئے شری سنجیوا ریڈی کی تحریک پر اس کی خریدی کی جانب حکومت آندھرا پردیش کارروائی ہو رہی ہے۔ اور توقع ہے کہ یہ عمارت بھی بہت جلد مولانا کے نام اور کاموں کے شایانِ شان بن سکے گی۔

ادارۂ ادبیاتِ اردو اور ابوالکلام آزاد اورنٹیل ریسرچ انسٹی ٹیوٹ دونوں کے اربابِ کار تہہ دل سے جنابِ والا کے شکر گذار ہیں کہ آج آپ نے تشریف لا کر ہماری ہمت افزائی فرمائی۔ آج کی اس تقریبِ سعید کے موقع پر ادارہ کے ایک جواں سال رفیق شری نارائن کرن ریڈی کی خواہش ہے کہ ان کی کچھ زمین ایوانِ اردو کو عطا کی جائے۔ ان کے بڑے بھائی بھوودان راجندر ریڈی ہی نے سب سے پہلے بھوودان کے لئے اپنی زمینات پیش کر کے ملک کو شرف بخشا تھا۔ آج نارائن کرن ریڈی صاحب اپنی زمینات کا وثیقہ جنابِ والا کی خدمت میں پیش کر رہے ہیں تاکہ جناب اپنے دستِ مبارک سے ادارہ کے صدر نواب زین یار جنگ بہادر کو عطا فرمائیں۔

ہم اردو کے ایک ادنیٰ خدمت گذار کی حیثیت سے میں پھر اپنے وطن کی سب سے زیادہ مقتدر اور محترم ہستی کا اپنی اور اردو دنیا کی طرف سے شکریہ ادا کرتا ہوں۔ آپ کی تشریف آوری نے یہ توقع پیدا کر دی ہے کہ اردو والوں کی جملہ مردہ قوتوں کی جلد سے جلد تکمیل ہو سکے گی اور مطالبات شرفِ قبولیت حاصل کریں گے۔ اور وہ آزاد ہندوستان کی ترقی و شادکامی کے لئے آزادی اور اطمینانِ قلب کے ساتھ سرگرمِ عمل رہ سکیں گے۔

یقین ہے کہ جناب کی دعائیں اور نیک تمنائیں ہمارے ساتھ رہیں گی۔

روئدادِ ایوانِ اردو

(معتمد ادارۂ ادبیات اردو جناب ڈاکٹر زورؔ صاحب کی تقریر جو انھوں نے افتتاحی تقریب میں کی)

آج سے تقریباً تیس سال قبل ۱۹۳۱ء میں ادارۂ ادبیات اردو اس مقصد کے تحت قائم کیا گیا تھا کہ حیدرآباد اور ج میں اردو کا ذوق عام کیا جائے اور اس خطۂ ملک کے موجودہ اور گذشتہ شاعر اور ادیب اردو دنیا میں اس طرح روش کہ ان کا جائز حق ان کو مل سکے اور ساتھ ہی یہاں کے نوجوانوں میں وہ خود اعتمادی اور شگفتگی پیدا کی جائے جس کے بغیر شعر و اد اور خوشگوار ارتقا کسی ملک میں بھی ممکن نہیں۔

خدا کا شکر ہے کہ اس مقصد میں ادارے کو خاطر خواہ کامیابی حاصل ہوئی اور حیدرآباد کا شاید ہی کوئی قابلِ ذکر ادیب اور ش رشحاتِ قلم ادارے کی طرف سے کتابی شکل میں یا اس کے ترجمان ماہ نامہ سب رس میں شائع نہ ہوئے ہوں اور جس کا کبھی کسی نہ کسی طرح ادارے سے تعلق نہ رہا ہو۔

ادارے کا کام یوں تو دس شعبوں میں تقسیم ہے اور ان میں سے ہر شعبہ بجائے خود ایک ادارے کا کام انجام دیتا رہا ہے لیکن چند شعبوں نے بڑی غیر معمولی ترقی کی، جن میں سے ایک مخطوطات اور مطبوعات کا کتب خانہ ہے جس میں ۲۵ ہزار مطبوعہ کتابیں اور پانچ ہ قلمی نوادر شامل ہیں اور ان کی ضخیم توضیحی فہرستیں ہر سال شائع کی جا رہی ہیں۔ چنانچہ تذکرہ مخطوطات کی پانچ جلدیں جو دو ہزار سے زائد ہیں اور فہرست مطبوعات کی دو جلدیں چھپ چکی ہیں اور تمام اردو دنیا ان سے مستفید ہو رہی ہے۔ چنانچہ دور دور کے اہلِ علم استفادے کے لئے آتے یا مراسلت کرتے رہتے ہیں۔

ادارے کا ایک اور شعبۂ تاریخ و آثار و ثقافت کے لئے وقف ہے۔ اس شعبے کا کام بھی رفتہ رفتہ اتنا ترقی کر گیا کہ کا ایک بڑا حصہ اس کے لئے مختص کرنا پڑا۔ اس میں مشاہیر اردو کے اصلی خطوط، ان کے علمی و ادبی آثار، تصاویر اور گولکنڈہ، بیجا اور بیدر وغیرہ کے ثقافتی شہ کاروں، فرمانوں، کتبوں اور ان کے چربوں کو محفوظ کر دیا گیا ہے۔ دکن کے خطاطوں، فن کاروں او اتنے عمدہ نمونے اس میں جمع ہیں کہ آج ادارہ بجا طور پر فخر کر سکتا ہے کہ اس سرزمین کے علم و فضل، آرٹ اور قلم کار اس میں موجود ہے شاید ہی کسی اور جگہ یک جا مل سکے اور آپ کو یہ سن کر تعجب ہوگا کہ اس گنجینۂ علم و ہنر کا اکثر و بیشتر حصہ و کرم دوستوں ہی کا عطیہ ہے جس میں سرفہرست نواب عنایت جنگ بہادر کا نام نامی ہمیشہ درج رہے گا۔ دوسرے

.راج سکسینہ، نواب یٰسین علی خاں نیین، سکینہ بیگم صاحبہ شعبہ نسواں کی صدر محترمہ رابعہ بیگم صاحبہ، مولوی احمد اللہ خاں صاحب
ندوہ، ملا عبدالباسط صاحب، پروفیسر سید محمد اور مرحوم محمد حسین جعفری کے نام قابل ذکر ہیں۔

.ادارہ ۱۹۴۱ء سے ہر سال اردو کے امتحانات لیتا رہا ہے جن کے مرکز حیدرآباد سے باہر بھی اور دور تک قائم ہوتے ہیں۔ اس طرح
ئ سال کے عرصہ میں اس نے ملک میں پڑھے لکھے افراد کا قابل ذکر اضافہ کیا ہے۔

۱۹۳۸ء سے ادارے کا ماہوار ترجمان "سب رس" پابندی سے شائع ہو رہا ہے اور ہندوستان کے معتبر اور مستند رسالوں میں
ہے۔

.لیہ اردو وات انسائیکلوپیڈیا کا منصوبہ بھی ادارے کی طرف سے بنایا گیا تھا جو ایک جلد تیار کرنے کے بعد مالی دشواریوں کے باعث روک دیا
ہ عمارت کی تکمیل کے ساتھ اس کو پھر ایک مہم کے طور پر شروع کرنے کی توقع پیدا ہو گئی ہے خدا کرے کہ ہم اس امتحان میں بھی کامیاب
ں۔

دارے کے بڑھتے ہوئے کاموں اور روز افزوں ذخیرہ کتب و نوادر نے شروع ہی سے محسوس کرا دیا تھا کہ اس کے لئے اس کی ایک
ت تعمیر ہونی چاہیئے۔ چنانچہ اس کے لئے نواب زین یار جنگ بہادر نے آج سے پندرہ سال قبل ۱۹۴۲ء میں ایک عمدہ رنگین نقشہ
اپنے بصیرت افروز نوٹ کے ساتھ اپیل شائع کی تھی جس کے باعث ادارے نے رفتہ رفتہ ۲۵ ہزار روپے جمع کر لئے تھے۔ مگر اس
ری کوشش یہ تھی کہ سرکار سے کسی مرکزی مقام پر ایک قطعہ زمین حاصل کیا جائے اور اس سلسلہ میں اس عہد کے وزرائے سلطنت
راہ مان کے بعد سر مرزا اسمٰعیل نے توجہ بھی کی تھی مگر افسوس ہے کہ ہماری جد و جہد اور ان کی تائید کے باوجود ہم کو کوئی مناسب جگہ حاصل نہ ہو سکی
شن کے بعد جب حیدرآباد کی تاریخ نے پلٹا کھایا اور ہماری جمع کردہ رقم جو صدر محاسب سرکار عالی کے کھاتے میں محفوظ ہو رہی تھی بحق
ت ضبط ہونے کا خطرہ لاحق ہو گیا تو شری بکشمی نارائن گپتا صاحب نے ادارے کی مجلس انتظامی میں زور دیا کہ ہم میں سے
ا اپنی کچھ زمین ادارے کے نام بطور عطیہ رجسٹری کرا دے تاکہ حکومت سے رقم کی بازیافت کی کوشش کی جائے۔ اس وقت جملہ ارکان
تظامی سے فرداً فرداً خواہش کی گئی اور جب یہ مسئلہ دو تین اجلاسوں میں بھی طے نہ پا سکا تو گپتا صاحب نے موجودہ عمارت جس جگہ
ئی ہے اس کے حاصل کرنے پر زور دیا اور چونکہ یہ میری اہلیہ کی ملک تھی اس لئے ان سے اس وقت کے صدر نواب لیاقت جنگ بہادر
.ایسے پیرائے میں خواہش کی کہ عطیہ حاصل ہونے میں ان کو کامیابی ہو گئی۔ اس کے بعد ہی ایک مجلس عمارت بنائی گئی جس کی معتمد محترمہ
ہاں بیگم صاحبہ ایم ایل اے منتخب ہوئیں۔ اور مولوی فیض الدین صاحب سے خواہش کی گئی کہ اپنی نگرانی میں ایک ایسا نقشہ تیار
ں جو ادارے کی تعمیر اور مزاج کے موافق ہو۔

آخر کار وہ دن بھی آ گیا جب کہ ۶ نومبر ۱۹۵۵ء کو حکیم الشعراء حضرت امجد کی دعاؤں کے ساتھ اس وقت کے چیف منسٹر ڈاکٹر بی
شن راؤ صاحب نے اس عمارت کا سنگ بنیاد رکھا اور ادارے کے ایک دیرینہ رفیق مرزا ضامن علی غازی گتہ دار نے تعمیر کا
روع کر دیا مگر جلد ہی ہماری مجتمعہ رقم خرچ ہو گئی اور کام روک دینا پڑا۔

ایک کمیٹی میں مولانا ابوالکلام آزاد مرحوم سے میں نے اس کا تذکرہ کیا اور انھوں نے ازراہ کرم حکومت ہند سے ۲۵ ہزار کا
ا دیا۔ اس کے بعد پھر کام شروع ہوا اور اسی اثنا میں نواب مہدی نواز جنگ بہادر نے سالار جنگ اسٹیٹ سے رقم دلائی اور حضور نظام
یلیجی ٹرسٹ فنڈ، ڈاکٹر رگھونندن راج سکسینہ، ستی ریتی کارپوریشن اور نظام شوگر فیکٹری سے بھی عطیے وصول ہوئے۔ مگر یہ سب

رفتہ رفتہ خرچ ہوتے گئے اور کام بھی رک گیا۔ ہم بہت مایوس ہو گئے اور ایسا معلوم ہوتا تھا یہ خواب شرمندۂ تعبیر نہ ہو سکے گا۔ آخر کار ہم نے بخشی صاحب کی خدمت فیض درجت میں رجوع کیا اس لئے کہ مولانا آزاد کے بعد ہندوستان کی اردو دنیا کے سب سے بڑے لیڈر ہیں اور دو سال قبل سرینگر میں آزاد سیمینار میں تقریر کرنے اور مشاعرے کی صدارت کرنے کی دعوت کے سلسلے میں ان کے قلب کی پہنائیوں اور وسیع القلبی سے واقف ہو چکا تھا۔ جناب بخشی صاحب نے دیر سے سہی مگر کچھ اس طرح مدد کی کہ دوبارہ ہمت بندھ گئی اب جو کام شروع ہوا تو تکمیل تک پہنچے بغیر نہ رہ سکا۔ حکومت کشمیر نے ہمارے کام میں دوبارہ جان ڈال دی۔ چنانچہ اس کے ساتھ آ... کی حکومت نے بھی ہماری دستگیری کی اور پروفیسر ہمایوں کبیر اور ڈاکٹر گوپال ریڈی نے حکومت ہند سے بھی مزید امداد دلائی اور نواب بہادر وشنورام چیما ریڈی صاحب، علی حسین خاں صاحب، نواب ظہیر یار جنگ بہادر وغیرہ میں سے بھی ہر ایک نے پانچ پانچ سو روپے لئے۔ محترمہ شاہ جہاں بیگم صاحبہ اور ان کے شوہر مولوی محمد حسین خاں صاحب انجنیئر نے کم سے کم صرفے میں زیادہ کام کرا کے ادارے کی ... کی۔ آخر میں مولوی دلدار حسین صاحب سابق چیف انجنیئر کی صدارت میں عمارت کی باقی ماندہ ضروریات کی تکمیل اور افتتاح کے انتظام کے لئے ایک کمیٹی بنائی گئی جس کے معتمد شری نارائن کرن ریڈی اور ارکان ڈاکٹر مہندر راج سکسینہ، پروفیسر ایم اے رحمٰن، کے ایم خا... اور نرسنگ راؤ صاحبان وغیرہ نے اپنے اپنے فرائض جس خوبی سے انجام دیئے اس کا ذکر نہ کرنا احسان ناشناسی ہو گا۔

آخر میں کچھ عمارت کے بارے میں بھی بیان کرنا ضروری معلوم ہوتا ہے۔ اردو زبان کی طرح اس میں بھی مختلف قوموں، مذہبوں اور کلچر کی عمدہ خصوصیات کا جو خوشگوار امتزاج کیا گیا ہے اس کے لئے کسی بڑے جینیس ہی کی ضرورت تھی اور ہم شکر گذار ہیں بہزاد دکن مولوی فیاض الدین صاحب نظامی کے جن کی دلچسپی سے عہد حاضر کی یہ عمارت زمانہ ماضی کی عظیم الشان تعمیری یادگاروں کے پہلو بہ پہلو کھڑی رہ سکی۔ ا... حیران ہیں کہ اس کے سفید رکھاؤ اور مینٹیننس کا اہتمام ہم سے کیوں کر بن پڑے گا۔ دعا فرمایئے کہ اس کے بھی اسباب پیدا ہو جائیں۔

اس عمارت کے سلسلہ میں ایک یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ اس میں باہر سے آنے والے ریسرچ اسکالروں کے قیام کے لئے ... بھی تیار کیا گیا ہے جس میں ایسے تمام ارباب و طلبا علم و فضل قیام کر سکیں گے جو اردو کے علاوہ کسی بھی زبان تلگو، ہندی، مرہٹی، عربی، سنسکرت کے ادب سے متعلق یا تحقیقی یا تخلیقی کام کے سلسلے میں حیدرآباد آئیں گے۔ سچ تو یہ ہے کہ یہ ہندوستان جدید کے شگفتہ تمدن کی ایک ایسی اہم مانگ ہے جس کی طرف ملک کے ہر علمی و ادبی ادارے کو بالآخر توجہ کرنا پڑے گا۔

آخر میں آپ سب خواتین و حضرات کا شکر گزار ہوں کہ ادارے کی ہر تقریب کی طرح آج بھی ہمارے ساتھ شریک ہو کر ہماری ہمت افزائی کی ہے اور خاص طور پر عالی جناب گورنر صاحب اور عالی جناب بخشی صاحب کے لئے ہم سراپا سپاس ہیں کہ اپنے معروف ترین اوقات میں سے ہمارے لئے وقت نکالا اور ہماری عزت بڑھائی۔

آندھرا پردیش کے اہل اردو اس کو اپنی خوش قسمتی سمجھتے ہیں کہ اس کی گورنری پر شری بھیم سین سچر جیسے اردو و فارسی کے دلدادہ فائز ہیں اور ہمارے تمام جلسوں اور تقریبات میں شرکت فرما کر اپنے مشفقانہ اور ہمدردانہ برتاؤ سے ہم کو اپنا گرویدہ بنا لیتے ہیں۔ واقعہ یہ ہے کہ ان کے عہد حکومت نے حیدرآباد کی اردو دنیا کے حوصلے اور ولولے بڑھا دیئے۔

عالی جناب بخشی غلام محمد صاحب ایک ایسے علاقے کے وزیر اعظم ہیں جہاں کی سرکاری زبان اردو ہے اور آج ایک ایسے علاقے کے مرکزی اردو ادارے کے افتتاح کے لئے تشریف فرما ہوئے ہیں جس کو پورے ہندوستان میں یہ شرف حاصل ہے کہ اردو یہاں کی ایک علاقائی زبان مان لی گئی ہے۔ اس طرح کشمیر اور آندھرا پردیش کے آپس میں ایک ایسا رشتہ مواخاۃ قائم ہو گیا ہے جس میں تجارت کا

نی اور علاقہ شریک ہونے کا دعویٰ نہیں کر سکتا۔ اسی لئے اگر حکومت کشمیر نے ادارے کو امداد جاری کی ہے اور آئندہ اس میں اضافہ کرے گی تو یہ
ئی تعجب کی بات نہیں۔ دکنیوں اور کشمیریوں دونوں پر اب اردو کلچر کے تحفظ و ترقی کی ذمہ داری عائد ہوگئی ہے اور مقام مسرت ہے کہ دونوں کو
ن کا احساس بھی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ کشمیر جنت نظیر کے گل سرسبد بخشی غلام محمد صاحب ہزاروں میل کی زحمت سفر برداشت کرکے ایوان اردو
نے افتتاح کے لئے تشریف فرما ہوئے ہیں۔ مجھے یقین ہے کہ آج کی یہ تقریب کشمیر اور حیدرآباد کے درمیان ایک عقد مواصلت ثابت
ہوگی اور ہم دونوں ہمیشہ کے لئے ایک دوسرے کے دکھ درد کے ساتھی اور ہمراز و ہمکار بن جائیں گے۔

بقیہ سلسلہ صفحہ ۳۳۲

امر واضح کرنا تھا کہ صرف یہ سہ روزہ یوم محمد قلی قطب شاہ منانا ہی ہمارا اصلی کام نہیں ہے۔
اس تقریب کے بانی نواب زین یار جنگ مرحوم کے مخلصانہ خدمات کا ذکر کئے بغیر میں اپنی یہ تقریر ختم نہیں کرونگا
میں سے اکثر احباب نے ان کو حالت علالت میں بھی اس تقریب کا انتظام کرتے اور ہماری رہنمائی کرتے ہوئے ابھی تھوڑے
دیکھا ہے۔ انسان گزر جاتے ہیں مگر ان کی خوبیاں اور خدمات باقی رہ جاتی ہیں اور بھلائی نہیں جا سکتیں۔ وہ ان
صوصیات کا ایک مجسمہ تھے جو عہد محمد قلی قطب شاہ سے حیدرآباد کے خاص خاص خدمت گزاروں میں جلوہ گر رہی ہیں۔
داری، محنت، خدمت، شرافت اور اخلاق ان کی زندگی کا مطمح نظر تھے اور یہی وہ خوبیاں ہیں جن کی تقلید
نئی آندھرا پردیش کے ہر فرد کو سعی کرنی چاہیے تاکہ یہ روایت باقی رہے اور ایک چراغ سے دوسرا چراغ اسی طرح
شن ہوتا چلا جائے۔
آخر میں جناب چیف منسٹر صاحب اور آپ سب خواتین و حضرات کا اس افتتاحی تقریب میں شرکت کرنے اور
اری ہمت افزائی کرنے کے لئے دلی شکریہ ادا کرتا ہوں اور اسی جذبہ شکر گزاری کے ساتھ ہم ہر سال یہاں
پ کا خیر مقدم کرتے رہے ہیں اور کرتے رہیں گے۔

خیر مقدمی تقریر

بتقریب یوم محمد قلی قطب شاہ

—— ۱۹۶۲ء ——

پانچ سال گزر گئے جب کہ گولکنڈے کے اس تاریخی چبوترے پر اہل حیدرآباد نے اپنے شہر کے اس عظیم المرتبت اور اردو زبان کے پہلے صاحب دیوان شاعر کی یاد منانے کی ٹھانی تھی اور اس امر کا تہیہ کیا تھا کہ تین سو سال سے اردو اور آندھرا کے اس سب سے بڑے محسن کو بھولے رہنے کی غلطی کا اس انداز سے تدارک کریں گے کہ حسب زندگی اور زندہ دلی، مشترکہ معاشرت اور رواداری کی روایتیں پھر سے تازہ ہو جائیں ۔

یہ بڑی خوشی اور اطمینان کی بات ہے کہ ہم نے اس اثنا میں محسوس کرا دیا کہ اہل حیدرآباد ایک: کلچر اور طرزِ معاشرت اور ذہنی ارتقا کے مالک ہیں جس کو گردشِ دوراں اور فتنۂ زماں دبا تو سکتا ہے مٹا نہیں سکتا۔ یہ ہم جانتے ہیں کہ

زمانہ دگر گونہ آئیں نہاد

لیکن یہ بھی ہم جانتے ہیں کہ باہمی میل جول، محبت اور رواداری، شرافت اور اخلاق کی جو قدریں، قطب شاہ کے دور سے اس ملک کے رہنے بسنے والوں کی رگ و پے میں سرایت کر گئی ہیں وہ سیاست کی نظروں اور سماج کے بگڑے ہوئے تیوروں کے باعث رفتہ رفتہ دھندلے پڑ سکتے ہیں مگر کوئی طرح مل نہیں کر دئے جا سکتے اور چونکہ اکثر قدیم قدروں اور قیمتوں میں تبدیلی ہو رہی ہے اور زمانہ کے اقتضا سے ہم کو اپنی یہ کوشش جاری رکھنی چاہئے کہ جو اعلیٰ قدریں ہم کو وراثت میں ملی ہیں ان کو باقی رکھیں اور اس شہر کے اور پورے آندھرا پردیش کے رہنے بسنے والوں کے مستقبل کو سنوارنے میں کام لیں ۔

آج آندھرا پردیش کی موجودہ حکومت کے وزیروں اور عہدہ داروں اور ارباب سیاست کو یہ معلوم اس ملک کے سابق حکمرانوں نے عوام کی زبان اور مذہب کے ساتھ نہ صرف رواداری بلکہ فیاضانہ سرپرستی کا تھا اور ہر کامیاب اور روشن خیال حکومت کا فرض ہے کہ اس روایت کو نہ صرف جاری رکھے بلکہ اگر وہ اپنی اور کامرانی کو برقرار رکھنا چاہتی ہے تو اس میں اضافہ بھی کرے ۔

آپ حضرات یہ معلوم کر کے خوش ہوں گے کہ ادارہ ادبیات اردو ہر سال یوم محمد قلی قطب شاہ صرف نمو یا ذوق تماشہ یا شوق ہنگامہ کے تحت نہیں مناتا آیا ہے ۔ اس کی ہر سالانہ تقریب کسی ٹھوس اور دیرپا علمی و ادبی یادگاروں کا نقطۂ آغاز بنتی ہے ۔ چنانچہ یہاں ہر سال میں اپنی خیر مقدمی تقریر میں ان گوناں

تذکرہ کرتا آرہا ہوں۔ سال حال بھی اس سلسلے میں مجھے بہت کچھ کہنا ہے مگر میں بہت کم کہوں گا۔ بہتر یہی معلوم ہوتا ہے کہ کم کہا جائے اور زیادہ کیا جائے۔ اگر آپ خواتین و حضرات میں سے کسی نے اس سال ایوان اردو ملاحظہ نہیں فرمایا ہے تو صرف اتنا عرض کروں گا کہ سال میں ایک بار آپ ضرور اس کو دیکھ لیں تو معلوم کریں گے کہ دکن کے تاریخی و تمدنی آثار میں ایک "یوم محمد قلی" کے بعد سے دوسرے "یوم محمد قلی قطب شاہ" تک ہماری تہذیب معاشرت کے نوادر کا کتنا گراں بہا اضافہ اس میں ہوتا ہے۔ آخر اس مختصر سے وقت میں ان بیش بہا نوادر کی میں کتنی تفصیلات آپ کے ملاحظہ میں پیش کرسکوں گا جن میں ہر روز وہاں اضافہ ہو رہا ہے اور اب تک اپنے منہ میاں مٹھو بنتا رہوں گا اور پھر ع

شنیدہ کے بود مانند دیدہ

اس لئے صرف اتنا عرض کروں گا کہ گزشتہ سال ایک مبسوط تذکرہ "نوادر ایوان اردو" چھپا تھا اور اس اثنا میں اتنا اور گنجینۂ گراں بہا زیادہ تر نواب عنایت جنگ بہادر کی توجہ سے جمع ہو چکا ہے کہ اب اس کی دوسری جلد ترتیب دی جارہی ہے جو جلد چھپ جائے گی۔ اہل علم و فضل اس خبر سے خوش ہوں گے کہ قطب شاہی عہد کی فارسی تاریخوں کی طباعت کا سلسلہ شروع ہوچکا ہے۔ چنانچہ "حدیقۃ السلاطین" چھپ چکی ہے جس کا اجرا آج کے مہمان خصوصی چیف منسٹر صاحب کے ہاتھوں عمل میں آرہا ہے۔ عہد ابوالحسن تاناشاہ کے ایک فارسی تذکرے "حدائق السلاطین" کی چھپائی کا انتظام بھی ہوچکا ہے اور "تاریخ محمد قطب شاہی" اور "مکتوبات سلاطین قطب شاہیہ بنام سلاطین مغلیہ و ایران" کی طباعت کا کام بھی شروع ہونے والا ہے۔ یہ تو فارسی زبان کا قدیم تاریخی و سیاسی ادب ہے۔ ضرورت تھی کہ سنسکرت اور تلگو ادب میں قطب شاہوں کے بارے میں جو کچھ لکھا گیا تھا اس کی بھی چھان بین کی جائے اور اس کو مرتب کرکے شائع کیا جائے۔ چنانچہ اب ڈاکٹر بی۔ رام راجو سے اس موضوع پر ایک مقالہ انگریزی زبان میں لکھوایا جارہا ہے اور خود تلگو زبان میں "قطب شاہوں کی خدمات آندھرا تمدن" پر ایک کتاب ان ہی سے مرتب کراکے چھپوائی گئی ہے۔ اس کا رسم اجرا بھی آج شری کا سنجیویا انجام دیں گے۔ اس کے ساتھ ہی انگریزی میں بھی اسی موضوع پر ایک کتابچہ شائع ہو رہا ہے۔

محمد قلی قطب شاہ کے اردو دیوان کو ناگری رسم الخط میں چھپانا بھی ضروری تھا تاکہ ارباب ہندی اس سے استفادہ کریں اور محسوس کریں کہ محمد قلی قطب شاہ نے سہل اور پاکیزہ ہندی کا کیا عمدہ معیار قائم کیا تھا۔ حیدرآباد کی ہندی پرچار سبھا کے تعاون کے ساتھ یہ کتاب بھی ہندی رسم خط میں اب چھپ گئی ہے اور آج ہی اس کی اشاعت بھی عمل میں آرہی ہے۔ یہ تو قطب شاہ اور اس کے عہد سے متعلق فارسی۔ تلگو۔ سنسکرت۔ ہندی اور انگریزی زبانوں میں علمی اور تحقیقاتی کاموں کی تفصیل تھی۔ خود ادارہ میں اداروں نے اب تک ایک درجن سے زیادہ کتابیں اس موضوع پر شائع کی ہیں۔ اور یہ سب مطبوعہ اور غیر مطبوعہ ادب اور قدیم مخطوطات اور دکن کی نقاشی۔ خطاطی۔ حکاکی۔ ہتھیار اور لکڑی اور پتھر کے اصلی کتبات اور ان کے

چہرلیے کل آپ ایوان اردو کی اس نمائش میں ملاحظہ فرمائیں گے جس کا افتتاح آندھرا پردیش کی ایک معصومہ بیگم صاحبہ صبح دس بجے فرما رہی ہیں۔

اس کے بعد ہی مسز روڈ امستری صاحبہ کی اور سہ پہر میں چار بجے ہمارے ڈپٹی چیف منسٹر شری رنگا ریڈ کی صدارت میں اس دور سے متعلق مختلف مضامین، مقالے اور نظمیں ایوان اردو میں سنائی جائیں ہماری ریاست آندھرا پردیش کی بڑی سرکاری زبان تلگو میں بھی گزشتہ سالوں کی طرح گرشاد لائبریری سلطان بازار میں پرسوں ۱۳ جنوری کو (۵) بجے شری ایے۔ کالیشور راؤ صاحب اسپیکر آندھ کی صدارت میں تلگو تقریریں اور مقالے سنائے جائیں گے۔ اور ان تمام کے مجموعے بھی ہر سال کی طرح اس بعد کو شائع ہوں گے۔ آخر میں اسی رات کے نو بجے ایک محفل شعر و سخن ایوان اردو میں منعقد ہوگی جس ریاست گجرات کے گورنر اور ہمارے ایک ہردلعزیز اور مقبول خواص و عوام لیڈر نواب مہدی نواز فرمائیں گے۔

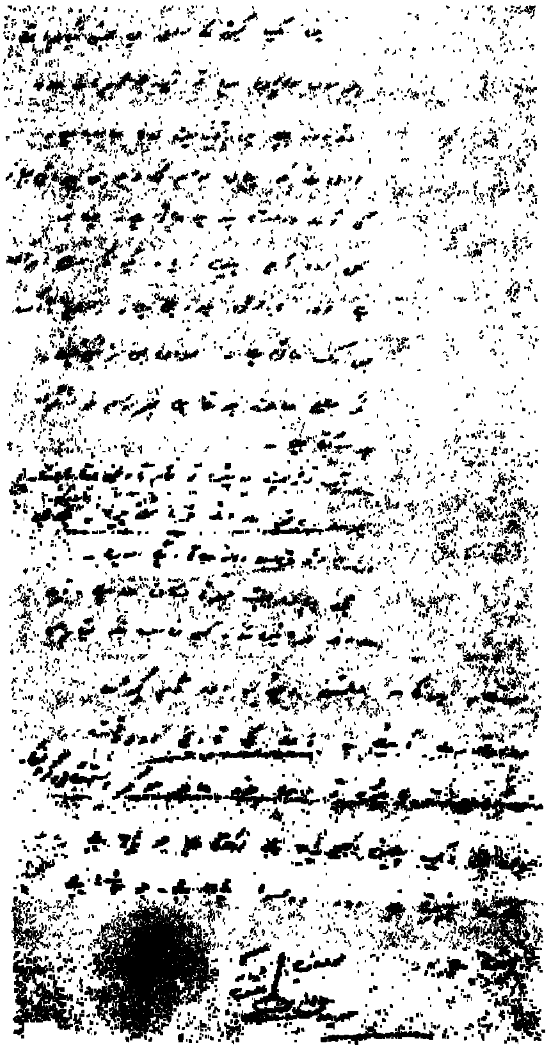
یہ ادارہ ادبیات اردو کے صرف ایک ہی شعبے مجلس اشاعت تاریخ و تمدن دکن کا کام ہے۔ کے ماہنامے "سب رس" کی خصوصی اشاعتوں، کتب خانہ کے مخطوطات اور مطبوعات کی توضیحی فہر سائنس اور دیگر علمی و ادبی موضوعوں پر ہر سال کتابیں چھپتی ہیں، ان کی تفصیلات میں یہاں بیان ادارہ اردو کی تعلیم کے لیے پڑھائی گھروں کو جو امداد دیتا ہے اور ہر سال اردو کے جو امتحانات مختلف پر منعقد کرتا ہے اس کا ذکر بھی آج کی اس تقریب میں غیر ضروری ہے۔ البتہ اس واقعہ کی اطلاع ضرو کہ اس سال سے ایک شعبۂ اشاعت ادبیات کشمیر کا آغاز کیا گیا ہے جس کے تحت پانچ کشمیری شاعروں ا کی کتابیں چھپ رہی ہیں۔ آپ یہ معلوم کرکے خوش ہوں گے کہ حکومت کشمیر ادارے کو مناسب مالی امد رہی ہے۔

ادارہ کا ترجمان ماہنامہ "سب رس" گزشتہ چوبیس سال سے برابر پابندی سے چھپ رہا ہے اور کے بلند پایہ رسائل میں شمار ہوتا ہے۔ ادارے نے گزشتہ یوم محمد قلی کے بعد سے دکن کے ایک دوسرے قدیم تا بیجاپور کے صاحبان کمال کی طرف بھی توجہ کی ہے چنانچہ وہاں کی ایک اردو نثر کی کتاب کلمۃ الحقایق مولفہ برہان الدین جانم اور بیجاپور کے نابینا شاعر ملا ہاشمی کا ضخیم دیوان ریختی بھی مرتب کراکے چھپوا دیا ہے۔

شہر ناندیڑ کی ایک تاریخ اور شعرائے اردو کا اورنگ آبادی تذکرہ تحفۃ الشعراء بھی چھاپ دیا ہے جدید انشاپردازوں کے مزاحیہ مضامین اور افسانوں کے مجموعے ٹھنڈی بجلیاں اور نیل کنول مسکائے ہو گئے ہیں۔ ان کے علاوہ حیدرآباد میں ہر مذہب و ملت کی جو عبادت گاہیں ہیں، ان کا ایک تذکرہ مرتب اور اس شہر کے صوفیائے کرام اور ان کی زیارت گاہوں پر ایک مبسوط کتاب لکھائی ہے۔ سلطنت گولکنڈے جغرافیہ اور دکن کی سماجی اور تمدنی تاریخ بھی قلمبند کرائی گئی ہے۔ یہ سب کام گزشتہ ایک سال میں مکمل ہو اور توقع ہے کہ ان میں سے بعض آئندہ یوم محمد قلی قطب شاہ تک شائع بھی ہو جائیں گے۔ قصہ مختصر اس

بقیہ سلسلہ صفحہ

ڈاکٹر زور
کے
خطوط



آخری مکتوب

ڈاکٹر زور بنام ہارون خاں شروانی

(۲۲ - ستمبر ۱۹۶۲ء)

بنام ڈاکٹر گوپی چند نارنگ

ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور سرزمین دکن کے انمول رتن تھے۔ موت نے ان چند برسوں میں اردو علم و ادب کے جو چراغ بجھائے ہیں ان میں اس چراغ کی خاص اہمیت تھی۔ اس کی روشنی سے اگر ایک طرف حیدرآباد کی محفلوں میں اجالا تھا تو دوسری طرف کشمیر میں بھی اردو سے محبت کی ایک نئی کرن پھوٹ رہی تھی۔ ڈاکٹر زور کی خدمت میں مجھے پچھلے دس برس سے نیاز حاصل تھا۔ رفتہ رفتہ یہ تعلقات اس قدر پختہ ہو گئے تھے کہ دوسرے چوتھے ہفتے ایک دوسرے کی خیریت کی اطلاع نہ ملتی تو پریشانی ہوتی۔ ان کے اچانک انتقال سے یوں معلوم ہوتا ہے کہ مجھ پر دعا و شفقت کا دروازہ ہمیشہ کے لئے بند ہو گیا۔ ان چند برسوں میں ان کے دو ڈھائی سو خط میرے نام آئے ہوں گے۔ لیکن امریکہ کے سفر کی وجہ سے مجھے اتنی مہلت نہ مل سکی کہ دل جمعی سے ان سب کو تلاش کرتا اور ان کا انتخاب پیش کرتا۔ یہ چند خطوط ادھر ادھر سے جمع کر کے الگ کر آیا تھا۔ ان کی نقل جناب ہربنس لال نے فراہم کی ہے، جس کے لئے ان کا ممنون ہوں۔

ان چند خطوط سے بڑی توقعات وابستہ نہیں کرنا چاہیے۔ ایک ادیب کے نجی لمحات کی تصویریں ہیں ۔۔۔ باتیں ہیں عام زندگی کی، دکھ سکھ کی، کاروبار شوق کی اور سفر و حضر کی۔ الفاظ کی چولیں بٹھانے یا نگینہ کاری کرنے کی انہیں نہ تو فرصت تھی اور نہ وہ اس کے قائل تھے۔ بے تکلف باتیں کرتے اور قلم برداشتہ لکھتے تھے۔ جو صاف گوئی، سادگی، بے باکی اور دلآویزی ان کی شخصیت میں تھی، وہ ان خطوط میں بھی ملے گی۔ جن لوگوں نے ڈاکٹر زور مرحوم کو قریب سے دیکھا ہے وہ جانتے ہیں کہ ان کی وضعداری میں بے نیازی کی ایک خاص آن تھی۔ وہ نہ کسی سے مرعوب ہوتے تھے، نہ مرعوب کرنے کی کوشش کرتے تھے۔ اچھے خاصے تن و توش کے وجیہہ و شکیل انسان تھے، اس لئے دوسروں کو دبا کر کے اپنی وقعت بڑھانے کا "شیوہ" انھوں نے کبھی اختیار ہی نہیں کیا۔ چھوٹوں بڑوں سے ان کا برتاؤ نہایت محبت کا تھا۔ ہنس مکھ شخص تھے، کبھی کبھی شوخی و شرارت سے بھی کام لیتے تھے۔ دو ایک خطوں میں اس کی ہلکی سی جھلک بھی ملے گی۔ آخری خطوں میں انھوں نے اپنے جس مجموعے کی ترتیب کا بار بار ذکر کیا ہے، وہ زیر طبع ہے، اور عن قریب شائع ہوگا۔ ان شاءاللہ۔ یہ مجھ سے ان کی آخری فرمائش تھی۔

(نارنگ۔ امریکہ)

رفعت منزل، خیریت آباد، حیدرآباد (۱) ۲ "

فارنگ صاحب۔ آپ کے دو خط آئے تھے۔ میں ادھر کئی روز سے بیمار ہوں۔ انفلوئنزا کا سخت حملہ ہوا تھا۔ ا
مگر کمزوری باقی ہے۔ کل اڈیشنل سکریٹری رندھاوا صاحب میرے یہاں چاء پر مدعو تھے۔ ادارہ دیکھ کر بہت خوش ہوئے۔
کی کمیٹی ہے۔ کوشش کر رہا ہوں کہ یہاں سے ۲ فروری کو نکلوں۔ اسٹیشن پر ریٹائرنگ روم کے لئے تار کردوں گا۔ ایک رات رہ
کا ارادہ ہے۔ یہیں سے واپسی کے لئے ریزرو کرانے کا خیال ہے تاکہ آپ کو زحمت نہ ہو۔ البتہ آپ یکم فروری کو
آپ کے کاغذات بھی لیتا آؤں گا۔ عرشؔ صاحب اور آزادؔ صاحب کو مطلع کردیجئے۔ اب کے بھاگ دوڑ نہ ہو سکے گ
ہوگیا ہوں۔ صرف آب و ہوا کی تبدیلی کے لئے آرہا ہوں۔ طبیعت یہاں بحال نہیں ہو رہی ہے۔ بہت پریشان
کی رسید دیجیے تاکہ یقین ہو کہ آپ کو مل گیا۔ آزادؔ صاحب کو لکھا تھا مگر جواب نہیں آیا۔ کیا بہت مصروف ہیں۔ مخلص
سید محی الدین

(۲)

۲۶ جولائی ۵۰ء عزیز مکرم

آپ کے خط سے بڑی تسکین ہوئی۔ آپ نے زحمت فرما کے جملہ استفسارات کا جواب دیا۔ بہت شکریہ۔
پاؤں میں اب بھی درد ہے اور ایک طرح کا عذر لنگ پیدا ہوگیا ہے، میں اچھا ہوں۔ انسان بڑا سخت اور بے غیرت وا
ہر حالت میں کام کئے جاتا ہے، اور میں تو اپنے کو مزدور سمجھتا ہوں۔ یہ حال کئے جاتا ہے اور کرتا رہتا ہوں۔ تذکرہ شائع ہو
آپ کو بھی ملے گا۔ آپ کا مضمون میں نے ابھی نہیں دیکھا۔ سب رس بھجواتا ہوں۔ دو ماہی ہوگیا ہے۔ مئی جون کا نکلا تھا۔ ا
کا نکلے گا۔ عرشؔ صاحب کا خط آیا تھا۔ مضمون کی نقل بھجوادی ہے۔ آج آزادؔ صاحب کا بھی خط آیا ہے اور خوش خبر
سمندر سے شبنم ملنے والی بات ہے۔ گذشتہ سال ہی کی رقم منظور ہوئی۔ حالانکہ اس سال کے موازنے میں بھی خسارہ
آزادؔ صاحب کا شکریہ ادا کردیجئے۔ اشفاق صاحب کا پتہ لکھئے تاکہ ان کو بھی لکھ سکوں۔ عرشؔ صاحب کمیٹی کب
تاکہ پہلے سے پروگرام بنا سکوں۔ مخلص
سید محی الدین قادری زورؔ

(۳)

یکم مئی ۱۹۵۸ء

محب مکرم

میں آپ کا پتہ بھول گیا۔ آپ نے بھی خط نہیں لکھا۔ آخر ڈاکٹر فاروقی صاحب کو لکھا کہ پتہ لکھیئے۔ آپ کا پی ایچ
پاس آیا تھا۔ اس کو پڑھ کر آپ کی لیاقت، محنت اور عزت میری نگاہ میں بڑھ گئی ہے۔ بڑی خوشی ہوئی۔ آپ نے
ہے۔ یہ اس قابل ہے کہ فوراً شائع کی جائے۔ اور اس اہم کام پر آپ کو انعام بھی ملے، ڈگری کے علاوہ۔ ہمارے یہاں مقا
انگریزی میں آتی ہے، وہاں کیا قاعدہ ہے۔ عرشؔ صاحب سے فون پر معلوم کیجئے کہ وہ ویزا کے سلسلے میں وزارت خار
ان کے جواب کا بے حد انتظار ہے۔ فاروقی صاحب سے معلوم ہوا ہے زبانی امتحان کی ضرورت نہیں۔ البتہ مئی میں
کا جلسہ ہے۔ آؤں گا اور بالمشافہ مبارک باد دوں گا۔ آزادؔ صاحب کو میرا خط ملا یا نہیں؟
مخلص
سید محی الدین قادری زورؔ

(۴)

اگست ۱۹۵۸ء ۔ محب مکرم

رات یونی ورسٹی کا تار آیا کہ ۲۰ کو کمیٹی ہے۔ پہلے دن فاروقی صاحب کے یہاں رہوں گا۔ وضعداری کا تقاضا ہے۔ آزاد صاحب کا دن میرے لئے محفوظ رکھیں۔ ان کے روپ صورت والے دوست سے وزارت تعلیم میں ملنا ہے۔ آپ کو اطلاعاً لکھ رہا ہوں۔

مخلص زور

(۵)

ستمبر ۱۹۵۸ء عزیز مکرم

بڑی خوشی ہوئی کہ ڈاکٹریٹ کا اعلان ہو گیا۔ اب آپ کے روشن مستقبل کا آغاز ہو گیا ہے۔ ڈاکٹر گوپال ریڈی کو بھی یہ خبر سنائیے۔ یا خوش ہوں گے کیونکہ آپ کے قدردان ہیں۔ ان سے ملیں تو کہئے کہ آندھرا گورنمنٹ ادارے کی عمارت کے لئے مدد دے رہی ہے۔ انھوں نے شرط لگائی تھی کہ آندھرا دے تو حکومت ہند دوسری قسط دے گی۔ مثل انھیں کے پاس رکھی ہوئی ہے۔ آپ مل کر کہئے کہ اردو دنیا کی نظریں ادارے کی عمارت کی طرف لگی ہوئی ہیں۔ اس کا جلد مکمل ہونا ضروری ہے۔ حکومت ہند سے ۲۵ ہزار کی علاوہ رقم کا جاری ہونا ضروری ہے، وغیرہ۔ آپ ان سے جلد ملئے۔ آپ کی گفتگو کا اثر ہوگا۔ مخلص

سید محی الدین قادری زور

(۶)

اپریل ۱۹۵۹ء ۔ عزیزی نارنگ صاحب! گذشتہ بار دہلی آنے سے پہلے میں نے آپ کو اور میر حسن کو ایک ساتھ خط ڈالے۔ میر حسن سے ملاقات ہوئی، آپ سے نہیں۔ میں نے خیال کیا آپ دہلی میں نہیں ہیں۔ میں ۲۲ اپریل کو دلی آ رہا ہوں۔ شاید بیگم صاحبہ بھی ساتھ آئیں۔ اپنی لڑکی سے ملنے بشوق جانا چاہتی ہیں۔ ۲۲ کو یونی ورسٹی میں پی۔ ایچ۔ ڈی کا زبانی امتحان ہے۔ آپ کو علم ہوگا۔ باقی بالمشافہ۔ آزاد صاحب آپ کے عدم وجود سے ناواقف تھے۔ عرشی صاحب سے بھی پوچھا۔ ہر ایک سے پوچھا۔ آخر یہی خیال ہوا کہ آپ دہلی میں نہیں۔

سید محی الدین قادری زور

(۷)

۱۹۵۹ء محب مکرم

کارڈ اور فارم مل گیا۔ آزاد انسٹی ٹیوٹ پر آپ کا مضمون کب چھپ رہا ہے۔ یاد دہانی کرا دیجئے۔ خدا کرے یونی ورسٹی میں آپ کا انتخاب ہو جائے تو آپ اطمینان سے کام کر سکیں۔ آپ دہلی میں ادارۂ ادبیات اردو کے سفیر ہیں۔ "سب رس" کی مجلس ادارت میں آپ کا شامل کر رہا ہوں۔

مخلص سید محی الدین قادری زور

(۸)

ستمبر ۱۹۵۹ء عزیزی ڈاکٹر نارنگ۔ آپ کا کرم نامہ ملا۔ بڑا افسوس ہوا کہ آپ نے دو گھنٹے اسٹیشن پر زحمت فرمائی۔ میں نے فاروقی کو اطلاع دے دی تھی کہ نہ آسکوں گا۔ معلوم ہوتا ہے وہ آپ کو نہیں بتا سکے۔ اس زمانے میں خانقاہ میں عرس تھا اور میرا موجود رہنا ضروری تھا۔ عرشی صاحب سے کہئے کہ کبھی تو لکھیں۔ عجیب اتفاق ہے کہ اب کے انھوں نے نہیں لکھا اور میں نہیں آسکا۔ جب وہ خود نہیں آتے تو آنا ہو ہی جاتا ہے۔ کرپلانی صاحب فرانس سے واپس ہوئے یا نہیں؟ آپ حیدرآباد کب آ رہے ہیں؟ آجکل قاضی عبدالودود پٹنہ سے یہاں آئے ہوئے ہیں۔ خلیق انجم کے دوست اسلم صاحب اب کیا کر رہے ہیں۔ اگر معلوم ہو تو مطلع کریں۔

مخلص، سید محی الدین قادری زور

(۹)

فروری ۶۰ء محب مکرم

ساہتیہ اکادمی کی کونسل میں شرکت کے لئے ۱۳ فروری ہفتہ کی صبح دہلی پہنچ رہا ہوں۔ ۱۵ فروری کو آپ کے لئے خریداری کرنا ہوگی۔

اور اسی روز واپسی ہے۔ تذکرہ جلد پنجم اور معانی سخن وغیرہ آپ کے لئے لا رہا ہوں۔ چند جلدیں وہاں کتب فروشوں کو بھی دوں گا۔ اتوار کے دن فرصت ہے۔ کوئی ادبی یا سیاحتی منصوبہ بنا کر رکھئے۔

مخلص سید محی الدین قادری زور

(۱۰)

۷ مئی ۶۰ء محب مکرم

آپ کے خط ملے تھے۔ میں خود جواب نہ دے سکا۔ دفتر سے وقار خلیل نے جواب دیئے تھے۔ آج ذرا فرصت ملی تو آپ کو خط لکھ رہا ہوں۔ آپ حیدرآباد آنے والے تھے۔ کب ارادہ ہے۔ حیدرآباد ضرور دیکھنا چاہیئے۔ آج کل چھٹیاں ہوں گی۔ کیا مصروفیت ہے؟ میں مئی میں لاہور جانے والا تھا، مگر گرمی کی شدت سے ارادہ ملتوی کر دیا۔ یوں بھی ایوان اردو کے ابھی بہت سے کام ترتیب وغیرہ کے باقی ہیں ان میں مصروف ہوں۔ آج کرپلانی صاحب اور حسن ثانی نظامی صاحب بھی آئے تھے۔ شام کو اقبال اکیڈیمی کی جانب سے یوم اقبال منایا گیا۔ افتتاح گورنر کیرالا ڈاکٹر کرشنا راؤ نے کیا۔ بہت بڑا مجمع تھا۔ وہاں کے حالات سنائیے۔

مخلص۔ سید محی الدین قادری زور

(۱۱)

۳۱ اگست ۱۹۶۰ء محب مکرم

آپ کا خط مورخہ ۲۰ اگست ملا اور روشن صاحب کی غزل بھی۔ شکریہ۔ تعجب ہے کہ میرے خط آپ کو نہیں مل رہے۔ سہیل صاحب کو آپ نے لکھنے کے لئے فرمایا ہے مگر ان کا پتہ نہیں لکھا۔ پتہ لکھئے کہ میں ان کو خط لکھوں۔ کشمیر کا ابھی کچھ معلوم نہیں۔ آزاد صاحب کا نوٹ PEN نہیں دیکھا یہ ادارے میں نہیں آتا۔ اب وہ کیونکر نظر سے گذرے۔ آپ سب رس کے لئے جو دلچسپی لے رہے ہیں، اس کے لئے شکر گذار ہوں۔ اس کی توقع تھی۔ یہ ترقی کر رہا ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ ہر ماہ کا پرچہ اسی مہینے کی ۱۰ تاریخ تک نکل جائے۔

مخلص سید محی الدین قادری زور

(۱۲)

۱۴ اکتوبر ۶۰ء محب مکرم

آپ کہاں ہیں۔ میں نے پہلے بھی ایک کارڈ لکھا تھا، جواب ندارد۔ ساہتیہ اکادمی کو رسید دستخط کر کے بھیج دی تھی مگر ابھی تک چیک نہیں آیا۔ رسید وصول کر لی اور چیک غائب۔ آزاد صاحب کا بھی کوئی خط نہیں ملا۔ آپ آج کل کیا کر رہے ہیں اور کہاں رہتے ہیں مطلع کیجئے۔

مخلص سید محی الدین قادری زور

(۱۳)

۲۶ ستمبر ۶۰ء محب مکرم

آپ کے ۱۷، ۲۰ اور ۲۱ ستمبر کے خطوط پیش نظر ہیں، شکر گذار ہوں۔ کرپلانی صاحب کے بیانات سے معلوم ہوا کہ اب دسمبر میں آپ سے ملاقات ہوگی۔ رہا کشمیر کا معاملہ۔ وہاں تو مکمل سکوت ہے، کوئی مراسلہ یا خط آئے تو غور کروں۔ آزاد صاحب کا خط اب تک نہیں آیا۔ ان سے کہئے کہ مجھ سے مراسلت نہ رکھیں گے تو دوسری جگہ سے مراسلت بند کرا دوں گا۔ آپ کے نئے کام کی خبر سن کر خوشی ہوئی۔ پہلے کسی کتاب کے زیر اشاعت ہونے کا ذکر تھا، وہ اب تک چھپی یا نہیں؟

مخلص

سید محی الدین قادری زور

(۱۴)

ب مکرم

ب ہو۔ آپ کا خط ملا اور اس کے دوسرے روز چیک بھی آگیا۔ اس کے لئے جو زحمت ہوئی۔ شکر گذار ہوں۔ آزاد صاحب
ا وہ کسی سے مس نہیں ہوتے۔ حالانکہ ان کے دوست کے کامیاب آپریشن کی اطلاع بھی ان کو دی ہے اور ان کا
رہتا ہوں۔ منسٹری آف کلچرل افیئرس سے معلوم کرائے کہ ان سائیکلوپیڈیا کی گذشتہ سال کی باقی امداد اور سال رواں
نہیں ملی۔ کام رکا پڑا ہے۔ آزاد ریسرچ انسٹی ٹیوٹ کی امداد بھی جاری نہیں ہوئی۔ جلد کچھ کرائیے۔ ورنہ یہ بے موت مرجائے
کھنا پڑے گا۔ ادارۂ ادبیاتِ اردو کو گذشتہ سال ڈھائی ہزار روپے ملے تھے۔ امسال درخواست دی ہے کہ اس
ے اور گوپال ریڈی صاحب کو لکھا ہے کہ وہ کوشش کریں۔ آپ مل کر یاد دلا دیجئے۔ آپ کمیٹی میں سب جگہ گھومئے انہوں نے
۔ آپ وہاں ادارہ کے سفیر اور نمائندے ہیں۔ عرشی صاحب سے کہئے ۲۷ دسمبر کا جلسہ رکھیں۔ واپسی میں
ں شرکت کرنے کے لئے سب ایک ساتھ حیدرآباد آئیں گے۔ مخلص سید محی الدین قادری زور

محب مکرم

(۱۵)

رخہ ۲ جنوری ملا۔ میں یوم محمد قلی قطب شاہ کی تقریبات اور جھگڑوں سے ابھی فارغ ہوا ہوں۔ مصروفیت کی وجہ سے جلد
۔ کام کلا کی قیمت اتنی زیادہ معلوم نہ تھی۔ بعد میں اطلاع دوں گا۔ یا آکر خرید دوں گا۔ کشمیر والوں نے ابھی کچھ نہیں لکھا۔
انفرنس کے لئے دعوت دی ہے۔ ساہتیہ اکاڈمی کا اجلاس بھی ہونے والا ہے۔ اگر دونوں کے درمیان زیادہ دن نہ
ں گا۔ اب تو رخصت کا جھگڑا بھی نہیں رہا۔ منتظرِ جواب مخلص سید محی الدین قادری زور

محب مکرم

(۱۶)

یک خط لکھا تھا۔ اس کے بعد دعوت نامہ مل گیا۔ اب خدا کو منظور ہوا تو ۲۶ مارچ کو دہلی پہنچ جاؤں گا۔ انڈو پاکستان
لت کا خیال ہے۔ اور اس کی نمائش کے لئے ۱۹۴۷ء کے بعد کی مطبوعاتِ ادارہ لیتا آؤں گا۔ آپ وہاں متعلقہ انچارج
ہ۔ شاید تاباں صاحب ہیں۔ آزاد صاحب کا خط آیا تھا کہ اپریل میں ان کے محکمے کی جانب سے انیسویں صدی کے
ی نمائش ہو رہی ہے اگر وہ اپریل کے پہلے ہفتے میں ہو رہی ہے تو اس کے لئے ۱۹۰۰ء سے قبل کے بیسیوں اخبار و رسائل
۔ اگر دیر میں ہو رہی ہو تو فوٹو دیئے جا سکتے ہیں۔ آزاد صاحب کو مطلع کر دیجئے۔ اگر یہ خط وقت پر پہنچے تو جواب دیجئے۔
ی مات کو نکلوں گا۔ مخلص سید محی الدین قادری زور

مکرم

(۱۷)

خہ یکم مئی مل گیا اور مبارک باد کا تار بھی۔ شکریہ۔ شادی بخیر و خوبی انجام پائی۔ آپ آتے تو حیدرآباد کی ایک شادی بھی
حکام آئے ہیں۔ عید کے بعد نکلوں گا۔ ٹھیک تاریخ سے مطلع کر دوں گا۔ خوشی ہوئی کہ آپ لسانیات کے امتحان سے نمٹ گئے
ے ہیں۔ مخلص سید محی الدین قادری زور

عزیز مکرم

(۱۸)

ں سے سری نگر تک کا راست ٹکٹ لے لیا ہے۔ ۲۶ مئی کو یہاں سے نکل رہا ہوں۔ اور خدا کو منظور ہوا تو ۲۸ کو صبح
یا لکھوں۔ بہت مصروف ہوں۔ چالیس سالہ گھر چھوڑ کر نکلنا آسان نہیں ہے۔ بیگم صاحبہ بعد میں آئیں گی۔ مخلص
سید محی الدین قادری زور

(۱۹)

جون ۱۹۶۱ء۔ تلسی باغ (متصل سولنا) سری نگر۔ محب کرم

اب میں نئے مکان میں منتقل ہو گیا ہوں۔ پتہ درج ہے۔ براہ کرم اس پتے پر مراسلت کیجئے۔ میری بچیاں شنبہ ۱۷ جو، کو صبح یہاں سے حیدر آباد کے لئے نکل رہی ہیں۔ اگر زحمت نہ ہو تو پٹھان کوٹ سے آنے والی گاڑی پر پہنچئے اور انھیں حیدر آباد والی گاڑی پر سوار کرا دیجئے۔ سب رس کا ٹیگور نمبر تو اچھا نکلا ہے۔ مبارک ہو۔ آپ کے مساعی کی داد دیتا ہوں اور متوقع ہوں کہ اسی طرح جاری رہے گی۔ مصباح الدین شکیل صاحب، امید ہے آپ سے ملے ہوں گے۔ آپ ذرا تفصیل سے خط لکھا کیجئے تاکہ آپ کی معروفیات و دوست احباب کے حالات معلوم ہوتے رہیں۔ مخلص

سید محی الدین قادری زورؔ

(۲۰)

سری نگر ۱۴ر جولائی ۶۱ء۔ محب مکرم

میں گو رہا رہین ستم ہائے روزگار لیکن ترے خیال سے غافل نہیں رہا

اپنی مصروفیتوں اور پریشانیوں کے باوجود آپ کے پتے سے غافل نہیں ہوں۔ یہ اور بات ہے کہ کسی وقت غفلت میں کچھ دیر گیا ہوں۔ آپ کا وہ خط مجھے مل گیا تھا جس میں ارشد قدوائی کی ملاقات کا ذکر تھا۔ آج کل یہاں بڑی گرمی ہے ...... مخلص

سید محی الدین قا

(۲۱)

سری نگر ۴ر ستمبر ۶۱ء جناب نارنگ صاحب!

یہاں یہ خبر سن کر بڑی خوشی ہوئی کہ آپ ریڈر ہو گئے ہیں۔ اگر یہ سچ ہے تو میری دلی مبارک باد قبول فرمائیے۔ یہ شکوہ ہے کہ مجھے اس خوش خبری سے کیوں محروم رکھا۔ امید ہے کہ آپ کے گھر میں سب بخیریت ہوں گے۔ میں نے حیدر آباد سے ایک شکریہ نامہ بھیجا اس کی رسید بھی نہ ملی۔ مخلص

سید محی الدین قادری زورؔ

(۲۲)

۱۴ر ستمبر ۶۱ء عزیز مکرم سلمہٗ آپ کا خط ملا اور خوش خبری لایا کہ آپ انسٹیٹیوٹ کانفرنس میں شرکت کے لئے سری نگر آ رہے ہیں۔ آپ میرے یہاں ٹھیریں۔ جگہ چھوٹی سی ہے۔ مگر مسافرت کے عالم میں گذر جائے گی۔ کوشش کروں گا کہ آپ کی بیگم اور بچہ کو کوئی تکلیف نہ ہو۔ آپ کو ہو تو ہو۔ یہاں کے شعبۂ اردو کی طرف سے اردو کی علمی و ادبی کتابیں شائع کرنے کی اسکیم پیش کرنا چاہتا ہوں۔ میں آپ سے مشورہ کروں گا۔ کشمیر یونیورسٹی میں آپ کو تقریر بھی کرنا ہو گی۔ مخلص

سید محی الدین قادری زورؔ

(۲۳)

۱۸ر نومبر ۱۹۶۱ء محب مکرم۔ آپ کا کرم نامہ مورخہ ۱۱ر نومبر ملا۔ شکر گذار ہوں کہ آخر آپ نے یاد فرمایا۔ مجھے افسوس ہے کہ آپ میرے یہاں باربار لکھنے کے باوجود نہیں ٹھیرے۔ شاید یہاں اتنی سردی نہ لگتی اور آرام سے رہ سکتے۔ میں پچھلے ہفتے جموں چلا گیا تھا۔ یکم نومبر سے یہاں کی سرکار اور دفاتر جموں منتقل ہو گئے ہیں۔ آج واپس آیا تو یہ خط ملا۔ راستے میں ایک ایک فٹ برف ہے۔ گاڑیاں پھسل رہی ہیں۔ ڈسمبر کے پہلے ہفتے میں نکلنے کا ارادہ ہے۔ دعا فرمائیے کہ خیر و عافیت سے یہ پل صراط پار کر سکوں۔ سخت سردی ہے۔ دلی آنے کے لئے نہ ہوائی جہاز میں سیٹ مل سکی نہ بس میں۔ ناچار بے بس ہو کر بیٹھ رہا۔ آپ سے شرمندہ ہوں۔ دیکھئے کب ملاقات ہوتی ہے۔ یہاں انتظامی معروفیات روز بروز بڑھ رہی ہیں اور سردی ان سے بھی زیادہ۔ آپ کی طبیعت کیسی ہے اور فرزند ارجمند کا کیا حال ہے۔ ہم سب خیریت سے ہیں۔

مخلص

(۲۴)

فروری ۶۲ء محب کرم نارنگ صاحب

حیدرآباد آنے کے بعد بے انتہا مصروف ہو گیا ہوں۔ آپ کو یہاں کے رسالے اور کتابیں مل ہوں گی۔ پرسوں ایک انگریزی کتابچہ بھی ہے۔ حسب خواہش کاغذ پر دستخط کر کے بھیج رہا ہوں۔ میں ۲۴ر فروری کو دہلی آرہا ہوں اور ۲۵ر کو صبح بذریعہ موٹر کار جموں کے لئے انہ ہو جاؤں گا۔ آپ کے لندن جانے کا کیا ہوا۔ معلوم ہوتا ہے آپ کا ہر بات راز میں رکھنا چاہتے ہیں۔ یکایک چلے جائیں گے اور بعد میں م ہوگا۔ میں بے حد مصروف ہوں۔ آپ اندازہ نہیں کر سکتے۔ مخلص

سید محی الدین قادری زور

(۲۵)

نگر ۲۸ر اپریل ۱۹۶۲ء مجی نارنگ صاحب

ایک خط پہلے لکھ چکا ہوں، ملا ہوگا۔ مجموعے کے لئے ایک اور مضمون بھیج رہا ہوں۔ اس کو بھی شامل کر لیجئے اور اطلاع بخشئے کہ کام کس منزل تک پہنچا۔ کتابت کتنی ہوئی؟ آپ کا مقدمہ تیار ہو گیا کہ نہیں۔ مجھے بھی تو دکھائیے۔ رومی اور اقبال والا مضمون بھی شامل یجئے اور یہ بھی۔ وہ مضمون آخر کہاں بھیجا ہے۔ مگر اس کی نقل رکھ لینی چاہیئے تھی۔ جواب کا منتظر مخلص

سید محی الدین قادری زور

(۲۶)

ی نگر ۰ر جون ۱۹۶۲ء۔ محب کرم

آپ کا کرم نامہ مورخہ ۲۶ مئی یہاں آیا تھا اور میں حیدرآباد اسی روز نکلا تھا۔ واپسی پر خط دیکھا۔ میں نے حیدرآباد میں ادارے ان سے اس کی اشاعت کا تصفیہ کرا لیا تھا۔ مگر اب پبلشرز راضی ہے تو وہیں شائع کرائیں۔ میں چاہتا ہوں کہ دلی کی طباعت ہو۔ ان کی طباعت کی بات کہیں اور نہیں آتی۔ یاد نہیں نسیم بک ڈپو نے چار سو ایک ایڈیشن کے دیئے تھے۔ اب یہ رقم ملے تو نصف آپ لے لیں۔ پ کا مقدمہ کہاں ہے۔ کیا یہ ہو سکتا ہے کہ کتابت طباعت دلی میں ہو اور اس کے اخراجات نسیم بک ڈپو ادا کرے اور کتابیں اٹھالے۔ نہ یہ لکھ کر دیکھئے اور کچھ رقم پیشگی کتابت اور کاغذ کے لئے منگوا لیجئے۔ میں آج ہی حیدرآباد سے آیا ہوں اور تھکا ہوا ہوں۔ آپ نے نہیں لکھا کہ میرا مضمون "اردو اور قومی یک جہتی" آپ کو ملا یا نہیں۔ اس مضمون کو شریک کر رہے ہیں یا نہیں۔ ہاں یہ بھی تو لکھئے آپ نے رتیب کیا رکھی ہے۔ مضامین کی جو ترتیب ہے اس کی نقل (یعنی فہرست) جلد بھجوائیے۔ مخلص

سید محی الدین قادری زور

(۲۷)

۲۲ر جون ۶۲ء محب مکرم زاد لطفہٗ۔ کرم نامہ مورخہ ۲۰ر جون کل شام کو ملا۔ بڑے انتظار میں تھا۔ خوشی ہوئی کہ آپ نے تفصیل سے ا۔ میں نے کل ہی تمکین صاحب کو لکھا ہے کہ آپ کو یاد دلائیں۔ ان کے لئے آپ نے ... بہت اچھا موضوع منتخب کیا ہے۔ بارک ہو کہ آپ اب اتنے دیدہ ور ہو گئے ہیں۔ اب نسیم بک ڈپو سے معاملہ کرنے کی ضرورت نہیں۔ میں چاہتا تھا کہ نقد رقم آپ کو اس محنت اور دوڑ دھوپ کے معاوضے میں ملے۔ جب آپ یہ نہیں لینا چاہتے تو پھر کتاب ادارے ہی کی طرف سے چھپے گی۔ میں نے شاید پہلے لکھا ہے کہ ختم مئی پر حیدرآباد گیا تھا تو ادارے کی مجلس انتظامیہ میں طے کر آیا تھا کہ میرا ایک مجموعہ آپ کی ادارت میں دہلی بلا چھپے گا۔ اس طرح اب کاغذ اور کتابت کے لئے کتنی رقم درکار ہوگی، فوراً لکھ بھیجئے۔ میں چیک بھیج دوں گا یا نقد۔ آپ نے اردو و ملی مضمون کو بھی شریک کرنے کے بارے میں پوچھا ہے۔ یہ مضمون آل کشمیر سے پہلے نقوش کے لئے لکھا تھا۔ چند روز ہوئے محکمہ زبان پٹیالہ نے خواہش ظاہر کی تھی کہ اردو، ہندی اور پنجابی پر ایک مقالہ لکھوں۔ چنانچہ اسی مضمون کو مناسب اضافے کے بعد ان کے یہاں بھیج دیا ہے۔ آپ چاہیں تو اس کی نقل بھیج دوں۔ ریڈیو کشمیر سے میری ایک تقریر "اردو شاعری میں انسان دوستی" اور ریڈیو حیدرآباد سے "ہندوستان محمد قلی قطب شاہ کی نظر میں

ہو رہی ہیں۔ آپ فرمائیں تو یہ دونوں بھیج دوں۔ اس دوران میں کئی اور مضمون لکھے۔ یعنی چند یادیں، بحر العلوم عبد القدیر صدیقی، عبد الرحمٰن خاں
کیا ان کی نقلیں آپ کو ملیں؟ کون کون سے مضمون آپ کے یہاں ہیں؟ اگر زحمت کرکے فہرست بھیج دیں تو عنایت ہوگی اور مذکورہ مضمونوں
میں سے جس کی نقل کی ضرورت ہو یا جس کو آپ شامل کرنا چاہیں، اس کا نام لکھ بھیجیں۔ وہ بھی بھیج دوں گا۔ آپ کے دوست غلط کہتے ہیں
میں نے ۱۹۳۰ء میں ہندوستانی لسانیات لکھی تھی۔ اور اس میں پہلی بار اکثر و بیشتر لسانیاتی اصطلاحوں کے ترجمے کئے تھے۔ اس کے بعد ۱۹۴۲ء
میں اردو انسائیکلوپیڈیا کی ترتیب کے سلسلے میں لسانیاتی اصطلاحیں مرتب کرکے ماہرین کو بھجوائی تھیں۔ ڈاکٹر عبد الستار صدیقی اور ڈاکٹر
سدھیشور ورما نے ان کی توثیق کی تھی اور مشورے دیئے تھے۔ آپ کے مقدمہ کا انتظار ہے۔ محمد بن عمر کی کتاب آپ کے پاس ہے
یا نہیں؟ اردوئے معلیٰ کے دو آف پرنٹ مل چکے ہیں۔ اگر کچھ اور ہوں تو بھجوائیے۔ اور کیا لکھوں، آپ تو بہت مصروف رہتے ہیں؟
اور میں جب سنتا ہوں دعا کرتا ہوں۔

مخلص

سید محی الدین قادری زورؔ

ڈاکٹر سید محی الدین قادری زورؔ کی المناک وفات نے برصغیر کی علمی اور ادبی بساط سے ایک جید عالم محقق اور ادیب کو اٹھا لیا ہے اور علمی اور ادبی فضاؤں پر تاسف کی لہر چھا گئی ہے۔ مرحوم ہماری اکیڈیمی کے مرکزی کمیٹی اور مختلف سب کمیٹیوں کے ممبر اور سرگرم کارکن بھی تھے۔ دوسرے ادبی اداروں کے ساتھ اکادمی بھی شریک غم ہے۔ اور مرحوم کو خراج عقیدت ادا کرنے کے لئے "شیرازہ" کا آئندہ شمارہ زورؔ نمبر کی صورت میں شائع کیا جا رہا ہے۔ ہماری یہ کوشش ہے کہ یہ خصوصی شمارہ ان کی حیات اور افکار کی ایک مستند دستاویز کی حیثیت سے شائع ہو۔

علی جواد زیدی
سکریٹری جموں اینڈ کشمیر اکیڈیمی آف آرٹس،
کلچر اینڈ لنگویجز سری نگر

بنام عارف الدین حسن صاحب

(۱)

۱۲ر جون ۱۹۶۱ء

محب محترم زاد لطفہٗ

تسلیم مع التکریم

کرمنامہ مورخہ ۹ر جون نے شادکام کیا۔ یاد آوری کے لئے شکر گذار ہوں۔ میں یہاں خیریت سے پہنچ کر ابھی ٹورسٹ سنٹر میں مقیم ہوں۔ کئی مکان دیکھے مگر ابھی تک کوئی انتظام نہیں ہوا۔ اردو کی خدمت کے ذوق نے اس دور دراز علاقہ میں غریب الدیار بنا کر پہنچایا ہے۔ دعا فرمائیے کہ اردو والوں کی کچھ خاطر خواہ خدمت کرسکوں۔ یہاں اب تک پی ایچ ڈی کا کچھ انتظام نہ تھا۔ میری آمد کے بعد آٹھ خواتین و اصحاب نے درخواستیں دی ہیں۔

کشمیر اردو اکیڈیمی کے قیام کے لئے بھی کوشاں ہوں۔ انشاء اللہ جلد اس کا افتتاح عمل میں آئے گا۔

یہاں آنے کے بعد معلوم ہوا کہ اردو والے اور خاص کر مسلمان ہر جگہ سست گام اور آہستہ خرام واقع ہوئے ہیں۔ اس لحاظ سے حیدرآباد ہی کچھ تیز گام نظر آتا ہے جہاں آپ جیسے مخلص اور مستعد اصحاب اس گئے گزرے زمانے میں بھی موجود ہیں۔

میں ۲۱ر جون کو ذریعہ ہوائی جہاز بمبئی جا رہا ہوں وہاں سے ۲۴ کو حیدرآباد پہنچوں گا۔ آپ اتوار ۲۵ر کو مجھے شرف نیاز حاصل کرنے کا موقع عطا فرمائیں تو باعث کرم ہوگا۔ ۲۶ر کو وہاں سے واپس ہوں گا اور ۲۸ر کو سری نگر پہنچ جاؤں گا۔ انشاء اللہ باقی بالمشافہ۔

مخلص

سید محی الدین قادری زورؔ

(۲)

۹ تلسی باغ۔ سری نگر

۷۔۴۔۶۲ء

مولانائے محترم زاد مجدکم

السلام علیکم

کرم نامہ مورخہ ۲۲ر مارچ یہاں آیا۔ اور میں ۱۲ر کو جموں گیا اور وہاں سے دلی۔ آخر ۲ر اپریل کو واپس ہوا۔ اس لئے جواب

لکھنے میں تعویق ہوئی۔ معافی کا خواستگار ہوں۔

دلی میں گرمی تھی۔ اور یہاں پہنچا تو پھر برف خانہ میں بند ہوگیا۔ بلا کی سردی ہے۔ دعا فرمائیے کہ اللہ تعالیٰ اپنے فضل سے صحت و عافیت سے رکھے۔ آسمان پر بادل ہیں۔ دن کے وقت ایسی تاریکی ہے جیسے وہاں صبح ۵، ۶ بجے صبح۔ ایسے موسم اور ایسی سردی میں کیا کام ہوگا۔ اور میں کام کا بندہ ہوں۔ اور خدا نے مزدور پیدا کیا ہے۔ اور قسمت میں کام لکھا ہے۔ میں یہاں ہوں مگر دل آپ لوگوں میں رہتا ہے۔

چھوٹے گودام کا کام اب تک مکمل ہوگیا ہوگا۔ جو بیکار ردی نکلے (اس کو جانچ کر کہ سب بیکار کاغذ ہیں) ز... اور ہر چیز درج رجسٹر کرادیجیے۔

امید کہ آپ کی طبیعت ٹھیک ہوگی اور آپ ہمیشہ کی طرح ادارے کے کاموں میں دلچسپی اور رہبری فرماتے رہیں گے۔

مخلص

سید محی الدین

(۳)

وتنسی باغ۔ سری نگر

۸ مارچ ۶۲ء روز عید

مولانائے محترم زاد لطفہٗ

السلام علیکم۔ عید مبارک۔

ابھی جامع مسجد سے نماز پڑھ کر آئے ہیں۔ شیر خرما تیار ہو رہا ہے۔ خیال آیا کہ آپ کو عید کی مبارک باد بھی نہیں دی۔ نہ کارڈ کا جواب دیا۔

یہاں بلا کی سردی ہے۔ تین روز سے بارش ہو رہی ہے۔ اس لئے عیدگاہ میں نماز نہیں ہو سکی۔ آج بارش نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ کے رحم و کرم اور تقدیر کے جتنے منتظر یہاں کے لوگ ہیں شاید ہی کوئی ہوں۔ راستے بند نہ ہوائی جہاز چلتے ہیں نہ... آپ جو دلچسپی ادارے کے کاموں میں شروع سے لیتے رہتے ہیں اس کے لئے ہمیشہ شکرگذار رہا ہوں۔ کھاتے کم ہوں گے۔ اب غلام دستگیر کمپنی سے آڈٹ کرا کے فوراً حکومتوں کو امداد کے لئے لکھنا ہے تاکہ دیر تک انتظار نہ کرنا پڑے۔

امتحانات کا نتیجہ تو اخبارات میں شائع فرما چکے ہوں گے۔ قادر صاحب سے کہئے کہ سیاست پہلی مارچ کا یہاں آنے کے بجائے لہا تھا۔ مگر اب تک نہ آیا۔ پھر وہاں تاکید کیجئے۔ بلکہ تحریری مراسلہ لکھوائیے۔

مخلص

سید محی الدین قادری زور

بنام ممتاز حسن صاحب احسن صدر ترقی اردو بورڈ کراچی

(۱)

یونیورسٹی آف جموں اینڈ کشمیر۔ سری نگر
۵ ر جون ۱۹۶۱ء

محب محترم۔ تسلیم

ایک عرصے کے بعد آپ نے یاد فرمایا اور آپ کا خط حیدر آباد ہوتا ہوا یہاں پہنچا۔ شکر گذار ہوں۔
میں مئی میں یہاں آگیا اور اردو کی خدمت میں منہمک ہوں۔ ایک "کشمیر اردو اکیڈیمی" بھی بنا رہا ہوں اور کوشش کر رہا ہوں کہ اردو ادب اور زبان کا اعلیٰ ذوق پیدا ہو سکے۔

آپ جیسے اصحاب وہاں اردو کے لئے جو کچھ توجہ فرما رہے ہیں، غنیمت ہے مگر ضرورت ہے کہ مزید توجہ منعطف ہو۔

حدی را تیز تر می خواں چو محمل را گراں بینی

سنا کہ مولوی عبدالحق صاحب علیل ہیں اور دواخانہ میں زیر علاج۔ اگر ان کی علالت کی نوعیت اور موجودہ حالت۔ اطلاع بخشیں تو کرم ہوگا۔

میرے بارے میں آپ جو کچھ سنتے ہیں وہ حقیقت سے زیادہ ہے۔ من آنم کہ من دانم۔ شاہد صاحب حیدر آباد میں مصروف رہتے تھے۔ وہاں ان کی علمی و ادبی مصروفیت کے کوئی ثبوت وہاں کے رسائل و جرائد میں نہیں ملتے۔

امید کہ کبھی کبھی اس طرح یاد سے شاد فرمایا کریں گے۔ مذکورہ بالا پتہ کافی ہے۔

مخلص
سید محی الدین قادری زور

بنام سیّد مبارز الدین رفعت

(۱)

رفعت منزل۔ خیریت آباد۔

محب مکرم۔ کرم نامہ ملا۔ مضمون وصول ہوا۔ دونوں کے لیے شکریہ ادا کرتا ہوں۔ پہلے کا مضمون نہیں ملا۔ اس طرح پابندی سے بھجواتے رہیے۔ اس کے بعد سب رس بھی پابندی سے آپ کو ملتا رہے گا۔ مخلص

سید محی الدین قادری زور ۹؍۲ ۵۰ء

(۲)

رفعت منزل۔ خیریت آباد۔ عزیز مکرم۔ آپ کا تفصیلی خط مل گیا۔ اور ان شاء اللہ سفارش کردوں گا بمبئی سے واپسی پر۔ میں ۲۴ کو یہاں سے نکل رہا ہوں۔ گلبرگہ تو گاڑی بڑی رات میں پہنچتی ہوگی۔ سب رس کے لیے مضامین بھیجیے۔ اور اس کے لئے خریدار بھی وہاں۔ حیدرآباد کب آرہے ہیں؟ مخلص

سید محی الدین قادری زور

(۳)

رفعت منزل۔ خیریت آباد۔ محب مکرم۔ آپ کا خط مل گیا۔ شکریہ۔ رافعی صاحب کی ملاقات کا حال معلوم ہوا۔ ابھی اطلاع نہیں ملی۔ اگر ملے تو ضرور جاؤں گا۔ جولائی کی کمیٹی کی ابھی تک تاریخ نہیں آئی۔ میں جاؤں گا تو ضرور آپ کے نام کوئی کتاب ضرور مقرر کراکے وہیں سے اطلاع بھجواؤں گا۔ بے فکر رہیں۔

پن چکی کی اشاعت ابھی نہیں ہوئی۔ انتخابات کے کام میں پریس مصروف تھا۔ کل پرسوں شاید اس طرف توجہ کرے۔ معارف میں بھی آگیا ہے۔ ملا ہوگا۔ سنا ہے کہ تعلیمات میں کمیٹی ہوئی اور اتنی ہی امداد منظور ہوئی جو گذشتہ سال ملی تھی۔ اضافہ اچھا ہوتا۔ آپ نے اس مرتبہ ادارے کے لئے جو ہمدردانہ سعی فرمائی، اس کے لئے دل سے شکر گذار ہوں۔ گلبرگہ کے بعض پرانے گھروں میں تلاش کیجیے۔ ممکن ہے کوئی قلمی کتابیں یا کاغذات مل جائیں۔ یہ ادارے کی بڑی خدمت ہوگی۔ ضرور اس طرف توجہ فرمائیے۔ آپ نے خانقاہ کے کتب خانے کے لئے کچھ کتابیں دینے کا وعدہ کیا تھا۔ وہ بھی ایفا نہیں ہوا۔ آپ کا نام بھی بطور معطی اس میں چھپے گا۔ امید کہ آپ بخیریت ہوں گے۔ اور کتابیں تلاش کرتے رہیں گے۔ مخلص

سید محی الدین قادری زور ۲۷/۶/۶۱ء

(۴)

رفعت منزل۔ خیریت آباد۔ عزیزی رفعت صاحب۔ مخمس وصول ہوا۔ شکریہ۔

ایک غزل بھی بھیج سکیں تو مزید عنایت ہوگی۔ آپ کی کتاب چھپ گئی ہے۔ آپ کو اس خط کے ساتھ مل جائے گی۔ کہیے کون اسے لینا چاہتا تھا؟ فوراً ان کو لکھیے تاکہ ختم نومبر سے پہلے کام ہو جیسا کہ آپ کا خیال تھا۔

اب آپ یہاں کن چھٹیوں میں آئیں گے؟

خواجہ بندہ نواز پر ایک مبسوط (علمی انداز میں) مقالہ کئی سو صفحات کا لکھیے۔ ان کے مرشد نصیر الدین چراغ دہلوی کی بھی ایک ...

اردو رسم خط میں مجمل گئی ہے جس سے اب یہ یقین ہو چلا ہے کہ معراج العاشقین خواجہ بندہ نوازہی کی کتاب ہو گی ؎

ایں سلسلہ طلائے ناب است

ایں خانہ تمام آفتاب است

اگر آپ ان پر لکھیں تو بجائے خود دکن کے چند بڑے عوامی خدمت گذاروں کی یاد تازہ ہو جائے گی ———

"تازہ خواہی داشتن ایں داغ ہائے سینہ را!"

ایک بات یہ بھی ہمیشہ پیش نظر رکھیے کہ علمی و ادبی کام کو ذریعہ آمدنی نہ بنائیے۔ اللہ تعالیٰ نے آپ کو ملازمت اور باعزت ملازمت سے سرفراز فرمایا ہے۔ کچھ کام محض علم و فن کی خاطر کیجئے۔ دولت و عزت خود بخود ملتی جائے گی اور یہ عارضی چیزیں ہیں۔ دائمی چیز تو کام ہے اور کام خود انعام ہے۔ مخلص

(۵) سید محی الدین قادری زور ۱۲/۱۰/۶۹ء

رفعت منزل۔ خیریت آباد۔ عزیز مکرم۔ آپ کا خط۔ کارڈ اور شاہی کی غزل مل گئی۔ شکریہ۔ آپ کو رن جی کی کتابیں ملیں یا نہیں۔ ٹائیٹل پیج لگ گیا۔ حضرت بندہ نواز پر ایک مبسوط کتاب کی ضرورت ہے جو میری "حیات میر مومن" سے دوگنی ہو۔ محنت سے مواد جمع کیجئے۔ اچھا کام ہو جائے گا اور ہم خرما و ہم ثواب۔ امید کہ آپ بخیر ہوں گے اور رفتار کار سے آگاہ کرتے رہیں گے۔ کب آ رہے ہیں۔ مخلص

(۶) سید محی الدین قادری زور ۲۳/۱۱/۶۹ء

رفعت منزل۔ خیریت آباد۔ محب مکرم۔ آپ کا کارڈ ۴ دسمبر کا۔ میں پٹنہ، الہ آباد، دلی سے ابھی واپس ہوا ہوں اور بہت مصروف ہوں۔ کتاب تو چھپ گئی، اگر اخراجات کچھ نکل آئیں تو دوسری کتابیں بھی چھپ سکتی ہیں۔ کوشش فرمائیے۔ حضرت خواجہ بندہ نواز پر ضرور کام کیجئے۔ بہت بڑا اور مفید کام ہو گا۔ مخلص

(۷) سید محی الدین قادری زور ۱۲/۱۱/۶۹ء

رفعت منزل۔ خیریت آباد۔ محب مکرم۔ کرم نامہ اور کارڈ وصول ہوئے۔ سب رس مندرجہ پتہ پر بھجوا دیا جائے گا۔ جمال الدین صاحب آج کل انفلوئنزا سے بیمار ہیں۔ نئے پرچے میں آپ کا مضمون بھی چھپا ہے۔ حیدرآباد میں آپ سے ملاقات نہ ہو سکنے کا افسوس ہے۔ بہت سی باتیں کہنے کی تھیں۔

حضرت خواجہ بندہ نواز پر آپ نے مضمون مکمل کر لیا۔ بڑا اچھا ہوا۔ میں دیکھ لوں گا۔ سالار جنگ میوزیم کی کتاب ادارے سے کوئی نہیں دے گا۔ نہ بک ڈپو ہے نہ تشہیر ہے۔ آپ رائٹرس امپوریم بمبئی سے مراسلت کر کے ان کے پاس بھجوائیے۔

کوئی اور مضمون بھیجئے، اور کبھی کبھی خیریت سے مطلع فرماتے رہئے۔ مخلص

(۸) سید محی الدین قادری زور ۱۵/۱/۷۰ء

رفعت منزل۔ خیریت آباد۔ محب مکرم۔ آپ کا خط ملا۔ میں خود آپ کو لکھنے والا تھا۔ مگر میری بیوی کو ہارٹ اٹیک ہو رہے تھے۔ پریشان رہا۔ اب کچھ رو بصحت ہیں مگر عرصہ تک لیٹے رہنا ہو گا۔ میرے معمولات روزمرہ میں فرق آ گیا۔ اور کسی کو نہ لکھ سکا۔ ہما رالا لہ کیریکے جلسے کا مقالات، خطبہ وغیرہ ملا تھا۔ میں آپ کو مبارکباد دینا چاہتا تھا۔ آپ نے کچھ نہیں لکھا کہ ان سے کیا گفتگو رہی۔ پھر عملی کارروائی امداد وغیرہ کی ہوئی یا نہیں۔ لکھ تو دیجئے۔ باضابطہ درخواست کی شکل میں دلی کو۔ اور مجھے تفصیلات سے آگاہ کیجئے۔

ابوالکلام آزاد ریسرچ انسٹی ٹیوٹ کے فیلوشپ فل ٹائمرس (ہمہ وقتی) طلبہ کو دیئے جانے کا تصفیہ ہوا ہے۔ آ
EDITING COMPILATION کا کام مل سکتا ہے۔

آپ نے جو تاریخ محمد قطب شاہی مرتب کی تھی وہ کہاں ہے؟ کس نوبت پر ہے؟ اس کی ترتیب کا معاوضہ دے کر اس پر بھی فیلوشپ کے لئے درخواست دینا چاہیں تو دے سکتے ہیں۔ اصولاً میں منع نہیں کر سکتا۔ اگر دوسری درخواست نہ آئیں تو آپ کو موقع مل جائے گا۔ جامعہ عثمانیہ کی درخواست پی ایچ ڈی کے فارم پر بھجوائیے۔

آپ کی جو دو کتابیں ادارے کی طرف سے طبع کے لئے رکھی ہوئی ہیں ان میں پرسی براؤن کی کتاب چھپ سکتی ہے۔ کتنی ضخامت کی؟ اور کیا اس میں تصویروں کے بلاک بھی ہیں؟ اطلاع بخشئے۔

امید کہ آپ کی صحت اچھی ہوگی۔ میں ڈسمبر کی چھٹیوں میں گلبرگہ اور بیجاپور کے لئے نکلنا چاہتا ہوں۔ سجادہ صاحب نے دعوت دی ہے۔ اگر بیگم صاحبہ چلنے پھرنے کے قابل ہوجائیں تو نکلوں گا۔ مخلص

(۹) ۱۳/۱۱/۶۸ء سید محی الدین قادری زور

یوم محمد قلی قطب شاہ ! دفتر ادارۂ ادبیات اردو، خیریت آباد۔ حیدرآباد (اے پی) مورخہ ———

محبی۔ آپ کا کارڈ ملا۔ کمیٹی نے جو فارم تیار کرایا ہے مرسل ہے۔ اس پر درخواست بعد خانہ پری حال کے ساتھ بھجوائیے۔ باقی حالات بدستور ہیں۔ میں پرسوں دلی جا رہا ہوں۔ دوسری ڈسمبر تک آجاؤں گا۔ آپ دفتر ادارہ کے پتہ پر فارم بھیجئے۔

۲۵/۱۱/۶۹ء (۱۰)

۹۔ تلسی باغ۔ سری نگر۔ محب عزیز سلمہٗ۔ کارڈ مورخہ ۲ مارچ وصول ہوا۔ میں یہاں آنے کے بعد سے متعدد کمیٹیوں میں ۱۱ کو جموں جا رہا ہوں۔ اور پھر واپس آنے کے بعد ۲۰ کو دلی جاؤں گا۔ خیال ہوا کہ فوراً جواب دیدوں۔ اس لئے عجلت میں لکھ

آپ کی علمی اور تحقیقاتی کاوشوں سے بڑی خوشی ہوتی ہے اور باوجود ناسازی مزاج کے آپ جو کام کرتے رہتے ہیں حضرت بندہ نوازؒ رحمۃ اللہ علیہ کی اردو نظم و نثر کے متعلق مجھے شبہ ہے۔ اور جب معراج العاشقین ان کے نام سے چھپی تو میں نہیں کیا۔ میرا خیال ہے کہ ان کے کسی عقیدت مند نے ان کی گفتگو یا فارسی رسالے کو اردو میں منتقل کیا ہے۔ مگر یہ محض مولوی عبدالحق اس کو مان چکے تھے اس لئے اس کے خلاف کچھ کہنے یا لکھنے کے لئے باضابطہ ثبوت اور دلائل کی ضرورت ہے؟ یہی حال شکارنامہ، تلاوت الوجود اور درالاسرار کا ہوگا۔ اور جن تین رسائل کا آپ نے سراغ لگایا ہے ان کا شمار میں اپنے میں کروں گا۔ مگر میرے اس ذاتی شبہ کی بنا پر آپ اپنا کام ملتوی نہ فرمائیں۔ یہ بجائے خود ایک اہم اور ضروری کام ہے کی قدیم ترین نظم و نثر میں اضافہ ہوگا۔

مجھے اس وقت یاد نہیں کہ یہ تین رسالے کہاں موجود ہیں۔ اور کہیں ہیں بھی یا نہیں۔ یہاں تو میں بالکل بے دست و پا ہوں۔ اور محض اس خطے میں اردو کی خدمت کے لئے بطور غریب الوطن مقیم ہوں۔ اور اپنی بساط کے مطابق اردو کا کام نتائج کچھ عرصے کے بعد ظاہر ہوں گے۔ خدا کرے کہ میری یہ خدمت مقبول ہو اور خود اللہ تعالیٰ اس کو قبول فرمائیں۔

۱۶/۳/۶۲ء سید محی الد

بنام خواجہ حمید الدین شاہد

(۱)

۲۱-۶-۶۹ء محب مکرم آپ کے دو خط ۱۱ اور ۱۶ جون کے اور وحید النساء بیگم کا ایک کارڈ ۱۰ جون کا ملا۔ یہ معلوم کر کے مسرت ہوئی کہ سب خیر و عافیت ہیں۔ احمد علی صاحب دو بار ملے تھے، بہت متاثر ہیں۔ تاب صاحب نہیں ملے۔۔۔۔۔۔ ڈاکٹر ظہیر کے بچوں کے لئے سفارش کر دی ہے۔ بےفکر رہیں۔ الماری کی قیمت یہ لوگ بہت کم بتا رہے ہیں۔ آپ کا خیال معلوم ہونے کے بعد راما نجا صاحب کو بھجوا دوں گا۔

تسنیم آرکی ٹکچر اور توفیق بی اے میں شریک ہو رہی ہیں۔ سب لوگ گھر میں اور باہر یاد کرتے رہتے ہیں۔۔۔۔۔۔ چہلم تک کہیں آنا جانا بند ہے سید صاحب کی لڑکی کی شادی تھی۔ اردو انسائیکلو پیڈیا کا کام شروع کرنے کا ارادہ ہے۔ حکومت سے امداد کی توقع پیدا ہو گئی ہے۔

بچے کیسے ہیں۔ خسر صاحب، خوشدامن صاحبہ، منعم صاحب اور آپ کی بیوی کو حسب مراتب کہیئے۔ وحید النساء کو الگ جواب نہیں دیتا اب آپ ہی میرا جواب بن کر وہاں گئے ہیں۔ ان سے کہئے کہ ان کی امانت دیری سے سہی ان کے پاس واپس کر دی گئی ہے۔ اطمینان سے رہیں اور دعائے خیر سے یاد کرتے رہیں۔ موٹر خریدیں تو فاتحہ دے کر بیٹھیں۔

یہاں سب خیریت سے ہیں۔ تہذیب کا ابھی کچھ نہیں ہوا۔ بڑی فکر ہے۔ خدا کرے کہ جلد کوئی اچھے گھر میں ٹھکانا مل جائے۔ لکچراری کا بھی کچھ نہ ہوا۔ بیگم صاحبہ اور بچے سب سلام کہتے ہیں اور خیر و عافیت کے طالب ہیں۔ مخلص سید محی الدین قادری زورؔ

ـلہ ڈاکٹر صاحب کی والدہ وفات پائی تھیں۔

(۲)

۱-۷-۶۹ء عزیز مکرم آپ کا خط بڑے انتظار کے بعد ملا۔ جلد جلد لکھتے رہیئے۔ میری طبیعت بہت پست ہو گئی ہے۔ کسی کام میں دل نہیں لگ رہا ہے۔ عمارت کی تکمیل کا انتظار ہے، بڑی دیر لگ رہی ہے۔

احمد علی صاحب ہر جمعہ کو ملتے ہیں اور آپ کے فراق میں روز بروز دبلے ہو رہے ہیں۔ میں دل بہلانے کی مختلف ذریعے سمجھاتا ہوں۔ انہوں نے آپ کو خط لکھا ہے اب تک مل گیا ہوگا۔ وہ آپ سے بہت محبت رکھتے ہیں۔

دکن کے شاعروں کی دوسری جلد کا کام آپ وہیں سے کر سکتے ہیں یا نہیں؟ راما نجاؤ صاحب محرم کے بعد کمیٹی رکھنے والے ہیں۔ میں نے کہا ہے کہ آپ سے لکھ کر پوچھوں گا۔ کمیٹی میں آپ ہی کے سپرد کراؤں گا۔ نہ ہو سکے تو بعد میں انکار کر سکتے ہیں۔ انسائیکلو پیڈیا کا اسکیم بھجوایا ہے، دیکھیں کیا ہوتا ہے۔ سب کو سلام کہہ دیا ہے۔ ہر شخص اپنی اپنی فکر میں لگا ہوا ہے۔ سامنے کی بات اور ہوتی ہے۔ آپ نے خود بھی ان لوگوں کو لکھا یا نہیں۔

یہاں بارش شروع ہو گئی ہے، مطلع ابر آلود ہے، پھوار جاری ہے۔ اس کو کہتے ہیں عالم آرائی۔ ہر طرف سبزہ ہے اور موسم خوش گوار ہے مگر اب دل میں امنگ اور طبیعت میں جوش کی کمی ہوتی جا رہی ہے۔ علمی و ادبی کاموں سے بھی وہ لگی سی لگن باقی نہیں رہی۔

پرسوں حافظ محمد ابراہیم صاحب منذیر مرکزی حکومت ادارہ دیکھنے آئے تھے۔ زین یار جنگ نے خیر مقدمی تقریر کی۔ محرم کی وجہ سے محفل شروع نہیں ہوئی۔ خشک سی صحبت رہی مگر حافظ صاحب بہت خوش ہوئے اور کہا کہ یہاں نادر کام ہو رہا ہے۔ مگر یہ سب باتیں آپ کو لکھنے سے کیا فائدہ؟

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ دنیا سے جنت کو یا عالم بالا کو خط لکھ رہا ہوں۔ نہ آپ کچھ کر سکتے ہیں اور نہ لطف اٹھا سکتے ہیں۔ جنت والے مخصوں اور جھگڑوں سے دلچسپی تو ہو سکتی ہے۔ مگر وہ ان میں کمی یا ان کے سلسلے میں مدد نہیں کر سکتے، ہاں دعا کر سکتے ہیں اور اس سے دریغ نہیں کریں گے۔ بیگم صاحبہ کی طبیعت خراب ہو گئی تھی اب اچھی ہے مگر میری طرح وہ بھی زوال آمادہ ہو گئی ہیں۔ قانون فطرت سے کون بچ سکتا۔

بچے کیسے ہیں۔ ان کی اچھی پرداخت کیجئے۔ لاڈ پیار کا وقت گزر چکا۔ منعم صاحب کیسے ہیں۔ سب کو اور خسر صاحب کو سلام تقریباً روزانہ آپ کا ذکر رہتا ہے معلوم نہیں ملاقات کب ہوگی اور ہو بھی تو وہ اگلی سی بات کہاں؟ مخلص

سید محی الدین قادری زور

(۳)

۱۸-۸-۵۹ء عزیز مکرم مطیع الرسول صاحب آپ کے خط لائے اور سب کو تقسیم کر دیئے گئے۔ آپ کی علالت کی خبر ہے۔ خدا کرے کہ اب تک صحت ہو گئی ہو۔ ٹائیفائڈ کے بعد بڑی کمزوری ہو جاتی ہے۔ احتیاط اور توجہ کی ضرورت ہے۔ یہاں طبیعت کچھ خراب ہے۔ گردوں کی علالت تھی اب کچھ آرام ہے۔

احمد علی صاحب نے آپ کو تین خط لکھے مگر آپ کہتے ہیں کہ ایک بھی نہیں ملا کیا بات ہے۔ محمود صاحب اور فریدی صاحب کو پہنچا دیئے گئے۔ ان لوگوں نے آپ کو لکھا ہوگا۔ سب لوگ آپ کو یاد کرتے ہیں اور فاروقی صاحب نے آپ کی عمدہ ملازمت کے لئے سے بھیجا تھا۔ میں نے جواب دیدیا کہ شاید وہ وہاں نہ آسکیں۔ شعرائے حیدرآباد کا کام آپ نہیں کر سکیں گے اور نہ مناسب معلوم ہوتا ہے ذمہ لینا۔ مخلص

سید محی الدین قادری زور

(۴)

۲۲-۱۰-۵۹ء عزیز مکرم آپ کا خط مورخہ ۸ اکتوبر ملا۔ آپ کی صحت کا حال شوکت سے بھی معلوم ہوا۔ خدا کرے توانائی حاصل ہو جائے اور آپ جوش و خروش کے ساتھ کام کر کے وہاں اپنی زندگی بنائیں اور عزت و شہرت حاصل کر سکیں۔ آپ کی بیوی کو خط لکھ دیا ہوں۔ ممکن ہے کہ وہ راست آپ سے مراسلت کریں۔ شعرائے عثمانیہ کے لئے راست رائٹرس امپوریم کر دیں گے۔ اور یہ بھی پوچھئے کہ پاکستان میں ان کے کون ایجنٹ ہیں۔ ہم نے بھی دریافت کیا ہے۔ علاء الدین خالد صاحب اور پروف ملے یا نہیں، انھوں نے جواب نہیں دیا پوچھ کر لکھئے۔

کل جمعہ ہے، احمد علی صاحب آئیں تو کہوں گا۔ وہ گذشتہ جمعہ کو آئے تھے۔ کہتے تھے کہ بیمار رہا اس لئے نہیں آیا مالی اور جسمانی خراب معلوم ہوتی ہے۔ تاب صاحب کا ذکر ہی بیکار ہے۔ ان کو کوئی احساس نہیں ہے۔ آپ کیوں بار بار یاد کر رہا ہمارا ؤ صاحب کو خط پہنچا دیا۔ دیکھیں آپ سے کب ملاقات ہوتی ہے۔ مخلص

سید محی الدین قادری زور

(۵)

۴ نومبر ۱۹۵۹ء محب مکرم! خط مورخہ ۲۹ اکتوبر ملا۔ اس سے پہلے کارڈ بھی ملا تھا۔ حفیظ صاحب کو میں لکھ دیا تھا۔ نقل نہیں رکھی۔ اگر ان کو خط ملے تو گفتگو کریں ورنہ ضرورت نہیں۔

میں بہت مصروف اور بیگم صاحبہ کی صحت کی وجہ سے پریشان ہوں۔ بیگم صاحبہ کو قم معدہ میں درد ہوتا تھا اور ایکسرے کارڈیوگرام لیا گیا تو قلب کے عارضہ کا بھی شبہ ہے۔ اس لئے کئی سنہ سے لٹا دیا گیا ہے۔ بہت کمزوری محسوس کرتی ہیں مجھے ...

قریب نہ ہونے سے بے چینی رہتی ہے۔ وہ بھی سمجھتے ہیں کہ خواہ مخواہ ہم کو بے کار بنا کر ڈال دیا گیا ہے۔ آج ڈاکٹر[1] صاحب کہہ رہے تھے کہ کل سے ٹہلا کر بٹھائیں۔ اب تکلیف کم ہے مگر جب تک حسبِ معمول چلنے پھرنے نہ لگیں پریشان رہوں گا۔ آزاد ریسرچ انسٹی ٹیوٹ کے لیے ۲۱ ہزار رقم آگئی ہے۔ اس کا کام اور کمیٹیاں بھی شروع ہیں۔ بہت زیادہ مصروفیت ہے۔ افتتاح عمارت اور یوم محمد قلی وغیرہ کے انتظامات بھی ہیں۔ غرض کہ ایک سر ہزار سودا کا حال ہے۔ جب تک اللہ چاہے کام لیتا رہے گا اور جب تک اس کو منظور ہو میں محنت کروں گا۔ اس لیے زیادہ بار برداشت کر رہا ہوں کہ جب تک برداشت کی قوت ہے نہ کرنا کفرانِ نعمت ہے۔

آپ کی صحت و عافیت اور آپ کے متعلقین کی خوشی و خوش حالی کے لیے دعا کرتا رہتا ہوں۔ یہاں سے اور کیا کر سکتا ہوں۔ بہت سے کام لیجیے جلد قوت آجائے گی اور چاق و چوبند ہو جائیں گے۔

مخلص سید محی الدین قادری زور

[1] ڈاکٹر رگھونندن راج سکسینہ جو ڈاکٹر صاحب مرحوم کے ہم جماعت، مخلص دوست اور خاندانی معالج ہیں۔

(۶)

۲۵-۱۱-۵۹ء محب مکرم کیا بات ہے اب کے آپ بہت خاموش ہیں۔ خط کے جواب کا اب تک انتظار رہا۔ میرا خط تو آپ کو مل چکا ہے مگر آپ نے یا تو جواب نہیں دیا یا راستے میں غائب ہو گیا۔ ۱۰ جنوری کو یوم محمد قلی ہے۔ آپ آ رہے ہیں یا نہیں۔ حفیظ جالندھری صاحب کو آپ تک خط ملا یا نہیں۔ ان سے کیا گفتگو ہوئی جلد جواب دیجیے تاکہ میں پھر ان کو لکھوں۔

بیگم صاحبہ لٹا دی گئی ہیں۔ یہ سلسلہ اور کئی ماہ تک جاری رہے گا۔ گھر کے سب معاملات منقلب ہو گئے ہیں۔ میں پرسوں دو روز کے لیے دلی جا رہا ہوں۔ کالج سے کئی بار لکھا جا چکا مگر وہاں پتہ یاد نہیں رہتا۔ آپ کے خط کا بے حد انتظار ہے۔ مخلص

سید محی الدین قادری زور

(۷)

۹-۱۲-۵۹ء محب مکرم آپ کا تفصیلی خط ملا۔ شکریہ۔ میں دلی سے واپس آگیا ہوں اور یہ خط لکھ رہا ہوں۔ بیگم صاحبہ اب اللہ کے فضل سے بہتر ہیں۔ آج ڈاکٹر شاہ نواز آئے تھے اور دیکھ کر کہا کہ آپ تھوڑی دیر اٹھ کر بیٹھ سکتے ہیں۔ چند روز بعد چلنے پھرنے کی اجازت ملے گی۔

آپ ۱۰ جنوری کو یوم محمد قلی میں شریک ہوں گے یا نہیں۔ حفیظ صاحب آ رہے ہیں یا نہیں، کوئی جواب نہیں ملا۔ آپ آئیں تو پھر دعوت نامے بھیجوں مگر اب دن کم رہ گئے ہیں۔ آپ کی علمی و ادبی مصروفیتوں کا بھی علم نہیں ہوا۔ توقیر کے خط آ رہے ہیں۔ یہاں سے ان کو پابندی سے لکھا جاتا ہے۔ معلوم ہوتا ہے بعض خط نہیں ملے یا دیر سے ملتے ہیں۔ شادی کے ساتھ ہی ان کی قومیت بدل گئی۔ اب قومیت حاصل کرنا سمجھ میں نہیں آیا۔ سب آپ کو یاد کرتے ہیں۔ عبدالرحیم[1] اور پہلوان صاحب سلام کہتے ہیں۔ بچے سب آپ کو یاد کرتے ہیں اور احباب بھی۔ وہاں سے جو رسائل و جرائد آتے ہیں ان میں آپ کا نام ڈھونڈتا ہوں کہیں نظر نہیں آتا۔ بڑی مایوسی ہوتی ہے۔ میں انتہا سے زیادہ ہی مصروف ہوں۔ پہلے میں کام ڈھونڈتا تھا لیکن اب کام مجھے ڈھونڈ ڈھونڈ کر آ رہے ہیں۔ جلد جلد لکھا کیجیے۔ مخلص

سید محی الدین قادری زور

[1] رشید پہلوان اور ان کا لڑکا جو ڈاکٹر صاحب مرحوم کو اور مجھے ہفتے میں دو دن مالش کرتے تھے۔

(۸)

۸-۴-۶۰ء محبی شاہد صاحب

مجھے معلوم نہ تھا کہ آپ آج نہیں آئیں گے۔ آپ سے ملنا ضروری ہے۔ میرا ارادہ دلی سے بنوں جانے کا ہے۔ آپ کے مشورے کے بعد طے کرنا ہے۔ بنگلے پر آج یا کل ضرور ملیے۔ مخلص

سید محی الدین قادری زور

(۹)

۲۵-۶-۶۰ء عزیز مکرم آپ کے تین خط تینوں کے نام ملے۔ خدا کا شکر ہے کہ بیگم صاحبہ رو بصحت ہیں۔ اصل معاملہ ان کی صحت کا ہے۔

شادیاں تو ہوتی رہیں گی۔ توقیر آجائے تو اچھا ہو۔ آپ کا شکر گزار ہوں کہ بڑی محبت سے خطوط لکھے۔ اس عمر میں محسوس ہو رہا مخلصوں کی قربت کتنی مفید ہوتی ہے۔ آپ کے خالو صاحب کے پوتے امجد علی صاحب کی شادی بڑی دھوم دھام سے ہوئی۔ میں بھی بیگم لے کر گیا تھا۔ البتہ ولیمہ میں شریک نہ ہو سکا۔ سالگرہ بھی بہت عمدہ اہتمام سے ہوا۔ مخلص

سید محی الدین قادری زور

(۱۰)

۲۔۱۰۔۶۰ء محبی شاہد صاحب فرزند ارجمند کی تقریب تسمیہ کا رقعہ اور خط ملا۔ بڑی خوشی ہوئی کہ اتنے عرصے کے بعد آپ نے اتنی اعلیٰ پیمانہ کی اور عمدہ تقریب انجام دی۔ خدا مبارک کرے اور اس کو آپ کی زندگی کا ایک نیا موڑ ثابت کرے۔

میں ہمیشہ آپ کی ترقی علم و اقبال کی دعا کرتا رہتا ہوں۔ میں گو رہا رہین ستم ہائے روزگار ؎ لیکن ترے خیال سے غافل نہیں اب کام کرتے کرتے بہت تھک گیا ہوں۔ چھوڑنا چاہتا ہوں مگر کام پیچھا نہیں چھوڑتے۔ یکے بعد دیگرے سلسلہ بندھا ہوا ہے۔ اب یوم محمد قلی قطب کی تیاریاں شروع ہو گئی ہیں۔ گھریلو معاملات پیچھے پڑ جاتے ہیں۔ ادارے کے کام بڑھتے جا رہے ہیں۔ مخلص

سید محی الدین قادری زور

(۱۱)

۲۳۔۳۔۶۱ء عزیز کرم ایک خط اس سے پہلے دلی سے واپسی کے بعد لکھ چکا ہوں ملا ہوگا۔ جواب کا انتظار ہے۔ تہذیب کی ۲ رمئی کو مقرر ہوئی ہے۔ لطیف احمد فاروقی صاحب کے فرزند کے ساتھ۔ آپ معلوم نہیں اس قدر جلد آ سکتے ہیں یا نہیں۔ کوشش تو کیجئے ہمت مرداں مدد مولا۔

مقبول نواب کو بھی لکھا ہے اور توقیر کو بھی۔ اس موقع پر وہاں کے لوگوں کی شرکت کی کچھ توقع معلوم نہیں ہوتی۔ پھر بھی لکھ تو رہا مئی میں سری نگر جانے کا ارادہ ہے۔ دیکھئے کیا ہوتا ہے۔ ابھی کوئی قطعی بات نہیں معلوم ہوتی اور نہ تاریخ مقرر کی ہے۔ بیگم صاحبہ فراقی اور وحید الدین کو لے آئیے۔ وہ جانے کے بعد پھر آئیں ہی نہیں۔ اس طرح موقع نکل آئے گا۔ انڈو پاک کلچرل کانفرنس میں جناب حقی صاحب تشریف لائے۔ بڑی امید تھی کہ ان سے ملاقات ہو جائے گی مگر اے بسا آرزو کہ خاک شدہ۔

آپ اب کیا کر رہے ہیں۔ مضامین وغیرہ برابر لکھتے رہیئے۔ دفتری کام کے علاوہ۔ امجد صاحب کی وفات بڑا سانحہ تھا اور خدا کا شکر ہے کہ مختلف اخباروں اور رسالوں میں ان کی خدمات کو سراہا گیا اور اب بھی سراہا جا رہا ہے۔ ملاپ میں بھی کئی مضامین چھپے۔ یہ تو آپ نہیں ملتا ہوگا۔ وہاں کیا کیا ہوا۔ آپ کی موجودگی کے باعث بہت کچھ توقع ہے۔ بیوی اور بچے کیسے ہیں۔ منعم صاحب کو سلام کہئے۔ وہ بالکل دفتری آدمی بن کر رہ گئے ہیں۔ باقی خیریت۔ مخلص

سید محی الدین قادری زور

یہ خط لکھا تھا کہ آج آپ کا ۱۷ اپریل کا کارڈ ملا۔ آپ اپنے پیٹ کے درد کا ٹھیک علاج اور تشخیص کرائیے۔ میں اب بہتر ہوں اور کے انتظامات میں مصروف۔

(۱۲)

۷-۱۱-۶۱ء عزیز مکرم۔ آپ کا خط مورخہ ۱۷ جون ۶۱ء اس وقت پیش نظر ہے۔ میں یہاں سے بمبئی اور وہاں سے
ر آباد گیا تھا۔ ۲۰ جون کو واپس ہوا ہوں۔ بیگم صاحبہ اور سب بچے بچیاں ساتھ ہیں۔ ایک مکان بھی مل گیا ہے، موٹر بھی آ گئی ہے۔
ت تہذیب وہاں اپنے گھر میں ہے۔ ہمارا مکان منتقل ہو گیا۔
ادارے کا کام صدیقی صاحب اور مہندر راج صاحب دیکھ رہے ہیں۔ خدا کرے کہ آپ کا مکان جلد تیار ہو جائے اور آپ
ت و عافیت اور مسرت و اطمینان کی زندگی بسر کریں اور علمی و ادبی دنیا میں مناسب شہرت پائیں۔ ممتاز صاحب کا بھی خط آیا ہے۔
ن کو بھی جواب دے رہا ہوں۔
مقبول نواب جو کام کر رہے ہیں اس میں ممکنہ مدد دیجئے۔ میری قسمت بھی عجیب ہے۔ اس اہتمام سے ندکاہ کی عمارتیں بنوائیں
کچھ عرصے کے بعد اس سے بے تعلق ہو گیا۔ ایوان اردو بنایا۔ اپنی زندگی ہی میں چھوڑ آیا۔ اب یہاں کشمیر اردو اکیڈیمی کی بنیاد
ل رہا ہوں۔ شاید عمارت بن جانے کے بعد اس کو بھی چھوڑ دوں۔ "موتو قبل ان تموتو" کی مثل صادق آ رہی ہے۔ مذکورۂ بالا
پر جواب دیجئے۔ یہاں خطوط وہاں سے برابر آتے ہیں۔ مخلص سید محی الدین قادری زور

(۱۳)

۔۸۔۶۱ء عزیز من زاد لطفہٗ۔ عرصے سے آپ کا خط نہیں آیا۔ سری نگر سے آپ کو خط لکھا تھا اور یہ بھی لکھا تھا کہ وہاں کے
برابر خطوط توقیر کے اور مقبول نواب کے آ رہے ہیں، آپ بھی لکھئے۔ اسلم صاحب کے بھی برابر آتے رہیں۔ تعجب ہے کہ آپ نے کیوں نہیں
۔ فکر ہے کہ علیل تو نہیں ہیں۔ کسی اور ذریعے سے بھی آپ کی مصروفیت کا اور حالت کا علم نہ ہو سکا۔
میں ۱۲ اگست کو یہاں آیا۔ ۔۔ کو الہ آباد جا رہا ہوں وہاں سے ۲۲ کو نکل کر ۲۴ کو سری نگر پہنچ جاؤں گا۔ انشاء اللہ ۱۰ اگست
ضرت کا عرس ہے۔ بارش کی وجہ سے مختصر کر رہا ہوں۔ بیگم صاحبہ اور سجادے صاحب وہیں ہیں۔ میں صرف اکیلا آیا ہوں۔ توفیق
منیم یہاں ہیں۔
ممتاز حسین صاحب کے خط کا جواب وہاں سے آیا تھا معلوم نہیں ان کو ملا یا نہیں۔ آپ اپنی، وحید النساء کی، بچوں کی، خسرو صاحب
خورشید امین صاحبہ کی اور منعم صاحب کی خیر و عافیت سے جلد مطلع کریں۔ ہاں کل یہاں لغت کا نمونہ ملا۔ ماشاء اللہ بہت عمدہ کام
ا اردو کے اور آپ لوگوں کے شایان شان۔ اگر یہ مکمل ہو جائے تو بڑا کارنامہ ہوگا۔ میں نے اکبر الدین صاحب سے کہا ہے کہ
ن پر سب رس میں رائے ضرور چھپائیں۔
آج کل یہاں سے اور وہاں سے بہت لوگ یورپ اور امریکہ جا رہے ہیں۔ آپ بھی کیوں نہ قصد کریں مگر پہلے کسی یونیورسٹی
منتقل ہو جائیے، وہ ضروری ہے۔ جواب ضرور دیجئے۔ معلوم ہوا کہ یہاں بھی آپ کے خط نہیں آئے۔

مخلص

سید محی الدین قادری زور

(۱۴)

۲۹-۸-۱۰ء عزیز مکرم زاد لطفہٗ آپ کا کارڈ اور خط (جو حیدرآباد سے ری ڈائرکٹ ہو کر آیا) ایک ساتھ ملے۔ بڑی خوشی ہوئی مگر فکر پیدا ہو گئی کہ آپ کی صحت وہاں ٹھیک نہیں ہے۔ شاید تعمیر مکان کی مصروفیتوں کے باعث تکان ہو جاتی ہو۔ مجھے بھی ادارہ کی تعمیر کے زمانے میں ایسا ہی محسوس ہوتا تھا۔ آپ فکر نہ کریں اور اس کو بیماری نہ سمجھیں۔ انشاءاللہ ختم کار کے ساتھ ہی آپ چاق و چوبند ہو جائیں گے اور پھر پرانی توانائی اور مستعدی عود کر آئے گی۔

آپ کی ترقی کے امکانات ابھی بہت باقی ہیں۔ کسی ناکامی سے اثر نہ لیجئے۔ میری زندگی کا نمونہ آپ کے سامنے ہے۔ آپ تو ابھی کم عمر ہیں اور آپ کی بیوی بھی ماشاءاللہ کمارہی ہیں اس لئے "اثر نہ لیا کیجئے۔ پھر آپ تو صوفی منش انسان بھی ہیں۔

فراست اور بچوں اور سسرال کے تمام اصحاب اور خاص کر منعم صاحب کو حسب مراتب پہنچائیے۔ کبھی کبھی ذائقہ بدلنے ہی کی خاطر خط لکھا کیجئے۔ مخلص

سید محی الدین قادری زور

(۱۵)

۲۸-۴-۶۲ء عزیز مکرم۔ ۱۰ مارچ کا کارڈ ملا تھا۔ اس کے بعد سے آپ نے کیوں نہیں لکھا، سمجھ میں نہیں آتا۔ میں نے ۱۵ اپریل کو ایک کارڈ اور ۱۹ اپریل کو لفافہ بھیجا تھا۔ جس میں "رومی اور اقبال" پر مضمون بھی تھا۔ کیا یہ دونوں نہیں ملے؟

اب ایک اور مضمون "اردو اور قومی یکجہتی" بھیج رہا ہوں۔ اس ایک سال کے عرصے میں کئی مضمون لکھے ہیں۔ جس میں سے چند آپ کو بھیجوں گا تاکہ آپ جمع کرکے ایک مجموعہ اپنے مقدمے کے ساتھ وہاں چھپوا لیں۔ بعض مضمونوں کے عنوان یہ ہیں۔

۱۔ قدیم اردو ادب کی تحقیقات ۲۔ دکنی ادب ۳۔ کشمیری اور اردو ۴۔ رومی اور اقبال ۵۔ اردو اور قومی یکجہتی وغیرہ۔

آپ چاہیں تو کسی نام سے ان کو کتابی صورت میں چھاپ سکتے ہیں۔ اپنے ارادے سے مطلع کریں۔ مکان تو بن چکا ہوگا۔ آپ منتقل ہوئے یا نہیں۔ صحت کیسی ہے، بچے کیسے ہیں، وحید النسا کا کیا حال ہے، کچھ معلوم نہ ہوا۔ آپ کو چاہیئے کہ ہر ہفتہ دو ہفتہ پابندی سے لکھتے رہیں۔ بڑی فکر ہو گئی ہے کہ آپ کی صحت کیسی ہے ورنہ میرے ۱۵ اپریل کے کارڈ کا جواب تو اب تک آ جاتا۔

حیدرآباد سے خط آیا کہ پہلی مبارک باد تہذیب کے بچے کی آپ نے دی۔ مگر مجھے آپ نے نہیں لکھا۔

گو میں رہا رہین ستم ہائے روزگار لیکن ترے خیال سے غافل نہیں رہا

آپ کی یاد ہر وقت اور ہر موقع پر آتی ہے۔ عجیب بات ہے کہ جن کو قریب رکھنے کی کوشش کی وہی دور ہو گئے۔ آپ کا بھی وہی ہوا اور تہذیب کا بھی وہی۔ حالانکہ اس کے لئے باہر کے کتنے عمدہ عمدہ پیام آئے تھے۔ اس خیال سے نہیں دیا کہ قریب رہے مگر فطرت کی ستم ظریفی دیکھئے کہ شادی کے بعد ہی خود مجھے وہاں سے نکل جانا پڑا۔ اس سے پتہ چلا کہ قسمت میں عزیزوں سے فراق اور دوری لکھی ہے۔ اور اس کی وجہ سے ایک خاص سوز و کرب دل میں پیدا ہوتا رہتا ہے۔ آپ کا اردو نامہ بھی آج تک نہیں ملا۔ اور نہ کوئی اور کتاب یا رسالہ جس میں آپ کا ذکر یا تعلق ہو۔ مقبول نواب کے خط برابر آتے ہیں مگر آپ کے نہیں۔ اس لئے بھی زیادہ خیال رہتا ہے۔ بیگم صاحبہ ابھی وہیں ہیں معلوم کب آئیں۔ میں یہاں لڑکوں کے ساتھ ہوں اور ماں اور باپ دونوں کے فرائض انجام دے رہا ہوں۔

یہ ادیکھ قسمت میں لکھا تھا ہمیں معلوم نہ تھا مخلص

سید محی الدین قادری زور

(۱۶)

۶-۶-۶۲ء عزیز من آپ کا خط ملا تھا۔ میں اس انتظار میں تھا کہ بیگم صاحبہ اور بچیوں کو لے کر آیا۔ رضی پاشا کی تقویرے سے کام نکل گیا

واپس فرمادیں۔ اردو نامہ مجھے اب تک نہیں ملا۔ آپ خط پر تاریخ اور پتہ نہیں لکھتے۔ میرا مضمون " اردو اور قومی یک جہتی " ملا یا نہیں۔
ل نوب سے ملاقات ہوئی تھی۔ ان کی کتاب کی تصویریں اب تک تیار نہیں ہوئیں۔ خالد صاحب سے ملیں تو کہئے کہ عجلت کریں۔
دوست اب بھی ضد کرتے ہیں یا سنجیدہ اور سمجھ دار ہو گئے ہیں۔ فریں جماعت تو کافی بڑی ہوتی ہے۔ محنت کرنی چاہئے۔ استاد رکھئے۔
صاحب کیا لنڈورے ہی رہنا چاہتے ہیں۔
مکان اب تک مکمل ہو گیا ہوگا۔ صفر کے آخر میں یا ربیع الاول میں گھر بھرائی کیجئے اور منعم صاحب کی شادی۔ بچے سب اچھے ہیں۔ رفیع
نزلہ کھانسی ہے۔ قاضی صاحب کی میت میں شریک ہوئے تھے یا نہیں۔ توقیر تو آج کل میرپور میں ہے۔ جون تک رہے گی۔ آپ کو کوئی مناسب
ت مل جائے تو اچھا ہے۔ باقی خیریت۔

مخلص
سید محی الدین قادری زور

بنام سید محمد مورخ بیدری

(۱) مورخہ ۲۰ فروری ۱۹۵۵ء محب مکرم
میں نے آپ کا ذخیرۂ نوادر دیکھا۔ آپ نے بڑی محنت و جستجو سے بعض نہایت اہم و نادر کاغذات و کتب و تصاویر جمع کئے ہیں۔ اس پر میں آپ کو دلی مبارکباد دیتا ہوں۔ ہمارے اضلاع میں آپ جیسے اور اصحاب ذوق پیدا ہو جائیں تو ہمارے ملک کی تاریخ کے وہ گوشے بھی منظر عام پر آجائیں جو اب تک تاریکی میں ہیں۔ آپ کو تاریخ کا اچھا ذوق ہے اور تصنیف و تالیف سے بھی شغف ہے۔ ایسے اصحاب کی ملک اور عہدہ داران مقامی کو قدر کرنی چاہئے اور عملی طور پر مدد کر کے حوصلہ افزائی ہونی چاہئے۔ میں مکرر آپ کو مبارکباد دیتا ہوں اور امید کرتا ہوں کہ ادارۂ ادبیات اردو سے بھی گہرا تعلق رکھیں گے۔ مخلص

سید محی الدین قادری زور

(۱) [illegible] محبی مولوی سید محمد بیدری صاحب
آپ نے میری خواہش پر اردو کانفرنس میں شرکت کی زحمت گوارہ فرمائی اور تنگ وقت میں مضامین لکھے اور اردو سے متعلق گراں بہا کتب و کاغذات لا کر نمائش میں حصہ لیا۔ اس کے لئے میں آپ کا دلی شکریہ ادا کرتا ہوں۔
آپ جیسی ہستیاں اردو والوں کے لئے قابل فخر ہیں کہ اپنی بے مائگی اور تنگ دستی کے باوجود کام کئے جا رہی ہیں۔ اور اتنا عمدہ ذخیرہ نادر تاریخی اشیاء کا جمع کر رہی ہیں۔ خدا آپ کی ہمت میں ترقی دے اور کاموں میں برکت عطا فرمائے۔ پروفیسر سروری کا ایڈریس گزارا اُن گوڑہ حیدرآباد ہے بہ ہوئے مسجد سلیمہ خاتون کے پتہ پر لکھے کہ وہ آپ کا مضمون سب رس کے اڈیٹر سلیمان اریب صاحب کو دے دیں تا کہ چھپ جائے۔ میرا ارادہ عید کے بعد جون کی ۲ تاریخ تک بیدر آنے کا ہے۔ مولوی بدیع الزماں خاں صاحب کے ہاں ٹھیرنا ہوگا۔ ان کا بہت تقاضہ ہے۔ ان کے والد مولوی مظہر حسین صاحب بھی یہاں ان کی طرف سے کہتے رہتے ہیں۔ ان سے مل کر میرے بارے میں

مطلع فرما دیجئے۔ غالباً اب ان کی طبیعت اچھی ہوگی۔ مخلص

سید محی الدین قادری زورؔ

(۳) رفعت منزل۔ حیدرآباد ۳۰/۳/۱۹۵۴ء

محب مکرم۔ آپ کا کارڈ ملا۔ افسوس ہے کہ میں اس سے قبل جواب نہ دے سکا۔ کانفرنس ۳۰ اپریل و یکم مئی ہوگی۔ ۳۰ اپریل کو نمایش کا اکبولے صاحب وزیر تعلیم افتتاح کریں گے۔ اس میں آپ اپنی شرکت کریں۔ اور اردو سے متعلق ایک مقالہ بھی قلمبند فرمائیں۔ دوسرے مقالوں کے ساتھ یہ بھی چھپے اور موقع ملے تو پڑھا بھی جائے گا۔ کانفرنس میں ضرور شرکت فرمائیں۔ مخلص

سید محی الدین قادری زورؔ

(۴) رفعت منزل خیریت آباد۔ ۲۳-۴-۱۹۵۴ء

محب مکرم۔ کارڈ مورخہ ۱۰ اپریل ملا۔ شکریہ۔

نمایش میں صرف اردو سے متعلق اشیاء رکھی جائیں گی۔ عربی۔ فارسی وغیرہ نہیں۔ نمایش کا انتظام ڈاکٹر راحت صاحب کے سپرد ہے۔ اور وہ ادارہ کو سب جگہ دینا چاہتے ہیں۔ پھر بھی میں ان سے کہہ دیتا ہوں کہ کچھ جگہ آپ کے لئے رکھیں مگر عین وقت پر گڑبڑ ہو جائے گی۔ آپ کے مضمون کا عنوان کیا ہے۔ آج کل یہاں ترقی پسندی زور پر ہے۔ نمایش اشتی گرلز ہائی اسکول میں ہوگی۔ آپ سیدھا وہیں پہنچ جائیں۔ وہ نظامت تعلیمات کے سامنے کا مدرسہ ہے۔ میں نے کہہ دیا ہے کہ آپ اردو سے متعلق جو چیزیں لائیں اس کے لئے جگہ رکھی جائے فقط مخلص

سید محی الدین قادری زورؔ

(۵) مولوی سید محمد صاحب بیدری

اس دفعہ قیام بیدر کے زمانہ میں آپ سے ملنے اور آپ کے دولت خانہ میں آکر آپ کے باقی ماندہ خزینہ نوادر کو دیکھنے سے بڑی مسرت حاصل ہوئی۔ آپ نے واقعی بڑی محنت سے کام کی اور نادر کتابیں جمع کیں۔ افسوس ہے کہ آپ ان سے خاطر خواہ مستفید نہ ہو سکے۔ اور نہ آپ کی جستجو اور تلاش کی قدر کی گئی۔ آپ کا بہت سا ذخیرہ نادر و نایاب حیثیت رکھتا ہے۔ کاش کہ اس کی قدر کی جائے اور آپ کی محنت و کاوش کی داد ملے۔ آپ نے جس خلوص کے ساتھ میرا استقبال کیا اور تحفے عطا کئے اس کا دلی شکریہ قبول فرمائیے۔ بیگم صاحبہ کو اس کا افسوس اور بہت قلق رہا کہ ان کو آپ کے پاس اترنے نہیں دیا گیا فقط مخلص

سید محی الدین قادری زورؔ

(۶) رفعت منزل خیریت آباد ۳۰/۳/۱۹۵۵ء۔ محب مکرم

کارڈ کے لئے شکر گزار ہوں۔ مثنوی حسن المطلب پر ضرور مضمون لکھئے۔ اس کے مصنف میر سلطان علی طالب کے بارے میں اب تک کوئی معلومات حاصل نہ ہو سکیں۔ آپ جو لکھیں گے وہی مستند ہوگا۔ مثنوی کے گہرے مطالعہ سے آپ کو معلومات ہوں گی وہی لکھ دیجئے۔ سب رس میں یہ مضمون ضرور چھپ جائے گا۔ فقط مخلص

سید محی الدین قادری زورؔ

ادارۂ ادبیات اردو خیریت آباد دکن

نشان: ۳۵۰، ۲۴/۸، ۱۹۵۵ء

محترمی تسلیم۔ مکتوب گرامی مورخہ ۱۹ اگست اور اس کے ساتھ ایک مضمون (مثنوی حسن المطلب) کا شکریہ۔ یہ مضمون انشاء اللہ سب رس کے قریبی اشاعت میں چھپ جائے گا۔ امید کہ جناب بخیر و عافیت ہوں گے۔ مضمون بڑی محنت سے آپ نے لکھا ہے مبارک فقط مخلص

سید محی الدین قادری زور

بفوت منزل خیریت آباد۔ ۶-۷-۱۹۵۶ء

محبت مکرم۔ آپ کا کرم نامہ ملا۔ یہ معلوم کر کے خوشی ہوئی کہ صدر جمہوریہ نے آپ کے جمع کیے ہوئے خزانہ کو بہت پسند فرمایا۔

میں نے کل صبح شاہد صاحب کے ذریعہ سے آپ کی وہ تصویر بھجوائی ہے جس میں آپ صدر کے ساتھ کھڑے ہیں۔ مبارک ہو۔ آپ نے اپنی تصنیف کردہ کتاب کا جو نسخہ تحفتہً صدر جمہوریہ کی خدمت میں پیش کیا ہے غالباً اس کی نقل آپ کے پاس ضرور ہوگی۔ میں نے کہا تھا کہ آپ اپنے ذخیرہ کی ایک فہرست روانہ فرمائیں تاکہ اس سے آپ کو کچھ فائدہ پہونچے۔ ورنہ خالی زبانی تعریف سے تو آپ کا پیٹ نہ بھرے گا۔ فقط مخلص

سید محی الدین قادری زور

۸-۱۲-۶۰ء محبِ مکرم۔ آپ کا کارڈ مورخہ ۲-۱۲-۶۰ء وصول ہوا تھا۔ میں نومبر کے مہینہ میں زیادہ تر دلی میں رہا اس لئے جواب نہ دے سکا۔

آپ بیدر اور گولکنڈہ کے عنوان پر ضرور مقالہ لکھیئے اور ضرور لکھئے۔ شاید ۱۲ جنوری کے اجلاس میں جو حافظ محمد ابراہیم صاحب کی صدارت میں ہوگا اس کو سنانا ہوگا۔ مولوی بدیع الزماں خاں صاحب کی صحت اب کیسی ہے۔ علالت کی خبر سنی تھی۔ میری طرف سے جا کر ملئے اور کیفیت سے مجھے جلد بواپسی مطلع فرمائیے۔ میری طرف سے ان کو سلام کہنا فقط مخلص

سید محی الدین قادری زور

نوٹ:۔ کشمیر سے کراچی کے پتہ پر میرے نام قبلہ زور مرحوم کا آخری خط۔

۹ تلسی باغ سری نگر۔ ۲۱ جون ۱۹۶۲ء

محب مکرم زاد لطفہٗ تسلیم۔ کرم نامہ بلا تاریخ وصول ہوا۔ پتہ اوپر درج ہے۔ اس پتہ پر مراسلت فرمائیں۔ آپ کی خیر و عافیت معلوم کر کے مسرت ہوئی۔ اور آپ کی پریشانیاں اور فکریں دور ہو گئیں یہ معلوم کر کے مزید اطمینان ہوا۔ اللہ تعالیٰ تا دیر آپ کو اپنے خاندان کے سر پر سلامت باکرامت رکھے اور وہاں حیدر آباد کی تہذیب و کلچر کی ترویج اور علم و ادب کی خدمت کا موقع عطا فرمائے۔

افسوس ہے کہ دکن روز بروز اجڑتا جا رہا ہے اور لائق اور اچھے لوگ ختم ہوتے جا رہے ہیں۔ بیدر چھوڑتے

غم آپ کو آخر وقت تک رہے گا مگر "وطن میں رہ آؤ۔ کیا رہنا جو جھپے آبرو رہنا" بیگم صاحبہ اور بچوں ابھی اوائل جون میں لے آیا ہوں۔ ۱۰ر مئی کو حیدرآباد گیا تھا اور چار روز رہ کر آیا۔ کیا آپ وظیفہ پر نہیں جائیں گے۔ صدیقی صاحب تو آتے جاتے رہتے ہیں اور اس لئے ملاقات کی امید رہتی ہے۔

شاہد صاحب کو میرا سلام کہیئے۔ اُن سے ملتے رہیئے۔ بڑی خوبیوں کے انسان ہیں اور حیدرآبادی اور اخلاق کے مکمل نمونہ۔

مخلص

سید محی الدین قادری زور

ڈاکٹر زور مرحوم کی خدمات علمی و ادبی کسی فرد یا ادارے کی سند و تحسین کی محتاج نہیں۔ وہ ایک بلند پایہ محقق صاحب بصیرت نقاد تھے۔ انھوں نے علم و ادب اور زبان اردو کو ایک شاندار مقام تک پہنچایا۔ اپنی زندگی وقف کر دی تھی۔ وہ ہماری زبان اور ادب کی تاریخ میں ہمیشہ نمایاں طور پر یاد کئے جائیں گے۔

جمیل الدین عالی

معتمد انجمن ترقی اردو

ادارۂ "الشجاع" کے لئے یہ خبر انتہائی اندوہناک ہے کہ ۲۴ر ستمبر کو ادارۂ ادبیات اردو حیدرآباد کے بانی ڈاکٹر زور اچانک ہم سے ہمیشہ ہمیشہ کے لئے جدا ہو گئے اور اردو زبان ایک مخلص خدمت گذار سے محروم ہو گئی۔ ڈاکٹر زور اردو کے انشاپرداز، بلند پایہ شاعر، ممتاز محقق اور عظیم نقاد تھے۔ گزشتہ تیس سال سے وہ اردو کی ترویج و اشاعت کے لئے سرگرم عمل تھے۔ قدیم اردو کی تلاش و تحقیق کا سہرا مرحوم کے سر ہے۔ آزادی کے بعد ہندوستان میں ڈاکٹر زور نے اردو کے تحفظ و بقا کے لئے جو گرانقدر خدمات انجام دی ہیں مورخ اور اردو کے پرستار انھیں کبھی فراموش نہیں کر سکیں گے۔

مرحوم لسانی عصبیت کے حوصلہ شکن اور صبر آزما حالات میں جس جرأت اور بے باکی سے اردو کی خدمت کر رہے تھے اس کی مثال ہندوستان میں نہیں مل سکتی۔ موجودہ دور میں جبکہ اردو کو مخلص خدمت گزاروں کی خاص طور پر ضرورت ہے ڈاکٹر زور کی موت اردو ادب کا ایک ایسا نقصان ہے جس کی کوئی تلافی نہیں ہو سکتی۔

(ماہنامہ "الشجاع" کراچی۔ دسمبر ۱۹۶۲ء)

بنام محترمہ جہاں بانو نقوی

(۱)

محترمہ

آپ نے جتنے مضامین بھیجے تھے۔ سب چھپ چکے۔ حمیرۃ النساء بیگم صاحبہ کا مضمون بھی اپریل میں آ رہا ہے۔ محشر صاحب قبلہ کی غزل دکھی ہوئی ہے آج تک سب رس میں کوئی فارسی کلام نہیں چھپا۔ اگر اردو کلام سے نوازیں عنایت ہوگی۔

آپ کے مضمون کا انتظار رہے گا اور آپ کے تلامذہ کے مضامین کا بھی جواب خود استاد بن گئے ہیں۔ زینت کو کیوں خاموشی چھوڑ دیا ہے؟ کیا ان کے یہاں تنقید کے لئے کتابیں بھجوائی جائیں؟

مخلص

۱۲/۳ ء سید محی الدین قادری زورؔ

(۲)

محترمہ

عنایت نامے کا شکر گزار ہوں۔ رفیعہ سلطانہ تک میرا سلام اور مضمون (افسانہ) کا شکریہ پہنچا دیجئے۔ آپ کی تو ممنون تو عرصے سے ہوں۔ تنقید کے لئے کتابیں بھی بھجوا دوں گا۔ اکبر کی غزل ملی ان کو الگ شکریہ کا خط لکھا ہے۔ آپ کا مضمون کہاں ہے؟ مخلص

۲۶/۳ ء سید محی الدین قادری زورؔ

(۳)

محترمہ

کرم نامہ کے لئے سراپا سپاس ہوں۔ جلسے کی صدارت کی دعوت غالباً کسی تقریر کے لئے مشروط نہ ہوگی۔ ۱۴ ستمبر کو ۳ بجے آپ یہ جلسہ منعقد فرمائیں اور مجھے مطلع فرما دیں تو حاضرِ خدمت ہو جاؤں گا۔ کوشش کروں گا کہ ۳ بجے وقت کے ساتھ حاضر ہو جاؤں گا۔ مخلص

محی الدین قادری زورؔ

بنام ڈاکٹر خلیق انجم

(۱)

رفعت منزل۔ خیریت آباد
۴-۱۰-۵۷ء

محب کرم

کرم نامہ مورخہ ۶-۹-۵۷ کا شکریہ۔ میں شاید ۱۲ اکتوبر کو دلی میں رہوں گا۔ ماہنامۂ آجکل کی کمیٹی ہے۔ عرش صاحب سے فون پر آپ کو میرا پروگرام معلوم ہو جائے گا۔

آپ دلی میں کہاں رہتے ہیں؟ میں جگن ناتھ آزاد صاحب کے یہاں ٹھہرتا ہوں۔ آپ کی دعوت کا شکریہ۔ میں ایک دن زیادہ سے زیادہ دو دوستوں کے لئے آتا ہوں۔

مخلص

سید محی الدین قادری زور

(۲)

رفعت منزل۔ خیریت آباد
۲۴-۱۰-۵۷ء

عزیزی خلیق انجم صاحب

آپ سے مل کر بڑی خوشی ہوئی۔ میں خیریت سے وقت پر حیدرآباد پہنچ گیا۔ افسوس ہے کہ میں آپ کے گھر پر نہ آسکا اب کے ضرور تھوڑی دیر کے لئے آؤں گا اور آپ کے دوستوں اور ساتھیوں سے بھی ملوں گا۔ نثار صاحب کو اور آپ کے دوسرے شاعر دوست صاحب کو میری طرف سے سلام کہیئے۔ ان کا نام یاد نہیں ہے۔ یہ دیکھ کر خوشی ہوئی کہ دلی کے مسلم نوجوان اب ابھر رہے ہیں۔ اور جو خلا محسوس ہو رہا تھا وہ انشاءاللہ آپ جیسے نوجوانوں کے باعث پر ہو جائے گا۔ آپ سے میری بڑی توقعات وابستہ ہیں۔

مخلص

سید محی الدین قادری زور

(۳)

رفعت منزل۔ خیریت آباد

۱۰-۱۲-۵۷ء

محب مکرم

آپ کے خط مورخہ ۷ر ڈسمبر کے جواب میں عرض ہے کہ میں آپ کے پہلے خطوں کے جواب دے چکا ہوں۔ تعجب ہے کہ آپ کو نہ ملے۔

میں خفا کیوں ہوں گا؟ میں تو خوش ہوں کہ دلی میں آپ جیسے نوجوان موجود ہیں جن کا مستقبل روشن ہے اور جو اپنے وطن کے نام کو درخشاں کر سکیں گے۔

میں آج کل یوم محمدؐ قلی قطب شاہ کے انتظامات میں مصروف ہوں اور بہت مصروف۔ اس لئے کارڈ کے ذریعے سے اطلاعاً رسید بھیج رہا ہوں۔ دلی آنے کی ابھی کوئی اطلاع یا دعوت نہیں آئی ہے۔ ۲۹ر ڈسمبر کو اردو کانفرنس کی صدارت کے لئے برہان پور سے دعوت آئی ہے۔ شاید وہاں جاؤں۔

دلی جب آؤں تو آپ کو پہلے سے مطلع کردوں گا۔

مخلص

سید محی الدین قادری زور

میں خطوں کے جواب عموماً فوراً دیتا ہوں سوائے علالت یا انتہائی مصروفیت کے۔

(۴)

رفعت منزل۔ خیریت آباد

۱۴-۲-۵۸ء

محب عزیز

آپ کا کرم نامہ ملا۔ شکریہ۔ میں نے جگن ناتھ آزاد صاحب سے پہلے ہی وعدہ کر لیا ہے کہ ان کے یہاں جاؤں گا البتہ آپ کے خلوص و محبت کی خاطر ایک روز آپ کے یہاں گذاروں گا۔ امید کہ آپ بُرا نہ مانیں گے۔

میں ۲۳ر کی صبح میں دلی پہنچ رہا ہوں اور ۲۵ر کو واپسی کے لئے ریزرو کرانے آزاد صاحب کو اطلاع دے دی ہے۔

مشاہیر شعرائے دہلی کی یادگاروں اور آخری آرام گاہوں پر تختیاں لگانے کے بارے میں آپ نے اب تک کیا کام ہے۔ ہو سکے تو ایک کمیٹی ان تین دنوں میں سے کسی ایک معین کر لیجئے۔ اکاڈیمی کی کمیٹی اتوار کو ۳ بجے سے ہے۔ اس کے سوا کوئی اور وقت مقرر فرمائیں۔

مخلص

سید محی الدین قادری زور

(۵)

رفعت منزل۔ خیریت آباد۔

۷۔۳۔۶۵ء

محب غلیق سلمہٗ

میں دلی سے آکر ایسا مصروف رہا کہ وقت کیسے گزر گیا کچھ پتہ نہ چلا۔ آپ نے اور اسلم پرویز صاحب نے اس دفعہ بڑی زحمت اٹھائی۔ آپ کی والدہ صاحبہ اور بہنوں کو بھی میری وجہ سے پکوان کی تکلیف ہوئی۔ سب کا شکر گزار ہوں۔

آپ کی مرتب کی ہوئی کتاب معراج العاشقین بہت دیدہ زیب اور عمدہ چھپی ہے اور اس میں نظموں کی شرکت کے باعث خواجہ بندہ نواز کا مکمل مجموعۂ اردو یکجا ہو گیا ہے۔ یقین ہے کہ یہ کاوش مقبول ہوگی۔

آپ دلی کے شعراء و مشاہیر کی آخری آرام گاہوں پر مضامین کا سلسلہ جلد شروع کر دیجئے۔ تصویر کے ساتھ مکمل جغرافیۂ محل اور تفصیلات ضرور لکھئے۔ یہ کام آپ کی شہرت کا باعث بھی ہوگا اور ضروری بھی ہے۔ آپ کے کالج میں اردو کا پوسٹ قائم ہو جائے گا۔ آپ کے پرنسپل صاحب سے موٹر میں گفتگو رہی۔ خدا کرے کہ آپ نہ صرف مستقل ہو جائیں بلکہ مسلسل ترقی کرتے رہیں۔

پی ایچ ڈی کی جلد تکمیل کر لیجئے۔ یہ ڈگری مزید ترقیوں میں ممد و معاون ثابت ہوگی۔ وہاں کے حالات لکھتے رہیئے۔

مخلص

سید محی الدین قادری زورؔ

(۶)

رفعت منزل۔ خیریت آباد

۱۱۔۳۔۶۵ء

عزیز مکرم

آپ کا کارڈ وصول ہوا۔ اس سے پہلے ایک خط ڈال چکا ہوں آج ہی ڈاکٹر محمد بن عمر صاحب مرحوم کے بھائی کی اطلاع ہی ہے کہ ان کی کتابیں ڈاکٹر تیواری کے نام بذریعہ وی پی بھیج دیں۔ ان کا گذشتہ ماہ ترکی میں غریب الوطنی میں انتقال ہو گیا ہے۔

امید ہے کہ آپ بخیر و عافیت ہوں گے۔ انڈیا بک ٹرسٹ کو لکھا ہے کہ آپ کو ترجمہ کا کام دیں۔ انھوں نے نام پوچھے تھے۔ وہاں سے آپ کو اطلاع ملے گی۔

(۷)

رفعت منزل۔ خیریت آباد

۲۴۔۴۔۶۵ء

محب مکرم

آپ کا ایر لیٹر آیا تھا۔ میں نے فوراً محمد بن عمر صاحب کے بھائی کو اطلاع کر دی تھی کہ کتابیں بھجوا دیں۔ ملیں یا نہیں۔

اسلم پرویز کی غزل بھی سب رس میں چھپی تھی وہ سب رس ملا ہوگا۔
کیا آپ لائبریری سائنس کے امتحان میں شریک ہو رہے ہیں۔ بہت اچھا کیا۔ اسی طرح اپنی علمی و ادبی فتوحات میں اضافہ کرتے رہیئے۔
پی ایچ ڈی میں بھی داخلہ لے لیجیے۔ ڈاکٹر فاروقی صاحب اور اپنے پرنسپل کو ملا کر رکھئے۔ ان دونوں سے ملتے رہیئے اور ان کے کاموں اور دلچسپیوں میں ہاتھ بٹاتے رہیئے۔ دوسری باتوں سے زیادہ ان کا خیال رکھیئے۔
خدا وہ بھی دن لائے گا کہ آپ دلی میں اردو کے سب سے بڑے ماہر اردو رہیں گے۔ اس کے لئے بڑی ریاضت اور سعی کی ضرورت ہے چونکہ آپ میں صلاحیتیں ہیں اس لئے آپ کو لکھ رہا ہوں۔ ان صلاحیتوں سے فائدہ اٹھایئے۔ ورنہ ضایع جائیں گی۔ وقت بڑا قیمتی ہے۔ اس کا خیال رکھیئے۔
ہمیشہ بڑے لوگوں سے ملتے رہیئے۔ ان سے تعلقات بڑھایئے عرش، آزاد صاحبان وغیرہ سے بھی ملتے رہیئے۔ حسن ثانی نظامی صاحب کے یہاں بھی کبھی کبھی جاتے رہیئے۔ یہ اچھے لوگ ہیں۔
اپنی والدہ صاحبہ کو سلام اور بہنوں کو دعائیں پہنچایئے۔ اسم بامسمیٰ ثابت ہونے کی کوشش کرنی چاہیئے۔
دہلی میں مشاہیر اردو کے مزارات کے سلسلے میں آپ کو غیبی فتوح بھی حاصل ہوں گی۔ جو دوسروں کے نام نیک کو زندہ رکھتا ہے خدا اس کے نام اور کام کو ضایع نہیں ہونے دیتا۔
زیادہ کیا لکھوں آپ خود ماشاء اللہ بہت ذہین و فہیم ہیں۔ خط کالج کے پتے پر ملے یا نہ ملے اطلاع دیجئے۔

مخلص
سید محی الدین قادری زور

(۸)

رفعت منزل۔ خیریت آباد
۱۲۔ ۲۔ ۵۹ء

محب مکرم
میں صبح ۱۲ فروری کو دلی آرہا ہوں۔ ۱۰ یا ۲۲ کو ۵ بجے واپس ہوجاؤں گا۔ معلوم نہیں آپ کیوں خاموش ہیں۔ عرصہ سے کوئی اطلاع نہیں ملی۔ کیا کر رہے ہیں۔ آپ کے دوست کیسے ہیں۔ بی اے پاس ہوگئے یا نہیں۔ شاید ایک سال سے ان کو بھی نہیں دیکھا۔
میں بے حد مصروف ہوں اور روز نئے نئے کاموں سے سابقہ پڑتا ہے۔ آپ کی والدہ صاحبہ اور بہنیں کیسی ہیں۔ کوشش کیجئے کہ اس دفعہ ملاقات ہوجائے۔ میں غالباً اپنے ایک شاگرد میر حسن صاحب (۲۶، ہیٹوڈی ہاؤس نئی دہلی) کے یہاں ٹھہروں گا۔ ظ انصاری صاحب دلی میں ہیں یا چلے گئے۔

مخلص
سید محی الدین قادری زور

(۹)

رفعت منزل۔ خیریت آباد
۱۹-۱-۶۰ء

محب کرم

خط ملا تھا۔ میں یوم محمد قلی قطب شاہ کے انتظامات میں مصروف تھا اس لئے جواب نہ دے سکا۔ مکین تشریف لائے تھے۔ ان سے تفصیلات معلوم ہوں گی۔

اب ادارے کی عمارت میں سامان کی منتقلی میں مصروف ہوں۔ مارچ میں انشاء اللہ افتتاح ہو جائے۔ بعد آپ خوشی سے تشریف لائیں۔

اسلم پرویز کہاں ہیں کیا کر رہے ہیں ان کا اکثر خیال رہتا ہے۔

مخلص
سید محی الدین قادری زورؔ

(۱۰)

رفعت منزل۔ خیریت آباد

محب کرم

میں ۱۰ رنومبر کی صبح دلی آ رہا ہوں۔ ۱۱ رکو ساہتیہ اکاڈیمی کے اڈوائزری بورڈ میں شرکت کروں گا۔ اور ۱۲ء واپس ہو جاؤں گا۔

میرا قیام حیدرآباد ہاؤس میں رہے گا آپ اور اسلم پرویز صاحب ملیں تو خوشی ہوگی۔

مخلص
۶-۱۱-۶۰ء سید محی الدین قادری زورؔ

(۱۱)

محب مکرم

میں پہلی ڈسمبر کو دلی آ رہا ہوں۔ آپ کا خط اور شاہراہ کے تبادل کتب کا خط ملا۔ ان کو جواب دے دیا فہرستیں بھیجدی ہیں۔ ادارے کی کتابیں میں ساتھ لاؤں گا۔ اور آپ ان کی کتابوں کا بنڈل تیار رکھیے۔ ان کو دیکر ان کا بنڈل لے لیجئے۔ باقی بالمشافہ۔

مخلص
سید محی الدین قادری زورؔ

(۱۲)

سی باغ سری نگر
۰-۸-۶۱ء

عزیز مکرم زاد لطفہٗ

میں پٹھان کوٹ سے ۱۸ اگست کو ۴۰۔۹ رات کی گاڑی سے نکل کر صبح ۱۹ اگست دلی پہنچ رہا ہوں۔ ریل گاڑی کا غالباً 112 UP ۱۶/ ہے۔ اگر آپ کو سہولت ہو تو اسٹیشن پر مجھ سے ملئے۔ باقی بالمشافہ۔

اسی روز حیدرآباد جا رہا ہوں۔ نارنگ صاحب اور دوسرے احباب کو مطلع فرما دیں۔ میں یہاں سے بذریعہ بس نکل رہا ہوں۔ اگر بس وقت پر پٹھان کوٹ نہ پہنچا سکے تو دوسرے دن دلی پہنچوں گا۔ دعا کیجئے کہ وقت پر حسب پروگرام پہنچ جاؤں۔

مخلص
سید محی الدین قادری زور

(۱۳)

سی باغ۔ سری نگر
۱۰-۹-۶۱ء

محب مکرم۔ تسلیم

آپ کا کارڈ ملا۔ یہ معلوم نہ ہوا کہ آپ رام پور کب گئے تھے اور کیوں گئے تھے۔ اسلم پرویز صاحب سے بھی دلی میں ملاقات ہو سکی۔

شاید ڈاکٹر نارنگ صاحب ریڈر مقرر ہو گئے ہیں؟ کیا یہ خبر صحیح ہے؟ عرصے سے ان سے بھی مراسلت بند ہے۔

مخلص
سید محی الدین قادری زور

(۱۴)

سی باغ۔ سری نگر
۱۲-۹-۶۱ء

انجم صاحب آپ کا خط ملا۔ خوشی ہوئی کہ آپ نے یاد فرمایا۔ نارنگ صاحب کی ریڈری کی خبر سے بھی خوشی ہوئی۔ اسلم پرویز صاحب کیا ہوا۔ اب مجھے ان کی فکر ہے۔ آپ کی پی ایچ ڈی کا بھی خیال رہتا ہے۔

مجھے ان پیرانِ پارسا کے بارے میں کچھ علم نہیں جن کا آپ نے خط میں ذکر فرمایا ہے۔ امید کہ آپ کے یہاں سب بخیریت ہوں گے۔ نثار احمد فاروقی صاحب کہاں ہیں اور کیسے ہیں۔

مخلص
سید محی الدین قادری زور

(۱۵)

وتلسی باغ۔ سری نگر

۱۶-۳-۶۲ء

محب عزیز

آپ کا کرم نامہ مورخہ ۹ مارچ ملا۔ حیدرآباد کے لئے خان بہادر تارا پور والا معتمد ہز اکز الٹیڈ ہائی نس دی نظام چیری ٹیبل کے نام انگریزی میں ایک درخواست بھیجئے۔ اور کشمیر کے لئے جناب بخشی صاحب سے مل کر کہنا ہوگا جب کہ وہ دلی آئیں۔ یہ دونوں صورتیں اور زیادہ بااثر ہوسکتی ہیں۔ اگر آپ کوئی انجمن یا ادارہ بنا کر اس کی طرف سے درخواست بھیجیں یا موجودہ انجمن کی طرف سے کارروائی کریں۔ انفرادی طور پر اثر کم ہوگا۔

امید کہ آپ اور اسلم پرویز بخیر و عافیت ہوں گے۔ میں ۳۰ مارچ کو دلی آرہا ہوں۔ پرتھوی راج روڈ پر کشمیر امپوریم میں ٹھہروں گا۔

مخلص

سید محی الدین قادری زور

بنام اسلم پرویز

وتلسی باغ۔ سری نگر

۲۵ اپریل ۶۲ء

عزیزمن سلمہٗ

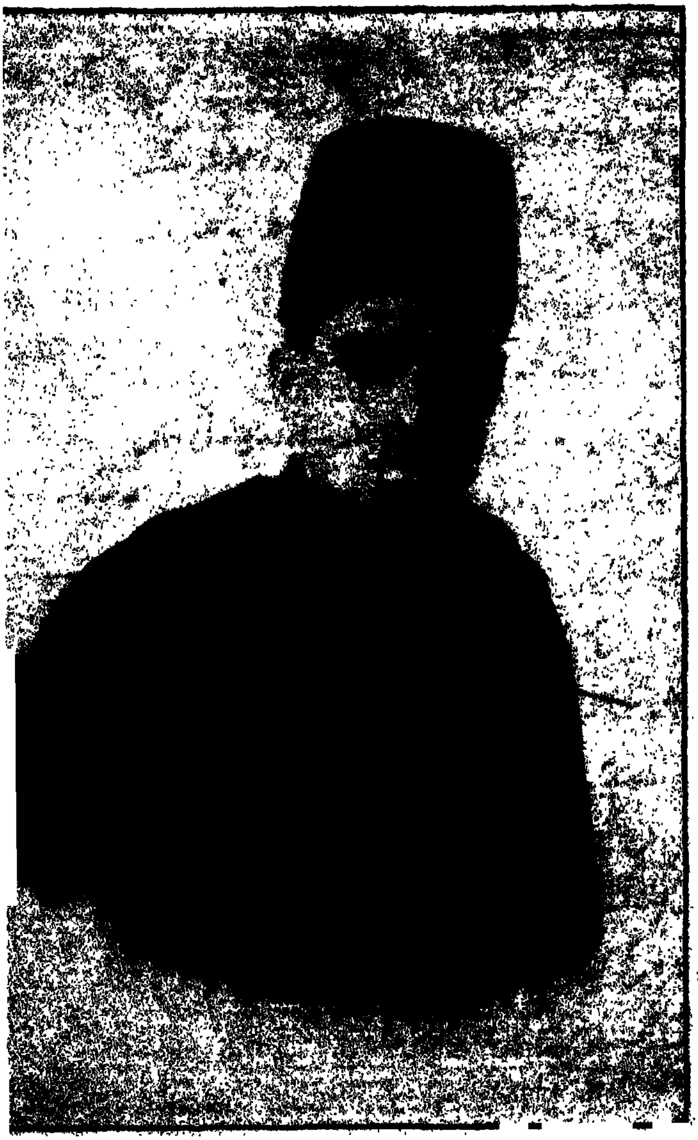
آپ کے دو خط پیش نظر ہیں۔ میں ابھی جموں سے واپس ہوا ہوں وہاں اس ماہ کئی روز قیام کرنا پڑا کیونکہ مختلف کام تھے۔ آپ کی کتاب ملی۔ کچھ لکھوں گا۔ بسمل سعیدی صاحب کا میں خود معتقد ہوں اور ان کے لئے جو کچھ کرسکتا تھا کردیا ہے۔ ایک کمیٹی ہے۔ شاید اس کے بعد رقم ایصال ہو۔ ان کو میری طرف سے مطمئن کردیجئے۔

ڈاکٹر خلیق انجم اور آپ سے میری بہترین توقعات ہمیشہ وابستہ رہیں گی۔

مخلص

سید محی الدین قادری زور

ڈاکٹر زور
کی
نظمیں اور غزلیں



چاندنی

پھر ذکرِ رونقِ شبِ مہتاب آگیا   سامانِ وحشتِ دلِ بے تاب آگیا
نقشے شبِ وصال کے آنکھوں میں پھر گئے   گردوں پہ بادلوں میں مہ و مہر گھر گئے
میں اور یادِ نعمتِ دیدار الاماں   گرتی ہیں خرمنِ دلِ مضطر پہ بجلیاں

موسم وہی فضا وہی کہسار بھی وہی
اے کاش مل سکے نگہِ یار بھی وہی

ہوگا یونہی فلک پہ سدا ماہ ضوفشاں   مل جائے میرا چاند ہے وہ چاندنی کہاں
میں ہوں وہی مگر وہ طبیعت وہ دل نہیں   وہ ولولے نہیں وہ امنگیں نہیں رہیں
وہ جوشِ دادخواہیٔ بیداد اب کہاں   وہ شکوہ ہائے خاطرِ ناشاد اب کہاں

اب وہ خیالِ مست مئے خواب ہو گئے
غرقِ الم نشاط کے اسباب ہو گئے

نشتر دل و جگر میں چبھوئے ہوئے سے ہیں   نغمے مرے رباب میں سوئے ہوئے سے ہیں
آتی ہیں یادِ شوق کی سرمستیاں مجھے   تڑپاتی ہیں زمانہ کی نیرنگیاں مجھے
اب دل میں خواہشِ شبِ مہتاب ہی نہیں   تفریح و انبساط کے اسباب ہی نہیں

ہاں عمر بھر کریں گے تجھے یاد چاندنی
اس قیدِ غم سے ہوں گے نہ آزاد چاندنی

آسمان کی زبان سے

عرصۂ امکاں پہ ہوں دیرسے میں حکمراں
حکم سے میرے رواں
بادلوں کے کارواں
کشتیوں کے بادباں
باغ کی سب ڈالیاں
عرصۂ امکاں پہ ہوں دیرسے میں حکمراں

۲

قافلۂ زیست کا کارواں سالار ہوں
مخزنِ اسرار ہوں
مطلعِ انوار ہوں
مرجعِ افکار ہوں
درپئے رفتار ہوں
قافلۂ زیست کا کارواں سالار ہوں

۳

سامنے میرے ہوئیں معرکہ آرائیاں
شہروں کی زیبائیاں
قوموں کی رعنائیاں
حسن کی پرچھائیاں
عشق کی رسوائیاں
سامنے میرے ہوئیں معرکہ آرائیاں

۴

حامیٔ تدبیر ہوں مالکِ تقدیر ہوں
عرش کی تفسیر ہوں
خلد کی تصویر ہوں
حسن کی تنویر ہوں
خواب کی تعبیر ہوں
حامیٔ تدبیر ہوں مالکِ تقدیر ہوں

۵

باایں ہمہ برتری خاک میں آلودہ ہوں
میں نہ تو محدود ہوں
اور نہ مفقود ہوں
نام کو موجود ہوں
شعلۂ بے دودہ ہوں
باایں ہمہ برتری خاک میں آلودہ ہوں

افسانۂ محبّت

بھر دے مئے الفت سے ساقی مرا پیمانہ آباد رہے دائم یہ عشق کا مے خانہ
ہنستوں کو جو رُلوا دے مستوں کو جو تڑپا دے مُردوں کو جو گرما دے وہ ہے مرا افسانہ
ہیں یاد ابھی وہ دن تھی تیری جبیں سادہ عاری تھا جفا سے تو تھا جور سے بیگانہ
تھا دل نہ غمزے کا عشوے سے نہ دلچسپی انداز سے کچھ مطلب شوخی سے نیارانہ

ــــــ

وہ راحتِ جاں بننا وہ روٹھ کے من جانا وہ من کے بگڑ جانا وہ شوق کا اکسانا
وہ نور کی کرنوں کا چہرہ پہ چمک جانا وہ وقتِ خرام ان کے اعضا کا لچک جانا

ــــــ

مخمور سی آنکھیں وہ محجوب سی وہ باتیں محجوب ادائیں وہ رفتار وہ مستانہ
مجنوں کو ہو حیرانی، وامق کو پریشانی فرہاد کو ہو سکتہ، خسرو بھی ہو دیوانہ

آباد ہے الفت سے داتا کی عنایت سے
دنیا مری نظروں کی دل کا مرے کاشانہ

رہبرِ منزل کی جدائی

آج گلشن کے اجڑنے کی خبر آئی ہے
دلِ ناشاد پہ کلفت کی گھٹا چھائی ہے
نہ وہ ساقی ہے نہ وہ انجمن آرائی ہے
چار سو مجمعِ اغیار ہے رسوائی ہے

رقص کرتے نظر آئیں گے نہ ارماں دل میں
کوئی بے تاب رہیگا کوئی حیراں دل میں

عندلیبانِ چمن کا نہیں پرساں کوئی
نظر آتا نہیں اب شعلۂ عریاں کوئی
پھول ہیں باغ میں لیکن نہیں خنداں کوئی
اس گلستاں کو کہے گا نہ گلستاں کوئی

نظر آتا نہیں سامانِ مسرت باقی
اب وہ اگلی سی نہ راحت ہے نہ فرحت باقی

شعلے اٹھنے ہی کو تھے وادیٔ سینا سے ابھی
مست آنکھیں نہ ہوئیں کیفِ تماشا سے ابھی
لہریں اٹھتی ہیں مری چشمِ تمنا سے ابھی
جان آئی نہ تھی انفاسِ مسیحا سے ابھی

سیکھتے تھے ابھی پرواز پرِ پروانہ
تشنہ لب تھے ابھی زندانِ درِ میخانہ

کوئی بے وقت یہ محفل کا اجڑنا دیکھے
راہ میں رہبرِ منزل کا اجڑنا دیکھے
شاہِ حسن کی محفل کا اجڑنا دیکھے
کس طرح اپنے کوئی دل کا اجڑنا دیکھے

یاد تڑپائے گی زور اس کی ہمیشہ ہم کو
نہ ملا ہے نہ ملے گا کوئی ایسا ہم کو

جامعۂ عثمانیہ اور نونہالانِ دکن

مژدہ باد اے ہم صفیرو پھر بہار آنے کو ہے   شاہدِ ملکِ دکن پر پھر نکھار آنے کو ہے
پھر صبا آنے کو ہے بے اختیار آنے کو ہے   جوش پر پھر رحمتِ پروردگار آنے کو ہے

ظلمتِ جہلِ زبوں کافور ہوتی جائے گی
کلفتِ ادبار و نکبت دور ہوتی جائے گی

آج کل غنچوں کی وہ دل تنگیاں باقی نہیں   کشت زاروں میں تردد کے نشاں باقی نہیں
پیچ سنبل میں میانِ بوستاں باقی نہیں   طائروں کے دل میں بھی خوفِ خزاں باقی نہیں

پھول پھل سب نشۂ آبِ طرب میں چور ہیں
مست ہیں خوش ہیں جوانانِ چمن مسرور ہیں

زینتِ فصلِ بہاراں نونہالانِ چمن   ہیں خوشی میں نغمہ زن سب مثلِ مرغانِ چمن
اُف رے گلشن کی فضا! اللہ رے شانِ چمن   کیا سرور افزا نظر آتے ہیں سامانِ چمن

جامعۂ عثمانیہ اب جلوہ گاہِ طور ہے
ہر طرف پرتو فگن علم و عمل کا نور ہے

اس کے ہر ذرہ کو رشکِ آفتاب اب دیکھیے   عظمتِ ملکِ دکن کو بے نقاب اب دیکھیے
ہو چکا منت کشی کا سدِ باب اب دیکھیے   دیکھیے اِس دیکھیے یہ انقلاب اب دیکھیے

داغ ہائے منتِ اغیار دھوتے جائیں گے
نونہالانِ دکن شاداب ہوتے جائیں گے

خیر مقدم

بتقریب ورودِ مسعودِ اعلیٰ حضرت شہنشاہِ ایران در کشورِ ہندوستان

○

ستمِ دوست بجا ہست امروز
شاید از ما کہ خطا ہست امروز

تو چہ دانی کہ چہ باشد فردا
آنچہ نقشِ کعب پا ہست امروز

این مپندار کہ خالی ز خطر
راہِ اربابِ وفا ہست امروز

حافظ و سعدی ہمی یاد آیند
شاہِ ایران کہ بہ ما ہست امروز

ساقیا بزمِ رباب و چنگ است
مئے و پیمانہ کجا ہست امروز

بادۂ عہدِ جہانگیر بیار
محفلِ شاہِ رضا ہست امروز

شجرِ رشتۂ دیرینہ را
موسمِ نشو و نما ہست امروز

بہرِ خوشی وقتیِ ہند و ایراں
ہر کجا دستِ دعا ہست امروز

فیضِ مہمانِ عزیز است اے زورؔ
فکرِ شاعر کہ رسا ہست امروز

○

مطبوعہ ماہنامہ "آجکل" دہلی۔ مئی ۱۹۵۶ء

غزلیں

(۱)

شبِ غم کی نہ ہوگی انتہا کیا
نہ لائے گا خوشی کا دن خدا کیا
مری آنکھوں میں جلوہ اپنا دیکھو
یہ ہر دم دیکھتے ہو آئینہ کیا
خضر کیا جائیں تم پہ جان دینا
انھیں اس مرحلہ سے واسطہ کیا
کروں کس منہ سے غیروں کی شکایت
سناؤں اپنے غم کا ماجرا کیا
ترے در پر جو آیا پھر نہ اٹھا
یہی دنیا میں تھا اک آسرا کیا؟
بتوں سے مہربانی کی توقع
مرے ذوقِ طلب کا پوچھنا کیا
وہ بزمِ غیر وہ جھوٹے فسانے
انھیں یاد آئے گی میری وفا کیا
نہیں معلوم نکلیں گے یہ کیوں کر
دلِ غمگیں میں ہیں ارمان کیا کیا
بڑھے جوشِ محبت میں جب آگے
بلند و پست کیا ارض و سما کیا
گِنا کرتے ہو راتوں کو جو تارے
یہ آخر زورؔ تم کو ہو گیا کیا؟

(۲)

دل جب سے ہوا ہے خوگرِ غم آزار میں لذت پاتا ہوں
گلبانگِ مسرت دور رہے میں اس سے بہت گھبراتا ہوں
ہر روز ہزاروں زخم نئے اس زخمی دل پہ کھاتا ہوں
افتاد سے ہوں مجبور ہوا کب چاہ سے میں باز آتا ہوں
وہ ناز و ادا میں سرگرمی سوزنگ سے جب کھلاتے ہیں
جذبات کو لے کر پہلو میں سرگرم وفا ہو جاتا ہوں
اے زورؔ نہ کر راحت کی ہوس دنیا ہے یہ سب دھوکا
چشمہ بھی سراب آتا ہے نظر جب پیاس بجھانے جاتا

○

یوں تو کہنے کو یاں سے گذر جائیں گے
کیا بتائیں کہ آخر کدھر جائیں گے

میری آنکھیں ترستی رہیں گی مگر
وہ جو آئیں گے دل میں اُتر جائیں گے

بوئے گل ہو کہ سیلاب و برقِ تپاں
سعیٔ انساں سلامت، سنور جائیں گے

زندگی سانس لیتی رہے گی یوں ہی
زندہ دل ہنستے ہنستے گذر جائیں گے

موت سے بھی مریں گے نہیں زورؔ ہم
زندگی میں جو کچھ کام کر جائیں گے

○

○

بن کے انگشت اشارت جو اشارا کر
نگہ ناز تری کیا کہوں کیا کیا کر

بھر دے آہوں میں خیال رُخِ تابندہ
اور اشکوں کو مرے روکشِ دریا کر

دلِ پُر یاس ہے صد تشنۂ سوزِ
اس کو مرہونِ شرر ہائے تمنا کر د

ضبط آخر یہ ترا دیدۂ گریاں کب تک
کیفیت ابر بہاراں کی ہویدا کر

دل ہو سہائے مجازی میں ہے چشم
خوف ہے رازِ حقیقت کہیں افشا کر د

عاشقوں میں ہے مواخات کا رشتہ
شمع پہ زورؔ نہ کیوں خون کا دعویٰ

○

○

ہم اپنی گرمیٔ سوزِ دروں سے چیخ اٹھے
خوشا کہ مستیٔ فیضِ جنوں سے چیخ اٹھے
بہ نازِ طبع بلند و بہ زعمِ خود نگہی!
زمانہ سازیٔ دنیائے دوں سے چیخ اٹھے
ذرا سی بات سے سارے جہاں میں دھوم ہوئی
جو کم سوادیٔ صبر و سکوں سے چیخ اٹھے
بہ تنگ آکے جو
بہ پاسِ خاطرِ جاناں خموش بیٹھے تھے
مگر خرابیٔ بازیٔ خوں سے چیخ اٹھے
کہاں ہے وعدۂ پرویز و جلوۂ شیریں!
عجب نہیں جو دلِ بے ستوں سے چیخ اٹھے

○

مطبوعہ نقوش ۔ ۱۹ اکتوبر ۱۹۶۲ء

○

فردوسِ آب و گل کے نظاروں کا شوق ہے
چشموں کا رنگ و بو کا بہاروں کا شوق ہے
انسانیت کے رِستے ہوئے زخم چھوڑ کر
دانشوروں کو چاند ستاروں کا شوق ہے
ہستی کی تلخیاں جو گوارا نہ ہو سکیں!
زندوں سے ہے نفور، مزدوروں کا شوق ہے
حرص و ہوس کو گرمیٔ بازار چاہیئے!
خستہ دلوں کو درد کے ماروں کا شوق ہے
عزمِ خودی ہے بیچ سمندر میں غوطہ زن
امواجِ بے خودی کو کناروں کا شوق ہے
رہتے ہیں دل میں اور سمجھتے ہیں خود کو دور
ایسے ستم شعار پیاروں کا شوق ہے

○

بیاضِ محررہ ڈاکٹر ... میں "خود نگہی" اور ... "بہ تنگ آکے جو" درج ہے۔

ہم نے سیکھا ہی نہیں آپ کی چاہت کے سوا
کام آیا نہیں دنیا میں محبت کے سوا
دل ہو بیدار تو انسان سمجھ سکتا ہے
قوتیں اور بھی ہیں دولت و ثروت کے سوا
دل کے بہلانے کو ہیں امن کی باتیں شاید
یہ بھی افسانہ و افسوں ہے حقیقت کے سوا
نطقِ انساں رہا پابندِ سلاسل ہی سدا
شاعری عشوہ گری کیا ہے سیاست کے سوا
یوں تو کرنے کو بہت کام ہیں لیکن اے نور
کام آتا ہے ہنر کوئی نہ خدمت کے سوا

عزم و ہمت ہے تخیل ہے کہ ہو ذوقِ یقیں
یہ جو ہم پر خاک نشیں ہوتا ہے افلاک نشیں
ذوقِ پاکیزہ سے ہر چیز ہے پُر لطف حسیں
یہ نہ حاصل ہو تو بے کار ہے دنیا ہو کہ دیں
سوچتا ہوں کہ کہیں تم تو نہیں آ نکلے
ایک ہلچل سی مچی رہتی ہے جب دل کے قریں
کیا ستم ہے وہی بے نام و نشاں رہتے ہیں
جن غریبوں کے پسینوں سے نکھرتی ہے زمیں
یہ جو خوش پوش ہیں پروردۂ تہذیب جدید
ڈھونڈتا ہوں کوئی انسان کہ ان میں ہے کہیں

○

وز لیے بھی انسان روزگار میں ہیں
ی سحر کے کبھی شب کے اعتبار میں ہیں
راہ سوچ سمجھ کر ہی اختیار کریں
سوئے دار چلے ہیں جو کوئے یار میں ہیں
جھ ہی سکتے نہیں ہیں حقیقتِ امروز
لوگ جو کسی فردا کے انتظار میں ہیں
ہ ایسے لوگ ابھی تک چمن میں ہیں شاید
ریب خوردہ خزاں میں نہ خوش بہار میں تھے
یضِ سوز دروں و بطرز اہلِ جنوں
ہی ہے منزلِ لیلیٰ کہ جس دیار میں ہیں
ماں میں اب بھی کچھ ایسے بتوں کی جلتی ہے
اپنے بس میں نہ وہ کسی کے اختیار میں ہیں
بھی تو ایک جھلک سی دکھائیے ہم کو
بھی تک آس لگائے ہیں انتظار میں ہیں
زور بھی شاعر ہیں سنتے آئے ہیں
طار میں شامل نہ کچھ شمار میں ہیں

○

○

ٹوٹیں جو روز سر پہ بلائیں تو کیا کریں
وہ بھی ہنسا ہنسا کے رلائیں تو کیا کریں
ہر دم نئے نئے یہ دکھاتی ہے شعبدے
ہستی کا پھر فریب نہ کھائیں تو کیا کریں
اچھا ہے آپ ہم سے کریں عہدِ سرخوشی
لیکن اگر نہ اس کو نبھائیں تو کیا کریں
جن جی کے انتظار میں مرتے رہے ہیں ہم
آخر وہ آتے آتے نہ آئیں تو کیا کریں
اچھا نہیں یہ شکوۂ شام و سحر مگر
افکارِ روزگار ستائیں تو کیا کریں

○

○

انقلابِ زمانہ ہے شاید یہی دیکھتے دیکھتے کیا سے کیا بن گئے
ہم جو بن بن کے بگڑے تو بندے بنے، وہ بگڑتے بگڑتے خدا بن گئے

ہم جو تھے اک تہی مایہ و بے نوا، ہم نے الفت جو کی تو بفیضِ وفا
ساز و آہنگ ایسے ہویدا ہوئے جو دھڑکتے دلوں کی صدا بن گئے

جن کو اپنا سمجھتے رہے عمر بھر، ان کی بیگانگی اور بڑھتی گئی
میری دیوانگی کا اثر یہ ہوا جو تھے نا آشنا، آشنا بن گئے

یہ زمین و زماں، یہ مکین و مکاں، آدمِ نو کی ضَو سے ہوئے پھر جواں
زندگی کروٹیں پھر سے لینے لگی، ولولے حاصلِ مدعا بن گئے

یہ ہجومِ گُل و لالہ، یہ رنگ و بو، جوشِ موج و خروشِ لبِ آبِ جُو
میرے ہاتھوں سے ایسے سنورتے گئے، نازشِ ارض و فخرِ سما بن گئے

○

احباب سے وفا کا صلہ گر نہ پائیے
دشمن کے باب میں بھی بدی پر نہ آئیے

آتا ہے آپ کو تو کچھ اس طرح آئیے
آنکھوں میں بیٹھیے مرے دل میں سمائیے

انسان مر چکا ہے مشینوں کا دَور ہے
اب کیا کسی کو زہر کہ امرت پلائیے

فردا کے انتظار میں کٹتی ہے زندگی
بہتر ہے روز و شب کا نہ پردہ اٹھائیے

احساسِ آگہی تو بہت عام ہے مگر
کس بات کی تلاش ہے یہ تو بتائیے

ل ڈاکٹر زور نے اپنی قلمی بیاض میں نظرِ ثانی کرتے ہوئے "کا شعور" پنسل سے تحریر کیا ہے مگر تلاش کو قلم زد نہیں کیا

○

ہیے بے درد و بد اندیش یہاں ہیں کچھ لوگ
سمجھتے نہیں پابندِ فغاں ہیں کچھ لوگ

ینے والے مئے و مینا پہ نظر رکھتے ہیں!
ہم ساقی کی طرف کیوں نگراں ہیں کچھ لوگ

غریبوں پہ امیروں کی خدائی چلتی
عثِ برہمیٔ بزمِ بُتاں ہیں کچھ لوگ

فلے چل بھی پڑے لے کے شعورِ فردا!
ر بھی مست مئے خوابِ گراں ہیں کچھ لوگ

رح افسانہ و افسوں کی حقیقت معلوم
پسِ کارگہِ شیشہ گراں ہیں کچھ لوگ

ئی فکرِ جدید، آذرِ طرزِ فردا
ن ہی گمنام غریبوں میں نہاں ہیں کچھ لوگ

م سے شرحِ غمِ اندوہِ عزیزاں مت پوچھ!
وِ تفسیرِ حدیثِ دگراں ہیں کچھ لوگ

ب نگاہِ غلط انداز سہی، دیکھ تو لیں
پ کے چاہنے والوں میں یہاں ہیں کچھ لوگ

ندگی زندہ دلی، ذوقِ طلب، شوقِ عمل
عہدِ پیری میں بھی اے زور جواں ہیں کچھ لوگ

○

بعض ہمدرد سے آ جاتے ہیں انساں کے قریب
قصر والوں سے پرے کوئے غریباں کے قریب

اپنی کوتاہیٔ دانش کا گلہ کیا کیجئے!
بارہا ہم بھی گئے تھے درِ زنداں کے قریب

پھول تو پھول ہیں کانٹے بھی ہیں بیگانے سے
اب بھٹک کر بھی نہ جائیں گے گلستاں کے قریب

وہ پہاڑوں کو بگولوں کو سمٹ لیتی ہے
اک قیامت ہے بپا گردشِ دوراں کے قریب

دوستو دیکھ بھی لینا کہیں واعظ تو نہیں
کوئی بھٹکا ہوا آتا ہے بیاباں کے قریب

ساتھیو!

پونچھ بھی ڈالو اب چشمِ پرنم ساتھیو!
کیوں کریں آج بھی کل کا غم ساتھیو!

اپنی تقدیر بنتی ہے تدبیر سے
اب نہ دشمن کا ڈھونڈو کرم ساتھیو!

منحصر ہے یہ دنیا جو اسباب پر
سب ہی اسباب ہوں گے بہم ساتھیو!

ہم دمو! جی نہ چھوڑو یہی وقت ہے
یوں ہی بڑھتا رہے ہر قدم ساتھیو!

ہمتیں پست ہونے نہ پائیں گی اب
ختم ہوتا ہے دورِ ستم ساتھیو!

○

اہلِ دکن

حیرت سے دیکھتا ہوں کہ یہ گلبدن ہیں کون
کھلتا نہیں کہ ان میں سرِ انجمن ہیں کون

قدریں بدل گئی ہیں کہ معلوم ہی نہیں
شہرِ سخن میں کون یہ دیدہ دہن ہیں کون

سیکھی ہے رہبروں نے لٹیروں سے رہزنی
اربابِ انبساط غریبِ وطن ہیں کون

شیرازۂ بہارِ گلِ تر بکھر گیا
اب کس کو کیا بتائیں کہ زیبِ چمن ہیں کون

کشمیر میں کوئی تو کراچی میں ہے کوئی
اے زورؔ کس سے پوچھئے اہلِ دکن ہیں کون

○

آگ بھڑکتی ہی رہی

آپ آئیں گے مگر آئیں گے کب کس کے لئے
ڈر یہ ہے آپ کے سودائی گذر جائیں گے
آپ کے شوق میں جیتے ہی رہے مر مر کے
اور زمانے نے یہ سمجھا کہ یہ مر جائیں گے

ولولے دل کے مگر سرد نہ ہونے پائے
مضمحل ہو کے بھی جذبات نہ ٹوٹنے پائے
کمر ہمت و تدبیر بندھی رکھی ہے
گوہر عزم کسی حال نہ کھونے پائے

سختیاں زیست کی سہہ سہہ کے جئے جاتے ہیں
تلخ احوال کے سب گھونٹ پیئے جاتے ہیں
بے کسی کے ہیں اسیر ابلہ فریبی کے شکار
آس کے مارے ہیں اور آس کئے جاتے ہیں

فتنے اٹھتے ہی رہے آگ بھڑکتی ہی رہی
یہ نہیں وہ کہ کسی طرح سے ڈر جائیں گے
آندھیوں میں بھی دیا دل کا نہ بجھنے پایا
آپ اس سمت نہ آئیں تو کدھر جائیں گے

(سری نگر کشمیر، ۱۴ر نومبر ۱۹۹۶ء)

جہاں آشوب

دریوزہ گرو کوتاہ نظر با عیش و فراغت بیٹھے ہیں
تھا ناز شرافت جن کو کبھی محروم شرافت بیٹھے ہیں
جو خار کبھی تھے ننگ چمن، ہیں آج وہی نسرین و سمن
کیا جانیے کس جا لالہ و گل پابند نزاکت بیٹھے ہیں
میدان قیامت جیت لیا دیوانوں نے آگے بڑھ کر
یاں سر بگریباں فرزانے با فہم و فراست بیٹھے ہیں
ہر سمت ہیں چرچے امن ہی کے، ہر روز ہے چرچا امن ہی کا
ہم رنگ زمیں اک دام بچھا کر اہل سیاست بیٹھے ہیں
کیوں اہل جنوں سے پوچھتے ہیں کیوں تیشہ و سنگ سے کھیلتے ہیں
انداز جنوں وہ کیا سمجھیں جو سر بہ سلامت بیٹھے ہیں
ہم اور غم دوراں کی خلش، ہم اور غم جاناں کی تپش
کچھ لوگ ابھی تک منتظر فردائے قیامت بیٹھے ہیں
کیا جانیے کیا کیا گزری ہے انداز و ادا سہتے سہتے
کیا پوچھیے اب کیوں اہل وفا با اشک ندامت بیٹھے ہیں

مقالہ نما

ڈاکٹر زور

مرتبہ

وقار خلیل



مقالہ نما

نمبر	عنوان مضمون	نام رسالہ	صراحت اشاعت
۱	ادبی تنقید (دو قسطیں)	"تحفہ" حیدرآباد دکن	جولائی، اکتوبر ۱۹۲۴ء
۲	طرز بیان	″	ستمبر ۱۹۲۴ء
۳	فرانسیسی ادب (دو قسطیں)	″	نومبر ۱۹۲۴ء اور فروری ۱۹۲۵ء
۴	حُبِّ وطن	"ارتقا" حیدرآباد دکن	نومبر و دسمبر ۱۹۲۴ء
۵	حدیقۂ سنائی	"تحفہ" ″	فروری ۱۹۲۵ء
۶	تعصب	"ارتقا" ″	″
۷	طبقاتِ ناصری اور اس کا مصنف	"تحفہ" ″	مارچ ۱۹۲۵ء
۸	انگلستان اور ارتقائے تعلیم	"ارتقا" ″	اپریل ″
۹	ہوریس اسمتھ کی شاعری	"تحفہ" ″	″ ″
۱۰	ابوالحسن تاناشاہ کی قبر پر	″ ″	مئی ۱۹۲۵ء
۱۱	زندۂ جاوید		ستمبر ″
۱۲	اردو کے اسالیبِ بیان	"سہیل" علیگڈھ	اپریل ۱۹۲۶ء
۱۳	تازیانہ (دو اقساط)	"نگار" لکھنؤ	مئی، جون ″
۱۴	میر انیس کی شاعری پر ایک نظر	"نیرنگِ خیال" لاہور	
	(دو اقساط)	"الناظر" لکھنؤ	جون ۱۹۲۶ء
۱۵	میر کی مثنویاں	"تحفہ" حیدرآباد دکن	جولائی ″
۱۶	غالب کی ذہنیت (دو اقساط)	"نگار" لکھنؤ	اگست، ستمبر ۱۹۲۶ء
۱۷	اردو کے اسالیبِ بیان ″	"سہیل" علی گڈھ	ستمبر ۱۹۲۶ء
۱۸	میر تقی میر اور خارجی حالات کی ترجمانی	"نگار" لکھنؤ	نومبر ۱۹۲۶ء
۱۹	شرابِ ناب	ہمایوں لاہور	″
۲۰	حالی اور نثرِ اردو	"نگار" لکھنؤ	جنوری ۱۹۲۷ء
۲۱	نواب آصف الدولہ کا سفرِ شکار اور میر و سودا	"زبان" آگرہ	″
۲۲	فارسی نثر کا آغاز اور ابو علی بلعمی	"مجلۂ عثمانیہ" حیدرآباد	فروری ۱۹۲۷ء

نمبر	عنوان مضمون	نام رسالہ	صراحت اشاعت
۲۳	ادبیاتِ اُردو اور تنقید نگاری	"تجلی" حیدرآباد	اپریل ۱۹۲۷ء
۲۴	اردو کے پیغام گو شاعر	"زبان" آگرہ	جولائی "
۲۵	فارسی ادب کے ابتدائی گہوارے	"تجلی" حیدرآباد	" "
۲۶	ادبیاتِ ایران کا عہد زرین	"نظر" لکھنؤ	ستمبر "
۲۷	غزنوی دور کا آغاز اور ایرانی علم و فضل	"تجلی" حیدرآباد	اکتوبر "
۲۸	طامس گرے کے کلام پر تنقیدی نظر	"ہمایوں" لاہور	" "
۲۹	"فسانۂ عجائب" و باغ و بہار	"نیرنگِ خیال" لاہور	سالنامہ دسمبر ۱۹۲۷ء
۳۰	سلطان محمود غزنوی اور علم و ادب	"نگار" لکھنؤ	جنوری ۱۹۲۸ء
۳۱	واجد علی شاہ کے خطوط اکلیل محل کے نام	"نظام گزٹ" حیدرآباد	اپریل "
۳۲	کتب خانہ جات شاہانِ اودھ اور دکھنیات	"تجلی" حیدرآباد	"
۳۳	کرنل میکنزی کا مجموعہ ادبیاتِ شرقی	"	مئی ۱۹۲۸ء
۳۴	دیوانِ یقین	"نگار" لکھنؤ	جون "
۳۵	بہرام گور دکن میں	"مجلہ مکتبہ" حیدرآباد	نومبر "
۳۶	شمالی اور دکنی اردو کی علیحدگی	"جامعہ" دہلی	دسمبر "
۳۷	گولکنڈہ کا ایک قدیم ترین ادبی شہ پارہ	"مجلہ مکتبہ" حیدرآباد	اپریل ۱۹۲۹ء
۳۸	دکنی اثر شمالی ہند پر	"اردو" اورنگ آباد	" "
۳۹	ابن نشاطی اور "پھول بن"	"مجلہ مکتبہ" حیدرآباد	جولائی ۱۹۲۹ء
۴۰	دکنی مرثیے ایڈنبرا میں	"مجلہ اردو" اورنگ آباد	"
۴۱	اُردو انشا پردازی	"رہبر دکن" حیدرآباد	سالنامہ دسمبر ۱۹۲۹ء
۴۲	اورنگ زیب اور تاناشاہ	"	"
۴۳	شیطان	"مجلہ مکتبہ" "	دسمبر ۱۹۲۹ء
۴۴	اخبار رنگین	"مجلہ عثمانیہ" "	مارچ ۱۹۳۱ء
۴۵	گارساں دتاسی	"ہندوستانی" الہ آباد	اپریل "
۴۶	افسانے	"مجلہ عثمانیہ" حیدرآباد	جون "
۴۷	صوتیاتی تحقیقات	"مجلہ مکتبہ" "	اکتوبر "
۴۸	اردو شاعری کا پہلا سرپرست شہزادہ	"رہبر دکن"	عطیہ عید نمبر

نمبر	عنوان مضمون	نام رسالہ	صراحت اشاعت
۴۹	حاتم کی مسلسل نظمیں	"مجلہ مکتبہ" حیدرآباد	جنوری ۱۹۳۳ء
۵۰	ہندوستانی کا آغاز	"مجلہ عثمانیہ" ″	جون ″
۵۱	دہلی میں اردو شاعری کا آغاز	"ہندوستانی" الہ آباد	جولائی ″
۵۲	لسانیات	"مجلہ مکتبہ" حیدرآباد	ستمبر ″
۵۳	ہندوستانی کا ارتقا	"مجلہ مکتبہ" ″	اکتوبر ″
۵۴	مثنوی قہوہ	″ ″	نومبر ″
۵۵	زبان اور سیاسیات	"کاروان" لاہور	سالنامہ ″
۵۶	لے کونت دے خب ترنگ (فرانسیسی)	"ژورنل ایشیاتیک جرنل" (پیرس)	جولائی ″
۵۷	میر حسن کی "سحر البیان" اور مرزا قتیل	"مجلہ تحقیقات علمیہ" حیدرآباد	اکتوبر ″
۵۸	چار کمان	"حسن کار" حیدرآباد	″ ″
۵۹	شہر حیدرآباد کا آغاز	″ ″	نومبر ″
۶۰	جامعہ عثمانیہ کے فرزندوں کی اردو خدمات	"مجلہ عثمانیہ" ″	″ ″
۶۱	ناول کا ارتقا	"منشور" ″	سالنامہ نومبر ″
۶۲	حیدرآباد کی آبادیاں	"رہبر دکن" ″	″ ″
۶۳	سٹی کالج کی تربیت	"مجلہ سٹی کالج" ″	سالنامہ اپریل ۱۹۳۴ء
۶۴	جواہر سخن پر ایک نظر	"مجلہ عثمانیہ" ″	جون ۱۹۳۴ء
۶۵	سٹی کالج کے بعض قدیم طلبا	"مجلہ سٹی کالج" ″	جولائی ″
۶۶	حیدرآباد کی جدید اردو مطبوعات	"مجلہ عثمانیہ" ″	اگست ۱۹۳۴ء، مارچ جون ۱۹۳۶ء ستمبر ۱۹۳۷ء
۶۷	اردو کا قدیم ترین معیار سخن	"نظام گزٹ" ″	سالگرہ نمبر اکتوبر ۱۹۳۴ء
۶۸	اردو شاعروں کی شاہ پرستی	"منشور" ″	اکتوبر ۱۹۳۴ء
۶۹	قدیم اردو مناجاتیں	"رہبر دکن" ″	″ ″
۷۰	حالی کی شخصیت ان کے کارنامے	یادگار حالی ...	مقالہ "یوم حالی" ۱۹۳۴ء
۷۱	اردو مرثیوں کے ابتدائی گہوارے	"مجموعہ تحقیقات علمیہ" "جامعہ عثمانیہ" حیدرآباد	جلد دوم ۱۹۳۴ء
۷۲	ادبی معمات	"المرسی" (مجلہ سٹی کالج) ″	۱۹۳۵ء
۷۳	حیدرآباد کی جدید اردو مطبوعات	"مجلہ عثمانیہ" حیدرآباد	مئی ۱۹۳۵ء

نمبر	عنوان مضمون	نام رسالہ	صراحت اشاعت
۷۴	اردو اور ہندوستان کی دوسری زبانیں (دو قسطیں)	"آئینۂ ادب" حیدرآباد	۱۹۳۵ء
۷۵	لکھنؤ کی اردو خدمات (مقالہ)	"اورنٹیل کانفرنس" میسور	〃
۷۶	فرزندانِ جامعہ عثمانیہ کے علمی ادبی رجحانات اور ان کا مستقبل۔	"شہاب" حیدرآباد	اپریل ۱۹۳۶ء
۷۷	مُشک محل (آثارِ قطب شاہی)	〃 〃	اکتوبر 〃
۷۸	چھلم کی رقاصہ	〃 〃	نومبر 〃
۷۹	ولی کا وطن	"مجلہ الموسیٰ" 〃	۱۹۳۶ء
۸۰	ولی کے قلمی نسخے	〃 〃	〃
۸۱	ہماری شاعری کا لفظی خزانہ	"رہبر دکن" 〃	سالنامہ ۱۹۳۶ء
۸۲	مکہ مسجد	"شہاب" 〃	دسمبر 〃
۸۳	غیبی امداد (افسانہ)	"مجلہ عثمانیہ" 〃	جون 〃
۸۴	چاندنی (نظم)	〃 〃	〃 〃
۸۵	دورِ آصفیہ میں حیدرآباد کی اردو شاعری	"ہندوستانی" الہ آباد	جولائی 〃
۸۶	عہدِ عثمانی میں اردو مطبوعات (حیدرآباد)	"مجلہ عثمانیہ" حیدرآباد	مارچ ۱۹۳۷ء
۸۷	اُستادِ کل حضرت فیض کا زمانہ	"شہاب" 〃	اکتوبر 〃
۸۸	اُستاد الاساتذہ حضرت فیض	"رہبر دکن" 〃	سالگرہ نمبر 〃
۸۹	سروِ صحرا (افسانہ)	"مجلہ عثمانیہ" 〃	جولائی 〃
۹۰	شیخ چاند کی وفات	〃 〃	۱۹۳۷ء
۹۱	اُستادِ کل حضرت میر شمس الدین محمد فیض	"ہندوستانی" الہ آباد	اپریل ۱۹۳۸ء
۹۲	"سب رس" (تین سو گیارہ سال قبل کی مشہور کتاب)	"سب رس" حیدرآباد	جنوری 〃
۹۳	بادشاہی عاشور خانہ بیجاپور	〃 〃	محرم نمبر مارچ ۱۹۳۸ء
۹۴	اردو مرثیوں کا ارتقا	〃 〃	〃 〃
۹۵	اقبال کا اثر اُردو شاعری پر	〃 〃	
		"مجلہ عثمانیہ" جنوری ۱۹۳۸ء	اقبال نمبر جون ۱۹۳۸ء
۹۶	حیدرآباد ایجوکیشنل کانفرنس کی اُردو خدمات	"سب رس" حیدرآباد	اگست ۱۹۳۸ء [مسلسل

نمبر	عنوان مضمون	نام رسالہ	صراحت اشاعت
۹۷	ادارۂ ادبیات اردو کی سرگذشت	"سب رس" حیدرآباد	ستمبر ۱۹۳۸ء
۹۸	خطبۂ صدارت (یوم اقبال منعقدہ بمبئی)	〃 〃	اکتوبر 〃
۹۹	کیوں لکھیں ؟	〃 〃	نومبر 〃
۱۰۰	کیا لکھیں ؟	〃 〃	دسمبر 〃
۱۰۱	گولکنڈہ کی قطب شاہی سلطنت	〃 〃	"مرقع" دکن نمبر جنوری ۱۹۳۹ء
۱۰۲	مشاہیر گولکنڈہ	〃 〃	〃 〃
۱۰۳	راشد الخیری	"عصمت" دہلی	فروری ۱۹۳۹ء
۱۰۴	کس طرح لکھیں ؟	"سب رس" حیدرآباد	〃 〃
۱۰۵	اسلوب بیان	〃 〃	اپریل 〃
۱۰۶	عہد سلطان العلوم سے قبل کا آصفی ادب	"مجلہ عثمانیہ" 〃	〃 〃
۱۰۷	اپج بیید اکرتا	"سب رس" 〃	مئی 〃
۱۰۸	علامہ سر ڈینی سن راس	〃 〃	جولائی 〃
۱۰۹	محمد قلی قطب شاہ کی بارہ پیاریاں	〃 〃	〃 〃
۱۱۰	گولکنڈے کے نئے قلعے میں ملا خیالی کی مسجد	〃 〃	اگست 〃
۱۱۱	بھاگ متی یا حیدر محل (دو قسطیں)	〃 〃	〃 〃 مارچ ۱۹۴۱ء
۱۱۲	سلطان محمد قلی قطب شاہ اور تصوف	مجلۂ نقش ادبی" ورنگل کالج"	جنوری ۱۹۴۰ء
۱۱۳	حیدرآباد کے عاشور خانے	"سب رس" حیدرآباد	فروری 〃
۱۱۴	سراج اورنگ آبادی (دو اقساط)	〃 〃	مارچ 〃 دسمبر ۱۹۴۳ء
۱۱۵	شاہ سراج کا تکیہ اور عرس	〃 〃	اپریل 〃
۱۱۶	عظمت اللہ خاں	〃 〃	ستمبر 〃
۱۱۷	میر محمد مومن کا ذوق تعمیر (تین اقساط)	〃 〃	جون۔جولائی۔اگست ۱۹۴۱ء
۱۱۸	گارساں دتاسی (اردو کا پہلا پروفیسر)	〃 〃	نومبر ۱۹۴۱ء
۱۱۹	حضرت بابا شرف الدین	〃 〃	جولائی ۱۹۴۲ء
۱۲۰	بابائے ریختہ ولی اورنگ آبادی	〃 〃	اگست 〃
۱۲۱	پروفیسر عبدالقادر سروری	〃 〃	ستمبر 〃
۱۲۲	تذکرۂ اردو مخطوطات	〃 〃	جنوری 〃
۱۲۳	اردو مخطوطات ادارہ کے کتب خانے میں (چار اقساط)	〃 〃	فروری تا مئی ۱۹۴۳ء

نمبر	عنوان مضمون	نام رسالہ	صراحت اشاعت
۱۲۴	مشرقی طب عہدِ قطب شاہی میں	"سب رس" حیدرآباد	اپریل ۱۹۴۳ء
۱۲۵	ہدایت کے تاریخی قصائد (تین اقساط)	" "	اگست۔ اکتوبر ۱۹۴۳ء
۱۲۶	دکنی کی یاد کیوں منائی جاتی ہے؟	" "	ستمبر ۱۹۴۳ء
۱۲۷	داغ دہلوی	" "	فروری ۱۹۴۴ء
۱۲۸	اُردو کی کہانی (شمالی ہند کا دور)	" "	اپریل "
۱۲۹	خطبۂ صدارت	" "	مئی "
۱۳۰	اردو کے علمی وادبی رسائل	" "	جون "
۱۳۱	عظیم تر حیدرآباد	" "	دسمبر "
۱۳۲	خطبۂ صدارت (بزم اردو ورنگل کالج)	" "	مارچ ۱۹۴۵ء
۱۳۳	ادبی تنقید کی لفظیات	" "	اپریل "
۱۳۴	حالی کی ترقی پسندی	" "	مئی "
۱۳۵	عہد عفران مکان کے شاعر	" "	اگست "
۱۳۶	ترقی پسند ادب	" "	" "
۱۳۷	خطبۂ استقبالیہ (کل ہند ترقی پسند کانفرنس)۔	" "	نومبر "
۱۳۸	علمی نثر	" "	اپریل ۱۹۴۷ء
۱۳۹	اصغر گونڈوی	" "	جولائی۔ اگست ۱۹۴۷ء
۱۴۰	میکشِ مرحوم (ایک تعارف)	" "	میکش نمبر مارچ اپریل ۴۸ء
۱۴۱	مہدی یار جنگ مرحوم	" "	مئی۔ جون ۱۹۴۸ء
۱۴۲	"سب رس" کا مستقبل	" "	ستمبر "
۱۴۳	ادارۂ ادبیات اردو میں قلمی کتابیں (مسلسل)	" "	اکتوبر ۱۹۴۸ء تا اکتوبر۔
۱۴۴	تحسین سروری	" "	مارچ ۱۹۴۹ء
۱۴۵	نواب سالار جنگ مرحوم (چند تاثرات)	" "	اپریل "
۱۴۶	عزیز یار جنگ عزیز کی شاعری	" "	مئی "
۱۴۷	دکن کی آخری طویل اردو مثنوی	سہ ماہی "نوائے ادب" بمبئی	جنوری ۱۹۵۰ء
۱۴۸	اُردو کے علمی وادبی رسائل	"آج کل" دہلی	اگست "
۱۴۹	بہمنی ادب	سہ ماہی "نوائے ادب" بمبئی	اکتوبر "

نمبر	عنوانِ مضمون	نام رسالہ	صراحت اشاعت
۱۵۰	مرزا فرحت اللہ بیگ کی ادبی تحقیق (دو اقساط)	"سب رس" حیدرآباد	فروری، مارچ ۱۹۵۱ء
۱۵۱	ایم، اسلم	" "	اپریل ۱۹۵۱ء
۱۵۲	کشن پرشاد یمین السلطنۃ	" "	اگست "
۱۵۳	ولی اورنگ آبادی اور ولی گجراتی	"آج کل" دہلی	ستمبر ۱۹۵۲ء
۱۵۴	اردو کے آرمینی شاعر	"سب رس" حیدرآباد "مشرب" کراچی	اگست ۱۹۵۳ء
۱۵۵	موجودہ اردو ادب کے چند رجحانات اور مسائل	"سب رس" حیدرآباد	فروری مارچ ۱۹۵۴ء
۱۵۶	دکن میں اردو شعر و سخن کا ارتقا	"شاہراہ" دہلی	اگست ۱۹۵۵ء
۱۵۷	خواجہ حسن نظامی	"سب رس" حیدرآباد	ستمبر اکتوبر ۱۹۵۵ء
۱۵۸	اردو کا لسانیاتی ادب (دو اقساط)	"آج کل" دہلی	اکتوبر۔ دسمبر "
۱۵۹	پنڈت دتاتریہ کیفی دہلوی	"سب رس" حیدرآباد	نومبر۔ دسمبر "
۱۶۰	قاضی عبد الغفار	" "	سالگرہ نمبر جنوری فروری ۱۹۵۶ء
۱۶۱	دو ساتھی بچھڑ گئے (علی منظور، فیض محمد صدیقی)	" "	"
۱۶۲	سپاس نامہ	" "	امجد نمبر۔ جولائی اگست "
۱۶۳	جعفر زٹلی	"صبا" حیدرآباد	جلد ۲، شمارہ ۴ - ۱۹۵۷ء
۱۶۴	یادگار فہیم	"آج کل" دہلی	اکتوبر ۱۹۵۷ء
۱۶۵	مدراس کا ایک غیر معروف اردو شاعر (غلام علی سبقت)	"سب رس" حیدرآباد	مئی۔ جون ۱۹۵۷ء
۱۶۶	غلام محی الدین خان متین	" "	جولائی۔ اگست "
۱۶۷	شبلی کے بارے میں چند غیر مطبوعہ اطلاعات	"صبا" حیدرآباد	شبلی نمبر ۱۹۵۸ء
۱۶۸	بھاگ متی اور بھاگ نگر	"سب رس" حیدرآباد	محمد قلی قطب شاہ نمبر اپریل تا جون ۱۹۵۸ء
۱۶۹	شہید دہلوی	" "	ستمبر، اکتوبر ۱۹۵۸ء
۱۷۰	میر عبد الحی تاباں	"شاعر" بمبئی	خاص نمبر ۱۹۵۹ء
۱۷۱	شاہ نصیر دہلوی	"نقوش" لاہور	مئی ۱۹۵۹ء
۱۷۲	کیا موجودہ ادب رو بہ تنزل ہے (سمپوزیم)	" "	دسمبر "

نمبر	عنوان مضمون	نام رسالہ	صراحت اشاعت
۱۷۳	جامعہ عثمانیہ کی تاسیس اور اس کا پس منظر	"مجلہ عثمانیہ" حیدرآباد	جامعہ عثمانیہ نمبر ۱۹۵۹ء ۱۹۶۰ء
۱۷۴	محلات قطب شاہی	"سب رس" 〃	محمد قلی قطب شاہ نمبر جنوری ۔
۱۷۵	خیر مقدمی رپورٹ یوم محمد قلی قطب شاہ	〃 〃	〃 〃
۱۷۶	ہندوستانی کلچر کی نشاۃ ثانیہ میں مولانا آزاد کی خدمات ۔	"آندھرا پردیش" 〃	مارچ ۱۹۶۰ء
۱۷۷	آندھرا کا پہلا اردو شاعر	"فروغ اردو" لکھنؤ	〃 〃
۱۷۸	قصۂ پنچہ آفتاب و مہرشاہ	"سب رس" حیدرآباد	اپریل 〃
۱۷۹	واجد دہلوی	سہ ماہی "مجلس" 〃	اپریل، جولائی ۱۹۶۰ء
۱۸۰	مثنوی چھو منتر	"سب رس" 〃	ایوان اردو نمبر مئی ۱۹۶۰ء
۱۸۱	خیر مقدمی رپورٹ (تقریب افتتاح ایوان اردو)	〃 〃	〃 〃
۱۸۲	اردو اور پنجابی	"نقوش" لاہور	ادب عالیہ نمبر جولائی ۱۹۶۰ء
۱۸۳	علامہ اقبال اور حیدرآباد	"سب رس" حیدرآباد	جولائی ۱۹۶۰ء
۱۸۴	دیوان اشرف	〃 〃	اگست 〃
۱۸۵	من سمجھاون اور گیان سروپ	"نیا دور" لکھنؤ	اسپیشل نمبر اگست ۱۹۶۰ء
۱۸۶	حضرت جگر مرادآبادی	"سب رس" حیدرآباد	ستمبر ۱۹۶۰ء
۱۸۷	ناوک گلشن آبادی	〃 〃	اکتوبر 〃
۱۸۸	جیون خاں (گولکنڈے کے قلعہ دار)	〃 〃	نومبر 〃
۱۸۹	حیدرآباد کا ایک قدیم مورخ	"آندھرا پردیش" 〃	سالنامہ نومبر ۱۹۶۰ء
۱۹۰	مولوی عبدالحق صاحب	سہ ماہی "مجلس" 〃	عبدالحق نمبر جنوری ۱۹۶۱ء
۱۹۱	اردو غزل کے ارتقا میں فکر و فن	"نیا دور" لکھنؤ	اسپیشل نمبر ۲ جنوری ۱۹۶۱ء
۱۹۲	بہت کٹھن ہے ڈگر پنگھٹ کی	"تعمیر" سرینگر	خالد کشمیر نمبر جولائی ۱۹۶۰ء
۱۹۳	صفۂ شعرائے سری نگر	〃 〃	اگست ستمبر ۱۹۶۱ء
۱۹۴	خیر مقدمی رپورٹ محمد قلی قطب شاہ	"سب رس" حیدرآباد	محمد قلی قطب شاہ نمبر جنوری
۱۹۵	مولوی محمد مرتضیٰ مرحوم	〃 〃	مئی ۱۹۶۱ء
۱۹۶	النغمۂ فضائل خانی	〃 〃	ستمبر، اکتوبر ۱۹۶۱ء
۱۹۷	دیوان محشری حیدرآبادی	〃 〃	دسمبر ۱۹۶۱ء

نمبر	عنوان مضمون	نام رسالہ	صراحت اشاعت
۱۹۸	محمد قلی کی شاعری	"سب رس" حیدرآباد	محمد قلی قطب شاہ نمبر جنوری فبروری ۱۹۶۲ء
۱۹۹	رسالہ جادو دانی	دو ماہی "شیرازہ" سری نگر	جنوری ۱۹۶۲ء
۲۰۰	قدیم اردو ادب کی تازہ تحقیق	"	مارچ "
۲۰۱	اردو کی ابتدا	مجلہ "اردوئے معلیٰ" دہلی	لسانیات نمبر ۱۹۶۲ء
۲۰۲	حضرت امجد حیدرآبادی	"سب رس" حیدرآباد	امجد نمبر مئی جون "
۲۰۳	پروفیسر محمد عبدالرحمٰن خاں مرحوم	"	اگست "
۲۰۴	مولانا روم اور علامہ اقبال	سہ ماہی "اردو نامہ" کراچی	جولائی تا ستمبر "
۲۰۵	یہ جو اردو زبان ہماری ہے !	"ہم قلم" کراچی	اکتوبر نومبر "

فہرست تصانیف و تالیفات ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور

نمبر	نام کتاب	موضوع	سن اشاعت	صفحات	طابع / ناشر
۱	روحِ تنقید	تنقید	بار اول ۱۹۲۵ء دوم ۲۷ء سوم ۳۱ء چہارم ۱۹۴۰ء	۲۹۰	مکتبۂ ابراہیمیہ حیدرآباد
۲	طلسمِ تقدیر	ناول	۱۹۲۶ء ۱۹۳۷ء	۸۰	شمس الاسلام پریس "
۳	تازیانہ	افسانہ	۱۹۲۷ء		
۴	تنقیدی مقالات	ادب	۱۹۲۸ء (تین ایڈیشن)	۴۹۶	" "
۵	تین شاعر (میر، انیس اور یورپیس اسمتھ)	تنقید	۱۹۲۷ء		" "
۶	محمود غزنوی کی بزم ادب	ادب	"		
۷	اردو شہ پارے	"	۱۹۲۹ء	۳۵۶	مکتبۂ ابراہیمیہ "
۸	ہندوستانی فونیٹکس (انگریزی)		۱۹۳۰ء		پیرس
۹	ہندوستانی لسانیات	لسانیات	۱۹۳۲ء	۱۶۰	شمس الاسلام پریس "
۱۰	قصۂ خوب ترنگ (زبان فرانسیسی)	ادب	۱۹۳۳ء	۱۴۸	مطبوعہ پیرس
۱۱	عہد عثمانی میں اردو کی ترقی	"	۱۹۳۴ء	-	-

نمبر	نام کتاب	موضوع	سن اشاعت	صفحات	طابع / ناشر
۱۲	تذکرۂ گلزار ابراہیم	تذکرہ	۱۹۳۲ء	۳۰۰	انجمن ترقی اردو دکن
۱۳	جواہر سخن	ادب	"		
۱۴	فن انشا پردازی	"	۱۹۳۵ء	۱۱۶	اعظم اسٹیم پریس ح
۱۵	مرقع سخن (جلد اول) با تصویر	تذکرہ	"	۴۵۰	ادارۂ ادبیات ار
۱۶	متاعِ سخن (عزیز یار جنگ)	انتخاب کلام	"	۱۲۶	"
۱۷	کیف سخن (رضی الدین حسن کیفی)	"	"	۱۲۲	"
۱۸	بادۂ سخن (احمد حسین مائل)	"	"	۱۴۸	"
۱۹	سیر گولکنڈہ (۲ ۔ ایڈیشن)	افسانے	"	۱۱۲	"
۲۰	گولکنڈے کے ہیرے	"	۱۹۳۷ء	۱۴۶	اعظم اسٹیم پریس
۲۱	مرقع سخن (جلد دوم) با تصویر	تذکرہ	"	۴۳۲	ادارۂ ادبیات ار
۲۲	فیضِ سخن (میر شمس الدین محمد فیض)	انتخاب کلام	"	۱۴۴	"
۲۳	محرم نامہ	ادب	۱۹۳۸ء	۱۱۳	"
۲۴	روح غالب	"	۱۹۳۹ء	۱۴۵	"
۲۵	سرگزشت غالب	تذکرہ	"	۶۴	"
۲۶	مکتوباتِ شاد عظیم آبادی	مکاتیب	"	۲۹۰	"
۲۷	اردو کے اسالیب بیان	ادب	تیسرا ایڈیشن ۱۹۴۰ء	۱۲۸	"
۲۸	سلطان محمد قلی قطب شاہ (با تصویر)	سوانح ادب	۱۹۴۰ء	۵۰۰	
۲۹	کلیات محمد قلی قطب شاہ	کلام	"	۱۰۶۸	مجلس اشاعت دکن سالار جنگ
۳۰	ہندوستانی صوتیات	صوتیات		۱۲۸	
۳۱	نگارستان فارسی	ادب	۱۹۴۱ء (دو ایڈیشن)		بار اول ہندوستانی بار دوم ادارۂ اد
۳۲	دیوان زادہ حاتم	"			
۳۳	تاریخ ادب اردو	ادب	چھٹا ایڈیشن ۱۹۴۲ء	۱۲۸	ادارۂ ادبیات اردو
۳۴	میر محمد مومن (با تصویر)	سوانح	بار اول ۱۹۴۱ء بار دوم ۱۹۵۸ء	۳۱۰	"
۳۵	تذکرۂ اردو مخطوطات ادارہ	تذکرہ	جلد اول ۱۹۴۳ء	۳۹۶	"
۳۶	" "	"	جلد دوم ۱۹۵۱ء	۱۸۰	"

نمبر	نام کتاب	موضوع	سن اشاعت	صفحات	طابع / ناشر
۳۷	تذکرۂ اردو مخطوطات ادارہ	تذکرہ	جلد سوم ۱۹۵۷ء	۳۹۸	ادارۂ ادبیات اردو حیدرآباد
۳۸	"	"	" چہارم ۱۹۵۸ء	۳۰۰	"
۳۹	"	"	" پنجم ۱۹۵۹ء	۳۴۵	"
۴۰	تذکرہ نوادر ایوانِ اردو	"	جلد اول ۱۹۶۰ء	۲۲۰	"
۴۱	معانی سخن (محمد قلی قطب شاہ)	کلام	۱۹۵۸ء	۱۱۲	"
۴۲	داستان ادب حیدرآباد	ادب	۱۹۵۱ء	۲۲۴	"
۴۳	حیدرآباد فرخندہ بنیاد (با تصویر)	افسانے	۱۹۵۲ء	۲۲۲	"
۴۴	رمز سخن (جوگی بہاری لال رمز)	کلام	۱۹۵۱ء	۱۴۰	"
۴۵	سرگزشت حاتم	ادب	۱۹۴۴ء	۱۲۸	"
۴۶	شادؔ و اقبال	مکاتیب	۱۹۴۲ء	۱۶۷	"
۴۷	باغ و بہار (میرامن)	افسانے	۱۹۴۰ء	۲۰۰	"
۴۸	ارمغانِ یوم محمد قلی (با تصویر)	تذکرہ	۱۹۵۸ء	۴۰	"
۴۹	طالب و موہنی	مثنوی	"	۸۰	"
۵۰	یادگار محمد قلی قطب شاہ	تاریخ	۱۹۵۹ء		"
۵۱	نذر محمد قلی قطب شاہ	ادب و تاریخ	۱۹۵۸ء	۲۲۸	"
۵۲	قطب شاہی سلاطین اور آندھرا	تاریخ	۱۹۶۱ء	۱۲۸	"
۵۳	اردو شاعری کا انتخاب	انتخاب	۱۹۶۰ء	۲۰۶	ساہتیہ اکاڈمی دہلی
۵۴	کلیات محمد قلی (ہندی ـ انتخاب)	شاعری	۱۹۶۱ء	۱۲۸	ہندی پرچار سبھا حیدرآباد
۵۵	جامعہ عثمانیہ کے فرزندوں کی اردو خدمات	ادب	... ...	۴۰	احمدیہ پریس حیدرآباد
۵۶	دکنی ادب کی تاریخ	"	۱۹۶۰ء	۱۸۸	سندھ اردو اکاڈمی کراچی
۵۷	ادبی تحریریں	"	۱۹۶۳ء		ادارۂ ادبیات اردو
۵۸	چند شخصیتیں - چند تاثرات	سوانح	"		سندھ اردو اکاڈمی کراچی

بشکریہ "شیرازہ" سری نگر کشمیر

تبصــــرہ

"شیرازہ" زور نمبر

"شیرازہ" جموں اینڈ کشمیر اکیڈیمی آف آرٹس کلچر اینڈ لینگویجز سری نگر (کشمیر) کا د جس کا زور نمبر اس وقت زیرِ تبصرہ ہے جہاں تک اس کے ظاہری حسن کا تعلق ہے اور ستھرے ذوق کی نشاندہی کرتا ہے اور اس کی ترتیب اور اس کو صحیح معنوں میں ایک سنجیدہ علمی اور ادبی پر پورا اتارنے میں اس کے ایڈیٹر محمد یوسف ٹینگ نے جو محنت کی ہے اس کے لئے وہ توصیف اور ستایش

"شیرازہ" کا یہ خاص نمبر ان مضامین پر مشتمل ہے جو زور صاحب کے احباب، معاصر ادیب اور شاعر ا رفقائے کار نے لکھے ہیں۔ ان مضامین میں زور صاحب کی شخصیت کے مختلف پہلوؤں پر بڑے خلوص اور محبت گئی ہے اور جہاں تک زور صاحب کی علمی اور ادبی شخصیت کا تعلق ہے، ان مضامین میں بہت کچھ مواد مہیا کیا گ میں جتنے مضامین ہیں ان میں زور صاحب کی شخصیت کے مختلف پہلوؤں پر انہی لوگوں نے قلم اٹھایا ہے جن کی شخصیت کے کسی ایک خاص پہلو سے زیادہ نسبت رہی ہے۔ یوں تو زور صاحب پر دکن کے لکھنے والوں میں جن م صدیقی، پروفیسر عبدالقادر سروری، ڈاکٹر ثمینہ شوکت، اکبرالدین صدیقی وغیرہ کے مضامین خاصے ہیں لیکن وہ مضا کے کشمیری شاگرد اور شریک کار جیسے محمود حسین بدخشی، قاضی غلام محمد، حامدی کاشمیری اور عبدالاحد رفیق وغیرہ اہمیت کے حامل ہیں۔ ان مضامین کو پڑھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ زور صاحب خود جتنے بڑے تھے اپنے ساتھیو اور رفیقوں کو بھی اتنا ہی بڑا بنانا اور دیکھنا چاہتے تھے۔ اور یہی وجہ تھی کہ کشمیر پہونچتے ہی انھوں نے کشمیری دنیا سے روشناس کروانے کا نہ صرف ارادہ کیا بلکہ اس کو عملاً پورا بھی کیا۔

زور صاحب پر بہ حیثیت استاد شاید محمود بدخشی کے علاوہ ان کے کسی شاگرد نے کچھ نہیں لکھا۔ اسی حیثیت مضمون نہ صرف پہلا مضمون ہے بلکہ اپنی ادائی، اپنے خلوص اور سیرت نگاری کے نقطۂ نظر سے بڑا خوبصورت یہی حال حامدی کاشمیری، قاضی غلام محمد، محمد عتیق صدیقی اور عبدالاحد رفیق کے مضامین کا ہے۔ ان میں زور کا اظہار محض اس لئے نہیں کیا گیا ہے کہ دنیا ان کو بڑا آدمی سمجھتی تھی اور ان کی بڑائی سے واقف تھی بلکہ دنیا ان حضرات نے زور صاحب کی بزرگی کا اندازہ اپنے طور پر لگانے کی کوشش کی ہے۔ یہ تمام مضامین بے شک کے اعلیٰ نمونے نہیں ہیں لیکن ان کی خوبی ان کے خلوص میں پوشیدہ ہے۔

اس شمارہ میں ڈاکٹر گوپی چند نارنگ نے ان خطوط کو بھی شائع کیا ہے جو ڈاکٹر زور نے ان کو مختلف او

اس شمارہ کا سب سے دلچسپ حصہ یہ خطوط ہیں اور بلاشبہ اپنی بے پناہ سادگی اور بے ساختگی، خلوص اور بے یہ خطوط اردو ادب میں ایک نئی چیز ہیں۔ ان خطوط میں زور صاحب نہ شاعر ہیں نہ ادیب، نہ محقق نہ مفسر وہ عام آدمی ہیں جو بزعمِ انشا پردازی معمولی واقعہ کو بھی "حادثہ" بنا دیتا ہے اور نہ خطوط میں کہیں اپنی خود ساختہ ادبیت کو ہاتھ سے نہیں جانے دیتا۔ جن حضرات کے پاس زور صاحب کے خطوط موجود ہیں، اب کو ان کی اشاعت کی طرف توجہ کر

حصہ نظم میں شاذ تمکنت اور جگن ناتھ آزاد قابلِ ذکر ہیں۔

نذ

مجلس اشاعت دکنی مخطوطات کی کتابیں

گذشتہ شمارہ سب رس میں ہم نے اعلان کیا تھا کہ ابوالکلام آزاد اورینٹل ریسرچ انسٹی ٹیوٹ مجلس اشاعت دکنی مخطوطات کی کتابیں حاصل کر کے اس کی فروخت شروع کرے گا۔ ہم مسرت کے ساتھ یہ اعلان کرتے ہیں کہ ہم نے یہ کتابیں حاصل کر لی ہیں اور ان کی فروخت شروع کر دی ہے۔ فہرست ملاحظہ ہو۔

۱۔ **کلیات سلطان محمد قلی قطب شاہ**:۔ مرتبہ ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور۔ گولکنڈے کے پانچویں تاجدار اور اردو کے پہلے صاحب دیوان شاعر سلطان محمد قلی قطب شاہ (۹۸۸ھ تا ۱۰۲۰ھ) کے اردو کلام کا مجموعہ (۲۲۰) کا طویل مقدمہ ہے جس میں موصوف نے سلطان محمد قلی قطب شاہ کی زندگی کے حالات پر تفصیلی روشنی ڈالی ہے اور اس کی شاعری پر سیر حاصل تبصرہ کیا ہے۔ اس کا کلام پچاس ہزار اشعار پر مشتمل ہے۔ صفحات معہ تصاویر ایک ہزار اڑسٹھ قیمت (پندرہ) روپے

۲۔ **کلیات سراج**:۔ مرتبہ پروفیسر عبدالقادر سروری۔ یہ سید شاہ سراج الدین سراج اورنگ آبادی کے کل اردو اور فارسی مخطوط کا مجموعہ ہے۔ (۱۲۰) صفحات کا طویل مقدمہ جس میں سراج کی حیات، تصنیفات اور شاعری پر سیر حاصل بحث کی گئی ہے۔ یہ (۶۶۳) صفحات پر مشتمل ہے۔ فی جلد آٹھ روپے۔

۳۔ **قصۂ بے نظیر**:۔ (۱۰۵۵ھ) از صنعتی بیجاپوری مرتبہ پروفیسر عبدالقادر سروری۔ یہ منظوم قصہ تمیم انصاریؓ کے نام سے مشہور، تین سو سال پہلے کی اردو کا نمونہ ہے اس کا مصنف صنعتی عادل شاہی خاندان کے پچھلے محمد عادل شاہ کا معاصر تھا۔ یہ ایک مہماتی طرز کا قصہ ہے جس کی مرکزی شخصیت حضرت تمیم انصاریؓ ہیں۔ فاضل مرتب نے ۱۳۶ صفحہ مقدمہ لکھا ہے۔ اصل قصہ ۴۰۰ صفحات پر مشتمل ہے قیمت مجلد چھ روپے غیر مجلد پانچ روپے۔

۴۔ **پھول بن**:۔ (۱۰۶۶ھ) از ابن نشاطی مرتبہ پروفیسر سروری۔ ابن نشاطی گولکنڈہ کا باشندہ اور سلطان عبداللہ کا درباری شاعر ہے۔ اس کی تصنیف "پھول بن" صوری اور معنوی ہر اعتبار سے ایک قابل قدر ہے اور اس زمانہ کی بہترین نظموں میں اس کا شمار ہوتا ہے۔ (۱۹۱) صفحات کا طویل مقدمہ لکھا ہے جس میں شاعر کی زندگی کے روشنی ڈالتے ہوئے اصل قصہ کی بھی تشریح کر دی ہے جس سے قصہ بہ آسانی سمجھ میں آ جاتا ہے۔ اصل کتاب (۱۷۴) صفحات۔ قیمت مجلد چھ روپے غیر مجلد پانچ روپے۔

۵۔ **مثنوی سیف الملوک و بدیع الجمال** (۱۰۳۵ھ) از غواصی مرتبہ میر سعادت علی رضوی ایم اے۔ ملا غواصی سلطان ابراہیم کے عہد میں پیدا ہوا۔ سلطان محمد قلی قطب شاہ اور سلطان محمد کے زمانہ میں شاعری کرتا رہا۔ لیکن اس کو دربار شاہی میں کوئی جگہ نہ مل سکی۔ سلطان عبداللہ قطب شاہ کے زمانہ میں اس کو شہرت ملی اور ملک الشعراء کے درجہ تک پہنچ گیا۔ یہ بہ حیثیت سفیر بیجاپور بھی روانہ کیا گیا تھا۔ اس کی تصنیفیں "سیف الملوک و بدیع الجمال" "طوطی نامہ" بہت مشہور ہیں۔ مثنوی سیف الملوک و بدیع الجمال کا مقدمہ ۷۲ صفحات پر مشتمل ہے اور بقیہ کتاب کے ۹۰ [illegible]

۶۔ طوطی نامہ (۱۰۴۹ھ) از غواصی۔ مرتبہ میر سعادت علی رضوی۔ طوطی نامہ کی زبان بہ نسبت سیف الملوک کے سلیس ہے۔ دکنی شاعر غواصی کی لکھی ہوئی سیف الملوک کا اسلوب طوطی نامہ پر فوقیت رکھتا ہے۔ ۲۱۰ صفحات کا مقدمہ ہے اور کتاب ۔۹۰ صفحات پر مشتمل ہے۔ قیمت غیر مجلد پانچ روپیہ۔

۷۔ کلام الملوک: سلاطین دکن کا منتخب کلام۔ مرتبہ میر سعادت علی رضوی۔ سلاطین بہمنیہ، سلاطین عادل شاہیہ اور سلاطین قطب شاہیہ کا فارسی کلام "کلام الملوک" کے نام سے پیش کیا گیا ہے۔ اور قارئین کی سہولت کے لئے ان خاندانوں کے شجرے بھی شامل کئے گئے۔ یہ کتاب ۲۱۲ صفحات پر مشتمل ہے۔ قیمت مجلد چھ روپے غیر مجلد پانچ روپیہ۔

۸۔ کلیات عبداللہ قطب شاہ (۱۰۳۵ھ تا ۱۰۸۳ھ) مرتبہ پروفیسر سیدہ محمد۔ بانی حیدرآباد سلطان محمد قلی قطب شاہ کے نواسے اور گولکنڈہ کے ساتویں فرماں روا سلطان عبداللہ قطب شاہ کے اردو کلام کا مجموعہ ہے۔
قیمت مجلد چھ روپے غیر مجلد پانچ روپیہ۔

۹۔ گلشن عشق (۱۰۶۸ھ) از نصرتی۔ مرتبہ پروفیسر سید محمد۔ یہ بیجاپور کے سب سے بڑے شاعر اور دربار علی عادل شاہ ثانی (۱۰۶۷ھ تا ۱۰۸۳ھ) کے ملک الشعراء نصرتی کی مشہور عشقیہ مثنوی ہے جس میں حسن و عشق اور رزم و بزم کے دلکش مرقع پیش کئے گئے ہیں۔ اس کتاب کے مقدمہ میں نصرتی کے حالات زندگی اور اس کی تصانیف کے بارے میں بڑی تحقیقی معلومات فراہم کی گئی ہیں۔ نیز اس کے شاعرانہ کمال پر تبصرہ کیا گیا ہے۔ فی جلد پانچ روپے۔

۱۰۔ علی نامہ: از نصرتی۔ مرتبہ پروفیسر عبدالمجید صدیقی۔ علی عادل شاہ ثانی کے دور کے حالات ہیں۔ یہ اردو کی بہترین رزمیہ مثنوی ہے۔ اور فاضل مرتب کے مقدمہ کے ساتھ شائع کی گئی ہے۔ قیمت سات روپے۔

۱۱۔ مثنوی رضوان شاہ و روح افزا: تصنیف فائز (۱۰۹۴ھ)۔ مرتبہ پروفیسر سید محمد صاحب۔ یہ مثنوی فائز کی واحد ادبی یادگار ہے۔ فائز قطب شاہی خاندان کے آخری فرماں روا ابوالحسن تاناشاہ کے عہد کا شاعر تھا۔ قصہ رضوان شاہ و روح افزا فارسی نثر میں تھا۔ فائز نے اس کو اردو نظم کا جامہ پہنایا ہے۔ اس کی زبان سلیس اور دلکش ہے۔ یہ کتاب ۱۶۵ صفحات پر مشتمل ہے۔ آخر میں فرہنگ بھی شریک ہے۔ قیمت تین روپے آٹھ آنہ۔

۱۲۔ مثنوی چندر بدن و مہیار: تصنیف مرزا محمد مقیم مقیمی بیجاپوری۔ مرتبہ محمد اکبر الدین صدیقی لکچرار عثمانیہ یونیورسٹی۔ مقیمی سلطان محمد عادل شاہ کے عہد کا مشہور شاعر تھا۔ اس نے عمر کا بڑا حصہ بیجاپور میں گزارا گولکنڈہ اور احمد نگر میں بھی اس نے سفارتی خدمات انجام دی ہیں۔ چندر بدن و مہیار کا قصہ دکن میں ہر شخص کی زبان پر تھا۔ مقیمی نے اس کو اردو میں نظم کیا۔ مرتب نے ۴۰ صفحات کا طویل مقدمہ لکھا ہے۔ کتاب کے صفحات ۱۲۰ ہیں۔ قیمت دو روپیہ آٹھ آنے۔

۱۳۔ مثنوی تصویر جاناں: تصنیف لچھمی نرائن شفیق اورنگ آبادی (۱۲۲۳ھ)۔ مرتبہ خواجہ حمید الدین شاہد۔ شفیق کی سب سے زیادہ اہم مثنوی تصویر جاناں ہے۔ شفیق نواب نظام علی خاں آصف جاہ ثانی کے عہد کے مشہور شاعر تھے۔ مرتب نے ۶۹ صفحات کا مقدمہ لکھا ہے۔ مثنوی ۲۰۰ صفحات پر مشتمل ہے۔ قیمت ایک روپیہ آٹھ آنے۔

۱۴۔ پنچھی باچھا (۱۱۹۲ھ) از وجدی۔ مرتبہ پروفیسر سیدہ محمد۔ حضرت شیخ فرید الدین عطار کی مشہور مثنوی منطق الطیر کا آزاد ترجمہ ہے۔ [illegible] کتاب ہے۔ شروع میں ایک سیر حاصل مقدمہ ہے جس میں وجدی کا ادبی [illegible] قیمت چار روپیہ آٹھ آنے۔

ابوالکلام آزاد اورینٹل ریسرچ انسٹی ٹیوٹ
[illegible] خیریت آباد۔ حیدرآباد ۴ اے پی

The

SABRAS

(ZORE NUMBER)

1963

Organ Of The Idara